درسی تفسیر جدید
پارہ عمّ
از افادات
حضرت مولانا نسیم احمد غازی مظاہری
ترتیب مفتی راشد محمود راجہ
مکتبہ عمر فاروق

درسی تفسیر جدید

پارہ عمّ

...

از افادات

حضرت مولانا نسیم احمد غازی مظاہری

...

ترتیب: مفتی راشد محمود راجہ

نام کتاب .... درسی تفسیر

مصنف .... حضرت مولانا نسیم احمد غازی مظاہری

طبع اول 2009

طبع دوم 2010

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انسانی طاقت وبساط کے بقدر کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے باوجود کوشش اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو مطلع فرمادیں تاکہ طبع جدید میں ان اغلاط کی تصحیح کی جاسکے۔

آپ کی یہ رہنمائی باعث اجر وثواب ہوگی۔

منتظم مکتبۃ الہادی
راجہ عرفان الحق

مکتبہ عمر فاروق

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

Tel: 021-4594144 Cell: 0334-3432345

فہرست

سورۃ النبإ

سورة النباء مكية وهى اربعون اية وفيها ركوعان

رکوع:۲،آیات:۴۰، سورۃ نبأ مکیہ ہے اور اس میں چالیس آیات اور دو رکوع ہیں۔ کلمات ۱۷۳،حروف:۹۷۰

اس سورت کا نام "سورۃ النبأ" بھی ہے اور "سورۂ تساؤل" بھی ہے۔مناسبت ظاہر ہے کہ یہ دونوں لفظ "نبأو تسآؤل" اس سورت کے شروع ہی میں مذکور ہیں۔

ربط ومناسبت:

سورۂ سابقہ "المرسلٰت" میں قیامت کا امکان ووقوع اور واقعات جزاوسزا مذکور ہیں، اس سورت "النبأ" میں بھی انہیں مضامین کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔

شانِ نزول:

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور اہل مکہ کو قیامت اور اعمال کی جزاوسزا کی خبر دی تو کفار ومشرکین کو اس سے بڑی حیرت ہوئی۔اور تعجب کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے نیز آپس میں ایک دوسرے سے قیامت وجزا، سزا کے بارے میں پوچھنے،اور مرنے کے بعد زندہ ہونے کو بعید خیال کر کے اس کا انکار واستہزا کرنے لگے۔اس لئے اس سورت میں اس کے امکانِ وقوع اور تحققِ وقوع پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔اور ان کے بے جا انکار واستہزا کو مختلف طریقوں سے رد کر کے قیامت اور اس میں پیش آنیوالے واقعات کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ (۱) عَنِ النَّبَأِ الْعَظِيْمِ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۳)

وہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں اس بڑی خبر کے بارے میں؟ جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

عَمَّ	يَتَسَآءَلُوْنَ	عَنِ	النَّبَأِ	الْعَظِيْمِ	الَّذِىْ	هُمْ	فِيْهِ	مُخْتَلِفُوْنَ
کس چیز	سوال کرتے ہیں	سے	اس خبر	بڑی	(جو) کہ	وہ	بیچ اس	اختلاف کرنیوالے

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (۴) ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (۵)

ایسا ہرگز نہیں چاہئے۔عنقریب ان کو معلوم ہو جائیگا۔پھر ہرگز ایسا نہ چاہئے ان کو بہت جلد معلوم ہو جائیگا۔

كَلَّا	سَيَعْلَمُوْنَ	ثُمَّ	كَلَّا	سَيَعْلَمُوْنَ
ہرگز یوں نہیں	شتاب جانیں گے	پھر	ہرگز یوں نہیں	شتاب جانیں گے

لغات :

عَمَّ عن جارۃ ما استفہامیہ سے مرکب ہے۔ عن کے نون کو میم سے بدل کر ادغام کر دیا گیا۔ اور ما استفہامیہ کو ما خبریہ سے ممتاز کرنے کے لئے، نیز کثرت استعمال کی بنا پر ما کے الف کو حذف کر لیا گیا۔ اور قاعدہ بھی یہی ہے کہ ما استفہامیہ پر جب بھی حرف جر آتا ہے تو اس کا الف حذف کر دیا جاتا ہے۔ یتسـاءَلون باب تفاعل سے جمع مذکر غائب مضارع، ایک دوسرے سے پوچھنا، مجرد میں فتح سے مستعمل ہے۔ النباء: مصدر، خبر (ف) خبر دینا۔ مختلفون باب افتعال سے صیغہ اسم فاعل (ن) پیچھے آنا۔ کلا دونوں جگہ حرف ردع وزجر ہے۔ والتکریر للتاکید .

ترکیب :

عَمَّ جار مجرور متعلق یتساء لون کے وقدم لصدارۃ الاستفهام، وتقدّمُ حرفِ الجرّ لایبطل صدارته، لأن الجار والمجرور کالکلمة الواحدة، وتأخر الجار من المجرور ممتنعٌ لضعف عمله. یتسآء لون: فعل ضمیر جمع غائب (جو اہل مکہ کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہ معنیً مذکور ہیں) فاعل، والمفعول محذوف لقرینة المقام عَن حرف جر النبأُ العظیم مرکب توصیفی مجرور، یہ یا تو فعل محذوف یتساءَ لون کے متعلق ہے، بشرطیکہ یتساءَ لون مذکور ہی کے متعلق کر دیا جائے گویا یہ سوال مذکور کا جواب ہے۔ اور اس فعل کو جار مجرور کے بعد مقدر مانا جائے، تا کہ رعایت ترتیب سوال ملحوظ رہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ عَمَّ سے بدل ہو یا عطف بیان قرار دیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عن النبا العظیم کو یتساءَ لون مذکور ہی کے متعلق کر دیا جائے۔ اس صورت میں عَمَّ کو فعل محذوف کے متعلق مانا جائے۔ جسکی تفسیر فعل مذکور یتســـاءَ لـــون کر رہا ہے۔ یا دونوں کو اس فعل مذکور ہی کے متعلق کر دیا جائے۔ ان مؤخر الذکر چاروں صورتوں میں یتساءَ لون پر وقف نہ کیا جائے گا۔ الذی اسم موصول هم ضمیر راجع بسوئے اہل مکہ مبتدا مختلفون اپنے متعلق مقدم "فیه" سے ملکر خبر (وقدم "فیه" اهتماماً ورعایةً للفواصل) مبتدا و خبر جملہ اسمیہ صلہ، اسم موصول وصلہ ملکر صفت ثانیہ النبأکی۔ (وجعلها جملةً اسمیةً للدّلالةِ علی الثبات ای هم راسخون فی الاختلاف) آگے کلّا دونوں فعلیہ جملوں پر برائے ردع ہے۔

تفسیر:

عَـمَّ یتسآءَ لون اہل مکہ کیسی عظیم الشان اور ہولناک چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے ہیں؟ حق تعالیٰ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں، اس لئے اُن کے کلام میں استفہام سوال کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ جس چیز کے متعلق سوال کیا جاتا ہے اس کی عظمت واہمیت یا ہولناکی کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قیامت وغیرہ کے متعلق نازل شدہ آیات اہل مکہ کو سنائیں، تو وہ اپنی مخصوص مجلسوں میں بیٹھ کر چہ میگوئیاں اور رائے زنی کرنے لگے۔ ان کے نزدیک قیامت کا بپا ہونا، مرنے کے بعد زندہ ہونا، اور جزا وسزا یہ سب چیزیں ناممکن تھیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں ان میں بکثرت گفتگو چلتی تھی، کوئی تصدیق کرتا تو کوئی انکار واستہزا کرتا، اس لئے اس سورت کے شروع میں ان کا حال بیان فرما کر آگے وقوع قیامت کا دعویٰ عجیب حاکمانہ انداز میں فرمایا گیا۔ اور قدرت کے مشاہدات کے ذریعہ ان کے اشکال واستبعاد کو دور کیا گیا ہے۔

تساؤل کے معنی

تساؤل کے معنی ایک دوسرے سے سوال کرنے اور پوچھنے کے ہیں۔ پھر یہ پوچھنے والے کون تھے؟ (۱) اہل مکہ تھے جو آپس میں تعجب وانکار اور تمسخر کے طور پر قیامت اور اس کے احوال کا چرچا کرتے اور ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ جمہور کا قول یہی ہے۔ کیونکہ بظاہر یتساء لون کی طرح کلا سیعلمون ثم کلاسیعلمون اور مختلفون کی ضمیریں انہیں کی طرف راجع ہیں۔ ورنہ انتشار ضمائر لازم آئیگا، جو بہتر نہیں۔ (۲) کفار مکہ مسلمانوں سے پوچھتے اور شبہات پیش کرتے اور مسلمان جواب دیتے تھے۔ (۳) کفار اور مسلمان سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے۔ ہاں مسلمان اپنے یقین کو زیادہ مضبوط کرنے کے لئے اور کفار استہزاو تمسخر کے طور پر پوچھتے تھے۔

امام فرار حمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تساؤل بات چیت کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اگر چہ باہم سوال جواب نہ ہو۔ جیسے سورۂ صفت میں ہے ﴿وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ﴾ (پارہ: ۲۳، سورۃالصفت، الآیۃ: ۵۰، ۵۱) اس میں سوال جواب نہیں، بلکہ جنتیوں کی ایک ایسے دوزخی کے بارے میں گفتگو ہے جو گفتگو کرنیوالوں میں سے دنیا میں ایک کا ساتھی تھا۔ اس صورت میں معنی یہ ہونگے کہ وہ کس چیز کا چرچا کرتے ہیں؟ یہ چرچا اور انکار و استہزاء کرنیکی چیز نہیں، ایک آنیوالی حقیقت ہے، جس سے ڈر کر اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیئے، نہ یہ کہ فضول تذکروں میں عمر عزیز کو برباد کر دیا جائے جس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

نبأ عظیم کیا ہے؟

نبأ عظیم کے مصداق میں تین قول ہیں: (۱) قیامت ہے: کلا سیعلمون ثم کلاسیعلمون میں تہدید ہے۔ الم نجعل الارض میں دلائل قیامت کا بیان اور لفظ عظیم وغیرہ اس کے قرائن ہیں۔ چنانچہ ﴿هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ﴾ (پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۶۷، ۶۸) اور ﴿لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ (پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۵) جیسی بہت سی آیات میں اس لفظ عظیم کے موصوف سے یوم قیامت ہی مراد ہے۔ (۲) اس سے قرآن مراد ہے، کیونکہ لوگ اس میں اختلاف کرتے تھے کہ وہ شعر ہے یا سحر، کہانت ہے یا اساطیر الاولین لفظ نبأ کے معنی خبر کے ہیں۔ جو قرآن پر زیادہ چسپاں ہوتے ہیں۔ یہ قول مجاہدؒ اور اکثر علماء کا ہے۔ (۳) اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت ہے۔ اور وہ بڑی چیز ہے، جس نے دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ واللہ اعلم قرآن کریم نے ان کے انکار واستہزا کے جواب میں ایک ہی جملہ کو تاکید کے لئے دو مرتبہ فرمایا: کلا سیعلمون ثم کلا سیعلمون مطلب یہ ہے کہ یہ چیز (قیامت کا وقوع) سوال و جواب اور بحث وتحقیق سے سمجھ میں آنیوالی نہیں۔ وہ تو جب سامنے آئیگی حقیقت واضح ہو جائیگی۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلے جملہ کا تعلق موت سے ہے اور دوسرے کا قیامت سے۔ اور ثم بُعد وتراخی زمان پر دال ہے۔ یعنی موت کیوقت حقیقت کا انکشاف ہوگا۔ اور وہاں کے ہولناک مناظر آنکھوں سے نظر آنے لگیں گے پھر جب قیامت قائم ہوگی تو سب ڈھکی چھپی حقیقتیں روشن ہو جائینگی۔ اور اپنی کرتوتوں کے پھل سامنے آجائیں گے۔

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (٦) وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (٧) وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (٨)

کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا۔ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا بنایا

اَلَمْ	نجعل	الارض	مِهٰدًا	وَّالْجِبَالَ	اَوْتَادًا	وَّخَلَقْنٰكُمْ	اَزْوَاجًا
کیا نہیں	ہم نے بنایا	زمین	بچھونا	اور پہاڑ	میخیں	اور ہم نے تمہیں پیدا کیا	جوڑے جوڑے

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (٩) وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (١٠)

وَّ	جَعَلْنَا	نَوْمَكُمْ	سُبَاتًا	وَّ	جَعَلْنَا	الَّيْلَ	لِبَاسًا
اور	کیا ہم	نیند تمہاری	سبب آرام	اور	کیا ہم	رات	پردہ

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (١١) وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (١٢) وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (١٣)

اور ہم نے تمہاری نیند کو باعث راحت بنایا۔ اور ہم نے رات کو پردہ بنایا۔

وَ	جَعَلْنَا	النَّهَارَ	مَعَاشًا	وَ	بَنَيْنَا	فَوْقَكُمْ	سَبْعًا	شِدَادًا	وَّجَعَلْنَا	سِرَاجًا	وَّهَّاجًا
اور	کیا ہم	دن	وقت معاش	اور	بنائے ہم	اوپر تمہارے	سات (آسمان)	سخت	اور کیا ہم	چراغ	روشن

اور ہم نے دن کو کاروبار کے لئے بنایا اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنادیئے۔ اور ہم نے ایک نہایت روشن چراغ بنایا۔

وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (١٤) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا

اور ہم نے پانی بھرے بادلوں سے موسلادھار پانی برسایا تاکہ ہم اس کے ذریعہ اناج

وَ	اَنْزَلْنَا	مِنَ	الْمُعْصِرٰتِ	مَآءً	ثَجَّاجًا	لِنُخْرِجَ	بِهٖ	حَبًّا
اور	اتارا ہم	سے	نچوڑنے والی (بدلیاں)	پانی	گرنا بکثرت	تاکہ نکالیں ہم	ساتھ اس	اناج

وَّنَبَاتًا (١٥) وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا (١٦)

اور گھاس اور گھنے باغ اگائیں۔

وَ	نَبَاتًا	وَّ	جَنّٰتٍ	اَلْفَافًا
اور	سبزی	اور	باغات	لپٹے ہوئے

لغات:

مِهٰدًا: بچھونا، جمع مُهُد وامْهِدَةٌ. (ف) بچھانا۔ اَوْتَادًا: جمع وَتِد کی: میخ، کھونٹی وَتَدَ، يَتِدُ (ض) کھونٹی گاڑنا۔ میخ ٹھوکنا۔ نوم: نیند (س، ن) سونا۔ سُبَاتًا: نیند، اونگھ، راحت، اصل معنی اس کے قطع کے آتے ہیں: ای قطعًا عن الاحساس والحركة استراحةً للقوى الحيوانيةِ. سَبَتَ، سَبْتًا (ن ص) ہفتہ کے دن میں داخل ہونا، سبت منانا، آرام لینا، کاٹنا، مونڈنا، نیند آجانا، یوم السبت سنیچر کا دن۔ لِبَاسًا: وہ کپڑا جو پہنا جائے، غلاف، پردہ، لبس لَبْسًا (ن) شبہ میں ڈالنا (س) کپڑا پہننا۔ مَعَاشًا: مصدر میمی یا ظرف زمان ہے۔ (ض) زندہ رہنا۔ اگر ظرف زمان ہے تو معنی وقتِ معاش ہیں۔ بَنَيْنَا: صیغہ جمع متکلم ماضی (ض) بنانا۔ شِدَادًا: جمع شَدِيْد کی، قوی، مضبوط (ن، ض) دوڑنا، بلند ہونا، قوی ہونا، مضبوط کرنا، باندھنا وغیرہ۔ سِرَاجًا: چراغ، دیا، مجازاً سورج اور ہر روشن چیز کے لئے بھی استعمال ہوتا

ہے، جمع سُرُج، سَرَجَ سَرْجًا (ن) جھوٹ بولنا۔ (س) جھوٹ بولنا، خوبصورت چہرہ والا ہونا۔ وَهَّاجًا: صیغہ مبالغہ، بہت روشن، وَهَجَ وَهْجًا (ض) روشن ہونا، بھڑکنا، چمکنا۔ اَلْمُعْصِرَات: صیغہ جمع مونث اسم فاعل باب افعال سے، نچوڑنے والیاں۔ (ض) نچوڑنا۔ ثَجَّاجًا: صیغہ مبالغہ زور شور کے ساتھ برسنے والا (ن) بہنا، برسنا، حَبًّا: دانہ، غلہ، اناج، جمع حُبُوب. اَلْفَافًا لپٹے ہوئے، ایک دوسرے سے پیوست، گنجان درخت۔ زمخشریؒ کہتے ہیں کہ اَوْزَاع اور اَخْيَاف کی طرح اسکا بھی واحد نہیں آتا۔ بعض اس کا واحد لف بتاتے ہیں۔ ابن قتیبہؒ کہتے ہیں کہ یہ لُف بضمّ اللام کی جمع ہے۔ اور لف لفاء کی جمع ہے۔ ابوحیانؒ کہتے ہیں کہ واحد بکسر اللام ہی صحیح ہے۔ یہی قول جمہور اہل لغت کا ہے۔ صاحب قاموس نے لف بفتح اللام لکھا ہے۔ ابوعبیدہ اس کا واحد لَفِيف بتاتے ہیں. لف لفًا (ن) لپیٹنا، ملانا، جمع کرنا، گنجان ہونا۔ (س) پرگوشت رانوں والا ہونا

ترکیب:

اَلَمْ نَجْعَلُ فعل بافاعل اپنے دونوں مفعولوں الارض اور مهدا سے ملکر جملہ فعلیہ، وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا کا عطف الْاَرْضَ مِهٰدًا پر ہے۔ وخلقنا بمعنی صیّرنا اپنے دونوں مفعولوں سے ملکر جملہ، والجملة عطف المضارع المنفی بلم داخل فی حکمه؛ فانه فی قوة اَمَا خَلَقْنَاكُمْ...... أو علی ما یقتضیه الانکار التقریری؛ فانه فی قوة ان یقال وقد خلقنا، وراعیناه فی الترجمة فافهم . اگلے تینوں جملوں کی ترکیب بھی اسی طرح ہے۔ وبنینا فعل بافاعل فوقکم ظرف کو مفعول بہ پر رعایت فواصل کی بنا پر مقدم کیا گیا ہے۔ یا تشویق کے لئے فان ماحقه التقدیم اذا اخِّر تبقی النفس مترقبةً له فاذا وَرَدعلیها تمکن عندها فضل تمکن؛ لان حصول الشی بعد الشوق الیه اوقع والَذّ فی النفس. وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَاجًا. مثل سابق ہے اور اسی پر عطف ہے۔ هکذا وانزلنا...... لنخرج میں لام لام ”کَیْ“ ہے۔ جملہ بتاویل مفرد مجرور، جار مجرور انزلنا کے متعلق ہے جیسا کہ من المعصرات تھا۔ نباتا اور جنتٍ کا عطف حبًّا پر ہے۔ اور ”الفافًا“ جنتٍ کی صفت ہے۔

تفسیر:

ان مذکورہ آیات میں باری تعالیٰ نے اپنی مصنوعات کا ذکر فرما کر اپنی توحید وقدرتِ حشر پر اور اپنی عطا کی ہوئی نعمتوں کے وجوبِ شکر پر استدلال کیا ہے۔ تاکہ لوگ توحید وعبادت اور ایمان واعمال کی دعوت کو مانیں اور داعی کا اتباع کریں۔ ان آیات میں باری تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمت وصنعت کے نو مناظر بیان فرمائے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت سے یہ بعید نہیں کہ وہ اس سارے عالم کو فنا کر کے دوبارہ پیدا کر دے۔ (۱) زمین کو ہم نے فرش بنایا۔ اس فرش کے عجائبات میں غور کرو۔ کیا کوئی اور اس شان کی زمین بنا سکتا ہے؟ پھر اس کے ہلنے اور لرزنے سے حفاظت کا سامان اس طرح کیا۔ (۲) کہ پہاڑ اس کی روک تھام کے لئے پیدا کر دیئے گئے، جن کی وجہ سے وہ کشتی کی طرح ڈگمگاتی نہیں ہے پھر اس فرش کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ (۳) تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا تاکہ مرد عورت کے لئے اور عورت مرد کیلئے سامانِ عیش وباعث راحت وآرام بنے۔ اور توالد وتناسل کے ذریعہ دنیا میں نسل انسانی پھیلے۔ (۴) راحت اور آرام کے لئے ایک عظیم نعمت نیند عطاء فرمائی۔

نیند اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے:

یہاں انسان کو جوڑے جوڑے بنانے کا ذکر فرمانے کے بعد اسکی راحت کے سب سامانوں میں سے خاص طور پر نیند کا ذکر فرمایا ہے۔ غور کیجئے تو یہ ایک ایسی عظیم الشان نعمت ہے کہ انسان کی تمام راحتوں کا مدار اسی پر ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس نعمت کو ایسا عام فرما دیا ہے کہ امیر غریب، عالم جاہل، بادشاہ اور مزدور سب کو یہ دولت بیک وقت یکساں عطاء ہوتی ہے۔ بلکہ غریبوں اور محنت کشوں کو یہ نعمت جیسی حاصل ہوتی ہے وہ دولتمندوں، بادشاہوں اور دنیا کے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے پاس راحت کا سامان، آرام کے مکان، سردی وگرمی کے اعتدال کی جگہیں، نرم گدے، تکیئے سب اسباب موجود ہوتے ہیں۔ مگر نیند کی نعمت ان گدّوں، تکیوں یا کوٹھی بنگلوں کے تابع نہیں ہے۔ وہ تو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو براہ راست اس کی طرف سے ملتی ہے۔ مفلس بے سامان کو بلا اسباب راحت کھلی زمین پر یہ نعمت فراوانی سے دیدی جاتی ہے۔ اور بعض اوقات وہ بھی فیل ہو جاتی ہے۔ پھر غور کرو کہ اس نعمت کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح ساری مخلوق کے لئے عام فرمایا ہے اس سے بڑی نعمت یہ ہے کہ یہ نعمت مفت بلا محنت ہی نہیں بلکہ اپنی رحمت سے اس نعمت کو جبری بنا دیا ہے۔ کہ انسان بعض مرتبہ کام کی کثرت کی وجہ سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ رات بھر جاگتا ہی رہے۔ مگر رحمت حق اس پر جبرًا نیند طاری کر دیتی ہے۔ تاکہ دن بھر کی تکان دور ہو جائے۔ اور اس کے قویٰ مزید کام کے لئے تیز ہو جائیں۔ آگے اسی نیند کی عظیم نعمت کا تکملہ یہ بیان فرمایا کہ (۵) ﴿وجعلنا اللَّيْلَ لباساً﴾ یعنی ہم نے رات کو پردہ بنا دیا (جو مخلوق کو اپنے اندر چھپالیتا ہے) چونکہ انسان کو فطرۃً اس وقت نیند آتی ہے جب روشنی زائد نہ ہو، ہر طرف سکون ہو، شور وشغب نہ ہو۔ اس میں حق تعالیٰ نے رات کو لباس یعنی اوڑھنے اور چھپانے کی چیز فرما کر اشارہ کر دیا کہ قدرت نے تمہیں صرف نیند ہی عطاء نہیں فرمائی، بلکہ سارے عالم میں ایسے حالات پیدا فرما دیئے جو نیند کے لئے سازگار ہوں۔ اول رات کی تاریکی دوسرے انسان اور غیر انسان پورے عالم پر بیک وقت نیند کا مسلط ہونا کہ جب سب سو جائیں گے تو پورے عالم میں سکون کا ماحول بپا ہو جائیگا۔ ورنہ دوسرے کاموں کی طرح اگر نیند کے اوقات بھی لوگوں کے مختلف ہوتے تو کسی کو بھی پورے سکون سے سونا میسر نہ ہوتا۔

لطیفہ:...... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ نکاح دن میں بہتر ہے یا رات میں؟ فرمایا: رات میں اس لئے کہ رات کو بھی قرآن نے لباس فرمایا ہے: ﴿وجعلنا الیل لباسا﴾ اور زوجین کو بھی ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ﴾ (پارہ: ۲ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷) ایک لباس کو دوسرے لباس سے مناسبت ظاہر ہے۔ (۲) انسان کو راحت وسکون کیلئے غذا اور دیگر ضروریات بھی درکار ہیں۔ ورنہ نیند موت ہو جائے۔ اگر رات ہی رات رہتی اور آدمی ہر وقت سوتا ہی رہتا تو وہ انعامات کس طرح میسر آتے جو دن میں حاصل ہوتے ہیں؟ اور انسان ان کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ اس لئے تمہارے لئے ایسا روشن دن بنایا کہ اس میں تم کاروبار کر کے اپنی معاشی ضروریات حاصل کر سکو۔

اس کے بعد انسان کی راحت کے ان سامانوں کا ذکر ہے جو اس کے گھر (دنیا) کی چھت (آسمان) اور اس سے متعلق ہیں۔ (۷) اور ہم نے تمہارے (اس مکان کے) اوپر سات مضبوط آسمان بنائے (جو اس مکان کی اوپر نیچے سات پائیدار اور بے نظیر چھتیں ہیں) یہ سات چھتیں ایسی خوبصورت اور مضبوط ہیں جو اللہ کی قدرت اور اس کی کاریگری پر دلیل کافی

ہیں۔اس مکان دنیا کے فرش اور چھت کا ذکر کر کے اس کے چراغ کا ذکر ہے جس سے اندھیرے گھر میں روشنی ہوتی ہے۔جو دن میں نمودار ہوتی ہے۔(۸)اور ہم نے تمہارے لئے ایک روشن چمکدار چراغ بنایا۔مقاتلؒ کہتے ہیں کہ "وھـــج" اس روشنی کو کہتے ہیں جس میں گرمی بھی ہو اللہ تعالیٰ نے سورج میں نور بھی پیدا کیا اور گرمی بھی۔(۹) آسمان میں حق تعالیٰ نے جو اسباب انسان کی راحت کے لئے پیدا کئے ہیں ان میں سب سے زیادہ ضرورت کی چیز پانی برسانے والے بادل ہیں وانـزلـنـا...... میں ان کا ذکر فرمایا یعنی ہم نے بادلوں کو نچوڑنیوالی ہواؤں سے یا بادلوں سے مسلسل برسنے والا پانی برسایا۔ **الـمـعـصـرات** ۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ کے قول کے مطابق وہ ہوائیں (مراد ہیں) جو بادلوں سے پانی نچوڑتی ہیں۔ابو العالیہ اور ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد بادل ہیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔فراء کہتے ہیں کہ **المعصرات** سے مراد وہ بادل ہیں جو پانی سے بھرے ہوئے برسنے والے ہوں مگر ابھی برسے نہیں جیسے **اَلْمَرْاَۃُ الْمُعْصِرَۃُ** وہ عورت جس کے حیض کا زمانہ آ گیا ہو اور ابھی حیض جاری نہ ہوا ہو۔ ابن اکسیانؒ نے کہا کہ **الـمـعـصـرات** سے برسنے والے بادل مراد ہیں۔اور **وفیـه تعصرون** کے محاورہ سے یہ لفظ ماخوذ ہے حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ، زید بن اسلم اور مقاتل، بن حبانؒ کے نزدیک **الـمـعـصـرات** سے آسمان مراد ہیں۔مجاہدؒ کے قول پر **من المعصرت** میں **من** سببیہ ہوگا۔باقی اقوال پر **من** ابتدائیہ ہوگا۔**ثَجَّاجًا** کا ترجمہ مجاہدؒ نے خوب برسنے والا۔ قتادہؒ نے مسلسل برسنے والا۔ابن زیدؒ نے بکثرت برسنے والا کیا ہے۔مآل سب کا ایک ہی ہے۔

فائدہ:......اس سے معلوم ہوا کہ بارش بادلوں سے نازل ہوتی ہے۔اور جن آیات میں آسمان سے نازل ہونیکا ذکر ہے یا تو ان میں بھی آسمان سے مراد فضائے آسمانی ہے جیسا کہ قرآن میں بکثرت لفظ سماء اس معنی کے لئے آیا ہے۔یا یہ کہا جائے کہ کسی وقت براہ راست آسمان سے بھی بارش آسکتی ہے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

فائدہ:......آیات مذکورہ میں قدرت کاملہ وحکمت بالغہ ونعمت شاملہ کا تذکرہ ہوا جن سے توحید وامکان بعث کا ثبوت ملتا ہے۔پھر اس عالم کا نتیجہ اور محسن ومنعم کا اپنے بندوں سے باز پرس کرنا، یہ عین عقل کے مطابق بلکہ تقاضائے عقل ہے جس سے حساب اور جزا وسزا کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔نیز باغ وبہار اور خزاں کی آمد وشد، کھیتوں کا اگنا، سرسبز اور سوکھ کر ناپید ہو جانا، پھر دوبارہ کھیتوں کا لہلہانا، سورج کا طلوع وغروب وغیرہ انسان کی زندگی کے تغیرات، موت وحیات اور بعث کے نقشوں سے نہایت مشابہ ہیں۔پھر بھی اگر غور وفکر کر کے صحیح راستہ پر نہ آئے تو خود اپنا قصور ہے۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا (۱۷) يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا (۱۸)

بیشک فیصلہ کا دن ایک وقت متعین ہے یعنی جس دن صور پھونکا جائیگا پھر تم لوگ گروہ گروہ ہو کر آؤ گے

اِنَّ	يَوْم	اَلْفَصْلِ	كَانَ	مِيْقَاتًا	يَوْمَ يُنْفَخُ	فِيْ	الصُّوْر	فَتَاْتُوْنَ	اَفْوَاجًا
بیشک	دن	جدائی	ہے	وقت مقرر	دن، پھونکا جائیگا	میں	صور	پس آؤ گے تم	فوج فوج

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا (۱۹) وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۲۰)

اور آسمان کھولا جائیگا تو اس کے دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔اور پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے تو وہ ریت ہو جائیں گے۔

وَّفُتِحَتْ	سَّمَآءُ	فَكَانَتْ	اَبْوَابًا	وَّسُيِّرَتْ	الْجِبَالُ	فَكَانَتْ	سَرَابًا
اور کھولا جائیگا	آسمان	ہو جائینگے	دروازے	اور چلائے جائیں گے	پہاڑ	پس ہو جائیگے	سراب

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (٢١) لِّلطَّٰغِينَ مَاٰبًا (٢٢) لّٰبِثِينَ فِيهَآ اَحْقَابًا (٢٣)

یقیناً دوزخ شریروں کی تاک میں ہے ان کا ٹھکانا بننے کے لئے، جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔

اِنَّ جَهَنَّمَ	كَانَتْ	مِرْصَادًا	لِلطّٰغِينَ	مَاٰبًا	لّٰبِثِينَ	فِيهَآ	اَحْقَابًا
بیشک جہنم	ہے	گھات میں	سرکشوں کیلئے	جگہ پھر جانے کی	رہنے والے	اس میں	قرنوں بیشمار

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (٢٤) اِلَّا حَمِيمًا وَّغَسَّاقًا (٢٥) جَزَآءً وِّفَاقًا (٢٦)

اس میں نہ تو وہ کسی ٹھنڈک کا مزا چکھیں گے اور نہ پینے کی چیز کا، بجز گرم پانی اور پیپ کے۔ انہیں پورا پورا بدلہ ملے گا۔

لَا	يَذُوقُونَ	فِيهَا، بَرْدًا	وَ	لَا	شَرَابًا	اِلَّا	حَمِيمًا	وَّ	غَسَّاقًا	جَزَآءً	وِّفَاقًا
نہ	چکھیں گے	اس میں، ٹھنڈک	اور	نہ	پینا	مگر	گرم پانی	اور	پیپ	بدلہ	موافق

اِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا (٢٨) وَّكَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا (٢٩)

کیونکہ وہ حساب سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور وہ نہایت آسانی سے ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے۔

اِنَّهُمْ	كَانُوا	لَا يَرْجُونَ	حِسَابًا	وَّكَذَّبُوا	بِاٰيٰتِنَا	كِذَّابًا
تحقیق وہ	تھے	امید رکھتے	حساب	اور جھٹلایا انھوں نے	ساتھ نشانیوں ہماری	جھٹلانا

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا (٣٠) فَذُوقُوا فَلَنْ نَّزِيدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا (٣١)

اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے۔ پھر تم مزہ چکھو ہم تمہارے عذاب ہی کو بڑھاتے رہیں گے۔

وَ، كُلَّ	شَيْءٍ	اَحْصَيْنٰهُ	كِتٰبًا	فَذُوقُوا	فَلَنْ	نَّزِيدَكُمْ	اِلَّا	عَذَابًا
اور، ہر	چیز	گن لیا ہم اس	لکھنا	پس چکھو	پس ہرگز نہ	زیادہ کریں گے ہم تم	مگر	عذاب

لغات:

میقاتا ظرف بمعنی وقتِ مقرر (ض) وقت مقرر کرنا۔ تفعیل سے بھی یہی معنی ہیں۔ **افواجا** جمع فوج کی۔ گروہ جماعت، جمع افواج، افاویج، افایج. **سرابا** وہ ریگستانی ریت جو دوپہر کو دھوپ کی تیزی کی وجہ سے پانی جیسا نظر آتا ہے۔ اور اس میں مکانوں اور درختوں کا سایہ عکس کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ جھوٹ اور مکروفریب کے لئے اس سے مثال دیجاتی ہے۔ سَرَبَ سُرُوْبًا (ن) جاری ہونا، ہوجانا۔ (س) ٹپکنا. **مرصادا:** ظرف مکان مَرَاصِد جمع، مقام انتظار، گھات لگانیکی جگہ یعنی جس طرح گھات لگا کر کسی مخفی مقام میں بیٹھنے والے ادھر سے گذرنے والا دشمن بچ نہیں سکتا۔ اسی طرح دوزخ سے شریر لوگ بچ نہیں سکتے۔ گھات لگانے کے چار اجزاء ہیں۔ (۱) گھات لگانیکا مقام (۲) دشمن کی نظر سے پوشیدہ ہونا (۳) اس مقام کا دشمن کا گذرگاہ ہونا (۴) وہاں بیٹھنے والے کو دشمن کے حالات کی اطلاع ہونا۔ رَصَدَ رَصْدًا (ن) انتظار کرنا۔ گھات میں بیٹھنا۔ **مَاٰبًا:** صیغہ ظرف لوٹنے کی جگہ آبَ اَوْبًا (ن) لوٹنا. **لٰبِثِيْنَ:** صیغہ جمع مذکر اسم فاعل (س) ٹھہرانا، اقامت کرنا۔ **احقابا:** جمع حُقُبٌ کی بضم القاف (و بضمتین، آلوسی) زمانے کو کہتے ہیں۔ اور بسکون القاف زمانہ کی ایک مقررہ مدت کا نام ہے۔ مگر اس مدت کی تعیین میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ بعض اسّی برس کی مدت کو، بعض ستر برس کی مدت کو، بعض تین سو برس کی مدت کو، بعض چالیس سال، بعض تیس سال ہزار سال کے عرصہ کو کہتے ہیں۔ قتادہؓ کہتے ہیں

احقاب سے غیر منقطع زمانہ مراد ہے۔ باقی حقب کی مدت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ حسن بصریؒ سے بھی اسی کے قریب قریب منقول ہے۔ بقول امام بغویؒ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور بقول ھنا د حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ ایک حقب اسی برس کا ہوگا اور ہر برس بارہ ماہ کا، اور ہر ماہ تیس دن کا، اور ہر دن (اس دنیا کے) ہزار برس کا ہوگا اس حساب سے ایک حقب دو کروڑ اٹھاسی لاکھ برس کا ہوگا۔ مجاہدؒ نے کہا احقاب: تینتالیس حقبہ کا۔ ہر حقبہ ستر خریف کا، ہر خریف سات سو سال کا، ہر سال تین سو ساٹھ دن کا، اور ہر دن (اس دنیا کے) ہزار برس کا ہوگا۔ مقاتل بن حیانؒ کہتے ہیں کہ ایک حقب سترہ ہزار سال کا ہوگا. بردا: ٹھنڈک، زمہریر وفاقا: بمعنی وافق اگر اس کو صیغہ صفت مانا جائے یا بمعنی موافق ہے، اگر اس کو باب مفاعلۃ کا مصدر مانا جائے مجرد میں وفق وفقا (س) موافق پانا، موافق ہونا۔

ترکیب:

انّ اپنے اسم یوم الفصل اور خبر کان میقاتا (جملہ فعلیہ) سے ملکر جملہ۔ یوم اپنے مضاف الیہ ینفخ فی الصور (جملہ فعلیہ) سے ملکر یوم الفصل سے بدل فی الصور متعلق فعل ہے یا اسکا نائب فاعل۔ فتأتون میں فاء فصیحیۃ ہے جو اس جملہ کو ظاہر کررہی ہے جس کو دلالت حال کی وجہ سے اور انتہائی سرعت اتیان بیان کرنے کے لئے حذف کیا گیا۔ ای فتخرجون من القبور فتاتون...... افواجا ضمیر تاتون سے حال ہے وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ: جملہ فعلیہ یُنْفَخُ پر عطف ہے وصیغۃ الماضی للدلالۃ علی التحقیق ردا علی الفلاسفۃ القائلین بامتناع الخرق والالتیام فی السمٰوٰت. فکانت: میں فاء تعقیبیۃ ہے۔ اور جملہ کا عطف ماسبق پر ہے۔ اسی طرح وسُیِّرَتْ سے سرابا تک کی ترکیب ہے۔ انّ جھنم کی ترکیب اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کی طرح ہے. للطّٰغین متعلق محذوف ہوکر یا تو مِرْصَادًا (جو خبر کانت ہے) کی صفت ہے یا مَاٰبًا سے حال ہے قدمت علیہ لکونہ نکرۃً۔ اور مَاٰبًا بدل ہے مرصادا سے۔ لٰبِثِیْنَ حال مقدرہ ہے للطغین کی ضمیر سے۔ فیھا، لبثین کے متعلق اور احقابا لبثین کا ظرف ہے اور لایذوقون کا بھی ہو سکتا ہے جو رعایت فواصل کی وجہ سے مقدم کردیا گیا۔ لایذوقون: فعل ضمیر فاعل فیھا متعلق بردا و لا شرابا معطوفین مفعول بہ، اس میں لا ثانی زائد برائے تاکید ہے۔ جملہ فعلیہ لبثین کی ضمیر سے حال ہے، بشرطیکہ احقابا اس کا ظرف ہو، لیکن اگر اس کو حال مانیں تو یہ جملہ ماقبل کی تفسیر ہوگا۔ الا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا: مفعول بہ سے مستثنیٰ منقطع ہے، کیونکہ یہ مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہیں ہے۔ جَزَآءً وِفَاقًا: مرکب توصیفی مفعول مطلق فعل محذوف یُجْزَوْنَ کا اور جملہ فعلیہ لَایَذُوْقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہوگا۔ آگے دونوں جملوں کی ترکیب ظاہر ہے۔ وکل شیءٍ میں مَا اُضْمِرَ عَامِلُہٗ عَلٰی شَرِیْطَۃِ التَّفْسِیْرِ والی ترکیب ہے۔ الا عذابا: استثنائے مفرغ ہے۔ باقی ترکیب آسان ہے۔

تفسیر:

جب مناظر قدرت وصنعت اور انعامات ربانی کے ذکر سے یہ ثابت ہوگیا کہ جس قادر مطلق نے ابتداءً اس کائنات ہست وبود کو وجود عطاء فرمایا ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ نیز مناظر سے اس قادر وقیوم کی حکمت کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے کوئی چیز بے فائدہ پیدا نہیں کی۔ لامحالہ ان انعامات سے فائدہ اٹھانے والوں سے حساب کتاب اور باز پرس ہونی چاہئے۔ اس مقام پر سننے اور غور کرنیوالوں کے دل میں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ باز پرس اور فیصلہ کا دن

اوراسکی تفصیل معلوم کریں۔اس لئے گذشتہ کلام سے پیدا ہونیوالے اس سوال کے جواب میں فرمایا:

ان یوم الفصل ......یعنی فیصلہ کا ایک مقررہ وقت ہے جس پر عالم ختم ہو جائیگا، پھراس کے لئے چند چیزیں ضروری ہیں: (۱) اس کارخانۂ عالم کا ختم ہونا، کیونکہ فیصلہ کا مقام، جرم کے مقام سے جدا ہوتا ہے۔ (۲) ان انعامات کا فنا ہونا جن سے برے بھلے سب فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ انعامات ہی کی باز پرس ہوگی، اوران کی شکر گذاری وناشکری پر ہی سزا وجزا کا مدار ہوگا۔ (۳) روحوں کا دوسری مرتبہ اپنے جسموں سے تعلق، کیونکہ اس کے بغیر سزاء وجزاء کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ (۴) یہ سب اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک اس عالم دنیا میں آنیوالی سب روحیں نہ آ چکیں۔لہٰذا حساب وکتاب سزاء وجزاء کا ایک وقت مقرر کیا گیا ہے جس کا علم صرف احکم الحاکمین کو ہے۔تمہیں جلدی کرنے اور فوری مطالبہ کرنے کا حق نہیں، بلکہ یہ مطالبہ خلاف عقل اور ناحق ہے۔ہاں قیامت کا آنا تقاضائے عقل ہے، نیز مذکورہ نو دلائل سے عالم کا حادث ہونا ثابت ہو ہی چکا ہے اور تمام اہل عقل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر حادث کی انتہاء اور حد ہوتی ہے۔یہ عالم حادث ایک دن اپنی حد کو پہنچ جائیگا۔اوراس دنیا کی انتہائی حد ہی قیامت ہے۔**یوم ینفخ** ......جس دن صور پھونکا جائیگا۔دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ صور دوبار ہوگا: پہلا فنائے عالم کے لئے، دوسرا احیاء وبعث کیلئے۔اسکی تفصیل سورۂ ''الحآقۃ'' میں گذر چکی۔یہاں پر نفخۂ ثانیہ مراد ہے۔اس وقت تمام مردے زندہ ہوکر جوق در جوق بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونگے۔

محشر کی طرف سفر:

○حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ قیامت کے دن تین جماعتوں میں تقسیم ہونگے: ایک وہ لوگ ہونگے جو پیٹ بھرے، لباس پہنے ہوئے، سواریوں پر سوار ہوکر میدان حشر میں آئیں گے۔دوسری جماعت پیادہ لوگوں کی ہوگی، جو پیدل چل کر میدان حشر میں پہنچیں گے۔تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جن کو چہروں کے بل گھسیٹ کر محشر میں لایا جائیگا۔حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت **یوم ینفخ فی الصور** تلاوت کرنے کے بعد فرمایا: (۱) حشر کے وقت میری امت کے دس گروہ ہونگے۔ایک صف کی صورتیں بندروں جیسی ہونگی، یہ قدریہ ہونگے۔ایک قطار سوروں کی شکل (۴) ایک صف کی صورت گدھوں کی طرح ہوگی یہ رافضی ہونگے۔(۵) ایک گروہ کی شکل چھوٹی چیونٹیوں کے مثل ہوگی، یہ متکبروں کا گروہ ہوگا۔(۶) ایک جماعت چوپاؤں کی صورت پر ہوگی، یہ لوگ سود خور ہونگے۔(۷) ایک گروہ درندوں کی صورت کا ہوگا، یہ زندیق ہونگے۔(۸) ایک گروہ کا حشر منہ کے بل ہوگا، یہ مصور (فوٹو گرافر) اور دوسروں کی عیب جوئی کرنیوالے اور دوسروں پر طنز وطعن کرنیوالے ہوں گے۔(۹) ایک جماعت نازوادا سے ٹہلنے والوں کی ہوگی۔(۱۰) یہ لوگ مقرّب ہونگے، ایک جماعت شکم سیر ہوگی، یہ اصحاب الیمین ہونگے۔ابن عساکر نے اس حدیث کو بیان کرکے لکھا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔اسکے بعض رواۃ مجہول ہیں۔

خطیب نے (السراج المنیر میں) یہ حدیث اس طرح نقل کی ہے کہ میری امت کی دس اصناف کا حشر دس گروہوں کی صورت میں ہوگا۔(۱) بعض کی صورتیں بندروں جیسی ہوں گی۔یہ چغل خور ہونگے۔(۲) بعض سوروں کی شکل کے ہوں گے یہ حرام خور ہونگے۔(۳) بعض سرنگوں ہونگے ٹانگیں اوپر، چہرے اور آنکھیں نیچے، ان کو اسی طرح گھسیٹا جائیگا، یہ سود خور ہوں گے۔(۴) کچھ نابینا ہونگے جو ادھر ادھر سرگرداں پھرینگے، یہ وہ لوگ ہونگے جو فیصلہ میں ظلم کرتے تھے۔(۵) بعض

گونگے، بہرے بے عقل ہونگے، یہ وہ لوگ ہونگے جو اپنے اعمال پر مغرور تھے (۶) بعض لوگوں کی زبانیں ان کے سینوں پر لٹکتی ہونگی اور انکے منہ سے لہو پیپ بہتا ہوگا، جس سے مجمع میں تعفن پیدا ہوگا یہ وہ علماء واعظین ہونگے جن کا کردار گفتار کے خلاف تھا۔(۷) بعض لوگوں کے ہاتھ پیر کٹے ہونگے، یہ پڑوسیوں کو دکھ دینے والے لوگ ہونگے۔(۸) بعض لوگوں کو آگ کے تختوں پر پھانسی دی جائیگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو حاکم سے جا کر لوگوں کی چغلیاں کھاتے تھے۔(۹) بعض لوگوں کی بدبو مردار سے زیادہ ہوگی، یہ وہ لوگ تھے جونفسانی خواہشات اور دینوانی لذات میں اس طرح مگن رہتے تھے کہ اللہ کے (مالی) حق کو اپنے مالوں کیساتھ روکے رکھتے تھے، یعنی زکوۃ وعشر وغیرہ ادانہیں کرتے تھے۔(۱۰) بعض لوگوں کو تارکول کی لمبی چادر پہنائی جائیگی، یہ رعونت وفخر، غرور کرنیوالے ہوں گے۔حضرت براء بن عاذب نے بھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔جس کو ثعلبی نے نقل کیا ہے۔(مظہری) بعض حضرات نے فرمایا کہ حاضرین محشر کی بے شمار جماعتیں اپنے اپنے اعمال وکردار کے اعتبار سے ہوں گی۔ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں۔سب جمع ہو سکتے ہیں۔

فائدہ:......ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں بعض فرقوں کے نام آئے ہیں، ہم ان کی مجمل خصوصیات بیان کرتے ہیں: اول فرقہ قدریہ ہے: جو اپنے اعمال کا خالق خود انسان کو بتاتا ہے۔خدا کو خالقِ افعال نہیں جانتا۔دوسرا فرقہ مرجئہ ہے: یہ گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ایمان کے بعد نہ تو اعمال کی ضرورت ہے، نہ کسی گناہ سے کوئی نقصان۔تمام ممنوعات تصدیق قلبی کی موجودگی میں معاف ہیں۔گویا ان کے نزدیک اعمال کی کوئی اہمیت نہیں، بنیادی عقیدہ کی درستگی ضروری اور کافی ہے، اس کے بعد آدمی خدائی سانڈ ہے جو چاہے کرتا پھرے، بہرحال وہ جنتی ہے۔تیسرا فرقہ حروریہ ہے: یہ خارجیوں کا ایک گروہ تھا مقام حروراء میں جنہوں نے لشکر کشی کی تھی۔اس گروہ کے نزدیک اعمال ایمان کے اجزائے تقویمی ہیں۔گناہ کا مرتکب انکے نزدیک کافر ہو جاتا ہے۔یہ بدنصیب لوگ حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کو کافر کہتے تھے۔اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے۔چوتھا فرقہ رافضیہ ہے اس گروہ کا مسلک خارجیہ کے برخلاف ہے۔ان کے نزدیک صدیق اکبر وعمر فاروق رضی اللہ عنہما بلکہ چند صحابہ کو چھوڑ کر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ایماندار نہ تھے۔ان کا خیال ہے کہ خلافت جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا شیخین رضی اللہ عنہما نے اس کو غصب کر لیا تھا۔انکے نزدیک اجماع حجت نہیں اور خلافت وامامت خداداد چیز ہے۔خدا، پیغمبر، یا امام کے واضح ارشادات وتصریحات پر ہی ان کا مدار ہے۔جس طرح نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح امامت کی تصدیق بھی ضروری ہے وغیرہ۔**وفتحت السمآء** ......یہ احوال قیامت میں سے تیسرا حال ہے کہ آسمان کھولے جائیں گے۔اور اسمیں بکثرت دروازے ہو جائیں گے اسی لئے بطور مبالغہ آسمان ہی کو ابواب قرار دیدیا گیا۔

آسمان کھولے جانے کا مطلب؟

اس بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں: (۱) صور پھونکے جانے سے آسمان میں دراڑیں پڑ جائینگی جن کو دروازوں سے تعبیر کر دیا گیا، کیونکہ جب کوئی مضبوط چھت گرتی ہے تو پہلے دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔(۲) دنیا کو ویران کرنے کے لئے فرشتوں کے لشکروں کے اترنے کے واسطے آسمانوں میں بہت سے دروازے کھولے جائینگے۔یہ دنیا کی اس مضبوط چھت کے جس کو **سَبۡعًا شِدَادًا** سے تعبیر کیا تھا گرنے کا حال تھا۔آگے **وسیرت الجبال** ......سے اس مکان کے فرش کو

اٹھائے جانیکا حال بیان کیا جاتا ہے۔ پہاڑوں کے مختلف حالات جو قرآن میں مذکور ہیں، ان کی تطبیق وترتیب کا ذکر سورۃ معارج میں ہو چکا ہے۔ جب آیت فتاتون افواجا میں تمام لوگوں کا حساب کیلئے محشر میں آنا مذکور ہوا تو سننے والوں کو انکے تفصیلی حالات جاننے کا شوق پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے آئندہ آیات میں سب سے پہلے طاغین (سرکشوں) کا ذکر کیا گیا۔ پھر متقین (فرمانبرداروں) کے انجام کا، کیونکہ تخویف ذہن انسانی پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لئے بشارت پر تخویف کو مقدم فرمایا گیا۔ ان جھنم کانت ...... مطلب یہ ہے کہ دوزخ کے پل پر عذاب اور رحمت کے فرشتے تاک میں لگے رہیں گے۔ عذاب کے فرشتے کافروں کی گھات میں ہوں گے۔ وہ ان کو پکڑ کر دوزخ میں پھینک دیں گے۔ اور رحمت کے فرشتے مؤمنوں کے انتظار میں ہونگے وہ ان کو بعافیت وحفاظت وہاں سے گزار کر جنت کی طرف لیجائیں گے۔ اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ سب لوگوں کی گزرگاہ ہوگی جیسا کہ آیت ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (پارہ:۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۷۱.) میں یہ مضمون صراحۃً آیا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ جہنم کے پل پر نگراں فرشتوں کی چوکی ہوگی۔ جسکے پاس جنت میں جانے کا پروانہ ہوگا اس کو گزرنے دیا جائیگا جس کے پاس نہ ہوگا اس کو وہیں روک لیا جائیگا۔

دوزخ کے پل پر گذر:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صراط تلوار کی دھار کی طرح بہت تیز (اور باریک) ہوگی اور ملائکہ ایماندار مردوں اور عورتوں کی حفاظت کرتے ہوں گے۔ جبریل میری کمر پکڑے ہونگے۔ اور میں کہتا ہونگا رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ (الصحیح للامام البخاری، کتاب الرقاب، باب الصراط جسر جھنم، ج:۶، ص: ۲۴۰۳، رقم: ۶۲۰۴.) (الٰہی بچا، الٰہی بچا) اور پھسل کر گرنے والے مرد اور عورت بکثرت ہونگے۔ حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ پر پل صراط تلوار کی دھار کی طرح ہوگی۔ اسکے دوطرفہ آنکڑے اور کانٹے ہوں گے۔ جن کے ذریعہ لوگوں کو اچک لیا جائیگا۔ قسم اس ذات کی جسکے قبضے میں میری جان ہے (صرف ایک) آنکڑے سے قبائل مضر و ربیعہ سے بھی زیادہ لوگ پکڑے جائیں گے۔ اور فرشتے اس کے کنارے پر کھڑے کہتے ہونگے، خدایا بچا، خدایا بچا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جہنم کے پل پر سات جگہ لوگوں کو روکا جائیگا۔ پہلی جگہ بندہ سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کی شہادت پوچھی جائیگی۔ اگر اس نے شہادت پوری دی ہوگی تو دوسرے مقام تک گزر جائیگا۔ وہاں اس سے نماز پوچھی جائیگی اس نے نماز بھی ٹھیک ادا کی ہوگی۔ تو تیسرے مقام تک گذر جائے گا۔ وہاں زکوٰۃ کی پرستش ہوگی۔ اگر زکوٰۃ بھی پوری دی ہوگی۔ تو چوتھے مقام تک پہنچ جائیگا۔ وہاں روزوں کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ اگر روزے ٹھیک ادا کئے ہوں گے تو پانچویں مقام تک چلا جائیگا۔ وہاں حج کے متعلق سوال ہوگا۔ اگر حج ٹھیک طور پر ادا کیا ہوگا تو چھٹے مقام تک جانے دیا جائیگا۔ وہاں عمرہ پوچھا جائیگا۔ اگر وہ بھی کر چکا ہوگا تو ساتویں مقام تک پہنچ جائیگا۔ وہاں بندوں کے حقوق کی پوچھ گچھ ہوگی۔ اگر اس مقام سے بھی نکل گیا تو خیر ورنہ کہا جائیگا۔ دیکھو اس کے پاس کچھ نوافل ہیں؟ نوافل سے (فرض) اعمال کو پورا کیا جائیگا۔ جب وہ سب امور سے فارغ ہو جائیگا تو اس کو جنت کی طرف لیجایا جائیگا۔

طغیان کیا ہے؟

طاغین طاغی کی جمع ہے طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں سرکشی، حد سے بڑھ جانا، اور طاغی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سرکشی اور نافرمانی میں حد سے بڑھ جائے۔ اور یہ جبھی ہوسکتا ہے جبکہ وہ ایمان سے نکل جائے اور کفر وانکار پر اس کو پختگی حاصل ہوجائے۔ اس لئے طاغین سے مراد یہاں کفار ہونگے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مسلمانوں کے وہ بدعقیدہ وگمراہ فرقے مراد ہوں جو قرآن وسنت کی حدود سے نکلے ہوئے ہیں۔ اگر چہ انہوں نے صراحۃً کفر کو اختیار نہیں کیا: جیسے روافض، خوارج، معتزلہ وغیرہ۔ صاحب مظہریؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ لبثین فیھا احقابا: وہ شریر وسرکش لوگ دوزخ میں صدیوں اور مدتوں پڑے رہیں گے۔ احقاب کی تحقیق عنوان لغت میں گذر چکی۔ اختلاف روایات کے سبب کسی ایک مدت پر جزم ویقین تو نہیں ہوسکتا مگر اتنی بات بطور قدر مشترک مفہوم ہوتی ہے کہ حقبہ یا حقب بہت ہی زیادہ طویل زمانہ کا نام ہے۔ اسی لئے علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے احقابا کی تفسیر دھوراً متتابعۃً سے کی ہے یعنی پے در پے بہت سے زمانے۔

جہنم کے خلود ودوام پر شبہہ:

احقاب کی مدت کتنی طویل سے طویل قرار دی جائے بہر حال وہ متناہی ومحدود ہوگی، جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس مدت طویلہ کے بعد کفار بھی جہنم سے نکل جائیں گے۔ حالانکہ یہ قرآن مجید کی دوسری واضح اور صریح نصوص کے خلاف ہے جن میں ﴿هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۹) اور ﴿خٰلِدِيْنَ فِيهَآ اَبَدًا﴾ (پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۶۹) کے الفاظ آئے ہیں۔ اور اسی لئے امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ نہ جہنم کبھی فنا ہوگی اور نہ کفار اس سے کبھی نکالے جائیں گے۔ سدیؒ نے حضرت مرۃ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اگر دوزخیوں کو یہ خبر دے دی جائے کہ ان کا قیام جہنم میں دنیا بھر کی کنکریوں کے شمار کے برابر ہوگا تو اس سے ان کو خوشی ہوگی کہ آخر کار یہ کنکریاں اربوں کھربوں کی تعداد میں سہی پھر محدود ومتناہی تو ہیں۔ کبھی نہ کبھی اس عذاب سے چھٹکارا ہوجائیگا۔ اور اگر اہل جنت کو یہی خبر دے دی جائے کہ ان کو دنیا کے سنگریزوں کے شمار کے برابر جنت میں رہنا ہے تو غمگین ہوں گے۔ کہ وہ کتنی ہی دراز مدت ہوجائے بہر حال وہ جنت سے نکال دیئے جائیں گے۔

جواب:...... احقاب لفظ سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ احقاب (مدت طویلہ) کے بعد کفار دوزخ سے نکال دیئے جائیں گے۔ تمام نصوص صریحہ اور اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ مفہوم مخالف غیر معتبر ہوگا، کیونکہ اس آیت میں اس کی تصریح تو ہے نہیں کہ احقاب کے بعد کیا ہوگا صرف یہ ہے کہ مدت احقاب ان کو دوزخ میں رہنا پڑے گا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس مدت کے بعد جہنم فنا ہوجائیگا یا کفار کو اس سے نکال دیا جائیگا۔ اسی لئے حضرت حسن نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اہل جہنم کے لئے جہنم کی کوئی میعاد ومدت مقرر نہیں فرمائی۔ جس کے بعد انکا دوزخ سے نکل جانا سمجھا جائے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب ایک حقبہ زمانہ کا گذر جائیگا تو دوسرا شروع ہوجائیگا۔ اسی طرح دوسرے کے بعد تیسرا، پھر چوتھا یہاں تک کہ ابدالآباد تک یہی سلسلہ رہیگا۔ سعید بن جبیر نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی یہی تفسیر نقل کی ہے کہ احقاب سے وہ زمانہ مراد ہے جس کا انقطاع اور انتہا نہیں، بلکہ ایک حقب کے بعد دوسرا پھر تیسرا یہی سلسلہ ہمیشہ رہیگا۔ پھر یہاں ایک دوسرا احتمال یہ بھی

ہے جس کو ابن کثیر وقرطبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بیان کیا۔ اور صاحب مظہری نے اس کو اختیار کیا ہے: وہ یہ کہ اس آیت میں طاغین سے مراد کفار نہ لئے جائیں، بلکہ وہ اہل توحید مراد ہوں جو عقائد باطلہ کے سبب مسلمانوں کے گمراہ فرقوں میں شمار ہوتے ہیں، جن کو محدثین کی اصطلاح میں اہل اہواء کہا جاتا ہے۔ تو آیات کا یہ حاصل ہوگا کہ ایسے اہل توحید (کلمہ گو) جو عقائد باطلہ کے سبب کفر کی حدود سے جا ملے تھے مگر صریح طور پر کافر نہ ہوئے تھے وہ مدت احقاب جہنم میں رہنے کے بعد بالا آخر کلمہ توحید کی بدولت جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ صاحب مظہری کہتے ہیں کہ میرے اس قول کی تائید بزارؒ کی نقل کردہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم کوئی بھی دوزخ سے نہ نکلے گا تاوقتیکہ مدت احقاب اس میں نہ رہ چکا ہو۔ حقب کچھ اوپر اسی سال کا ہوگا۔ اور ہر سال تمہاری گنتی کے ۳۶۰ دن کا۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ مدت مذکورہ گذرنے کے بعد طاغین دوزخ سے نکل آئیں گے۔ اس لئے ہم اس کو اہل بدعت پر محمول کرتے ہیں۔

مگر ابوحیان نے فرمایا کہ بعد کی آیات ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا﴾ اس احتمال کے منافی ہیں کہ طاغین سے مراد اس جگہ اہل توحید کے گمراہ فرقے ہوں۔ کیونکہ ان آخری آیات میں انکار وتکذیب آیات کی تصریح ہے۔ اسی طرح ابوحیان نے مقاتلؒ کے اس قول کو بھی فاسد قرار دیا ہے کہ یہ بعد والی آیت فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ سے منسوخ ہے کیونکہ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ...... خبر ہے۔ اور خبر میں نسخ کا احتمال ہی نہیں ہوتا۔ یعنی حکم منسوخ ہوتا ہے خبر منسوخ نہیں ہوتی۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں ایک تیسرا احتمال یہ بھی قرار دیا ہے کہ اس آیت کے بعد کا جملہ ﴿لایذوقون فیها بردا ولا شرابا الا حمیما وغساقا﴾ احقابا سے حال ہے۔ اور معنی آیات کے یہ ہیں کہ احقاب کے طویل زمانے تک یہ لوگ نہ ٹھنڈی لذیذ ہوا کا ذائقہ چکھیں گے، نہ کسی کھانے پینے کی چیز کا، سوائے حمیم غساق کے۔ اور ان احقاب کے گذرنے جانے کے بعد شاید وہ مزید شدید ترین عذاب میں مبتلا کردیئے جائیں۔

لیکن میرے خیال ناقص میں تو یہ اشکال خود اس کے بعد والی آیت ہی سے دور ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طاغین مدت دراز تک اقسام وانواع کے عذاب میں گرفتار رہیں گے۔ اس مقام پر ذہن میں جو یہ شبہ پیدا ہوا کہ پھر کیا ہوگا ان کو نکال دیا جائیگا یا کیا ہوگا؟ تو بعد کی آیات نے اس شبہ کو صاف کردیا فذوقوا ...... ای فیقال لهم ذوقوا...... یعنی پھر ان سے یہ کہا جائیگا کہ عذاب چکھتے رہو ہم تمہارا عذاب بڑھاتے رہیں گے۔ اس زیادتی عذاب کی خبر سے عذاب کی تناہی کا شبہ ختم ہوکر خلود کا مفہوم حاصل ہوجاتا ہے۔ اور کسی مزید تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

حمیم اور غساق:

حمیم: بہت ہی گرم پانی۔ حدیث میں ہے کہ لوہے کے چمٹوں سے پکڑ کر سخت گرم پانی دوزخیوں کے سامنے لایا جائیگا۔ جب وہ ان کے منہ کے قریب آئیگا تو چہرے بھن جائیں گے۔ اور پیٹوں میں اترے گا تو پیٹ کی آنتوں کے ٹکڑے اڑادیگا۔ (ترمذی) ﴿يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ﴾ (پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۰) غسّاق: ہنادؒ نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ غساق (انتہائی سرد ہوگا) جسکی سخت ٹھنڈک کیوجہ سے دوزخی اس کو پی نہ سکے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جس طرح آگ گرمی کیوجہ سے جلاتی ہے غساق اپنی سردی کیوجہ سے انکو سوختہ کردیگا۔ مقاتلؒ کہتے ہیں کہ غساق وہ چیز ہے جس کی سردی آخری حد کو پہنچی ہوئی ہو۔ ہنادؒ نے ابوالعالیہ کا قول ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں پینے کی

چیزوں میں گرم ترین پانی کا استثناء ہے۔اور سرد (برد) سے غساق کا۔عطیہؒ وابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں کہ غساق دوزخیوں کا بہتا ہوالہو ہے۔ابن ابی حاتم وابن ابی الدنیاؒ کا قول ہے کہ غساق جہنم میں ایک چشمہ ہے جسمیں سانپ بچھواور ہرزہریلے جانور کا زہر بہہ کر جمع ہوگا۔اور دوزخی کو لاکر اس میں یکبارگی غوطہ دیا جائیگا تو اس کی کھال ہڈیوں سے گر جائیگی۔کھال اور گوشت ٹخنوں پر آکر گریں گے اور وہ ان کو اس طرح کھینچتا پھرے گا جس طرح آدمی اپنے وسیع کپڑے کو کھینچتا ہے۔

بہرحال ان تمام اقوال پر اگر غساق کو سرد چیز قرار دیا جائے تو اس کا استثناء برد سے ہوگا ورنہ حمیم وغساق دونوں کا استثناء شرابا سے ہوگا۔اس صورت میں برد سے مراد برد جہنم ہوگی۔جو حرارت نار سے جدا چیز ہوگی۔مطلب یہ ہوگا کہ ان بدبختوں کو کوئی ٹھنڈک میسر نہ ہوگی نہ ٹھنڈا پانی نہ سرد ہوا۔ٹھنڈا مکان نہ سرد لباس نہ سرد کھانے،نہ بدن کی ٹھنڈک نہ دل کی ٹھنڈک نہ آنکھوں کی ٹھنڈک۔اس لفظ کو عام رکھنا ہی مناسب ہے۔بعض علماء نے برد سے مراد نیند لی ہے۔عرب میں برد کا اطلاق نوم پر بھی ہوتا ہے۔اور شراب سے مراد پانی ہے یعنی ان کو اور تو کیا نعمت ملتی پانی جیسی مفت کی چیز بھی میسر نہ ہوگی۔جو پانی دنیا میں خونی قیدی کو پلایا جاتا ہے وہاں دوزخی کو وہ بھی نصیب نہ ہوگا۔پھر الا حميما وغساقا میں استثناء متصل ہے اور منقطع بھی ہوسکتا ہے۔علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رعایت فواصل کی بنا پر غساقا کو حميما کے بعد ذکر کیا گیا۔واللہ اعلم۔

جزآءً وفاقا یعنی جو سزا ان کو جہنم میں دی جائیگی وہ ان کے باطل عقیدوں اور بداعمالیوں کے مطابق ہوگی۔ اس میں عدل وانصاف کی رو سے قطعاً زیادتی نہ ہوگی۔مقاتلؒ نے اس کا ترجمہ ''سخت عذاب'' کیا ہے جو بدترین جرم شرک وکفر کا بدلہ ہوگا۔اس صورت میں الطاغين سے مراد کفار ہوں گے تو یہ جملہ ان جهنم کی تاکید ہوگا۔کیونکہ اس جملہ میں اسکے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں ہے گویا یہ له على الف درهم اعترافا کے مثل تاکید لنفسہ ہے۔کیونکہ له على الف درهم میں اعتراف کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں۔جسکی لفظ اعترافاً سے تاکید ہورہی ہے۔البتہ اگر الطاغین سے مراد اہل بدعت ہوں۔جیسا کہ صاحب مظہریؒ وغیرہ کا خیال ہے تو جزآءً وفاقا پہلے جملہ کی تاکید نفسی نہ ہوگا بلکہ تاکید لغیرہ قرار پائیگا۔اور اس سے تاسیس (نئے معنی) کا فائدہ حاصل ہوگا۔(والتاسيس خيرمن التاكيدالابعارض اومرجح) مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ اہل بدعت کے عقائد جس قدر حق سے دور ہوں گے اسی کے موافق اس کے عذاب کی نوعیت وکیفیت ہوگی۔یعنی دوزخ میں بعض کا قیام زیادہ ہوگا۔بعض کا کم۔بعض کو شدید عذاب ہوگا۔بعض کو نسبتاً خفیف۔اور یہ قیام وعذاب جہنم زیادہ احقاب اور کم سے کم حقب تک ہوگا۔

انهم كانوا ...... یہ کلام سابق کی علت ہے۔کافروں کو چونکہ حشر وحساب کا یقین ہی نہیں ہوتا۔تو ظاہر ہے کہ اندیشہ بھی کیوں ہونے لگا۔رہے بدعتی تو ان میں سے بعض فرقوں میں یہ (انکار حساب) کی صفت موجود ہے۔جیسے مرجئہ کہ وہ نہ حساب کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ سزا کا۔اور رافضی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شیعہ (متبع) اور دوستوں کو کسی صغیرہ یا کبیرہ گناہ پر عذاب نہ ہوگا۔اور بعض اہل بدعت اگرچہ زبان سے انکار وحساب نہیں کرتے۔مگر عملی طور پر انکار کرتے ہیں،کیونکہ ان کی بے پروائی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حساب کا اندیشہ نہیں ہے۔

وكذبوا باياتنا كذابا...... اور ہماری آیات کو وہ خوب جھٹلاتے تھے۔آیات سے عام معنی مراد لینا بہتر ہے۔خواہ وہ آیات قرآنیہ ہوں،خواہ آیات قدرت ربانیہ ہوں۔اس جملہ میں کفار کی قوت علمیہ ونظریہ کے فساد کا بیان

ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے جملہ میں قوت عملیہ کے فساد کا ذکر تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی زبردست سزا اس زبردست جرم کی ہوگی کہ انہوں نے ان دونوں قوتوں کو خراب اور برباد کر دیا تھا۔ جنکی صلاح واصلاح سے وہ سعادت ابدی حاصل کر سکتے تھے۔ صاحب مظہری فرماتے ہیں کہ تمام بدعتیوں میں یہ (تکذیب کا) وصف موجود ہے۔ چنانچہ رافضی مناقب صحابہ رضی اللہ عنہم کے منکر ہیں۔ اور وہ ان کو مرتد اور منافق قرار دیتے ہیں (نعوذ باللہ) ہاں چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو مستثنیٰ کر لیتے ہیں۔ (اسی طرح دوسرے فرقے بھی کوئی اعمال کی ضرورت کا منکر ہے تو کوئی دین کے مکمل ہونے کا اور کوئی فرقہ تقدیر کا وغیرہ)

فائدہ:...... قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری تفسیر کے موافق آیت سے اہل بدعت کے عذاب پر روشنی پڑتی ہے۔ (جیسا کہ للطاغین کے ذیل میں گذرا) کہ اس کا مصداق قاضی صاحبؒ کے نزدیک اہل بدعت وفرق ضالہ ہیں۔ رہے مسلمان اہل کبائر تو ان کا قیام جہنم کی انتہائی مدت، مدت دنیا کے برابر ہوگی۔ یعنی سات ہزار سال۔ اور ان کو حمیم نہیں پلایا جائیگا۔ اور نہ کسی طرح کا کوئی (رسوا کن اور سنگین) عذاب ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام امتوں کے (مؤمن) اہل کبائر اگر بغیر توبہ کئے مر گئے تو ان میں سے جو لوگ جہنم میں داخل ہونگے ان کی آنکھیں نیلی نہ ہوں گی۔ چہرے کالے نہ ہونگے، شیطانوں کے ساتھ زنجیروں سے ان کو نہ باندھا جائیگا۔ ان کے گلوں میں زنجیروں کے طوق نہ ڈالے جائیں گے۔ ان کو حمیم نہ پلایا جائیگا۔ نہ ان کو قطران کا لباس پہنایا جائیگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اجسام پر دوام جہنم حرام کر دیا ہے۔ اور سجدہ کیوجہ سے ان کے چہروں کو آگ پر حرام کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کو آگ قدموں تک پکڑے گی، بعض کو ایڑیوں تک، بعض کو کمر تک، بعض کو گلے تک۔ غرض بداعمالیوں کے موافق ان کو آگ پہنچے گی۔ بعض سال بھر رہ کر اس سے نکل آئیں گے۔ قیام جہنم کی سب سے لمبی مدت دنیا کی عمر کے برابر ہوگی۔ الحدیث

نوادرالاصول میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کو گرزوں سے نہ مارا جائیگا۔ اور طبقہ جہنم میں نہ پھینکا جائیگا۔ ان میں سے کچھ لوگ ایک ساعت جہنم میں رہ کر نکل آئیں گے۔ کچھ ایک دن رہ کر کچھ سال بھر میں ان کی سب سے لمبی مدت قیام ابتداء سے فنائے دنیا ہوگی۔ اور یہ مدت سات ہزار برس ہوگی۔ بعض مرفوع روایات میں ہے کہ جب اہل کبائر کو دوزخ کی آگ پہنچائی جائے گی تو اللہ تعالیٰ ان پر موت طاری فرما دینگے۔ جب اذن شفاعت اور معافی ہو جائیگی تو انکو زندہ کر دینگے۔ مگر کافروں کا حال اس کے برخلاف ہوگا۔ وہ نہ اس میں جئیں گے نہ مرینگے۔ (مظہری)

وکل شیءٍ أحصینہ کتابا ...... اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر ضبط کر رکھا ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ یا انھم کانوا **لایرجون** ...... کی طرح **جزآء وفاقا** کی علت ہے۔ اور **کتابا** تمیز ہے یا حال۔ اور کتاب (مصدر) بمعنی مکتوب ہے۔ یا مفعول مطلق ہے۔ یعنی ہم نے ان کے ہر عمل کا اس طرح احصاء کر لیا ہے جیسے تحریر احصاء کر لیتی ہے۔ یا **کتابا** فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ معنی یہ ہونگے کہ ہم نے انکے اعمال کا احاطہ کر لیا ہے۔ اور (لوح محفوظ میں یا اعمالناموں میں) لکھ کر رکھ لیا ہے۔ **فذوقوا** ...... اسمیں فاء سببیہ ہے۔ اور بطور التفات الطاغین کو خطاب ہے۔ **فلن نزید کم الا عذابا** ...... (اے سرکشو! ہم تمہارا عذاب بڑھاتے ہی رہے گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دوزخیوں کے حق میں یہ آیت قرآن کریم کی تمام آیات سے زیادہ سخت ہے۔ واللہ اعلم (مظہری)

اِنَّ لِلۡمُتَّقِيۡنَ مَفَازًا(۳۲) حَدَآئِقَ وَاَعۡنَابًا(۳۳) وَّكَوَاعِبَ اَتۡرَابًا(۳۴) وَّكَاۡسًا دِهَاقًا(۳۵)

بیشک اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے کامیابی ہے یعنی باغات اور انگور اور ہم عمر نوجوان عورتیں اور چھلکتا ہوا جام شراب

اِنَّ	لِلۡمُتَّقِيۡنَ	مَفَازًا	حَدَآئِقَ	وَ، اَعۡنَابًا	وَّ، كَوَاعِبَ	اَتۡرَابًا	وَّ، كَاۡسًا	دهاقا
تحقیق	پرہیزگاروں کیلئے	کامیابی	باغات	اور، انگور	اور، نوجوانیں	ہم عمر	اور، پیالے	بھرئے ہوئے

لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا كِذّٰبًا(۳۶) جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا(۳۷)

نہ وہاں پر وہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ جھٹلانا، جو پورا صلہ ہو گا آپکے پروردگار کی طرف سے

لَا، يَسۡمَعُوۡنَ	فِيۡهَا	لَغۡوًا	وَّ، لَا	كِذّٰبًا	جَزَآءً	مِّنۡ	رَّبِّكَ	عَطَآءً	حِسَابًا
نہ، سنیں گے	اسمیں	بیہودہ	اور، نہ	جھٹلانا	بدلہ	سے	تمہارارب	انعام	حساب.

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا الرَّحۡمٰنِ لَا يَمۡلِكُوۡنَ مِنۡهُ خِطَابًا(۳۸)

جو آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا مالک بے حد مہربان ہے کسی کو اس سے بات کرنیکی مجال نہ ہو گی۔

رَّبِّ	السَّمٰوٰتِ	وَالۡاَرۡضِ	وَمَا	بَيۡنَهُمَا	الرَّحۡمٰنِ	لَا	يَمۡلِكُوۡنَ	مِنۡهُ	خِطَابًا
رب	آسمانوں	اور زمین	اور جوا	نکے درمیان ان	بہت مہربان	نہیں	اختیار پائینگے	سے، اس	بات کرنا

يَوۡمَ يَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا(۳۹) لَّا يَتَكَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ

جس دن روح اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہونگے اس کے سوا کوئی بول نہ سکے گا جس کو رحمان اجازت دیدے اور وہ بات بھی ٹھیک کہے۔

يَوۡمَ	يَقُوۡمُ، الرُّوۡحُ	وَالۡمَلٰٓئِكَةُ	صَفًّا	لَا، يَتَكَلَّمُوۡنَ	اِلَّا	مَنۡ	اَذِنَ	لَهُ	الرَّحۡمٰنُ
دن	کھڑی ہوگی، روح	اور فرشتے	صف باندھ کر	نہ، بولینگے	مگر	جس	اجازت دی	واسطے اس	رحمن

وَقَالَ صَوَابًا(۴۰) ذٰلِكَ الۡيَوۡمُ الۡحَقُّ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا(۴۱)

وہ دن برحق ہے پھر جس کا جی چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانہ بنالے۔

وَ	قَالَ	صَوَابًا	ذٰلِكَ	الۡيَوۡمُ	الۡحَقُّ	فَمَنۡ	شَآءَ	اتَّخَذَ	اِلٰى	رَبِّهٖ	مَاٰبًا
اور	کہے گا	اچھا	یہ	دن	برحق	پس جو کوئی	چاہے	پکڑے	طرف	پروردگار اپنے	جگہ پھر جانیکی

اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰكُمۡ عَذَابًا قَرِيۡبًا(۴۲) يَّوۡمَ يَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ يَدٰهُ

ہم نے تم کو ایک نزدیک آنے والے عذاب سے ڈرادیا ہے جس دن ہر شخص ان اعمال کو دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیج دیئے تھے۔

اِنَّا	اَنۡذَرۡنٰكُمۡ	عَذَابًا	قَرِيۡبًا	يَّوۡمَ	يَنۡظُرُ	الۡمَرۡءُ	مَا	قَدَّمَتۡ	يَدٰهُ
تحقیق ہم	ڈرایا تم	عذاب	نزدیک	دن	دیکھ لیگا	ہر مرد	جو کچھ	آگے بھیجا تھا	ہاتھوں اس

وَيَقُوۡلُ الۡكٰفِرُ يٰلَيۡتَنِىۡ كُنۡتُ تُرٰبًا(۴۳)

اور کافر کہے گا کہ اے کاش میں خاک ہو جاتا۔

[illegible]	[illegible]	الۡكٰفِرُ	يٰلَيۡتَنِىۡ	كُنۡتُ	تُرٰبًا
[illegible]	[illegible]	کافر	کاش میں	ہوتا میں	مٹی

لغات:

المتقين: صیغہ جمع مذکر اسم فاعل باب افتعال سے۔ متقی کی اصل موتقی تھی واؤ کو تاء سے بدل کر میں ادغام میں کر دیا متقی ہو گیا۔ مجرد میں وَقٰی یَقِی وِقَایَۃً (ض) آتا ہے جس کے معنی انتہائی احتیاط اور پرہیز کرنے کے ہیں۔ اور شرعاً متقی اس شخص کو کہتے ہیں، جو ایسی چیزوں سے پرہیز کرے جو آخرت میں نقصان دہ ہوں فمعنی التقوی شرعاً التجنب عمّا یضرہ فی الآخر وقولہ درجات ثلثۃ وقد مر تفصیلہ من قبل۔ مفازا: اسم مصدر بمعنی فوز یا ظرف مکان بمعنی مقام فوز۔ (ن) کامیاب ہونا۔ نجات پانا۔ امام راغب فرماتے ہیں فوز کے معنی سلامتی کے ساتھ خیر کو پالینا ہیں۔ علامہ سیوطیؒ و علامہ محلیؒ فرماتے ہیں کہ اسکے معنی انتہائی مقصود کو پالینا ہے۔ حدآیق: حدیقۃ کی جمع وہ باغ جس کے گرد چار دیواری کھینچی گئی ہو۔ باغ کا نام حدیقۃ اس مناسبت سے رکھا گیا کہ وہ اپنی شکل میں حدقۃ یعنی آنکھ کے پتلی کے مشابہ ہے۔ یعنی جس طرح وہ گھری ہوئی بارونق ہوتی ہے۔ اسی طرح حدیقۃ ہوتا ہے حدق حدقا (ض) گھیر لینا۔ اعنابا: عنب کی جمع، انگور۔ ایک دانہ کو عنبۃ کہتے ہیں۔ کواعب کاعب کی جمع نوجوان لڑکیاں جن کے پستان خوب ابھرے آئے ہوں کعب کعوبا و کعوبۃ و کعابۃ (ن ض) ابھرنا (لازم) فتح سے متعدی بھر دینا۔ اترابا جمع ترب کی ہم عمر۔ اس کا استعمال اکثر عورتوں میں ہوتا ہے۔ (س) مٹی لگ جانا محتاج ہونا۔ دِھاقا: بھرا ہوا، چھلکتا ہوا۔ یہ اسم صفت ہے۔ دھق دھقا (ف) بھرنا۔ گرانا وغیرہ۔ لغوا: بیہودہ بات، چڑیوں کی چوں چوں۔ وہ بات جو بے ارادہ منہ سے نکلے۔ (ن س) غلطی کرنا، بغیر سوچے سمجھے بولنا۔ عطآءً: بخشش، انعام، صلہ جمع اعطیۃ و اعطیات اس کی اصل عطاو تھی۔ اہل عرب کا دستور ہے کہ جب الف کے بعد واؤ یا یاء آ جائے تو ان کو ہمزہ بنا لیتے ہیں۔ کیونکہ ہمزہ ان دونوں کی بہ نسبت حرکت کو زیادہ برداشت کرتا ہے۔ نیز واؤ اور یاء پر وقف ثقیل ہوتا ہے۔ عطاءٌ کی مثال ردآءٌ ہے کہ در اصل رداي تھا۔ اسی لئے بعض لوگ تانیث اور تثنیہ میں ان کی واؤ اور یاء کو لوٹا لیتے ہیں۔ عطی عطواً (ن) لینا۔ بلند کرنا۔ باب افعال سے دینا۔ حسابا: مصدر (ن) گننا، شمار کرنا عطآءً حسابا کے معنی جو عطاء کافی ہو۔ بولا جاتا ہے: اَعْطَانِیْ مَا اَحْسَبَنِیْ (یعنی اس نے مجھے اتنا دیا کہ وہ مجھے کافی ہو گیا)

بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی: اَنْ تُعْطِیَہٗ حَتّٰی یَقُوْلَ حَسْبِیْ ہیں یعنی تم کسی کو اتنا دو کہ وہ کہنے لگے بس بس خطابا باب مفاعلہ کا مصدر ہے، کلام، گفتگو۔ خطبۃ (ن) خطبہ دینا خِطبۃ (ن) پیغام نکاح دینا۔ صوابا ٹھیک بات، حق راست درست خطا کی ضد ہے صواب کا استعمال دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک ذات شئی کے لحاظ سے یعنی وہ شئی جو شرعاً و عقلاً قابل تعریف ہو جیسے: تحری العدل صواب، (انصاف کو مدنظر رکھنا ٹھیک ہے۔) الکرم صواب (سخاوت عمدہ ہے) دوسرے ارادہ کرنے والے کے اعتبار سے جبکہ وہ مقصود کو اپنے ارادہ کے مطابق پالے۔ مثلاً اصاب بالسھم جب تیر نشانہ پر لگ جائے وغیرہ (ن) بارش ہونا، اوپر سے اترنا، نشانہ پر لگنا۔ (ض) نشانہ پر لگنا۔ مآبا: یہ مصدر بھی ہے اور اسم زمان و مکان بھی یعنی لوٹنا۔ لوٹنے کا وقت۔ لوٹنے کی جگہ۔ اوبٌ وایابٌ بھی مصدر ہیں۔ (ن) لوٹنا۔ امام راغب کہتے ہیں کہ اوب کسی صاحب ارادہ حیوان کے لوٹنے کو کہتے ہیں۔ اور لفظ رجوع میں ارادہ کو خصوصی دخل نہیں ہے۔ گویا اوب خاص اور رجوع معنوی اعتبار عام ہے۔

ترکیب:

إن: حرف مشبہ بہ فعل للمتقین: متعلق محذوف ہوکر خبر (وقدم للتخصیص) مفازا مبدل منہ حدآئق اپنے معطوفات واعنابا وکواعب اترابا (مرکب توصیفی) وکاسا دھاقا (مرکب توصیفی) سے ملکر بدل اشتمال یا بدل بعض۔ مبدل منہ بدل سے ملکر اسم۔ جملہ اسمیہ۔ لا یسمعون اپنے فاعل ضمیر متعلق فیھا اور مفعول بہ لغوا ولا کذابا (معطوفین) سے ملکر جملہ فعلیہ مستانفہ یا للمتقین سے حال۔ جزآءً فعل محذوف کا مفعول مطلق۔ دونوں جملے جزآءً اور عطاءً، لا یسمعون کی ضمیر سے حال ہوسکتے ہیں۔ حسابا عطآءً کی صفت ہے۔ اور رب السموات والارض وما بینھما (معطوفین) رَبِّکَ سے بدل ہے اور بینھما فعل محذوف کا ظرف ہے۔ اور جملہ ما کا صلہ الرحمن یا تو ربک کی صفت ہے۔ یا رب السمٰوٰت کے لفظ رب کی صفت یا بدل ہے۔ لا یملکون فعل ضمیر فاعل اور متعلق منہ اور مفعول بہ خطابا سے ملکر جملہ فعلیہ الرحمن سے حال لازمہ ہے۔ وفی قراءۃ بر فعھما علی انھا خبران لمبتداء محذوف، ولایملکون حال لازمۃ عامرٌ، فحینئذٍ الوقف المطلق علی "حسابا" وعلی "الرحمن" لاستیناف مابعدھما ولاوقف علی "ومابینھما"، لئلایلزم الانقطاع بین خبری مبتدا مضمر، او "رب السموت" مبتداء "والرحمن" نعت لہ "ولا یملکون" خبرہ او "الرحمن" خبرہ ولا ثان لہ او "الرحمن" مبتداء ثانٍ "ولا یملکون" خبرہ. والجملۃ خبرللاول. وفی قراءۃ بجر "الرب" علی البدلیۃ ورفع "الرحمن" علی الابتداء والخبرما بعدہ اوعلی انہ خبر لمبتداء محذوف وما بعدہ استیناف، اوخبر ثان، اوحال لازمۃ، فحینئذٍ الوقف علی "مابینھما" ولا وقف علی "حسابا" ولا علی "الرحمن" وتوجیھہ ظھرمما سبق فاحفظہ.

یوم مضاف یقوم فعل الروح معطوف علیہ والملٰئکۃ صفا ذوالحال وحال معطوف، معطوفین فاعل جملہ فعلیہ مضاف الیہ۔ مرکب اضافی ظرف لا یملکون فعل مذکور کا (اس صورت میں خطابًا پر وقف نہ ہوگا) یا لا یتکلمون کا ظرف ہے جو اس کے بعد ہے (اس صورت میں خطابًا پر وقف جائز ہے) لایتکلمون فعل ضمیر بارز فاعل الا حرف استثناء من موصولہ اذن فعل لہ متعلق الرحمن فاعل جملہ فعلیہ صلہ۔ موصول وصلہ ملکر ضمیر لا یتکلمون سے بدل البعض ہے یا منصوب باستثناء ہے یا بحسب العامل مرفوع کیونکہ کلام غیر موجب میں ہے۔ اور لا یتکلمون جملہ۔ جملہ لا یملکون سے بدل ہے یا حال ہے الملٰئکۃ سے اور یوم اس صورت میں لا یملکون کا ظرف ہوگا۔ (واظھار الرحمن فی موضع الاضمارفی "اذن لہ الرحمن" للاشعاربأنّ مناط الاذن ھوالرحمۃ البالغۃ) وقال صوابا ای قولا صوابا جملہ معطوف ہے اذن پر یا لہ کی ضمیر مجرد سے حال ہے۔ بتقدیر قد یا بلا تقدیر قد۔ اور قال کی ضمیر کا مرجع من ہے۔ لا یتکلمون ...... کو جملہ مستانفہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ فقیل ما شانہ تعالیٰ فی ذلک الوقت فقال لا یملکون...... ذلک مبتدا الیوم الحق مرکب توصیفی خبر جملہ اسمیہ خبریہ۔ فمن فاء فصیحیہ (تفصح عن شرط محذوف) ای اذا کان الامر کذلک۔

فمن موصولہ متضمن لمعنی الشرط شاء فعل ضمیر فاعل مفعول محذوف ای ان یتخذ الی ربہ مرجعا جملہ صلہ۔ موصول وصلہ مبتدا اتخذ الی ربہ ما با جملہ فعلیہ خبر (بمنزلہ جزا) جملہ اسمیہ ہوا۔ انا حرف مشبہ فعل معہ اسم انذرنا فعل

بافاعل کم مفعول بہ اول عذا با قریبا مرکب توصیفی مفعول بہ ثانی۔ جملہ فعلیہ خبر۔ یوم مضاف ینظر فعل المرء فاعل ما موصولہ قدمت ید اہ فعل فاعل جملہ فعلیہ صلہ۔ موصول وصلہ مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ معطوف علیہ۔ ویقول الکٰفر فعل فاعل یا تنبیہ کیلئے قائم تنبہ کے یا یاء حرف ندا قائم مقام ادعوا یا اطلب کے اور ایہا الحاضرون منادی محذوف لیت حرف مشبہ بہ فعل نون وقایہ ی متکلم اسم کنت ترابا جملہ فعلیہ خبر اور یہ جملہ اسمیہ تنبہ کے مفعول کے قائم مقام ہوا۔ پھر جملہ فعلیہ مقولہ مفعول بہ یقول اپنے فاعل ومفعول بہ سے ملکر معطوف ہوا۔ معطوفین ملکر یوم کا مضاف الیہ۔ یوم ینظر...... یوم یقوم الروح کی طرح عذابا سے بدل اشتمال ہے یا کائنا محذوف کا ظرف ہو کر ثانیہ ہے عذابا کی۔

تفسیر: ربطِ آیات

پچھلی آیات میں طاغین (سرکشوں) کے انجام کا ذکر تھا۔ ان آیات میں متقین (پرہیز گاروں) کا حال بیان کرتے ہیں: وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَآءُ چنانچہ یوم یقوم ...... میں دونوں قسم کے لوگوں کا تقابل وامتیاز مذکور ہے نیز یہ بھی بیان کرنا ہے کہ متقین پر انعامات، طاغین کے عذابوں پر مزید ایک روحانی عذاب بصورت حسرت وحسد مسلط ہوگا۔ چنانچہ آخری آیت میں کافر کی حسرت بھری تمنا کا ذکر ہے۔ (کہ اے کاش میں خاک ہو کر ہی ان ذلت بھری سخت سزاؤں سے نجات پا جاتا)

پرہیزگاروں کا ثواب:

متقیوں کو وہاں پر ہر طرح کی کامیابی حاصل ہوگی روحانی ہو کہ جسمانی، مفازاً کے اطلاق میں تمام انعامات آگئے۔ پھر بھی بندوں کی چند مرغوبات کو خاص طور پر ذکر فرمایا گیا۔ حدائق باغات جو ہر طرف سے محفوظ ہونگے۔ اور ہر قسم کے میووں اور پھلوں سے لدے ہونگے۔ خصوصاً واعنابا انگور بکثرت ہونگے جو غذا کا بھی کام دیتے ہیں اور ان سے شراب بنتی ہے۔ باغ میں انگوروں کی ٹٹیوں کا سایہ بھی ہوتا ہے۔ اور ان سے باغ کی رونق بھی دوبالا ہوتی ہے۔ اور ان لذتوں اور نعمتوں کے باغات میں پری پیکر ہمنشینوں کی صحبت لطف وعیش میں چار چاند لگادے گی۔ وہ ماہ جبیں ہمنشین کون ہونگے؟ وکواعب اترابا ...... نوجوان ونوخیز دوشیزائیں ہوں گی۔ وہ آپس میں ہم عمر ہونگی۔ اور ان کے شوہر جنتی لوگ بھی جواں سال ہوں گے۔ اس عمر کی مناسبت سے ان کی لذتیں کمال کو پہنچ رہی ہوں گی۔ پھر یہ سب کچھ ہو اور دل میں حجاب ہو، ان چونچلوں کیساتھ اچھل کود نہ ہو، تو صحبت و ہمنشینی سوئی ہوئی رہتی ہے، اس لئے اس کا سامان بھی وہاں چھلکتے ہوئے ساغروں کی شکل میں موجود ہوگا۔
وکاسا دھاقا ...... اس فرحت وسرور میں ہمہ وقت تازگی پیدا ہوگی۔ اور یہ وہ شراب محبت الٰہی کی ہوگی، جو ان کو عالم رنگ وبو میں ساقی کوثر کے میخانے سے عطاء ہوئی تھی۔ پھر شراب کے ساتھ اگر وہ خرابیاں بھی ہوں جو دنیا کی شراب سے ہوتی ہیں، بے ہوشی، دردسر، مار پیٹ، بیہودہ بکواس، گالی گلوچ تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے اور سرور باعث شرور بن جاتا ہے۔ اس لئے وہاں کی شراب ان خرابیوں سے پاک ہوگی۔

لایسمعون فیھا لغوا ولا کذابا اس میں اشارہ ہے کہ وہاں کی شراب سے علم وادراک واخلاق پر کوئی برا اثر نہ ہوگا۔ یہاں کی فانی ظلمانی چیزوں پر محض نام کی شرکت کی بنا پر وہاں کی چیزوں کو قیاس کر کے اعتراض کرنا یا استہزا کرنا کج فہمی وبدد ماغی کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ جزآء من ربک ...... پرہیز گاروں کو یہ نعمتیں ان کے اعمال وعقائد ومعارف کے بدلہ میں پروردگار عالم

کی جانب سے عطا ہوں گی۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو یہاں بوئیگا وہی کاٹے گا۔ بغیر تقویٰ ان نعمتوں کی ہوس ایسی
ہے جیسا کہ بغیر شادی کے اولاد کی تمنا۔ من ربک میں اشارہ ہے کہ یہ نعمتیں گو اعمال کی جزا ہوں گی۔ مگر یہ جزا کسی تنگ
دل وکم حوصلہ کی طرف سے نہیں ہوگی، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی طرف سے ہے۔ جسکی بخشش وکرم کے
سمندر رات دن بہتے ہیں۔ اسی لئے آگے فرمایا کہ یہ بدلہ بھی ایسی بھرپور عطائے ربانی ہوگی کہ بندوں کی کوئی تمنا و آرزو اس
کے بعد باقی نہ رہیگی۔ عطآء حسابا ...... صاحب مظہریؒ فرماتے ہیں کہ شاید مطلب اسکا یہ ہے کہ متقیوں کو جو کچھ ملے گا
وہ بظاہر ان کے نیک اعمال کا بدلہ ہوگا، مگر درحقیقت وہ عطاء الٰہی ہوگی۔ کیونکہ انسانی اعمال تو ان نعمتوں کا بدلہ بھی نہیں بن
سکتے جو ان کو دنیا میں دیدی گئی ہیں۔ اُخروی نعمتوں کا حصول تو صرف فضل وانعام خداوندی وعطائے خالص ہوگا۔ جیسا کہ
حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال سے جنت میں نہ جائیگا۔ جب تک کہ حق تعالیٰ کا فضل
نہ ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی اپنے عمل سے جنت میں نہیں
جاسکتا۔ جب تک اللہ تعالیٰ فضل نہ فرمائیں۔ حسابا کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ عطاء کافیا کثیرا یعنی ایسی عطا جو اس
کی تمام ضرورتوں کے لئے کافی، وافی اور کثیر ہو۔ یہ معنی اس محاورہ سے ماخوذ ہیں اَحْسَبْتُ فُلَانًا اَیْ اَعْطَیْتُہٗ مَا یَکْفِیْہِ
حَتّٰی قَالَ حَسْبِیْ یعنی اَحْسَبْتُ کا لفظ اس معنی کے لئے آتا ہے کہ میں نے اس کو اتنا دیا کہ اسکے لئے بالکل کافی ہوگیا یہاں
تک کہ وہ بول اٹھا حَسْبِیْ یعنی بس یہ میرے لئے بہت ہے۔ یہ قول ابن عتبہ کا ہے۔ (۲) دوسرے معنی حساب کے موازنہ
اور مقابلہ کے بھی آتے ہیں۔ حضرت مجاہدؒ نے اس جگہ یہی معنی لیکر مطلب آیت کا یہ قرار دیا ہے کہ یہ عطائے ربانی اہل جنت
پر ان کے اعمال کے حساب سے مبذول ہوگی۔ اور اہل دوزخ کو ان کی بداعمالیوں کے بقدر سزا ملیگی۔ صاحب مظہریؒ
فرماتے ہیں کہ جزا اعمال کے مطابق نہیں، بلکہ اللہ کی مشیت وفضل کے مطابق ملے گی کیونکہ ارشاد ربانی ہے کہ ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ
اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ جس کا حاصل یہ ہے کہ
نیکی کا ثواب سات سو گنا اور اس سے زائد جتنا اللہ جل شانہٗ چاہیں ملے گا اللہ کے خزانے میں کمی نہیں۔ نیز اہل عمل کے اخلاص
اور ان کے مراتب قرب کے اعتبار سے جزا ملے گی، کیونکہ مقربین کو تھوڑے عمل کا بھی اتنا عظیم اجر ملے گا کہ ابرار کو زیادہ عمل کا
بھی اتنا نہ ملے گا۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
میرے صحابہ کو گالیاں نہ دو اگر تم سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا بھی (راہ خدا میں خرچ) کردے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک مدّ
بلکہ آدھے مدّ کی برابر بھی نہ ہوگا۔ (مدّ تقریباً ایک سیر کا ہوتا ہے) یہ فرق اہل قرب میں بھی درجات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔

لا یملکون منه خطابا اس جملہ کا تعلق اگر پہلے جملہ جزآء من ربک عطآء حسابا سے مانا جائے تو معنی یہ
ہونگے کہ حق تعالیٰ جو درجہ ثواب کا عطا فرمائیں گے اس میں کسی کو گفتگو کی مجال نہ ہوگی کہ فلاں کو زیادہ اور فلاں کو کم کیوں دیا
گیا؟ اور اگر اس کو علیحدہ جملہ قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ محشر کو بغیر اجازت حق تعالیٰ خطاب کرنیکا اختیار نہ ہوگا۔ اور یہ
اجازت بعض مواقف حشر میں ہوگی، بعض میں نہ ہوگی۔ کلبی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ بلا اجازت خداوندی کوئی
شفاعت نہ کرسکے گا۔ یوم یقوم الروح والملٰئکة صفا یوم کا تعلق اگر یملکون سے ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس دن
روح اور ملائکہ کا قیام ہوگا اس دن اللہ سے کوئی خطاب نہ کرسکے گا۔ اور اگر لا یتکلمون سے تعلق ہے تو معنی یہ ہونگے کہ
روح اور ملائکہ کے قیام کے دن بغیر اجازت رحمٰن کوئی کلام نہ کرسکے گا۔ اول صورت زیادہ ظاہر ہے۔

روح کیا ہے؟

روح کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں:۔(۱) روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ان کا ذکر عام ملائکہ سے پہلے ان کی عظمت شان ظاہر کرنے کے لئے ہے۔یہ قول حضرت ضحاک کا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام قیامت کے دن اللہ کے سامنے کھڑے ہونگے ،اور خوف خداوندی سے ان کے شانے لرزتے ہونگے اور عرض کرتے ہونگے: آپ پاک ہیں،آپ کے سوا کوئی معبود نہیں،ہم نے اور مشرق سے مغرب تک کسی نے آپ کی عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔

(۲) روح اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان لشکر ہے جو فرشتے نہیں۔ان کے آدمیوں کی طرح ہاتھ اور پاؤں ہیں ان کی ایک صف ہوگی۔اور ایک فرشتوں کی۔ابو صالحؒ، مجاہد، قتادہ کا یہی قول ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت ہے کہ روح اللہ کی فوجوں میں سے ایک فوج ہے۔جو ملائکہ نہیں اس کے سر بھی ہیں اور ہاتھ پاؤں بھی۔پھر آیت **یوم یقوم الروح** تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ ایک صف ان کی ہوگی اور ایک انکی۔

(۳) بغویؒ نے حضرت مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے روح کو اولاد آدم کی شکل پر پیدا کیا ہے۔جو فرشتہ آسمان سے اترتا ہے اس کے ساتھ روح کا ایک شخص ضرور ہوتا ہے۔(۴) حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ روح سے مراد آدمی ہے۔

(۵) مقاتل بن حیان کا قول ہے کہ روح اشرف الملائکہ ہے۔وہ تمام فرشتوں سے زیادہ مقرب بارگاہ خداوندی وصاحب وحی ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ روح ایک ایسا فرشتہ ہے جس کے دس ہزار بازوں ہیں۔اور وہ جسمانیت میں سب فرشتوں سے بڑا ہے۔بغویؒ نے بروایت عطاءؒ اتنا اور نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن تنہا روح ایک صف میں،اور باقی ملائکہ ایک صف میں کھڑے ہونگے۔اور اس کی جسمانیت ان سب کے برابر ہوگی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ روح ایک ایسا فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار منہ ہیں۔ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں۔اور ہر زبان میں ستر ہزار بولیاں ہیں۔اور ان تمام بولیوں میں وہ اللہ پاک کی پاکی بیان کرتا ہے۔ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ روح اللہ کا مقرب ہے۔اللہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔تمام فرشتوں سے بڑا ہے اگر منہ کھول دے تو سارے ملائکہ اس میں سما جائیں۔فرشتے اس کی ہیئت کی وجہ سے اس کی طرف نظر اٹھا کر اوپر نہیں دیکھتے۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ روح چوتھے آسمان پر ہے تمام آسمانوں، پہاڑوں اور فرشتوں سے بڑا ہے۔بغویؒ نے اتنا اور بھی بیان کیا ہے کہ وہ روزانہ بارہ ہزار بار تسبیح (سبحان اللہ) پڑھتا ہے اور اس کی ہر تسبیح سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا فرمادیتے ہیں۔قیامت کے دن روح تنہا ایک صف ہوگا۔ان سب اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ روح سب فرشتوں سے بڑا فرشتہ ہے۔واللہ اعلم۔(مظہری)

(۶) حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ روح اس لطیفہ دراکہ کا نام ہے جو ہر مخلوق کو ملی ہے، آسمان ہو یا زمین، پہاڑ ہو یا درخت، ہوا ہو یا پانی، اسی کو دوسری جگہ ﴿مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (پارہ:۱۸، سورۃالمؤمنون،الآیۃ:۸۸.) سے تعبیر کیا گیا ہے۔اور اسی لطیفہ کی وجہ سے ہر شیٔ اللہ کی تسبیح وعبادت کرتی ہے۔جیسا کہ ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ (پارہ:۱۵ سورۃ الاسراء،الآیۃ:۴۴.) اور ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ (پارہ:۱۸ سورۃالنور،الآیۃ:۴۱.) میں بیان فرمایا گیا ہے در حقیقت وہ ایک ایسا نورانی جوہر ہے۔جو تمام جواہر واعراض سے تعلق رکھتا ہے۔اور اسی وجہ سے ساری بارگاہ

حق میں گواہ بنیں گی اور روز قیامت ہر ایک شئی مناسب شکل پر کھڑی ہوکر بارگاہ الٰہی میں شفاعت کریگی۔ (اس روح کے تعلق کا فرق حیوانات، نباتات وغیرہ میں سورہ ملک میں گذر چکا) اخیر میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مفسرین نے روح کے بارے میں مختلف باتیں کہی ہیں لیکن حق بات یہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم۔

لا یتکلمون الا من اذن له الرحمن وقال صوابا ...... کوئی بھی بول نہیں سکے گا اور نہ کسی کی سفارش کر سکے گا۔ خواہ روح و ملائکہ ہو یا انبیاء علیہم السلام یا ان کے علاوہ جب تک اللہ رب العزت اجازت نہ دیدیں۔ پھر جس کی سفارش کی اجازت ملے گی وہ قاعدہ کے مطابق ہی سفارش کر سکے گا۔ ان کو کسی کافر یا بدعتی کی شفاعت کرنیکی نہ اجازت ہوگی نہ کسی کی مجال ہوگی کہ ان کے بارے میں بارگاہ حق میں کوئی لفظ کہہ سکے۔ بعض لوگوں نے قول صواب کا مصداق ﴿لا اِلٰهَ اِلَّا الله﴾ کو قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کو بولنے اور معذرت کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اور اہل بدعت کو شفاعت کی اجازت نہ ہوگی۔ خصوصاً ان کو جو شفاعت کے منکر ہیں۔ جیسے فرقہ معتزلہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

یوم ینظر المرء ما قدمت یداه ...... یوم سے مراد بظاہر یوم القیامہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنے اعمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیگا۔ خواہ اس طرح کہ نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں آجائیگا اور اس میں اپنے اعمال دیکھ لیگا۔ یا اس طرح کے محشر میں تمام اعمال مجسم اور متشکل ہوکر سامنے آجائیں گے۔ جیسا کہ بعض احادیث سے ثابت ہے احتمال یہ بھی ہے کہ یوم سے مراد موت کا دن ہو اور قبر و برزخ میں اپنے اعمال کو دیکھنا مراد ہو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضور کا ارشاد ہے کہ آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل قبر ہے جس کو اس میں نجات ہوگئی تو بعد والی منزلیں اس پر آسان ہو جاتی ہے۔ اور جو اس میں (عذاب سے) نہ بچا تو بعد والی منزلیں اس سے زیادہ سخت ہوتی ہیں۔ عذاب قبر کے متعلق بہت سی احادیث صحیحہ وارد ہیں۔ قبر کے اندر اچھے اور برے اعمال کا مجسم ہوکر سامنے آنا بھی روایات صحیحہ میں موجود ہے۔

ما قدمت یداه ...... اعمال کی نسبت ہاتھوں کی طرف اس لئے کی ہے کہ اکثر کام ہاتھوں ہی سے سرزد ہوتے ہیں یا ''یداہ'' (ہاتھ) سے بطور کنایہ قدرت وقوت مراد ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قوت نظریہ (اعتقاد) اور قوت عملیہ (اعمال) سے کنایہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مراد اعمال کی دو قوتیں ہوں۔ یعنی نیک عمل کی قوت اور بدعمل کی قوت۔ واللہ اعلم

ویقول الکفر یلتنی ترابا ...... (اور کافر کہے گا کاش میں خاک ہوجاتا) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ قیامت کے دن ساری زمین ایک سطح مستوی (ہموار) ہوجائیگی۔ جسمیں انسان، جنات، زمین پر چلنے والے پالتو جانور اور وحشی جانور سب جمع کر دیئے جائیں گے۔ اور جانوروں میں سے اگر کسی نے دوسرے پر دنیا میں ظلم کیا ہوگا تو اس سے اس کا بدلہ دلوایا جائیگا۔ یہاں تک کہ اگر کسی سینگ والی بکری نے بے سینگ کی بکری کو مارا تھا تو آج اس کا بھی بدلہ دلوایا جائیگا۔ جب اس سے فراغت ہوگی تو سب جانوروں کو حکم ہوگا کہ مٹی ہوجاؤ۔ اسوقت کافر لوگ یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہم بھی جانور ہوتے اور اس وقت مٹی ہوکر حساب کتاب اور جہنم سے بچ جاتے۔ (نعوذ باللہ)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ **الکافر** میں الف لام عہد کا ہے۔ اور اس سے مراد ابلیس ہے، کیونکہ اس نے آدم کی تخلیق خاکی کی تحقیر کی تھی، اور اپنی آتشیں خلقت پر فخر کیا تھا تو قیامت کے دن آدم و اولاد آدم کے ثواب اور استحقاق رحمت کو دیکھ کر اور اپنی بربادی کا مشاہدہ کر کے تمنا کریگا کہ کاش میں خاک ہوجاتا۔ تکبر و غرور اور نافرمانی نہ کرتا۔ (وَالْاَوَّلُ اَصَحُّ)

فائدہ......آدمی کی اصل خاک، غذا، اخلاط اور منی سب کی اصل خاک ہی ہے اور سب چیزیں خاک سے بن کر آخرکار خاک بن جاتی ہیں۔اس لئے صورت انسانیہ سے بھاگنے کے لئے کافر کے ذہن میں خاک کے سوا کچھ نہ ہوگا پھر حیوانات کو خاک ہوتے دیکھے گا تو کافر خاک ہونے ہی کی تمنا کریگا۔اپنی طرف لوٹنا یا اس کی آرزو کرنا ہی تقاضائے فطرت ہے۔چنانچہ پریشان حال مسافر یہ کہتا ہے، کاش میں گھر سے نہ نکلتا یہ نہیں کہتا کہ کاش میں سفر سے پھر جاتا۔اور بلا سے کمال دوری بھی اسی سے معلوم ہوتی ہے۔پھر عذاب وبلا سے دوری اور راحت سے قرب کی آرزو ہے۔اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ قبر میں دفن کرنے میں جسم انسانی کی عزت وراحت ہے۔آگ میں جلانا یا پانی میں بہانا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔واللہ اعلم

تَمَّ تفسیرُ سُوْرَةِ النَّبَأ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْاَرْضِ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْوَرٰى وَآلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَهْلِ التُّقٰى

اللّٰہ اللّٰہ اللّٰہ اللّٰہ اللّٰہ

سُورَةُ النّٰزِعٰتِ

سورۃ النّٰزعٰت مکیہ وھی ست واربعون اٰیۃ وفیھا رکوعان

رکوعات:۲،آیات:۴۶ سورہ نازعات مکہ میں نازل ہوئی اس میں چھیالیس آیات اور دو رکوع ہیں کلمات:۱۸۹،حروف:۷۵۳

ربط و مناسبت:

بظاہر سورۂ نازعات کا ربط سورۂ والمرسلٰت سے زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کی ابتدا بھی پانچ قسموں سے ہوئی اور اس کی ابتداء بھی پانچ قسموں ہی سے ہے۔یاد رکھئے کہ یہ اندازِ ابتدا پورے قرآن مقدس میں صرف پانچ سورتوں: (۱)صافات (۲)ذاریات (۳)مرسلات (۴)نازعات (۴)عادیات کا ہے۔اول میں تین صفات ہیں۔دوسری میں چار اور باقی تینوں میں پانچ پانچ ہیں۔سورۂ عادیات چھوٹی سورت ہے۔پھر اس میں دوصفات صیغہ فعل کے ساتھ مذکور ہیں۔ اس لئے یہ مناسبت میں کم ہے۔لیکن مرسلات و نازعات میں بہت قوی ربط اور ہر طرح مناسبت ہے پھر غور کیا جائے تو سورۂ نبا اور سورہ نازعات میں بھی کلی جزوی طور پر نہایت ربط و مناسبت ہے۔مثلاً سورۂ نبا میں بھی سورۂ مرسلٰت کی طرح احوال قیامت کی شرح و تفصیل تھی، بلکہ سورۂ نبا گویا سورۂ مرسلٰت کی شرح تھی۔سورۂ نبا میں قیامت کے بارے میں کفار کے انکار واستہزاء اور سوال کا جواب مذکور تھا۔اس سورۂ نازعات میں قیامت کے مبادی کو باندازِ قسم بیان فرما کر قیامت اور اس جہان بقا کی اجمالی کیفیت کو ذکر کیا گیا ہے۔مناسبت کی مزید تفصیل فتح العزیز میں دیکھئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم کرنیوالا بہت مہربان ہے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۱) وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا(۲) وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (۳)

قسم ہے ان فرشتوں کی جو سختی سے جان نکالتے اور جو بند کھول دیتے ہیں اور جو تیرتے ہوئے چلتے ہیں

وَ	النّٰزِعٰتِ	غَرْقًا	وَ	النّٰشِطٰتِ	نَشْطًا	وَ	السّٰبِحٰتِ	سَبْحًا
قسم ہے	زور سے کھینچنے والے	ڈوبنا	اور	بند کھولنے والے	بند کھولنا	اور	تیرنے والے	تیرنا

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا (٤) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا(٥) يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (٦)

پھر ان کی جو دوڑ کر آگے بڑھتے ہیں یا پھر ان کی جو ہر معاملہ کا انتظام کرتے ہیں۔قیامت ضرور آئیگی جس دن ہلانے والی ہلا ڈالے گی

فَالسّٰبِقٰتِ	سَبْقًا	فَالْمُدَبِّرٰتِ	اَمْرًا	يَوْمَ	تَرْجُفُ	الرَّاجِفَةُ
پھر (قسم ہے) آگے نکل جانیوالے	آگے نکل جانا	پھر (قسم ہے) تدبیر کرنے والے	کام	دن	کانپے گی	کانپنے والی

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ(٧) قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ(٨) اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ(٩)

جس کے بعد پیچھے آنیوالی آ جائے گی۔ دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی۔

تَتْبَعُهَا	الرَّادِفَةُ	قُلُوْبٌ	يَّوْمَئِذٍ	وَّاجِفَةٌ	اَبْصَارُهَا	خَاشِعَةٌ
پیچھے آئیگی اس	پیچھے آنیوالی	کتنے دل	اس دن	دھڑکنے والے	آنکھیں ان	نیچے ہونے والی

لغات:

النزعت: اسم فاعل جمع مؤنث، النازعة واحد (ض) کھینچنا، نکالنا۔ غرقا: مصدر (س) ڈوبنا، گہرائی کے اندر سے شدت کیساتھ کھینچنا۔ یہاں غرق بمعنی اغراق ہے۔ النشطت: اسم فاعل جمع مؤنث، الناشطة واحد۔ بند کھولنے والے۔ فراءؒ کہتے ہیں کہ نصر سے معنی ہیں گرہ باندھنا۔ اور باب افعال سے گرہ کھولنا۔ اس لحاظ سے الناشطات کے معنی "بند کھولنے والا" درست نہ ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الناشطات کا ترجمہ خوش ہونیوالی روحیں کیا ہے، اس صورت میں الناشطات (سمع) سے ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے، کافروں کی روح کو کھال اور ناخن کی تہہ سے سختی کے ساتھ کھینچنے والے، اس وقت ناشطات باب ضرب سے ہوگا۔ لیکن خلیل بن احمد فراہیدی نے کہا کہ نشط اور انشاط دونوں کے معنی ہیں کسی چیز کو اتنا کھینچنا کہ وہ کھل جائے۔ اسی قول پر مولانا تھانویؒ و مولانا حقانی و دہلویؒ کے ترجمے مبنی ہیں۔ السبحت: اسم فاعل جمع مؤنث (ترنے والیاں) (س) (مر فی المزمل)۔ السبقت: اسم فاعل جمع مؤنث (آگے بڑھنے والیاں) سَبَقَ سَبْقاً (ض) آگے بڑھنا۔ فالمدبرات: اسم فاعل جمع مؤنث (انتظام کرنے والیاں) باب تفعیل سے انجام کو سوچنا۔ انتظام کرنا۔ یہاں بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما فرشتوں کی وہ جماعتیں مراد ہیں جو مجانب اللہ انتظام کائنات پر مامور ہیں۔ ترجف: صیغہ واحد مؤنث غائب (ن) لرزنا، کانپنا۔ الراجفة: صیغہ واحد مؤنث اسم فاعل: کانپنے والی۔ تھرتھرانے والی۔ الرادفة: پیچھے آنے والی۔ واحد مؤنث اسم فاعل ردف ردفاً (ن، س) پیچھے سوار ہونا۔ ردیف ہونا۔ ردیف بننا۔ واجفة: واحد مؤنث اسم فاعل (ض) مضطرب ہونا۔ لرزنا۔ باب افعال سے متعدی۔

ترکیب:

واو قسمیہ جارہ النزعت مجرور أقسم فعل محذوف کے متعلق غرقا اسم قائم مقام اغراقاً مصدر کے جو مفعول مطلق من غیر لفظه ہے جیسے قَعَدتُ جُلُوساً میں مفعول مطلق من غیر لفظه ہے۔ والنشطت نشطا اسی ترکیب سے ماقبل پر عطف ہے۔ اگلے تینوں جملے بھی اسی طرح ہیں۔ البتہ امراً مفعول بہ ہے والفاء فی الاخیرین للدلالة علی ترتیبهما علی ماقبلهما بغیر محله. جواب قسم لَتُبْعَثُنَّ مابعد کے قرینہ کی وجہ سے محذوف ہے۔ یوم مضاف ترجف الراجفة فعل فاعل جملہ فعلیہ، تتبعها الرادفة فعل مفعول بہ (ھا راجع الراجفة کی طرف) اور فاعل سے ملکر جملہ فعلیہ الراجفة سے حال ہے۔ (ویوم القیمة زمان واسع للنفختین فلا اشکال) جملہ یوم کا مضاف الیہ ہوگا۔ اور یوم لتبعثن محذوف جواب قسم کا ظرف ہوگا یا اذکر فعل محذوف کا یا یومئذ واجفة کے متعلق محذوف کا قلوبٌ مبتدا (شَرٌّ أهرَّ ذَاناب) کے قبیل سے ہے، یعنی اس کی تنوین تخصیص یا تعظیم کے لئے ہے، لہٰذا اس نکرہ کا مبتدا بننا صحیح ہے، یومئذٍ بہ ترکیب مشہور واجفة کا ظرف ہے جو خبر ہے قلوب مبتدا کی ابصارها مبتدا خاشعة خبر۔ جملہ اسمیہ۔ (وترک الواو بین الجملتین لکمال الانقطاع) دوسری ترکیب یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قلوب موصوف واجفة اپنے ظرف سے ملکر صفت، مرکب توصیفی مبتدا۔ اور ابصارها خاشعة جملہ خبر ہے۔

تفسیر:

والنزعٰتِ غرقا ......اس سورت کے شروع میں فرشتوں کی چند صفات بیان کر کے ان کی قسم کھائی گئی ہے اور جواب قسم بدلالت حال وقرینہ مابعد محذوف ہے۔فرشتوں کی قسم شاید اس وجہ سے کھائی گئی ہے کہ فرشتے نظام عالم میں دخل رکھتے ہیں اور اپنی اپنی خدمات بجالاتے ہیں۔قیامت میں بھی جبکہ اسباب مادیہ کے رشتے ٹوٹ کر غیر معمولی حالات وواقعات پیش آئیں گے فرشتے وہی کام کرینگے۔فرشتوں کی اس جگہ پانچ صفات بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق انسان کی موت اور نزع روح سے ہے۔اگرچہ مقصود قیامت کی حقانیت کا بیان کرنا ہے مگر اس کا شروع انسان کی موت سے کیا گیا ہے، کیونکہ ہرانسان کی موت ایک نوع قیامت ہے: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ اور قیامت کے اعتقاد ویقین میں اسکا بڑا دخل ہے۔

پہلی صفت:......النزعت غرقا نَازِعَات نَزَعَ سے مشتق ہے،جس کے معنی کسی چیز کو کھینچ کر نکالنے کے ہیں اور غرقاً (بمعنی اغراقا) اس کی تاکید ہے۔پوری قوت وشدت کسی کام میں خرچ کر دینے کے معنی ہیں۔محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ اَغْرَقَ النَّازِعُ فِي الْقَوْسِ (یعنی کمان کھینچنے والے نے اس کے کھینچنے میں اپنی پوری قوت خرچ کر دی) مراد اس سے وہ عذاب کے فرشتے ہیں جو کافر کی روح سختی کے ساتھ نکالتے ہیں۔یہ ضروری نہیں ہے کہ دیکھنے والے کو سختی کا احساس ہو۔اسی لئے بسااوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کافر کی روح بظاہر آسانی سے نکلتی ہے،مگر یہ آسانی ہمارے دیکھنے میں ہے۔جو سختی اس کی روح پر ہورہی ہے اس کو کون دیکھ سکتا ہے وہ تو خود اسی کو معلوم ہے یا اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے ہم کو معلوم ہوسکتا ہے۔اسلئے اس جملہ میں یہ خبر دیدی گئی ہے کہ کفار کی روح کھینچ کر سختی سے نکالی جاتی ہے۔

بغویؒ نے معالم میں لکھا ہے کہ اس آیت میں وہ فرشتے مراد ہیں جو کفار کی روح کو انتہائی سختی سے اس طرح نکالتے ہیں جیسے تیر کمان سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فرشتہ ہر بال اور ناخن سے جان نکالتا ہے پھر چھوڑ دیتا ہے کافروں کے ساتھ اس کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔مقاتلؒ نے کہا کہ ملک الموت اور ان کے معاون فرشتے کافروں کی روحوں کو اس طرح کھینچتے ہیں کہ جیسے شاخدار آنکڑا دھنی ہوئی اور بھیگی ہوئی اون سے کھینچا جاتا ہے۔سدیؒ کہتے ہیں کہ نازعات سے مراد سینہ میں ڈوبی ہوئی سانسیں ہیں۔حسنؒ وقتادہؒ اور ابن کیسانؒ کے نزدیک ستارے مراد ہیں۔جو ایک افق سے نکل کر دوسرے افق میں ڈوبتے ہیں۔عطاؒ وعکرمہؒ نے کہا کھینچی ہوئی کمانیں مراد ہیں۔بعض لوگوں نے کہا کہ تیراندازوں کی جماعتیں مراد ہیں۔لیکن عام مفسرین نے اس سے ملائکہ ہی مراد لئے ہیں۔اور یہی قول زیادہ صحیح اور قوی ہے۔واللہ اعلم

دوسری صفت:...... والنشطت نشطا یہ نَشَطَ سے ہے،جس کے معنی بندھن کھول دینے کے ہیں۔جس چیز میں پانی ہوا وغیرہ بھرے ہوئے ہوں اس کا بندھن کھول دینے سے وہ پانی وغیرہ آسانی سے نکل جاتا ہے۔اس میں مومن کی روح نکلنے کو بندھن کھول دینے سے تشبیہ دے کر بتایا ہے کہ جو فرشتے مومن کی روح قبض کرنے پر مقرر ہیں وہ آسانی سے اس کو قبض کرتے ہیں سختی نہیں کرتے۔یہاں بھی روحانی آسانی مراد ہے جسمانی نہیں، اس لئے کسی نیک آدمی کی روح دیر سے نکلنے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس پر واقعتاً سختی ہورہی ہے، اگرچہ جسم پر سختی کے آثار نظر آتے ہیں۔اصل وجہ یہ ہے کہ نزع روح کے وقت ہی سے برزخ کا عذاب کافر کے سامنے آجاتا ہے، جس سے اسکی روح گھبرا کر بدن میں چھپنا چاہتی ہے فرشتے کھینچ کر نکالتے ہیں۔اور مومن کی روح کے سامنے عالم برزخ کا ثواب نعمتیں اور بشارتیں آتی ہیں۔تو اس کی روح ان کی طرف راغب اور متوجہ ہوجاتی ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب مومن دنیا سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ کی حالت میں ہوتا ہے تو آفتاب جیسے روشن چہرے والے فرشتے جنت سے کفن اور بہشتی خوشبوئیں لیکر آتے ہیں۔ اور تا حد نظر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ملک الموت اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ اللہ کی مغفرت، اور خوشنودی کی طرف نکل کر چل۔ فوراً جان اس طرح بہہ کر باہر آجاتی ہے جیسے مشکیزہ سے پانی کا قطرہ، (ملک الموت) اس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔ مگر وہ ملائکہ لمحہ بھر اس نفس کو ملک الموت کے پاس نہیں چھوڑتے۔ اور خود اپنے قبضے میں لے کر جنتی کفن اور بہشتی خوشبو میں رکھ دیتے ہیں۔ اور اس سے پاکیزہ ترین وبہترین مشک کی خوشبو نکلتی ہے۔ الحدیث اور کافر بندہ جب دنیا سے قطع تعلق کی حالت میں ہوتا ہے تو آسمان سے سیاہ فرشتے بدبودار ٹاٹ لے کر آتے اور تا حد نظر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، اے نفس خبیث، اللہ کے غضب کی طرف نکل کر چل، جان بدن کے اندر دوڑتی پھرتی ہے۔ مگر ملک الموت اس کو اس طرح کھینچ کر نکالتے ہیں کہ جیسے خاردار تار ، تر اون سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے آخر وہ اس کو پکڑ کر نکال لیتے ہیں۔ پھر ملائکہ لمحہ بھر تاخیر کئے بغیر لے لیتے ہیں۔ اور ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں اور اس سے مردار جیسی بدبو نکلتی ہے دوسری روایت یہ ہے کہ ملک الموت کافر کی جان کو رگوں سمیت کھینچتے ہیں۔ (رواہ احمد)

تیسری صفت:...... والسبحت سبحا سَبْحٌ کے معنی تیرنے کے آتے ہیں اس جگہ تیزی سے چلنا مراد ہے جیسے دریا میں تیرنے والا یا کشتی وغیرہ چلنے والا سیدھا اپنی منزل مقصود کی طرف تیزی سے جاتا ہے اسی طرح ملائکہ موت بھی انسان کی روح قبض کر کے تیزی سے اس کو آسمان کی طرف لیجاتے ہیں۔

چوتھی صفت:...... فالسبقت سبقا پھر سبقت کرنیوالے فرشتوں کی قسم۔ مطلب یہ ہے کہ جو روح فرشتوں کے قبضہ میں ہے۔ وہ اس کو لیکر اچھے یا برے ٹھکانے پر تیزی سے پہنچتے ہیں۔ مؤمن کی روح کو جنت کی ہواؤں اور نعمتوں کی جگہ میں اور کافر کی روح کو دوزخ کی ہواؤں اور عذابوں کی جگہ میں پہنچا دیتے ہیں۔

پانچویں صفت:...... فالمدبرت امرا پھر امرِ الٰہی کا انتظام کرنیوالوں کی قسم۔ یعنی ان ملائکہ موت کا آخری کام یہ ہوگا کہ جس روح کو ثواب وراحت کا حکم ہوگا اس کے لئے راحت کا سامان جمع کر دیں۔ اور جس کو عذاب اور تکلیف میں ڈالنے کا حکم ہوگا اس کے لئے اس کا انتظام کر دیں۔

قبر و ثواب و عذاب: موت کے وقت فرشتوں کا آنا اور انسان کی روح قبض کر کے آسمان کی طرف لیجانا، پھر اس کے اچھے برے ٹھکانے پر جلدی سے پہنچا دینا اور وہاں ثواب یا عذاب، راحت یا تکلیف کے انتظامات کرنا۔ ان مذکورہ آیات سے ثابت ہو گیا کہ یہ عذاب وثواب قبر یعنی برزخ میں ہوگا۔ حشر کا عذاب وثواب اسکے بعد ہوگا۔ احادیث صحیحہ میں اس کی بڑی تفصیلات مذکور ہیں۔

روح اور نفس کے متعلق صاحب مظہری کی ایک مفید تحقیق:

قاضی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نفس انسانی ایک جسم لطیف ہے جو اس کے جسم کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے۔ اور وہ انہیں مادی عناصر اربعہ سے بنا ہے۔ فلاسفہ اور اطباء اسی کو روح کہتے ہیں، مگر در حقیقت روح انسانی ایک جوہر مجرد اور لطیفہ ربانی ہے جو نفس کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہے اور نفس کی حیات خود اس لطیفہ ربانی پر موقوف ہے۔ گویا اس کو روح الروح کہہ سکتے ہیں، کیونکہ جسم کی زندگی نفس سے ہے۔ اور نفس کی زندگی اس روح سے وابستہ ہے اس روح مجرد و لطیفہٴ ربانی کا تعلق

اس جسم لطیف (نفس) کیساتھ کس طرح کا ہے؟ اس کی حقیقت کا علم اللہ سوا کسی کو نہیں۔ اس جسم لطیف (نفس) کو اللہ تعالیٰ نے اس آئینہ کی طرح بنایا ہے جو آفتاب کے سامنے رکھدیا گیا ہو تو آفتاب کی روشنی اس میں ایسی آجاتی ہے کہ وہ آفتاب کی طرح چمک جاتا ہے نفس انسانی اگر علم نبویؐ کے مطابق محنت کر لیتا ہے تو وہ بھی منور ہو جاتا ہے ورنہ وہ جسم کثیف کے اثرات سے ملوث رہتا ہے یہی وہ جسم لطیفہ (نفس) ہے جس کو فرشتے اوپر لیجاتے ہیں۔ پھر اگر وہ منور ہے تو اعزاز کے ساتھ نیچے لاتے ہیں۔ ورنہ اس کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھلتے اور وہ اوپر سے نیچے پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر روح مجرد کا تعلق اسی جسم لطیف کے واسطہ سے جسم انسانی سے ہوتا ہے۔ اس جسم لطیف پر موت طاری نہیں ہوتی۔ قبر کا عذاب وثواب بھی اسی جسم لطیف (نفس) سے وابستہ ہے۔ اس نفس کا تعلق قبر سے ہی رہتا ہے۔ اور روح مجرد علیین میں ہوتی ہے۔ روح مجرد بواسطہ نفس عذاب وثواب قبر سے متاثر ہوتی ہے۔ الحاصل روح طبعی (نفس) کا مسکن قبر اور عالم برزخ ہے۔ اور لطیفہ ربانیہ (روح مجرد) کا مستقر علیین ہے۔ اس تقریر سے اس سلسلہ کی تمام روایات مختلفہ میں تطبیق ہو جائیگی۔ (وھذا التحقیق مفید للاساتذۃ)

درجات کمال یا صفات کمالیہ:

پچھلی سورت میں فتاتون افواجا ...... (تم گروہ گروہ حاضر ہو گے) میں نفس انسانی کے پانچ مرتبوں کی طرف مجمل اشارہ تھا۔ یہاں اس سورت کے شروع میں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر ان پانچ صفات یا مراتب کی طرف اشارہ کر دیا۔ جن کے سبب انسان خیر اور شر کے مراتب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہو کر الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ اور وہ گروہ گروہ بارگاہ خداوندی میں حاضر ہونگے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب کسی (غیر، شر، دینوی، دینی، علمی، عملی) کمال کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ پانچ مرتبوں کو طے کر کے حد کمال کو پہنچتا ہے۔ ان مذکورہ پانچ صفات میں انہیں پانچ مراتب کمال کی طرف اشارہ ہے

پہلا مرتبہ: طالب موانع سے اپنے آپکو دور کرے۔ یعنی مقصود کے حاصل کرنے میں جو چیزیں رکاوٹیں بنتی ہیں خود کو ان سے جدا کر لے۔ اس کو حضرت صوفیاء مجاہدہ کہتے ہیں۔ والنازعٰت...... میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا مرتبہ: طالب کا اتنی مشقت وریاضت اٹھانا جس سے مقصود کیساتھ ایک خاص دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اور نفس میں مطلوب سے ایک خاص تعلق ورغبت اور اس کے حصول میں سرور وفرحت ہونے لگے۔ اس حالت کو نشاط (امنگ) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اہل سلوک کے یہاں اس مرتبہ کا نام شوق وذوق ہے۔ راہ مشکل کشائی اسی صفت پر موقوف ہے، لیکن یہ صفت پہلی صفت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، بلکہ مجاہدہ کی تکمیل کے بعد اس صفت تک رسائی ہوتی ہے والنّٰشطٰت...... میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

تیسرا مرتبہ: مرتبہ شوق کی تکمیل سے نفس میں شغل مطلوب کی مہارت تامہ اور ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے یعنی وہ کام بے تکلف وبلا مشقت ہونے لگتا ہے، جیسے تیرنے والا بے تکلف پانی پر تیرتا ہے اسی طرح وہ اس شغل میں بے تکلف شناوری کرتا ہے۔ اہل اللہ اس مرتبہ کو سیر احوال ومقامات سے تعبیر کرتے ہیں نو السّٰبِحٰتِ میں اسی کا بیان ہے اور یہیں سے میدان کمال کی ابتداء ہے۔

چوتھا مرتبہ: سیر میں اپنے ہم عصروں سے آگے بڑھ جائے اس لائن میں جو اوروں سے نہ ہو سکے یہ کر گذرے۔ اور یہ اعلیٰ کمال کا مرتبہ ہے جو مسابقت سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرف والسّٰبِقٰتِ...... میں اشارہ ہے اس حالت کو سبقت اور اہل معرفت کی اصطلاح میں طیران اور عروج کہتے ہیں۔

پانچواں مرتبہ: تمام مراتب مذکورہ حاصل ہونے کے بعد انسان اپنی لائن میں کامل ہو کر دوسروں کی تکمیل میں لگ

جائے۔اور دوسروں کا مقتدا، پیشوا، استاذ اور مرشد بن جائے۔اور اس لائن کے طالبین اس سے رجوع کرنے لگیں۔فقراء وصوفیہ کے یہاں اس مرتبہ کو رجوع، نزول اور دعوۃ الخلق الی الحق کہتے ہیں اس مرتبہ تکمیل وارشاد کو فالمدبرٰت ...... میں بیان کیا گیا ہے۔الحاصل ہر کام میں خواہ وہ نیک ہو یا بد، خیر ہو یا شر ان مراتب کو طے کر کے تفوق حاصل ہوتا ہے' خیر کا طالب ان مرتبوں کو طے کر کے مرجع خلائق و مرشدِ عالم بن جاتا ہے اور شر کو اختیار کرنے والا اشریروں کا پیشوا بن جاتا ہے۔

دوسری تفسیریں:

آیات مذکورہ کی سلف سے دوسری تفسیریں بھی منقول ہیں۔مثلاً (۱) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اوصاف مذکورہ ستاروں کے ہیں۔اول وصف طلوع وغروب کے اعتبار سے، دوسرا چمک دمک کے اور روشنی کے اعتبار سے، تیسرا ان کی چال کے اعتبار سے جیسا کہ ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ﴾ (پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۴۰) میں فرمایا گیا ہے چوتھا ان کی تیز رفتاری کے اعتبار سے، پانچواں ان کی تاثیر کے اعتبار سے۔ستارے اور ان کا طلوع وغروب قدرت خداوندی اور امکان بعث وقیامت پر ایک روشن دلیل ہے۔(۲) بعض مفسرین نے اخیر کا وصف ملائکہ کا قرار دیا ہے۔باقی چار ستاروں کے۔وہ کہتے ہیں کہ تدبیر کی نسبت ستاروں کی طرف مناسب نہیں، لیکن ستاروں کے مدبرات ہونے کی یہ توجیہہ ہوسکتی ہے کہ حرارت وبرودت اور شعاع وضیاء کے اعتبار سے ان کی تاثیرات زمین پر پڑتی ہیں۔اس اعتبار سے تدبیر کی نسبت ان کی طرف کردی گئی ہے مگر یہ توجیہ ضعیف ہے۔ (۳) بعض لوگوں نے پانچوں کلمات سے مراد ارواح لی ہیں۔پہلی صفت ارواح ظلمانی کی ہے، کہ فراق جسم میں نزع شدید ہوتا ہے۔دوسری صفت سے ارواح نورانی مراد ہیں۔پھر اگلی دونوں صفتوں میں عالم بالا کی سیر کو بیان کیا گیا ہے۔اور اخیر کی صفت انبیاء واولیا کی روحوں کی ہے کہ اس عالم بالا میں وہ مدبر ومربی ہیں۔چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں آگے جاتا ہوں تمہارے لئے تیاریاں کرونگا۔حضرت ابراہیمؑ اہل ایمان کے بچوں کے مربی ہیں۔دوسرے مؤمنین کی ارواح اس عالم میں جزوی تدابیر انجام دیتی ہیں۔(۴) بعض کہتے ہیں کہ پانچوں صفات غازیوں کے گھوڑوں کی ہیں۔ان کی رفتار کے اقسام اور فتح وظفر کیطرف اشارہ ہے۔(۵) ابومسلم اصفہانی کہتے ہیں کہ پانچوں صفات غازیوں کی صفات ہیں۔نازعات غازیوں کے ہاتھ ہیں ناشطات سے مراد ان کے تیروکمان ہیں۔سابحات سے گھوڑے۔سابقات ان کا حملہ آور ہونا۔مدبرات سے مراد فتح کی تدبیریں وغیرہ ہیں۔ لیکن تفسیر اول صحیح اور مختار جمہور ہے۔واللہ اعلم۔

یوم ترجف الراجفة ...... یوم جواب قسم محذوف کا ظرف زمان ہے۔یعنی اے کافرو! تم قیامت کا انکار کرتے ہو۔ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائیگا جس دن لرزنے والی چیزیں (زمین پہاڑ وغیرہ) لرزیں گی بالاخر فنا ہو جائیں گی۔(یہ سب کچھ نفخ صور اول کے وقت ہوگا) اس کے بعد دوسرا صور پھونکا جائیگا جس کو رادفہ کہا گیا ہے جس سے سارے جاندار زندہ ہو جائیں گے۔ابتدائے نفخ صور اول سے نفخ ثانی تک ایک متصل زمانہ ہوگا۔اسلئے گویا وہ زمانہ یوم واحد ہوگا۔اس وجہ سے یوم لتبعثن محذوف جواب قسم کا ظرف ہے۔فافہم۔

راجفة اور رادفة:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ راجفہ سے مراد نفخہ اولی ہے جس سے ہر شئی فنا ہو جائیگی۔ اور رادفہ سے مراد نفخہ ثانیہ ہے یہ نفخہ بعث ہوگا۔ اس سے سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس برس کی مدت ہوگی۔ حلیمیؒ نے بیان کیا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہونے پر تمام روایات متفق ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں صرف چالیس کا لفظ مذکور ہے اس کے ساتھ سال کا لفظ نہیں ان کی دوسری روایت میں چالیس سال مذکور ہے۔ حضرت ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ دونوں نفخوں کے درمیان وادی میں سیلاب ہو جائیگا۔ اور دونوں کے درمیان چالیس (دن یا مہینے یا سال) کا فاصلہ ہوگا۔ پھر ہر فنا شدہ حیوان (زمین سے) اگے گا۔ اگر ان کے مرنے سے پہلے کوئی گذرنے والا ان کی طرف سے گذرا ہو۔ اور پھر جی اٹھنے کے بعد ادھر سے گذرے تو ان کو پہچان لے (یعنی سب اول شکل وصورت پر دوبارہ پیدا ہوں گے کوئی فرق نہ ہوگا) پھر روحوں کو چھوڑا جائیگا اور بدنوں میں لا کر ملا دیا جائیگا۔ آیت ﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ (پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۷.) کا یہی مطلب ہے۔ قلوبٌ ...... مارے خوف کے دھڑک رہے ہونگے۔ ابصارها ای ابصار اصحاب القلوب جن لوگوں کے دل بے قرار ہونگے ان کی نگاہیں ندامت وشرم اور خوف وہراس سے جھکی ہونگی۔

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ (۱۰) ءَاِذَا كُنَّا عِظَاماً نَّخِرَةً (۱۱)

منکر لوگ کہتے ہیں کہ کیا ہم پہلی حالت پر لوٹائے جائینگے؟ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے (لوٹائے جائیں گے.)

يَقُوْلُوْن	ءَ	اِنَّا	لَمَرْدُوْدُوْنَ	فِی	الْحَافِرَةِ	ءَ	اِذَا	كُنَّا	عِظَاماً	نَّخِرَةً
کہتے ہیں	کیا	ہم	البتہ پھیرے جائیں گے	بیچ	حالت پہلی	کیا	جب	ہوجائینگے ہم	ہڈیاں	گلی ہوئی

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۱۲) فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ (۱۳) فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۱۴)

کہتے ہیں کہ پھر تو یہ واپسی بڑی خسارہ کی ہوگی۔ وہ تو ایک ہیبت ناک آواز ہوگی جس سے وہ سب میدان میں آموجود ہوں گے۔

قَالُوْا	تِلْكَ	اِذًا	كَرَّةٌ	خَاسِرَةٌ	فَاِنَّمَا	هِیَ	زَجْرَةٌ	وَّاحِدَةٌ	فَاِذَا	هُمْ	بِالسَّاهِرَةِ
کہاانھوں نے	یہ	اس وقت	پھرآنا	ٹوٹے	پس سوائے اسکے نہیں کہ	وہ	ڈانٹنا	ایک بار	پس ناگہاں	وہ	بیچ روئے زمین

لغات:

لمردودون: جمع مذکر اسم مفعول رَدًّ، رَدًّا (ن)، واپس کرنا۔ الحافرة پہلی زندگی رَجَعَ فُلَانٌ فِی الْحَافِرَةِ پہلی حالت پر لوٹ گیا۔ اسی طریق پر واپس ہوا جس سے آیا تھا۔ اپنی مرضی سے جسکو کھودا تھا (گویا حافرۃ بمعنی بوسیدہ ہونا، چور چور ہونا۔ (ن ض) منمنانا۔ ناک میں سے آواز نکالنا۔ (ف) ناک میں انگلی ڈالکر کھجلانا۔ تفصیل سے بات کہنا۔ کرة: ایک بار۔ زجرة: جھڑکی، ڈانٹ (ن) جھڑکنا، ڈانٹنا۔ الساهرة: میدان، زمین، روئے زمین۔ امام رازی کہتے ہیں کہ سفید ہموار زمین کو ساہرہ کہتے ہیں۔ اسلئے کہ (۱) اس پر چلنے والا خوف سے سوتا نہیں۔ (۲) اس میں سراب (ریگ رواں) ہوتا ہے یہ عرب کے محاورہ عَیْنٌ سَاهِرَةٌ سے ماخوذ ہے۔ سهر سهراً (س) جاگنا۔ بیدار رہنا۔ قیامت میں شدت خوف سے آدمی کی نیند اڑ جائیگی۔ اس لئے بھی میدان حشر کا نام ساہرہ رکھا گیا۔

ترکیب:

یقولون فعل ضمیر جمع (عائد الی منکری البعث) فاعل۔ ہمزہ برائے استفہام انکاری انا معہ اسم لمردودون اپنے متعلق فی الحافرۃ سے ملکر خبر۔ ان جملہ اسمیہ مفعول بہ۔ ہمزہ مثل سابق اذا بمعنی وقت مضاف کنا فعل ناقص معہ اسم عظاما نخرۃ موصوف وصفت مل کر خبر جملہ مضاف الیہ اذا کا۔ مرکب اضافی یقولون محذوف کاظرف۔ جملہ فعلیہ ہوا۔ قالوا فعل ضمیر جمع فاعل (عائد الی منکری البعث) تلک مبتدا (اشارۃ الی الرجعۃ المفهومۃ من قوله لمردودون) اذا ظرف (والعامل فیه معنی الاشارۃ) وظرف للکرۃ وتنوینه عوض عن المضاف الیه. کرۃ خاسرۃ موصوف وصفت خبر۔ جملہ اسمیہ خبریہ مقولہ قالوا کا۔ فانما فاء تعلیلیہ (یہ جملہ علت بعث ہے) ان حرف مشبہ بفعل ما کافۃ ھی (ای الکرۃ وقیل الرادفۃ) مبتدا زجرۃ واحدۃ مرکب توصیفی خبر۔ جملہ اسمیہ خبریہ۔ فاء سببیہ ہے یا عطف کے لئے ہے۔ اذا مفاجاتیہ (من الظروف الزمانیة عند الزجاج والمکانیة عند المبرد) مضاف۔ ھم مبتدا۔ با حرف جر بمعنی علی، الساھرۃ مجرور سے ملکر متعلق ثابتون محذوف کے ہوکر خبر۔ جملہ اسمیہ خبریہ ہوکر مضاف الیہ اذا کا اور وہ فَفَاجِئُوا کا ظرف زمان یا مکان۔ ای فَفَاجِئُوا زمانَ اَومکانَ ثبوتهم علی وجه الارض. اوفاذاهم متلبسون بالابدان الساهرة. والله اعلم

تفسیر:

قیامت کا کچھ حال بیان فرما کر کفار کے ان بے ہودہ اقوال کو نقل فرماتے ہیں جو...... غفلت وجہالت کی وجہ سے اس دنیا میں ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ بطور استہزاء کہتے ہیں کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ پہلی ہی طرح زندہ ہو جائیں گے؟ جب ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی۔ پھر ہم زندہ کئے جائیں۔ ایسا ہوا تو ہم بڑے گھاٹے میں رہیں گے۔ یہ سب باتیں بطور استہزا کہتے ہیں۔ ان کے ان اقوال کے جواب میں باری تعالیٰ نے وقوع قیامت کو بیان فرمایا ہے۔ فانما ھی ...... کہ وہ کوئی مشکل نہیں بس ایک ہیبت ناک آواز (نفخ صور) سے سب کے سب سطح زمین پر آجائیں گے جس طرح گویا سوئے ہوؤں کو جگا دیا گیا ہو۔ فاذا ھم بالساھرۃ کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ لوگ قیامت کے دن فوراً جاگ اٹھیں گے۔ اس میں موت کو نیند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسے حدیث میں نیند کو موت کے مثل فرمایا گیا۔ اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ (الصحیح للامام مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب جامع صلاۃ اللیل ومن نام عنها، ج: ۱، ص: ۵۱۲، رقم: ۷۴۶۔) اس صورت میں یہ لفظ لیلۃ ساھرۃ سے ماخوذ ہوگا۔ جس کے معنی ہیں۔ "رت جگے کی رات" نیند اور موت میں اسی طرح رات کے اچھے اور برے خوابوں میں اور عذاب قبر میں بہت مناسبت ہے۔ فتفکر، دوسرے معنی یہ ہیں کہ پھر ایک دم وہ میدان میں حاضر ہو جائینگے۔

ساہرہ سے کیا مراد ہے؟

اس میں مختلف اقوال ہیں (۱) زمین (۲) روئے زمین (۳) کھلا میدان (۴) سفید و ہموار زمین جس میں گھاس پھونس پیڑ، پودے، عمارت وغیرہ کچھ نہ ہو۔ (۵) ارض القیامۃ اور میدان حشر ان سب اقوال کا حاصل ایک ہی ہے (۶) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ چاندی کی صاف و پاک زمین ہے جس پر کوئی گناہ نہیں ہوا (۷) ساتویں زمین جس کو اللہ تعالیٰ اوپر لے جائیں گے اور اس پر حساب

کتاب ہوگا۔ وَذٰلِکَ حِیۡنَ تُبَدَّ لُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَالۡاَرۡضِ (۸) وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ وہ سرزمین شام ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ اتنی وسیع کردیں گے کہ تمام مخلوق اس پر آجائیگی۔ (۹) ابوالعالیہؒ وسفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ وہ بیت المقدس کے قریب والی زمین ہے۔ قول ۸، ۹، کا حاصل ایک ہی ہے۔ (۱۰) ایک جنگل ہے جہنم کے کنارے پر (۱۱) قتادہؒ کہتے ہیں کہ ساہرہ جہنم ہی کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں کسی کو نیند نہیں آئیگی۔ (۱۲) ابن عباسؓ سے مروی ہے ک وہ سرزمین مکہ ہے۔ واللہ اعلم۔

هَلۡ اَتٰكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى (۱۵) اِذۡ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى (۱٦)

کیا آپ کو موسیٰ کا قصہ پہنچا ہے؟ جب ان کے رب نے انہیں ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں پکارا

هَلۡ	اَتٰكَ	حَدِيۡثُ	مُوۡسٰى	اِذۡ	نَادٰهُ	رَبُّهٗ	بِالۡوَادِ	الۡمُقَدَّسِ	طُوًى
کیا	آئی تیرے	بات	موسیٰ	جب	پکارا اس	رب اس	بیچ میدان	پاک	طویٰ

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۱۷) فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى (۱۸) وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ

کہ آپ فرعون کے پاس جایئے کیونکہ اس نے سر اٹھا رکھا ہے پھر اس سے کہئے کہ کیا تو درست ہونا چاہتا ہے۔ اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں

اِذۡهَبۡ	اِلٰى	فِرۡعَوۡنَ	اِنَّهٗ	طَغٰى	فَقُلۡ	هَلۡ	لَّكَ	اِلٰى	اَنۡ	تَزَكّٰى	وَاَهۡدِيَكَ	اِلٰى رَبِّكَ
جا	طرف	فرعون	تحقیق اس	سرکشی کی ہے	پس کہہ	کیا	تجھ کو	طرف	اسکی کہ	پاک ہو تو	اور رستہ بتاؤں	پروردگار تیرے

فَتَخۡشٰى (۱۹) فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى (۲۰) فَكَذَّبَ وَعَصٰى (۲۱) ثُمَّ اَدۡبَرَ يَسۡعٰى (۲۲)

کہ تو اس سے ڈرنے لگے۔ پھر موسیٰ نے اس کو بڑا معجزہ دکھلایا تو اس نے جھٹلا دیا اور کہنا نہ مانا۔ پھر جدا ہو کر کوشش کرنے لگا۔

فَتَخۡشٰى	فَاَرٰىهُ	الۡاٰيَةَ	الۡكُبۡرٰى	فَكَذَّبَ	وَ	عَصٰى	ثُمَّ	اَدۡبَرَ	يَسۡعٰى
پس ڈرے تو	پس دکھادی اس	نشانی	بڑی	پس جھٹلایا	اور	نافرمانی کی	پھر	پیٹھ پھیری	سعی کرتے ہوئے

فَحَشَرَ فَنَادٰى (۲۳) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى (۲٤) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ

پھر جمع کرکے با آواز بلند کہا۔ کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ تو اللہ نے اس کو

فَحَشَرَ	فَنَادٰى	فَقَالَ	اَنَا	رَبُّكُمُ	الۡاَعۡلٰى	فَاَخَذَهُ	اللّٰهُ
پس اکٹھا کیا	پس پکارا	پس کہا	میں	پروردگار تمھارا	سب سے بلند	پس پکڑا اس	اللہ

نَكَالَ الۡاٰخِرَةِ وَالۡاُوۡلٰى (۲۵) اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى (۲٦)

آخرت اور دنیا کے عذاب میں گرفتار کیا۔ بے شک اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لئے جو ڈرتا ہو۔

نَكَالَ	الۡاٰخِرَةِ	وَ	الۡاُوۡلٰى	اِنَّ	فِىۡ	ذٰلِكَ	لَعِبۡرَةً	لِّمَنۡ	يَّخۡشٰى
عذاب	آخرت	اور	دنیا	تحقیق	بیچ	اس	البتہ نصیحت	واسطے اس شخص	ڈرتا ہے

لغات:

الواد اسم مفرد اصل میں الوادی تھا۔ دو پہاڑوں کے درمیان کا میدان۔ مراد اس سے وادی طور ہے۔ جمع الاودیۃ ہے۔ ودی ودیاً (ض) بہنا، قریب کرنا، دیۃ: خون بہا دینا۔ المقدس پاک کیا ہوا، مبارک۔ باب تفعیل سے اسم مفعول مادہ قدس ہے۔ قَدَسَ قُدُساً قُدُساً (ن) پاک ہونا۔ بابرکت ہونا۔ القُدُّوسُ (مبارک) پاک، باری تعالیٰ کے

اسماء میں سے ہے۔یعنی ہر نقص وعیب سے پاک۔طوی بالضم والکسر،بالتنوین وبلا تنوین ملک شام میں ایک وادی ہے۔یہ منصرف بھی ہے کہ وادی اور مکان کا نام ہے۔اور غیر منصرف بھی بتاویل بقعۃ۔بعض نے کہا کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے۔بعض علماء کہتے ہیں کہ طوی کے معنی شیٔ ثنی کے ہیں یعنی وہ چیز جس کو دوبار عمل میں لایا گیا ہو۔وہ لوگ وادالمقدس طوی کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں ''وہ وادی جس کی دو دفعہ تقدیس کی گئی ہو۔طَوٰی طُوًی (ض) لپیٹنا،طے کرنا۔تزکی (تو سنور جائے،پاک ہو جائے) مضارع کا صیغہ واحد مذکر حاضر دراصل تتزکی تھا ایک تاء حذف ہوگئی۔باب تفعل کی ایک تاء کو مضارع میں تخفیفاً حذف کردیتے ہیں۔زَکَا زُکَاءً(ن) زَکِیَ زَکًی (س) بڑھنا،نیک ہونا،زکی ہونا وغیرہ حشر (ن ض) جمع کرنا۔نکال ایسا عذاب جو باعث عبرت ہو،عِبْرَۃ نصیحت حاصل کرنا۔دوسرے کے حال پر اپنے حال کو قیاس کرنا۔اصل میں عبر کے معنی ایک حال سے دوسرے حال میں گذرنے کے ہیں۔عبرۃ کی جمع عبر ہے جیسا کہ سدرۃ کی جمع سدر ہے۔عبور مصدر (ن) ایک جانب سے دوسری جانب پہنچ جانا۔علامہ خازن رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے۔العبرۃ الدلالۃ الموصلۃ الی الیقین المؤدیۃ الی العلم (عبرت وہ دلالت ہے جو یقین تک پہنچ جاتی اور علم تک رسائی کراتی ہے۔

ترکیب:

هل برائے استفہام اتک حدیث موسیٰ فعل،مفعول بہ،فاعل علی الترتیب۔جملہ فعلیہ۔اذ کر فعل با فاعل محذوف اذ مضاف نادی فعل ہ مفعول بہ ربہ مرکب اضافی فاعل باء جارہ الوادالمقدس موصوف وصفت مبدل منہ طوی بدل۔مجرور ہو کر متعلق نادی جملہ فعلیہ مضاف الیہ۔مرکب اضافی مفعول فیہ فعل محذوف اذکر کا۔جملہ فعلیہ طوی اگر مصدری معنی میں لیا جائے تو مفعول مطلق ہوگا۔نادی کا یا المقدس کا (من غیر لفظ الفعل) والجملۃ مستانفۃ۔قال فعل محذوف ضمیر فاعل اذھب فعل با فاعل الی فرعون متعلق۔جملہ فعلیہ مقولہ انہ حرف مشبہ معہ اسم طغی فعل ضمیر عائد الی فرعون فاعل۔جملہ فعلیہ خبر۔جملہ اسمیہ علت ماقبل۔فاء عاطفہ قل فعل با فاعل هل استفہامیہ لک جار مجرور متعلق حصل وغیرہ کے خبر مقدم ان تزکی جملہ فعلیہ بتاویل مفرد مجرور الی۔متعلق میل یا رغبۃ کے ہو کر مبتدا مؤخر جملہ اسمیہ مقولہ قل ہوا۔

واھدی فعل با فاعل ک مفعول بہ الی ربک متعلق جملہ فعلیہ فاء تفریعیہ برائے عطف تخشی فعل با فاعل ہ مفعول بہ محذوف (حذف لرعایۃ الفاصلۃ) جملہ فعلیہ معطوف ماقبل فاء عاطفہ اور معطوف علیہ اس کا محذوف ہے وَاَصْلُ الْعِبَارَۃِ ھٰکَذَا وَذَھَبَ مُوْسٰی وَبَلَّغَ فِرْعَوْنَ فَقَالَ لَنْ اُوْمِنَ حَتّٰی اَرٰی الآیَۃَ الْوَاضِحَۃَ فَاَرٰی......

اری فعل ضمیر راجع بسوئے موسیٰ فاعل ہ مفعول بہ اول الآیۃ الکبری موصوف صفت مفعول بہ ثانی۔جملہ فعلیہ۔فاء تعقیبیہ کذب فعل ضمیر فاعل (راجع الی فرعون) جملہ فعلیہ ماسبق پر معطوف وعصی جملہ فعلیہ معطوف،ہکذا اور دونوں فعلوں کے مفعول بہ محذوف ہیں ای کذبہ وعصاہ (رعایۃً للفاصلۃ) ثم ادبر بھی جملہ فعلیہ ماقبل پر معطوف اور یسعی جملہ فعلیہ ادبر کی ضمیر فاعل سے حال ہے اور فحشر اور فنادی دونوں جملوں کا عطف بھی ماقبل پر ہے۔

فقال انا مبتدا ربکم مرکب اضافی موصوف الاعلی صفت۔مرکب توصیفی خبر جملہ اسمیہ مقولہ قال پھر جملہ فعلیہ ماقبل پر معطوف فاء عاطفہ اخذہ اللہ فعل مفعول بہ اور فاعل نکال الآخرۃ والاولیٰ مرکب اضافی مفعول مطلق

فعل محذوف فنكله نكال...... یااخذ کامفعول مطلق ہے کیونکہ معنیً اتحاد ہے ای فعذبهٗ عذاب الآخرة...... یا بحذف مضاف ای أخذه الله اخذ نكا ل الآخرة والاولیٰ. یامفعول لہ ہے ای أخذه لاجل نكال منصوب بنزع الخافض ہے ای اخذه بنكال...... وهوالاحراق وتعذيب الدنيا الاغراق.(وانماقدم عذاب الآخرة لانه هوالمقصود والشديد. وأخرعذاب الدنيالانهٗ وسيلة واخف بالنسبة اليه.فافهم .فی ذلک حاصل وغیرہ کے متعلق ہوکر ان کی خبر مقدم۔ من موصولہ یخشی جملہ فعلیہ صلہ سے مل کر مجرور لام ہوکر متعلق لعبرۃ کے ہوا اور وہ اسم ان ہے۔ جملہ اسمیہ مستانفہ ہوا۔ای فما فائدة ذكر هذه القصّه؟﴿فقال ان فی ذلک...﴾والله تعالیٰ اعلم .

تفسیر:

منکرین قیامت کفار مشرکین کی ضد وعداوت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچتی تھی۔جس کا ازالہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفرعون کا قصہ بیان فرما کر کیا گیا کہ مخالفین سے ایذا رسانی کچھ آپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ دوسرے انبیاء کرام کو بھی بڑی بڑی ایذائیں پہنچی ہیں۔انہوں نے صبر کیا اور آپ بھی صبر سے کام لیں۔
مقصود اس قصے کا آپ کو تسلی اور بشارت دینا بھی ہے۔اور کفار کو وعید وتنبیہ کرنا بھی۔ نیز یہ نبوت ورسالت پر دلیل بھی ہے۔اول تو یہ کہ رسالت محمدیہ کوئی نئی چیز نہیں، پہلے سے نبی ہوتے چلے آئے ہیں۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام، پھر ان کا واقعہ ایک امّی کا بیان کردینا بھی دلیل نبوت ہے۔علاوہ ازیں مسئلہ معاد پر دلائل عقلیہ کے بعد قصہ موسیٰ دلیل نقلی ہے۔جس کا تعلق ایک جم غفیر کے مشاہدہ سے ہے۔وہ یہ کہ عصائے موسیٰ میں باوجود حیات نہ ہونے کے حق سبحانہ نے روح پھونک دی تھی اسی طرح مردوں میں بھی روح پھونک دی جائیگی۔

قصہ موسیٰ علیہ السلام:

قصہ موسیٰ علیہ السلام قرآن پاک میں اکثر سورتوں میں مذکور ہے۔اہل عرب بھی اس کو اجمالاً جانتے تھے اس سورت میں حسب ضرورت مدین سے واپسی کے بعد کے چند اجزاء بیان فرمادیئے گئے ہیں۔ان کی پیدائش، دریائے نیل میں ڈالا جانا، فرعون کے محل پہنچنا، والدہ کے پاس واپسی، پھر دودھ پلانے کی مدت کے بعد فرعون کے محل میں پرورش، جوانی میں قبطی کا قتل اور مدین پہنچنا وغیرہ یہ سب اجزاء یہاں مذکور نہیں ہیں۔ یہاں پر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے وادی طوی میں نبوت ورسالت سے سرفراز فرما کر فرعون سرکش کے پاس بھیجا۔موسیٰ علیہ السلام نے اس کو دعوت ایمان دی اور معجزۂ عصا وید بیضا دکھلا کر اپنی رسالت پر دلیل قائم کی۔مگر وہ نہ مانا تو اللہ نے اس کو دنیا کے عذاب (غرق) اور آخرت کے عذاب (دوزخ) میں گرفتار کرلیا۔اس قصہ میں بڑی عبرت ہے کہ نبی ورسول کی مخالفت سے دنیا وآخرت دونوں برباد ہوجاتی ہیں۔اور ابدی ذلت ورسوائی میں گرفتار ہونا پڑتا ہے۔

ءَ اَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (۲۷) رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰهَا (۲۸)

بھلا تمہارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا ؟اللہ نے اسکو بنایا اس کی چھت کو بلند کیا او راس کو درست کیا

ء	اَنۡتُمۡ	اَشَدُّ	خَلۡقًا	اَمِ	السَّمَآءُ	بَنٰهَا	رَفَعَ	سَمۡكَهَا	فَسَوّٰهَا
کیا	تم	سخت تر	پیدائش	یا	آسمان	بنایا اس	بلند کیا ہے	موٹاپا اس	پس برابر کیا اس

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا (۲۹) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۳۰)

اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔ اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔

وَ	اَغْطَشَ	لَيْلَهَا	وَ	اَخْرَجَ	ضُحٰهَا	وَ	الْاَرْضَ	بَعْدَ	ذٰلِكَ	دَحٰهَا
اور	ڈھانک دیا	رات اس	اور	نکال دیا	دھوپ اس	اور	زمین	پیچھے	اس	بچھادیا

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا (۳۱) وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۳۲) مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۳)

اس سے اسکا پانی اور اس کا چارہ نکالا۔اور پہاڑوں کوقائم کردیا۔تم کو تمہارے مویشیوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ۔

اَخْرَجَ	مِنْهَا	مَآءَهَا	وَ	مَرْعٰهَا	وَ	الْجِبَالَ	اَرْسٰهَا	مَتَاعًا	لَّكُمْ	وَ	لِاَنْعَامِكُمْ
نکالا	سے اس	پانی،اس	اور	چارہ اس	اور	پہاڑوں	گاڑدیاان کو	فائدہ	واسطےتمھارے	اور	واسطےچارپایوں تمھارے

لغات:

اشد صیغہ اسم تفضیل (ن) نہایت سخت، بہت قوی۔ بَنٰی صیغہ واحد مذکر غائب (ض) بنانا تعمیر کرنا۔ سمک بوجھ چھت، بلندی۔(ن) بلند کرنا۔سوی باب تفعیل سے برابر کرنا۔درست کرنا۔مجرد میں (س) سے لازم۔ اغطش باب افعال سے تاریک کرنا۔تاریک ہونا۔غَطَشَ غَطْشاً (ن) تاریک ہونا غطشاً و غطشاناً (ض) مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے آہستہ آہستہ چلنا۔غطشا کمزور نظر والا ہونا. ضحی وہ وقت جس میں دھوپ چڑھ جائے، وقت چاشت ضحی مثل ھدیٰ مؤنث ہے،تصغیر ضُحَيَّةٌ اور ضُحَيٌّ ہے ثانی بہتر ہے تاکہ ضَحْوَة کی تصغیر کے مشابہ نہ ہو۔بعض اہل لغت نے اس کو مذکر مانا ہے۔(ن س) دھوپ لگنا، دھوپ کھانا،دَحٰی دَحْوًا (ن) بچھانا، ہموار کرنا۔مرعی چراگاہ اسم ظرف باب فتح۔ارسی افعال سے ٹھہرنا۔ثابت ہونا اور ٹھہرانا۔کشتی کو لنگر انداز کرنا۔کھونٹا زمین میں گاڑنا۔رسا رَسْوًا وَرُسُوًّا (ن) ٹھہرنا، ثابت ہونا۔استوار ہونا۔

ترکیب:

(ءَ) برائے استفہام تقریری۔انتم مبتدا أشدّ خلقاً ممیّز تمیز خبر۔جملہ معطوف علیہ ام حرف عطف (لاحد الامرین مبهماً عند المتكلم وههنا لتوبيخ المخاطبين) السماء مبتدا۔خبر محذوف أشد خلقاً جملہ اسمیہ معطوف بنٰها فعل ضمیر مستتر فاعل ومفعول بہ جملہ بيانٌ وتفصيلٌ لكيفية خَلقِهَا۔رفع فعل ضمیر فاعل سمکها مفعول بہ جملہ فعلیہ بیان للبناءِ ۔ فسوها جملہ فعلیہ معطوف ماقبل پر۔اسی طرح اغطش لیلها واخرج ضحها تمام جملے فعلیہ ہوکر ماقبل پر معطوف ہیں۔دحی محذوف ضمیر فاعل الارض مفعول بہ جملہ مفسر بعد ذلک دحی فعل کا ظرف اور یہ جملہ فعلیہ تفسیر ہوا۔ اخرج فعل ضمیر فاعل منها متعلق ماءها معطوف علیہ مرعها معطوف۔معطوفین مفعول بہ۔جملہ فعلیہ والجبال ارسها مثل والارض بعد ذلک دحها ۔متاعا باب تفعیل کا مصدر ہے مثل سلام کے یہ یا تو افعال سابقہ کا مفعول لہ ہے یا ان کا مفعول مطلق من غیر لفظہ ہے۔اس لئے کہ افعال ثلثہ مذکورہ تمتیع کے معنی میں ہیں یا معنی یہ ہیں کہ متعکم بذلک فمتعتم متاعا۔لکم ولانعامکم متاعاً کے متعلق۔

تفسیر:

ان آیات میں باری تعالیٰ نے منکرین حشر ونشر کے اس شبہ کو زائل فرمایا ہے کہ مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد کیسے زندہ کئے جائیں گے۔ تو باری تعالیٰ نے ان آیات میں زمین وآسمان اور ان کے اندر کی پیدا کی ہوئی عظیم مخلوقات کا ذکر کر کے غافل ومنکر انسانوں کو خبردار کیا ہے کہ جس ذات عالی نے ایسی عظیم الشان مخلوقات کو بغیر کسی مادہ اور آلہ کے ابتداءً وجود دیا ہے وہ اگر ان کو فنا کر کے دوبارہ وجود عطا فرمادے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اور حضرت انسان تو زمین وآسمان کے مقابلہ میں بہت چھوٹی سی مخلوق ہے۔ ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (پارہ: ۲۴ سورۃ الغافر، الآیۃ: ۵۷) (یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے کی بہ نسبت بڑا کام ہے لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے)

تخلیق ارض وسماء کی ترتیب اور ایام تخلیق کی تعیین:

''بیان القرآن'' میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ یوں تو زمین وآسمان کی پیدائش کا ذکر مختصر ومفصل قرآن مجید میں سینکڑوں جگہ آیا ہے۔ مگر ان میں ترتیب کا بیان کہ پہلے کیا بنا اور بعد میں کیا بنا۔ غالباً صرف تین ہی جگہ آیا ہے۔ ایک آیت (۹ تا ۱۲) حم سجدہ میں، دوسری جگہ سورہ بقرہ کی آیت (۲۹) میں، تیسری جگہ سورۂ نازعات کی یہ آیات:

ء انتم اشد...... اور سرسری نظر میں ان سب مضامین میں کچھ اختلاف بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سورۂ بقرہ وسورہ حم سجدہ کی آیات سے زمین کی تخلیق کا آسمان سے مقدم ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور سورۂ نازعات کی آیات سے اس کے برعکس۔ بظاہر زمین کی تخلیق آسمان کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ سب آیات میں غور کرنے سے میرے خیال میں تو یہ آتا ہے کہ یوں کہا جائے کہ اول زمین کا مادہ بنا اور ہنوز اس کی موجودہ ہیئت نہ بنی تھی کہ اسی حالت میں آسمان کا مادہ بنا جو دخان یعنی دھوئیں کی شکل میں تھا اس کے بعد زمین ہیئت موجودہ پر پھیلا دی گئی، پھر اس پر پہاڑ اور درخت وغیرہ پیدا کئے گئے۔ پھر آسمان کے مادہ دخانیہ سیالہ کے سات آسمان بنا دیئے گئے۔ امید ہے کہ سب آیات اس تقریر پر منطبق ہو جاویں گی آگے حقیقت حال سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہیں۔ (از بیان القرآن سورۂ بقرہ ع ۳)

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی آیت (حم سجدہ) کے تحت میں چند سوالات وجوابات مذکور ہیں۔ ان میں اس آیت کی جو تشریح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی وہ تقریباً یہی ہے۔ جو حضرت نے تطبیق آیات کیلئے بیان فرمائی ہے۔ اس کے الفاظ جو ابن کثیرؒ نے اسی آیت (حم سجدہ) کے تحت نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ وَخَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ ثُمَّ خَلَقَ السَّمَآءَ ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ فِيْ يَوْمَيْنِ آخَرَيْنِ ثُمَّ دَحَى الْاَرْضَ، وَدَحْيُهَا اَنْ اَخْرَجَ مِنْهَا الْمَآءَ وَالْمَرْعٰى وَخَلَقَ الْجِبَالَ وَالرِّمَالَ وَالْجَمَادَ وَالْآكَامَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ يَوْمَيْنِ آخَرَيْنِ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى: دَحٰهَا.

اور حافظ ابن کثیر نے بحوالہ ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت حم سجدہ کی تفسیر میں یہ روایت بھی نقل کی کہ: یہود مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے متعلق سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اتوار اور پیر کے دن پیدا فرمایا۔ اور پہاڑ اور اس میں جو کچھ معدنیات ہیں ان کو منگل کے دن، اور درخت اور پانی کے چشمے اور شہر اور عمارتیں اور ویران میدان بدھ کے روز۔ یہ کل چار روز ہو گئے۔ جیسا کہ

آیت میں ہے کہ ﴿ءَ اِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ﴾ (پارہ:۲۴،سورۃ فصلت ،الآیۃ:۹، ۱۰) یعنی ان لوگوں کے لئے جو اس تخلیق کا سوال کریں پھر فرمایا۔ جمعرات کے روز آسمان بنائے اور جمعہ کے روز ستارے اور شمس وقمر اور فرشتے یہ سب کام جمعہ کے دن میں تین ساعت باقی تھیں جب پورے ہوئے۔ان میں سے دوسری ساعت میں آفات ومصائب جو ہر چیز پر آنیوالی ہیں وہ پیدا فرمائی ہیں۔اور تیسری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اوران کو جنت میں ٹھہرایا اورابلیس کو سجدہ کا حکم دیا۔اور سجدہ سے انکار کرنے پر جنت سے نکال دیا گیا یہ سب تیسری ساعت کے ختم تک ہوا۔(**الحدیث بطوله ابن کثیر**)ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا۔**ھذا الحدیث فیه غرابة .**

اور صحیح مسلم میں ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آئی ہے جس میں تخلیق عالم کی ابتداء یوم السبت یعنی ہفتہ کے روز سے بتلائی گئی ہے۔اس کے حساب سے آسمان وزمین کی تخلیق کا سات روز میں ہونا معلوم ہوتا ہے مگر ایک تو عام نصوص قرآنیہ میں یہ تخلیق چھ روز میں ہونا صراحۃً مذکور ہے۔مثلاً ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ (پارہ: ۲۶ ،سورۃ ق،الآیۃ: ۳۸) یعنی ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب کو چھ دن میں پیدا کیا ہے۔اور ہمیں کوئی تکان پیش نہیں آئی۔دوسری سند کے اعتبار سے بھی اکابر محدثین نے اس روایت کو معلول قرار دیا ہے۔ابن کثیرؒ نے اسکو بحوالہ مسلم ونسائی نقل کر کے فرمایا **وھو من غرائب الصحیح لمسلم کما فی زاد المسیر لابن الجوزی ۔** یعنی یہ حدیث صحیح مسلم کے عجائب میں سے ہے۔اور پھر فرمایا کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب تاریخ کبیر میں اس روایت کو معلول قرار دیا ہے اور بعض لوگوں نے اس روایت کو ابوہریرہؓ سے بروایت کعب احبار نقل کیا ہے۔لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے اور فرمایا کہ یہی اصح ہے(التفسیر للامام ابی الفداء ابن کثیر ،تحت سورۃ فصلت، ج:۷،ص:۱۶۸ ،مطبوعہ دار طیبہ، ۱۹۹۹ء)

اسی طرح ابن مدینیؒ اور بیہقیؒ وغیر حفاظ حدیث نے بھی اس کو کعب احبار کا قول قرار دیا ہے(حاشیہ زاد المسیر لابن الجوزی) پہلی روایت جو ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے ابن کثیرؒ کے فیصلے کے مطابق اس میں بھی غرابت ہے ایک وجہ غرابت کی یہ بھی ہے کہ اس روایت میں حضرت آدمؑ کی تخلیق آسمانوں کی تخلیق کے ساتھ آخری دن جمعہ کی آخری ساعت میں اور اسی ساعت میں حکم سجدہ اور ابلیس کا جنت سے اخراج مذکور ہے۔حالانکہ متعدد آیات قرآنی میں جو قصہ تخلیق آدمؑ کا اور حکم سجدہ اور اخراج ابلیس کا مذکور ہے۔اس کے سیاق سے بدیہی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق آدمؑ کا واقعہ تخلیق ارض وسماء سے بہت زمانہ بعد میں ہوا جبکہ زمین میں اس کی تمام ضروریات مکمل ہو چکی تھیں۔اور جنات اور شیاطین وہاں بسنے لگے تھے۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾(پارہ: ۱ ،سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۳۰) (کذا فی المظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ تخلیق ارض وسماء کے اوقات اور دن اور ان میں ترتیب جن روایاتِ حدیث میں آئی ہے ان میں کوئی روایت ایسی نہیں جس کو قرآن کی طرح قطعی اور یقینی کہا جاسکے۔ بلکہ ان میں یہ احتمال غالب ہے کہ وہ اسرائیلی روایات ہوں۔اور وہ روایات صحیحہ مرفوعہ نہ ہوں۔جیسا کہ ابن کثیرؒ نے مسلمؒ ونسائیؒ کی حدیث کے متعلق تصریح فرمائی ہے۔اس لئے آیات قرآنی ہی کو اصل قرار دے کر مقصود متعین کرنا چاہئے۔اور آیات قرآنی کو جمع کرنے سے ایک بات تو قطعی معلوم ہوئی کہ آسمان وزمین اور ان کے اندر کی تمام چیزیں صرف چھ دن میں پیدا ہوئی ہیں۔دوسری بات حم سجدہ کی آیات سے یہ معلوم ہوئی کہ زمین اور اس کے پہاڑ درخت وغیرہ کی تخلیق میں پورے چار دن لگے ہیں۔تیسری بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ آسمانوں

کی تخلیق میں دودن صرف ہوئے۔ جس میں پورے دودن ہونے کی تصریح نہیں، بلکہ کچھ اشارہ اس طرف ملتا ہے کہ یہ دودن پورے خرچ نہیں ہوئے تھے آخری دن جمعہ کا کچھ بچ گیا تھا۔ ان آیات کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھ دن میں سے پہلے چار دن زمین پر باقی دودن آسمانوں کی تخلیق پر صرف ہوئے۔ اور زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی۔ مگر سورۂ نازعات کی آیت میں زمین کے پھیلانے اور مکمل کرنے کو صراحۃ تخلیق آسمان کے بعد فرمایا گیا ہے اس لئے وہ صورت کچھ بعید نہیں جو اوپر بحوالہ بیان القرآن بیان ہوئی۔ کہ زمین کی تخلیق دوحصوں میں منقسم ہے۔ پہلے دودن میں زمین اور اسکے اندر پہاڑوں وغیرہ کا مادہ تیار کردیا گیا۔ اس کے بعد دودن میں سات آسمان بنائے گئے اس کے بعد دودن میں زمین کا پھیلاؤ اور اس کے اندر جو کچھ پہاڑ، درخت، نہریں، چشمے وغیرہ بنائے گئے تھے ان کی تکمیل ہوگئی۔ اس طرح تخلیق زمین کے چار دن متصل نہیں رہے۔ اور آیات حم سجدہ میں جو ترتیب بیان رکھی گئی ہے کہ پہلے زمین کو دودن میں پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ﴿خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ (پارہ: ۲۴، سورۃ فصلت، الآیۃ: ۹) اس کے بعد مشرکین کو تنبیہ کی گئی پھر الگ کرکے فرمایا ﴿وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ﴾ (پارہ: ۲۴، سورۃ فصلت، الآیۃ: ۹، ۱۰) اس پر تو سب ہی مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ اربعۃ ایام ان پہلے دودنوں کو شامل کرکے ہیں۔ اس سے الگ چار دن مراد نہیں ہیں۔ ورنہ مجموعی ایام چھ کے بجائے آٹھ ہوجائیں گے۔ جو تصریح قرآنی کے خلاف ہیں۔ اب یہاں غور کرنے سے بظاہر مقام کا مقتضی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ﴿خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ فرمانے کے بعد پہاڑوں وغیرہ کی تخلیق کو بھی فی یومین کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تو اس کا مجموعہ چار دن ہونا خود بخود معلوم ہوجاتا مگر قرآن کریم نے عنوان تعبیر اس کے بجائے یہ رکھا کہ زمین کی تخلیقات میں سے باقی ماندہ کو ذکر کرکے فرمایا کہ یہ کل چار دن ہوگئے۔ اس سے بظاہر اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ یہ چار دن متواتر اور مسلسل نہیں ہیں بلکہ دوحصوں میں منقسم تھے۔ دودن تخلیق سموات سے پہلے دودن اس کے بعد۔ اور آیت مذکورہ میں جو **خلق فیھا رواسی من فوقھا** الخ کا ذکر ہے۔ یہ آسمانوں کی تخلیق کے بعد کا بیان ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن ج ۷/ ۶۳۴ تا ۶۳۷)

علامہ عصام الدینؒ نے کہا کہ **والارض بعد ذلک دحھا** میں **بعد ذلک** ایسا ہی ہے جیسا کہ سورۂ نون میں ﴿بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ﴾ (پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۱۳) میں ہے۔ یعنی تراخی فی الاخبار مراد ہے۔

جمہور علماء صحابہؓ وتابعین عبداللہ بن عباسؓ ومجاہدؒ وحسنؒ وغیرہ اسی تفسیر پر متفق ہیں کہ آسمان زمین کے بعد بنایا گیا۔ گو زمین باقاعدہ آسمان کے بعد بچھائی اور سجائی گئی ہے۔ لیکن بعض علماء (قتادہؒ، مقاتلؒ، قاضی بیضاویؒ وغیرہ) یہ کہتے ہیں کہ آسمان کو پہلے پیدا کیا گیا زمین کو بعد میں جیسا کہ سورۂ نازعات آیت (**والارض بعد ذلک دحھا**) سے معلوم ہوتا ہے یہ حضرات ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ﴾ میں (جو سورۂ بقرہ آیت ۲۹ اور سورۂ حم سجدہ آیت ۱۱ میں ہے) یہ تاویل کرتے ہیں کہ **ثم تراخی زمانی** کے لئے نہیں ہے بلکہ تراخی مکانی اور بعد رتبی کے لئے ہے۔ **لان خلق السماء اعجب واکبر من خلق الارض. واللہ اعلم (وان شئت التفصیل فلیراجع الی رسالتنا)** "پیدائش زمین وآسمان"۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى (۳۴) يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (۳۵)

پھر جب بڑا حادثہ آجائے گا۔ یعنی جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا

سَعٰی	مَا	الْاِنْسَانُ	يَتَذَكَّرُ	يَوْمَ	الْكُبْرٰى	الطَّآمَّةُ	جَآءَتِ	فَاِذَا
سعی کی تھی	جو	آدمی	یاد کرے گا	دن	بڑی	آفت	آئے گی	پس جب

وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی (۳۶) فَاَمَّا مَنْ طَغٰی (۳۷) وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۳۸)

اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کی جائیگی تو جس نے سرکشی کی ہوگی، اور دینوی زندگی کو

وَ	بُرِّزَتِ	الْجَحِیْمُ	لِمَنْ	یَرٰی	فَاَمَّا	مَنْ	طَغٰی	وَاٰثَرَ	الْحَیٰوۃَ	الدُّنْیَا
اور	ظاہر کی جائیگی	دوزخ	واسطے اس شخص	دیکھتا ہے	پس اپیر	جس	سرکشی کی	اور، اختیا کیا	زندگانی	دنیا

فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی (۳۹) وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ

پسند کرلیا ہوگا۔سو دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے نفس کو

فَاِنَّ	الْجَحِیْمَ	هِیَ	الْمَاْوٰی	وَ	اَمَّا	مَنْ	خَافَ	مَقَامَ	رَبِّهٖ	وَ	نَهَی	النَّفْسَ
پس تحقیق	دوزخ	وہی	جگہ رہنے کی	اور	اپیر	جوکوئی	ڈرا	کھڑے ہونے	پروردگار اپنے	اور	منع کیا	جی

عَنِ الْهَوٰی (۴۰) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی (۴۱)

خواہش سے باز رکھا ہوگا۔ تو جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

عَنِ	الْهَوٰی	فَاِنَّ	الْجَنَّةَ	هِیَ	الْمَاْوٰی
سے	خواہش	پس تحقیق	بہشت	وہی	جگہ رہنے کی

لغات:

طآمۃ بڑی آفت، بڑا ہنگامہ، قیامت، طم طماً، طمو مًا (ن) بھرنا۔زیادہ ہونا۔گرہ لگانا۔ڈھانپ لینا۔(ن، ض) آہستہ آہستہ دوڑنا۔پاٹ دینا۔غالب آجانا طامۃ وہ بڑی مصیبت جو ہر چیز پر چھا جائے۔یہاں اس سے مراد قیامت ہے، کیونکہ ہنگامہ قیامت سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔برزت باب تفعیل سے ظاہر ہونا۔(ن) ظاہر ہونا الجحیم دوزخ۔دہکتی ہوئی آگ۔جحم جحمًا (ف) بھڑ کانا جحماو جحومًا (س) بھڑکنا جحیم اسی سے مشتق ہے فعیل بمعنی فاعل۔امام ابن جریجؒ سے مروی ہے کہ دوزخ کے سات طبقے ہیں۔(۱) جهنم (۲) لظیٰ (۳) حطمه (۴) سعیر (۵) سقر (۶) جحیم (۷) هاویه. (معالم التنزیل ج ۵/۴) آثر افعال سے ترجیح دینا (ن ص) نقل کرنا۔الماوی ٹھکانا۔اسم ظرف یا مصدر۔قیام کرنا۔ٹھکانا پکڑنا، سکونت پذیر ہونا یا جائے قیام۔ٹھکانا اوٰی (ض) اگر صلہ الی ہو تو ٹھکانا پکڑنے۔پناہ پکڑنے اور فروکش ہونے کے معنی ہوں گے۔لیکن اگر اس کے بعد لام آئیگا تو مہربانی اور رحم کرنے کے معنی ہوں گے۔اوی له ای رحمه۔باب افعال سے متعدی آتا ہے۔مقام مصدر یا ظرف مکان باب نصر.

ترکیب:

فاء سببیه اذا ظرفیہ متضمن بمعنی شرط جآءت فعل الطامة الکبری مرکب توصیفی فاعل جملہ فعلیہ مبدل منه۔یوم مضاف یتذکر، فعل الانسان فاعل ما مصدریہ سعی جملہ فعلیہ بتاویل مصدر مفعول بہ۔یا ما موصولہ سعی جملہ صلہ، موصول وصلہ ملکر مفعول بہ (عائد محذوف ہے) جملہ مضاف الیہ یوم کا اور وہ بدل ہے اذا کا۔وَ عاطفه برزت فعل الجحیم فاعل من موصولہ اپنے صلہ یری جملہ فعلیہ سے ملکر مجرور لام کا۔متعلق فعل ہوا (ومفعول یری محذوف لرعایة الفاصلة ای یراها والعائد الی الموصول ضمیر الفاعل) جملہ فعلیہ ماقبل پر معطوف۔اور اذا

کا جواب محذوف ہے جس پر یتذکر دلالت کررہا ہے۔ یا انقسم الناس قسمین فریق فی الجحیم وفریق فی الجنۃ. جواب محذوف مان لو۔ اور ظاہر یہ ہے کہ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں۔ آئندہ جو تفصیل احوال فاما من طغی...... آرہی ہے وہی اذا کا جواب ہوگا۔ فاء تعقیبیہ ہے کہ اگر جواب اذا محذوف مانو ورنہ جزائیہ اما حرف تفصیل برائے شرط من موصولہ طغی جملہ فعلیہ معطوف علیہ" و "عاطفہ آثر فعل ضمیر مستتر فاعل الحیوۃ الدنیا مرکب توصیفی مفعول بہ جملہ فعلیہ معطوف۔ معطوفین شرط فان الجحیم ھی الماوی جملہ اسمیہ جزاء ھی ضمیر فصل ہے۔ اس کا محل اعراب نہیں۔ اور ایک قول کے مطابق مبتدا ہے اور الماوی خبر ہے۔ جملہ اسمیہ ہوکر خبر ان ہوگی۔ اور یہ جملہ اسمیہ جزاء ہے الماوی میں الف لام کوفیوں کے نزدیک بعوض مضاف الیہ ہے ای ما واہ سیبویہ اور بصریوں کے نزدیک من کا عائد محذوف ہے۔ واما من خاف...... کی ترکیب بھی اسی طرح ہے۔

تفسیر:

ایجاد کائنات کے ذکر سے قدرت خداوندی وامکان بعث کا ثبوت ہوگیا۔ پھر حشر پر دلیل بھی قائم کردی گئی تو ان آیات میں قیامت کے احوال، اس دن کی شدّت، ہر شخص کے اعمال کا سامنے آجانا۔ اور اہل جنت اور اہل جہنم کے ٹھکانوں کا بیان اور دونوں فریقوں کی خاص خاص علامات کا ذکر ہے جن کو دیکھ کر انسان دنیا ہی میں فیصلہ کرسکتا ہے کہ ضابطہ میں میرا ٹھکانا دوزخ ہے یا جنت۔ ضابطہ اسی لئے کہا کہ کسی کی شفاعت یا حق تعالیٰ کی رحمت سے کسی دوزخی کو جنت مل جانا ایک استثنائی حکم ہے۔ اصل ضابطہ جنت یا دوزخ میں ٹھکانا بننے کا وہی ہے جو ان آیات میں مذکور ہے۔

فاما من طغی...... اس میں اہل جہنم کی دو علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) طغیان یعنی اللہ اور اس کے احکام کی پابندی کی بجائے سرکشی کرنا (۲) دنیا کی فانی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا یعنی جب کوئی ایسا کام سامنے آئے کہ اس کے اختیار کرنے سے دنیا میں تو آرام یا لذت ملتی ہے۔ مگر آخرت میں اس سے عذاب کا اندیشہ ہے اس وقت وہ دنیا کی لذت کو ترجیح دیتا ہے۔ اور آخرت کی فکر کو نظر انداز کردیتا ہے۔ تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

واما من خاف...... اس میں اہل جنت کی بھی دو نشانیاں ذکر فرمائی گئی ہیں۔ (۱) اللہ کے سامنے ہوکر اس کی بارگاہ میں حساب دینے سے ڈرتا ہے یا اس کی عظمت وقہر سے لرزتا ہے۔ (۲) اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے۔ اور ناجائز خواہشات سے اس کو بچائے رکھتا ہے تو اس کا ٹھکانا جنت ہے۔ قوت علمیہ وقوت عملیہ دونوں بنیادی چیزیں ہیں۔ طغیان وسرکشی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا ان دونوں قوتوں کا فساد ہے جس کا انجام دوزخ ہے اور اللہ کا خوف حاصل ہونا، اور نفسانی خواہشات سے باز رہنا ان دونوں قوتوں کی صلاح ہے جس کا انجام جنت ہے۔

ہوائے نفسانی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے:

ھوی تمام ممنوعات کا سرچشمہ اور حرام چیزوں کی بنیاد ہے ھوی کے معنی ہیں اپنی پسندیدہ چیزوں کیطرف نفس کا میلان۔ ھوی کے لغوی معنی گرنے کے ہیں۔ کیونکہ ھوی اپنے صاحب کو دنیا میں مصیبت میں لے گرتی ہے اور آخرت میں ھاویہ (دوزخ) میں۔ اس لئے ہوا کو ہوا کہتے ہیں۔ ابوبکر وراق کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ھوا سے زیادہ خبیث کوئی مخلوق پیدا

نہیں کی۔ ہوا عقلاً اور شرعاً ہر طرح مذموم ہے۔ عقائد صحیحہ کا حصول۔ اچھے برے اعمال کی شناخت، خصائل ورذائل میں امتیاز اور عبادت وغبادت میں فرق، اپنی خواہش کو چھوڑ کر پیغمبروں کی اتباع کئے بغیر ناممکن ہے۔ خواہش پرستی اتباع انبیاء کیخلاف ہے جسقدر عقائد باطلہ وافکار فاسدہ اور اعمال خبیثہ اس دنیا میں جاری ہیں۔ ان سب کی بنیاد ہوا ہی ہے۔ ہوا پرستوں نے ہی باطل فرقوں کی بنیاد رکھی اور ان کو فروغ دیا ہے۔ مجدد صاحبؒ نے حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ اللہ تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ مخالفت نفس ہے۔ مراد یہ ہے کہ احکام شرع کی پوری نگہداشت کے ساتھ نفس کی مخالفت کی جائے۔ واللہ اعلم۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین چیزیں برباد کرنے والی ہیں۔ خواہش جس کا اتباع کیا جائے۔ حد سے بڑھکر کنجوسی جس کے حکم پر چلا جائے۔ اور خود پرستی جو کہ سب سے زیادہ بری ہے۔

مخالفت نفس کے تین درجے:

آیت مذکورہ میں جنت میں ٹھکانا بننے کی دو شرطیں مذکور ہیں۔ ایک خدا کی بارگاہ میں جوابدہی کا خوف۔ دوسری نفس کو ہوا سے روکنا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو خوف خدا ہی اصل چیز ہے۔ اسی سے انسان خواہشات نفسانی سے باز رہتا ہے۔ صاحب مظہریؒ نے فرمایا کہ مخالفت ہوا کے تین درجے ہیں۔ **اول درجہ** تو یہ ہے کہ آدمی ان عقائد باطلہ سے بچ جائے جو نصوص ظاہرہ و اجماع سلف کے خلاف ہوں۔ اس درجہ میں پہنچ کر وہ سنی مسلمان کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ **دوسرا درجہ**: یہ ہے کہ وہ کسی گناہ کا ارادہ کرے اور اس کو یہ یاد آجائے کہ مجھے اللہ کے سامنے حساب دینا ہے اس خیال کی بنا پر گناہ ترک کردے اس متوسط درجہ کا تکملہ یہ ہے کہ آدمی شبہات سے بھی پرہیز کرنے لگے، بلکہ جس مباح کام میں مشغول ہونے سے کسی ناجائز کام میں مبتلا ہوجانیکا خطرہ ہو اس کام کو بھی چھوڑ دے۔ جیسا کہ حضرت نعمان بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرلیا اس نے اپنی آبرو اور اپنے دین کو بچالیا اور جو مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو گیا آخر کار وہ حرام چیزوں میں مبتلا ہو جائیگا۔ جیسے وہ چرواہا جو جانوروں کو محفوظ وممنوع چراہ گاہ کے آس پاس چراتا ہے ممکن ہے کسی جانور کو چراگاہ میں بھی ڈالدے۔ (بخاری ومسلم) مشتبہ چیزوں سے وہ کام مراد ہیں جن میں جائز وناجائز ہونے کے دونوں احتمال ہوں۔ یعنی عمل کرنے والے کو یہ شبہ ہو کہ میرے لئے یہ کام جائز ہے یا ناجائز۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہے۔ وضو کرنے پر قادر تو ہے اور اس کا پورا یقین نہیں کہ میرے لئے اس حالت میں وضو کرنا مضر ہی ہوگا تو اس پر تیمم کا جواز وعدم جواز مشتبہ ہو گیا۔ اسی طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے مگر مشقت بہت زیادہ ہے اس کی وجہ سے مشتبہ ہو گیا کہ بیٹھ کر میرے لئے نماز درست ہے یا نہیں۔ ایسے موقعوں پر مشتبہ چیزوں کو چھوڑ کر یقینی جواز کو اختیار کرنا تقوی ہے۔ اور مخالفت ہوائے نفس کا متوسط درجہ یہی ہے۔

نفس کی پوشیدہ شرارتیں:

یہاں ایک خاص نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ جو گناہ کھلے ہوئے ہیں ان سے بخوف حساب پرہیز ممکن ہے۔ گناہوں کی ایک قسم وہ ہے جو چیونٹی کی چال سے زیادہ دقیق ہیں۔ یہ وہ گناہ ہیں جو نیکی کی شکل میں ہوتے ہیں۔ جیسے ریاء، خود پسندی، غرور اور کثرت نوافل وطاعات پر اپنی پاکیزگی کا خیال۔ اس مقام پر آدمی خود بھی دھوکہ کھا جاتا ہے۔ اپنے عمل کو درست اور قابل قبول سمجھتا رہتا ہے۔ یہی وہ ہوائے نفس ہے جس کی مخالفت سب سے زیادہ ضروری ہے کسی بزرگ نے اپنے مرید سے:

کہا تھا: بیٹا! مجھے یہ اندیشہ تو نہیں کہ گناہوں کے راستے سے شیطان کی رسائی تجھ تک ہو سکے گی۔ مجھے یہ خوف ہے کہ وہ نیکیوں کی راہ سے تجھ تک نہ پہنچ جائے۔ مگر اس سے بچنے کا صحیح علاج اور مجرب نسخہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر کام میں نفس کو مشتبہ سمجھے۔ اور زاری و استغفار کرتا رہے۔ اور مکمل حفاظت کی صورت یہ ہے کہ ایسے شیخ کامل کا دامن پکڑ لے جس نے کسی شیخ کامل کی خدمت میں رہ کر مجاہدات کیے ہوں۔ اور وہ عیوب نفس اور ان کے علاج میں مہارت رکھتا ہو۔ خود کو اسکے حوالے کر کے اس کے مشورہ پر عمل کرتا رہے۔ (شیخ کامل کو اپنے احوال کی اطلاع اور اس کے احکام کی پوری پوری اتباع معرفت کی کنجی ہے)

بہترین علاج:

حضرت یعقوب کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی ابتدائی عمر میں نجار (بڑھئی) تھا۔ میں نے اپنے نفس میں سستی اور باطن میں ایک قسم کی تاریکی محسوس کی۔ تو ارادہ کیا کہ چند روزے رکھ لوں تاکہ یہ تاریکی و سستی دور ہو جائے اتفاقاً اسی روزے کی حالت میں ایک دن شیخ اجل امام بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے مہمانوں کے لئے کھانا منگایا۔ اور مجھے بھی کھانے کا حکم دیا۔ اور فرمایا بہت برا بندہ ہے جو اپنی ہوائے نفسانی کا بندہ ہو جو اسے گمراہ کردے۔ اور فرمایا: کھانا کھالینا اس روزے سے بہتر ہے جو ہوائے نفسانی کے ساتھ ہو۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا نفس عجب و خود پسندی کا شکار ہے۔ جس کو شیخ نے محسوس کیا۔ اور یہ بات سمجھ میں آگئی کے ذکر شغل اور نفلی عبادات میں کسی شیخ کامل کی اجازت و ہدایت درکار ہے جو مکائد نفس سے واقف ہو اور خواہش نفس سے وہ خود آزاد ہو چکا ہو اس وقت میں نے حضرت شیخ نقشبند قدس سرہ سے عرض کیا کہ حضرت اگر ایسا شیخ جس کو اصطلاح میں فانی فی اللہ کہا جاتا ہے کسی کو میسر نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ شیخ نے فرمایا کے اس کو چاہیے کے استغفار کی کثرت کرے۔ اور ہر نماز کے بعد بیس مرتبہ استغفار کرنیکی پابندی کرے۔ تاکہ پانچ وقت میں سو مرتبہ ہو جائے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعض اوقات میں اپنے قلب میں کدورت محسوس کرتا ہوں۔ اور میں روزانہ اللہ تعالیٰ سے سو مرتبہ استغفار (یعنی طلب مغفرت) کرتا ہوں۔

تیسرا اعلیٰ درجہ:...... مخالفت ہوائے نفس کا یہ ہے کہ کثرت ذکر و مجاہدات کے ذریعہ اپنے نفس کو ایسا مزکی (اور پاکیزہ) بنالے کے اس میں وہ ہوائے نفسانی باقی ہی نہ رہے جو انسان کو شر کی طرف کھینچتی ہے۔ یہ مقام ولایت خاصہ کا مقام ہے۔ یہ اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کو صوفیاء کی اصطلاح میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کہتے ہیں۔ یہی لوگ قرآن کی اس آیت کے مصداق ہیں۔ جو شیطان کو مخاطب کر کے کہی گئی تھی: ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۴۲۔) (یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہیں چل سکے گا۔) اور یہی مصداق ہیں اس حدیث کے جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا ہے لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ (مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ج: ۱، ص: ۳۶، رقم: ۱۶۷۔) (یعنی تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفس میری تعلیمات کے تابع نہ ہو جائے) اللھم ارزقنا بفضلک و کرمک۔

خلق اطفال اند جز مرد خدا　　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (۴۲) فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (۴۳) اِلٰى رَبِّكَ

وہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا اس کے ذکر سے آپ کو کیا تعلق؟ اسکی خبر تو صرف آپکے پروردگار کو ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ	عَنِ	السَّاعَةِ	اَيَّانَ	مُرْسٰهَا	فِيْمَ	اَنْتَ	مِنْ	ذِكْرٰهَا	اِلٰى	رَبِّكَ
سوال کرتے ہیں تجھ (محمد)	سے	قیامت	کب	وقت کھڑا ہونے اس	بیچ اس بات	تو	سے	یاد اس	طرف	رب تیرے

مُنْتَهٰهَا (۴۴) اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (۴۵) كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا

آپ تو بس ایسے شخص کو ڈرانے والے ہیں جو اس سے ڈرتا ہو۔ جس دن اس کو دیکھ لیں گے

مُنْتَهٰهَا	اِنَّمَآ	اَنْتَ	مُنْذِر	مَنْ	يَّخْشٰهَا	كَاَنَّهُمْ	يَوْمَ	يَرَوْنَهَا
انتہا اس	سوائے اسکے نہیں کہ	تو	ڈرانے والا	اس شخص	ڈرتا ہے اس	گویا کہ وہ	دن	دیکھیں گے اس

لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (۴۶)

تو یہ سمجھیں گے کہ گویا (دنیا میں) ایک شام یا اس کی صبح رہے ہیں۔

لَمْ	يَلْبَثُوْٓا	اِلَّا	عَشِيَّةً	اَوْ	ضُحٰهَا
نہ	رہے تھے	مگر	ایک شام	یا	صبح اس

لغات:

ایان ظرف زمان مبنی علی الفتح ہے۔ امور عظام کے بارے میں سوال کرنے کے لئے آتا ہے مرتفصلیہ۔ مرسها مرسا مصدر میمی: ٹھہرانا۔ جمانا رَسَا رُسُواً (ن) ٹھہرنا، جمانا۔ باب افعال سے مصدر ارساءٌ اور مصدر میمی مرسا آتا ہے۔ منتهى اسم ظرف مکان بمعنی آخری حد یا ظرف زمان آخری وقت۔ علامہ بغویؒ نے کہا "اس علم کی آخری حد عشية ایک شام جمع عشيات و عشايا یہ عشى کی مؤنث ہے بسا اوقات اہل عرب اس کو مذکر بھی استعمال کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں عشية واحد ہے اس کی جمع عَشِيٌّ ہے۔

ترکیب:

یسئلونک فعل فاعل مفعول بہ عن جارہ الساعة مبدل منہ ایان ظرف مضاف مرسها مرکب اضافی مضاف الیہ۔ مضاف ومضاف الیہ ملکر بدل۔ مبدل منہ اور بدل ملکر مجرور، متعلق جملہ فعلیہ۔ فیم جار مجرور (وما الاستفهامية للانكار فحذفت الالف تخفيفاً كما فی عم) متعلق وَاقِفٌ کے خبر مقدم انت مبتدا من ذكرها متعلق خبر (وَاقِفٌ) جملہ اسمیہ الی ربک متعلق محذوف کائن وغیرہ کے خبر مقدم۔ منتهها مبتدا مؤخر۔ جملہ اسمیہ۔ انما کلمہ حصر انت مبتدا منذر مضاف من موصولہ یخشها جملہ صلہ۔ موصول وصلہ ملکر مضاف الیہ خبر۔ جملیہ اسمیہ كأن حرف مشبہ بفعل هم اسم یوم مضاف یرونها جملہ فعلیہ مضاف الیہ مرکب اضافی یقولون محذوف کا ظرف، لم یلبثوا فعل ضمیر فاعل الا حرف استثناء لغو عشية ای قدر عشية بحذف المضاف واقامة المضاف اليه مقامه) معطوف علیہ او حرف عطف ضحها (ای ضحی العشية واضافة الضحى اليها لادنى الملابسة هى اجتماعهما فی نهار واحد) معطوف۔ معطوفین ظرف لم یلبثوا کا جملہ فعلیہ مقولہ۔ اور وہ جملہ بن کر كأن کی خبر۔ جملہ اسمیہ ہوا۔

تفسیر:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور استہزا دریافت کیا تھا کہ قیامت کب آئیگی؟ تو یہ مذکورہ آیات نازل ہوئیں۔ اوران کے اس معاندانہ سوال کا جواب ان میں دیا گیا جواب کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے بپا ہونے کی تاریخ کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ اوراس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ہے کہ اسکی اطلاع کسی فرشتے یا رسول کو بھی نہیں دی گئی۔ اس لئے یہ مطالبہ لغو ہے۔ فیم انت من ذکر ھا لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے متعلق پوچھتے تھے۔ تو آپ ان کو جواب دینے کے خواہش مند تھے۔ اور اللہ تعالیٰ سے یا حضرت جبرئیل سے اس کا وقت معین معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ان آیات کے نزول پر آپ نے سوال ترک کردیا۔ صاحب مظہریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ تعیین قیامت کو پوشیدہ رکھنے میں کوئی خاص حکمت ہے۔ اوراس کا علم ناقابل امید ہے۔ فیم انت...... کا مطلب یہ ہے کہ آپ قیامت کے کس ذکر پر پڑے ہیں اس کے وقت کا بیان جائز نہیں، کیونکہ آپ کو نہ اسکا علم ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس کے پوشیدہ رکھنے میں کوئی مصلحت ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کا علم خود آپ کو نہیں (اس صورت میں ذکری بمعنی علم ہوگا) محاورہ بولا جاتا ہے لَیْسَ فُلَانٌ فِی الْعِلْمِ مِنْ شَیْءٍ ۔ یعنی فلاں شخص کو بالکل علم نہیں۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ فیم خبر ہواوراس کا مبتدا محذوف ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ سوال کس غرض سے ہے۔ اسکا کیا فائدہ؟ اس کے بعد انت من ذکر ھا سے نیا کلام شروع ہوگیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود علامات قیامت میں سے ہیں۔ آپ کے وجود سے تو قیامت کی یاد آتی ہے کیونکہ آپ آخری نبیؐ ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعثت انا والساعۃ کھاتین مجھ کو اور قیامت کو ان دونوں انگلیوں وسطی ومسبحہ) کی طرح (متصل) بھیجا گیا ہے ایک روایت میں ہے کہ مجھے قیامت کے وقت ہی بھیجا گیا ہے۔ مجھے سابق بنادیا گیا ہے جیسے یہ اس سے سابق ہے۔ اورآپ نے کلمہ کی انگلی اور انگوٹھے کی طرف اشارہ فرمایا (ترمذی) ایک قول یہ بھی ہے کہ فیم انت من ذکر ھا کا تعلق یسئلونک سے ہے۔ یعنی وہ لوگ آپ سے قیامت کا وقت پوچھتے ہیں وہ کب آئیگی؟ اور کہتے ہیں کہ تم کو اس کے وقت مقرر کے متعلق کیا معلومات ہیں بتاؤ؟ الی ربک یہ انکار سابق کے علت ہے لیکن اگر فیم انت کو سوال کا تتمہ قرار دیا جائے (جیسا کہ اس کی آخری توجیہ ہے) تو یہ کلام جواب ہوگا۔ فتفکر۔ انما انت...... یعنی آپ کو قیامت کا وقت بیان کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ صرف اہل خشیت کو ڈرانے کے لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ شدائد قیامت میں مبتلا ہونے کے اسباب سے پرہیز کریں۔ اور صرف قیامت کے آنے کا یقین اوراس کا اجمالی علم ڈرانے کے لئے اوراس سے ڈرنے کے لئے کافی ہے تعین وتفصیل کی ضرورت نہیں۔ پھر آپ سب ہی کے لئے منذر ونذیر ہیں۔ مگر آپ کے انذار کا فائدہ صرف اہل خشیت کو پہنچتا ہے۔ اس لئے آیت میں خاص طور سے انہیں کو ذکر فرمایا گیا۔ یہ آیت مضمون سابق کی تاکید ہے۔ کانھم یوم یعنی جس دن منکرین قیامت کا مشاہدہ کریں گے تو اس کے طول کی وجہ سے ایسا محسوس کرینگے کہ دنیا میں اور قبروں میں ایک دن بھی نہیں ٹھہرے۔ بلکہ دن کے نصف اخیر یا نصف اول میں رہے ہیں۔ چونکہ دنیا اور قبروں کی محدود مدت ہے جو ختم ہوچکی ہوگی۔ اور عذاب کی مدت غیر محدود ہوگی۔ اور عذاب کی شدت بھی ہوگی۔ اس لئے وہ مدت عذاب کے مقابلہ میں دنیا وقبر کی مدت کو ہیچ سمجھیں گے۔ اور خیال کریں گے کہ ہم وہاں تھوڑے ہی وقت رہے ہیں۔

تم تفسیر سورۃ النزعت فالحمد للہ رب الکائنات والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ سید الموجودات وعلی آلہ وصحبہ البررۃ الذین فازوا بالسعادۃ والکرامات

سُورَةُ عَبَسَ

سورة عبس مكية وهى اثنتان واربعون اية وفيها ركوع احد

رکوع:۱،آیات:۴۲، سورۂ عبس مکیہ ہے اوراس میں بیالیس آیات ہیں اورایک رکوع ہے کلمات:۱۳۰،حروف:۵۳۵۔

ربط ومناسبت:

یہ سورت بالاتفاق مکیہ ہے۔سورہ نازعات اوراس سورت میں ربط کئی وجوہ سے ہے۔ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:(۱)نازعات میں صاحب خشیت کے انذار کا حکم تھا: اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا اس سورت میں اس منصب کے ترک یا اس سے تغافل پر عتاب فرمایا گیا ہے۔وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰى وَهُوَ یَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى۔ (۲) نازعات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صاحب اقتدار اور متکبر بادشاہ کے پاس جا کر اس کو دعوت دینے کے حکم کا ذکر تھا۔اس سورت میں ایک نابینا مفلس کی طرف خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ فرمایا گیا۔اس طرح دونوں سورتوں میں نسبت تقابل ہوئی۔(۳)وہاں هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى تھا۔یہاں لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰى ہے۔(۴)وہاں فرعون کی سرکشی اور طغیان کا بیان تھا۔یہاں اس نابینا طالب حق کی خشیت وخاکساری کا ذکر ہے۔(۵)پیغمبر(موسیٰ علیہ السلام)کو متکبر کے پاس جانے کا حکم مذکور تھا۔اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ یہاں طالب حق بندۂ خدا کے خود دربار رسالت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے،وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰى یہاں سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کا شیوہ کمال اطاعت ہے سرکشوں کی ملاقات کا حکم ہو تو بسر وچشم،فقراء کی توقیر کا فرمان ہو تو سر تسلیم خم۔(۶)وہاں بھی احوال قیامت کا ذکر ہے فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى...... اور یہاں بھی فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ...... (۷)وہاں بھی اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا میں انعامات خداوندی کا ذکر تھا یہاں بھی فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ سے نعمتوں ہی کا تذکرہ ہے(۸)وہاں زمین وآسمان کی پیدائش کا ذکر تھا یہاں تاجدار کائنات حضرت انسان کی پیدائش کا مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُّطْفَةٍ ...... میں ذکر ہے۔

شان نزول:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مسجد الحرام میں تشریف فرما تھے۔اور آپ کے پاس سرداران قریش عتبہ،ربیعہ، ولید ابن مغیرہ،ابی بن خلف،امیہ بن خلف،شیبہ،ابوجہل بن ہشام،عباس بن عبدالمطلب وغیرہ موجود تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام کی خوبیاں اور شرک اور بت پرستی کی خامیاں بتا کر توحید کی دعوت دے رہے تھے۔اور آپ ان کی طرف پوری طرح متوجہ تھے۔ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن شریح بن مالک بن ربیعہ زہری جن کو عبداللہ بن ام مکتوم بھی کہا جاتا ہے(مکتوم بمعنی پوشیدہ نابینا کو کہتے ہیں ان کی والدہ کو ام مکتوم کہتے تھے)آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔آپ کو ایسی مصروفیات کے وقت ان کا آنا ناگوار ہوا،کیونکہ نابینا موقع ومحل کی رعایت کے بغیر بات کر دیتا ہے اور بسا اوقات نہ دیکھنے کی وجہ سے بیجا خلل انداز ہوتا ہے۔چنانچہ ان صحابی نے مجلس کا لحاظ کئے بغیر درخواست کر دی **یارسول اللہ! علمنی مما علمک اللہ**۔(اے اللہ کے رسول مجھ کو احکام خداوندی یا آیات قرآنی سکھا دیجئے)آپ نے کچھ جواب نہ دیا مگر وہ نابینا بار بار سوال کرتے رہے۔جس کی وجہ سے آپ کے رخ انور پر خفگی وناگواری کے آثار ظاہر ہو گئے۔اوران صحابی سے منہ

موڑ کر مشرکین سرداران قریش کی طرف متوجہ رہے۔ اسی حالت میں سورۂ عبس نازل ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آیات کو سنتے جاتے تھے۔ اور آپ کا رخ انور خوف عتاب اور ہیبت خطاب کی وجہ سے زرد ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جبرئیل امین کلا انها تذكرة...... پر پہنچے تو آپ مطمئن ہوئے۔ اور خوشی سے رنگ نکھر گیا کہ یہ عتاب وخطاب صرف بطور نصیحت اور سراپا مہر وعنایت ہے۔ غضب کے لئے نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کے نزول کے بعد ان نابینا صحابی کے گھر پہنچے۔ جو مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔ عذر فرمایا اپنے ہمراہ لے کر دولت کدہ پر تشریف لائے۔ اور اپنی مبارک چادر بچھا کر ان کو اس پر بیٹھا دیا۔ پھر آپ کا یہ معمول ہو گیا کہ جب وہ صحابی حاضر خدمت ہوتے تو آپ ان کی نہایت تعظیم وتکریم فرماتے۔ اور ارشاد فرماتے تھے۔ مرحبا بمن عاتبني فيه ربي یعنی مسرت کے ساتھ ان کو خوش آمدید کہہ کر ان کا استقبال فرماتے۔ پھر آن سے معلوم کرتے کیا کچھ کام ہے اور کیا کوئی ضرورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مدینہ منورہ میں دو مرتبہ مسجد نبوی کی امامت کے لئے اپنا نائب مقرر فرما کر سفر میں تشریف لے گئے (مظہری)

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تیرہ بار مدینہ میں اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔ اور یہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ (**كما رواه ابن عبد البر في الاستيعاب عن اهل العلم**) پھر آپ نے ابولبابہ کو بھی اپنا نائب مقرر فرمایا ہے حضرت ابن ام مکتوم مہاجرین میں سے ہیں علامہ قرطبی سے چوک ہوئی ہے کہ انہوں نے ان کو مدنی صحابی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ سرداران قریش کے واقعہ میں یہ موجود نہ تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جنگ قادسیہ کے موقع پر اس نابینا کا عجیب حال دیکھا کہ وہ زرع پہنے ہوئے ایک عربی گھوڑے پر سوار تھے۔ اور ان کے پاس ایک سیاہ جھنڈا تھا۔ نابینا ہونے کے باوجود کفار کی صفوں پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ بالآخر شہید ہو گئے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ واپس ہو کر مدینہ میں وفات پائی۔ واللہ اعلم۔

صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ عبداللہ ابن ام مکتوم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ماموں زاد بھائی یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبتی بھائی تھے۔ اور ان کے نام اور سلسلہ نسب میں دو قول ہیں۔ (۱) عمرو بن قیس بن زائدۃ بن جندب بن هرم بن رواحہ بن حجر بن معیص بن عامر بن لوئی قرشی (۲) عبداللہ بن عمرو یا عبداللہ بن شریح بن مالک بن ابی ربیعۃ الفہری۔ **وقال والاول اكثر واشهر كما في جامع الاصول** نیز ان کی والدہ کی کنیت ام مکتوم تھی اور نام عاتکہ بنت عبداللہ المخزومیۃ تھا۔ علامہ زمخشری نے کشاف میں ام مکتوم ان کی دادی کی کنیت غلط لکھی ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ نابینا پیدا ہوئے تھے۔ اسی لئے ان کی ماں کو ام مکتوم کہتے تھے۔ یا بعد میں نابینا ہو گئے تھے۔ دونوں قول ہیں۔ واللہ اعلم۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بہت رحم کرنیوالا ہے

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى (۱) اَنۡ جَآءَهُ الۡاَعۡمٰىؕ (۲) وَمَا يُدۡرِيۡكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓىۙ (۳)

ترشرو ہوگئے اور رمنہ موڑلیا اس بات سے کہ ان کے پاس ایک اندھا آ گیا۔ اور آپکو کیا معلوم کہ وہ شاید سنور جاتا

عَبَسَ	وَ	تَوَلّٰى	اَنْ	جَآءَ	هُ	الْاَعْمٰى	وَ	مَا	يُدْرِيْكَ	لَعَلَّهٗ	يَزَّكّٰى
تیوری چڑھائی	اور	منہ موڑا	اس سے کہ	آیا	اس	اندھا	اور	کس چیز	معلوم کروایا تجھ	شاید وہ	پاک ہو جاتا

اَوۡ يَذَّكَّرُ فَتَنۡفَعَهُ الذِّكۡرٰی (۴) اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی (۵) فَاَنۡتَ لَهٗ تَصَدّٰی (٦)

یا نصیحت قبول کرلیتا اور اس کو نصیحت فائدہ پہنچاتی، لیکن جو پرواہ نہیں کرتا آپ اس کے تو پیچھے پڑتے ہیں

اَوۡ	يَذَّكَّر	فَتَنۡفَعَهُ	الذِّكۡرٰی	اَمَّا	مَنِ	اسۡتَغۡنٰی	فَاَنۡتَ	لَهٗ	تَصَدّٰی
یا	نصیحت سنتا	پس فائدہ دیتی اس	نصیحت	اپیر	جو شخص	بے پروائی کرتا ہے	پس تو	واسطے اس	تقید کرتا ہے

وَمَا عَلَيۡكَ اَلَّا يَزَّكّٰی (۷) وَاَمَّا مَنۡ جَآءَكَ يَسۡعٰی (۸)

حالانکہ آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں کہ وہ نہ سنورے اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے

وَ	مَا	عَلَيۡكَ	اَلَّا	يَزَّكّٰی	وَ	اَمَّا	مَنۡ	جَآءَكَ	يَسۡعٰی
اور	کیا	تیرے اوپر	یہ کہ نہ	پاک ہو وہ	اور	اپیر	جو کوئی	آیا تیرے	دوڑتا ہوا

وَهُوَ يَخۡشٰی (۹) فَاَنۡتَ عَنۡهُ تَلَهّٰی (۱۰) كَلَّآ اِنَّهَا تَذۡكِرَةٌ (۱۱) فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۱۲)

اور وہ ڈرتا ہے تو آپ اس سے بے پروائی برتتے ہیں آپ ہرگز ایسا نہ کیجئے یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پھر جس کا جی چاہے اس کو قبول کرلے۔

وَهُوَ	يَخۡشٰی	فَاَنۡتَ	عَنۡهُ	تَلَهّٰی	كَلَّا ، اِنَّهَا	تَذۡكِرَةٌ	فَمَنۡ	شَآءَ	ذَكَرَ ، هٗ
اور وہ	ڈرتا ہے	پس تو	اس سے	تغافل کرتا ہے	ہرگز نہیں، یہ	نصیحت	پس جو	چاہے	یاد کرے، اس

فِیۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ (۱۳) مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۱٤) بِاَيۡدِیۡ سَفَرَةٍ (۱۵) كِرَامٍ بَرَرَةٍ (۱٦)

وہ معزز بلند مرتبہ، پاکیزہ صحیفوں میں نیک، بزرگ لکھنے والوں کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔

فِیۡ	صُحُفٍ	مُّكَرَّمَةٍ	مَّرۡفُوۡعَةٍ	مُّطَهَّرَةٍ	بِاَيۡدِیۡ	سَفَرَةٍ	كِرَامٍ	بَرَرَةٍ
میں	صحیفے	باعزت	بلند مرتبہ	انتہائی پاکیزہ	ہاتھوں میں	لکھنے والے	بزرگ	نیکوکار

لغات:

عبس عَبَسًا عُبُوۡسًا (ض) تیوری چڑھانا، ترشرو ہونا، چیں بجبیں ہونا، منہ بنانا۔ راغب کہتے ہیں کہ ملول و دل تنگ ہوجانے سے ماتھے پر بل آجانے کو عبوس کہتے ہیں۔ امام رازیؒ کہتے ہیں کہ ماتھے پر بل ڈالنے کیساتھ دانت بھی ظاہر ہوجائیں تو اس کو "كَلَحٌ" جمہرۃ اللغۃ بولتے ہیں۔ اور اگر منہ بنانے کا فکر و اہتمام بھی ہو تو اسکو "بَسُرٌ" کہتے ہیں۔ اور اگر غصہ بھی ہو تو اس کو "بَسۡلٌ" کہتے ہیں۔ تولی واحد مذکر غائب، باب تفعل سے، منہ موڑا، توجہ نہ کی، بلاواسطہ تعدیہ ہو تو معنی ہوتے ہیں دوستی رکھنا، کسی کام کو اٹھانا، والی و حاکم ہونا۔ اور جب متعدی بعن ہو خواہ وہ عن لفظاً ہو یا تقدیراً تو منہ پھیرنے، توجہ نہ کرنے اور وہاں سے ہٹ جانے کے معنی میں آتے ہیں۔ حَسِبَ سے والی و متصرف ہونا، محبت کرنا، قریب ہونا۔ باب ضرب سے قلیل الاستعمال ہے۔ الاعمٰی صغیہ واحد مذکر صفت مشبہ (س) نابینا ہونا۔ استغنٰی صیغہ واحد مذکر غائب ماضی بے پرواہ ہونا۔ غَنِیَ غنی (س) مالدار ہونا۔ بے پرواہ ہونا۔ تصدی واحد مذکر حاضر مضارع باب تفعل سے تصدی در پے ہونا کسی چیز کے پیچھے پڑنا۔ صَدیٰ سے ماخوذ جس کے معنی آواز بازگشت کے ہیں۔ اس اعتبار سے تصدی کے معنی کسی چیز کے اس طرح مقابل ہونے کے ہونگے جس طرح آواز بازگشت مقابل ہوتی ہے۔ تصدی دراصل تتصدی تھا ایک تاء تخفیفاً حذف ہوگئی صَدِیَ صَدَیً (س) سخت پیاسا ہونا۔ تلھی صیغہ مثل تصدی بصلہ عن تغافل و بے پروائی کرنا۔

لَهَا اَلْهُوا(ن) کھیلنا، فریفتہ ہونا، مانوس ہونا، بصلہ عن غافل ہونا، بھولنا، (س) محبت کرنا۔ عن روگردانی کرنا۔ غافل ہونا۔ سفرۃ سافر کی جمع جیسے کاتب کی جمع کتبۃ۔ سفر کے اصلی معنی (ن ص) کھلنا، واضح ہونا، واضح کرنا ہیں۔ کاتب کو سافر اس لئے کہہ دیتے ہیں کہ وہ لکھ کر واضح کر دیتا ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ نبطی زبان میں اس کے معنی قراءت کرنے والوں کے ہیں۔ کرام جمع کریم کی جیسے لئام جمع لئیم کی۔ بررۃ بر کی جمع ہے۔ یہ لفظ ابرار کی بہ نسبت زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ ابرار بار کی جمع ہے اور بررۃ، بر کی۔ اور جس طرح عدل عادل سے زیادہ بلیغ ہے اسی طرح بر بھی بار سے ابلغ ہے۔

ترکیب:

عبس فعل فاعل عائد الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھونذ کورمعنیً جملہ فعلیہ خبریہ معطوف علیہ۔ ھکذا وتولی جملہ معطوف ان مصدریہ جاء فعل ہ مفعول بہ الاعمیٰ فاعل جملہ فعلیہ بتاویل مصدر مفعول لہ عبس کا کوفیوں کے نزدیک۔ اور تولی کا بصریوں کے نزدیک۔ و عاطفہ ما استفہامیہ مبتدا یدری فعل ضمیر فاعل ما کی طرف عائد ک مفعول اول لعل حرف مشبہ بہ فعل ہ اسم، یزکی فعل ضمیر فاعل جملہ فعلیہ خبر، جملہ مفعول ثانی، جملہ فعلیہ خبر ما جملہ اسمیہ ہوا۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یدری کا مفعول ثانی محذوف ہو ای ومایدریک حال عدم صلاحیۃ ھذا الاعمی اور لعلہ...... جملہ اسمیہ مستانفہ ہو۔ پھر لعلہ کی ضمیر میں بھی دو احتمال ہیں (۱) الاعمی کی طرف عائد ہے (۲) من حضر عندہ علیہ السلام من اشراف قریش کی طرف راجع ہے۔ اس ثانی صورت میں جملہ عبس موضع تعلیل میں ہوگا۔ اور یدری کا مفعول ثانی محذوف ہوگا۔ ای وما یدریک ان ذلک مرجو الوقوع او عاطفہ بمعنی واو یذکر جملہ کا عطف یزکی پر ہے۔ فتنفعہ الذکری، مفعول بہ، فاعل علی الترتیب جملہ معطوف یذکر پر۔ اما حرف تفصیل من موصول متضمن بمعنی الشرط استغنی جملہ فعلیہ صلہ مبتدا۔ فاء جزائیہ انت مبتدا تصدی فعل با فاعل لہ متعلق مقدم سے ملکر جملہ فعلیہ خبر۔ مبتدا خبر، جملہ اسمیہ خبر مبتدائے اول کی، و حالیہ ما مشابہ بلیس علیک الزاماً کے متعلق ہو کر خبر مقدم ان لایزکی جملہ بتاویل مفرد اسم مئوخر۔ جملہ اسمیہ ہو کر حال ہوگا۔ تصدی کی ضمیر سے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ ما کا اسم محذوف اور علیک خبر ہے ای لیس باس ثابتاً علیک اور ان سے پہلے لام جارہ ہے۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ ما مشابہ بلیس نہ ہو بلکہ برائے استفہام انکاری مبتدا ہو اور علیک، ثابت کے متعلق ہو کر خبر ای ضرر ثابت علیک...... واما من جاءک مثل سابق اور اسی پر عطف ہے۔ اور یسعی جملہ فعلیہ جآء کے فاعل سے حال ہے۔ اور وھو یخشی جملہ اسمیہ یسعی کے فاعل سے حال ہے۔ فانت عنہ تلھی مثل فانت لہ تصدی، کلا حرف ردع، ان حرف مشبہ بہ فعل اپنے اسم ھا اور خبر تذکرۃ سے مل کر جملہ اسمیہ تعلیل ردع ہے فمن شاء ذکرہ مرمثلہ۔ والضمیر فی "انھا و ذکرہ" راجعان الی القرآن، واما تانیث الاول فلتانیث الخبر وقیل الضمیر الاول للسورۃ او للآیات السابقۃ والثانی للتذکرۃ لانھا فی معنی الذکر والوعظ ومن جوز رجوعھما الی المضمون السابق فقد اخطأ واساء الادب فتامل صحف اپنی تمام صفات آئندہ سے مل کر کائنۃ کے متعلق ہو کر تذکرۃ کی صفت ہے یا ان کی خبر ثانی ہے اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ مبتدا محذوف ھی کی خبر ہے سفرۃ اپنی دونوں صفتوں سے مل کر مضاف الیہ ایدی کا مرکب اضافی مجرور متعلق مطھرۃ کا یا متعلق محذوف ہو کر ضمیر مطھرۃ سے حال ہے یا صحف کی چوتھی صفت۔ واللہ اعلم۔

تفسیر:

عبس وتولی...... (چیں بجبیں ہوگئے اور منہ موڑلیا اس وجہ سے کہ اندھا آ گیا) سورۂ عبس کی یہ ابتدائی آیات شان نزول میں مذکورہ واقعہ پر بطور عتاب نازل ہوئیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ حق تعالیٰ نے بنی آدم کی ہدایت کے لئے انہیں میں سے کچھ مقدس ہستیوں کو منتخب فرمالیا ہے۔ ان حضرات کا ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے کامل ربط و تعلق ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ کامل ومکمل انسان ہوتے ہیں۔ تمام بشری کمالات اور فطری تقاضے ان حضرات میں بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ مرضیات ربانی کا ان پر نزول ہوتا ہے۔ اور وہ بندوں کو ان کی تعلیم وتبلیغ کرتے ہیں۔ ان نفوس مقدسہ کے مربی ومعلم حق تعالیٰ ہوتے ہیں۔ اور وہ خلقت کے معلم ومربی ہوتے ہیں۔ ان نفوس قدسیہ کو انبیاء ورسل علیہم السلام کہتے ہیں جو خلق وخالق کے درمیان ایک واسطہ وربط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ معصوم اور جملہ عیوب ونقائص سے مبرا ہوتے ہیں۔ ہاں ان سے بھول چوک، اجتہادی خطاء بامنشائے خداوندی کے خلاف بھول کر گاہے کوئی فعل سرزد ہوسکتا ہے۔ جو گناہ نہیں ہوتا۔ مگر بڑوں کی معمولی اور ادنی سی فروگذاشت اور بے احتیاطی بھی عتاب وخفگی کا باعث ہوجاتی ہے۔ اور ان حضرات کی تادیب وتہذیب اور تعلیم احتیاط کے لئے عتاب کا اظہار بھی ہوتا ہے جیسے آدمی بھی اپنے چھوٹے بے شعور بچے کی بہت سی ناشائستہ حرکات کو نظر انداز کرتا ہے۔ اور اس کی بے ادبیوں پر بھی مواخذہ نہیں کرتا۔ اور بڑی اولاد کی ادنی بے التفاتی پر دارو گیر، عتاب اور اظہار خفگی کرتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ حضرات کاملین انبیاء ومرسلین علیہم السلام کی ادنی بے التفاتی پر جو ان کے منصب عالی ومرتبہ عظیم کے خلاف بھی نہیں ہے عتاب فرمایا جاتا ہے۔ بس اسی نوع کے مذکورہ واقعہ پر اس سورت میں عتاب کا نزول ہوا۔ جو اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ وَعَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ کا ایک عجیب خوشگوار و پرانوار منظر ہے (جمع الجوامع)

عتاب کیوں ہوا؟

اس مقام پر بڑا اشکال یہ ہے کہ عتاب آخر کیوں فرمایا گیا۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضائے عقل سلیم واصول شرع کے خلاف کوئی بات پیش نہیں آئی، شرعاً اور عقلاً آپ کا عمل درست اور برمحل تھا۔ (۱) عام نفع خاص پر مقدم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداران قریش کی دعوت وتبلیغ کو مقدم کیا جس میں نفع عام تھا۔ اور نابینا کی تعلیم کو موٴخر کردیا جس کا نفع خاص تھا۔ سرداران قریش کو دعوت دینے میں عام نفع اس لئے تھا کہ وہ دور قبائلی سرداری کا تھا۔ قبیلہ کا کوئی بڑا آدمی اسلام قبول کرلیتا تو پورا قبیلہ اسلام میں داخل ہوجاتا۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (مرقاۃ المفاتیح، کتاب الجھاد، باب الکتاب الیٰ الکفار ودعائھم، ج:۱۲، ص:۶۰) (۲) اصول دین اور ایمان کی دعوت مقدم ہے، اعمال وفروع کی تعلیم سے، کیونکہ اصول اور ایمان پر مدار نجات ہے نہ کہ اعمال پر۔ گویا کافر کی حالت سرسام والے مریض کی سی ہے۔ ذرا سی سستی وغفلت سے مریض لاعلاج ہوسکتا ہے اور مسائل شرعیہ یا تعلیم قرآن سے ناواقف کی حالت معمولی مریض کی سی ہے۔ جس کے علاج میں تاخیر کی بھی گنجائش ہے۔ اس لئے آپ نے کفار کی تبلیغ وتعلیم کو مقدم رکھا اور نابینا کی تعلیم کو موٴخر فرمایا۔ (۳) کفار کو اس وقت ایمان کی دعوت اور حق سمجھانے کا موقع میسر تھا۔ نہ معلوم پھر سہولت سے ایسا موقع ملتا یا نہ ملتا اور نابینا ہر

وقت کے حاضر باش خادم اور قریبی تعلق رکھنے والے تھے۔ ان کو کسی وقت بھی تعلیم دی جا سکتی تھی۔ (۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترشروئی نابینا کی نامناسب حرکات، بار بار تقاضے اور آپ کی بات کاٹ دینے کی وجہ سے غیر اختیاری طور پر پیش آئی۔ اور غیر اختیاری امور میں عتاب اور خفگی تکلیف مالا یطاق اور بے موقع ہے۔ (۵) پھر نابینا کے نزدیک ترشروئی وکشادہ روئی، متوجہ رہنا یا منہ پھیر لینا سب برابر ہے۔ جب اس کو نظر نہیں آتا تو رنج وملال بھی نہیں ہوگا جس پر عتاب ہو سکے۔ (۶) اس وقت تک اس فعل کی ممانعت بھی نازل نہ ہوئی تھی۔ جس سے اس کا ناپسندیدہ وخلاف منشائے خداوندی ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتا تو ابتدا ہی میں اس قدر عتاب وخفگی کا کیا موقع تھا؟ (۷) پھر اس طرز میں طالب کی اصلاح وتادیب بھی تھی۔ جو آپ کی تشریف آوری وبعث کا مقصود ہے۔

شبہات کا حل:

اوپر اصول معلوم ہو چکا ہے کہ ادنیٰ بے احتیاطی اور منشائے خداوندی کی معمولی خلاف ورزی پر بھی مقربین سے مواخذہ ہو جاتا ہے۔ گو وہ فروگذاشت گناہ کی حد تک نہ پہنچی ہو حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّاٰتُ الْمُقَرَّبِیْن بہت سے کام نیکوں کے لئے اجر وثواب کا باعث ہوتے ہیں۔ اور مقربین کے لئے وہی کام قابل مواخذہ ہو جاتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر   گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(۱) آپ نے نفعِ عام کو نفع خاص پر مقدم رکھا۔ مگر یقینی کو چھوڑ کر غیر یقینی کو اختیار فرمایا۔ نابینا کی تعلیم میں نفع متیقن تھا۔ اور سرداران قریش کو دعوت دینے میں یہ بات یقینی نہ تھی۔ کہ وہ ان کے لئے سودمند ثابت ہوگی۔ (۲) نفوس قدسیہ کو چاہئے کہ طالب کی قوت استعداد کا لحاظ رکھیں۔ اور اسی کے موافق فیض رسانی کریں۔ انجام کے اعتبار سے اسی میں نفع عام ہوتا ہے۔ خاکسار فقیر فیض حاصل کر کے عالم کے لئے شمع وچراغ بنتا اور تاریکیوں کو دور کرتا ہے۔ اور جس کے پاس طلب وقوت استعداد نہ ہو تو وہ خود بھی محروم اور ظلمتوں میں گرفتار رہتا ہے۔

الحاصل قوتِ استعداد سے نفع عام وتام ہوتا ہے۔ اہل ظاہر کثرت تعداد وقوت اسباب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کے منصب عالی کے موافق یہ اصول تھا۔ اور اس اصول پر نابینا فقیر کی طرف متوجہ ہوتے نہ کہ کثرت وقوت اور دولت وثروت والوں کیطرف۔ (۳) لاعلاج مریضوں کے علاج میں کامیابی کی توقع نہیں ہوتی۔ اور جن مریضوں کی شفا متوقع یا متیقن ہو ان پر ہی توجہ مبذول کرنا حکمت کا اصول ہے۔ (۴) آپ کا فرض منصبی پیغامات ربانی کو پہنچانا ہی تو تھا نہ کہ جبراً منوانا۔ اس لئے آپ اس کے مکلف نہ تھے کہ اب موقع میسر آ گیا ہے پھر آئے نہ آئے، بلکہ فرض منصبی کی ادائیگی کی طرف ہی متوجہ ہونا آپکے شایان شان تھا۔ اور طالب کو مایوس کر دینا مناسب نہ تھا۔ (۵) نابینا فقیر طالب تھا۔ اس کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑ جانا جن میں طلب نہ تھی۔ احتیاط کا تقاضا نہ تھا۔ طالب کی طبیعت فیض کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ اور اس کو تقاضا ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہوا جیسا کہ ایک بھوکے اور پیاسے کو چھوڑ کر ایسے شخص کو کھلانے پلانے کی کوشش کرنا جس کو بھوک پیاس کا احساس تک نہ ہو۔

(۶) نابینا آداب مجلس کا لحاظ نہ رکھنے اور بار بار تقاضا کر کے بات کاٹ دینے میں معذور تھا۔ اس عذر کو لفظ اعمیٰ سے بیان فرما دیا گیا کہ وہ نابینا تھے۔ انکو پتہ نہ چلا کہ آپ کس شغل میں مشغول ہیں۔ اس کی معذوری کو نظر انداز کر کے اظہار

خفگی آپ کی علوشان کے مناسب نہ تھا۔ گو یہ امر پورے طور پر اختیاری نہ تھا لیکن اگر احتیاط ملحوظ رکھی جاتی تو یہ امر غیر اختیاری نہ ہوتا۔ (۷) عتاب تقصیر وگناہ پر نہیں، بلکہ اس سے تربیت وتادیب مقصود ہے۔ اس تخلق باخلاق اللہ کی تعلیم وتاکید کرنے کے انداز میں عتاب اختیار کیا گیا ہے۔ دنیا میں ہر شخص اپنے چہیتوں کو اپنے اخلاق میں ڈھالتا ہے۔ اور ادنی خلاف ورزی پر تنبیہ کرتا ہے بادشاہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی اولاد صلحاو مشائخ کی طرح گوشہ نشیں ہو جائے اور علماء وصوفیہ اسکو پسند نہیں کرتے کہ ان کی اولاد سیاست اور وکالت وغیرہ کی لائینیں اختیار کریں۔ اسی طرح اللہ جل شانہ اپنے محبوب بندوں میں اپنے اخلاق وعادات دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے پہلے سے اجازت وممانعت وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں۔ (۸) فقیر نابینا سے لاپروائی اور ترشروئی پر علی الاعلان عتاب میں آپ کی امت کی تادیب وتربیت بھی مقصود ہے۔ گو اس فقیر کو اس کا احساس نہ ہوا۔ پھر اخلاص واحسان کی تعلیم بھی ہے کہ اللہ کا دھیان ہمہ وقت رہے۔

بھلائی کر بھلا ہوگا برائی کر برا ہوگا کوئی دیکھے نہ دیکھے پر خدا تو دیکھتا ہوگا

پھر جن لوگوں کو علم تھا ان سے اس خیال کو ہٹانا بھی منظور ہے کہ کسی قسم کی ریا محبوب حق میں ہو۔ (۹) یہ صحابی آنکھوں کے اندھے تھے دل کے بینا تھے۔ اور مشرکین دل کے اندھے تھے۔ اور یہ اندھاپن ہی اصل ہے تو آپ نے آنکھوں کے اندھے سے منہ پھیر لیا اور دل کے اندھوں کی طرف متوجہ رہے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا۔ دل کے اندھوں پر محنت رایئگاں ہے۔ اور وہ آنکھوں کا اندھا ہزاروں بیناؤں کا مقتدا بننے والا تھا۔

فدائے کوری خفاش چشم بینائی کہ بے خبر زرخ آفتاب نیم شبی است

(۱۰) یہ نابینا خدا کا دوست تھا۔ اور مشرکین دشمن تھے۔ دوست کا دوست التفات کا مستحق ہے نہ کہ دشمن۔

﴿تلک عشرۃ کاملۃ﴾

لطیفہ:...... اللہ تعالیٰ نے اس سورت کا نام ہی سورہ عبس رکھا ہے۔ یہ لفظ پورے واقعہ کی غمازی کرتا ہے۔ یہ لفظ جب بھی کسی شیخ ومعلم اور مربی کے ذہن وزبان پر آئیگا فوراً قصہ یاد آجائیگا۔ اور تلازمہ وطلبہ اور مریدین کے سلسلہ میں عبرت وموعظت قلب میں مستحضر ہو جائیگی۔ یہ مفیدین ومستفیدین پر خاص عنایت وکرم ہے۔

عظمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم:

ان آیات سے عظمت واعزاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند طریقوں سے معلوم ہوتا ہے۔ (۱) اس جگہ بظاہر ہر صے خطاب کا موقع تھا۔ لیکن اس کے بجائے غائب کا صیغہ اختیار کیا گیا جس میں عتاب کی حالت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اکرام واحترام ملحوظ رکھا گیا اس صیغہ غائب سے ایہام کیا گیا کہ جیسے یہ کام کسی اور نے کیا ہو کہ یہ کام آپ کی شایان شان نہ تھا کیونکہ دراصل ہر کام کا مدار نیت پر ہے۔ آپ کی نیت ان سے اعراض وانحراف کی نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ یہ تو اپنے ہیں۔ فرعی مسئلہ پوچھتے ہیں پھر کبھی تعلیم کردونگا۔ یہ لوگ اجنبی ہیں۔ اصول کی تبلیغ اہم ہے ذرا اعراض سے یہ لوگ چلے جائیں گے۔ پھر موقع میسر آنا دشوار ہوگا۔ اس لئے گویا یہ فعل آپ سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ اور آپ سے اعراض پایا ہی نہیں گیا۔

(۲) وما یدریک میں آپ کے عذر کی طرف بھی اشارہ فرمادیا گیا کہ بے خبری میں ایسا ہوا۔ اگر اس طرف دھیان گیا ہوتا کہ یہ صحابی جو کچھ دریافت کرتے ہیں۔ اس کا اثر یقینی ہے۔ اور غیروں سے گفتگو کا اثر موہوم ہے تو آپ ایسا نہ کرتے۔

(۳) یہ جملہ وما یدریک...... میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات میں آپ کے قلب سے ملال کو دور کرکے تکریم ودلجوئی بھی منظور ہے اگر بالکل خطاب کا صیغہ استعمال نہ ہوتا تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ اس عمل کی ناپسندیدگی ترک خطاب کا سبب بن گئی۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک نا قابل برداشت رنج والم کا باعث ہوتا۔ جس طرح پہلے دو جملوں میں غائب کا صیغہ استعمال کرنے میں آپ کی تکریم ودلجوئی ہے اس جملہ میں صیغہ خطاب سے تکریم ودلجوئی مفہوم ہوتی ہے۔

لعلہ یزکی او یذکر فتنفعہ الذکری...... یعنی آپ کو کیا معلوم کہ وہ دریافت کرنیوالے صحابی (اگر آپ ان کو تعلیم دیتے تو وہ) اپنے نفس کا تزکیہ کرکے کمال حاصل کرلیتے۔ یا کم از کم ذکر سے ابتدائی نفع اٹھاتے۔ جس سے ان کے دل میں خوف خداوندی اور اس کی محبت کی ترقی ہوجاتی۔ لفظ ذکری کے معنی کثرت ذکر کے ہیں۔

فائدہ...... یہاں قرآن کریم نے دو جملے اختیار فرمائے ہیں۔ ﴿یزکی، یذکر﴾ پہلے کے معنی پاک صاف ہونے کے ہیں۔ اور دوسرے کے معنی نصیحت حاصل کرنے اور ذکر سے متاثر ہونے کے ہیں۔ پہلا مقام ابرار واتقیاء کا ہے جو اپنے نفس کو ظاہری اور باطنی ہر قسم کی گندگیوں سے پاک صاف کرلیں۔ اور دوسرا مقام دین پر چلنے کا ابتدائی حال ہے کہ اس کو اللہ کی یاد دلائی جاتی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں اترتا ہے مطلب یہ ہے کہ ان کو تعلیم دینا نفع سے کسی حال میں خالی نہ تھا۔ خواہ نفع کامل ہوتا کہ وہ تزکیہ نفس مکمل حاصل کرلیتے۔ یا ابتدائی نفع حاصل ہوتا کہ اللہ کی یاد، عظمت وخوف ان کے قلب میں متحضر ہوجاتے۔ دونوں جملے بحرف تردید (اَو) مستعمل ہیں۔ یعنی ان دونوں میں سے کوئی ایک نفع ضرور حاصل ہوتا۔ یہ قضیہ مانعۃ الخلو ہے۔ یعنی دونوں جمع بھی ہوسکتے ہیں ابتداءً تذکر اور انتہاءً تزکیہ۔ لیکن دونوں مرتفع نہیں ہوسکتے۔ مانعۃ الجمع نہیں ہے کہ دونوں نفع جمع نہ ہوسکیں۔ اس کی مثال جَالِسُ الْحَسَنَ اَوْ ابْنَ سِیْرِیْنَ کہ ایک کے ہم نشین تو ضرور بنو دونوں کے بھی بن سکتے ہو۔

تنبیہ:...... مقربین وصدیقین کا حال یہاں نہیں بیان کیا گیا۔ یہ مقام اختیاری مراتب کے بیان کا ہے۔ اور ان کا مقام محض وہبی وعطیہ ربانی ہوتا ہے اعمال حسنہ سے اس مقام تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بعض علما کا قول ہے کہ لعلہ کی ضمیر اعمی کی طرف نہیں بلکہ کافر کی طرف راجع ہے۔ جس سے جنس کافر مراد ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو جن کفار کے نصیحت پذیر یا پاک ہوجانے کی حرص ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کی یہ تمنا پوری ہو ہی جائیگی۔ اس صورت میں یدری کا مفعول اول ک ہوگا اور مفعول ثانی لعلہ یزکی ہوگا۔

فائدہ...... ان آیات سے اشارۃً چند باتیں معلوم ہوئیں: (۱) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبوبیت (۲) کسی معذور آدمی سے بے خبری میں کوئی بات آداب مجلس کے خلاف سرزد ہوجائے تو وہ قابل مواخذہ وعتاب نہیں۔ (۳) سرداران قریش آپ کے تخاطب کے قابل نہ تھے۔ یہ نابینا صحابی لائق تخاطب والتفات تھے۔ (۴) ان کے اسلام کی توقع نہیں نہ ان کی اسلام کو ضرورت۔ (۵) طالب قابل توجہ ہے۔ بے طلب قابل التفات نہیں۔ (۶) اہل دعوت اور مصلحین کو اہل (اخلاص خواہ وہ مفلس ہوں) کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ اہل اسباب کی خاطر ان کو نظر انداز کردینا موجب عتاب ہے۔ کاش اہل علم اس راز کو سمجھیں۔ اور اس دور کے علماء اور رواجی مشائخ اپنے طرز پر نظر ثانی کریں۔

تبلیغ وتعلیم کا اہم ترین اصول:

یہ تو ظاہر ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام بیک وقت آ گئے تھے ایک تو مسلمان کو تعلیم اور اس کے تزکیہ وتکمیل اور دلجوئی کا مسئلہ۔ دوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لئے محنت وکوشش اور توجہ۔ قرآن پاک نے اس مقام پر واضح کر دیا کہ پہلا کام دوسرے کام پر مقدم ہے۔ دوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا کوئی خلل ڈالنا درست نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کی فکر غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدم ہے۔

اس میں ان علماء کے لئے ایک اہم ہدایت موجود ہے جو غیر مسلموں کے شبہات زائل کرنے اور ان کو اسلام سے مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن سے عام مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات یا شکایات پیدا ہو جاتی ہیں ان کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی حفاظت واصلاح حال کو مقدم رکھنا چاہئے۔ اکبر مرحوم نے خوب فرمایا ہے۔

بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو ۔۔۔ دَیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

بعد والی آیات میں قرآن مقدس نے اسی بات کو پوری وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ **اما من استغنی** ...... یعنی جو شخص آپ سے استغناء وبے رخی برت رہا ہے تو آپ پر کوئی الزام نہیں۔ اور جو شخص دوڑتا ہوا طلب علم دین کے لئے آتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا بھی ہے۔ آپ اس کی جانب التفات نہیں فرماتے۔ ان آیات میں واضح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کر کے ان کو پکا مسلمان بنانا غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی فکر سے زیادہ اہم اور مقدم ہے۔ واللہ اعلم۔

کلا انہا تذکرۃ...... اس آیت میں بیان فرمایا گیا کہ یہ قرآن (یا سورت یا آیات) اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے ایک نصیحت ہے۔ جو طالب کو نافع ہے۔ اسی لئے فرمایا **فمن شاء ذکرہ** جو چاہے اس کو قبول کرے اور یاد کرے۔ یہ زبردستی چمٹانے کی چیز نہیں۔ آفتاب کو احتیاج نہیں جس کو ضرورت ہے اس کی روشنی سے کام لے۔ نفع حاصل کرے۔ اس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی گئی ہے کہ آپ لوگوں کے پیچھے زیادہ نہ پڑیں۔ کام کی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرض منصبی ادا فرمادیں اور بس۔ صاحب مظہریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اشارۃً قرآن کو حفظ نہ کرنے والوں کو زجر اور حفظ کرنیوالوں کی ثناء بھی ہے۔ بلکہ عام معنی کے اعتبار سے یہ کہنا زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے اعراض کرنے والوں کی مذمت اور اس میں مشغول رہنے والوں کی مدحت اس سے اشارۃً مفہوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

فی صحف مکرمۃ ...... صحف سے مراد لوح محفوظ ہے۔ وہ اگرچہ ایک ہی ہے۔ مگر اس کو جمع اسلئے لایا گیا ہے کہ اس میں تمام صحف آسمانی مکتوب ہیں۔ یا اسلئے کہ فرشتے اس سے اپنے صحیفے نقل کرتے ہیں۔ یا اس سے وہ نقلیں ہی مراد ہیں جو فرشتے لوح محفوظ سے کرتے ہیں۔ یا حضرات انبیاء علیہم السلام کے صحائف مراد ہیں۔ جیسا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۹۶.) ﴿اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی﴾ (پارہ: ۳۰، سورۃ الاعلی، الآیۃ: ۱۸، ۱۹.)۔ یا وہ صحیفے مراد ہیں۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھ لئے تھے۔

صحف انبیاء میں وجودِ قرآن کا مطلب:

صحف انبیاء میں قرآن کے موجود ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن مقدس کی بنیادی تعلیمات ،توحید، الوہیت ، ربوبیت ،صفات کمالیہ ،وجود ملائکہ ،خیر وشر کا مقدر من اللہ ہونا،ذکر مبدء ومعاد ،وحی ورسالت ،اصول حسنات واوامر، اصول سیأت ونواہی وغیرہ سب چیزیں سابقہ کتب سماوی میں بھی مذکور تھیں ۔قرآن نے یہ باتیں نئی نہیں بتائیں۔ تمام کتب آسمانی میں یہ تعلیمات مشترک ہیں۔رہیں وہ خصوصیات شریعت اور ضوابط وآئین جن میں قرآن منفرد ہے۔وہ گذشتہ صحف انبیاء میں موجود نہ تھیں۔جیسا کہ قرآن میں پچھلی شریعتوں کی خصوصیات نہیں ہیں۔اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قرآن صرف معانی کا نام ہے۔الفاظ وعبارت قرآن کا جزء نہیں۔جیسا کہ فرقۂ قرآنیہ کا خیال فاسد ہے کہ قرآن کا صحف انبیاء ہونا بتایا گیا ہے ظاہر ہے کہ ان میں قرآن کے معانی ہی ہو سکتے تھے نہ کہ الفاظ وعبارات بلکہ قرآن کے الفاظ وعبارات جبرئیل امین یا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھڑے ہوئے ہیں۔قدماء میں بھی بعض لوگ اہل قرآن (جو درحقیقت منکرین قرآن ہیں) کی طرح اس کے قائل ہوئے ہیں۔اور یہ اندھے ان آیات کو نہ دیکھ سکے جن میں مثل قرآن یا دس سورتوں یا ایک سورت کے مقابلہ کا چیلنج کیا گیا ہے۔اور ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾ (پارہ: ۱۹ ،سورۃالشعراء ، الآیۃ: ۱۹۵) اور ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ (پارہ: ۱۴ ،سورۃالحجر ،الآیۃ: ۹) اور ﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ﴾ (پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۴۴) وغیرہ بہت سی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مقدس الفاظ ومعانی ہر دو مجموعہ کا نام ہے۔کتب علم کلام میں کلام نفسی کی تحقیق کے موقع پر یہ بحث مفصل ومدلل موجود ہے یہاں ان تفصیلات کے ذکر کا موقع نہیں۔

مکرمة جو عنداللہ قدر اور عندالناس معزز ہیں۔اور جن کی تکریم کے انسان مکلف ہیں۔**مرفوعة** ان کو رفعت مرتبہ بھی حاصل ہے اور عالیشان مقام بھی۔ساتویں آسمان پر لوح محفوظ پھر آسمان دنیا پر بیت العزت اور نزول کے بعد قلوب مومنین اس کتاب مقدس کے مقامات ہیں۔ **مطهرة** وہ پاکیزہ ہیں۔ناپاک لوگوں کو اس کے چھونے کا حق نہیں۔جنب، حائض ،نفساء،اور بے وضوء شخص کو اسے چھونا جائز نہیں۔

بایدی سفرة کرام بررة ......سفرة: بفحتین سافر کی جمع بھی ہوسکتی ہے۔جس کے معنی کاتب کے آتے ہیں اس صورت میں اس سے مراد فرشتے ،کراماً کاتبین یا انبیاء علیہم السلام اور ان کی وحی کو لکھنے والے حضرت ہوں گے۔ابن عباسؓ ومجاہدؒ سے یہی تفسیر منقول ہے۔اور یہ لفظ سفرۃ سفیر بمعنی قاصد کی جمع بھی ہوسکتی ہے۔اس صورت میں اس سے مراد رسل ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام اور وحی کی کتابت کرنے والے حضرات صحابہ ہوں گے۔اور علماءِ امت بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان سفیر وقاصد ہیں۔حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ قرأت میں بھی ماہر ہے تو وہ سَفَرَةِ كِرَامٍ بَرَرَةٍ کے ساتھ ہے۔اور جو شخص ماہر نہیں مگر تکلف کے ساتھ مشقت اٹھا کر قراءت صحیح کرلیتا ہے اسکے لئے دوہرا اجر ہے۔(رواہ الشیخان عن عائشہ مظہری) اس سے معلوم ہوا کہ غیر ماہر کو دو اجر ملتے ہیں۔ایک قراءت قرآن کا دوسرا مشقت اٹھانے کا۔اسی سے ماہر قرآن کو بے شمار اجر ملنا معلوم ہوا۔

قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَكۡفَرَهٗ (١٧) مِنۡ اَىِّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ (١٨) مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (١٩)

خدا کی مار آدمی پر وہ کیسا ناشکرا ہے اس کو کس چیز سے بنایا؟ ایک بوند سے اس کو بنایا پھر اس کا ایک اندازہ مقرر کردیا

قُتِلَ	الۡاِنۡسَانُ	مَاۤ اَكۡفَرَهٗ	مِنۡ	اَىِّ	شَىۡءٍ	خَلَقَهٗ	مِنۡ	نُّطۡفَةٍ	خَلَقَهٗ	فَقَدَّرَهٗ
مارا جائے	آدمی	کیا، ناشکرا	سے	کس	چیز	اسے پیدا کیا	سے	نطفہ	اسکو پیدا کیا	پھر اندازہ کیا

ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ (٢٠) ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ (٢١) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَهٗ (٢٢)

پھر اسکا راستہ آسان کردیا پھر اسکو موت دی پھر اس کو قبر میں رکھوادیا پھر جب اللہ چاہے گا اس کو دوبارہ زندہ کردے گا

ثُمَّ	السَّبِيۡلَ	يَسَّرَ	هٗ	ثُمَّ	اَمَاتَهٗ	فَاَقۡبَرَ	هٗ	ثُمَّ	اِذَا	شَآءَ	اَنۡشَرَ	هٗ
پھر	راہ	آسان کی	اس	پھر	مارا اس	پھر گاڑا	اس	پھر	جب	چاہے گا	جلا اٹھائے گا	اس

كَلَّا لَمَّا يَقۡضِ مَاۤ اَمَرَهٗ (٢٣) فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ (٢٤) اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا (٢٥)

ہرگز نہیں اس کو جو حکم کیا تھا وہ اسکو بجا نہیں لایا پھر انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے میں غور کرے کہ ہم نے اوپر سے پانی برسایا

كَلَّا	لَمَّا	يَقۡضِ	مَا	اَمَرَ	هٗ	فَلۡيَنۡظُرِ	الۡاِنۡسَانُ	اِلٰى	طَعَامِهٖ	اَنَّا	صَبَبۡنَا	الۡمَآءَ	صَبًّا
ہرگز نہیں	ابھی نہیں	ادا کی	وہ چیز کہ	حکم کیا	اس	پس چاہیے کہ دیکھے	آدمی	طرف	کھانے اپنے	یہ کہ	ڈالا ہم	پانی	ڈالنے کر

ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا (٢٦) فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا حَبًّا (٢٧) وَّعِنَبًا وَّقَضۡبًا (٢٨)

پھر ہم نے زمین کو چیر پھاڑ کر اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری

ثُمَّ	شَقَقۡنَا	الۡاَرۡضَ	شَقًّا	فَاَنۡۢبَتۡنَا	فِيۡهَا	حَبًّا	وَ	عِنَبًا	وَ	قَضۡبًا
پھر	پھاڑا ہم	زمین	پھاڑنے کر	پس اگائے ہم	بیچ اس	اناج	اور	انگور	اور	ترکاری

وَّزَيۡتُوۡنًا وَّنَخۡلًا (٢٩) وَّحَدَآئِقَ غُلۡبًا (٣٠)

اور زیتون اور کھجور گھنے باغات اگائے

وَ	زَيۡتُوۡنًا	وَ	نَخۡلًا	وَ	حَدَآئِقَ	غُلۡبًا
اور	زیتون	اور	کھجوریں	اور	باغات	گھن کے

وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا (٣١) مَّتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ (٣٢)

اور میوہ اور چارہ پیدا کیا۔ تمہارے نفع کیلئے اور تمہارے چوپائے کیلئے۔

وَ	فَاكِهَةً	وَ	اَبًّا	مَتَاعًا	لَكُمۡ	وَ	لِاَنۡعَامِكُمۡ
اور	میوہ	اور	چارہ	فائدہ	واسطے تمہارے	اور	واسطے چارپایوں تمہارے

لغات:

قتل صیغہ مجہول (ن) مارا گیا یعنی مارا جائے۔ یہاں ماضی بمعنی مستقبل ہے۔ اور یہ جملہ بدعائیہ ہے۔ لیکن اللہ کے کلام میں بدعا کے معنی حقیقی نہیں ہو سکتے، بلکہ ایجاد قتل مراد ہوتا ہے۔ یعنی اللہ نے اس کا قتل کیا جانا مقرر کردیا۔ یا اپنی رحمت سے اس کو دور کردیا۔ یہاں اخیر معنی انسب ہیں۔ اماتَ واحد مذکر غائب ماضی افعال سے موت دینا، مارنا (ن س)

مرنا۔ اقبر ایضاً قبر میں رکھنا، قبر میں رکھوانا۔ قبر بنانا، دفن کرنا۔ قَبَرَ قَبْرًا مَقْبَرًا (ن س) دفن کرنا۔ صببنا جمع متکلم ماضی صبّ صَبًّا (ن) پانی انڈیلنا۔ اوپر سے نیچے کو بہانا۔ شققنا ایضاً (ن) پھاڑنا حبا دانہ، غلہ، اناج، جمع حبوب عنب انگور۔ انگور کا درخت۔ اس کا واحد عنبۃ اور جمع اعناب۔ قَضْبًا کھیرا، سبز ترکاری۔ قَضِيبٌ اور قَضْبٌ دونوں کے معنی۔ تروتازہ۔ لیکن درخت کی تروتازہ شاخ کو قَضِيبٌ اور سبز ترکاری کو قُضْب کہا جاتا ہے۔ قَضَبَ قَضْبًا (ض) کاٹنا غلبا غلباء کی جمع موٹی گردن والی۔ مراد وہ باغ جن میں درخت بہت ہوں۔ گھنے درختوں والا باغ۔ ابا جانوروں کے کھانے کی گھاس اور چارہ کو کہتے ہیں، لیکن وہ کون سی گھاس اور کون سا چارہ ہے اور اسکی کیا شکل وصورت ہے۔ اس میں مختلف اقوال ہیں۔ مجاہدؒ، حسن بصریؒ، قتادہؒ اور ابن زید کا بیان ہے کہ انسانی غذا میں میوے کا جو درجہ ہے چرند پرند کی خوراک میں وہی حیثیت اس کی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جب اسکی تعیین کے متعلق سوال ہوا تو فرمانے لگے اَیُّ سَمَآءٍ تُظِلُّنِی؟ وَاَیُّ اَرْضٍ تُقِلُّنِی؟ اِذَا قُلْتُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ مَالَا اَعْلَمُ (کونسا آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا اور کونسی زمین مجھ کو اپنے اوپر رہنے دیگی جبکہ میں کتاب اللہ کی تفسیر میں ایسی بات کہہ دوں جس کا مجھے علم نہیں۔) بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھی۔ اور فرمایا کہ "اَبٌّ" کیا ہے؟ پھر خود ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو نہ اس کی تعیین کا مکلف کیا ہے اور نہ اس کا حکم دیا ہے۔ اس سے تفسیر قرآن کے متعلق صحابہ کرام وسلف صالحین کی انتہائی احتیاط کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک ہمارا دور ہے۔ یہ بات قابل غور ہے۔ اَبٌّ کی جمع اَوُبٌ آتی ہے

ترکیب:...... قتل الانسان فعل مجہول ونائب فاعل (جملہ دعائیہ) ما مبتدا (لِكَوْنِهَا نَكِرَةً مُخَصَّصَةً مِنْ قَبِيلِ "شَرٌّ اَهَرَّ ذَا نَابٍ" وَنَكَارَتُهَا مُنَاسِبٌ لِلْعَجَبِ اِذْ هُوَ يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ خَفِيَ سَبَبُهُ وَلِذَا قِيْلَ اِذَا ظَهَرَ السَّبَبُ بَطَلَ الْعَجَبُ. وَلَا يَجُوْزُ التَّعَجُّبُ مِنْهُ تَعَالٰى حَقِيْقَةً، اِذْ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ بَلْ بِاعْتِبَارِ الْمُخَاطَبِيْنَ) اکفرہ فعل فاعل ضمیر مستتر اور مفعول بہ سے ملکر جملہ فعلیہ خبر۔ ھذا عند سیبویہ والا خفش فی احد قولیہ۔ اخفش کا دوسرا قول یہ ہے کہ ما موصولہ اور جملہ اکفرہ صلہ۔ موصول وصلہ مبتدا اور شیءٌ موجب لاستحقاقہ اللعنۃ خبر محذوف ہے۔ لیکن یہ ترکیب دووجہ سے ضعیف ہے: (۱) خبر کا وجوباً حذف بغیر قائم مقام کے لازم آتا ہے (۲) اس صورت میں ابہام کے معنی مفقود ہیں جو تعجب کے مناسب تھے۔ فراء کہتے ہیں کہ ما استفہامیہ مبتدا ہے اور مابعد کا جملہ خبر ہے۔ ای ای شیئ جعلہ ذا کفران باللہ تعالیٰ اوما اشد کفرہ۔ استفہام توبیخ یا تعجب کے لئے ہے۔ معنوی اعتبار سے یہ ترکیب قوی ہے۔ اور یہ جملہ ماسبق کی تعلیل وبیان ہے۔ من ای شیء خلقہ کا متعلق مقدم ہے اور اس کی تقدیم صدارت استفہام کی وجہ سے ہے۔ من نطفۃ خلقہ مقدر کے متعلق اور حذف پر پہلا خلقہ قرینہ ہے۔ اور یہ جواب کا استفہام سابق ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو بعد والے خلقہ کے متعلق کر دیا جائے اول ترکیب پر جملہ مستانفہ ہوگا اور دوسری پر من ای شی کا بیان فاء ترتیب وعطف کے لئے ہے۔ قدرہ جملہ معطوف۔ ضمیر فاعل خالق یا اللہ کی ہے۔ اور مفعول کی انسان کی طرف راجع ہے۔ ثم حرف عطف السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ما اضمر عاملہ کے قبیل سے ہے ای مُيَسَّرًا السبیل یسرہ جملہ ماقبل پر معطوف ہے۔ اسی طرح دونوں جملے ثم اماتہ اور فاقبرہ معطوف ہیں۔ ثم حرف عطف اذا اسم زمان مضاف ہے اور بمعنی شرط ہے۔ شاء فعل فاعل ضمیر۔ مفعول محذوف ای احیا، جملہ شرط، انشرہ فعل وفاعل مفعول بہ۔ جملہ جزا۔ شرط وجزا ملکر مضاف الیہ اذا کا اور وہ ظرف ہے انشرہ کا، نہ کہ شآءکا، کیونکہ وہ مضاف الیہ

ہے۔اور مضاف الیہ اپنے مضاف میں عامل نہیں ہوتا۔ کلا حرف ردع ہے۔ لما حرف جازم بمعنی لم ۔ یقض فعل ضمیر فاعل ما امرہ ' موصول وصلہ ملکر مفعول بہ جملہ سبب ردع ہے۔ فاء تعقیبیہ لینظر صیغہ امر غائب الانسان فاعل الی طعامہ متعلق انا حرف مشبہ بہ فعل معہ اسم صببنا فعل بافاعل الماء مفعول بہ صبا مفعول مطلق۔ جملہ فعلیہ خبر ان۔ جملہ اسمیہ۔ طعامہ سے بدل اشتمال ہوگا۔ ثم شققنا الارض شقا جملہ صببنا ...... پر عطف ہے۔ فاء ترتیب عطف کے لئے انبتنا فعل بافاعل فیھا متعلق حبا اپنے آئندہ کے تمام معطوفات سے ملکر مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ معطوف سابق پر۔ متاعا لکم ...... کے مثل سورۂ نازعات کے اخیر میں گذرا۔

تفسیر:

سابقہ آیات میں قرآن کا عالیشان وواجب الایمان ہونا بیان کرنے بعد کافر انسان (منکرین قرآن) پر لعنت اور اللہ کی ناشکری پر (ناشکروں کو) تنبیہ کی گئی ہے۔ پھر ان انعامات الٰہیہ کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کی تخلیق سے اخیر تک انسان پر مبذول ہوتے رہتے ہیں۔ قرآن بھی نعمتِ عظیمہ ہے مگر وہ معنوی چیز ہے۔ جس کو اہل علم وفہم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے ان آیات میں محسوس انعامات بیان کئے گئے ہیں جن کو ادنی شعور والا انسان بھی مشاہدہ سے سمجھ سکتا ہے۔

قتل الانسان ما اکفرہ ...... یہ الفاظ انتہائی مختصر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے بے حد غضب اور اللہ کی طرف سے بے انتہا مذمت پر دلالت کر رہے ہیں۔ (قتل بددعا کا لفظ ہے۔ اور ما اکفرہ تعجب پر دلالت کرتا ہے۔ مگر بددعا وہ کرتا ہے جو عاجز ہو۔ اور تعجب وہ کرتا ہے جسکی نگاہ سے تعجب خیز چیز کا سبب خفی ہو۔ اللہ نہ عاجز ہے نہ اسکی نگاہ سے کوئی شئے پوشیدہ ہے۔ اس لئے عربی محاورہ کے مطابق دعا سے مراد مذمت اور تعجب مخاطبوں کے اعتبار سے ہے)۔ مقاتل ؒ وعکرمہ ؒ کا قول ہے کہ اس آیت کا نزول عتبہ بن ابی لہب کے بارے میں ہوا ہے۔ جس نے کفرت برب النجم کہا تھا۔

عبرتناک واقعہ: ...... سیرت کی کتابوں میں یہ قصہ اس طرح آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور ان کی بہن رقیہ کا نکاح ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے کر دیا تھا۔ جب سورۂ ابی لہب نازل ہوئی تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ اگر تم محمد کی بیٹیوں کو طلاق نہ دو تو تم عاق ہو۔ دونوں نے طلاق دے دی۔ یہ واقعہ رخصتی سے پہلے کا ہے۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو جب عتبہ نے طلاق دے دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ میں نے تیرے دین سے انکار کر دیا اور تیری بیٹی کو چھوڑ دیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس نے حملہ کیا۔ اور آپ کی مبارک قمیص پھاڑ ڈالی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو تجھ پر مسلط کر دے۔ ایک بار وہ قریشی لوگوں کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں ملک شام جا رہا تھا۔ مقام زوراء پر پڑاؤ کیا۔ رات کو ایک شیر آیا۔ اور ان لوگوں کے چاروں طرف چکر لگایا۔ عتبہ نے شور مچایا: ہائے مصیبت! مجھے محمد کی بددعا سے اندیشہ ہے۔ لوگوں نے اپنے تمام پلان اور سامان لا کر ایک اونچا ڈھیر لگا کر عتبہ کو اس کے اوپر کر دیا۔ اور چاروں طرف یہ سب لوگ سو گئے۔ شیر جا چکا تھا۔ جب یہ سب سو گئے تو شیر آیا۔ سب کو سونگھا۔ پھر چھلانگ لگا کر اوپر چڑھ گیا اور عتبہ کو پھاڑ ڈالا۔ صاحب مظہری ؒ فرماتے ہیں کہ عتیبہ اور معتیب ابولہب کے دونوں بیٹے اسکے بعد مسلمان ہو گئے۔ اور غزوہ حنین میں (وقتی طور پر بھاگنے کے بعد) جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے تھے۔ ان میں یہ دونوں بھائی بھی تھے۔

مِن ای شیء ...... اس میں ان اسباب کا بیان ہے جو شکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے مبدء تخلیق کو اس لئے بیان فرمایا گیا کہ تمام نعمتوں سے پہلے اسی کا درجہ ہے۔ گویا انعامات کی ابتداء حضرت انسان پر پیدائش ہی سے ہوتی ہے اس میں اولاً تو سوال کیا گیا۔ اور مخاطب کو غور وفکر اور اقرار پر آمادہ کیا گیا ہے کہ سوچ! مجھے کس چیز سے بنایا گیا؟ اور چونکہ اس کا جواب متعین ہے۔ اسکے سوا کوئی دوسرا جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے خود ہی فرمایا مِن نطفة سے تخلیق کو بیان فرما کر انسان کی ذاتی حقارت کا اظہار فرمایا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ تحقیر خلقی تکبر کے منافی ہے اس لئے انسان کا تکبر کرنا بے بنیاد اور ناز بیا ہے۔ خلقه یعنی اول اس کو رحم کے اندر وجود عطا کیا۔ فقدره یہی نہیں کہ اس کا جاندار وجود بنا دیا بلکہ اس کو خاص اندازہ اور بڑی حکمت سے بنایا اس کے قد وقامت، جسامت، شکل وصورت، اعضاء کے طول وعرض، آنکھ، کان، ناک جوڑ بند سب کی تخلیق میں ایسا اندازہ اور توازن قائم فرمایا کہ اگر ذرا اس کے خلاف ہو جائے تو انسان کی صورت بگڑ جائے اور کام کاج دو بھر ہو جائے۔ لفظ قدره سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا۔ یعنی اللہ کے موکل فرشتے نے بطن مادر میں اس کے لئے چار باتیں لکھ دیں۔ مقدار عمل، مدت زندگی، رزق، شقاوت یا سعادت وھذا اولیٰ عندی.

ثم السبیل یسره یعنی پھر اللہ نے پیٹ سے نکلنے کا راستہ اسکے لئے فرما دیا۔ سدی اور مقاتل نے یہی معنی بیان کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے بطن مادر کی تین اندھیریوں کے اندر ایک محفوظ مقام میں انسان کو اس طرح بنلایا کہ جس کے پیٹ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس کو بھی اسکی تفصیلات کا علم نہیں۔ پھر اس مقام سے اس زندہ وکمل انسان کے اس دنیا میں آنے کا راستہ تنگ ہونے کے باوجود اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے آسان فرما دیا کہ چار پانچ پونڈ کا وزنی جسم صحیح وسالم برآمد ہو جاتا ہے۔ اور ماں کے وجود کو بھی اس سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا۔ ﴿فَتَبَارَكَ اللهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾

آیت کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور کتابیں بھیج کر اپنی ذات عالی تک پہنچنے کا راستہ آسان فرما دیا جیسا کہ سورۃ واللیل میں ہے ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾۔ یا اللہ نے انسان کے لئے دنیوی زندگی جو آخرت کی زندگی کی راہ ہے آسان فرما دی ہے۔ کیونکہ دنیا یا جنت کا راستہ ہے یا دوزخ کا، حدیث میں ہے کہ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل (دنیا میں پردیسی بلکہ مسافر کی طرح رہو۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ خود کو اہل قبور میں شمار کرو۔ اول تفسیر مختار جمہور ہے۔ اور بعد والی تفسیر اس کے بعد والی آیت کے بظاہر زیادہ مناسب ہے۔ گویا اول انسب ہے۔ کیونکہ دنیا میں آنے اور دنیا سے دوسرے عالم میں جانے (دونوں) کا ذکر اس میں آجاتا ہے۔ پھر ماقبل میں تخلیق کا ذکر ہے۔ اس کے بعد انسان کی دنیا میں آمد ہوتی ہے۔ فافہم۔ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ انسان کی ابتداء زندگی (پیدائش) کے بعد اس کی انتہاء کا ذکر ہے کہ وہ موت اور قبر ہی ہے۔

سوال:...... انعامات کے بیان کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اس میں موت کو بھی بیان کر دیا گیا۔ حالانکہ بظاہر موت انعام نہیں ہے۔ بلکہ موت تو انعامات سے دور کر دیتی ہے۔

جواب:...... جنت مومن کی آرام گاہ اور اصلی وطن ہے۔ اس تک موت کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا ہے۔ وطن تک پہنچنے والی سواری بھی نعمت ہوتی ہے۔ ابدی راحت، رضوان، دیدار خداوندی، جنت تک رسائی موت ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب۔ اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ موت مؤمن کا تحفہ ہے۔ غور کیا جائے تو موت دنیا میں رہ جانے والوں کے لئے بھی نعمت ہے۔ مرنے والے کے مال ومکان وغیرہ دنیا والوں

کو ملتے ہیں۔ مرنے والے ظالم ہیں تو دوسروں کو راحت بھی ملتی ہے۔ وغیرہ۔ **سوال:**...... موت راہ جنت ہونے کے اعتبار سے تو نعمت ہے۔ مگر جہنم کی راہ بھی تو یہی ہے۔ **جواب:**...... موت دوزخ کا ذریعہ صرف اس لئے بنتی ہے کہ انسان جنت کے راستہ کو اختیار نہیں کرتا۔ مثلاً کسی کے مکان تک عمدہ سڑک پہنچتی ہے۔ اس پر چل کر وہ اپنے مکان تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر سڑک کے برابر کوئی تالاب ہے۔ چلتے چلتے اس میں چھلانگ لگادی۔ اور ڈوب کر مر گیا۔ منع کرنے کے باوجود سیدھی سڑک سے ہٹ گیا تو قصور کس کا ہے؟ فاقبرہٗ (پھر اسکو قبر میں داخل کیا۔ یہ بھی اللہ کا ایک بڑا انعام ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو دوسرے جانوروں کیطرح نہیں رکھا۔ کہ مرکر زمین پر سڑتا رہے۔ اور اس کو کتے اور گدھے کھاتے رہیں۔ بلکہ اس کا اکرام کیا گیا۔ نہلا کر نیا لباس پہنایا گیا۔ اور عزت سے سپرد خاک کر دیا گیا۔ اصول ہے کل شیء یرجع الی اصلہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اسی میں بدن کی راحت ہے۔ اور یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر کوئی دفن نہ کرے۔ جلائے یا پانی میں بہائے تو یہ اس نعمت کی ناشکری وناقدری ہے۔ وکان الانسان کفورا۔ انسان ہے ہی ناشکرا۔ جیسے دوسرے انعامات کی ناشکری کی جاتی ہے اسی طرح بعض لوگ اس کی بھی ناشکری کرتے ہیں۔ **مسئلہ:**...... اس آیت سے معلوم ہوا کہ مردہ انسان کو دفن کرنا واجب ہے۔

ہندو مسلمان کا مناظرہ:

اسلام کے ابتدائی زمانے کی بات ہے کہ مسلمانوں کا ایک لشکر سیستان پہنچا۔ اتفاق سے ایک ہندو بھی وہاں پہنچ گیا اس نے مسلمانوں کے چال چلن، رہن سہن کو غور سے دیکھا اور مذہب اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اطمینان سے تمام معلومات فراہم کر چکا تھا تو اس نے کہا کہ مسلمانو! تمہاری سب باتیں اچھی ہیں۔ مگر ایک بات مجھے پسند نہیں۔ پوچھا گیا وہ کونسی بات ہے جو تجھ کو پسند نہیں؟ ہندو نے کہا بس یہ بات تمہاری اچھی نہیں لگتی کہ تم مردہ کو زمین میں دفن کرتے ہو۔ آگ میں نہیں جلاتے۔ حالانکہ دفن سے مردہ سڑتا ہے۔ زمین ناپاک ہو جاتی ہے۔ اور آگ میں جلانے سے بدبو اور ناپاکی دور ہو جاتی ہے۔ (حالانکہ جلانے سے بدبو پھیلتی ہے) نسیم احمد غازی مظاہری۔) ایک مسلمان نے کہا کہ اول میں تجھ سے ایک بات معلوم کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں تجھے اس کی حقیقت سمجھاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ ایک آدمی کسی جگہ نکاح کے مقصد سے پہنچا۔ اس نے ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ اور ایک دوسری عورت کو کھانا پکانے کیلئے نوکر رکھ لیا۔ اس کی بیوی کے ایک لڑکا بھی پیدا ہو گیا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد اس نے وہاں سے سفر کا ارادہ کیا تو اس لڑکے کو وہ کس کے حوالہ کرے۔ اس ماں کے یا باورچن کے؟ ہندو نے کہا کہ ماں کے ہوتے ہوئے باورچن کے حوالہ کرنا بالکل غلط اور ظلم ہے۔ مسلمان نے کہا تو نے بات ٹھیک کی۔ انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ لڑکا ماں کے حوالہ ہی کیا جائے۔ لے اب اپنے اعتراض کا جواب سن۔ روح آسمانی نے جب سرزمین سے اپنا تعلق پیدا کیا۔ تو اللہ نے اس زمین سے ایک جسم بنا کر روح کے حوالے کر دیا۔ اس بدن کی غذا، دوا، لباس وغیرہ سب حاجتیں زمین سے اس کو ملتی رہیں۔ گویا زمین اس کی پرورش کرتی رہی۔ آگ اس کی باورچن بن کر اسکو کچی چیزیں پکا کر دیتی رہی۔ تو اس بدن انسانی کی ماں زمین ہوئی اور باورچن آگ۔ جب اس بدن کے باپ یعنی روح نے سفر کا ارادہ کیا تو تیرے کہنے کے مطابق بچہ کو یعنی بدن کو اسکی ماں یعنی زمین کے حوالہ کرنا انصاف اور باورچن یعنی آگ کے حوالہ کرنا ظلم ہوگا۔ اسلام انصاف والا مذہب ہے ظلم کو پسند نہیں کرتا اسلئے اسلام نے دفن کرنے کا حکم دیا ہے، ہندو نے اس

بات کو سن کر قبول اسلام کیا اور مسلمان ہو گیا۔ (از فتح العزیز) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو اٹھانا چاہیں گے تو دوبارہ زندگی عطا فرمادیں گے۔ جس طرح اوّل بار پیدا فرمادیا اسی طرح اپنی قدرت کاملہ سے دوبارہ زندہ فرما کر شاکرو کافر ظالم و مظلوم میں انصاف فرما کر جزاء وسزادیں گے۔ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ۔ عظیم الشان نعمتوں اور روشن دلائل کو جاننے کے باوجود اس ناشکر گذار انسان نے حکم خداوندی کو پورا نہیں کیا۔ نہ ایمان لایا نہ شکر گذاری کی۔

یتمنی المرء فی الصیف الشتا فاذا جاء الشتا انکرهٗ

فھولا یرضی بحال واحد قتل الانسان ما کفرهٗ

منکر انسان کو تنبیہ کرنے کے بعد پھر ان انعامات الٰہیہ کا تذکرہ ہے۔ جو انسانی زندگی کے ابتداء وانتہا کے درمیانی زمانے میں انسان پر مبذول ہوتے ہیں۔ جن میں قدرت و بعث پر بھی دلائل موجود ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اسکا کلام کے مفہوم پر عطف ہے۔ یعنی انسان کو اول آغاز حیات سے آخر حیات تک اپنے اوپر غور کرنا چاہیے۔ پھر اپنی غذا کو دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اس کی غذا کس طرح پیدا کی۔ اور اس سے انسان کو کس طرح بہرہ اندوز کیا۔ قرآن مقدس کا طرز ہے کہ وہ مقصود پر (خصوصاً توحید وقدرت پر) دلائل انفس قائم کرنے کے بعد دلائل آفاق لاتا ہے۔ اور کبھی اس کے برعکس۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ دلوں میں خوب اثر ہو۔ یہاں اول ترتیب کو اختیار کیا گیا۔ اول انفس پر غور کرنے کی دعوت دی گئی۔ اسکے بعد آفاق میں فکر کا سبق دیا گیا۔ کہ ہم نے آسمان وزمین، ابرو باراں وغیرہ سب اشیاء کو اے انسان تیری غذا اور تیرے خدام چوپاؤں کے چارہ کا انتظام کرنے میں لگادیا۔ تو ان میں غور کر کے ہماری قدرت وتوحید اور معبودیت کو پہچان اور سمجھ لے کہ تجھ کو بھی ہم نے کسی کام کے لئے پیدا کیا ہوگا۔ اور وہ ہے عبادت خداوندی۔ جس طرح کائنات اپنے متعلقہ کاموں میں مصروف ہے۔ تجھ کو بھی اپنے کام سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔

ابر باد ومہ خورشید فلک در کارند تاتو نانے بکف آری بغفلت نخوری

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ (۳۳) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ (۳۴) وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ (۳۵)

پھر جب وہ بہرہ کرنے والا شور بپا ہوگا۔ جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ

فَاِذَا	جَآءَتِ	الصَّآخَّةُ	يَوْمَ	يَفِرُّ	الْمَرْءُ	مِنْ	اَخِيْهِ	وَ	اُمِّهٖ	وَ	اَبِيْهِ
پس جب	آئیگی	کان پھوڑنے والی	دن	بھاگے گا	آدمی	سے	بھائی اپنے	اور	ماں اپنی	اور	باپ اپنے

وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (۳۶) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۳۷)

اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا اس دن ہر شخص کی ایسی حالت ہوگی کہ اسکو اوروں سے بے پرواہ کردیگی

وَ	صَاحِبَتِهٖ	وَ	بَنِيْهِ	لِكُلِّ	امْرِئٍ	مِّنْهُمْ	يَوْمَئِذٍ	شَاْنٌ	يُّغْنِيْهِ
اور	بیوی اپنی	اور	بیٹوں اپنے	واسطے ہر	مرد	سے ان	اس دن	ایک حالت	کفایت کرتی ہے اس

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (٣٨) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (٣٩) وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (٤٠)

بہت سے چہرے تو اس دن روشن، ہنستے ہوئے، خوش وخرم ہوں گے۔ اور بہت سے چہروں پر اس دن خاک پڑی ہوگی۔

غَبَرَةٌ	عَلَيْهَا	يَوْمَئِذٍ	وُجُوْهٌ	وَ	مُسْتَبْشِرَةٌ	ضَاحِكَةٌ	مُسْفِرَةٌ	يَوْمَئِذٍ	وُجُوْهٌ
غبار	اوپر ان	اس دن	کتنے منہ	اور	خوش وقت	ہنستے	روشن	اس دن	کتنے منہ

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (٤١) أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (٤٢)

اور ان پر سیاہی چڑھی ہوگی۔ وہ لوگ کافر بدکار ہوں گے۔

الْفَجَرَةُ	الْكَفَرَةُ	هُمُ	أُولٰٓئِكَ	قَتَرَةٌ	تَرْهَقُهَا
بدکار	کافر	وہی	یہ لوگ	سیاہی	ڈھانکتی ہے ان

لغات:

الصآخة : سخت چیخ۔ کان پھوڑ دینے والی آواز۔ وہ شور جو قیامت میں بپا ہوگا اور بہرہ کر دیگا۔ قیامت نفخہ صور۔ صخ صخا (ن) لوہے کو لوہے پر مارنا۔ آواز کا کان کو بہرا کرنا۔ یفر (ض) بھاگنا۔ شان: فکر، حال، دھندا، اہم معاملہ۔ شئون جمع۔ مسفرة: اسم فاعل مؤنث افعال (اسفار) سے چمک دار روشن، یہ سفر سے ماخوذ ہے جسکے معنی سر پوش یا پردہ ہٹا دینا ہیں۔ (ض ن) ضاحکة: ایضاً ضحک ضحکاً (س) ہنسنا۔ مستبشرة: ایضاً شگفتہ، شاداں، بشر بشرا (ن) چہرہ چھیل دینا، ظاہر کرنا۔ (ض س) خوش ہونا، تفعیل سے خوش کرنا افعال سے خوشخبری دینا۔ غبرة: خاک خاک کا اثر۔ غبر غبوراً (ن) گذرنا، ٹھہرنا، گرد وآلود ہونا۔ غبراً (س) غبار لگنا۔ خراب ہونا۔ قترة: غبار، بدرونق دھوئیں کی طرح غبار نما، قتر قتراً قتورا (ن ض) تنگی کرنا۔ الکفرة: الکافر کی جمع۔ الفجرة الفاجر: کی جمع۔ بدکار، بابہ نصر۔

ترکیب:

فاذا جآءت الصآخة فاذاجاءت الطآمة کیطرح ہے۔ یوم، الصآخة سے بدل یا اذاجاءت سے بدل یا اعنی محذوف سے منصوب ہے۔ یفر فعل المرء فاعل من الخ جار مجرور متعلق جملہ فعلیہ۔ یوم کا مضاف الیہ۔ لکل امرئ متعلق محذوف۔ اسی طرح منهم بھی اسی کے متعلق ہوکر خبر مقدم یومئذٍ ظرف فعل مابعد یغنی کا۔ شانٌ: موصوف یغنیہ فعل فاعل مفعول بہ جملہ صفت۔ مرکب توصیفی مبتداء مؤخر، جملہ اسمیہ مستانفہ۔ وجوہ: مبتدا (وان کانت نکرة لکونها فی حکم المعرفة لأن التنوین فیه عوض عن المضاف الیه (ای وجوه المؤمنین) یومئذٍ ظرف مسفرة کا۔ مسفرة خبر اول۔ ضاحکة خبر ثانی۔ مستبشرة خبر ثالث۔ جملہ اسمیہ معطوف علیہ۔ وَ عاطفہ وجوہ مبتدا یومئذٍ ثبت فعل محذوف کا ظرف۔ اور علیها اس کا متعلق غبرة فاعل۔ جملہ فعلیہ خبر غبرة مبتدا مؤخر اور علیها خبر مقدم جملہ اسمیہ خبر۔ ترهقها قترة فعل مفعول بہ اور فاعل جملہ فعلیہ خبر ثانی وجوہ مبتدا کی یا غبرة کی صفت اولٰئک مبتدا اوّل هم مبتدا ثانی الکفرة الفجرة مرکب توصیفی خبر مبتدائے ثانی کی۔ جملہ اسمیہ ہوکر خبر مبتدائے اول کی۔ جملہ اسمیہ یا هم ضمیر فصل مان لیا جائے اور مرکب توصیفی اُولٰئک کی خبر ہے۔

تفسیر:

فاذا جآءت الصآخۃ اس شرط کی جزاء محذوف ہے جس پر **لکل امرئ منھم**...... دال ہے۔ پھر پورا جملہ شرطیہ **انھا تذکرۃ** سے مربوط ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ قرآن ایک یاد داشت اور نصیحت ہے۔ جب صور کی ہیبت ناک آواز آئیگی تو اس وقت نصیحت قبول کرنے والوں کا حال نصیحت نہ قبول کرنے والوں کے حال سے جدا ہوگا۔ اختلاف حال کیا ہوگا اس کا بیان آئندہ آیات **وجوہ یومئذ**...... میں کیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس صورت میں جزاء محذوف نہ ہو، بلکہ **وجوہ یومئذ**...... اسکی جزاء ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس شرط کا تعلق **قتل الانسان ما اکفرہ**...... سے ہو۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ لعنت ہو انسان پر کیسا ناشکرا ہے وہ۔ جب صور پھونکا جائیگا تب اس کو اپنی ناشکری کا نتیجہ معلوم ہوگا۔ **یوم یفر المرء**...... اس میں اجتماع محشر کا ایک منظر بیان کیا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص اپنی فکر میں مبتلا ہوگا۔ وہ ایسا عجیب نفسی نفسی کا عالم ہوگا کہ کوئی اپنے ایسے محبوب ترین عزیزوں کی طرف بھی توجہ نہ کریگا جن پر دنیا میں جان و مال سب کچھ قربان کر دیتا تھا۔ وہاں ان سب سے متنفر و گریزاں ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ان دونوں بچوں کا حال دریافت کیا جو اسلام سے پہلے گذر گئے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: وہ دوزخ میں ہیں (اس سے ان کو صدمہ ہوا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرہ پر صدمہ کا اثر دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ اگر تم ان کے مقام کو دیکھ لو تو تم کو بھی ان سے نفرت ہو جائیگی۔ (معلوم ہوا کہ اچھے لوگوں کو ایک دوسرے سے نفرت نہ ہوگی۔)

سوال:...... میدان حشر میں آدمی اپنے اعزہ سے کیوں بھاگے گا؟ **جواب:**...... علماء نے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں۔ (۱) ان حقوق کے مطالبہ کے اندیشہ سے جو دنیا میں تلف ہوئے تھے۔ جیسے مفلس قرض خواہ سے بھاگتا ہے (۲) طلب مدد کے خوف سے۔ ایسا نہ ہو کہ عزیز کو عذاب خداوندی سے چھڑانے کے لئے کچھ نیکیاں دینی پڑ جائیں۔ جیسے قحط سالی میں لوگ ایک دوسرے سے متنفر و گریزاں ہو جاتے ہیں۔ یا مالدار فقیروں سے اور سفیروں سے بھاگتے ہیں۔ (۳) عزیزوں کی مصیبتیں دیکھی نہ جائیں گی۔ ایک دوسرے سے منہ چھپائیں گے۔ (۴) اپنی رسوائی کو چھپاتے کے لئے بھاگیں گے۔ (۵) حقیقت عیاں ہو جائے گی۔ ان کی ناپاکی اور مردارپن سے نفرت کھا کر بھاگیں گے۔ جیسے آدمی گندگی اور مردار سے دور بھاگتا ہے بعض سب اسباب کی وجہ سے بھاگیں گے اور بعض ان میں سے کچھ (ایک یا دو تین یا چار) کی وجہ سے بھاگیں گے۔

سب سے پہلے بھاگنے والے:

(۱) قابیل اپنے بھائی ہابیل سے بھاگے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خون ناحق کا مطالبہ کرلے۔ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے ماں باپ سے بھاگیں گے۔ (۳) حضرت نوح و حضرت لوط علیہما السلام اپنی نافرمان بیویوں سے بھاگیں گے (۴) حضرت نوح علیہ السلام اپنے کافر بیٹے کنعان سے بھاگیں گے۔ (فتح العزیز)۔ **لکل امرئ منھم**...... ہر شخص اپنی فکر میں ڈوبا ہوگا۔ کسی دوسرے کا خیال نہ کریگا۔ حضرت سودہؓ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگوں کو ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ اٹھا کر میدان حشر میں لایا جائیگا۔ حضرت سودہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ایک دوسرے کی شرمگاہوں کو دیکھیں گے؟ فرمایا لوگوں کو اس کی خواہش ہی نہ ہوگی۔ ہر شخص کے لئے ایسی حالت ہوگی کہ اوروں سے بے پرواہ کر دیگی۔ حضرت عائشہ سے بھی صحیحین میں اسی طرح کی روایت منقول ہے (مظہری)۔

چند فوائد:

یہ سورت بہت سے فوائد واصول زندگی پر مشتمل ہے۔ جن میں سے کچھ تو تفسیر کے ضمن میں آچکے ہیں۔ اور چند مختصراً ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔ (۱) اللہ کے نبی ایسے معاملہ میں جس میں باری تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہیں ہوا اجتہاد کرتے ہیں۔ لیکن اگر اجتہادی حکم منشائے خداوندی کے موافق نہیں ہوتا تو اللہ کی جانب سے تنبیہ ہو جاتی ہے۔ اور ان کو غلطی پر برقرار نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ شان نزول والے قصہ میں مذکور ہے کہ اپنے اجتہاد سے دعوت اسلام کو تعلیم قرآن پر ترجیح دی۔ تو آپ کو تنبیہ کردی گئی۔ (۲) تھوڑے یقینی نفع کو زیادہ مقدار کے محتمل نفع پر ترجیح دینی چاہیے۔ (۳) عمدگی اور حقیقت مطلوب ومحمود ہے۔ نہ کہ محض کثرت تعداد اور ثروت واسباب اور بے حقیقت ظاہری شان وشوکت۔ (۴) اکرام مسلم اور مسلمانوں کی دل جوئی واحترام نہایت اہم ہے خصوصاً معذورین کی رعایت بہت ضروری ہے۔ (۵) اہل اسلام کی اصلاح اور تعلیم وتربیت کفار کو دعوت اسلام پیش کرنے سے مقدم ہے۔ (۶) تعلیم قرآن ومسائل دینیہ دعوت سے اہم اور علم نبوت دعوت وتبلیغ سے مقدم ہے۔ (۷) اکرام واحترام وغیرہ کا اصل تعلق قلب سے ہے۔ اگر مسلم کو اپنے اکرام نہ کیے جانے کا علم بھی نہ ہو تب بھی یہ بات لائق عتاب ہے۔ جیسا کہ آپ کا چیں بہ جبیں ہو جانے اور رخ پھیر لینے کا مشاہدہ نابینا صحابی نے نہیں کیا تھا۔ تَرْکُ السَّلَامِ عَلَى الضَّرِيْرِ خِيَانَةٌ. (۸) قرآن مقدس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں۔ اللہ کا نازل کیا ہوا کلام ہے کیونکہ کوئی مصنف اپنی کوتاہی کو بیان نہیں کرتا۔ (۹) داعی کی بات اگر کوئی قبول نہ کرے تو داعی پر اس سے کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا۔ داعی نے دعوت دے دی تو وہ اپنے فریضہ کو ادا کر چکا اور کامیاب ہو چکا۔ البتہ ناکام وہ ہوا جس نے دعوت قبول نہیں کی۔ (۱۰) منعم ومحسن کی ناشکری کا گناہ ہونا بھی معلوم نہ ہو۔ عالی منصب حضرات کو اس سے شکوہ یا عتاب وخفگی کا اندیشہ ہوتا ہے (۱۲) بے ارادہ بھی کسی مسلمان سے ترشروئی کرنا یا اس سے بے رخی سے پیش آنا قباحت سے خالی نہیں۔ احتیاط اسکا علاج ہے۔ (۱۳) تقصیرات پر دوستوں کو تنبیہ یا ان پر عتاب خفگی اور شکوہ بقائے محبت ودوستی کی علامت ہے۔

إِذَا ذَهَبَ الْعِتَابُ فَلَيْسَ وُدٌّ　　وَيَبْقَى الْوُدُّ مَا بَقِيَ الْعِتَابُ

عتاب اور شکوہ ختم ہو جانا محبت کے خاتمہ کی علامت ہے اور محبت باقی ہی اس وقت تک رہتی ہے جب تک عتاب اور خفگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب　　کیوں کسی سے گلہ کرے کوئی

(۱۴) عالی مرتبت حضرات کو چھوٹوں پر شفقت، ان کے حالات کی خبر گیری اور ضروریات کی نگرانی لازم ہے اور یہی ان کی بڑائی کی علامت ہے۔ ورنہ منصب کو خطرۂ خلل ہے۔ (۱۵) بظاہر جو حقیر ہو اس کو حقیر نہ سمجھیے۔ نہ معلوم کتنا عظیم ہے۔ اور اللہ کے نزدیک اس کا کیا مقام ہے۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر　　تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(۱۶) طالب علم کو موانع کے باوجود طلب علم نہ چھوڑنا چاہیے۔ اگر استاذ کی توجہ نہ پائے۔ تو دوسرے وقت استفادہ کرے۔ بے توجہی پر استاذ سے بدگمان اور نالاں نہ ہو۔ جیسا کہ اعمیٰ کا عمل رہا۔ (۱۷) علماء ومشائخ اور اساتذہ کو چاہیے کہ کسی مرید وشاگرد کو اس کے مال وجاہ کی بنیاد پر ترجیح نہ دیں۔ اور شاگردوں اور مریدوں میں اس بنا پر فرق وامتیاز نہ کریں۔ (۱۸)

اگر کسی شاگرد کو استاذ سے یا مرید کو شیخ سے یا چھوٹے کو بڑے سے اذیت پہنچ جائے تو استاذ، پیر اور بڑے کو معذرت وحسن سلوک کے ذریعہ اسکا تدارک کرنا چاہیے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تنبیہ کے بعد اعمیٰ سے برتاؤ کیا۔ اس سے مرتبہ بڑھتا ہے گھٹتا نہیں۔

تواضع زگردن فرازان نکوست گدا گر تواضع کند جوئے اوست

(۱۹) روٹھے کو منا کر اس کی تعظیم وتکریم اور رعایت پہلے سے زیادہ کرنی چاہئے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نابینا سے معذرت کی۔ اپنی چادر ان کے بیٹھنے کے لئے بچھادی اور فرمایا **انت فی عیال محمد ما بقیت** (۲۰) طالب کو صاحب خشیت اور صاحبِ سعی ومحنت ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ فرمایا **اما من جاء ک یسعی وھو یخشی** اور ایسا طالب علم زیادہ قابل قدر ہے۔ (۲۱) اعزہ واقرباء اگر بددین ہوں تو ان سے اختلاط وموافقت اور ان کا قرب موجب عتاب ہے۔ (اس گروہ مشرکین میں آپ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے)

تم تفسیر سورۃ عبس والحمد اللہ الذی تقد س والصلوۃ والسلا م علی رسولہ الا قد س وعلی آلہ وصحبہ وکل منھم المقد س

سُوۡرَةُ التَّكۡوِيۡر

سُوۡ رَةُ التَّكۡوِيۡرِ مَكِّيَّةٌ وَّ هِيَ تِسۡعٌ وَّ عِشۡرُوۡنَ اٰيَةً و رُكُوۡعٌ وَّا حِدٌ

رکوع:۱، آیات:۲۹ سورہ تکویر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں انتیس آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔ کلمات:۱۰۴، حروف ۵۳۴

سورۂ تکویر کی اہمیت:

(۱) حدیث صحیح میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس دنیا میں قیامت کو آنکھوں سے دیکھنا چاہے وہ سورہ اذا الشمس کورت، اذا السماء انفطرت اور اذا السماء انشقت پڑھ لے (ان میں قیامت کا نقشہ خوب کھینچا گیا ہے) (۲) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک دن عرض کیا یا رسول اللہ! آپ پر بڑھاپا جلدی آ گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھ کو پانچ سورتوں (سورۃ ھود۔ سورۃ واقعہ۔ سورۃ والمرسلت۔ سورۃ عم یتسالون۔ اور سورۃ اذا الشمس کورت) نے بوڑھا بنا دیا۔ (ان سورتوں میں دنیا وآخرت کے ان عذابوں کا ذکر ہے جو امتیوں کو مخالفتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوں گے۔ آپ کو اس کا غم تھا اور غم میں بڑھاپا جلدی آجاتا ہے

سَــأَلۡـتُ مِـنَ الاَ طِبَـاءِ يَـوۡم اَخۡبِـرُنِـىۡ مَـا شَيَّبَنِىۡ قَـاٰلَ بَـلۡغَـمُ
فَـقُـلۡـتُ لَـهٗ عَـلٰـى غَيۡـرِ اخۡتِـتَـامٖ لَـقَدۡ اَخۡطَـأۡتَ فِيۡمَـا قُلۡتَ بَلۡ غَمُ

میں نے طبیب سے بڑھاپے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا بلغم۔ میں نے کہا غلط ہے بلکہ غم اس کا سبب ہے۔

ربط ومناسبت:

اس سورت میں بھی سابقہ ولاحقہ سورتوں کے مثل حادثہ قیامت کا بیان مقصود ہے۔ اور اسکی تقویت کے لئے اخیر میں قرآن کی حقانیت کا اثبات ہے۔ جیسا کہ سابقہ سورت میں **کلا انھا تذکرۃ** سے قرآن کی حقانیت وعظمت کو ذکر کیا گیا تھا۔ (گویا اس میں ترتیب معکوس ہے) اور لفظ **کورت** کی وجہ سے اس سورت کا نام تکویر رکھا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد مہربان اور رحم کرنے والا ہے

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۱) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۲) وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳)

جب سورج تاریک ہو جائیگا۔ اور جب ستارے جھڑ پڑیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

اِذَا	الشَّمْسُ	كُوِّرَتْ	وَ	اِذَا	النُّجُوْمُ	انْكَدَرَتْ	وَ	اِذَا	الْجِبَالُ	سُيِّرَتْ
جس وقت	سورج	لپیٹا جائے	اور	جس وقت	تارے	گدلے ہوجائیں	اور	جس وقت	پہاڑ	چلائے جائیں

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۴) وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۵) وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶)

اور جب گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔ اور جب وحشی جانور جمع کردیئے جائیں گے۔ اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے۔

وَ	اِذَا	الْعِشَارُ	عُطِّلَتْ	وَ	اِذَا	الْوُحُوْشُ	حُشِرَتْ	وَ	اِذَا	الْبِحَارُ	سُجِّرَتْ
اور	جسوقت	دس ماہ کی گابھن اونٹنی	بیکار چھٹی پھرے	اور	جسوقت	وحشی جانور	اکٹھے کئے جائیں	اور	جسوقت	دریا	بھڑکائے جائیں

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۷) وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (۸) بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۹)

اور جب ہر قسم کے لوگ الگ الگ اکٹھے کئے جائیں گے۔ اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا کہ اس کو کس جرم پر مارا گیا تھا۔

وَاِذَا	النُّفُوْسُ	زُوِّجَتْ	وَاِذَا	الْمَوْءٗدَةُ	سُئِلَتْ	بِاَيِّ	ذَنْبٍ	قُتِلَتْ
اور، جسوقت	جانیں قسم قسم کی	ملائی جائیں گی	اور، جسوقت	جیتی گاڑی ہوئی	پوچھی جائیگی	ساتھ کس	گناہ	ماری گئی

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۱۰) وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (۱۱)

اور جب اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے۔ اور جب آسمان کھول دیئے جائیں گے۔

وَ	اِذَا	الصُّحُفُ	نُشِرَتْ	و	اِذَا	السَّمَآءُ	كُشِطَتْ
اور	جس وقت	عمل نامے	کھولے جائیں	اور	جس وقت	آسمان	کھال اتاری جائے

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ (۱۲) وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ (۱۳)

اور جب دوزخ بھڑکائی جائیگی۔ اور جب جنت نزدیک لائی جائیگی۔

و	اِذَا	الْجَحِيْمُ	سُعِّرَتْ	وَ	اِذَا	الْجَنَّةُ	اُزْلِفَتْ
اور	جس وقت	دوزخ	دہکائی جائے	اور	جس وقت	جنت	نزدیک کی جائے

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (۱۴)

تو ہر شخص کو معلوم ہو گا کہ کیا لایا ہے۔

عَلِمَتْ	نَفْسٌ	مَّآ	اَحْضَرَتْ
جان لے گا	ہر جی	جو کچھ	حاضر کیا

لغات:

کورت جب سورج تاریک ہوجائیگا۔(ابن عباسؓ) بے رونق ہوجائیگا۔(مجاہدؒ) روشنی جاتی رہے گی (قتادہؒ، مقاتلؒ، کلبیؒ) لپیٹ میں دیا جائیگا (ابوعبیدہؒ، زجاجؒ) تکویر کے اصل معنی لپیٹ دینا ہی آتے ہیں۔ حدیث مرفوع میں ہے کہ سورج، چاند لپیٹ دیئے جائیں گے۔ یا بے نور کردیئے جائیں گے۔ کور سے مشتق ہے کار کورا (ن) لپیٹنا۔ انکدرت انکدار کے معنی میلے ہونے کے ہیں۔ مگر بکھر جانے اور پراگندہ ہونے میں بھی مستعمل ہے کدر کدرا کدرۃ (ن. س ک) مٹیالا ہونا۔ گدلا ہونا۔ العشار عشرا کی جمع وہ اونٹنی جس کو گابھن ہوئے دس ماہ ہوگئے ہوں۔ بیاہنے کے بعد تک اسکا یہی نام رہتا ہے ایسی اونٹنی عرب میں نفیس ترین مال سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح کے واحد و جمع کی نظیر نفساء اور نفاس ہے۔ ان کے علاوہ عرب میں تیسری نظیر موجود نہیں۔(المصباح المنیر للفیومی) عشر عشوا عشورا (ن) دسواں حصہ لینا۔ دسواں ہونا (ض) دس میں سے ایک لینا۔ نو پر ایک زائد کرنا۔ الناقۃ اونٹنی کا دس مہینہ کی حاملہ ہونا۔ عطلت تعطیل سے بیکار چھوڑ دینا۔ نفع نہ اٹھانا، دیکھ بھال نہ کرنا۔ عطل عطلا (س) خالی ہونا (ن) عورت کا بے زیور ہونا۔ بیکار رہنا۔ الوحوش، الوحوش کی جمع جنگلی جانور۔ البحار جمع البحر کی۔ سمندر۔ کھاری پانی۔ بڑا دریا۔ بحر بحرا (س) سمندر دیکھ کر گھبرانا (ف) پھاڑنا، چیرنا، سجرت آگ سے پر کی گئی۔ پڑ کی گئی خالی کی گئی۔ اس کا پانی بہادیا گیا۔ بھڑکادی گئی۔ سجر سجرا (ن) تنور میں ایندھن ڈال کر گرم کرنا۔ پانی کا دریا کو بھرنا۔ جوش میں آنا وغیرہ الموؤدۃ زندہ درگور کی ہوئی لڑکی۔ وأدا وأدا (ض) زندہ درگور کرنا (کشطت) (ض) برہنہ کردینا۔ ہٹادینا۔ گھوڑے سے جھول اتار دینا۔ ہٹا کر لپیٹ دینا۔ ازلفت ازلاف۔ قریب لانا۔ زلف زلفا ولفا (س) قریب ہونا (ن) آگے کرنا۔ زیادہ کرنا اذا ظرفیہ متضمن لمعنی الشرط فعل محذوف (کورت ای لفت) کی طرف مضاف لان اذا یطلب الفعل لما فیہ من معنی الشرط الشمس فاعل فعل محذوف مذکور کا اور کورت اس کی تفسیر کررہا ہے۔ والضمیر عائد الی الشمس۔ جملہ فعلیہ اگلے تمام معطوفات (جن کی ترکیب اسی طرح ہوگی) سے مل کر شرط۔ اور بای ذنب متعلق قتلت کے ہے اور یہ جملہ فعلیہ سئلت کا بیان ہوگا اور علمت نفس الایۃ جواب شرط ہوگا۔ ما احضرت میں ما موصولہ ہے۔ تو جملہ فعلیہ صلہ اور اگر موصوفہ ہے تو جملہ صفت ہوگا۔(والمرا دبھا واحد ممتد متسع للخصال المذکورۃ مبدؤہ نفخۃ الاولیٰ ومنتھاہ فصل القضاء)

تفسیر:

تخریب عالم کے بارہ نشانات...... جب یہ بارہ نشانات وجود میں آجائیں تو انسانوں کو اپنی کرتوتوں کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوجائیگا (۱) اذا لشمس کورت ...... ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کورت کی تفسیر میں فرمایا ہے اظلمت (تاریک ہوجائیگا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی منقول ہے کہ قیامت کے دن خدائے تعالیٰ سورج، چاند اور ستاروں کو بے نور کرکے سمندر میں ڈال دیں گے۔ اور ایک پچھمی ہوا چلے گی جو سمندر پر گذرے گی اور سمندر آگ ہو جائے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ جب سورج سمندر میں پھینکا جائے گا اور ستارے جھڑ کر جہنم میں گر جائیں گے۔ حدیث میں ہے

کہ سورج کو بے نور کر کے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔اور ستارے پراگندہ ہو کر جہنم میں پڑ جائیں گے۔اور عیسیٰ اوران کی ماں کے سوا تمام معبودان باطل کو جہنم رسید کر دیا جائیگا۔میں یہ کہتا ہوں کہ سورج کا سمندر میں پھینکا جانا اور جہنم میں پھینکا جانا بظاہر متعارض ہے۔دونوں میں تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ سمندر خود آگ بن جائے گا۔(اور جہنم یہیں عالم اسفل میں ہوگی)مظہری

(۲)وَاِذَا النجوم انکدرت ......(اور جب ستارے ٹوٹ پڑیں گے۔آسمان سے بکھر کر زمین پر آپڑیں گے)کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس دن آسمان سے ستاروں کی بارش ہوگی۔کوئی ستارہ بغیر گرے نہ رہے گا۔(ف) نجوم کے لفظ سے روشنی اور ظہور مفہوم ہے اس لئے اس کے ساتھ لفظ انکدرت استعال ہوا۔جس کے اصل معنیٰ دھندلا اور بے نور ہو جانے کے ہیں۔اور کواکب بھی تاروں کو کہتے ہیں۔مگر اس میں جمے رہنے اور جڑے رہنے کے معنی ہیں۔اسی لئے اگلی سورت میں الکواکب کے ساتھ انتثرت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

(۳)واذا الجبال سیرت ......اور جب پہاڑ چلا دیئے جائیں گے۔آخر کار پراگندہ ذرات بن کر ہوا میں اڑتے پھریں گے۔

(۴)وَاذا العشار عطلت ......اور جب وہ دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں جو بچہ دینے کے قریب ہیں بے کار و بے مہار ماری ماری پھریں گی۔ عرب میں ایسی اونٹنی (عشرا) کو نفیس ترین مال سمجھا جاتا تھا۔بعض لوگ کہتے ہیں العشار سے مراد بادل ہے۔یعنی بادل بارش سے خالی ہو جائیں گے۔والا ول اشھر و اصح۔

(۵)واذا الوحش حشرت ......ایسے حالات میں انسان کیا وحشی جانور بھی جو آج انسانوں سے بھاگتے ہیں۔اور آپس میں بھی ایک جنس کے جانور دوسری جنس کے جانوروں سے نفرت کرتے ہیں دہشت کی وجہ سے ایک دوسرے میں گھس پڑیں گے۔اور جنگل پہاڑ چھوڑ کر آبادیوں میں پناہ لینے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔جیسا کہ جنگل میں آگ لگ جانے یا سیلاب آجانے کے وقت یہ منظر دکھائی دیتا ہے۔بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس سے مراد حیوانات میں باہمی قصاص کے لئے ان کو جمع کرنا ہے جیسا کہ یلیتنی کنت ترابا کی تفسیر میں گذر چکا ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جانوروں کا حشر ان کی موت ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ انس وجن کے علاوہ ہر چیز کا حشر اسکی موت ہے عرب کہتے ہیں کہ حشر تھم السنة جبکہ لوگوں کے مال و جان قحط سے تلف ہو جائیں۔

(۶)واذا البحار سجرت ......ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب سمندر بھڑکائے جائیں گے۔اور وہ بھڑکتی آگ بن جائیں گے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ہے کہ جب سمندر بھر دیئے جائیں گے۔مجاہد و مقاتل رحمۃ اللہ علیہما کہتے ہیں کہ سمندر ایک دوسرے میں گھس پڑیں گے۔میٹھے اور شور مل کر گرم پانی کا سمندر دوزخیوں کے لئے بن جائے گا۔حسن بصری وقتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا کہ خشک ہو جائیں گے۔ان میں پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہ رہے گا۔ان تمام اقوال کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ تمام سمندروں کو جمع کر کے ایک سمندر لبریز کر دیا جائیگا۔اور سورج کو اس میں ڈال دیا جائیگا۔جس کی وجہ سے سمندر گرم ہو کر آگ بن جائے گا۔اور وہ دوزخیوں کے لئے حمیم بن جائے گا۔پانی کا ایک قطرہ بھی نہ رہے گا۔

ان چھ حادثات پر دنیا کا خاتمہ:

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول ہے (نفخہ اولیٰ کے وقت) قیامت سے پہلے چھ نشانیاں ہوں گی۔ لوگ بازاروں میں (اپنے کاروبار میں) مصروف ہوں گے کہ (۱) ایک دم سورج کی روشنی جاتی رہے گی۔ اسی اثنا میں (۲) پہاڑ زمین پر آ گریں گے۔ (۳) زمین ہل جائے گی۔ اور اس میں لرزہ پیدا ہو جائے گا (۴) انس و جن گھبرا جائیں گے، جنات آدمیوں سے کہیں گے ہم تم کو خبر لا کر دیتے ہیں چنانچہ جنات سمندر تک پہونچیں گے اور (۵) سمندر ان کو بھڑکتی ہوئی آگ نظر آئے گا۔ اسی دوران میں اچانک (۶) ایک ہوا آئے گی۔ جس سے سب مر جائیں گے۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے مگر اس میں سمندر کے آگ ہو جانے کے بعد اتنا اور زائد ہے کہ وہ اسی میں ہوں گے کہ زمین پھٹ جائے گی۔ اور اسی دوران میں ہوا آئے گی جس سے سب مر جائیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قیامت کی بارہ چیزیں ہوں گی۔ چھ دنیا میں (مذکور ہوئیں) اور چھ آخرت میں۔ (چھ آخرت والی چیزیں آئندہ آیات میں مذکور ہیں)۔

ترتیب پر اعتراض اور اس کا جواب:

مذکورہ حوادث کی ترتیب پر بعض نکتہ چینوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ نفخہ اولی کے وقت جب آفتاب بے نور ہو جائیگا ستارے دھندلے ہو کر گر پڑیں گے۔ پہاڑ اڑ جائیں گے۔ تو گابھن اونٹنیاں اور وحوش کا وجود ہی اس وقت کہاں رہے گا کہ ان کے معطل و محشور ہونے کا ذکر کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واؤ مطلق جمع پر دلالت کرتی ہے۔ ترتیب پر نہیں۔ یعنی ان آیات میں ترتیب وقوع کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا چھ حوادث کا وقوع نفخہ اولیٰ کے وقت ہوگا۔ ترتیب میں علویات کو اولاً بیان کر دیا گیا ہے پھر سفلیات کو۔ علویات کے حادثات بہ نسبت سفلیات کے زیادہ عظیم الشان ہیں۔ گویا سفلی حوادث کے بعد ہی واقع ہوں کیونکہ مکین کے نہ رہنے سے مکان ویران ہوتا ہے پھر اوپر سے شکستہ ہو کر چھتیں پھر دیواریں گرتی ہیں۔ اسی طرح پہلے انس و جن اور حیوانات ہلاک ہونگے پھر سورج ستاروں وغیرہ کا نمبر آئیگا۔ فافهم۔ ان مذکورہ چھ حوادث پر عالم فنا ہو جائیگا۔ اور ایک عرصہ گذرنے کے بعد دوبارہ صور پھونکی جائے گی پھر کائنات وجود میں آئے گی۔ اس نفخہ ثانیہ پر بھی چھ حوادث پیش آئیں گے۔

(۱) واذا النفوس زوجت .... (اور جب نفوس انسانیہ کے جوڑے لگیں گے) اول تو ارواح کا اجسام سے جوڑا لگے گا اور اجسام زندہ ہو جائیں گے۔ گویا ارواح کی اجسام سے ایسی شادی ہو جائے گی کہ ان میں پھر کبھی جدائی نہ ہوگی پھر ہر ایک جنس و نوع کے جوڑے لگیں گے اچھے الگ ہو جائیں گے اور برے الگ۔ پھر نیکوں میں مثلاً نمازیوں کی صف الگ ہوگی غازیوں کی جدا۔ علی ہذا القیاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس آیت میں وہ لوگ (مراد) ہیں جو آپس میں عملی مشارکت رکھتے تھے۔ ہر وہ شخص جو لوگوں کے ساتھ مل کر ان جیسا کام کرتا تھا (وہ انہیں سے ملا دیا جائے گا) اور یہ اللہ کے حکم سے ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت بھی اس موقع پر پڑھتے تھے۔ ﴿وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً﴾ اولاً تین جماعتیں قائم ہونگی۔ (۱) اصحاب الیمین (۲) اصحاب الشمال (۳) سابقین۔ پھر انواع کے جوڑ لگیں گے۔ حضرت عمر کا قول ہے کہ واذا النفوس زوجت سے وہ دو شخص مراد ہے جو ایک ہی کام کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ دونوں جنت یا دوزخ میں چلے گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ احشروا الذین ظلموا وازواجهم میں (ازواج) ان کے شرکاء کار مراد ہیں۔ سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اچھے آدمی کو اچھے آدمی کے ساتھ جنت میں ملا دیا جائے گا۔ اور برے آدمی کو برے کے ساتھ دوزخ میں ملا دیا جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے یہ مراد ہے کہ لوگوں کو ان کے اعمال کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ عطاء ومقاتل رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے کہ نفوس مومنین کا جوڑا تو بڑی آنکھوں والی حوروں سے ملا دیا جائے گا۔ اور نفوس کفار کو شیاطین کے ساتھ ملا دیا جائیگا بعض کہتے ہیں کہ نفوس انسانیہ اور نفوس سماویہ وارضیہ کو ملا دیا جائے گا۔ لیکن یہ لفظ واذا النفوس زوجت وسیع المعنی ہے۔ اور سب احتمالات کو حاوی ہے

(۲) واذا الموءودة سئلت ......(اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ اس کو کس جرم میں مارا گیا) جہلائے عرب ننگ وامادی خوف افلاس کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ گڑھے میں ڈال کر مٹی پھیر دیا کرتے تھے یہ ان کو سنایا جا رہا ہے کہ ایک دن اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ مظلومہ لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ اس کو کس جرم میں زندہ دفن کیا گیا۔ اور زندہ دفن کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔ آیت سے دفن کرنے والوں کی تذلیل وتجہیز مقصود ہے۔ یا موؤدہ کی طرف نسبت سوال مجازی ہے یعنی مقصود اس سے سوال نہیں۔ بلکہ اس کے بارے میں سوال مقصود ہے۔ جیسا کہ ان العهد کان مسئولا میں سوال عہد سے نہیں بلکہ صاحب عہد سے عہد کے بارے میں ہوگا یا موءودة بمعنی وائدة ہے یعنی دفن کرنے والی سے باز پرس ہوگی۔ اسم مفعول بمعنی اسم فاعل بھی آتا ہے۔ چنانچہ كان وعده ماتیا بمعنی اتیا ہے۔ یا الموءودة سے مراد الموءودة لهما ہے۔ یعنی مدفونہ لڑکی کے والدین ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ الوائدة والموءودة فی النار کہ اس حدیث میں ایک توجیہ کی بنا پر الموءودة سے مراد الموءودة لها یعنی ماں ہے۔

لڑکی سے کیوں پوچھا جائے گا؟

آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ ہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس مظلومہ لڑکی سے سوال ہوگا۔ بظاہر اس سے سوال کی کوئی وجہ نہیں۔ جرم کا تو مجرم سے سوال ہونا چاہئے؟ جواب ......(۱) یہ ہے کہ اس سوال سے صرف تلقین دعوی مقصود ہے تاکہ موؤدۃ اپنی مظلومیت وبے گناہی کی فریاد پورے طور پر بارگاہ الٰہی میں کرے۔ اور سوال اس انداز کا نہ ہوگا کہ ایسا کیوں ہوا۔ ایسا سوال تو مجرم سے ہوتا ہے (۲) ماں باپ پر دعوی کرنے میں حیا مانع ہو سکتی ہے تو اس کو ہمت بندھانے کے لئے دعوی کی تلقین کی جائے گی۔ (۳) اس میں والدین کے ادب کی رعایت ملحوظ ہوگی کہ اس میں قاتل کا ذکر ہے نہ قاتل سے خطاب۔ گویا قاتل سے سوال ہی منظور نہیں۔ (۴) یا یہ کہا جائے کہ والدین تو اپنی اولاد سے کمال شفقت ومحبت رکھتے ہیں۔ بلا جرم عظیم قتل جیسے گناہ کبیرہ وقطع رحمی کا ارتکاب کر ہی نہیں کر سکتے۔ اس لئے موءودة سے سوال ہوگا کہ آخر کس جرم میں تیرے قتل کا ارتکاب کیا گیا۔ گو نتیجہ کے اعتبار سے بے حد رسوائی زندہ درگور کرنے والے والدین کی ہی ہوگی۔ (۵) ممکن ہے کہ ایسے والدین کے کمال شقاوت وقساوت کی وجہ سے ان سے خطاب ہی نہ کیا جائے۔ بلکہ کمال غضب کی بناء پر اس نے خطاب سے اعراض کیا جائے گا (۶) چند توجیہات نسبت مجازی یا بمعنی اسم فاعل وغیرہ اوپر مذکور ہو چکی ہیں۔

نکتہ: ...... یہاں خطاب قُتِلْتِ کے بجائے صیغہ غائب قُتِلَتْ کیوں لایا گیا؟ بظاہر تو خطاب کا موقع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعات قیامت کا بیان مقصود ہے۔ اور آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موءودہ کے بارے میں

سوال ہوگا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی۔ کس سے سوال ہوگا؟ اسکا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کے پیش نظر کسی تاویل وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ فائدہ۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت نام ہی یوم الحساب، یوم الجزاء اور یوم الدین ہے۔ وہاں تو تمام اعمال کا محاسبہ اور تمام گناہوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ یہاں خصوصی احوال اور اہوال قیامت کے سلسلہ میں موؤدۃ کے معاملہ اور اسکے متعلق سوال کو اتنی اہمیت وخصوصیت کیوں دی گئی؟ جواب۔ غور کرنے سے وجہ خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مظلوم لڑکی جس کو خود اس کے ماں باپ نے قتل کیا ہے اس کا انتقام لینے کے لئے کوئی دعوی کرنے والا تو ہے نہیں خصوصاً جبکہ اس کو خفیہ دفن کر دیا گیا ہو (جیسا کہ عرب کی عادت تھی) تو کوئی شہادت بھی اس پر نہیں۔ لیکن عدالت خداوندی ایسے مظالم کو بھی سامنے لائے گی جن پر کوئی شہادت نہیں۔ اور نہ مظلوم کا کوئی پرسان حال ہے۔ گویا آیت میں کمال عدالت وانتہا انصاف کی طرف اشارہ ہے۔

اسقاط حمل بھی قتل ولد ہے:...... **(مسئلہ ۱)** بچوں کو زندہ دفن کر دینا یا قتل کر دینا سخت گناہ کبیرہ وظلم عظیم ہے۔ اور چار ماہ کے حمل کو گرانا بھی اسی حکم میں ہے کیونکہ چوتھے ماہ حمل میں روح پڑ جاتی ہے۔ اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے۔ اسی طرح جو کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائے اور اس سے بچہ ساقط ہو جائے۔ تو باجماع امت مارنیوالے پر اس کی دیت میں ایک غرہ یعنی ایک غلام یا اس کی قیمت واجب ہوتی ہے۔ اور اگر پیٹ سے وہ بچہ زندہ نکلا پھر مر گیا تو ایسی صورت میں پوری دیت بڑے آدمی کے برابر واجب ہوتی ہے۔

مسئلہ ۲:...... چار ماہ سے پہلے بھی اسقاط حمل اضطراری حالات کے بدون حرام ہے۔ مگر پہلی صورت سے اس میں گناہ کم ہے کیونکہ اس میں کسی زندہ انسان کا قتل صریح نہیں ہے۔ (مظہری)

مسئلہ ۳:...... کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پائے جیسے کہ آج کل دنیا میں ضبط تولید کے نام سے اس کی سینکڑوں صورتیں رائج ہوگئی ہیں۔ اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وأد خفی (خفیہ طور پر بچہ کو زندہ درگور کرنا) فرمایا ہے (رواہ مسلم) اور بعض دوسری روایات میں جو عزل (یعنی ایسی تدبیر کرنے پر جس سے نطفہ رحم میں نہ جائے) رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سکوت یا عدم ممانعت ہے۔ وہ ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ بھی اسی طرح کے ہمیشہ کے لئے قطع نسل کی صورت نہ بنے۔ آج کل جو ضبط تولید کے نام پر دوائیں دی جاتی ہیں یا علاج (کئے جاتے ہیں) ان میں بعض علاج ایسے بھی ہیں کہ ان سے ہمیشہ کے لئے نسل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی شرعاً کسی حالت میں اجازت نہیں۔ واللہ اعلم (معارف القرآن) **مسئلہ ۴:**...... عزل (نطفہ باہر گرانا) حرہ بیوی کی بلا اجازت ناجائز اور اجازت پر مکروہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرہ عورت سے بغیر اس کی اجازت کے عزل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابن ماجہ، مظہری)

(۳) **واذا الصحف نشرت** ...... (اور جب اعمال نامے پھیلا دیئے جائیں گے) صحیفے بانٹ دیئے جائیں گے یا عرش کے نیچے سے اڑا دیئے جائیں گے۔

(۴) **واذا السماء کشطت** ...... کشط کے لغوی معنی جانور کی کھال اتارنے کے آتے ہیں۔ بظاہر یہ حال قیامت کے نفخہ اولیٰ کے وقت کا ہے جو اسی دنیا میں پیش آئے گا۔ کہ آسمان کی زینت شمس وقمر اور ستاروں سے تھی وہ سب بے نور کر کے سمندر میں ڈال دیئے جائیں گے۔ تو آسمان کی موجودہ حالت تبدیل ہو جائے گی۔ جس کو کشطت کے لفظ سے

تعبیر کردیا گیا ہے۔بعض مفسرین نے کشط کے معنی لپیٹنے کے لکھے ہیں۔یعنی آسمان کو لپیٹ دیا جائے گا۔یہ حالت دونوں نفخوں کے درمیان یا نفخہ ثانیہ پر ہوگی۔قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ صاحب افصاح نے اخبار مختلفہ میں اسی طرح توفیق دی ہے کہ آسمان وزمین کی تبدیلی دوبار ہوگی۔ایک بار تو ان کے حالات کی تبدیلی جو نفخہ اولیٰ کے وقت ہوگی (اور یہ حالات وہ ہیں جن کو اذا الشمس سے سجرت تک بیان کیا گیا) پھر دونوں نفخوں کے درمیان آسمان وزمین لپیٹ دیئے جائیں گے۔اور بدل دیئے جائیں گے۔واللہ اعلم۔(۵) **واذا الجحیم سعرت** :......اور جب دشمنان حق کے لئے دوزخ کو خوب بھڑکا دیا جائے گا۔(۶) **واذا الجنۃ ازلفت** :......اور جب جنت کو پرہیزگاروں کے قریب کردیا جائے گا۔**علمت نفس ما احضرت** :......تو انسانوں کے اعمال (اعمالناموں کی شکل میں یا خود اعمال ہی جواہر اور متشکل بن کر) ان کے سامنے آجائیں گے۔

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ (١٥) الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ (١٦) وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ (١٧)

سو میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے، سیدھے چھپ جانیوالے ستاروں کی اور رات کی قسم جب وہ چھا جائے۔

فَلَآ اُقۡسِمُ	بِالۡخُنَّسِ	الۡجَوَارِ	الۡكُنَّسِ	وَ	الَّيۡلِ	اِذَا	عَسۡعَسَ
پس قسم کھاتا ہوں میں	کی پھر جانے والوں	سیدھے چلنے والوں	تھم رہنے والوں	اور	رات	جب	جانے لگے

وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ (١٨) اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ (١٩) ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ (٢٠)

اور صبح کی قسم جب وہ روشن ہو جائے کے یقیناً یہ قرآن ایک ایسے معزز طاقت ور فرشتہ کا لایا ہوا کلام ہے جو مالک عرش کے نزدیک صاحب مرتبہ ہے

وَ	الصُّبۡحِ	اِذَا	تَنَفَّسَ	اِنَّهٗ	لَقَوۡلُ	رَسُوۡلٍ	كَرِيۡمٍ	ذِىۡ قُوَّةٍ	عِنۡدَ	ذِى	الۡعَرۡشِ	مَكِيۡنٍ
اور	صبح	جب	دم لے دے	تحقیق یہ	البتہ کہنا	پیغام پہنچانیوالا	بزرگ	قوت والا	نزدیک	صاحب	عرش	مرتبے والا

مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ (٢١) وَمَا صَاحِبُكُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ (٢٢) وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِيۡنِ (٢٣)

وہاں کا سردار امانت دار ہے۔اور تمہارے پیغمبر دیوانے نہیں ہیں۔اور انہوں نے اس کو صاف مطلع پر دیکھا ہے۔

مُّطَاعٍ	ثَمَّ	اَمِيۡنٍ	وَ	مَا	صَاحِبُكُمۡ	بِمَجۡنُوۡنٍ	وَ	لَقَدۡ	رَاٰهُ	بِالۡاُفُقِ	الۡمُبِيۡنِ
کہا مانا گیا	اس جگہ	باامانت	اور	نہیں	صاحب تمھارا	دیوانہ	اور	البتہ تحقیق	دیکھا ہے اس نے اسکو	بیچ کنارے	ظاہر

وَمَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ (٢٤) وَمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ (٢٥) فَاَيۡنَ تَذۡهَبُوۡنَ (٢٦)

اور وہ غیب پر بخیل نہیں ہیں۔ اور یہ قرآن شیطان مردود کا کلام نہیں۔ پھر تم کہاں چلے جارہے ہو؟

وَ	مَا	هُوَ	عَلَى	الۡغَيۡبِ	بِضَنِيۡنٍ	وَ	مَا	هُوَ	بِقَوۡلِ	شَيۡطٰنٍ	رَّجِيۡمٍ	فَاَيۡنَ	تَذۡهَبُوۡنَ
اور	نہیں	وہ	اوپر	غیب کی بات	بخیل	اور	نہیں	وہ	کہنا	شیطن	راندے گئے	پس کہاں	جاتے ہو

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (٢٧) لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ (٢٨)

یہ تو دنیا بھر کے لئے ایک زبردست نصیحت ہے۔ اس کے لئے جو تم میں سیدھا چلنا چاہتا ہے۔

اِنۡ	هُوَ	اِلَّا	ذِكۡرٌ	لِّلۡعٰلَمِيۡنَ	لِمَنۡ	شَآءَ	مِنۡكُمۡ	اَنۡ	يَّسۡتَقِيۡمَ
نہیں	یہ	مگر	نصیحت	واسطے عالموں	واسطے اس شخص	چاہے	سے تم	یہ کہ	سیدھی راہ چلے

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹)

اور تم اللہ رب العالمین کے بغیر چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔

وَ	مَا	تَشَآءُوْنَ	اِلَّآ	اَنْ	يَّشَآءَ	اللّٰهُ	رَبُّ	الْعٰلَمِيْنَ
اور	نہیں	چاہتے تم	مگر	یہ کہ	چاہے	اللہ	پروردگار	عالموں

لغات:

الخنس خانس کی جمع، خلص خالص کی جمع، پیچھے ہٹ جانے والے، پھر جانیوالے، رک جانے والے، چھپ جانے والے، خنس خنساً خنوساً خنا سناً (ن ض) پیچھے ہونا۔ سکڑ جانا۔ سمٹنا، چھپانا خنسا (س) ناک کا چپٹا ہونا۔ اوراس کے سرے کا اٹھا ہوا ہونا۔ الجوار جارية کی جمع، کشتیاں۔ جہاز۔ باندیاں، چلنے والیاں، جری جریا نا (ض) چلنا، بہنا، جاری ہونا۔ الکنس الکانس کی جمع، صغیہ اسم فاعل کنس کناسا (ض) ہرن کا جائے پناہ میں داخل ہونا۔ چھپنا۔ کنسا (ن) جھاڑو دینا۔ کنس ستارے۔ نیل گائیں، ہرنیاں۔ عسعس رات کا اندھیرا چھا گیا۔ رات کا اندھیرا چلا گیا۔ یہ کلمہ اضداد میں سے ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سعسع کا مقلوب ہے جس کے معنی کسی چیز کے چلے جانے کے ہیں۔ تنفس سانس لینا، دم کھینچنا، مراد اس سے پو پھٹنا ہے۔ مکین صفت مشبہ کون مصدر (ك) عزت والا، مرتبہ والا۔ ضنین بخیل، کنجوس۔ صیغہ صفت مشبہ۔ ضن (ن ض) سے، اس کا استعمال نفیس شئی میں بخل کے متعلق ہوتا ہے۔

ترکیب:

فا تفریعیه لا اقسم فعل بافاعل الخنس موصوف اپنی دونوں صفتوں الجوار اور الکنس سے مل کر معطوف علیہ و عاطفہ (على الاصح وعند البعض قسمية، فالجملة عليحدة معطوفة على القسم) اذا ظرفیہ مضاف عسعس جملہ فعلیہ مضاف الیہ مرکب اضافی ہوکر اقسم کا ظرف ہوگا۔ اسی طرح والصبح اذاتنفس ہے۔ معطوفات مجرور متعلق لا اقسم کے، جملہ قسم۔ اور بعض لوگوں کے نزدیک تینوں جملے معطوفات اور ہر ایک قسمیہ ہے۔ انه حرف مشبہ بفعل معہ اسم لقول مضاف رسول موصوف کریم صفت اول ذی قوۃ مرکب اضافی صفت ثانیہ مکین اپنے ظرف عند ذی العرش (مرکب اضافی) سے مل کر صفت ثالثہ مطاع صفت رابعہ ثم لا شارة المكان۔ ظرف مطاع یا امین کا، امین صفت خامسہ رسول اپنی پانچوں صفات سے مل کر مضاف الیہ قول اپنے مضاف الیہ سے مل کر خبر۔ جملہ جواب قسم۔ واو عاطفہ۔ ما مشابہ بلیس صاحبکم مرکب اضافی اسم بمجنون خبر۔ (والباء زائد لتحسين الكلام وللتاكيد) اس جملہ کا عطف جواب قسم پر ہے۔ واو عاطفہ لقد لام تاکیدی اور قد تحقیقی راہ فعل ضمیر فاعل۔ (عائد الى صاحبكم) ہٗ مفعول بہ بالافق المبین متعلق جملہ فعلیہ معطوف جواب قسم پر واو عاطفہ ما مشابہ بلیس هو اسم بضنین اپنے متعلق مقدم على الغيب سے مل کر خبر۔ والباء زائدة۔ جواب قسم پر معطوف وکذا قوله تعالى وما هو بقول شيطين الرجيم بتفاوت يسير فاء تفريعيه تذهبون اپنے فاعل ضمیر جمع مذکر اور ظرف مقدم این سے مل کر جملہ فعلیہ (وقد الظرف لصدارة الكلام) ان نافیہ ھو مبتدا الا حرف استثناء لغو لـلعلیمن جار مجرور مبدل منہ ل

حرف جر من موصولہ شاء فعل ضمیر فاعل منکم متعلق ان یستقیم جملہ فعلیہ بتاویل مفرد مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ صلہ ، موصول وصلہ مل کر مجرور، جار مجرور بدل، مبدل منہ اپنے بدل سے مل کر ذ کرٍ کے متعلق اور وہ خبر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔ واو عاطفہ ما تشاؤن فعل ضمیر مخاطبین فاعل ھا ضمیر (ای الا ستقامۃ) مفعول بہ الا حرف استثناء ان یشاء فعل اللہ موصوف رب العلمین مرکب اضافی صفت۔ مرکب توصیفی فاعل۔ جملہ فعلیہ بتاویل مفرد مضاف الیہ وقت محذوف کا۔ اور یہ استثنائے مفرغ ہوا۔

تفسیر:

قیامت کے احوال اور ہولناک مناظر اور وہاں کے محاسبہ اعمال کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے چند ستاروں کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ قرآن حق ہے۔ اللہ کی طرف سے بڑی حفاظت کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اور جس ذات گرامی پر نازل کیا گیا ہے۔ اس سے اہل مکہ خوب واقف ہیں۔ کہ وہ صادق وامین کی بڑی خصوصیات وعمدہ صفات سے مزین ومتصف ہیں۔ وحی لانے والے فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خوب پہچانتے ہیں۔ اس لئے اس قرآن مقدس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں یہ پاکیزہ کلام شیطانی اثرات سے قطعاً مبرا ہے

قسم کیوں کھائی گئی ؟

سابقہ آیات میں جن ہولناک واقعات قیامت کی خبر دی گئی وہ امور بدیہیہ نہیں تھے۔ اور نہ ہی سہل الحصول تھے کہ متوسط عقلیں بغیر کسی دلیل وبرھان سے ان کو تسلیم کرلیتیں۔ اگر یہ امور ایسے ہوتے تو ان میں عقلاء کا اختلاف اس درجہ نہ ہوتا۔ اسی لئے شروع قرآن میں ان امور پر ایمان لانے کو ایمان بالغیب کہا گیا۔ ان کا ثبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے۔ جس نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، اس کے نزدیک ان تمام امور کے سچا ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس لئے ضروری ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وصداقت اور ان پر نازل ہونے والی کتاب کی سچائی کو ثابت کیا جائے۔ اور عرب والوں کے نزدیک جھوٹی قسم کھانا باعث ہلاکت میں شمار ہوتا تھا۔ اسی بناء پر اگر کوئی شخص قسم کھا کر کوئی بات بیان کردیتا تو وہ لوگ ایسی بات کی تصدیق بلا پس وپیش کرتے تھے۔ اس وجہ سے قیامت کے ہولناک واقعات کے بعد آیات مذکورہ کو قسم کے ساتھ شروع کیا گیا۔ اور قسم ہی پر بس نہیں کی گئی۔ بلکہ وہ دلائل بھی بیان فرمائے جن سے قیامت کے ہولناک واقعات کا امکان اور ان کا وقوع ثابت ہوتا ہے۔ اور قرآن مقدس کا کتاب الٰہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

قسم کے ساتھ ستاروں کو کیوں خاص کیا گیا؟

(۱) جن ستاروں کی قسم کھائی گئی وہ اکثر مفسرین کے نزدیک (جیسا کہ آگے آتا ہے) پانچ ستارے ہیں۔ جن کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔ ان کی حرکت ورجعت اور وقوف کا مشاہدہ سے تعلق ہے۔ جس طرح سورج اور چاند کے تغیرات، طلوع وغروب اور گرہن اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کا تعلق مشاہدہ سے ہے۔ جن بارہ واقعات وحوادث کا ذکر اوپر کی آیات میں آچکا تھا۔ ان کا تعلق ایمان بالغیب سے تھا۔ ان حوادث وتغیرات عالم پر ان مشاہدات کو دلیل بنایا گیا ہے۔ تو گویا کلام مختلف وجوہ

سے مضمون ماقبل کا موید ہوا۔قسم کے اعتبار سے۔دلیل کے اعتبار سے اور نبوت وکلام الٰہی کے اثبات کے اعتبار سے۔حاصل کلام یہ ہوا کہ ان ستاروں کے تغیرات آسمانی اجسام کے تغیر وانقلاب پر دلیل وعلامت ہیں۔اور جب اجرام سماوی میں انقلاب وتغیر ممکن ومتصور ہے تو اجرام سفلی کے تغیر میں کیا اشکال ہوسکتا ہے۔؟ حالانکہ اس عالم سفلی کے تغیرات وانقلابات کا بھی ہم شب وروز مشاہدہ کرتے ہیں۔

(۲) ان ستاروں کی تغیرات ان کے حدوث پر دلالت کرتے ہیں۔کیوں کہ کل متغیر حادث اہل عقل کے نزدیک مسلم ہے تو جو چیزیں متغیر اور حادث ہیں۔ظاہر ہے کہ ان میں صدمات قبول کرنے اور فنا ہوجانے کی صلاحیت موجود ہے۔بلکہ ان کا تغیر خود ان کے فنا ہوجانے کی دلیل ہے۔ستاروں کے علاوہ سورج اور عالم سفلی کی چیزوں کے تغیرات کا سب کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں۔ستاروں کا تغیر قدرے خفی تھا۔اس لئے خصوصاً ان پانچ ستاروں کی قسم کھا کر جن دیگر ستاروں کی بہ نسبت تغیر زیادہ نمایاں ہے ان تغیرات وانقلابات کی طرف متوجہ کیا گیا۔گو ستاروں کا دن میں چھپ جانا اور رات کو ظاہر ہونا بہت ہی نمایاں ہے۔مگر وقت ظہور بھی وہ تغیرات سے خالی نہیں۔واللہ اعلم۔

فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اکثر مفسرین سے منقول ہے کہ اس جگہ وہ پانچ ستارے مراد ہیں جن کو خمسہ متحیرہ کہا جاتا ہے۔یعنی زحل،مشتری،عطارد،مریخ،زہرہ۔ان کو متحیرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی حرکت کچھ اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ وہ کبھی مشرق سے مغرب میں چل رہے ہیں۔کبھی پھر پیچھے کو مغرب سے مشرق کی طرف چلنے لگتے ہیں۔کبھی ٹھہر جاتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ اور دو مختلف حرکتوں کا سبب کیا ہے؟ اس کے بارے میں قدیم فلاسفہ یونان کے اقوال مختلف ہیں۔

اور جدید فلاسفہ کی تحقیق ان میں سے بعض کے مخالف ہے۔اور بعض کے موافق ہے۔اور حقیقت کا علم پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں۔قدیم وجدید فلاسفہ کے اقوال اٹکل کے تیر،تخمینے اور اندازے ہیں۔جو غلط بھی ہوسکتے ہیں۔اور صحیح بھی۔قرآن حکیم نے امت محمدیہ کو ایسی فضول بحثوں میں نہیں الجھایا۔جتنی بات مفید تھی بتلادی گئی تاکہ بندے رب العزت کی قدرت کاملہ وحکمت بالغہ کا مشاہدہ کریں۔اور معرفت خالق سے بہرہ اندوز ہوں۔اور اپنے اوقات برباد نہ کریں۔**کل فی فلک یسبحون** ...... جیسی آیات سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سب ستارے اپنے اپنے دائرے میں تیرتے ہیں (یعنی ایک خاص ضابطہ خداوندی کے تحت جاری ومتحرک ہیں) حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **خنس** یہی ستارے ہیں۔جو رات کو نمودار ہوتے ہیں اور دن میں چھپ جاتے ہیں۔واللہ اعلم۔الحاصل ستاروں کا نظام قادر مطلق کی قدرت وعظمت پر بھی روشن دلیل ہے۔اور عالم کے فناء وزوال اور حوادث قیامت پر بھی ایک کھلی ہوئی علامت ہے۔نیز ان کے پرستاروں کے خیال فاسد اور حماقت کی تردید بھی ہے۔اس کے بعد قدرت کا ایک اور کرشمہ،اور روزانہ کے تصرف کا ایک نمونہ باندازِ قسم ذکر فرما کر حوادث مذکورہ اور اپنی قدرت باہرہ پر مزید ثبوت پیش کرتے ہیں۔

والیل اذا عسعس ...... حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے **عسعس** کا ترجمہ۔اقبل بظلا مہ او ادبر کیا ہے۔یعنی قسم ہے رات کی جب وہ اپنا اندھیرا لے کر آتی ہے۔یا پشت موڑ کر چلی جاتی ہے۔(یہ لفظ اضداد میں سے ہے) رات کا آنا اور دنیا پر چھا جانا بھی ایک تغیر عظیم ہے کہ روشنی کے بعد اندھیرا چھا گیا۔اور رات کا سمٹنا اور چلا جانا بھی زبردست تغیر اور اللہ کی قدرت کاملہ کا ایک کھلا ہوا نمونہ ہے کہ دنیا پر اندھیری کی سیاہ چادر پڑی تھی جو یکایک سمٹنے لگی۔

والصبح اذا تنفس ...... یہ تیسری قسم ہے۔ جو قدرت وعظمت خداوندی، تغیرات احوال وحدوث عالم اور بارہ مذکورہ حوادث قیامت پر دلیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لطیف استعارہ پر مشتمل ہے۔ تنفس کے معنی ہیں سانس لینا، گویا رات کو ایک ایسے غمگین شخص سے تشبیہ دی گئی ہے، جو سانس گھونٹے بیٹھا تھا، پھر اس نے راحت وآرام کا سانس لیا۔ غم کو تاریکی سے اور سرور کو نور سے تشبیہ دینا عام طور پر رائج ہے۔ وضاحت اس کی یہ ہے کہ پانچ اولعزم انبیاء حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان پانچ نورانی ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جن کی چالیس مختلف سمتوں میں نظر آتی تھیں۔ چنانچہ ان پانچوں انبیاء علیہم السلام کی نورانی شریعتیں بھی مختلف تھیں۔ جو اس تاریک دنیا کے انسانوں پر چمکتی اور ان کی رہبری کرتی رہیں۔ مگر جہل وکفر کی تاریکیاں دنیا کو محیط رہیں۔ یہاں تک کہ اخیر رات کی تاریکیوں میں پورا جہاں ڈوب گیا۔ تو صبح نورانی جلوہ گر ہوئی۔ اور پورے جہان کو تاریکیوں سے چھڑا لیا گیا۔ یعنی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگئی۔ اور آفتاب رسالت ونبوت نے اپنی ضوپاشیوں سے پورے عالم کو جگمگا دیا۔ اسی لئے آئندہ آیات میں ان کی توصیف اور ان کی نورانی کتاب قرآن پاک کی تحمید اور کتاب لانے والے کی توثیق وتصدیق کی جارہی ہے۔

روز وشب کے انقلاب:

رات آتی ہے۔ کائنات کو سیاہ چادر اوڑھا دیتی ہے۔ بازار اجڑ جاتے ہیں۔ چہل پہل ختم ہو جاتی ہے دنیا پر ایک سکوت کا عالم بپا ہوتا ہے۔ سب لوگ خاموش بے حس وحرکت مردوں کی طرح محو استراحت ہوتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے تو وہ سب کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ اور دنیا میں پھر چہل پہل کا منظر نمودار ہوتا ہے۔ رات، عالم برزخ کا منظر پیش کرتی ہے۔ تو دن محشر کا نقشہ قائم کرتا ہے۔ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند سے بیدار ہونے کی دعا میں انسانوں کو اس سبق کے سمجھ لینے کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْهِ النُّشُوْر۔ پھر جس طرح دن میں خیر وشر کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح حشر کے دن خیر وشر کا مکمل انکشاف ہو جائے گا۔ **علمت نفس ما احضرت۔**

تنبیہ: .... اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ **عسعس** کے معنی آنے کے بھی ہیں اور جانے کے بھی۔ یہ لفظ مشترک بین الضدین ہے۔ پھر اگر معنی تنفس اور صبح کے مقابلہ کا لحاظ کیا جائے تو آنے کے الفاظ مناسب ہوں گے۔ اور اگر رات کے آنے اور دن کے جانے میں تلازم کو ملحوظ رکھیں تو جانے کے معنی بہتر ہوں گے۔ یہ کلام اللہ کی شان اعجاز ہے۔ کہ مقام ذی وجہین میں لفظ بھی مشترک بین الضدین لایا گیا۔ لیکن ثانی (جانے کے) معنی پر صرف ایک انقلاب مفہوم ہوگا کیونکہ رات کا جانا انقلاب کی ابتدا اور دن کا آنا اس کی انتہا ہے جو **حیات بعد الممات** کا نمونہ ہے اور اول معنی مراد لینے کی صورت میں دو انقلاب مفہوم ہوتے ہیں۔ حیات کے بعد موت اور موت کے بعد حیات۔ اس لئے میرے نزدیک یہی معنی مقام پر زیادہ بہتر ہوگا۔ گو دیگر حضرات مفسرین نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔

نکتہ عجیبہ: .... رات دن کے عجائبات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ رات میں انسان کو دور کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ جیسے کہ آسمان کے تارے، چاند اور قریب کی چیزیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ جیسے فضا اور زمین کی چیزیں۔ اور دن میں اس کے برخلاف قریب کی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اور دور کی چیزیں اور تارے وغیرہ چھپ جاتے ہیں اس میں دنیا اور آخرت کا

نمونہ موجود ہے۔ جو چیزیں انسان سے قریب تر ہیں اس دنیا میں وہ نظر نہیں آتیں۔ ذات حق نظر نہیں آتی۔ حالانکہ وہ شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔ ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ اپنے اعمال اور اثرات نظر نہیں آتے۔ دور کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ قیامت کے دن وہ سب نقشے اور اسباب کے سلسلے انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے اور قریب والی چیزیں سامنے آجائیں گی۔ یہ دنیا رات ہے اور قیامت و آخرت دن ہے۔ البتہ روشنی مہیا کرنے سے رات میں قریب کی چیزیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ اسی طرح معرفت کے ذریعہ تجلیات ربانی اس کائنات میں نظر آتی ہیں۔ اور اعمال کے اثرات بھی۔ فافہم

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد:

حکیم الامت مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ یہ قسمیں مطلوبہ مقام کے نہایت مناسب ہیں۔ چنانچہ ستاروں کا سیدھا چلنا، اور لوٹ جانا اور چھپ جانا مشابہ ہے فرشتہ کے آنے اور واپس جانے اور عالم سکوت میں جا چھپنے کے اور رات کا گذرنا او رصبح کا آنا مشابہ ہے قرآن کے سبب ظلمت کفر کے رفع ہو جانے اور نور ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے (بیان القرآن)

صفات جبرئیل علیہ السلام:

انہ لقول ستاروں اور شب وروز اور ان کے احوال وتغیرات کی قسم کے بعد ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت اور وحی ربانی (قرآن مقدس) میں شبہات کرنے والوں کا جواب ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو ارشادات ربانی و آیات قرآنی تم کو سناتے ہیں۔ ان میں اختیاری یا غیر اختیاری کسی بھی قسم کی غلطی کا ہرگز احتمال وامکان نہیں ہے۔ یہ قرآن مقدس نہایت محفوظ طریقہ پر آپ تک پہنچا ہے۔ وہ شیطانی اثرات اور دخل اندازیوں سے قطعاً مبرا و پاک ہے۔

چونکہ وحی جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے بھیجی جاتی تھی۔ وہ معلم ومبلغ اور قاصد وحی ہیں۔ اس لئے اولاً جبرئیل علیہ السلام کی چند مخصوص صفات اور ان کی عظمت شان کا بیان فرما کر ان کی توثیق وتصدیق کی گئی۔ اس سلسلہ میں تفصیل کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ مشرکین مکہ اسرافیل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام سے تو واقف تھے۔ جبرئیل علیہ السلام سے واقف نہ تھے۔ غور کیا جائے کہ یہ صفات جبرئیل امین علیہ السلام پر بے تکلف صادق آتی ہیں۔ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ یہ قرآن جو صبح صادق کی طرح عالم میں روشنی پھیلا رہا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بنالیا ہے بلکہ یہ کلام حق تعالیٰ کی طرف سے ایک معزز رسول کی زبانی آپ تک پہنچا ہے۔

پہلی صفت: ...... جبرئیل امین علیہ السلام کی پہلی صفت رسول ہے۔ رسول کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ مرسل الیہ کے پاس جا کر وہ اپنا رسالہ ظاہر کرے۔ اور جو کچھ پیغام مرسل نے دیا ہے وہ بعینہ اسی کے الفاظ میں کمی زیادتی کے بغیر مرسل الیہ تک پہنچا دے ایسے شخص کو رسول کامل اور پورا پیام رسان کہہ سکتے ہیں۔ الفاظ ومعانی بدل کر یا صرف الفاظ بدل کر پیام پہنچانے والا رسول امین اور کامل پیام رسان نہیں کہلا سکتا۔ جبرئیل امین علیہ السلام ہوں یا نبی محترم علیہما السلام دونوں کے حیثیت رسول کامل کی تھی، ترجمان کی نہ تھی۔

یعنی یہ حضرات مضمون الٰہی وکلام و پیام خداوندی کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے والے نہ تھے بلکہ انہوں نے بعینہ الفاظ پہنچائے تھے۔ یہ بات یاد رکھئے کہ ترجمان ومعبر کو (جو الفاظ بدل دیتا ہے) رسول نہیں کہا جاسکتا۔ لہٰذا جو لوگ قرآن

مقدس کی عبارت کو جبرئیل امین علیہ السلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساختہ پرداختہ کہتے ہیں۔ اور کلام الٰہی صرف معانی ومضامین قرآنی قرار دیتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اور ان کا اس آیت سے استدلال بھی بالکل بیجا اور ظلم ہے رسول کا قول ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ عبارت رسول کی ہے۔

دوسری صفت: ...... دوسری صفت کریم ہے۔ جس کے معنی اس معزز اور بزرگ کے آتے ہیں جسکی عدالت وپرہیزگاری انتہاء کو پہنچی ہوئی ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ: **الکرم التقوی والحسب المال** (کرم اور بزرگی تقوی ہے اور حسب مال ہے) قرآن پاک میں بھی ہے کہ: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ (سب سے بڑا بزرگ تم میں وہ ہے جو تقوی میں سب سے بڑھ کر ہے)۔

تنبیہ: ...... کرم، اللہ تعالیٰ کی بھی صفت ہوتی ہے۔ انسان کی بھی اور فرشتہ کی بھی، اور قرآن کی بھی اور دوسری چیزوں کی بھی، مگر ہر موقع پر اس کے معانی مختلف اور جداگانہ ہوتے ہیں۔ (۱) اللہ کے کرم سے مراد اللہ کا احسان وانعام ہوتا ہے۔ **اللہ کریم** (یعنی اللہ مخلوق پر پیہم احسان ونوازش کرنے والا ہے۔ (۲) آدمی کے کریم ہونے کے معنی یہ ہے کہ وہ خصائل حمیدہ واخلاق پسندیدہ، کردار کی بلندی اور ذاتی شرافت ومحاسن سے متصف ہے بعض کہتے ہیں کہ حریت وکرم دونوں ہم معنی ہیں۔ لیکن استعمال میں یہ فرق ہے کہ حر اس آدمی کو کہتے ہیں جس میں خوبیاں اور محاسن ہوں، خواہ وہ خوبیاں چھوٹی ہوں یا بڑی۔ لیکن کریم صرف اس آدمی کو کہتے ہیں کہ جس میں بڑی خوبیاں ہوں۔ (۳) ملائکہ کے کریم ہونے کا مطلب دربار خداوندی میں باعزت ہونا ہے۔ **کراما کاتبین** ۔ عزت والے فرشتے جو انسانوں کے اعمالنامے لکھتے ہیں۔ (۴) قرآن کریم یا کتاب کریم، عزت وشرف والا قرآن، بلند مرتبہ کتاب (۵) رسول کریم عزت وبزرگی والا پیامبر (جبرئیل) (۶) قول کریم۔ نرم اور اچھی بات، عاجزانہ کلام۔ ﴿وقل لھما قولا کریما﴾ (۷) باقی اشیاء میں جس چیز کی صفت لفظ کریم ہوگا۔ تو اس سے عمدہ ہونا اور اچھی صفات سے متصف ہونا مراد ہوگا۔ جیسے زَوْجٌ کَرِیْمٌ عمدہ قسم۔ مَقَامٌ کَرِیْمٌ عمدہ مقام۔

تیسری صفت: ...... رسول جبرئیل علیہ السلام کی تیسری صفت ذِیْ قُوَّۃٍ ہے۔ جبرئیل امین کی قوت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے قوم لوط کی چار بستیوں کو (جن میں سے ہر بستی میں چار لاکھ مرد، عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کے علاوہ تھے) ساتویں زمین کی تہ سے اپنے ایک پر کی نوک سے اکھاڑ کر اور اوپر اٹھا کر آسمان کے اتنا قریب کر دیا کہ آسمان کے رہنے والوں نے ان شہروں کے کتوں اور مرغوں کی آواز کو سنا، پھر وہیں سے ان کو پلٹ دیا۔ اور قوم ثمود کو ایک چیخ سے ہلاک کر دیا۔ وہ ایک پل جھپکنے کی مقدار میں آسمانوں سے زمین پر اور زمینسے آسمانوں پر چلے جاتے ہیں۔ سورۂ نجم میں ہے۔ ﴿**علمہ شدید القوی ذومرۃ فاستوی**﴾ (پیغمبر کو یہ قرآن ایک طاقتور، زور آور فرشتہ نے سکھلایا ہے۔ جو فطری طور پر طاقتور ہے۔) مطلب یہ ہے کہ یہ کلام آپ تک کسی شیطان کے ذریعہ نہیں پہنچا کہ آپ کے (نعوذ باللہ) کاہن ہونے کا شبہ کیا جائے۔ بلکہ فرشتے کے ذریعہ پہنچا ہے۔ اور وہ فرشتہ نہایت طاقتور ہے۔ جس کا مقابلہ یا اس کے کام میں دخل اندازی شیطانوں کی بس کی بات نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے ایسی قوت حافظہ مراد ہو جس میں نسیان وغیرہ کا احتمال نہ ہو۔

چوتھی صفت: ...... **عند ذی العرش مکین** ...... وہ عرش والے کے نزدیک معزز وصاحب مرتبہ ہیں۔ یعنی وہ خاص مقربین بارگاہ خداوندی میں سے ہے۔ اس میں چند امور کی طرف اشارہ ہے۔ (۱) وہ اللہ کے مقرب وحاضر

باش ہیں۔ (۲) بلاواسطہ کلام سنتے ہیں۔ (۳) اعلیٰ درجہ کے معتمد علیہ ہیں۔ (۴) ان کے پیام پہنچانے میں کمی زیادتی کا احتمال نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ اپنے منصب عالی و بلند مرتبہ کی محافظت کے لئے سرکاری پیام پہنچانے میں کمال احتیاط کریں گے۔ دنیا میں بھی شاہی مقربین بہت محتاط ہوتے ہیں۔ اوران کی بات زیادہ معتبر شمار ہوتی ہے۔

پانچویں صفت:...... مطاع وہ سردار ملائک ہیں۔ بے شمار ملائکہ ان کے ماتحت اور زیر فرمان ہیں۔ حدیث معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے کہنے سے ساتوں آسمانوں کے فرشتوں نے دروازے کھول دیئے۔ اور جنت ودوزخ کے دربانوں نے نیز دیگر ملائکہ نے ان کی اطاعت کی (اور یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز میں ہوا۔ تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کی اطاعت کی۔ اور تمام ملائکہ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی اطاعت کی) اطاعت سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے حکم باری حضرت جبرئیل علیہ السلام پر اترتا ہے۔ پھر ان کے ذریعہ دوسرے فرشتوں کو پہنچتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کے جب حق تعالیٰ کسی امر کی وحی فرماتے ہیں تو کلام باری سے تمام آسمانوں میں ایک سخت لرزہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جب ملائکہ سنتے ہیں تو حواس باختہ ہوکر سب اللہ کے سامنے سربسجود گر پڑتے ہیں۔ پھر سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام سر اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام اور وحی فرماتے ہیں۔

پھر وہ جس آسمان کے فرشتوں کی طرف سے گذرتے ہیں وہ فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھتے ہیں۔ ہمارے مالک نے کیا فرمایا؟ تو جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں **الحق وھوا لعلی الکبیر** ۔ یہ حدیث حضرت جبرئیل علیہ السلام کے مطاع ملائکہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطاع جمیع ملائکہ ہونے کی وجہ اہل حق وحضرات صوفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ حقیقت محمدیہ فیض وجود ومرتبہ قرب کا مبدا ہے جیسا کہ ارشاد ہے **اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ** ۔ اور مراتب قرب میں وحی وکلام کا مرتبہ بھی ہے۔ جو حقیقت محمدیہ کے بغیر توسل کسی کو وحی پہنچ نہیں سکتی۔ یہ کشفی چیز ہے جس کی مؤید بعض نصوص بھی ہیں مثلاً ﴿**وما ارسلنک الا رحمة للعلمين**﴾ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آسمان پر میرے دو وزیر ہیں جبرئیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام اور زمین پر بھی دو وزیر ہیں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما **فا فهم ايها الفطن اللبيب** ۔ (مظہری)۔

چھٹی صفت:...... **ثم امین** حضرت جبرئیل امین بھی ہیں کہ وہ وحی میں کمی زیادتی یا کوئی آمیزش نہیں کرتے۔ لفظ ثَمّ سے مفہوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ کے مقربین ان پر پورا اعتماد کرتے اوران کو امین سمجھتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ نہایت معتمد علیہ امین ہیں۔ لفظ ثَمّ کا تعلق امین سے ہے۔ اور مطاع سے بھی ہوسکتا ہے۔

تنبیہ:...... بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ رسول کریم کا مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا ہے۔ اور صفات مذکورہ کو قدر تکلف سے آپ کی ذات عالی پر منطبق کیا ہے۔ سورۃ الحآقہ میں بھی اس لفظ میں دونوں قول ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہاں اسکا مصداق پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام۔ **والله اعلم بالصواب** ۔

وما صاحبكم بمجنون ...... اور تمہارے ساتھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیوانے نہیں ہیں) یہ بھی جواب قسم ہے۔ **صاحبكم** سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جن لوگوں نے رسول کریم کا مصداق بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے۔ ان کے قول کی بنا پر **وماھو بمجنون** ہوتا مگر ضمیر کے بجائے اسم ظاہر **صاحبكم** لانے

میں ایک تو صراحۃً کفار کی تکذیب مقصود ہے کہ تم ﴿یا ایھا الذی نزل علیہ الذکر انک لمجنون﴾ غلط اور خلاف واقعہ کہتے ہیں۔ وہ تمہارے سامنے موجود ہیں۔ اور جنون کی کوئی بات ان میں موجود نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ صاحبکم سے تعبیر کرنے کی حکمت:

دوسرے اس امر پر تنبیہ کرنی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے نہیں آئے۔ وہ کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں کہ ان کے صدق و کذب کے بارے میں تم پر ان کا حال مشتبہ رہے۔ وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ تمہارے وطن میں پیدا ہوئے۔ ان کی خاندانی و ذاتی شرافت سے تم خوب واقف ہو۔ بچپن، جوانی کے ادوار تمہاری نگاہوں کے سامنے گذرے ہیں ان کے اخلاق عادات امانت و صدق و مروت اور شرافت پر تم سب متفق رہے ہو۔ کمال عقل و ہوش کبھی کوئی حرکت ان سے سرزد نہیں ہوئی۔ صادق و امین کے القاب سے تم لوگ ان کو یاد کرتے تھے۔

لیکن دعوائے نبوت کے بعد تم ان کی طرف جنون وغیرہ کا انتساب کرنے لگے۔ یہ درحقیت تمہارا جنون ہے۔ جو مخلوق کے معاملہ میں کبھی جھوٹ نہ بولے اور اعلیٰ درجہ کا عاقل ہو تو کیا اللہ کے معاملہ میں اس کی عادت بدل سکتی ہے؟ اور وہ اللہ پر جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ جبکہ اس میں کسی دنیوی منفعت کا واہمہ بھی نہ ہو۔ اور سب یگانے بھی بیگانے ہو جائیں۔ اور ہزاروں مصائب سر پر آپڑیں۔

ولقد راٰہ بالافق المبین ...... یہ بھی ایک شبہ کا جواب ہے۔ وہ یہ کہ آپ سچے بھی ہیں۔ دیوانے بھی نہیں۔ مگر ممکن ہے کہ جبرئیل علیہ السلام سے آپ نے یہ کلام نہ سنا ہو۔ اور ان کو دیکھا بھی نہ ہو۔ بلکہ کوئی شیطان آکر سنا دیتا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو جبرئیل سمجھ جاتے ہوں۔ اس آیت میں اس کا جواب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو آسمان کے مشرقی کنارہ پر دیکھا ہے۔ وہ ان کو خوب پہنچانتے ہیں۔ سورۂ نجم میں **افق الاعلی** کا لفظ ہے اور یہاں **افق مبین** کا۔ علما فرماتے ہیں کہ دونوں سے مراد آسمان کا مشرقی کنارہ ہے۔ نیز علما کا اتفاق ہے **راٰی** کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔ اور **ہ** کی ضمیر یا **ذی العرش** کی طرف راجع ہے۔ یا **رسول کریم** یعنی جبرئیل امین کی طرف راجع ہے۔ اول صورت میں **بالافق المبین راٰی** کی ضمیر فاعلی سے حال ہوگا۔ یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساتویں آسمانوں کے اوپر عالم کے افق پر تھے اس وقت آپ ﷺ نے اللہ کو دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیت باری تعالیٰ لیلۃ المعراج میں ہوئی۔ اور کھلی آنکھوں ہوئی۔ جیسا کہ جمہور کا مسلک ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور بعض نے رؤیت کو تسلیم بھی نہیں کیا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وغیرہ۔ اسکی پوری تفصیل کا اصل محل سورۂ النجم ہے۔ جمہور مفسرین نے ضمیرہٗ **رسول کریم** کی طرف لوٹائی ہے۔ جس سے مراد جبرئیل امین علیہ السلام ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا جبکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام **افق مبین** میں تھے۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل سے فرمایا تھا کہ آپ کو اس شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں جس شکل میں آپ آسمان میں ہوتے ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ آپ ﷺ ایسا نہ کرسکیں گے۔ لیکن آپ ﷺ نے پھر خواہش کی تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے کہا کہ آپ مجھ کو کس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ابطح میں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: وہاں

تو میں نہیں سما سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منی میں، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: وہاں بھی نہ سما سکوں گا۔ فرمایا عرفات میں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ اس میں بھی اتنی وسعت نہیں، فرمایا: حراء میں، جبرئیل علیہ السلام نے کہا: دیکھئے اس کے آس پاس گنجائش ہو۔ غرض وقت مقرر پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ اچانک عرفات کے پہاڑوں سے ہتھیاروں کی کھٹا کھٹ اور بادلوں کی گرج جیسی آواز کے ساتھ جبرئیل امین علیہ السلام نمودار ہو گئے۔ ان کا سر آسمان تک اور پاؤں زمین میں تھے۔ اور مشرق سے مغرب تک خلا پر تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سماں دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد جبرئیل نے اپنی صورت بدل دی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سینہ سے چمٹا کر کہا! محمد آپ خوف نہ کریں۔ اگر آپ اسرافیل علیہ السلام کو (ان کی اصلی صورت پر دیکھ لیں گے تو کیا حال ہوگا؟) کہ ان کا سر عرش کے نیچے اور پاؤں ساتویں زمین کے حدود میں ہیں عرش ان کے کاندھے پر ہے۔ اور ایسی عظمت کے باوجود اللہ کے خوف سے وہ کبھی کبھی اتنا سمٹ جاتے ہیں کہ چڑیا کی طرح ہو جاتے ہیں۔ اور عرش رب کو محض عظمت الٰہی سے اٹھائے رہتے ہیں۔ (مظہری)۔ حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے اماں جان سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد **ولقد راہ بالافق المبین ولقد راہ نزلۃ اخری** حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ پوری امت میں سب سے پہلے میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکا مطلب دریافت کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس کے دیکھنے کا آیت میں ذکر ہے۔ وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے آیت میں جس رؤیت کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہوئے دیکھا۔ کہ ان کے جثہ نے زمین و آسمان کے درمیان فضاء کو بھر دیا تھا (ابن کثیر و مسلم شریف) حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو ان کی اصلی صورت پر دو بار دیکھا ہے پہلی بار رؤیت ابتدائی دور میں ہوئی جبکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلی مرتبہ اقراء کی ابتدائی آیتوں کی وحی لے کر آئے تھے۔ اس کے بعد وحی میں وقفہ پیش آیا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم رہا۔ بار بار دل میں یہ خیالات آئے کہ پہاڑ سے گر کر جان دے دو۔ مگر کبھی ایسی صورت ہوتی تو جبرئیل علیہ السلام غائبانہ آواز دیتے "اے محمد آپ اللہ کے رسول برحق ہیں اور میں جبرئیل (علیہ السلام) ہوں ان کی آواز سے آپ ﷺ کو تسکین ہو جاتی۔ جب بھی ایسا خیال آیا اسی وقت جبرئیل نے آواز کے ذریعہ تسلی دے دی۔ مگر تسلیاں غائبانہ تھیں۔ یہاں تک کہ ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام بطحا کے کھلے میدان میں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔ اور انہوں نے پورے افق کو گھیر رکھا تھا۔ پھر جبرئیل امین علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور آپ کو وحی الٰہی پہنچائی۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبرئیل علیہ السلام کی عظمت اور اللہ کے نزدیک ان کی جلالت قدر کی حقیقت روشن ہوئی۔ (ابن کثیر) دوسری بار کس جگہ اور کس زمانہ میں دیکھا۔ اس کو سورۂ نجم میں متعین کر کے بتلا دیا کہ یہ رؤیت ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہوئی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ساتویں آسمان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ المعراج میں تشریف لے گئے تھے الحاصل رؤیت جبرئیل پہلی مرتبہ فترت وحی کے زمانہ میں مکہ معظمہ میں ہوئی اور دوسری مرتبہ شب معراج میں ساتویں آسمان پر ہوئی۔

انتباہ:...... (۱) یہاں جبرئیل امین علیہ السلام کی رؤیت سے مقصود یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو خوب پہنچانتے تھے۔ ان کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ رؤیت جبرئیل سے آپ ﷺ کی فضیلت بڑھ گئی۔

باجماع علماء امت جبرئیل امین علیہ السلام سے تو خود آپ ﷺ افضل ہیں۔(۲) اس مقام پر نیز سورۂ نجم کی ابتدائی آیات علماء امت کے اختلافات اور طویل بحثیں ہیں جن کو بڑی تفاسیر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وما ھو علی الغیب بضنین ...... (اور وہ پیغمبر غیب پر بخیل بھی نہیں ہیں) یہاں پر ایک شبہ یہ رہ جاتا ہے کہ شاید آپ کاہن ہوں اور جنات سے باتیں سن کر بیان کردیتے ہوں۔ اس مذکورہ آیت میں اس شبہ کو رفع کیا گیا ہے۔ کہ کاہنوں کی اور آپ ﷺ کی تعلیمات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کاہن نہ امور آخرت بیان کرسکتا ہے۔ نہ انسان کی سعادت وشقاوت کا راستہ بتاسکتا ہے۔ نہ مرضیات ونامرضیات خداوندی کی اپنے دلکش انداز میں تعلیم دے سکتا ہے۔ نہ آئندہ کے ہولناک واقعات کی۔ کاہن تو صرف دنیوی معاملات میں پیش آنے والی کچھ بے تکی باتیں جن میں بیشتر مہمل کلمات، زٹل قافیے، جھوٹے حاشیے، غلط تخمینے ہوتے ہیں۔ بیان کرتے ہیں۔ پھر ان پر وہ اجرت لیتے ہیں خود ان کے اخلاق گندے، اعمال برے اور حالات ناپاک ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بعض قراء نے ضاد کے بجائے **بظنین** ظاء سے پڑھا ہے۔ جس کے معنی متہم ہونے کے ہیں۔ یعنی جب کلام الٰہی کے دونوں واسطے جبرئیل وپیغمبر اعظم علیہما السلام ثقہ ومعتبر ہیں تو اس میں وہ متہم بھی نہیں۔ گویا یہ مضمون سابق کی تاکید ہے۔ دونوں قراءتوں پر خلاصہ آیت یہ ہوا کہ آپ بلا معاوضہ واجرت اور بلا کم وکاست کلام ربانی بندوں تک نہایت ایمانداری وامانتداری کے ساتھ پہنچاتے ہیں۔ نہ آپ میں طمع وحرص دنیوی ہے۔ اور نہ آپ کی امانت وصداقت پر کوئی انگلی رکھ سکتا ہے۔ بلکہ یہ مخالفین بھی آپ کی امانت ودیانت اور صداقت وقناعت کے پورے طور پر معترف تھے۔ اور تنہائیوں میں اس وقت بھی اقرار واعتراف کرتے تھے۔

وما ھو بقول شیطٰن رجیم ...... (اور یہ قرآن کسی شیطان مردود کا کلام بھی نہیں)۔ یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے۔ یعنی کہانت کی نفی کو اس جملہ نے اور مضبوط کردیا۔ حاصل یہ ہے کہ نہ آپ مجنون ہیں نہ کاہن۔ نہ صاحب غرض۔ اور وحی لانیوالے کو خوب پہچانتے بھی ہیں۔ اور وحی لانے والا بھی مذکورہ عالی صفات سے متصف ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مقدس اللہ کا کلام ہے اور آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ آپ کے اخلاق وعادات میں غور کرکے ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ شیاطین سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ اور قرآن مقدس کی خوبیاں خود بتادیں گی کہ شیطان کے کلام میں ایسی پاکیزہ تعلیمات ہو نہیں سکتی جن پر قرآن پاک مشتمل ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ جب کلام اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت روز روشن کی عیاں ہوگئی۔ **فاین تذھبون** ...... (تو پھر تم کہاں جارہے ہو؟) اے نادانو! صحیح راستہ کیوں جان بوجھ کر چھوڑ رہے ہو؟ کیا شیطان کی طرح مردود ہو کر اس کے ساتھ دوزخ میں جانا چاہتے ہو۔ یاد رکھو تم خود اپنے پیروں میں کلہاڑی مار رہے ہو۔ اپنی ہلاکت کا سامان کررہے ہو۔ تکذیب سے ہمارے کلام کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

ان ھو الا ذکر للعلمین ...... (کلام اللہ تو دنیا بھر کے لئے ایک عظیم الشان نصیحت ہے) جو اسکو مان لے گا۔ اس میں خود اس کا نفع ہے۔ نہ مانے گا تو ہمارا کلام آفتاب کی طرح روشن ہے اس میں کوئی نقص نہیں آسکتا۔ اس کی بلندی کسی کے ماننے پر موقوف نہیں۔ **لمن شآء منکم ان یستقیم** ...... (اس کا فائدہ اسی کو پہنچ سکتا ہے جو سیدھا چلنا چاہتا ہو) اور جو اپنے امراض نفسیانہ کا علاج نہ چاہے یہ نسخہ شفاء اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ غذائے لطیف صحت مند بدن ہی کو نفع پہنچاتی ہے۔ اور مریض میں اور اضافہ کردیتی ہے۔ **کما قال** ﴿فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا﴾ ﴿واما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجسا الی رجسھم﴾ کلام الٰہی نور پیغمبری، صحبت اولیاء اور نصیحت علماء سب

غذائے لطیف کے مثل ہیں۔ یا نسخہ شفاء کی طرح ہیں۔ پھر اپنی اپنی قسمت کی بات ہے کہ غذائے لطیف سے نفع اٹھائے یا نہ اٹھائے یا دوا سے شفا پائے نہ پائے کیونکہ وما تشآ ون الا ان یشآء اللہ رب العلمین تم بھی اسی وقت ارادہ کر سکتے ہو جب مشیت ربانی بھی متوجہ ہو۔ ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت میں فرقہ جبریہ کا رد ہے اور دوسری میں فرقہ قدریہ کا ابطال ہے۔ یعنی بندہ مجبور محض نہیں۔ اس کو اللہ نے ارادہ دیا ہے۔ اور نہ فاعل مختار ہے بلکہ اسکے ارادے اور افعال مشیت باری سے پیدا ہوتے ہیں۔ لفظ رب العلمین سے اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام وارواح سب کا مربی ہے۔

فائدہ..... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب لمن شاء منکم ان یستقیم نازل ہوئی تو ابوجہل کہنے لگا کہ ہم کو تو اختیار دے دیا گیا ہے کہ اگر ہم چاہیں استقامت رکھیں نہ چاہیں تو نہ رکھیں۔ اس پر آخری آیت: وما تشآء ون ..... نازل ہوئی۔

تم تفسیر سورۃ التکویر بعون ربنا القدیر وھو حسبی ونعم النصیر وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد والہ وصحبہ اجمعین

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعَ عَشَرَةَ اٰيَةً وَرُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

رکوع:۱، آیات:۱۹ سورہ انفطار مکہ میں نازل ہوئی اس میں انیس آیات ہیں اور ایک رکوع۔ کلمات:۸۰، حروف:۳۲۷

ربط ومناسبت:

اس سورت کا نام انفطار، انفطرت اور المنفطرۃ ہیں۔ وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔ یہ بالاتفاق مکیہ ہے۔ اور اس کی آیات بھی بالاتفاق انیس ہیں۔ اس کا ربط ماقبل سورت سے بالکل ظاہر ہے۔ گویا یہ دونوں سورتیں ایک شعر کے دو مصرعے یا ایک جان کے دو قالب ہیں۔ سورت سابقہ میں تخریب عالم کے اسباب بیان فرما کر نفوس انسانیہ کا اپنے اعمال پر مطلع ہونا ارشاد فرمایا گیا۔ اس سورت میں بھی اسی انداز سے انسانی سعادت وشقاوت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

دونوں سورتوں کے امتیازات:

(سوال) جب کہ دونوں سورتوں کا مضمون واحد ہے۔ تو دونوں کا نزول الگ الگ کیوں ہوا؟ ایک ہی سورت کافی ہوتی۔ (جواب) اس سورت میں اور سابقہ سورت میں چند وجوہ سے فرق وامتیاز ہے۔ (۱) یہاں اسباب تخریب عالم کا بیان اجمالاً ہے وہاں تفصیلاً ہے۔ (۲) یہاں اجزا کا بیان صراحۃً قدرے تفصیل سے ہے۔ وہاں اجزا کا بیان اشارۃً بالاجمال تھا۔ (۳) یہاں مضمون وعید صراحۃً ہے وہاں کنایۃً تھا۔ (۴) وہاں انسانی احاطہ علمی پر اکتفاء کیا گیا تھا۔ (۵) یہاں منکرین کی تردید اور جزاء وسزا کا اثبات ہے اور وہاں رسالت ونزول قرآن کا اثبات ومنکرین ومکذبین کی تردید وتکذیب تھی وغیرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم کرنے والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۱) وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۲) وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (۳)

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ اور جب سمندر پھیل جائے گا۔

اِذَا	السَّمَآءُ	انْفَطَرَتْ	وَ	اِذَا	الْكَوَاكِبُ	انْتَثَرَتْ	وَ	اِذَا	الْبِحَارُ	فُجِّرَتْ
جس وقت	آسمان	پھٹ جائے گا	اور	جس وقت	تارے	جھڑ جائیں	اور	جس وقت	دریا	چیرے جائیں

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۴) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (۵)

اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی۔ تب ہر شخص اگلے اور پچھلے اعمال جان لے گا۔

وَ	اِذَا	الْقُبُوْرُ	بُعْثِرَتْ	عَلِمَتْ	نَفْسٌ	مَّا	قَدَّمَتْ	وَ	اَخَّرَتْ
اور	جس وقت	قبریں	اٹھائی جائیں	جان لے گا	ہر جی	جو کچھ	آگے بھیجا ہے	اور	پیچھے چھوڑا

يَآاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (٦) الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (٧)

اے انسان تجھ کو تیرے رب کریم سے کس چیز نے غافل کر دیا۔ جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ اور تیرے اعضاء کو درست کر دیا۔

يَآاَيُّهَا	الْاِنْسَانُ	مَا	غَرَّكَ	بِرَبِّكَ	الْكَرِيْمِ	الَّذِىْ	خَلَقَكَ	فَسَوّٰكَ	فَعَدَلَكَ
اے	آدمی	کس چیز	فریب دیا تجھ	ساتھ پروردگار تیرے	کرم کرنے والے	جس نے	پیدا کیا تجھ	پھر تندرست کیا تجھ	پھر برابر کیا تجھ

فِىْ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (٨) كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (٩) وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (١٠)

جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔ نہیں نہیں بلکہ تم جزاء و سزا کو نہیں مانتے، حالانکہ تم پر معزز لکھنے والے نگران موجود ہیں۔

فِىْ	اَىِّ	صُوْرَةٍ	مَّا شَآءَ	رَكَّبَكَ	كَلَّا	بَلْ	تُكَذِّبُوْنَ	بِالدِّيْنِ	وَ	اِنَّ	عَلَيْكُمْ	لَحٰفِظِيْنَ
میں	جونسی	صورت	چاہا	ترکیب دی تجھ	ہرگز یوں نہیں	بلکہ	جھٹلاتے ہو تم	کو قیامت	اور	تحقیق	اوپر تمھارے	البتہ نگہبان

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (١١) يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (١٢) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِىْ نَعِيْمٍ (١٣)

جو کچھ بھی تم کرتے ہو۔ ان کو معلوم ہے۔ یقیناً نیک لوگ تو راحت میں ہونگے۔

كِرَامًا	كَاتِبِيْنَ	يَعْلَمُوْنَ	مَا	تَفْعَلُوْنَ	اِنَّ	الْاَبْرَارَ	لَفِىْ	نَعِيْمٍ
بزرگ	لکھنے والے	جانتے ہیں	جو کچھ	کرتے ہو تم	تحقیق	نیک کام والے	البتہ بیچ	نعمتوں

وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِىْ جَحِيْمٍ (١٤) يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ (١٥)

اور بدکار دوزخ میں جائیں گے۔ روز جزاء اس میں داخل ہونگے۔

وَ	اِنَّ	الْفُجَّارَ	لَفِىْ	جَحِيْمٍ	يَّصْلَوْنَهَا	يَوْمَ	الدِّيْنِ
اور	تحقیق	بدکار	البتہ بیچ	دوزخ	داخل ہونگے اس	دن	جزا

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (١٦) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (١٧) ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (١٨)

اور وہ وہاں سے کہیں جانے نہ پائیں گے۔ اور آپ کو معلوم بھی ہے۔ کہ روز جزاء کیسا ہے۔ پھر آپ کو کچھ خبر ہے کہ روز جزاء کیسا ہے؟

وَ	مَا	هُمْ	عَنْهَا	بِغَآئِبِيْنَ	وَ	مَا	اَدْرٰكَ	مَا	يَوْمُ	الدِّيْنِ	ثُمَّ	مَا	اَدْرٰكَ	مَا	يَوْمُ	الدِّيْنِ
اور	نہیں	وہ	سے اس	غائب ہونیوالے	اور	کس چیز	معلوم کروایا تجھ	کیا ہے	دن	جزا	پھر	کس چیز	معلوم کروایا تجھ	کیا ہے	دن	جزا

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (١٩)

وہ ایسا دن ہے کہ اس میں کسی کو کسی کے لئے کوئی اختیار نہ ہوگا۔ اور اس دن حکومت اللہ ہی کی ہوگی۔

يَوْمَ	لَا	تَمْلِكُ	نَفْسٌ	لِّنَفْسٍ	شَيْئًا	وَ	الْاَمْرُ	يَوْمَئِذٍ	لِّلّٰهِ
دن	نہ	اختیار پائے گا	کوئی جی	کا کسی جی	کچھ	اور	حکم	اس دن	واسطے اللہ

لغات:

انفطرت: باب انفعال سے پھٹنا۔ چرنا۔ (ن ض) پھاڑنا۔ چیرنا۔ پیدا کرنا۔ شروع کرنا۔ الکواکب: جمع الکوکب کی، ستارہ، تلوار، گرمی کی سختی، لوہے کی چمک دمک، سردار قوم وغیرہ۔ مراد یہاں اول معنی ہیں۔ انتثرت: انفعال سے بکھرنا (ن ض) بکھیرنا۔ نثر میں گفتگو کرنا۔ (ض) چھینکنا۔ فجرت: تفعیل سے بہانا۔ فجر فجرا (ن) پانی بہانا،

جاری کرنا۔فجوراً نافرمانی کرنا، تجاوز کرنا، مخالفت کرنا۔القبور جمع القبر کی، جائے دفن (ن) دفن کرنا۔غرّ: واحد مذکر غائب غِرَّۃً وَغُرُوْرًا (ن) دھوکہ دینا، تجاوز کرنا۔بیہودہ امید دلانا (س) ناتجربہ کار ہونا (ض) تجربہ کے باوجود بچوں جیسا کام کرنا عَدَلَ عَدْلاً (ض) سیدھا کرنا، برابری کرنا عدالۃً (س) عادل ہونا، گواہی کے قابل ہونا۔صورۃ: شکل، جمع صُوَر، صُوَرٌ صار صوراً (ن) آواز دینا، مائل کرنا، جھکا دینا، رکب تفعیل سے ترکیب دینا بعض کو بعض پر رکھنا۔سوار کرانا۔افعال سے سواری دینا۔(س) سوار ہونا، چڑھنا، بڑے زانو والا ہونا وغیرہ (ن) زانو پر مارنا۔الامر: کام، معاملہ، حالت، حکم، امر کا لفظ تمام اقوال وافعال کے لئے عام ہے (ن) حکم دینا۔

ترکیب:

اذاالسمآء انفطرت سے آخر تک ترکیب حسب سابق ہے۔یا حرف ندا قائم مقام ادعو افعل بافاعل کے ای مضاف وسیلہ ندائے معرف باللام ھا تنبیہ کے لئے قائم مقام مضاف الیہ، موصوف، الانسان صفت مرکب توصیفی منادی قائم مقام مفعول بہ جملہ انشائیہ ندا۔ما استفہامیہ مبتدا، غر فعل ضمیر فاعل کَ مفعول بہ۔ب حرف جر ربک موصوف الکریم صفت اول الذی اسم موصول خلقک جملہ فعلیہ معطوف علیہ اپنے تینوں معطوفات سے مل کر صلہ، صفت ثانی، مرکب توصیفی مجرور، متعلق فعل غر۔جملہ اسمیہ جواب نداء۔فی ای صورۃ، رکب سے متعلق مقدم ہے۔وقدم رعایۃً للسجع، یا محذوف حاصلاً کے متعلق ہو کر عدلک کے کاف سے حال ہوگا۔اور ماشاء میں ما زائدہ بھی ہو سکتا ہے اور شرطیہ بھی۔ثانی صورت میں جزاء رکبک ہوگی۔اور جار مجرور عدل کے متعلق ہوگا، نہ کہ رکب کے، لان معمول مابعد حرف الشرط لا یتقید علیہ ولایخفی ان ھذاالاحتمال کنسج العنکبوت. کلا حرف ردع بل اضراب کے لئے ہے۔جملہ مقدرہ (وانتم لاترتدعون عن الاغترار) سے واوٴ حالیہ ان حرف مشبہ بہ فعل علیکم خبر مقدم لحفظین اپنی صفت یا بدل یا عطف بیان یا حال سے مل اسم کاتبین کا تعلق بھی کراماً سے اسی طرح ہے۔یعلمون ما تفعلون جملہ فعلیہ کراماً کی دوسری صفت ہوگا۔یا حفظین کی۔یصلونھا...... الجحیم کی صفت۔یا جملہ مستانفہ ہوگا۔وما اپنے اسم ھم اور بغائبین معہ متعلق مقدم عنھا خبر سے مل کر (والباء فیہ زائدۃ) جملہ یصلون کی ضمیر سے حال۔اگلے دو جملوں کی ترکیب ظاہر ہے۔یوم اپنے مضاف الیہ لا تملک...... (جملہ فعلیہ) سے مل کر اذکر فعل بافاعل محذوف کا ظرف ہوگا۔یاھو مبتدا محذوف کی خبر ہے۔والامر مبتدا، للّٰہ ثابت کے متعلق اور یومئذٍ ثابت کا ظرف، خبر۔ای والامریوم اذکان کذاثابت للّٰہِ.

تفسیر:

حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو دو چیزوں (روح آسمانی وجسم خاکدانی) سے ترکیب دی ہے۔اسی لئے زمین سے اس کی جسمانی ضروریات اور آسمان سے اس کی روحانی حاجات اس کو پہنچتی ہیں۔پھر انسان چونکہ خلیفہ خداوندی ہے اس لئے وہ ارضی وسماوی اشیاء میں تصرف وجمع وتالیف کرتا ہے۔جس طرح یہ ارضی عناصر کی ترکیب سے ایجادات اور ان میں عجیب وغریب تصرفات کرتا ہے اسی طرح عالم بالا کی تسخیر کے اور ان سے استفادہ کے حیرتناک کارنامے انجام دیتا

ہے۔لیکن بسا اوقات انسان ان تصرفات میں حد سے گزر جاتا ہے۔اور مرضیات ربانی واحکام خداوندی کونظر انداز کر بیٹھتا ہے،جس سے وہ سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔اس لئے عقل کا تقاضا ہے کہ ایک دن ایسا مقرر ہو جس میں صحیح تصرفات پر انعام واکرام اور بے جا تصرفات پر عذاب وسزا کا فیصلہ ہو، پھر اس کو انعام یا عذاب دیا جائے۔اور نیک وبد میں پورے طور پر امتیاز ہو جائے۔چنانچہ حق تعالیٰ نے فیصلہ کے لئے جس دن کو مقرر فرمایا ہے وہ قیامت کا دن (یوم الدین ویوم الجزاء) کہلاتا ہے۔اور انعام وعذاب کے عالم کو آخرت کا عالم کہا جاتا ہے۔ولابعد الدنیادار الاالجنة او النار .

تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے:

نوع انسانی کے لئے یہ عالم دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے، بلکہ یہ عارضی پڑاؤ ہے جب آدمی وطن اقامت سے وطن اصلی کی طرف منتقل ہوتا ہے تو وہ اپنے ڈیرے، تنبو توڑ دیتا ہے۔اسی طرح جب حق تعالیٰ ہمیشہ کے لئے عالم آخرت کو نوع انسانی سے آباد فرمائیں گے، تو دنیا کے عارضی ڈیرے کو توڑ پھوڑ دیں گے۔جب کسی مکان کی تخریب کی جاتی ہے۔تو پہلے چھت اتار کر پھر بنیادیں اکھاڑی جاتی ہیں۔اس سورت کے شروع میں تخریب عالم دنیا کی یہی فطری ترتیب بیان کی گئی، کہ اول آسمان پھٹیں گے۔اور ستارے جھڑیں گے۔پھر عالم سفلی کی تخریب ہوگی۔گویا اس گھر کی بنیادوں کو اکھاڑ دیا جائے گا۔

چار انقلابوں کا بیان:

اس سورت کے شروع میں جو چار انقلابات ذکر کیے ہیں یہی اس عالم کے اصول ہیں۔**اول انقلاب:**...... آسمان کا پھٹنا۔جس کا مطلب یہ ہے کہ عقول ونفوس سماوی کا تعلق اجسام سماوی سے کٹ کر نفوس انسانیہ سے قائم ہوگا۔ احادیث میں اسی کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ اس دن ساتوں آسمانوں کے فرشتے زمین پر نازل ہوں گے۔**دوسرا انقلاب:**...... آسمان کے ستارے بے نور ہو کر جھڑ جائیں گے۔اور نورانی ارواح جو ستاروں سے متعلق ہیں ان سے ہٹ کر ارواح انسانیہ سے تعلق پیدا کریں گی۔اس کو قرآن پاک نے یوم یقوم الروح سے تعبیر فرمایا ہے۔**تیسرا انقلاب:**...... سمندروں کا جوش میں آکر آپس میں مل جانا ہے۔پھر کچھ حصہ ان کا زمین میں جذب ہوگا تا کہ اس میں رطوبت ونرمی پیدا کر کے شکلیں اور صورتیں بعث کے لئے تیار ہو جائیں۔باقی آگ ہو کر بھڑک اٹھے گا۔اسی کو تسجیر فرمایا گیا۔واذا البحار سجرت :...... گویا ابتدائی حال تفجیر ہے اور انتہائی تسجیر۔اسی طرف حدیث میں اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تحت البحر نارا اوتحت النار بحرا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سمندر کو دیکھ کر فرماتے یابحر متی تعود نارا اے سمندر تو آگ کب بنے گا؟ **چوتھا انقلاب:**...... زمین میں زلزلہ پیدا ہونا اور مردوں کا قبروں سے نکل آنا ہے۔اذازلزلت الارض زلزالها۔ اور۔ ان زلزلة الساعة شیءٌ عظیم۔ میں بھی زلزلہ کا ذکر ہے ۔ان چاروں انقلابات کے بعد نئے عالم یعنی آخرت کو نوع انسانی سے آباد کیا جائیگا۔اور خاص کر ان چاروں کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم کی بنیاد، ان ہی چار پر ہے۔گویا اصول عالم یہی چار (آسمان، ستارے، پانی اور زمین) ہیں۔باقی سب چیزیں انہیں چار سے پیدا ہوتی ہیں۔اہل ظاہر عقلاء نے گو آگ کو مستقل عنصر تسلیم کیا ہے۔اور ہوا کو بھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مستقل عنصر نہیں ہیں۔ہوا ایک ایسا جسم ہے جو پانی کی لطافت اور بعض ستاروں کی تاثیر سے کم یا زیادہ پیدا ہوتا ہے نہ

اس کی پیدائش کی کوئی خاص جگہ ہے نہ وہ کسی شکل کو قبول کرتی ہے اس کا کام سیر کرنا اور کیفیات خلق کو منتقل کرنا ہے۔ جیسے بو ،ناک میں، آواز کان میں وغیرہ۔ اور آگ ہوا کی سخت حرکت اور آفتاب کی تاثیر سے پیدا شدہ ہے۔ چیزوں کا پکانا، گرم کرنا اس کا کام ہے۔ بذات خود کوئی مفید شئی نہیں۔ حکماء کا یہ خیال کہ آگ اور ہوا کے کڑے پانی اور زمین کو گھیرے ہوئے ہیں یہ بات ایسی ہی بے سند ہے جیسے خرق والتیام (پھٹنا ملنا) آسمان کا عدم امکان بے دلیل ہے۔

علمت نفس ما قدمت واخرت ...... یعنی جب قیامت کے مذکورہ حالات پیش آ چکیں گے تو ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا اور پیچھے کیا چھوڑا ہے۔ آگے بھیجنے کا مطلب عمل کرنا۔ اور پیچھے چھوڑنے کا مطلب عمل ترک کرنا ہے۔ یا **قدمت** سے مراد وہ اعمال نیک و بد ہیں جو خود کیے تھے۔ اور **اخرت** سے مراد وہ اعمال نیک و بد جن کی رسم دنیا میں ڈال کر چلا گیا تھا۔ حدیث میں ہے۔ **من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بهاولا ينقص من اجورهم شيء ومن سن سنة سيئة فله وزرها وزر من عمل بهاولا ينقص من اوزا رهم شيء۔** ''جس شخص نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کو اپنے اعمال کا بھی ثواب ملے گا۔ اور جتنے لوگوں نے عمل کیا ان کے اعمال کے برابر مزید ثواب ملے گا لیکن اور لوگوں کے ثواب میں سے کم نہ کیا جائے گا۔ اسی طرح جس نے کوئی بری رسم جاری کی تو اسکو خود اپنے عمل کا گناہ ہوگا اور جتنے لوگ اس کا ارتکاب کریں گے ان سب کے برابر اس کو گناہ ہوگا۔ مگر ان لوگوں کے گناہ میں کمی نہ کی جائے گی۔'' یہ مضمون (پارہ: ۲۹) میں **ينبا الا نسان يومئذٍ بما قدم واخر** کے تحت تفصیل سے گذر چکا ہے۔

يا يها الانسان ماغرك بربك الكريم ...... جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قیامت آئے گی۔ اور ہر شخص کے نیک اور بد اعمال سامنے آ جائیں گے۔ تو اے انسان پھر یہ خواب غفلت کیسی؟ اور اپنے رب کریم سے سرکشی و بغاوت کیوں ہے؟ آخر کس چیز نے تجھ کو فریب دیا ہے۔ کہ تو رب کریم کی مخالفت پر ڈٹا ہوا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ **الانسان** سے مراد انسان کافر ہے۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ولید بن مغیرہ کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابی ابن خلف کے بارے میں نازل ہوئی۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسید بن کلدہ کے متعلق اس کا نزول قرار دیا ہے۔ اسید نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دی تھی۔ اور اللہ نے اس کو فوری سزا نہیں دی۔ تو اس آیت میں اس کو اور اس جیسے لوگوں کو تنبیہ کی گئی کہ فوری سزا نہ ملے تو دھوکہ میں نہ پڑنا چاہئے۔

رب اور شان کریمی:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موقع سرزنش کا ہے۔ اس لئے صفت قہر کا ذکر زیادہ مناسب تھا۔ مگر یہاں صفت ربوبیت و کرم کا ذکر ہے۔ ربوبیت و کرم تو خود غرور ہی کا سبب ہے۔ چنانچہ کتب تاریخ میں ہے کہ شاہ نوشیرواں کی موجودگی میں اس کے غلام و خدمت گار ہنس پڑے۔ ایک وزیر نے کہا کہ آپ کی نرمی سے یہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان پر آپ کا خوف اور رعب نہیں رہا۔ نوشیرواں نے جواب دیا کہ خوف دشمنوں کے لئے ہوتا ہے۔ دوستوں کے لئے نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو کئی بار پکارا۔ وہ نہیں آیا۔ حالانکہ قریب کھڑا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا تم کو بلایا مگر سننے کے باوجود کیوں حاضر نہیں ہوئے۔ غلام نے کہا کہ آپ کے کرم پر اعتماد اور سزا سے بے خوفی نے مجھے حاضری سے روکا۔ آپ نے اس کو فوراً آزاد کر دیا۔ معلوم ہوا کہ کرم و نوازش سبب غرور ہے۔ جواب یہ ہے کہ صفت کرم کے بیان کا

مقصد علت غرور ہی کا اظہار ہے۔ یعنی انسان کو کرم خداوندی ہی نے مغرور کر دیا ہے۔

کرمہائے تو مارا کرد گستاخ وگر نہ ایں مجال ما کجا بود

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **الھی غرنی حلمک لوا خذتنی بالاولی ماجرأت بالثانیۃ.** (خدایا آپ کے حلم نے مجھے فریب میں ڈال دیا۔ اگر آپ پہلی خطا پر مواخذہ فرما لیتے تو دوسری خطاء کی جرات نہ کرتا۔) حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ اگر حق تعالیٰ قیامت کے دن آپ سے پوچھیں **ما غرک بربک الکریم** تو آپ کیا جواب دے گے؟ فرمایا: یہ عرض کردوں گا **غرنی ستورک الملفات** (آپ کی پردہ پوشی نے دھوکہ میں ڈال دیا تھا) یحییٰ بن معاذ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے **کم من مغرور بالستر علیہ وکم من مستد رج بالا حسا ن** (بہت سے پردہ پوشی سے دھوکہ میں پڑے ہوئے اور بہت سے ڈھیل میں گرفتار ہیں) ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر مجھ سے فرمایا گیا **ما غرک بربک الکریم** ؟ تو میں کہہ دوں گا! **غرنی کرم الکریم** ۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب ہی سے باز پرس فرمائیں گے۔ اے ابن آدم تجھ کو میرے مقابلہ میں کس چیز نے جری بنا دیا؟ اے ابن آدم تو نے اپنے علم پر کیا عمل کیا؟ اے ابن آدم تو نے پیغمبر کو کیا جواب دیا؟ حاصل یہ ہے کہ لفظ رب کریم سے ایک طرف تو ناشکری کی زبردست تردید ہے۔ کہ ربوبیت و کرم کا تقاضا شکر گذاری ہے دوسری طرف بندوں کو امیدوار بنانا ہے رب کریم سے امیدیں منقطع نہ کرو۔

میرے گناہ زیادہ ہیں کہ تیری رحمت کریم! تو ہی بتادے حساب کر کے

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کو تفسیر میں فرمایا کہ تجھے کس چیز نے تیرے رب سے کاٹ کر نفس میں پھنسا دیا۔ **بئس للظلمین بدلا .**

ہوش و حواس اڑ گئے:

نقل ہے کہ ایک عورت نے قاضی کی بارگاہ میں استغاثہ کیا کہ میرے شوہر نے مجھ پر ایک اور عورت سے نکاح کر لیا ہے۔ قاضی صاحب نے کہا! تجھ کو اس پر اعتراض کا حق نہیں۔ اللہ نے مردوں کو دو دو۔ تین تین۔ چار چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ عورت بولی۔ قاضی صاحب! اگر حیا و حجاب کے خلاف نہ ہوتا تو میں آپ کو اپنے حسن جمال کا نظارہ کراتی۔ پھر پوچھتی کہ جس عورت کا حسن و جمال ایسا ہو جیسا کہ میرا ہے۔ اس کو چھوڑ کر دوسری طرف متوجہ ہونا جائز ہے؟ ایک اہل دل نے عورت کی یہ بات سنی تو اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا تو کہنے لگا کہ میں نے ایک ہاتف غیبی کو یہ آواز دیتے ہوئے سنا کہ تو نے اس عورت کی بات سنی؟ اگر عظمت و کبریائی کا حجاب نہ ہوتا تو میں تم کو اپنا جمال و جلال دکھاتا۔ جس کی سمائی کسی مقابل شئی میں نہ ہوتی۔ اور پھر تم سے پوچھتا کہ جو مجھ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ کیا اس کے لئے یہ جائز ہے؟ بتاؤ مجھ جیسا کہاں ہے میرے مثل کون ہے؟ ہرگز کوئی مجھ جیسا نہیں میری ہی طلب کر۔ جو میری جستجو کرے گا مجھ کو پالے گا۔ حدیث میں ہے کہ جب کوئی نماز پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ اس پر توجہ فرماتے ہیں۔ جب نمازی اپنا رخ ادھر ادھر کرتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے اے آدم کے بیٹے تو کدھر توجہ کرتا ہے۔ مجھ سے بہتر کون ہے؟ میری طرف رخ کر۔ جب آدمی دوبارہ روگردانی کرتا ہے تو وہی ارشاد ہوتا ہے پھر تیسری بار منہ پھیرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی توجہ نہیں فرماتے (مظہری)

شیطان کا دھوکہ:

بندہ جب گناہ کرتا ہے۔اور اللہ کی طرف سے فوری مواخذہ نہیں ہوتا تو شیطان کہتا ہے کہ جو جب چاہے کر۔اللہ تو کریم ہے۔اللہ غفور رحیم ہے۔اس سے انسان کی جرأت بڑھ جاتی ہے۔اور وہ نافرمانیوں پر دلیر ہو جاتا ہے۔سدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اللہ کی نرمی اور کرم سے انسان دھوکہ میں پڑ جاتا ہے۔آیت گرامی میں استفہام انکاری ہے۔یعنی اگر اللہ میں صفت کرم ہو تب بھی اس کے کرم درگذر اور فی الفور مواخذہ نہ کرنے سے انسان کو فریب کھانا جائز نہیں۔ظالم کو بالکل چھوڑ دینا اور دشمن و دوست کو برابر کر دینا کرم کا تقاضا نہیں۔پھر جب کہ قہار و جبار بھی ہے تو کرم پر مغرور ہو جانا اور انتقام سے غافل ہو جانا حماقت ہے کقول بعض شیا طین الانس

تَكَثَّرْ مَا اسْتَطَعْتَ مِنَ الْخَطَايَا سَتَلْقَىٰ فِيْ غَدٍ رَبًّا غَفُوْرًا

تو خوب جی بھر کر گناہ کر تا رہ کل کو رب غفور سے ملاقات ہوگی اور سب گناہ معاف ہو جائیں گے

تَعُضُّ نَدَامَةً كَفَّيْكَ مِمَّا تَرَكْتَ مَخَافَةَ الذَّنْبِ السُّرُوْرَا

ورنہ کل افسوس کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ ملے گا کہ تو نے گناہ کے اندیشہ سے مسرت کو چھوڑ دیا

یہ خیال باطل ہے جو کج فہمی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ورنہ کثرت کرم کا تقاضا ہی یہ ہے کہ شکر گذاری کی جائے۔ناشکری سے پرہیز کیا جائے۔اطاعت کی کوشش اور معصیت سے اجتناب کیا جائے۔وقال محمد بن السماک .

اپنے گناہ چھپا کر کرنے والے تجھے شرم نہیں آتی اللہ تعالی تجھ کو تنہائی میں بھی دیکھ رہا ہے

غرک من ربک امهاله وستره طول مساويک

تیرے رب کے مہلت دینے نے تجھکو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اور اسکی پردہ پوشی نے تیرے گناہ زیادہ کر دیئے

وقال بعضهم .

يقول مولاى اما تستحي مما ارى من سوء افعالك

میرا مولی کہتا ہے کہ تو شرماتا نہیں اس سے کہ میں تیری بدکاری دیکھ رہا ہوں

فقلت يا مولاى رفقا فقد جرءني كثرة افضالک

تو میں نے عرض کیا میرے مولی کرم فرمایئے مجھے آپ کے انعامات اور بخششوں نے جری کر دیا ہے

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں غره عدو ه المسلط عليه۔انسان کو اسکے دشمن (شیطان) نے دھوکہ میں ڈالا ہے جو اس پر مسلط ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر غرور کی تفسیر جہل سے کی اور یہ آیت بھی تلاوت فرمائی انه كان ظلوما جهولا (انسان بہت ظالم و جاہل ہے)

تنبیہ:......اہل اللہ اور صوفیہ حضرات کے جو اقوال مذکور ہوئے ان میں اور دوسری قسم کے (گستاخ) لوگوں کے اقوال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔اہل اللہ کا منشا اعتراف گناہ و ندامت کے ساتھ امید کرم کا اظہار ہے۔اور دوسرے لوگوں کا مقصود گستاخانہ رویہ سے گناہوں کو ہلکا سمجھ کر بے جا امید جتلانا ہے۔جیسے عیسائیوں کا خیال فاسد ہے۔کہ عیسی علیہ السلام ان کی طرف سے کفارہ بن گئے۔یا یہود کا خیال کہ ابراہیم و اسحٰق علیہما السلام کی اولاد ہونا ہی کافی ہے یا اہل اولاد

اور جاہل سیدوں کا خیال ہے کہ ہمیں یہی وصف نسبت کافی و باعث نجات ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ کی رحمت وشان غفاری وکرم پر بھروسہ کر کے جو چاہیں کرتے پھریں بالکل آزادی ہے۔ الحاصل یہ خیالات فاسدہ ہیں۔ ان کو امید کرم سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ نمک حرامی اور بے وفائی ہے۔ جو عقلا و نقلا اور عرفا ہر طرح قابل مذمت ولائق مواخذہ ہے۔ اور اسی کو غرور کہتے ہیں۔ نعوذ باللہ من الغرور۔

لطف راحت حق باتو مواسا ہا کند　　چونکہ ازحد بگزرد رسوا کند

غرور تمنا اور رجا:...... ان تینوں میں فرق ہے۔ اور تمنا دونوں مذموم ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔ **ولا یغرنکم باللہ الغرور** (تم کو دھوکہ باز یعنی شیطان دھوکہ میں نہ ڈالدے) **تلک امانیھم** اور **لیس باما نیکم ولا امانی اھل الکتب من یعمل سوء یجزبہ** وغیرہ۔

اور رجاء وامید کی مدح آئی ہے۔ مثلاً **اولئک یرجون رحمۃ اللہ**. رجا اور امید یہ ہے کہ مطلوب کے مناسب اسباب کو ترتیب دے کر مطلوب کا انتظار کیا جائے۔ جیسے کھیت جوت کر بیج بو کر غلہ کی توقع رکھنا۔ نکاح وغیرہ کر کے اولاد کی امید رکھنا۔ اعمال صالحہ کر کے نجات ومغفرت اور جنت کی امید رکھنا وغیرہ اور غرور ایسی چیز کی توقع رکھنا کہلاتا ہے جس میں اسباب اختیار نہ کئے ہوں۔ یا اسباب کی خلاف ورزی کی جیسے کھیت نہ بویا، اجاڑ کر غلہ کی توقع یا مال برباد کر کے نفع کی امید، نکاح بیاہ کے بغیر اولاد کی آرزو، بغاوت ونافرمانی پر مغفرت وجنت کی تمنا۔

ہر آنکہ تخم بدی کاشت وچشم نیکی داشت　　دماغ بیہدہ پخت وخیال باطل بست

اور تمنا وہ ہے کہ کسی قدر اسباب مہیا کر کے کامیابی کی آرزو کرے۔ حاصل یہ ہے کہ مکمل اسباب مہیا کر کے توقع رکھنا رجاء ہے۔ اسباب ناقص کے بعد آرزو تمنا ہے (جو شکی حالت ہے) اور اسباب بالکل مہیا نہ کرنا یا اسباب کے خلاف توقع کرنا غرور ہے۔

الذی خلقک:...... یہاں سے رب کے کرم کی کچھ تفصیل ہے۔ تاکہ مغرور کی آنکھیں کھلیں اور وہ سمجھے کہ میں کس کریم ذات کے بارے میں اپنی جہالت ونادانی کے سبب دھوکے میں پڑا ہوں۔ اے انسان! تیرا رب کریم وہ ہے کہ جس نے محض اپنے کرم سے تجھ کو وجود فرمایا نہ تو نے کوئی درخواست ودعا کی تھی۔ نہ تیرے وجود میں کسی کی شرکت ہے۔ پھر تجھ کو بے ڈول پیدا نہیں کیا۔ بلکہ تیرے تمام اعضاء میں تناسب وتوازن رکھا ہے۔ اور ہر عضو کو برمحل بنایا۔ کہ اس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتا تھا۔ **فسوک فعدلک** (پھر تجھ کو ایک متناسب الاعضاء ومعتدل بنایا) یعنی تیرے تمام اعضا کو ایک خاص مناسبت وتوازن کے ساتھ درست کر کے بنایا، ہر عضو کو ایک نہایت مناسب مقام دیا ہر عضو کو جسامت وطول وعرض میں متوازن بنایا۔ اگر تناسب وتوازن میں تھوڑا سا فرق ہو جائے تو اعضا کے منافع وفوائد کم یا ناپید ہو جائیں۔ پھر تیرے وجود کو ایک خاص اعتدال بخشا۔ جو دنیا کے کسی جاندار میں نہیں ہے۔ اور یہ اعتدال اعضاء کے تناسب وتوازن کے اعتبار سے بھی ہے اور مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے بھی۔ گو انسانی تخلیق میں متضاد اور مختلف مواد شامل ہیں۔ خون، بلغم، سودا، صفرا، حرارت، برودت یبوست، رطوبت وغیرہ مگر حکمت ربانی نے ان متضاد چیزوں سے ایک معتدل مزاج تیار کر دیا۔ اور ایک ضد کا زور دوسری ضد سے توڑ دیا۔

فائدہ...... یہاں دو وصف بیان کئے جاتے ہیں۔ **تسویہ** جس کا تعلق ظاہری بناوٹ سے ہے۔ چنانچہ بطن مادر

میں پہلے اعضائے جسم کا نسویہ ہوتا ہے۔تب تمام اعضاء میں قوت ودیعت رکھی جاتی ہے۔دوسرا وصف تعدیل ہے۔جو اس کے باطنی احکام سے متعلق ہے۔جو مزاج کی تعدیل سے لے کر اس کی تمام تک کو شامل ہے۔اس لئے خلق کی تفصیل میں اول نسویہ کو پھر تعدیل کو ذکر کیا۔ان دونوں کے بعد اور کوئی حالت منتظر باقی نہیں رہتی۔بلکہ ان کے فورا بعد ایک خاص صورت عطاء ہو جاتی ہے۔جس کو صورت شخصیہ کہتے ہیں۔خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔پھر خوبصورت یا بدصورتی یا بدصورتی وغیرہ کیفیات جو رب وہاب عطاء فرمانا چاہتا ہے عطاء فرما دیتا ہے اس تیسری حالت کو بغیر عطف کے اس طرح بیان فرمایا۔

فی ای صورۃ ما شآء رکبک :......(جس صورت میں چاہا اے انسان تجھ کو اس میں مرکب کر دیا) صورۃ کو تنوین برائے تنکیر و مفید تکثیر ہے۔اور لفظ ما سے اس کی تاکید کی گئی ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس کی صورت میں تم کو چاہا جوڑ دیا۔مجاہد وکلبی رحمۃ اللہ علیہما و مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ماں باپ، ماموں، چچا وغیرہ کسی بھی رشتہ دار کی مشابہت دے دی جاتی ہے۔چنانچہ حدیث میں ہے کہ نطفہ رحم میں ٹھہرتا ہے تو اس سے لے کر آدم علیہ السلام تک تمام صورتوں کو سامنے لایا جاتا ہے۔(اور اس کو ان میں سے کسی کی بھی شکل جیسا کر دیا جاتا ہے) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطور استشہاد واستدلال) یہی آیت فی ای صورۃ ماشاء رکبک تلاوت فرمائی۔بعض کہتے ہیں کہ اس سے خوبصورتی و بدصورتی کا تفاوت مراد ہے۔بعض کہتے ہیں کہ ذکورت وانوثت کا فرق مراد ہے۔بعض نے رنگوں کا اختلاف مراد لیا ہے۔بعض نے مقبولیت و مردودیت کا تفاوت مراد لیا ہے۔لیکن آیت کا مفہوم سب امتیازات کو شامل ہے۔یعنی جس اعتبار سے جس کو جیسا چاہا بنا دیا۔ان مذکورہ اشیاء میں سے کوئی ایک چیز بھی انسان کے بس میں نہیں۔اور نہ اس کی درخواست اور کوشش سے عطاء ہوئی ہے۔بلکہ یہ سب کچھ صرف رب کریم کا کرم ہے جس پر انسان غرور کرتا ہے۔

فائدہ......اکثر غرور کے اسباب تین ہوتے ہیں۔(۱) حسب ونسب (۲) حسن و جمال (۳) مال ومتاع۔ان تینوں کی حقیقت اس ایک ہی جملہ میں بیان فرما دی گئی۔کہ اس کریم نے جیسا چاہا بنا دیا۔ان میں سے ایک چیز بھی انسان کے اختیار میں نہیں۔

فائدہ......تمام انسانوں کی تخلیق ایک خاص ہیت ومزاج پر ہونے کی وجہ سے سب میں اشتراک ہے۔بظاہر اسکا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ شکل وصورت، عقل ومزاج وغیرہ میں سب یکساں ہوتے اور باہمی امتیاز وفرق دشوار ہو جاتا۔مگر حق تعالی نے اپنی قدرت کاملہ وحکمت بالغہ سے کروڑوں بلکہ اربوں، پدموں انسانوں کی صورتوں میں ایسے امتیازات رکھ دیئے ہیں کہ باوجود اشتراک کے سب ایک دوسرے سے ایسے ممتاز ہیں کہ اشتباہ نہیں ہوتا۔

یہ بھی اس کی شان یکتائی کا ہے ثبوت ایک کی صورت کسی بھی ایک سے ملتی نہیں

مگر یہ مغرور انسان کمالات قدرت خداوندی کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ناشکری وانکار کرتا ہے۔حالانکہ اس کو ہرگز مغرور، ناشکرا اور منکر قدرت نہ ہونا چاہیے۔

بل تکذبون بالدین ......دین سے مراد اسلام ہے۔یا جزاء وسزا۔یعنی تم غرور غفلت کی بناء پر خداوندی دین کے منکر ہو رہے ہو۔اور رب کریم کی عبادت سے منہ موڑ رہے ہو۔یا جزاء وسزا کو جھٹلا کر بے مہار کی طرح لذات وشہوات میں مشغول ومنہمک ہو۔

وان علیکم الخ (حالانکہ تم پر محافظ فرشتے مقرر ہیں۔جو اللہ کے نزدیک معزز ومکرم ہیں۔بنی آدم کے اعمال کو

لکھتے ہیں اور تمہاری تمام حرکات وسکنات کا ان کو علم ہے) کراماً کاتبین اور یعلمون ما تفعلون یہ تینوں حافظین کے اوصاف ہیں۔جن سے ان کی عظمت ورفعت ظاہر ہوتی ہے۔کہ وہ فرشتے صاحب کرم ہیں۔وہ شرمناک موقعوں پر تمہارے سامنے نہیں آتے۔نہ تمہارا راز ظاہر کر کے تم کو رسوا کرتے ہیں۔لیکن اللہ کے حکم سے وہ تمہارے اچھے اور برے اعمال کو دفتر غیب میں درج کرتے رہتے ہیں۔ان پر تمہارا کوئی عمل چھپا ہوا نہیں رہتا۔اس سے منکرین ومکذبین پر زجرا ور جزاء وسزا کی حقانیت کا اثبات مقصود ہے۔

نگران فرشتے:

پھر حافظین میں وہ فرشتے بھی ہیں۔جو انسان کی بلیات وآفات سے حفاظت کرتے ہیں۔اور حفاظت کی تدبیروں کا بنی آدم کے قلوب میں القاء والہام کرتے ہیں۔اگر ان کی حفاظت ایک آن کے لئے ہٹ جائے تو انسان موت کے گھاٹ اتر جائے۔اور ان میں وہ فرشتے بھی ہیں۔جو بنی آدم کے اعمال لکھتے ہیں۔ممکن ہے کہ دونوں کام ایک ہی قسم کے فرشتوں کے متعلق ہوں۔یا حفاظت کرنے والے فرشتے علیحدہ ہوں۔اور اعمال لکھنے والے ان کے علاوہ ہوں۔واللہ اعلم

حدیث میں ہے کہ فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں۔ایک رات کے لئے دوسری دن کے لئے۔اور یہ دونوں جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں۔ایک رات کے لئے۔اور یہ دونوں جماعتیں فجر اور عصر کی نمازوں میں جمع ہوتی ہیں۔صبح کی نماز کے بعد رات کے فرشتے رخصت ہو جاتے ہیں۔اور دن کے محافظ فرشتے حفاظت کا کام سنبھال لیتے ہیں۔اور عصر کی نماز کے بعد دن والے فرشتے رخصت ہو جاتے ہیں۔اور رات کے فرشتے ڈیوٹی پر آجاتے ہیں۔(بخاری)

ابو داؤد شریف میں بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے۔کہ ہر انسان کے ساتھ کچھ حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں۔اس پر کوئی دیوار وغیرہ نہ گر جائے۔یا وہ کسی گڑھے یا غار میں نہ گر جائے۔یا کوئی جانور یا انسان اس کو تکلیف نہ پہنچادے۔البتہ جب حکم الٰہی کسی انسان کو بلا ومصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے نافذ ہوتا ہے تو اس وقت محافظ فرشتے ہٹ جاتے ہیں۔اور امر خداوندی نافذ ہو جاتا ہے۔ابن جریر رضی اللہ عنہ کی حدیث (بروایت عثمان غنی رضی اللہ عنہ) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان محافظ فرشتوں کا کام صرف دنیاوی مصائب وبلیات سے حفاظت کرنا ہی نہیں ہوتا۔بلکہ وہ انسانوں کو گناہوں اور نافرمانیوں سے بچانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔لیکن اگر انسان فرشتوں کے القاء سے غفلت برت کر گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔تو وہ پھر بھی دعاء اور کوشش کرتے ہیں۔کہ وہ جلد توبہ کر کے گناہ سے پاک ہو جائے اگر اس کے باوجود بھی بندہ متنبہ اور خبردار نہیں ہوتا،تب وہ اعمالنامے میں اس گناہ کو لکھ لیتے ہیں۔حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر انسان سے حفاظت خداوندی کا پہرہ ہٹ جائے تو جنات اس کی زندگی وبال کر دیں۔لیکن یہ سب حفاظتی پہرے اسی وقت تک کام کرتے ہیں۔جب تک تقدیر الٰہی حفاظت کی اجازت دیتی ہے۔اور جب حق تعالیٰ کسی کو بندہ کو کسی آفت میں مبتلا کرنا چاہے تو حفاظتی پہرہ ہٹ جاتا ہے۔(معارف القرآن ۱۸۰)

محافظین کی تعداد:

صحیح روایات کے موافق ہر انسان کے ساتھ اعمال لکھنے والے چار فرشتے ہوتے ہیں۔دو دن کو آتے ہیں۔اور دو

رات کو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بیٹھنے کی جگہ آدمی کے کندھے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ انسان کے اوپر والے بڑے دانتوں پر بیٹھتے ہیں۔ اور آدمی کی زبان ان کا قلم اور تھوک ان کی روشنائی ہوتی ہے۔ پھر رات کے فرشتوں کا دفتر الگ ہوتا ہے۔ اور دن کے فرشتوں کا دفتر الگ ہوتا ہے۔ باوجود یہ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا علم ہر شئی کو محیط ہے۔ ان فرشتوں کے لکھے ہوئے اعمال نامے کا لوح محفوظ سے مقابلہ کراتے ہیں کیونکہ لوح محفوظ میں بندوں کے تمام اعمال پورے طور پر صحیح صحیح لکھے ہوتے ہیں۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ نیکی وگناہ کے علاوہ اعمال ناموں سے سب کچھ مٹا دیا جائے۔ کیونکہ نیکی وگناہ پر ہی ثواب وعذاب کا دارومدار ہوتا ہے۔ اسلئے ان ہی چیزوں کو باقی رکھا جاتا ہے۔ (فتح العزیز)

نیتوں کا اعمال ناموں میں لکھنا:

یہ مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ کہ فرشتے بنی آدم کی اچھی بری نیتوں کو بھی لکھتے ہیں یا نہیں۔ اگر لکھتے ہیں تو ان کو نیات کا علم کس طرح ہوتا ہے۔ آیا کوئی اثر اچھی بری نیت والے میں ظاہر ہوتا ہے۔ یا الہام ربانی سے ان کو اطلاع ہو تی ہے تب وہ لکھتے ہیں۔ اس میں علماء کے سب ہی اقوال ہیں اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ نیتوں کو لکھتے ہیں اور بواسطہ الہام ربانی ان کو نیات پر اطلاع ہوتی ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ لکھنے والے نیکی کے ارادہ کو لکھ لیتے ہیں۔ اور گناہ کے ارادہ کو جس کو نہیں کیا چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ چھوڑ دینے کو نیکی ہی میں شامل کر کے لکھتے ہیں ۔ دوسری روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اور اللہ کے درمیان بعض اسرار ایسے ہیں کہ فرشتوں کو ان کی خبر نہیں ہوتی اور آخرت میں ان اسرار کی بنا پر نوازش ہوں گی۔ تب فرشتوں کو معلوم ہوگا۔

میان عشق ومعشوق رمز یست   کراما کاتبین را ہم خبر نیست

ان الابرار :......سابقہ آیات سے جزاء وسزا کا ثبوت ہوا۔ نیز **علمت نفس ما قدمت واخرت** سے تمام اعمال کا سامنے آجانا معلوم ہوا تھا۔ تو اس آیات میں نتائج اعمال سے تشریح کی جارہی ہے کہ نیکیاں کرنے والے (نیک بندے) عیش وآرام میں ہوں گے۔ اور بدکردار فجار جہنم رسید ہوجائیں گے۔ ابرار وہ لوگ ہیں جو اوامر خداوندی کی تعمیل اور نواہی ونامرضیات خداوندی سے اجتناب کرتے ہیں۔ یا یہ کہیے کہ جو حکم خداوندی کے مطابق خالق ومخلوق کے حقوق ادا کرتے ہیں اور کوتاہیوں سے توبہ استغفار کرتے ہیں وہ لوگ ابرار ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرنبرداروں کو ابرار اسلئے فرمایا ہے کہ انہوں نے باپ، بیٹے (اصول وفروع اور اعزاء واقرباء) سے اچھا سلوک کیا (کیونکہ بر کے معنی اچھا سلوک کرنے کے آتے ہیں)۔ **فجور** کے معنی پھاڑنے کے آتے ہیں۔ جن لوگوں نے کفر وعصیان کے ہاتھوں دین ودیانت کا پردہ پھاڑ دیا ہے وہ فجار کہلاتے ہیں۔ **وما هم عنها بغائبين** یعنی دوزخی دوزخ سے غائب وغیرہ نہ ہوسکیں گے۔ یعنی اس میں ہمیشہ ہمیشہ موجود وحاضر رہیں گے۔ دنیا کے قید خانے سے مدت قید پوری کر کے بھاگ کر، چھوٹ کر، زبردستی، رشوت دے کر یا کسی اور ترکیب سے اور آخر کار مر کر پیچھا چھوٹ جاتا ہے۔ مگر جہنم سے نکلنے اور چھوٹنے کی یہ تمام راہیں مسدود اور بند ہیں۔ وہاں سے چھوٹ جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ **وما ادراک** الخ اس کلام سے **یوم الدین** کی عظمت کا اظہار اور وہاں کی سختیوں اور مصیبتوں کا بیان کیا جارہا ہے۔

معتزلہ کے استدلات اوران کے جوابات:

(۱)معتزلہ نے وما هم عنها بغآ ئبين سے ثابت کیا ہے کہ کبیرہ گناہ کے مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے کیونکہ وہ فجار ہیں۔جن کے متعلق آیت مذکورہ سے خلود في النار مفہوم ہوتا ہے۔جواب:۔امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وان الفجار لفي جحيم میں الفجار کاالف لام عہد کے لئے ہے۔اور معہود وہ کفار ہیں جو یوم الدين کاانکاراور تکذیب کرتے ہیں۔مرتکب کبیرہ اس میں داخل نہیں۔اور سیاق کلام اسکا قرینہ ہے۔حاصل یہ ہے کہ الفجار میں عموم اور استغراق نہیں ہے۔اوراگرالف لام استغراقی ہی مان لیا جائے تو بھی اس کا مصداق کفار ہی ہوں گے۔اہل کبیرہ کا فاجر ہونا ہمیں تسلیم نہیں۔کیونکہ سورۂ عبس کی آخری آیت میں کفار ہی کو فجار کہا گیا ہے۔پھراگر یہ مان لیا جائے کہ اہل کبیرہ فاجر ہیں تو وما هم عنها بغآ ئبين کے معنی وهم فيها محضرون ہیں جوقضیہ مہملہ موجبہ قوت میں جزئیہ کا ہوگا۔اوراس کے صدق کے لئے بعض افراد فجار یعنی کفار کا خلود کافی ہے۔راقم الحروف کہتا ہے کہ معتزلہ کا استدلال سرے سے ہی غلط ہے اس وجہ سے لفظ الفجار میں متعدد احتمالات ہیں۔جیسا کہ مذکور ہوئے۔ اوراحتمال پیدا ہونے کے بعد اس سے استدلال نہیں کرسکتے۔اور وما هم عنها بغآ ئبين کے معنی بھی خلود فی النار کے متعین نہیں اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ اپنی تدبیروں سے دوزخ سے نہ نکل سکیں گے۔یہ ممکن ہے بلکہ ضروری ہے کہ خدائے تعالی بعض فجار (اہل کبیرہ) کو شفاعت وغیرکے ذریعہ یااپنے فضل وکرم سے دوزخ سے نجات دے دے۔احادیث صحیحہ کثیرہ وآیات قرآنیہ سے اس کا ثبوت ہے آیت کے یہ بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ سزامیں دوزخ سے غائب نہیں ہوسکتے۔اس سے عام کہ وہ زمانہ سزا محدود ہو یا غیر محدود۔(۲)معتزلہ نے آیت يوم لا تملك...... کوانکار شفاعت پر دلیل بنایا ہے کہ اس عالم میں کسی کو کسی قسم کا اختیار نہ ہوگا۔معاملہ اللہ کے اختیار میں ہی ہوگا۔(کیونکہ نفس لنفس اور شيئاً تینوں کلمات کی تنوین کے لئے ہیں (جن سے عموم السلب مفہوم ہوتا ہے) **جواب**:......شفاعت کسی کا اپنا اختیار نہ ہوگا۔اورآیت میں اسی اختیار ذاتی کا سلب مذکور ہے بلکہ اللہ تعالی کے امرواختیاراوراجازت ہی سے شفاعت ہوگی جس کا اس میں بیان نہیں۔اور دوسری آیات واحادیث صحیحہ میں ہے۔مثلاً من ذالذی يشفع عنده الا با ذنه اور ولا يشفعون الا لمن ارتضى وغیرہ۔اورعدم ذکر شئی کو مستلزم نہیں۔(فافہم)

تم تفسیر سورہ الانفطار فالحمد للہ والصلوۃ والسلام علی سید الابرار وعلی آله وصحبه الاخیار الی یوم الفرار

سُوْرَةُ التَّطْفِيْفِ

سُوْ رَةُ التَّطْفِيْفِ مَكِّيَّةٌ وَّ هِيَ سِتٌّ وَّ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

رکوع:۱، آیات:۳۶ سورۂ تطفیف مکی ہے اور اس میں چھتیں (۳۶) آیات ہیں کلمات:۶۹، حروف:۷۳۰

شان نزول اور مکی مدنی کا اختلاف:

اس سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ سورۂ تطفیف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول پر مکی ہے عام مصاحف قرآن میں اسی بناء پر اس سورت کا مکہ لکھا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، قتادہ رضی اللہ عنہم اجمعین، مقاتل اور ضحاک رحمۃ اللہ علیھم کے نزدیک یہ سورۃ مدنی ہے۔ مگر اسکی صرف آٹھ آیات مکی ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو دیکھا کے مدینہ کے لوگ (جن کے معاملات تجارت کیل یعنی ناپ کے ذریعہ ہوتے تھے) ناپ تول میں کمی اور چوری کرنے کے عادی ہیں۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت (ويل للمطففين) نازل فرمائی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مروی ہے کہ یہ پہلی سورت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے پہنچتے ہی نازل ہوئی۔ کیونکہ اہل مدینہ میں یہ رواج عام تھا کہ جب کسی سے لیتے تو پورا پورا ناپ تول کر لیتے تھے۔ اور جب دوسروں کو دیتے تو کم ناپ تول کر دیتے تھے۔ جب یہ سورت نازل ہوگی تو لوگ اس بد، رسم سے باز آگئے۔ اور ایسے باز آئے کہ آج تک اہل مدینہ ناپ تول کو پورا کرنے میں مشہور ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں ابوجہینہ نامی ایک شخص تھا اس کے پاس دو صاع (غلہ ناپنے کا پیمانے) ایک سے ناپ کر دیتا اور ایک سے لیتا تھا (دینے والا چھوٹا اور لینے والا بڑا) اس پر ويل للمطففين نازل ہوئی۔ اس سورت کو مکی کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ معظمہ ہی میں نازل ہوگئی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور وہاں کے لوگوں کو کم ناپنے تولنے کی بلا میں مبتلا پایا تو یہ سورت ان کو پڑھ کر سنائی اس لئے لوگوں نے سمجھا کہ ابھی مدینہ میں نازل ہوئی ہے حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کا نزول سفر ہجرت میں مکہ و مدینہ کے درمیان (راستے میں) ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ربط مناسبت:

سورۂ الانفطار میں اعمالناموں کے ابتدائی حال (یعنی کتابت) کا ذکر تھا۔ اور اس سورت میں اس کے درمیانی حال یعنی علیین اور سجین میں (جو ابرار و فجار کے اعمالناموں کے دفتر ہیں) جمع ہونے کا ذکر ہے۔ نظم و ضبط کے اعتبار سے دونوں سورتوں میں پوری مناسبت ہے۔ مثلاً وہاں بل تکذبون بالدین تھا یہاں ويل يومئذٍ للمكذبين ہے۔ وہاں ان علیکم لحافظین تھا یہاں وما ارسلوا علیهم حفظین ہے۔ وہاں بھی ابرار و فجار کا ذکر تھا۔ اس سورت میں بھی ہے وہاں یصلونها یوم الدین تھا تو یہاں لصالو الجحیم ہے وہاں والامر یومئذٍ للہ تھا اور یہاں یوم یقوم الناس لرب العلمین ہے۔ اور ان تمام مضامین کی مناسبت بالکل ظاہر ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ(١) الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ(٢) وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے جب لوگوں سے ناپ کرلیں۔تو پورا پورا وصول کرلیں۔اور جب ان کو ناپ کریا تول

وَيْلٌ	لِّلْمُطَفِّفِيْنَ	الَّذِيْنَ	اِذَا	اكْتَالُوْا	عَلَى	النَّاسِ	يَسْتَوْفُوْنَ	وَ	اِذَا	كَالُوْهُمْ	اَوْ	وَّزَنُوْهُمْ
وائے واسطے	کم کردینے والوں	(جو) کہ	جب	ماپ لیں	اوپر	لوگوں	پورا لیں	اور	جب	ماپ دیں،ان	یا	تول دیں،ان

يُخْسِرُوْنَ(٣) اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ(٤) لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ(٥) يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ(٦)

کردیں تو گھٹادیں کیاان کواس کایقین نہیں ہے کہ ان کوایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اٹھایا جائیگا جس دن لوگ پروردگار عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے

يُخْسِرُوْنَ	اَلَا	يَظُنُّ	اُولٰٓئِكَ	اَنَّهُمْ	مَّبْعُوْثُوْنَ	لِيَوْمٍ	عَظِيْمٍ	يَّوْمَ	يَقُوْمُ	النَّاسُ	لِرَبِّ	الْعٰلَمِيْنَ
کم دیں	کیا نہیں	جانتے	یہ لوگ	کہ وہ	اٹھائے جائینگے	واسطے ایک دن	بڑے	دن	کھڑے ہوئگے	لوگ	واسطے پروردگار	عالموں

لغات:

المطففین باب تفعیل سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ہے **تطفیف** مصدر ناپ تول میں کمی کرنا۔**طف طفاً** (ن ض) قریب ہونا **اکتالو** جمع مذکر غائب ماضی باب افتعال سے **اکتیال** مصدر ناپنا۔پیمانہ سے ناپ کرلینا۔**کال کیلا مکیلاً مکالاً** (ض) ناپنا،اندازہ کرنا، یہ متعدی مفعول ہوتا ہے اور کبھی متعدی بدو مفعول بلاواسطہ حرف جر۔جیسے **کلت زید الطعام** اور کبھی مفعول اول پرلام آتا ہے جیسے **کلت لزید الطعام** ۔**کالو ھم ای کانو لھم** . **کیل مکیال** پیمانہ اور **کیلۃ** اسم ہے۔اور جو چیزیں پیمانے سے لی جاتی ہیں ان کو مکیل کہتے ہیں۔**یستوفون** جمع مذکر غائب مضارع۔ باب استفعال سے استیفاء مصدر۔پورا پورا لینا۔مجرد میں (ض) سے پورا کرنا۔ **اوزنوا** (ض) تولنا (ك) بوجھل ہونا،سنجیدہ ہونا۔موزون وہ چیزیں جو تولی جائیں۔**یخسرون** باب افعال سے گھٹانا۔ہلاک کرنا۔نقصان میں پڑنا۔(س) **خسراً خسراً** .**خساراً** .**خسارۃً** نقصان اٹھانا،گمراہ ہونا۔ہلاک ہونا۔**خسرا خسرانا** کم کرنا،ضائع کرنا۔

ترکیب:

ویلٌ مبتدا (تنوین اس میں تعظیم کے لئے جس سے اس میں تخصیص پیدا ہوگئی اور مبتدا بننا صحیح ہوگیا ای **ویل عظیم** یا یہ علم ہے دوزخ کے ایک طبقہ کا۔یا مصدر ہے فعل محذوف کا ای **تحسر ویلا** اسکو بقصد استمرار مرفوع کردیا گیا۔مثل **سلام علیکم** کے اور بعض نحویوں نے نکرہ کو بھی مبتدا بنایا ہے) **للمطففین** لام جار **المطففین** موصوف **الذین** اسم موصول **اکتالو ا** فعل اپنے فاعل ضمیر اور متعلق **علی الناس** سے مل کر شرط **یستوفون** جملہ فعلیہ جزا۔شرط جزا مل کر جملہ شرطیہ جزائیہ۔معطوف علیہ **واذا کالوھم** او **کالو مکیلھم** جملہ فعلیہ معطوف علیہ۔او حرف عطف **وزنوھم** فعل ضمیر مستر فاعل ضمیر **ھم** مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ معطوف۔معطوفین ملکر شرط **یخسرون** فعل فاعل جملہ فعلیہ جزا۔جملہ شرطیہ جزائیہ معطوف۔معطوفین مل کر **الذین** کا صلہ۔اسم موصول وصلہ مل کر صفت۔موصوف **المطففین** اپنی صفت سے مل کر مجرور۔ ثابت کے متعلق ہوکر ویل مبتدا کی خبر۔

جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔ استفہام توبیخ کے لئے ہے لا یظن اولئک فاعل ان حرف مشبہ بہ فعل ھم اسم مبعوثون اسم مفعول کا صیغہ لیوم عظیم اسکا تعلق یوم مضاف یقوم فعل الناس فاعل لرب العلمین متعلق جملہ فعلیہ مضاف الیہ۔ مرکب اضافی مبعوثون کا ظرف مبعوثون اپنے متعلق اور ظرف سے مل کر خبر۔ انّ اپنے اسم وخبر سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ لا یظن دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ جملہ فعلیہ انشائیہ ہوا۔

تفسیر:

ویل للمطففین الخ تطفیف کے معنی ناپ تول میں خیانت کرنے کے آتے ہیں اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ گو اپنا پورا لینا مذموم نہیں اور نہ پورا حق وصول کرنے پر مذمت مقصود ہے، بلکہ اس سے بھی کم دینے پر مذمت کی تاکید مقصود ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے حق جس طرح تم پورا پورا وصول کرتے ہو دوسروں کا حق بھی اسی طرح پورا دینا چاہئے۔ نیز ایسا شخص جو دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے وہ کسی رعایت نہیں کرتا۔ یہ آدمی کی بہت ہی بری عادت ہے۔ کہ اپنے حق کے بارے میں کسی سے رعایت نہ کرے پورا وصول کرے اور دوسروں کا حق کم کردے۔ اور جو اپنے حق میں بھی رعایت سے کام لیتا ہے وہ اتنا بڑا مجرم نہیں۔ چونکہ آیت سے اصل مقصود کم دینے کی مذمت ہے اس لئے اسمیں ناپ وتول دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ خوب تصریح ہو جائے کہ ایسے لوگ ناپ وتول دونوں میں کمی کرتے ہیں۔ اور چونکہ اپنا حق پورا لینا مدر مذمت نہیں اس لئے وہاں صرف ناپ ہی کا ذکر کردینا کافی ہوا۔ اور ناپ کو اسلئے اختیار کیا گیا کہ عرب میں زیادہ دستور ناپ (کیل) کا تھا خصوصًا مدینہ منورہ میں تو مکہ سے بھی زیادہ کیل کا رواج تھا (اگر آیت مدنیہ ہے)

ہر حق تلفی تطفیف میں داخل ہے:

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ تطفیف حرام ہے۔ قرآن پاک میں دوسرے مقامات سے بھی اس کی مذمت وحرمت معلوم ہوتی ہے۔ اور احادیث سے بھی۔ تطفیف سے مراد حق تلفی اور حقوق العباد میں کمی کرنا اور پنا حق پورا وصول کرنا دوسروں کے حقوق پورے ادا نہ کرنا ہے۔ لیکن چونکہ معاملات اور لین دین میں حق دار کے حق ادائیگی یا اس میں کمی بیشی انہی دو ذریعوں (وزن وپیائش) سے زیادہ تر معلوم ہوتی ہے اس لئے وزن (ناپ تول) کا ذکر کردیا گیا۔ ورنہ تطفیف صرف ناپ تول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہر حقدار کے حق میں کمی کرنا تطفیف میں داخل وحرام ہے محققین علماء نے اس سے یہی عام معنی مراد لئے ہیں۔ چنانچہ شیخ ابو القاسم قشیری وغیرہ اکابر سے منقول ہے کہ یہ لفظ وسیع المعنی ہے ناپ تول کی خیانت کو بھی شامل ہے اور ہر قسم کی خیانت وخست کو بھی۔ مثلاً اپنے عیوب چھپانا دوسروں کے ظاہر کرنا۔ اپنے لئے انصاف طلب کرنا دوسروں سے ناانصافی کرنا۔ اپنے عیبوں سے بے پروائی کرنا اور دوسروں کی عیب جوئی کرنا۔ دوسروں سے اپنی تعظیم چاہنا اور خود کسی کی تعظیم وتکریم نہ کرنا۔ خادموں، مزدوروں، نوکروں اور ملازموں سے خدمت اور کام تو خوب ٹھوک بجا کر لینا اور ان کو حق الخدمت اور تنخواہ واجرت کم دینا یا نوکروں، ملازموں اور مزدوروں کا کام اور خدمت میں کمی کرنا، سستی کرنا یا کم وقت لگانا، اپنے لئے جو پسند کرتا ہے وہ دوسروں کے لئے پسند نہ کرنا۔ اسی طرح

اللہ تعالیٰ سے عزت عافیت چاہنا اور اسکی عبادت وفرمانبرداری میں کوتاہی کرنا۔ اللہ کے لئے سوال کرنا اور خود اللہ کے لئے نہ دینا۔ اوروں کو نصیحت کرنا اور خود مبتلا رہنا یعنی قال درست اور حال برا رکھنا بزرگانہ صورت بنا کر باطن خراب رکھنا یا مکاری ریا کاری کرنا، یہ سب چیزیں تطفیف میں داخل ہیں۔ موطاء امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں رکوع وسجود میں کوتاہی کرتا اور نماز کو جلدی جلدی ختم کرڈالتا ہے۔ تو آپ نے اس کو فرمایا **لقد طففت** (تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کردی) فاروق اعظم کے اس قول کو نقل کر کے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا **لکل شئیءٍ وَفاءٌ تطفیف** (پورا کرنا اور کم کرنا ہر چیز میں ہے) یہاں تک کہ وضو، طہارت اور نماز میں بھی ہے حاصل یہ ہے کہ تطفیف حقوق العباد میں ہو یا حقوق اللہ میں، ہر حال میں مذموم وحرام ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں اہل علم میں بھی غفلت پائی جاتی ہے کہ وہ ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ (اعاذنہ اللہ منہ)

تطفیف کا وبال:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ گناہوں کی سزا پانچ چیزیں ہیں (۱) جو قوم عہد شکنی کرتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے دشمن کو اس پر مسلط کردیتے ہیں۔ (۲) جو قوم اللہ کے حکم کو چھوڑ کر دوسرے قوانین پر فیصلہ کرتی ہے۔ ان پر افلاس ضرور پھیلتا ہے۔ (۳) جس قوم میں بے حیائی اور بدکاری عام ہو جائے اس پر اللہ تعالیٰ طاعون (اور دوسرے وبائی امراض) مسلط کردیتے ہیں۔ (۴) جو لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگیں اللہ تعالیٰ انہیں قحط میں مبتلا کردیتے ہیں۔ (۵) جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان سے بارش روک دیتے ہیں۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں مال غنیمت میں چوری رائج ہو جائے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں دشمن کا رعب اور ہیبت ضرور ڈال دیتے ہیں۔ اور جس قوم میں سود عام ہو جاتا ہے اس میں موت کی کثرت ہو جاتی ہے۔ اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا رزق قطع فرمادیتے ہیں۔ اور جو لوگ حق کے خلاف فیصلے کرتے ہیں تو ان میں قتل وخونریزی پھیل جاتی ہے۔ جو لوگ عہد کو توڑتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر دشمن کو مسلط کردیتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کسی تاجر کے پاس گذرتے تو یہ فرماتے اللہ سے ڈر اور ناپ تول پوری کر۔ کیونکہ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو قیامت کے دن اس طرح کھڑا کیا جائیگا کہ پسینہ کی لگام ان کے منہ اور آدھے کانوں تک پہنچے گی۔ (یعنی وہ پسینہ میں غرق ہوں گے) (مظہری) حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر اسی گناہ (**تطفیف**) کی بناء پر عذاب نازل ہوا تھا حاصل یہ ہے کہ ناپ تول میں کمی کرنا۔ ڈنڈی مار کر لوگوں کو نقصان پہنچانا بڑا گناہ ہے جو دغا، مکر، خیانت، ظلم جیسی خباثتوں پر مشتمل ہے۔

افلاس کی مختلف صورتیں:

اوپر کی روایات سے معلوم ہوا کہ کم ناپنے تولنے والے لوگ فقروفاقہ، قحط وافلاس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ افلاس اور قطع رزق کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں (۱) ان کو رزق سے بالکل محروم کردیا جائے۔ (۲) رزق موجود ہو مگر امراض وغیرہ کی وجہ سے اس کے کھانے اور استعمال کرنے کی قدرت نہ ہو۔ اسی طرح قحط کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ چیزیں بالکل مفقود ہو

جائیں۔ یا موجود ہونے کی باوجود گرانی کی وجہ سے خریداری دشوار ہو جائے اور فقر وافلاس کا مطلب یہی نہیں کہ روپیہ پیسہ اور ضرورت کی چیزیں پاس نہ رہیں بلکہ فقر کے معنی دراصل محتاجی کے ہیں۔ ہر شخص اپنے کاروبار اور ضروریات زندگی میں دوسروں کا جتنا محتاج ہو وہ اتنا ہی فقیر ہے۔ اس زمانہ کے حالات پر غور کیا جائے تو انسان اپنے رہن سہن نقل وحرکت اور اپنے ارادوں بلکہ لقمہ اور کلمہ تک میں پابند اور قوانین میں جکڑا ہوا ہے۔ نہ تجارت میں آزاد نہ سفر میں آزاد، ہر کام میں دفتروں کے چکر، افسروں اور چپراسیوں کی خوشامدیں یہ سب حالات فقر ومحتاجی ہی کے تو ہیں۔ اس تفصیل سے وہ شبہات دور ہو جاتے ہیں جو مذکورہ احادیث میں ظاہری حالات کے اعتبار سے پیدا ہو سکتے ہیں (از معاف) الا یظن الخ کیا ایسی گندم نمائی جو فروشی کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں ایک بڑے سخت مصیبت کے دن عدالت خداوندی میں حاضر ہو کر جوابدہی کرنا ہے۔
یہاں الا میں ہمزہ استفہام انکاری کا ہے جس سے مقصود اہل تطفیف کے حال کو قابل تعجب بتانا اور ان کو زجر مقصود ہے۔
اور یقین کے بجائے ظن ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس کو آخرت میں حساب کا گمان بھی ہوگا وہ بھی ایسی ناشائستہ حرکتیں نہ کرے گا۔ جس سے وہ قیامت کے دن آفات میں مبتلا ہو جائے اور یقین رکھنے والا تو بدرجہ اولیٰ ایسی نازیبا حرکات سے احتیاط کریگا۔ لیوم عظیم ۔ اس میں لام علت کا ہے۔ یعنی یوم عظیم کے حساب کے لئے۔ یا ظرفیہ بمعنی فی ہے۔ اور یوم قیامت کو یوم عظیم اسلئے فرمایا گیا کہ وہ دن طویل ہوگا اور اس میں عظیم واقعات بھی رونما ہونگے۔ یوم یقوم الناس لرب العلمین ۔ اس یوم کا تعلق مبعوثون سے ہے۔ یعنی ان کو اس دن اٹھایا جائے گا جس دن لوگ بارگاہ خداوندی میں حساب کے لئے کھڑے ہونگے۔ یا یوم عظیم سے بدل ہے۔ اور اضافت الی غیر متمکن کی وجہ سے مفتوح ہے۔ لرب العلیمن ۔ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالی کی ربوبیت عامہ کا تقاضا یہی ہے کہ ہر صاحب حق کو اس کا پورا حق پہنچے۔ اور دنیا میں عدل وانصاف قائم ہو۔ اور صفت ربوبیت ہی کی بنا پر قیامت کے دن مظلوموں کے بدلے ظالموں سے لئے جائیں گے۔
درحقیقت انسانوں کو اگر مظالم سے کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ ہے آخرت کا تصور اور حساب کا یقین ہی ہے۔ ورنہ حکام وقت کی قانونی بندش یا اور کوئی ترغیب وترہیب ان کو سرکشی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جس قدر دنیا میں آخرت کا یقین واعتقاد کمزور ہوتا جائے گا۔ اسی مقدار میں جرائم بھی بڑھتے چلے جائے گے۔

منظر حشر الامان:

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے یوم یقوم الناس لرب العلیمن کی تفسیر میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے۔
وہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول پہنچا ہے کہ لوگ (محشر میں) تین سو برس کی مقدار میں کھڑے رہیں گے۔ (مظہری) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ قیامت کے دن تین سو برس مقدار میدان حشر میں کھڑے رہیں گے۔ اور ان کے لئے کوئی حکم نہ ہوگا۔ لیکن اتنی طویل مدت اہل ایمان کے لئے (دو رکعت) نماز کی برابر معلوم ہوگی (فتح العزیز)۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رب العلیمن کے سامنے اس دن لوگ کھڑے ہونگے جب کہ بعض لوگ اپنے پسینہ میں اپنے آدھے کانوں تک غرق ہوں گے۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ علیہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن لوگوں کو اتنا پسینہ آئے گا کہ زمین میں ستر باتھ تک پہنچ جائے گا۔ اور کانوں تک پسینہ کی لگام لگی ہوگی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ قیامت کے دن کافر کو اس کے پسینہ کی لگام لگی ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ کہے گا کہ، پروردگار! مجھے اس سے نجات دے۔

خواہ دوزخ ہی بھیج دے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن سورج مخلوق کے قریب آجائے گا۔ یہاں تک کہ ایک میل کے بقدر ہوگا۔ سلیم بن عامرؓ نے کہا۔ واللہ ہمیں معلوم نہیں کہ میل سے حضور کی مراد مسافت ہے یا سرمہ لگانے کی سلائی (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق پسینہ میں ہوں گے پسینہ بعضوں کے ٹخنوں تک، بعضوں کے گھٹنوں تک، اور بعضوں کے کمر تک ہوگا۔ اور بعض کو پسینہ کی لگام لگی ہوگی (یعنی منہ تک ہوگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے اپنے ہاتھ سے منہ کی طرف اشارہ کیا (مسلم) طبرانی میں ابوامامہ باہلی کی روایت میں اتنا اور ہے کہ سورج کی گرمی سے (پسینہ) میں کیڑے مکوڑے اسطرح ابال کھائیں گے جس طرح ہانڈی میں ابال آجاتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے کہ پیدائش سے (موت تک) موت سے زیادہ سخت تکلیف آدمی کو پیش نہیں آتی لیکن موت کے بعد مصیبتوں سے وہ آسان ہے۔ روز قیامت کی دہشت سے لوگوں کو ایسا پسینہ آئے گا کہ منہ تک لگام لگ جائے گی اگر کشتیاں اس میں چلائی جائیں تو چل جائیں۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس دن اتنی سختی ہوگی کہ حساب سے پہلے کافر کو پسینہ کی لگام لگ جائے گی۔ دریافت کیا گیا پھر مومن کہاں ہونگے۔ فرمایا سونے کی کرسیوں پر ابر کے سایہ تلے۔ ابن مسعودؓ کی روایت میں اتنا اور ہے کہ مؤمنوں کے لئے وہ پورا دن گھڑی بھر کا ہوگا۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے سلمان فارسی رضی اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن سورج لوگوں کے سروں کے قریب دو کمانوں کی مقدار (فاصلہ سے) ہوگا۔ اور اس میں دس سال کی گرمی ہوگی۔ اس دن کسی کے بدن پر کوئی پردہ نہ ہوگا۔ ہاں کسی مومن اور مومنہ کا ستر نہ دکھائی دے گا۔ اور نہ کسی مومن و مومنہ کو سورج کی گرمی ہی محسوس ہوگی۔ ہاں کافروں کو وہ گرمی خوب پکائے گی کہ ان کے اندر سے عق عق کی آواز سنائی دے گی۔ (**اللهم احفظنا منه**)

كَلَّا إِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ (۷) وَمَآ أَدْرٰكَ مَا سِجِّينٌ (۸) كِتٰبٌ مَّرْقُومٌ (۹)

ہرگز نہیں بے شک بدکاروں کا اعمالنامہ سجین میں رہیگا۔ اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ سجین کیا ہے؟ وہ ایک مہرزدہ دفتر ہے۔

كَلَّا	إِنَّ	كِتٰبَ	الْفُجَّارِ	لَفِي	سِجِّينٍ	وَ	مَآ	أَدْرٰكَ	مَاسِجِّينٌ	كِتٰبٌ مَّرْقُومٌ
ہرگز یوں نہیں	تحقیق	اعمال نامہ	بدکاروں	البتہ میں	سجین	اور	کس چیز	معلوم کروادیا تجھ	کیا ہے سجین	ایک دفتر لکھا ہوا

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۱۰) الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ (۱۱) وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖ إِلَّا كُلُّ

اس دن بڑی خرابی ہوگی جھٹلانے والوں کی۔ جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں۔ اور اس کو تو ہر

وَيْلٌ	يَّوْمَئِذٍ	لِّلْمُكَذِّبِينَ	الَّذِينَ	يُكَذِّبُونَ	بِيَوْمِ	الدِّينِ	وَ	مَا	يُكَذِّبُ	بِهٖ	إِلَّا	كُلُّ
وائے	اس دن	واسطے جھٹلانے والوں	وہ جو	جھٹلاتے ہیں	کو دن	جزا	اور	نہیں	جھٹلاتا	کو اس	مگر	ہر

مُعْتَدٍ أَثِيمٍ (۱۲) إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۱۳) كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى

حد سے گذرنے والا بدکار جھٹلاتا ہے جب اسکے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلوں کی بے سند کہانیاں ہیں ہرگز ایسا نہیں بلکہ

مُعْتَدٍ	أَثِيمٍ	إِذَا	تُتْلٰى	عَلَيْهِ	اٰيٰتُنَا	قَالَ	أَسَاطِيرُ	الْأَوَّلِينَ	كَلَّا	بَلْ	رَانَ	عَلٰى
حد سے نکل جانیوالا	گنہگار	جس وقت	پڑھی جاتی ہیں	اوپر اس	نشانیاں ہماری	کہتا ہے	کہانیاں	پہلوں	ہرگز نہیں	بلکہ	زنگ باندھا ہے	اوپر

قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (١٤) كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ (١٥)

ان کے دلوں پر ان کی بداعمالیوں کا زنگ چڑھ گیا ہے ۔ یقیناً وہ لوگ اس دن اپنے رب سے روک دیئے جائیں گے۔

قُلُوبِهِمْ	مَّا	كَانُوا	يَكْسِبُونَ	كَلَّآ	إِنَّهُمْ	عَن	رَّبِّهِمْ	يَوْمَئِذٍ	لَّمَحْجُوبُونَ
دلوں ان	اس چیز	تھے	وہ کماتے	ہرگز یوں نہیں	تحقیق وہ	سے	پروردگار اپنے	اس دن	البتہ حجاب میں

ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ (١٦) ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ (١٧)

پھر بے شک وہ دوزخ میں داخل ہوں گے ۔ پھر انے کہا جائے گا یہی ہے وہ جس کو تم جھٹلاتے تھے ۔

ثُمَّ	إِنَّهُمْ	لَصَالُوا	الْجَحِيمِ	ثُمَّ	يُقَالُ	هَٰذَا	الَّذِي	كُنتُم	بِهِ	تُكَذِّبُونَ
پھر	تحقیق وہ	البتہ داخل ہونے والے	دوزخ	پھر	کہا جائیگا	یہ	وہ چیز کہ	تھے تم	اس کو	جھٹلاتے

كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ (١٨) وَمَآ أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ (١٩) كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ (٢٠)

بے شک نیک لوگوں کا اعمال نامہ علیین میں رہے گا اور آپ جانتے ہیں کہ علیین کیا ہے ؟ وہ ایک مہر زدہ دفتر ہے

كَلَّآ	إِنَّ	كِتَٰبَ	الْأَبْرَارِ	لَفِي	عِلِّيِّينَ	وَ	مَآ	أَدْرَاكَ	مَا	عِلِّيُّونَ	كِتَٰبٌ	مَّرْقُومٌ
ہرگز یوں نہیں	تحقیق	اعمالنامہ	نیکوں	البتہ میں	علیین	اور	کس چیز	معلوم کروادیا تجھ	کیا ہے	علیون	دفتر	لکھاہوا

يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ (٢١)

جس کو مقرب فرشتے دیکھتے ہیں ۔

يَشْهَدُ	ه	الْمُقَرَّبُونَ
حاضر ہوتے ہیں	اس	مقرب

لغات:

فجار جمع فاجر کی جیسے کفار کی جمع کافر ہے بدکار مراد کافر ہے سجین قید خانہ۔ وہ مقام جہاں کفار کے اعمالنامے اور ان کی روحیں جمع ہیں۔ علیین وہ بلند مقام جہاں اہل ایمان کے اعمالنامے اور ان کی ارواح جمع ہیں (تفصیل عنوان تفسیر کے ذیل میں ہے) مرقوم صیغہ اسم مفعول لکھا ہوا۔ جلی خط سے لکھا ہوا، مہر لگی ہوئی تحریر (ن) لکھنا، نقش کرنا، ران (ض) زنگ آلودہ ہونا، رین زنگ، میل محجوبون صیغہ جمع مذکر اسم مفعول۔ روکے ہوئے (ن) روکنا، منع کرنا۔ صالوا اصالون تھا، نون بوجہ اضافت گر گیا۔ جمع مذکر اسم فاعل صلی یصلی (س) جلنا، آگ میں گرنا، داخل ہونا، المقربون جمع مذکر اسم مفعول۔ زیادہ معزز۔ قریب کئے ہوئے (س ک) نزدیک ہونا۔

ترکیب:

کلا حرف ردع (عما نوا علیہ من التطفیف والغفلۃ عن البعث والحساب) کتاب الفجار (مرکب اضافی اسم ان لفی سجین ۔ مثبت کے متعلق ہو کر خبر۔ جملہ اسمیہ۔ وما ادرلک ما سجین سورۃ انفطار کے اخیر میں ایسی ترکیب گذر گئی کتاب مرقوم مرکب توصیفی مبتدا محذوف ھو کی خبر۔ ویل الخ سورہ مرسلات میں اس کی

ترکیب گذرگئی (و الجملة متصلة برب العلمین وما بینهما اعتراض) الذین اسم موصول اپنے صلہ یکذبون بیوم الدین سے مل کر صفت المکذبین کی واؤ عاطفہ یا استینافیہ ابتدائیہ ما یکذب فعل الاحرف استثناء لغو کل معتد اثیم مرکب اضافی فاعل۔ جملہ فعلیہ۔ اذا ظرفیہ بمعنی شرط تتلی اپنے نائب فاعل اٰیٰتنا اور متعلق علیہ سے مل کر جملہ فعلیہ شرط قال فعل ضمیر ھو راجع معتدٍ اثیم کی طرف فاعل اسا طیر الا ولین مرکب اضافی مبتدا محذوف ھی کی خبر۔ جملہ اسمیہ مقولہ مفعول بہ۔ جملہ جزا ہوا۔ بل اضراب عن معنی کلا۔ ران فعل علی قلوبھم متعلق ما کا نو یکسبون (موصول وصلہ) فاعل۔ کلا بمعنی حقا اِن اپنے اسم ھم اور خبر لمجوبون سے مل کر جملہ اسمیہ عن ربھم ای عن رویة ربھم جار مجرور متعلق خبر ان کے اور یو مئذ بھی اسی کا ظرف ہے۔ ثم عاطفہ انھم...... ترکیب ظاہر ہے۔ ثم عاطفہ یُقَالُ فعل مجہول ضمیر نائب فاعل ھذا مبتدا الَّذِی اپنے صلہ کنتم ...... سے مل کر مقولہ بہ تکذبون کے متعلق ہے کلا ان کتب الا برار ...... تمام جملے مثل سابق ہیں۔

تفسیر:

کلا بجائے خود ایک مستقل کلام ہے جو مطففین کو جھڑکنے کے لئے لایا گیا ہے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کلا اس جگہ ابتدائیہ بمعنی حقا ہے۔

سجّین اور علّیین : سجین اور علیین حبس وقید کے معنی میں ہیں۔ قاموس میں ہے کہ یہ معنی دوامی و سخت قید کے ہیں کیونکہ فعیل کا وزن مبالغہ کے لئے مستعمل ہے۔ جیسے شریب (بہت پینے والا) فسیق (بڑا فاسق) عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سجین سے مراد ذلت و گمراہی ہے۔ مجازاً اعمال نامہ کو قید و ذلت قرار دیا ہے۔ درحقیقت کفار ان کے اعمال بد کی وجہ سے قید ذلت و گمراہی میں ہیں۔ جو ان کے اعمال نامہ میں مندرجہ ذیل ہیں۔ احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ سجین اس مقام کا نام ہے جہاں کفار کا رجسٹر ہے۔ یعنی ان کے اعمال نامے وہاں رکھے جاتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ کفار جن وانس کے اعمالناموں کی ایک کتاب (فائل) ہے جس میں ان کے سب اعمال نامے جمع کئے جاتے ہیں۔ اور کافروں کی روحیں بھی وہیں بند کر دی جاتی ہیں۔ سجین ساتویں زمین میں یا تو ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجین ساتویں زمین کے نچلے طبقہ میں ہے اور علیین ساتویں آسمان میں عرش کے نیچے ہے۔ حدیثوں میں ہے کہ سجین کفار و فجار کی روحوں کا مقام ہے۔ اور علیین مومنین متقین کی روحوں کی جگہ ہے۔

جنت اور دوزخ کا مقام:

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنت ساتویں آسمان میں ہے۔ اور جہنم ساتویں زمین میں ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ قرآن میں جو ﴿وجیءَ یومئذٍ بجھنم﴾ (قیامت کے دن دوزخ کو لایا جائے گا) اس کا مطلب کیا ہے۔ کہاں سے اس کو لایا جائیگا؟ آپ نے فرمایا کہ جہنم کو ساتویں زمین سے لایا جائے گا اس کی ہزار لگامیں ہوگی اور ہر لگام کو ستر ہزار فرشتے کھینچ رہے ہوں گے۔ جب وہ انسانوں سے ہزار برس کی دوری پر

رہ جائے گی تو ایک سانس کھینچے گی۔ جس سے ہر مقرب فرشتہ اور ہر نبی مرسل دوزانو بیٹھ کر رب نفسی نفسی کہے گا۔ (مظہری) اسی طرح روایات میں آیا ہے کہ سجین میں جہنم کے ایک مقام کا نام ہے وہ بھی اس پر منطبق ہے اور روایات متعارض نہیں۔

کتاب مرقوم ای کتاب مختوم یعنی مہر لگی ہوئی۔ امام بغویؒ وابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ یہ جملہ سجین کی تفسیر نہیں بلکہ کتاب الفجار کا بیان ہے یعنی کفار کے اعمال نامے سے مہر لگا کر مقام سجین میں محفوظ کر دیئے جاتے ہیں۔ جس سے کمی وبیشی کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ کلا بل ران علی قلوبھم۔ لفظ کلا سے معتدٍ اثیم کو تکذیب وغیرہ سے زجر ہے۔ ران ربن سے مشتق ہے جس کے معنی زنگ اور میل کے آتے ہیں۔ اور رسوخ اور غلبہ کے بھی آتے ہیں۔ رانت الخمر علی عقل شاربہ ای غلبت ران فیہ النوم ای رسخ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں نافرمانیوں کی محبت غالب وراسخ ہوگئی ہے۔ اور اعمال بد کا ان کے قلوب پر زنگ چڑھ گیا ہے۔ جس طرح آئینہ پر زنگ چڑھ جاتا ہے اور اس میں صورت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ان کے دل زنگ آلود دل تجلیات ربانی ومعرفت صمدانی سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور معاصی کی تاریکیوں نے حق وباطل کی تمیز سے ان کو محروم کر دیا ہے یا جس طرح زنگ آلود کو بے کار مٹی بنا دیتا ہے۔ اسی طرح گناہوں نے ان کے قلوب کی صلاحیتوں کو فنا کر دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے اور اس پر نادم وشرمندہ ہو کر آئندہ اپنے عمل کو درست کر لیتا ہے تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے۔ اور دل اپنی اصلی حالت پر چمکدار ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر توبہ نہیں کرتا بلکہ گناہ کرتا رہتا ہے تو وہ سیاہی اس کے دل پر پھیلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پورے دل کو گھیر لیتی ہے۔ یہی وہ ران ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے آیت کلا بل ران علی قلوبھم ما کانو یکسبون میں فرمایا ہے (احمد نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم) ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے (مظہری)

چار چیزیں دلوں کو خراب کرتی ہیں:

حدیث میں ہے کہ چار چیزیں دلوں کو خراب کرتی ہیں (۱) احمق سے جھگڑا کرنا۔ اگر اس سے لڑو گے تو تم بھی اسکے مثل ہو۔ خاموش رہو گے تو سالم رہو گے (۲) گناہوں کی کثرت بھی دلوں کو خراب کرتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: کلا بل ران علی قلوبھم ما کانو یکسبون ۔ (۳) عورتوں کے ساتھ خلوت واختلاط اور ان کی رائے پر عمل کرنا (۴) مردوں کے پاس بیٹھنا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مردے کون ہیں؟ فرمایا وہ مال دار لوگ جن کو ان کی مالداری نے اکڑ میں مبتلا کر دیا ہو۔ کلا اس سے ان جاہلوں کو زجر وتنبیہ ہے جنہوں نے اپنے گناہوں کے انبار میں مبتلا ہو کر اپنے دلوں کی فطری نورانیت وصلاحیت کو ایسا ختم کر دیا کہ حق وباطل کا امتیاز ہی ختم ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی تکذیب کسی دلیل یا عقل وفہم کی بنیاد پر نہیں۔ بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ان کے دل اندھے ہو چکے ہیں۔ انہیں بھلا برا کچھ نظر نہیں آتا۔ ومن کان فی ھذا اعمی فھو فی الاخرۃ اعمی (جو اس دنیا میں اندھا اور نور معرفت سے محروم ہے تو وہ آخرت میں بھی اندھا اور دیدار خداوندی سے محروم ہوگا) چنانچہ ارشاد ہے کلا انھم عن ربھم یومئذٍ لمحجوبون یعنی قیامت کے دن یہ کفار اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے وار پس پردہ روک دیئے جائے گے۔

ہر کہ امروز نہ بیند اثر قدرت دوست　　غالب آنست کہ فرداش نہ بیند دیدار

بعض مفسرین نے اس مذکورہ لفظ کلا کو بمعنی **حقا** مانا ہے۔

فوائد:...... (۱) بعض اکابر علمانے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ ہر انسان فطرۃ حق تعالی سے محبت کرتا ہے۔ کفار ومشرکین کفر وشرک میں مبتلا ہونے کے باوجود اور عقائد باطلہ واعمال فاسدہ رکھنے کے باوجود اتنی سی بات سب میں مشترک ہے کہ حق تعالی کی عظمت ومحبت سب کے دلوں میں ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اسی کی جستجو اور رضا جوئی کے لئے عبادت کرتے ہیں۔ راستہ غلط ہوتا ہے اسلئے وہ منزل مقصود تک رسائی سے محروم رہتے ہیں۔ اور اس کو دلیل بنانے کی وجہ یہ ہے کہ اگر کفار اللہ کی محبت اور اسی کی زیارت کا شوق ان کے دلوں میں نہ ہوتا تو ان کی سزا میں یہ نہ کہا جاتا کہ وہ لوگ زیارت ودیدار سے محروم رہیں گے کیونکہ جو شخص کسی کی زیارت ودید کا طالب ومشتاق ہی نہیں اس کے لئے یہ کوئی سزا نہیں کہ اس کو دیدار سے روک دیا جائے۔

(۲) حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وحضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان واولیاء اللہ کو حق تعالی کا دیدار ہوگا۔ ورنہ تو مومنوں اور کافروں میں فرق ہی کیا ہوا؟ کفار کے محجوب رہنے کی سزا کا ذکر ہی عبث ہوا (نعوذ باللہ) (۳) احادیث متواترہ المعنی سے یہ بات ثابت ہے کہ مومنوں کو دولت دیدار نصیب ہوگی۔ ہاں درجات کے اعتبار سے اس نعمت دیدار میں بھی تفاوت ہوگا۔ عام مومنوں کو جمعہ کے دن دیدار ہوا کریگا۔ (آخرت میں جمعہ کا نام یوم **المزید** ہوگا) اور خواص کو روزانہ دوبار صبح وشام دیدار ہوگا۔ اور جو شخص الخواص (جنت عدن والے ہونگے ان کو ہر آن یہ دولت نصیب ہوگی) (**اللھم جعلنا منھم بفضلک**)

ثم انھم لصالوا ...... ان دونوں آیتوں میں بتلایا گیا ہے کہ ان بدنصیبوں کو صرف محرومی دیدار ہی سزا نہیں ملے گی۔ بلکہ ان کو جہنم رسید بھی کیا جائے گا جس میں انواع واقسام کے عذاب ہوں گے۔ ان میں سے ایک سزا یہ بھی ہوگی کہ ان کو ذلیل ورسوا کیا جائے گا۔ اور ان کی شرمندگی وندامت بڑھانے کے لئے جتلایا جائے گا کہ یہ وہی عذاب ہے جس کو تم دنیا میں جھٹلاتے رہے۔ **کلا** بمعنی **حقا** بھی درست ہے۔ اور اس کو حرف ردع ماننا بھی ٹھیک ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ تم تکذیب سے باز آجاؤ اور ایمان وعمل صالح کو عبث خیال نہ کرو کہ نیکوں کو یہ انعامات حاصل ہونگے جن کا آئندہ تذکرہ ہے۔ علاوہ ازیں فجار کی سزا کو کلا سے ذکر کیا تو ابرار کی جزا بھی اسی لفظ سے شروع کرنے میں کلام میں ایک عجیب مناسبت وقوت پیدا ہوجاتی ہے۔

ان کتب الابرار لفی علیین ...... **علیین** اس دفتر کا نام ہے جہاں صلحاء کے اعمال اور ان کے ارواح رہتی ہیں۔ یہ **عِلّیٌّ** بروزن **سجین** (فعیل) کی جمع ہے۔ جو عُلُوٌّ سے مشتق ہے۔ سمی بذالك اما لانہ سبب الارتفاع الی اعالی درجات الجنان او لانہ، مرفوع فی السماء السابعة اوعندقائمة العرش الیمنی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ **مواضع علیہ** (بلند مقامات) اس سے مراد ہیں علیہ کی تاء کو حذف کرکے واؤ اور نون (علامت جمع) اس پر لائے گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ملائکہ کا وصف ہے۔ اس لئے واؤ نون کے ساتھ جمع لائی گئی۔ فراءؒ کہتے ہیں کہ یہ عشرون وثلاثون وغیرہ کی طرح صیغہ جمع ہے۔ اس کا واحد نہیں۔ اور اہل عرب میں جو جمع ایسی ہوتی ہے جس کا واحد نہیں ہوتا۔ اس کا اطلاق مذکر مونث دونوں پر واؤ نون کے ساتھ ہوتا ہے۔

سوال:......سجین کے برعکس علیین کو صیغہ جمع سے تعبیر کرنے میں اس کی فراخی وکشادگی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ایک مکان بہت سی مخلوق کے ازدھام سے تنگ وتاریک ہوجاتا ہے۔اور ہر ایک کیلئے ایک مکان اور وہ بھی بلند ہوتو کشادہ وفراخ ہوتا ہے الحاصل سجین وعلین کا مقابلہ لفظا اور معنی دونوں طرح سے ہے۔

کتاب مرقوم :......جس طرح ماقبل میں کتابٌ مَرْقُوْمٌ سجین کی تفسیر نہیں بلکہ کتاب الفجار کا بیان تھا اسی طرح یہ بھی علیین کی تفسیر نہیں بلکہ کتاب الابرار کا بیان ہے۔

یشهدُهُ المقربون :...... یشهدُ شهود سے متعلق ہے جس کے معنی حاضر ہونے۔مشاہدہ کرنے،اور گواہ بننے کے آتے ہیں۔یعنی مقرب لوگ وہاں حاضر رہتے ہیں۔یا گواہ ہوتے ہیں یا مشاہدہ، دیکھ بھال اور نگرانی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ملائکہ مقربین ابرار وصالحین کے اعمال ناموں کی نگرانی کرتے ہیں۔یا ان پر گواہ ہوتے ہیں۔اس صورت میں یہ معنی ہونگے کہ مقربین بارگاہ خداوندی (یعنی ملائکہ اور ابرار کی ارواح) اسی مقام علیین میں حاضر ہوتے ہیں۔کیونکہ ارواح ابرار کا مستقر یہی ہے۔جس طرح سجین ارواح کفار فجار کا مستقر ہے۔اسکی دلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت ہے (جو صحیح مسلم میں ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہداء کی ارواح اللہ تعالیٰ کے قریب سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی۔جو جنت کے باغات اور نہروں کی سیر کرتی ہوں گی۔اور ان کے رہنے کی جگہ وہ قندیل ہوں گے جو عرش میں لٹک رہے ہیں۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شہیدوں کی روحیں عرش کے نیچے رہتی ہیں۔اور جنت کی سیر کرتی ہیں سورۂ یسین میں حبیب نجار رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں آیا ہے قیل ادخل الجنة قال یلیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی اس سے معلوم ہوا کہ حبیب نجار موت کے ساتھ ہی جنت میں داخل ہونگے بعض احادیث سے بھی مومنوں کی روحوں کا جنت میں ہونا معلوم ہوتا ہے ان سب کا حاصل ایک ہی ہے۔کہ نیکوں کی روحوں کا ٹھکانہ علیین ہے۔ جو ساتویں آسمان پر عرش کے نیچے ہیں (جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے) اور یہی مقام جنت کا بھی ہے۔ان ارواح کو جنت کی سیر کا اختیار دیا گیا ہے۔بلکہ تمام مومنوں کی روحوں کا مستقر ومرکز یہی ہے۔جیسا کہ کعب بن مالک رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: انما نسمة المومن طائر یعلق فی شجر الجنة حتی مومن کی روح ایک پرندہ کی شکل میں جنت کے درختوں میں معلق رہتی ہے ترجع الی جسده یوم القیمة (رواۃ مالک النسائی) یہاں تک کہ قیامت کے دن وہ اپنے جسم میں پھر لوٹ جائے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ علیین زمرد وسبز کی ایک تختی ہے جو عرش کے نیچے آویزاں ہے۔ مومنوں کے اعمال اس میں لکھے ہوئے ہیں۔اس اثر کی بنا پر لوگوں نے کہا ہے کہ علیین وہ رجسٹر ہے جس میں نیکوں کے اعمال درج ہیں۔کعب وقتادہ فرماتے ہیں کہ علیین عرش کا داہنا پایہ ہے عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ علیین جنت ہے۔عطاء وضحاک رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ وہ سدرۃ المنتہی ہے۔واللہ اعلم

انسانی روحوں کا مقام کہاں ہے؟

اس معاملے میں احادیث وروایات بظاہر متعارض ہیں۔(۱) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی روحیں سجین میں رہتی ہے جو ساتویں زمین میں ہے۔اور مومنوں کی روحیں علیین میں رہتی ہیں جو ساتویں آسمان پر عرش

کے نیچے ہیں۔ (۲) دوسری بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ارواح کفار جہنم میں اور ارواح مومنین جنت میں رہتی ہیں۔ (۳) اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد مومنین کفار ہر دو قسم کے لوگوں کی روحیں ان کی قبروں میں رہتی ہیں۔ حافظ ابن البر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ بعد الموت سب کی ارواح قبر ہی میں رہتی ہیں۔

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روح کی دو قسمیں ہیں ایک جسم لطیف ہے جو انسان کے بدن میں حلول کرتا ہے اور وہ مادی وعنصری جسم ہے۔ مگر لطیف ہونے کیوجہ سے نظر نہیں آتا۔ اسکو نفس کہتے ہیں۔ دوسری روح جوہر مجرد ہے۔ جو مادی وعنصری نہیں۔ یہ روح مجرد ہی روح اول (نفس) کی حیات ہے۔ اسی لئے اسکو روح الروح بھی کہتے ہیں۔ جسم انسانی سے ان دونوں روحوں کا تعلق ہوتا ہے۔ مگر پہلی قسم کی روح (نفس) جسم انسانی کے اندر رہتی ہے۔ اس کے اس کے جسم سے نکل جانے کا نام ہی موت ہے۔ دوسری قسم کی روح (روح الروح یا روح مجرد) کا تعلق پہلی روح (نفس) سے قریب تو ہے لیکن اس تعلق کی حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ مرنے کے بعد روح اول آسمانوں پر لے جائی جاتی ہے۔ پھر قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اس کا مسکن ومستقر قبر ہی ہے۔ اور اسی پر عذاب وثواب ہوتا ہے۔ اور روح مجرد مومن کی علیین میں اور کافر کی سجین میں رہتی ہے۔ اور تحقیق پر تمام روایات جمع ہو جاتی ہیں۔ جن روایات سے ارواح کا مستقر علیین وسجین معلوم ہوتا ہے وہ روح مجرد کے اعتبار سے ہے۔ اور جن روایات سے جنت اور جہنم میں ہونا معلوم ہوتا ہے تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ مقام علیین اور مقام جنت دونوں ساتویں آسمان پر عرش کے نیچے واقع ہیں۔ قرآن پاک میں اس کی تصریح ہے: عند سدرۃ المنتھی عندھا جنۃ الماوی اس میں صاف ہے کہ جنت سدرۃ المنتہی کے پاس ہے اور سدرۃ کا ساتویں آسمان میں ہونا حدیث معراج سے ثابت ہے۔ اسی طرح سجین ساتویں زمین میں ہے اور وہی مقام جہنم بھی ہے اسی لئے جن روایات میں علیین یا جنت وجہنم میں ارواح کا رہنا معلوم ہوا اس میں کوئی تعارض نہیں۔ اور جن روایات سے ارواح کا قبر میں رہنا معلوم ہوتا ہے وہ روح کا قسم اول یعنی نفس کے اعتبار سے ہے لیکن قسم ثانی (روح مجرد) کا روح کی قسم اول (نفس) کے ساتھ ایک خاص رابطہ رہتا ہے (جس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے مگر) اس کی مثال آفتاب و ماہتاب کی سی ہے کہ وہ آسمان میں ہیں۔ مگر ان کی شعاعیں زمین پر پڑ کر اس کو روشن کر دیتی ہیں۔ اسی طرح مجرد کا مقام گو علیین ہے۔ مگر اسکا رابطہ معنویہ قبروں میں رہنے والی روح (نفس) سے ہو سکتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم۔ (مظہری)

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ (۲۲) عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ (۲۳) تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ

بے شک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ مسہریوں پر بیٹھے نظارہ کیا کریں گے۔ تم ان کے چہروں میں

اِنَّ	الْاَبْرَارَ	لَفِیْ	نَعِیْمٍ	عَلَی	الْاَرَآئِكِ	یَنْظُرُوْنَ	تَعْرِفُ	فِیْ	وُجُوْهِهِمْ
تحقیق	نیک کام کرنیوالے	البتہ میں	نعمت	اوپر	تختوں	دیکھتے ہوں گے	پہچانے گا تو	میں	چہروں ان

نَضْرَةَ النَّعِیْمِ (۲۴) یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۲۵) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَ فِیْ ذٰلِكَ

عیش کی تروتازگی دیکھو گے۔ ان کو ایسی شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہو گی۔ اور

نَضْرَةَ	النَّعِیْمِ	یُسْقَوْنَ	مِنْ	رَّحِیْقٍ	مَّخْتُوْمٍ	خِتٰمُهٗ	مِسْكٌ	وَ	فِیْ	ذٰلِكَ
تازگی	نعمت	پلائے جائینگے	سے	شراب خالص	مہر کی ہوئی	مہر کرنیکی چیز اس	مشک	اور	میں	اس

فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۶) وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ (۲۷) عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۸)

حرص کرنے والے کو ایسی ہی چیز میں حرص کرنی چاہئے۔ اور اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب حضرات پیا کریں گے۔

فَلْیَتَنَافَسِ	الْمُتَنَافِسُوْنَ	وَ	مِزَاجُهٗ	مِنْ	تَسْنِیْمٍ	عَیْنًا	یَّشْرَبُ	بِهَا	الْمُقَرَّبُوْنَ
پس چاہئے کہ رغبت کریں	رغبت کرنیوالے	اور	ملونی اس	سے	تسنیم	ایک چشمہ	پیتے ہیں	میں سے اس	مقرب

لغات:

رحیق ۔شراب ناب، وہ صاف شراب جس میں ذرا آمیزش نہ ہو، ایک قسم کی خوشبو مِسْکٌ رَحِیْقٌ خالص مشک یہ اسم جامد ہے مختوم اسم مفعول کا واحد مذکر ختام لگا ہوا یعنی مہر زدہ۔ ختام کا ترجمہ دو طرح کیا گیا ہے۔ (۱) مہر کرنے کا مسالہ (۲) کسی چیز کا خاتمہ۔ اس لئے اکثر مفسرین نے مختوم کا ترجمہ مہر زدہ لکھا ہے۔ یعنی جنت کی شراب کے برتنوں پر اللہ کی طرف سے بطور اعزاز سند مہر لگی ہوگی۔ جس کو اہل جنت ہی توڑیں گے۔ لیکن ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ مختوم وہ رحیق (شراب کہنہ صاف) ہوگی جس کے اخیر میں مشک کی خوشبو ہوگی۔ اس قول پر ختام بمعنی اخیر ہوگا۔ ختم ختما و ختماً (ض) مہر لگانا، ختم کرنا، ختام کی جمع ختم آتی ہے مِسْکٌ اسم بمعنی مشک، کستوری (ن ص) چمٹنا (ک) ایضا۔ امسک روکنا۔ مشک ایک خاص ہرن کا خون ہوتا ہے جو اسکی ناف میں جمع ہوتا ہے۔ اس ہرن کو عربی میں غزال المسک کہتے ہیں۔ اور مشک کے ٹکڑے کو مسکۃ کہتے ہیں۔ تنافس ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کسی چیز کی رغبت کرنا۔ کسی نفیس چیز میں ایک دوسرے کے مقابلے میں بڑھ کر میلان کرنا۔ مادہ نفس ہے۔ جس کے معنی کشائش، فراخی اور وسعت ہیں۔ اس سے نفیس بے معنی عمدہ، اعلی، بیش و قیمت، مرغوب ہے۔ (ک) نفیس ہونا۔ مرغوب ہونا۔ مزاج مصدر ہے۔ ملاوٹ کرنا، ملانے کی چیز، ملاوٹ کے بعد جو ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو بھی مزاج کہتے ہیں۔ یہاں ملانا یا ملانے کی چیز (شراب میں پانی) مراد ہے۔ (ن) ملانا۔ تسنیم جنت میں ایک چشمہ کا نام ہے تسنیم لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو خوشبو یا ذائقہ کیلئے شربت یا پانی میں ملاتے ہیں۔ جیس گلاب یا کیوڑا وغیرہ یا بید مشک وغیرہ ہے۔ یہ سنام سے ماخوذ ہے جس کے معنی کوہان شتر کے ہیں۔ چونکہ پینے کی چیزوں میں اشیاء مذکورہ ڈالنے سے برتن میں اونٹ کے کوہان کی طرح بلبلے اٹھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس لئے اسکو تسنیم کہتے ہیں۔ یہاں بہشت کا ایک چشمہ مراد ہے۔ جو نہایت لذیذ ہے اس کو مقربین و سابقین خالص پئیں گے۔ اور اصحاب الیمین کی شراب میں بطور گلاب یا مشک ملا کر دیا جائیگا۔

ترکیب:

ان الابرار لفی نعیم ۔اس کی ترکیب سورۃ الانفطار میں گذرگئی۔ علی الارائک متعلق جالسین محذوف کے ہو کر خبر انّ الکائنون کی ضمیر سے حال اوّل اور ینظرون جملہ فعلیہ حال ثانی ہے۔ اور جملہ ینظرون انّ کی خبر ثانی بھی ہو سکتا ہے۔ تَعْرِفُ فعل اپنے فاعل مخاطب، متعلق فِیْ وُجُوْهِهِمْ اور مفعول بہ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ (مرکب اضافی) سے مل کر جملہ فعلیہ ینظرون کی ضمیر سے حال یا ان کی تیسری خبر (اگر ینظرون پر وقف نہ کریں) ورنہ تو جملہ مستانفہ اور فما یکون شانهم سوال مقدر ہوگا۔ یُسْقَوْنَ اپنے نائب فاعل، ضمیر متعلق مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ

سے مل کر جملہ فعلیہ نضرۃ النعیم کا بیان ہے (اگر النعیم پر وقف نہ کریں) ورنہ تعرف کے مثل ہے۔ ختمہ مبتدا مسک خبر۔ یہ جملہ اسمیہ رحیق کی صفت ثانیہ ہے۔ فی ذلک فعل یتنافس کے متعلق ہے اور تقدیم برائے تخصیص ہے) اور فاء تفریعیہ ہے۔ المتنافسون فاعل جملہ فعلیہ۔ مزاجہ مبتدا (ۂ ضمیر رحیق کی طرف راجع ہے) من تسنیم خبر ہے اور من تبعضیہ یا ابتدائیہ ہے عینا منصوب علی المدح ہے۔ یا تسنیم سے حال ہے (کیونکہ وہ بمنزلہ مفعول ہے) یشرب اپنے متعلق اور فاعل سے (بالترتیب) مل کر جملہ فعلیہ نعت ہوگا عیناً کی۔

تفسیر:...... ان الابرار الخ سابقہ آیات میں مرنے کے بعد سے دوسرے صور کے پھونکے جانے تک کے حالات (عالم برزخ) کا ذکر تھا۔ یہاں تک عالم آخرت کے احوال کا بیان ہے۔ یا سابق میں اعمال ناموں کا ذکر تھا۔ ان آیات میں نامہ اعمال والوں کا تذکرہ ہے کہ ان کو عالم آخرت میں کیا کیا عطا ہوگا۔

لفظ نعیم ہر قسم کی نعمتوں کو شامل ہے اور علی الارآئک میں اہل جنت کی عظمت وشوکت کا بیان ہے۔ دنیا میں اپنی آرام گاہ یا تخت سلطنت پر رہتے ہوئے انسان دنیا کے نظاروں سے محروم رہتا ہے۔ لیکن جنت مزین مسہریوں پر بیٹھ کر بھی سیر وسیاحت کا لطف اٹھائیں گے۔ وہ وہیں سے تمام نظاروں سے محظوظ ہوا کریں گے۔ ینظرون کا مفعول بہ محذوف ہے۔ اکثر مفسرین نے فرمایا کہ مطلب یہ کہ وہ اس عزت وعظمت کا مشاہدہ کرے گے کو ان کو حق تعالی کی طرف سے عطاء ہوئی ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اپنے دشمنوں کو عذاب دوزخ میں مبتلا دیکھنا مراد ہے۔ صاحب مظہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دیدار خداوندی مراد ہے۔ یعنی وہ اللہ کو دیکھیں گے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ینظرون کے مفعول کو تعمیم کیلئے حذف فرمایا گیا۔ یعنی وہ جو چاہیں گے اور جہاں چاہیں گے دیکھیں گے۔ تعرف یعنی ان کے چہروں پر نعمتوں کی شادابی اور تازگی نظر آئے گی۔ ایک طرف تو ہر قسم کی راحتوں اور نعمتوں کی خوشی دوسری طرف دشمنوں (دوزخیوں) کی ذلت وبربادی کی مسرت نورٌ علی نورٌ ہوگی یسقون من رحیق ...... یعنی ان کو جنت کی سفید اور صاف شفاف شراب پلائی جائے گی۔ جس میں دنیوی شراب کی طرح، بدبو، تلخی، خمار دردسر، اور بے ہوشی وبدحواسی جیسے عیوب نہ ہوں گے۔ نہایت پر لطف ہوگی۔ اور ایسی مبتذل نہ ہوگی کہ ہر کس وناکس کا ہاتھ اس پر پہنچے گا۔ بلکہ مہرزدہ ہوگی اور مہر بھی دینوی مہر کی طرح مٹی وغیرہ کی نہ ہوگی۔ بلکہ مشک جنت کی مہر ہوگی۔ جس کی خوشبو اس شراب میں بھی بسی ہوگی۔ اور پینے والے کے دل ودماغ میں پینے سے پہلے ہی اسکی خوشبو نشاط پیدا کردے گی۔

بعض مفسرین نے ختام کے معنی اخیر کے کئے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اخیر میں پینے والے کو اس میں مشک کی خوشبو محسوس ہوگی۔ یا پینے والے کے منہ سے مشک کی خوشبو مہکے گی۔ ممکن ہے کہ اس شراب کے بعد پینے والوں کو کوئی فرحت بخش اور خوشبودار چیز کھانے کے لئے دی جائے جس کو مشک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسا کہ دنیا میں کھانا کھانے یا چائے وغیرہ پینے کے بعد الا ئچی اور پان وغیرہ کھاتے ہیں۔ اور انہیں چیزوں کو کھانے پینے کا ختام سمجھا جاتا ہے۔

وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔ تنافس کے معنی چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب ومحبوب چیز کو حاصل کرنے کے لئے جھپٹنا، دوڑنا، جن میں سے ہر ایک کا جذبہ یہ ہو کہ وہ اس چیز کو دوسروں سے پہلے حاصل کرلے۔ یہاں پر اللہ تعالی نے جنت کی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہوئے غافل انسانوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ تم دنیا میں جن چیزوں کو مرغوب ومحبوب سمجھ کر ان کے حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کررہے ہو۔ یہ چیزیں ناقص وفانی نعمتیں اس قابل

نہیں ہیں کہ ان کو مقصود زندگی بنا کر ان کیلئے مسابقت کرو۔ بلکہ اگر ایثار وقناعت سے کام لے کر یہ سمجھ لو کہ یہ چندروز سامان راحت اگر نہ بھی حاصل ہو سکا تو کوئی خسارہ کی بات نہیں۔البتہ تنافس اور مسابقت جنت کی ان باقی اور دائمی نعمتوں میں کرنا چاہیے جو ہر طرح کامل ومکمل ہیں۔اور حقیقی عیش ونشاط،ابدی راحت وانبساط انہیں نعمتوں میں ہے جو جنت میں حاصل ہونگی۔اکبر الہ آبادی فرماتے ہیں۔

یہ کہاں کا فسانہ ہے سود زیاں جو گیا سو گیا، جو ملا سو ملا
کہو ذہن سے فرصت عمر ہے کم جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

وَمزاجه من تسنیم ......قرآن پاک میں جا بجا نیک لوگوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک **اصحاب الیمین** کی جماعت دوسری **السابقون** کی جماعت۔ پھر بعض مقامات پر **اصحاب الیمین** کو **ابرار** سے اور **سابقون** کو مقربین سے تعبیر کیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوا ہے کہ **اصحاب الیمین** اور **ابرار** ایک جماعت کے دو نام ہیں۔اسی طرح **سابقین** اور **مقربین** بھی ایک جماعت کے دو نام ہیں۔پہلی جماعت میں صلحاء وشہدائے امت داخل ہیں دوسری میں صدیقین وانبیاء علیہم السلام داخل ہیں۔اور اچھے لوگ انہی چار قسم کے ہیں (نبیین،صدیقین،شہداء اور صالحین) جماعت ابرار کو پینے کیلئے **رحیق** یعنی شفاف وخالص شراب دی جائے گی۔اور مقربین کو نہر تسنیم سے سیراب کیا جائیگا۔ہاں ابرار کی شراب میں نہر تسنیم کی شراب بھی ملائی جائیگی۔تا کہ اس کا لطف دوبالا ہو سکے۔جیسا کہ دنیا کی شراب میں لطف مزید کے لئے گلاب وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔

نہر تسنیم :......تسنیم کے معنی بلندی کے ہیں سنم (س) سے ماخوذ ہے۔بلندی ہی کی وجہ سے اونٹ کے کوہان کو سنام کہتے ہیں اس لغوی معنی کے لحاظ سے مفسرین کے تسنیم کے بارے میں چند اقوال ہیں:(۱) چشمہ تسنیم اوپر سے نیچے گرتا ہے ایسا چشمہ اس چشمہ کی بہ نسبت جو ہموار زمین پر بہتا ہے۔زیادہ صاف اور پر لطف ہوتا ہے۔(۲) وہ چشمہ فضائے جنت میں بہتا ہے۔اس کے ارتفاع وبلندی سے اسکی لطافت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔(۳) اس کے بلند مرتبہ ہونے اور عالی مرتبت لوگوں کا مشروب ہونے کیوجہ سے اس کا نام تسنیم ہے۔(۴) ابن عباس رضی اللہ عنہم اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی حقیقت سے پروردگار عالم ہی واقف ہے۔اتنا معلوم ہے کہ وہ نہایت عمدہ وبے بہا نعمت ہے جو خاص طور پر مقربین کا مشروب بنے گی۔**عینا یشرب بها المقربون** یہ تسنیم کی تشریح ہے۔**عینا** کا نصب امدح یا اعنی مقدر کی بنا پر ہے یا تسنیم سے حال ہے۔اور **بها** بمعنی منها ہے یا یَشْرَبُ یَلْتَذ کے معنی کو متضمن ہے۔جس کا صلہ باء آتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا کَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ (۲۹) وَاِذَا مَرُّوۡا بِهِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ (۳۰)

بے شک جو لوگ نافرمان تھے وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے۔اور جب وہ ان کے پاس سے گذرتے تو وہ آنکھیں مارتے تھے۔

اِنَّ	الَّذِیۡنَ	اَجۡرَمُوۡا	کَانُوۡا	مِنَ	الَّذِیۡنَ	اٰمَنُوۡا	یَضۡحَکُوۡنَ		اِذَا	مَرُّوۡا	بِهِمۡ	یَتَغَامَزُوۡنَ
تحقیق	وہ لوگ جو	گنہگار ہیں	تھے	سے	ان لوگوں کہ	ایمان لائے	ہنستے	اور	جب	گزرتے تھے	ساتھ ان	آنکھیں مارتے تھے

وَاِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَهۡلِهِمُ انۡقَلَبُوۡا فَکِهِیۡنَ (۳۱) وَاِذَا رَاَوۡهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ

اور جب لوٹ کر اپنے گھر جاتے تو دل لگی کرتے ہوئے لوٹتے۔اور جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یقیناً یہ لوگ

وَ	اِذَا	انۡقَلَبُوۡا	اِلٰی	اَهۡلِهِمُ	انۡقَلَبُوۡا	فَکِهِیۡنَ	وَ	اِذَا	رَاَوۡ	هُمۡ	قَالُوۡا	اِنَّ هٰؤُلَآءِ
اور	جب	پھر جاتے تھے	طرف	لوگوں اپنے	پھر جاتے تھے	باتیں بناتے	اور	جب	دیکھتے تھے	ان	کہتے تھے	تحقیق یہ لوگ

لَضَآ لُّوْنَ (۳۲) وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ (۳۳) فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ

بہکے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ لوگ مسلمانوں کے نگران بنا نہیں کر بھیجے گئے ۔سو آج ایمان والے کافروں

اَلْكُفَّار	مِنَ	اٰمَنُوْا	الَّذِیْنَ	فَالْیَوْمَ	حٰفِظِیْنَ	عَلَیْهِمْ	اُرْسِلُوْا	مَا	وَ	لَضَآ لُّوْنَ
کافروں	سے	ایمان لائے ہیں	ایمان لوگ کہ	وہ لوگ پس آج	نگہبان	ان پر	بھیجے گئے	نہیں	اور	البتہ گمراہ

یَضْحَكُوْنَ (۳٤) عَلَى الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ (۳٥) هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (۳٦)

پر ہنس رہے ہیں۔ درانحالیکہ مسہریوں پر بیٹھے ہوئے (ان کا حال) دیکھ رہے ہیں ۔کیا کافروں کا ان کی کرتوتوں کا بدلہ خوب مل گیا

یفعلون	كَانُوْا	مَا	الْكُفَّار	ثُوِّبَ	هَلْ	یَنْظُرُوْنَ	الْاَرَآئِكِ	عَلَى	یَضْحَكُوْنَ
کرتے	تھے	اس چیز	کافر	بدلہ دیئے گئے	کیا	دیکھتے ہیں	تختوں	اوپر	ہنستے ہیں

لغات:

یضحکون جمع مذکر غائب (س) ہنسنا، تعجب کرنا، خوش کرنا، ہونا، مروا ایضا (ن) گذرنا۔ **یتغامزون** باب تفاعل سے جمع مذکر غائب۔ آنکھوں سے اشارہ کرنا۔ **غمز غمزا** (ض) ٹٹولنا۔ ابرو سے اشارہ کرنا۔ عیب یا مرض کا ظاہر ہونا۔ طعنہ دینا وغیرہ۔ **انقلبوا** ایضا پلٹنا، واپس ہونا۔ **قلب قلبا** (ض) پلٹ دینا **فکھین** صیغہ جمع مذکر اسم فاعل۔ **فکیہ فکھا وفکاھۃ** (س) خوش طبع (ہنسنے ہنسانے والا) تعجب کرنا، راحت پانا، **ثوب** واحد مذکر غائب مجہول تفعیل سے بدلہ دینا ثاب ثوبا (ن) لوٹنا۔ جمع ہونا۔

ترکیب:

الذین اسم موصول اپنے صلہ **اجرموا** (جملہ فعلیہ) سے مل کر ان کا اسم **کانو** فعل ناقص ضمیر جمع غائب اسم **یضحکون** اپنے فاعل ضمیر غائب اور متعلق مقدم **من الذین امنوا** سے مل کر جملہ فعلیہ خبر انّ (**وقدم المعتلق للقصر والراعاۃ الفواصل**) **واذا مروابھم** فعل متعلق سے مل کر شرط (فعل مرّوا کی ضمیر **الذین اجرمو** سے عائد ہے۔ اور بھم کی ضمیر **الذین امنو** کی طرف راجع ہے اور اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ **یتغامزون** فعل فاعل جملہ فعلیہ جزا (اس کی ضمیر فاعل دونوں مذکورہ صورتوں میں **الذین اجرموا** ہی کی طرف راجع ہے) جملہ شرطیہ جزائیہ ماقبل پر معطوف ہے۔ **واذا انقلبو الی اھلھم** فعل فاعل (ضمیر غائب) اور متعلق سے ملکر جملہ فعلیہ شرط **انقلبوا** (فعل ضمیر غائب فاعل **فکھین** ضمیر فاعل سے حال۔ جملہ فعلیہ جزا ماقبل پر عطف **واذا راوھم** فعل فاعل مفعول بہ جملہ فعلیہ شرط **قالوا** فعل فاعل جملہ فعلیہ قول **ان ھؤلاء لضالون** جملہ اسمیہ مقولہ جزا مثل سابق معطوف وحالیہ **ما ارسلوا** فعل مجہول معہ نائب فاعل **علیھم** متعلق **حفظین ارسلوا** کی ضمیر سے حال ہے۔ جملہ فعلیہ حال ہے ضمیر **قالوا** سے۔ **فالیوم** فاء تفریعیہ **الیوم** اس **یضحکون** کا ظرف ہے جو بعد میں آرہا ہے **الذین امنوا** اسم موصول وصلہ مبتدا **یضحکون** اپنے فاعل وظرف مذکور اور متعلق مقدم **من الکفار** سے مل کر جملہ فعلیہ خبر۔ مبتدا وخبر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔ **علی الارآئک** جالیسن مقدر کے متعلق **یضحکون** کا حال اول **ینظرون** جملہ فعلیہ حال ثانی ہے۔ ھل

استفہامیہ ثوب فعل مجہول الکفار نائب فاعل ما کانو یفعلون جملہ فعلیہ مفعول ثانی۔ جملہ فعلیہ ینظرون مذکور کی ضمیر سے حال ہے اگر یہ مقولہ مومنین ہے ای حال کو نہم قائلین لکفار هل جوزوا لخ اور اگر اللہ تعالیٰ کا مقولہ ہے مومنین کو تو وہ معطوف ہے ماسبق پر بحذف العاطف ای یقول الله للمومنین یوم القیمة هل جوزوا الخ

تفسیر:

ان آیات کا ربط ماقبل کی آیات سے بالکل ظاہر ہے کہ ان میں ان نیک بندوں کے انجام وانعام کا ذکر تھا۔ جن کے اعمالنامے علیین میں تھے۔ اور ان میں ان کفار کے بد کا ذکر تھا جو اہل سجیین ہیں۔ چنانچہ اول ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل حق کے ساتھ اہل باطل کے طرز عمل کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ پھر ان کے طرز عمل کی سزا کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان مجرموں کا بنیادی جرم دنیا کی محبت اور اس پر فریفتگی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نہ صرف اطاعت حق سے غافل ہوئے بلکہ اطاعت کیش لوگوں پر ہنستے تھے اور ان کو اذیت پہنچانے کے لئے ان کا مذاق بناتے تھے۔ اور اہل ایمان ان کے سامنے سے گذرتے ہیں تو ایک دوسرے کو آنکھ کے اشارے کرتے تھے جس سے ان کا مقصد ایذارسانی واستہزا ہوتا ہے۔ پھر جب یہ کفار اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس ہوتے تھے تو بھی ان کا مشغلہ مسلمانوں سے تمسخر کرنا اور مذاق اڑانا ہی ہوتا تھا۔ یا یہ معنی ہے کہ یہ لوگ اپنے گھروں میں آخرت سے غافل رہ کر اٹھکھیلیاں ہی کرتے ہیں۔ اور باخدا لوگ مغموم وفکرمند رہتے ہیں۔ ان کو اٹھکھلیوں کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ الگ اپنی تجھے اٹھکھیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

اور جب کفار مومنین کو دیکھتے ہیں تو اظہار ہمدردی کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ بے چارے سادہ لوح اور بے وقوف ہیں ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بہکا کر گمراہ کر دیا ہے۔ یہ آخرت کی نعمتوں کے چکر میں پڑ کر مصیبت میں ایسے پھنس گئے ہیں ان کی دنیا تلخ اور بدمزہ ہو کر رہ گئی ہے۔ دور حاضر میں نئی تعلیم کے شیدائیوں کا یہی طرز عمل بھی علماء وصلحاء کے ساتھ اسی انداز کا ہے۔ مگر اہل ایمان کیلئے ان آیات میں کافی تسلی کا سامان موجود ہے۔ اس لئے وہ مجرموں کے ہنسنے کی ہرگز پرواہ نہ کریں۔

تم تفسیر سورة التطفیف فالحمد لله العلی اللطیف وصلی الله تعالی علی البنی الامی الحنیف و علی اله وصحبه وعلی کل مومن قوی وضعیف

سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاق

سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاقِ مَکِّیَّۃٌ وَّ ھِیَ خَمْسٌ وَّ عِشْرُوْنَ اٰیَۃً

(رکوع:۱،آیات:۲۵،) سورۃ انشقاق مکہ میں نازل ہوئی اوراس میں پچیس آیات ہیں (کلمات:۱۰۷،حروف:۴۲۰)

ربط ومناسبت:

یہ سورۃ بالاتفاق مکیہ ہے ربط ومناسبت ہم ماقبل میں ذکر کر چکے ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ انفطار میں اعمال ناموں کے لکھنے کا ذکر ہے اورسورۃ کا ذکر ہے۔اورسورہ مطففین میں عالم برزخ کے دفترعلیین اورسجین میں اعمال ناموں کی حفاظت کا ذکر ہے۔اوراس سورت میں قیامت کے دن اعمال نامے ہاتھ میں دیئے جانے کا بیان ہے۔اوراگرغورکیا جائے تواس سورت میں جملہ مضامین سورت سابقہ کےتمام مضامین سے نہایت مربوط ہیں۔مثلاً وہاں ویل للمطففین اور ویل للمکذبین ہےتویہاں فملاقیہ ہے۔وہاں اعمالناموں کا ذکر ہےتویہاں بھی ہےوہاں تکذیب کفارکا واذا تتلیٰ میں ذکر ہےتویہاں بھی واذا قری الخ میں تکذیب کفارہی کا ذکر ہے۔وہاں لصالو ا الجحیم ہےتویہاں یصلی سعیرا ہےوہاں اہل نجات کی نضرت ونعمت وغیرہ کا ذکر ہےتویہاں بھی ان کی مسرت کا بیان ہےوغیرہ۔اگرغورکیاجائےتو پورےقرآن مقدس میں سابق ولاحق میں اسی اندازکاربط ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے نام سےشروع کرتاہوں جوبہت مہربان بےحدرحم والا ہے

اِذَاالسَّمَآءُ (١) وَاَذِنَتْ لِرَبِّھَا وَحُقَّتْ (٢) وَاِذَاالْاَرْضُ مُدَّتْ (٣)

جب آسمان پھٹ جائے گا او راپنے رب کا حکم سن لے گا اور اس کو یہی زیباہے۔اور جب زمین کھینچ دی جائے گی۔

اِذَا	السَّمَآءُ	انْشَقَّتْ	وَ	اَذِنَتْ	لِرَبِّھَا	وَ	حُقَّتْ	وَ	اِذَا	الْاَرْضُ	مُدَّتْ
جس وقت	آسمان	پھٹ جائے	اور	کان رکھے	واسطے پروردگاراپنے	اور	وہ اسی لائق ہے	اور	جب	زمین	کھینچی جائے

وَاَلْقَتْ مَا فِيْھَا وَتَخَلَّتْ (٤) وَاَذِنَتْ لِرَبِّھَا وَحُقَّتْ (٥) يٰاَيُّھَا الْاِنْسَانُ

اور وہ اپنے اندر کی چیزوں کوباہر ڈال دے گی۔ اور اپنے رب کا حکم سن لے گی اور اسی کو یہی لائق ہے اے انسان

وَ	اَلْقَتْ	مَا	فِيْھَا	وَ	تَخَلَّتْ	وَ	اَذِنَتْ	لِرَبِّھَا	وَ	حُقَّتْ	يٰاَيُّھَا	الْاِنْسَانُ
اور	ڈال دے	جوکچھ	میں اس	اور	خالی ہوجائے	اور	کان رکھے	واسطے پروردگاراپنے	اور	وہ اسی لائق ہے	اے	آدمی

اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (٦)

توکھٹاکھٹ اپنے رب کیطرف چلاجارہاہے پس تواس سے جاملے گا۔

اِنَّكَ	كَادِحٌ	اِلٰى	رَبِّكَ	كَدْحًا	فَمُلٰقِيْهِ
تحقیق تو	محنت کرنیوالا	طرف	پروردگاراپنے	خوب محنت کرنا	پس ملنے والا اس

لغات:

اذنت واحد مونث غائب ماضی اذن اذنا (س) سننا، کان لگانا، حقت ایضاً مجہول (وہ ثابت کی گئی وہ اسی لائق ہے) اسی لائق بنائی گئی۔ حق حقا و حقه (ن ض) ثابت ہونا، واجب ہونا۔ مُدَّت ایضاً مَدَّ مَدّاً (ن) کھینچنا، پھیلانا، دراز کرنا قلم میں روشنائی لینا وغیرہ۔ القت ایضاً باب افعال سے۔ ڈال دینا (س) ملنا، ملاقات کرنا۔ تخلت ایضاً تفعل سے۔ تنہائی میں رہنا، فارغ ہونا، چھوڑنا۔ خلا خُلوا و خلاءً (ن) خالی ہونا بس کرنا۔ کادِح واحد مذکر اسم فاعل کدحا مصدر (ف) محنت کرنا، کمائی کرنا، مشقت اٹھانا، ملقیه واحد مذکر اسم فاعل ہ ضمیر۔ ملاقاة مصدر باب مفاعلة ملاقات کرنا۔

ترکیب:

اذا السماء انشقت سورۂ انفطار و تکویر کے شروع میں اس جیسی ترکیب گذر گئی۔ اذنت فعل ضمیر فاعل لربها (ای لا مر بها) متعلق جملہ فعلیہ ماقبل کا معطوف وحقت جملہ فعلیہ معترضہ۔ افعال ثلاثہ مذکورہ کی ضمیر السماء کی طرف لوٹتی ہے۔ واذا الارض مدت مثل سابق۔ والقت فعل ضمیر فاعل ما موصولہ یا موصوفہ فیها متعلق محذوف ثبت یا ثابتا کے ہوکر صلہ یا صفت۔ موصول وصلہ یا مرکب توصیفی مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ اپنے سے پہلے جملہ کا معطوف وتخلت جملہ فعلیہ معطوف واذنت لربها جملہ فعلیہ معطوف وحقت مثل سابق جملہ معترضہ۔ مذکورہ پانچوں افعال کی ضمیر الارض کی طرف عائد ہے۔ اور اذا الارض الخ کا اذا السماء الخ پر عطف۔ معطوفین شرط اور جواب شرط محذوف ای علمت نفس ما قدمت واخرت او ما احضرت۔ اویکون ما یکون اولا قی الا نسان عمله او فملاقيه (ای فانت ایها الانسان ملاق جزاء عملک ان خیرا فخیر وان شرا فشر) اونقسم الا نسان الیٰ قسمین قسم فی الجنة وقسم فی العسير. اوفا ما من ہ او فیقول الله یا یها الا نسان ہ وغیرہ احتمالات مذکورہ میں سے کوئی یا ان کے علاوہ جواب شرط مقدر مان لیں۔ یا یها الا نسان ندا۔ (مر مثلہ فی الانفطار) انک کادح الخ جملہ جواب ندا ہے۔ الی ربک کادح کے متعلق کدحا مفعول مطلق ہے۔ ف تفریعیہ ملقیه مرکب اضافی۔ اس میں ضمیر کدحا کی طرف لوٹتی ہے۔ یا ربک کی طرف) خبر مبتدا محذوف انت کی۔

تفسیر:

اس سورت میں احوال قیامت، حساب کتاب، جزاؤ سزاء کا ذکر ہے۔ اور غافل انسان کو اپنے گرد و پیش کے حالات میں غور کرنے کی دعوت نیز ان سے عبرت حاصل کر کے ایمان باللہ و ایمان بالقرآن تک پہنچنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ ان مذکورہ آیات میں قیامت کے دن پیش آنے والے حادثات کو بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی آسمان کا بامر خداوندی پھٹ جانا، زمین کے اوپر سب چیزیں پہاڑ وغیرہ ہٹ کر زمین کا ہموار میدان اور وسیع ہو جانا اور خزائن و دفائن یا مردہ اجسام انسانی کو اگل دینا وغیرہ۔ یہ بیان دوسری سورتوں میں مختلف عنوانات سے مذکور ہے یہاں پر و اذنت لربها وحقت کا اضافہ ہے یعنی آسمان اور زمین حکم خداوندی کو سن کر اسکی اطاعت کریں گے۔ اور ان کو ایسا کرنا مناسب بھی ہے۔ کہ وہ حکم کی تعمیل کریں کیونکہ وہ ممکن ہیں اور اپنے وجود و بقاء میں اس کے محتاج ہیں۔ ان کے باوجود و بقاء اس کے نزدیک دونوں یکساں ہیں۔ وہ جب چاہے ان کو نیست و نابود کر دے۔

احکام خداوندی کی دو قسمیں:

احکام الہیہ دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) تشریعی (۲) تکوینی۔ تشریعی احکام تو شرعی قوانین ہیں۔ جن کے ذوی العقول یعنی جن وانس مکلف ہوتے ہیں ان کی تعمیل پر جزا اور خلاف ورزی پر سزا مرتب ہوتی ہے۔ مگر مکلفین کرنے نہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتے۔ ان کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ تعمیل کرے یا خلاف ورزی۔ یہیں سے جن وانس کی دو قسمیں مومن ومطیع اور کافر وعاصی نکل آتی ہیں۔ اور تکوینی احکام کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان میں مامورین کو اختیار بالکل نہیں ہوتا۔ بلکہ سرمو کسی کو خلاف ورزی کرنے یا دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کی تعمیل تمام مخلوقات پر جبری ہوتی ہے ان احکام تکوینی کا دوسرا نام تقدیر یا احکام تقدیری بھی ہے۔

ذرہ ذرہ دہر کا پابستہء تقدیر ہے زندگی کے خواب کی جامی تقدیری بھی ہے

اب یہ سمجھئے کہ زمین وآسمان کے سننے اور ماننے میں دونوں باتیں محتمل ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ ان کو شعور وادراک عطا فرما کر مکلف بنادیں اور ان کو تبدل وتغیر کا حکم دیں۔ اور وہ پورے طور پر مطیع وفرمانبردار ثابت ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حکم تکوینی ہو جس میں آسمان وزمین مجبور محض ہوں۔ لیکن اول معنی الفاظ اذنت اور حقت کے زیادہ مناسب ہیں۔ اور دوسرے معنی بطور درست ہوسکتے ہیں۔ واللہ اعلم

انقلاب کی وجوہات:

(۱) محشر کے لئے ایک نئی وسیع وعریض زمین تیار ہوگی جس پر نہ کوئی عمارت ہوگی نہ کوئی غار، پہاڑ اور نشیب وفراز۔ اور دنیا کا دستور ہے کہ تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہے۔ اس لئے اس عالم کی پرانی عمارت کو ختم کردیا جائے گا۔ پھر دوسرے عالم (حشر) کی تعمیر ہوگی (۲) ایسے دلائل عقلیہ ونقلیہ امکان قیامت وثبوت قیامت پر موجود ہیں کہ وہ ایک مشاہد شئی کیطرح ہے۔ اور جب ایسا ہے تو عبرت ونصیحت اور معرفت قدرت خداوندی کا یہ ایک عظیم باب ہے۔ فافہم (۳) اہل ایمان اس جہاں کے مہمان ہیں۔ جب مہمان چلے گئے دسترخوان لپیٹ دیا جاتا ہے اہل ایمان کے ایک عرصہ تک رہنے کا مکان یہ دنیا ہے (کفار تو ان کے طفیل میں رہتے ہیں) ظاہر ہے کہ جب مکین نہ رہے گا تو مکان ویران ہوجائے گا اور پھر ختم ہوجائیگا۔
(۴) علویات (سورج ستارے وغیرہ) کی پرستش کرنے والوں اور سفلیات (اشجار واحجار وغیرہ) کے پجاریوں پر ان کے معبودوں کے بے بسی ومجبوری کا اظہار ہوگا۔ تاکہ ان کو حماقت وبے عقلی پر ندامت وشرمندگی ہو۔

وحقت یعنی آسمان کے لئے حکم کی اطاعت ہی حق اور لائق ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ وہ ممکن ہے اور ممکن واجب ومرجع بن کر مشیت کے تابع ہوتا ہے اس لئے واجب کی اطاعت کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں ہوسکتا۔ یہی مطلب ثانی حقت کا ہے اور چونکہ اول سے آسمان کی اطاعت کا اظہار مقصود ہے۔ اور ثانی سے زمین کی اطاعت کا۔ اس لئے تکرار لازم نہ آئیگا۔

تنبیہ:...... انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک جسم دوسری چیز روح ہے۔ انسان کی روحانیت جوہر آسمان سے مناسبت ومشابہت رکھتی ہے یعنی جسطرح آسمان محفوظ چھت ہے (وجعلنا السماء سقفا محفوظا) قیامت تک اس میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ اسی طرح روح بھی محفوظ وغیر فانی ہے۔ اسی طرح وہ آسمانی شئی ہے وہیں سے آتی

ہے اوراس کی ضروریات بھی آسمان سے آتی ہیں۔ کیونکہ روح امـر رب ہے۔ اوراوامر خداوندی سے (جن کا نزول آسمانو ں سے ہوتا ہے) اس روح کی تربیت و پرورش ہوتی ہے۔ اسی طرح جسم خاک سے برآمد ہوا ہے۔ اس کی غذا وضروریات بھی وہیں سے آتی ہیں۔ باری تعالی نے آسمان وزمین کے متعلق فرمایا کہ وہ ہمارا حکم سن کر اس کی اطاعت کریں گے۔

و اذنت لـربها وحقت معلوم ہوا کہ انسان کی روح اور اسکے جسم کا فطری تقاضا یہ ہے کہ امر رب کو سن کر اس کی اطاعت کریں۔ مگر افسوس کے زمین وآسمان تو بایں کمال قوت وعظمت امر سن کر اطاعت کیلئے آمادہ ہیں۔ اور انسان باوجود ضعف وکمزوری نہ حکم رب سننے کے لئے تیار ہے نہ ماننے کے لئے آمادہ ہے۔

وا ذا الا رض مـــدت ۔ چونکہ بروز حشر زمین پر ساتوں آسمانوں کے فرشتے، حاملان عرش، دیگر تمام مخلوقات اور جن وانس اور اولین آخرین سب جمع ہوں گے۔ اسلئے زمین کو کھینچ کر وسیع کیا جائیگا۔ دوسری وجہ اس کو کھینچنے کی یہ بھی ہوگی کہ بلندی وپستی، پہاڑ اور غار سب ہموار ہوجائیں گے۔ اونچا نیچا نہ رہے اور کوئی آڑ باقی نہ رہے۔ جیسے بچھونے اور فرش کو کھینچنے سے عموماً یہی دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک وسعت وفراخی دوسرے ہمواری وبرابری۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن زمین کو اسی طرح کھینچ کر پھیلایا جائیگا جس طرح چمڑے (یا ربڑ) کو کھینچ کر بڑھایا جاتا ہے۔ مگر وسیع کردینے کے باوجود میدان حشر (جو اس زمین پر ہوگا اور اس میں اولین وآخرین سب جمع ہوں گے اس) میں ایک آدمی کے حصہ میں صرف اتنی جگہ ہوگی کہ اس پر اس کے پاؤں رہیں۔ (رواہ الحاکم بسند جید مظہری)۔

والـقت ما فيها وتخلت . **ما فيها** سے مراد دفینے، خزینے، مردے اور معادن ہیں۔ ایک بھونچال سے یہ سب چیزیں زمین سے باہر آپڑیں گی۔ **كما قال تعالى اذا زلزلت الا رض** الخ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت **اذا السـمـاء انشقت** کی تفسیر میں فرمایا کہ زمین پھٹنے پر سب سے پہلے جو شخص اس سے نکلے گا وہ میں ہوں گا۔ میں اپنی قبر میں (اٹھ کر) بیٹھ جاؤں گا میرے سر سے آسمان تک ایک دروازہ کھل جائے گا اور عرش تک مجھ کو دکھائی دے گا۔ پھر میرے نیچے کی جانب ایک دروازہ کھولا جائے گا کہ ساتویں زمین تک مجھ کو نظر آجائے گی۔ اور تری تک میں دیکھ لوں گا۔ پھر دائیں طرف ایک دروازہ کھولا جائے گا کہ میں جنت دیکھ لوں گا اور مجھ کو اپنے ساتھیوں کے مکانات نظر آجائیں گے اور مجھ سمیت زمین ہلنے لگے گی تو میں کہونگا اے زمین تجھے کیا ہوگیا؟ زمین جواب دے گی کہ میرے مالک نے حکم دیا ہے کہ میرے اندر جو کچھ بھی ہے کہ اسے باہر پھینک دوں اور خالی ہوجاؤں لہذا جیسے پہلے (خالی) تھی ایسی ہوجاؤں گی اسی کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ **والـقـت ما فيها وتخلت** (رواه ابو القاسم الختلى فى الديبا ج بسند جيد)

ابن المنذر نے اپنی تفسیر میں آیت **والـقت** الخ کے بارے میں ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ زمین سونے کے ستون (باہر پھینک دے گی) یعنی زمین میں جو خزانے مدفون ہونگے۔ ان کو زمین باہر پھینک دے گی۔ انھی کی ایک اور روایت سے معلوم ہوا کہ **مـافيهـا** کا مصداق مردہ اجسام ہیں (مظہری) اور آیت کو عموم پر رکھنا اولی ہے **يـا يهـا الانـسـان** مخاطب انسان کون ہے؟ اس میں مفسیرین کے کئی قول ہیں (۱) فرد کامل یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم (۲) فرد ناقص۔ یعنی انسان کافر (۳) مطلق انسان (۴) تمام انسانوں کو خطاب ہے۔ اخیر معنی زیادہ چسپاں ہیں احتمالات زیادہ درست ہیں۔ اور ہر اک احتمال پر ادنی غور سے مطلب واضح ہوجائیگا۔

آج جو کچھ بوئے گا کاٹے گا کل:

اس آیت شریفہ میں حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو خطاب فرما کر غور وفکر کی ایسی راہ دکھائی ہے کہ ادنیٰ عقل وشعور رکھنے والا انسان بھی اپنی جدوجہد کا رخ صحیح سمت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ اس آیت شریفہ میں چند امور قابل غور ہیں۔ (۱) اس میں ایک بات تو یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ ہر نیک اور بد انسان اپنی فطرت سے محنت کا عادی ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے مقصد قرار دے کر اسکے لئے جدوجہد اور محنت برداشت کرتا ہے۔ اگر ایک نیک اور شریف آدمی اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے فطری طریقوں کو اختیار کرتا ہے۔ تو ایک بدکار انسان بھی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اپنی توانائی صرف کرتا ہے۔ خواہ وہ غیر فطری اور ناجائز طریقوں کو اختیار کرتا ہے۔ جیسے چور، ڈاکو، بدمعاش، لوٹ کھوسٹ میں ذہنی وجسمانی زبردست محنت کرتے ہیں۔ انک کادح میں اسی طرف اشارہ ہے۔ (۲) دوسری بات یہ بتلائی گئی ہے کہ عاقل انسان اگر غور کرے تو اس کی حرکات وسکنات بلکہ اس کی سانسیں وہ قدم ہیں جن سے وہ سفر کر رہا ہے یا شب روز اسی سواری کے دو پہیئے ہیں جن پر یہ بے اختیار اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا سفر کی منزلیں ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہر انسان تیز گامی کے ساتھ بارگاہ خداوندی کی طرف جا رہا ہے۔ الی ربک میں اسی کا بیان ہے۔ (۳) آیت میں اسی طرف بھی اشارہ ہے کہ بارگاہ الٰہی میں حاضری ہوگی اور ہر جدوجہد ومحنت کا حساب اور سزا یا جزا ضرور سامنے آئے گی۔ تا کہ اچھے برے اعمال کے نتائج رونما ہو کر عدل وفضل کا مشاہدہ ہو جائے۔ جو عقل وانصاف کی رو سے ضروری ہے۔ (۴) آسمان وزمین اس کے باوجود کہ وہ گراں اور سخت ہیں۔ اور محنت وجد جہد ان کی فطرت نہیں۔ نیز ثواب وعذاب سے انہیں کوئی سروکار نہیں اللہ کے مطیع ہیں۔ اور اے انسان تیری فطرت میں جدوجہد بھی ہے اور تیرے لئے ثواب وعذاب بھی ہے تو تجھ کو بدرجہ اولیٰ اللہ کے احکام سن کر اللہ کا مطیع وفرمانبردار ہونا چاہیے۔

فملقیہ اس کی ضمیر کدحا کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔ تو معنیٰ یہ ہونگے کہ اے انسان آج تو جو محنت وجدوجہد کر رہا ہے اپنے رب کے پاس پہنچ کر تو اسی کا بدلہ اور پھل پائیگا۔ اسمیں دوسرا احتمال یہ ہے کہ رب کیطرف لوٹائی جائے تو معنیٰ یہ ہونگے کہ اے انسان تو اپنے رب سے جا ملے گا۔ اور اسکی بارگاہ میں حساب کتاب کے لئے پیش ہوگا۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ (۷) فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا (۸) وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰٓی

پھر جس کا نامہ اعمال اسکے داہنے ہاتھ پر دیا جائیگا۔ تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ اور وہ

فَاَمَّا	مَنْ	اُوْتِیَ	کِتٰبَهٗ	بِیَمِیْنِهٖ	فَسَوْفَ	یُحَاسَبُ	حِسَابًا	یَّسِیْرًا	وَّ	یَنْقَلِبُ	اِلٰی
پس اہر	جو کوئی	دیا گیا	اعمالنامہ	بیچ داہنا ہاتھ اپنے	پس عنقریب	حساب کیا جائیگا	حساب کرنا	آسان	اور	پھر آئیگا	طرف

اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۹) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ (۱۰) فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا (۱۱)

متعلقین کی طرف خوش وخرم واپس آئیگا اور جس شخص کا اعمالنامہ اسکی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائیگا تو وہ موت کو پکاریگا

اَهْلِهٖ	مَسْرُوْرًا	وَ	اَمَّا	مَنْ	اُوْتِیَ	کِتٰبَهٗ	وَرَآءَ	ظَهْرِهٖ	فَسَوْفَ	یَدْعُوْا	ثُبُوْرًا
لوگوں اپنے	خوش	اور	اہر	جو کوئی	دیا گیا	اعمالنامہ اپنا	پیچھے	پیٹھ اپنی	پس البتہ	پکارے گا	ہلاکی

وَّيَصۡلٰى سَعِيۡرًا(۱۲)اِنَّهٗ كَانَ فِىۡۤ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا(۱۳)اِنَّهٗ ظَنَّ اَنۡ لَّنۡ يَّحُوۡرَ(۱۴)

اور دوزخ میں جائیگا کیونکہ وہ اپنے اہل وعیال میں بے فکر رہتا تھا۔ بے شک اس نے یہ خیال کررکھا تھا کہ وہ واپس نہ ہوگا۔

وَيَصۡلٰى	سَعِيۡرًا	اِنَّهٗ	كَانَ	فِىۡ	اَهۡلِهٖ	مَسۡرُوۡرًا	اِنَّهٗ	ظَنَّ	اَنۡ	لَّنۡ يَّحُوۡرَ
اورداخل ہوگا	آگ	بیشک وہ	تھا	میں	اپنے اہل	خوش وخرم	بیشک اس	گمان کیا	کہ	ہرگز نہ لوٹے گا

بَلٰىۤ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيۡرًا(۱۵)

کیوں نہیں ہوگا۔ یقیناً اس کا رب اس کو خوب دیکھ رہا تھا۔

بَلٰى	اِنَّ رَبَّهٗ	كَانَ	بِهٖ	بَصِيۡرًا
یوں نہیں	تحقیق اسکا رب	تھا	اسکو	دیکھنے والا

لغات:

یحاسب واحد مذکر غائب مضارع مجہول۔ باب مفاعلة سے حساب لینا۔ حسابات کی جانچ کرنا۔ باب مفاعلة مغالبہ یعنی شرکت کے لئے آتا ہے۔ اور جہاں مغالبہ مراد ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ مجرد میں (ن) سے شمار کرنا (س، ح) گمان کرنا (ک) شریف الاصل ہونا۔ یسیراً آسان یسر ایسراً (ض) نرم ہونا، مطیع ہونا، **مسروراً** واحد مذکر اسم مفعول (ن) خوش کرنا۔ ظھر؛ پیٹھ۔ ج اظھر وظھور وظھران ۔ظھر ظھارۃً (ن) مضبوط پیٹھ والا ہونا۔ ظھراً (س) پیٹھ میں شکایت ہونا۔ ظھوراً (ف) ظاہر ہونا۔ ثبوراً ہلاکت، موت، ثبر ثبراً ہلاک کرنا، دھتکارنا، محروم کرنا، لعنت کرنا، **یحور** (ن) لوٹنا (س) العین سفیدی وسیاہی کا بہت سفید وسیاہ ہونا۔

ترکیب:

فا ما من اوتی کتبه بیمینه (مثلہ مر فی الحاقۃ) ف جزائیہ۔ **سوف یحاسب** اپنے نائب فاعل ضمیر غائب **حسابا یسیرا** (مرکب توصیفی) مفعول مطلق سے مل کر فعلیہ خبر مبتدائے مذکور (من معہ صلہ) قائم مقام جزا۔ **وینقلب** فعل ضمیر غائب فاعل **الی اهله** متعلق **مسرورا** ضمیر فاعل سے حال۔ جملہ فعلیہ جملہ **یحاسب** پر معطوف **وراء ظهره** مرکب اضافی اوتی کا ظرف۔ جملہ فعلیہ من کا صلہ۔ موصول وصلہ ماقبل کی طرح مبتدا قائم مقام شرط۔ **فسوف یدعوا ثبورا** فعل فاعل مفعول بہ جملہ فعلیہ معطوف علیہ **ویصلی سعیرا** فعل فاعل مفعول فیہ۔ جملہ فعلیہ معطوف۔ معطوفین ماقبل کیطرح خبر قائم مقام جزا۔ **انه کان فی اهله مسرورا** مثل ماقبل جملہ فعلیہ خبر ان پھر یہ جملہ اسمیہ مستانفہ علت ماقبل بیان کرنے کے لئے ہے۔ انہ حرف مشبہ بہ فعل معہ اسم **ظن** فعل ضمیر غائب فاعل ان مخففہ من المثقلہ واسمہ محذوف یعنی ضمیر الشان **لن یحور** فعل ضمیر غائب فاعل جملہ فعلیہ خبر ان۔ جملہ اسمیہ ظن کے دو مفعولوں کے قائم مقام۔ جملہ ظن خبر ان۔ اور یہ جملہ اسمیہ بھی ہے استینافیہ تعلیلیہ ہے۔ بلی نفی ماقبل کے ایجاب کے لئے ہے ان کا اسم ربہ ہے **کان** اپنے اسم ضمیر رب کی طرف راجع بہ متعلق اور **بصیرا** خبر سے مل کر جملہ فعلیہ خبر۔ ان اپنے اسم سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ۔ رجوع کو ثابت کرنے کی علت ہے۔ ای بلی یحود الیه البته والحور الرجوع مطلقاً ومنه قول الشاعر

وما المرء الّا کالشهاب وضوئه یحور ما دا بعد ذهو ساطع

تفسیر:

فَاَمَّا مَنْ اس میں مومنوں کا حال بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کے داہنے ہاتھ میں اعمال نامے دیئے جائیں گے ۔اوران سے آسان حساب ہوگا۔ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کے حساب یسیر کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حساب یسیر یہ ہے کہ بندہ کواس کوانس کا اعمالنامہ دکھادیں گے۔اور آئے گی ۔اے میرے مسلمان بندے جوتو نے عبادت کی میں نے قبول کرلی۔اور جوتجھ سے خطا سرزرد ہوئی وہ میں نے درگذرکردی۔اورجس سے پوچھ گچھ ہوگی اس کو عذاب دیا جائے گا۔(کیونکہ بندہ گناہ کا کوئی عذر پیش نہ کرسکے گا) بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من حوسب یوم القیمة عذب یعنی قیامت کے دن جس سے حساب لیا جائے گا وہ عذاب سے نہ بچ سکے گا۔اس پر حضرت صدیقہؓ نے سوال کیا کہ کیا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے فسوف یحاسب حسابایسیرا پھر حساب فہمی کے لئے عذاب کس طرح لازم ہے) آپ نے ارشادفرمایا (کہ جس کا ذکرآیت میں ہے وہ درحقیت مکمل حساب نہ ہوگا بلکہ (وہ تو صرف ایک پیشی ہو گی۔اورجس سے پوراپوراحساب لیاجائے گا وہ عذاب سے بچ نہ سکے گا۔

وینقلب الی اهله مسرورا کے دومعنی ہوسکتے ہیں۔یاتو گھروالوں سے مراد جنت کی حوریں اور بیویاں ہیں جووہاں جنتی کی اہل خانہ ہوں گی۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں جواس کے اہل وعیال تھے تو آدمی میدان حشر میں حساب میں کامیابی کے بعداپنی سجات اوراپنی کامیابی کی خوشخبری سنانے کے لئے ان کے پاس پہنچے گا۔

واما من اوتی کتبه ورآءَ ظهره الخ اس آیت میں کفاروفجار کا حال کیا گیا ہے کہ ان کے اعمال نامے کے کمر کے پیچھے سے دیئے جائیں گے۔تووہ اپنی موت اور ہلاکت کو پکاریں گے۔اور جہنم رسید ہوجائیں گے۔

سوال:......سورئہ الحاقه وغیرہ میں بشمالہ ہے اور یہاں وراءَ ظهره ہے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔جواب:......قیامت کے دن آدمیوں کی تین قسمیں ہوں گی (۱) اہل نجات۔ان کے اعمالنامے ان کے داہنے ہاتھ میں ملیں گے (۲) کفار جن کودائمی عذاب ہوگا ان کے بائیں ہاتھ میں اعمال نامے دیئے جائیں گے۔(۳) فساق جوعذاب کے بعدنجات پائیں گے ان کے اعمالنامے پیٹھ کے پیچھے سے دیئے جائیں گے۔یہ جواب جن مفسیرین نے ذکرکیا ہے صحیح نہیں۔قرآن وحدیث کے موافق نہیں۔اورمحض عقلی احتمال سے زائداس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔کیونکہ اہل شمال واہل ظہر کے بارے میں وعید یکساں وارد ہیں۔بلکہ پشت کے پیچھے سے کافر کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا۔لہٰذا بائیں ہاتھ میں دیا جانا بھی اس کو کہہ سکتے ہیں اور پشت کے پیچھے سے بھی۔کیونکہ مجرم زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوگا مشکیں بندھی ہوں گی اس کا بایاں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے بندھا ہوا ہوگا۔چناں چہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول بیان کیا ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ پشت کے پیچھے کردیا جائے گا اور پشت کے پیچھے سے اسکے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا۔ابن السائب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس کا بایاں ہاتھ موڑ کر سینہ کے اندر سے پشت کے پیچھے کونکال دیا جائے گا۔

انه کان فی اهله مسرورا یہ جملہ یدعواثبورا کی علت ہے یعنی وہ آج بصدحسرت ویاس ہلاکت وموت کی تمنا اسلئے کریگا کہ دنیا میں وہ اپنے اہل وعیال میں خوش وخرم اورمگن رہتا تھا آخرت سے بےفکر اور غافل رہتا تھا۔

اہل ایمان کے برخلاف کے ان کو دنیا کی زندگی میں کبھی بے فکری نہیں ہوتی۔ عیش وراحت میں بھی فکر آخرت دامن گیر رہتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ انا کنا فی اھلنا مشفقین یعنی جنتی جنت میں کہیں گے کہ ہم تو اپنے اہل وعیال میں رہتے ہوئے بھی اپنے دلوں میں آخرت کا خوف رکھتے تھے۔ جب مومن کو حساب کا یقین ہے تو اس دنیا میں خوشی ومسرت اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہردم جرس فریاد دارد کہ بر بندید محملہا

اس چل چلاؤ کے عالم میں خوشی کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟

عشرت امروز بے اندیشہ فردا خوش است فکر شنبہ تلخ دارد جمعہ اطفال را

آج فرصت کا دن ہے مگر مومن کو کل کی حاضری کا غم ہے۔ لہذا آخرت کا انجام دونوں کے حال کے مناسب ہوگا جن کو آخرت کا غم وفکر دنیا میں رہا تو ان کو وہاں عشرت ومسرت حاصل ہوگی۔ اور جو لوگ غم عقبٰی سے آزاد رہے وہ وہاں کی عیش وعشرت اور خوشی وراحت سے محروم ہوکر رنج وغم کی قید وبند میں رہیں گے۔ جو آج بے فکری میں ہنسے گا کل رنج ومصیبت میں پھنسے گا ﴿فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیرا﴾ اور غم آخرت میں جئے گا وہ عیش وعشرت میں ہمیشہ رہے گا یہاں سے معلوم ہوا کہ حق تعالی بندہ میں دو غم (دینوی واخروی) جمع نہ فرمائے گے۔

تنبیہ: .... یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ شرعاً وہی خوشی مذموم ہے جو غفلت وآسودگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جس کا منشا حکم الہی، توفیق خداوندی اور عطائے ربانی ہو وہ محمود ہے چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے کہ ﴿قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت ہی پر خوش ہونا چاہئے)

عیش وعشرت پہ نہیں مغرور ہونا چاہئے ہاں خدا کے فضل پر مسرور ہونا چاہئے

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۱۶) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۱۷) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۱۸) لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۹)

پھر میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے کہ تمکو ایک حالت سے دوسری حالت میں پہنچنا ہے

فَلَآ اُقْسِمُ	بِالشَّفَقِ	وَالَّيْلِ	وَمَا	وَسَقَ	وَالْقَمَرِ	اِذَا	اتَّسَقَ	لَتَرْكَبُنَّ	طَبَقًا	عَنْ طَبَقٍ
سو قسم کھاتا ہوں	سرخی شام	اور رات	اور جو	سمٹ آتی ہے	اور چاند	جب	وہ پورا ہو جائے	تمکو ضرور چڑھنا ہے	ایک حالت	سے ایک حالت

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۰) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (۲۱) بَلِ الَّذِيْنَ

تو ان لوگوں کو کیا ہوا کہ ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو نہیں جھکتے۔ بلکہ یہ

فَمَا	لَهُمْ	لَا	يُؤْمِنُوْنَ	وَاِذَا	قُرِئَ	عَلَيْهِمُ	الْقُرْاٰنُ	لَا يَسْجُدُوْنَ	بَلِ	الَّذِيْنَ
سو کیا ہے	واسطے انکے	نہیں	ایمان لاتے	اور جب	پڑھا جاتا ہے	ان پر	قرآن	سجدہ نہیں کرتے	بلکہ	وہ لوگ کہ

كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ (۲۲) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ (۲۳) فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۴)

کافر جھٹلاتے ہیں۔ اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں تو آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔

كَفَرُوْا	يُكَذِّبُوْنَ	وَاللّٰهُ	اَعْلَمُ	بِمَا	يُوْعُوْنَ	فَبَشِّرْ	هُمْ	بِعَذَابٍ	اَلِيْمٍ
کافر ہوئے	جھٹلاتے ہیں	اور اللہ	خوب جانتا	اس چیز کو	دل میں رکھتے ہیں	سو خوشخبری دے	ان	ساتھ عذاب	دردناک

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (۲۵)

لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان کو بے انتہا اجر ملے گا۔

اِلَّا	الَّذِیْنَ	اٰمَنُوْا	وَ	عَمِلُوا	الصّٰلِحٰتِ	لَهُمْ	اَجْرٌ	غَیْرُ مَمْنُوْنٍ
مگر	جولوگ	ایمان لائے	اور	انھوں نے کام کئے	اچھے	ان کے لئے	اجر	نہ ختم ہونے والا

لغات:

الشفق مصدر غروب آفتاب کے بعد افق آسمان کی سرخی یا سفیدی۔ راغب کہتے ہیں کہ سورج ڈوب جانے پر دن کی روشنی اور رات کی سیاہی کی باہمی آمیزش شفق ہے۔ یہ معنی سرخی وسفیدی دونوں کو شامل ہیں۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ یہ اضداد میں سے ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کی سرخی کے لئے بھی مستعمل ہے جس کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لیا ہے۔ اور اس سفیدی کے لئے بھی مستعمل ہے جو اس سرخی کے بعد مغربی افق پر آتی ہے۔ جس کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔ الحاصل شفق کے بارے میں ائمہ اور سلف کا اختلاف رہا ہے۔ اور لغت عرب میں دونوں معنی میں مستعمل ہے۔ والتفصیل فی لغات القرآن ج ۳/ ۲۹۱ شفق شفقاً (س) مہربان ہونا وسق واحد مذکر غائب ماضی (ض) سمیٹ کر جمع کرنا اتسق ایضاً پورا کرنا۔ جمع ہونا۔ بابہ افعال مادہ وَسَقٌ۔ اَلْقَمَر واحد۔ تیسری تاریخ سے اخیر ماہ تک کا چاند۔ جمع اقمار پہلی دو یا تین تاریخوں کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔ (س) بہت سفید ہونا (ن ض) جوے میں غالب آنا۔ مال چھین لینا۔ لترکبن صیغہ جمع مذکر حاضر مضارع با نون تاکید رکوب رُکُوْبٌ (س) سوار ہونا۔ طبق طبقہ۔ درجہ۔ منزل، کھنڈ، حال، حالت مر فی سورہ الملک۔ یوعون جمع مذکر غائب مضارع۔ مصدر ایعاءٌ (افعال) جمع کرنا۔ چھپانا۔ مجرد میں (ض) مر فی الحاقۃ۔

ترکیب:

فلا اقسم الخ مر مثلہ غیر مرۃ۔ وَالَّیْل عطف علی الشفق علی الا صح کما مر۔ وما وسق میں ما موصولہ ہے۔ اور وسق کی ضمیر الیل کی طرف راجع ہے۔ اور موصول کا عائد محذوف ہے۔ ای وما وسقہ اس جملہ کا عطف والیل پر ہے۔ والقمر اذا انسق والیل اذا عسعس کی طرح ہے لترکبن فعل با فاعل طبقا عن طبق ای حالاً مجاوزا عن حال۔ طبقاً مفعول بہ اور عن طبق طبقا کی صفت یا ترکبن کی ضمیر سے حال ہے۔ اور پورا جملہ جواب قسم ہے ف تفریعیہ ما استفہامیہ بمعنی ای شئی مبتدا لھم فعل محذوف ثبت کے متعلق۔ اور جملہ فعلیہ خبر۔ والضمیر المجرور فی لھم یعود الی لکفار۔ لا یومنون جملہ فعلیہ ھم سے حال ہے لانہ فی حکم الفعول۔ واذا قری علیھم القرآن جملہ شرط اور لا یسجدون جملہ فعلیہ جزا۔ اور جملہ شرطیہ حال کے محل میں ہے۔ بل اضرب عما سبق الذین اسم موصول اپنے صلہ کفروا (جملہ فعلیہ) سے مل کر مبتدا یکذبون جملہ فعلیہ خبر۔ واللہ اعلم اپنے متعلق بما یوعون سے مل کر خبر۔ بما میں ما موصولہ اور یوعون جملہ فعلیہ صلہ ہے۔ ف تعقیبیہ بشر فعل با فاعل ھم مفعول بہ بعذاب الیم متعلق اور لفظ بشارۃ بطور استہزا ہے الا حرف استثناء بمعنی لکن یعنی یہ استثناء منقطع ہے۔

اوراگر یہ معنی ہوں الا الـذین امنو وعملوا لصلحت منهم الخ تو متصل بھی ہوسکتا ہے۔الذین اسم موصول امنوا جملہ فعلیہ معطوف علیہ وعـمـلـو الـصـلـحـت فعل فاعل مفعول بہ جملہ فعلیہ معطوف۔معطوفین صلہ۔موصول وصلہ مل کر مبتدا۔لهم محذوف کے متعلق ہوکر خبر مقدم (وقـدم اللتخصیص) اجو مبتدا غیـر ممنون مرکب اضافی خبر جملہ اسمیہ۔مبتداء موخر۔متبدا وخبر مل کر جملہ اسمیہ مستانفہ۔

تفسیر:

فـلا اقـسـم بالشفق الخ ان چار آیات میں باری تعالی نے چار چیزوں کی قسم کے ساتھ انسان کو پھر اس چیز کی طرف متوجہ کیا ہے جس کا ذکر اوپر انک کـادح الی ربک میں آچکا ہے۔فرق یہ ہے کہ وہاں اجمال تھا یہاں کچھ تفصیل ہے وہاں جنس انسان کو خطاب تھا یہاں تمام افراد کو خطاب ہے وہاں بقائے عمل کا اجمالی بیان تھا، یہاں احوال موت، احوال برزخ احوال قیات اور جزا وسزا وغیرہ کی تفصیل ہے اور دینوی احوال سے ان امور پر استدلال اور مشاہدات کے ذریعہ معرفت قدرت خداوندی کی طرف سے رہنمائی ہے۔

قسموں کی مضامین سے مناسبت:

اگر غور کیا جائے تو یہ چاروں چیزوں جن کی قسمیں کھائی گئی ہیں جواب قسم میں آنے والے مضمون پر شاہد ہیں۔ یعنی انسان ایک حال پر برقرار نہیں۔بلکہ اس کے حالات و درجات ہمہ وقت بدلتے رہتے ہیں۔پہلی چیز شفق ہے جو غروب آفتاب کے ساتھ نمایاں ہوتی ہیں۔یہ رات کی ابتدا ہے جو انسانی حالات میں ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے کہ روشنی جارہی ہے اور تاریکی کا سیلاب امنڈتا آرہا ہے۔اس کے بعد رات کی قسم ہے۔جو اس انقلاب کی تکمیل کرتی ہے۔اس کے بعد ان تمام چیزوں کی قسم ہے جن کو رات کی تاریکی اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔

وسـق کے معنی جمع کر لینے کہ ہیں۔اس کے یہی عام معنی مراد لئے جائیں تو اس میں دنیا کی وہ تمام کائنات داخل ہے جو رات کی تاریکی میں چھپ جاتی ہے۔یعنی حیوانات، نباتات، جمادات، پہاڑ اور دریا اس میں شامل ہیں۔اور جمع کر لینے کی مناسبت سے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ چیزیں جو عادۃً دن کی روشنی میں منتشر ہوئی رہتی ہیں۔رات کے وقت وہ سب سمٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں جمع ہو جاتی ہے۔انسان اپنے گھروں میں، حیوانات اپنے تھلوں میں اور پرندے اپنے گھونسلے میں جمع ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔نیز کاروبار کے اسباب اور سامانوں کو سمیٹ کر یکجا کر دیا جاتا ہے یہ ایک عظیم انقلاب خود انسان اور اس کے متعلقات اور دیگر مخلوقات میں مشاہد ہے۔چوتھی چیز جس کی قسم کھائی گئی۔والقمر اذا تسق ہے اتسق بھی وسق سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کر لینے کے ہیں۔اتسـاق سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو جمع یعنی پورا کر لے اور یہ چودھویں رات میں ہوتا ہے کہ چاند اس میں بالکل مکمل ہوجاتا ہے۔

اذا تسـق کا لفظ چاند کے مختلف اطوار و حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ پہلے نہایت نحیف وضعیف قوس کی شکل میں ہوتا ہے پھر اس کی روشنی بڑھتی رہتی ہے۔یہاں تک کہ وہ بدر کامل (چودھویں کا چاند) ہو جاتا ہے۔ مسلسل اور پیہم انقلابات احوال پر شہادت دینے والی چار چیزوں کی قسم کھا کر حق تعالی نے فرمایا لتـر کبـن طبقا

عن طبق یعنی اے بنی نوع انسان تم ایک مرتبہ سے دوسری مرتبہ پر ایک حالت سے دوسری حالت پر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ابتداء تخلیق سے انتہاء تک کسی وقت ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ اسکے وجود پر تدریجی انقلابات آتے ہی رہتے ہیں۔

وجودانسانی کے انقلابات اور آخری منزل تک اس کے طویل سفر کے حالات:

حضرت انسان نطفہ سے خون کی پھٹکی پھر گوشت کی بوٹی بنا پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوئیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور اعضاء کی تکمیل ہوئی پھر اس میں روح ڈالی گئی۔ ایک خاص مدت کے بعد اللہ نے اس کے دنیا میں آنے کے لئے راستہ کھول دیا۔ اور یہاں گندے خون کے بدلے شفاف دودھ ملنے لگا۔ وہ دنیا کی وسیع فضاء میں بڑھنے اور پھلنے اور پھولنے لگا۔ دو برس کا ہوا تو چلنے پھرنے اور بولنے کی قوتیں بھی آگئیں۔ ماں کا دودھ موقوف ہو گیا تو اقسام وانواع کی عمدہ ولذیذ غذائیں ملیں۔ لہو ولعب اسکا شب وروز کا مشغلہ بن گیا۔ کچھ شعور ہوا حواس بڑھے ہوش آیا تو تعلیم وتربیت کے شکنجے میں کسا گیا۔ جوانی کی منزل پر پہنچا تو پچھلے سب مشغلے غبار راہ کی طرح چھوٹ گئے۔ خواہشات کی بہاروں نے ان کی جگہ لے لی۔ ایک نیا عالم شروع ہوا بیاہ شادی خانہ آبادی ہوگئی۔ آزادی ختم ہوگئی۔ اولاد ومتعلقین کے فکرات رات دن کا مشغلہ بن گئے۔

کہاں گیا میرا بچپن خراب کر کے مجھے — اسیر پنجہ عہد شباب کر کے مجھے

یہ دور بھی چل بسا، قوتیں گھٹنے لگیں، کمزوریوں، بیماریاں اور معذوروں نے گھیر لیا۔ بڑھاپا آگیا۔ کمر جھک گئی۔

شباب ہاتھ سے جاتا رہا پتہ نہ چلا — اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں کمر جھکائے ہوئے

آہ پھر اس جہان کی آخری منزل (قبر) تک پہنچنے کے سامان ہونے لگے۔ یہ سب حالات سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی کو مجال انکار نہیں۔ مگر حقیقت سے ناآشنا انسان سمجھتا ہے کہ یہ موت اور قبر اس کی آخری منزل ہے آگے کچھ نہیں لیکن

سب کچھ کے بعد کچھ نہیں یہ تو کچھ نہیں

اس خالق کائنات اور علیم وخبیر نے آگے آنیوالے مراحل سے اپنے انبیا علیہم السلام کے ذریعہ اس غافل انسان کو آگاہ وخبردار فرمایا ہے کہ اے غافل قبر تیری آخری منزل نہیں۔ بلکہ دنیا کی طرح یہ صرف ایک چندروزہ قیام گاہ ہے۔ اس کے آگے ایک بڑا جہان اور بھی ہے۔ جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے جس کی منزلیں ایک زبردست امتحان کے بعد مقرر کی جائیں گی اور اس راحت وآرام یا مصائب وآلام کی آخری منزل میں پہنچ کر ہی انسان انقلابات کے چکر سے نکلے گا۔ انّ الی ربّک الرّجعٰی. وَاِنَّ الٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی اور کادحٌ الی ربّک جیسی آیات میں غفلت شعار انسان کو اسی حقیقت مذکورہ پر متنبہ فرمایا گیا ہے اس لئے انسان عاقل کا کام یہ ہے کہ وہ خود کو دنیا میں ایک مسافر سمجھے اور اپنے وطن اصلی کی فکر وتیاری میں لمحات زندگی بسر کرے اور ہر قدم منزل کی طرف کامیابی کے ساتھ بڑھاتا رہے۔ حدیث میں ہے کہ کن فی الدنیا کانک ،غریب اور عابر سبیل (دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی مسافر چندروز کیلئے کہیں ٹھہر گیا ہو یا کسی رہگذر میں چلتے چلتے کچھ دیر آرام کے لئے رک گیا ہو) طبقاً عن طبق کی تفسیر مذکور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع میں بھی آئی ہے۔ جس کو قرطبی نے بحوالہ ابونعیم اور ابن کثیر نے بحوالہ ابن ابی حاتم مفصل بیان کیا ہے۔

یہ قسمیں احوال بعد موت کی آئینہ دار ہیں:۔

یہ چیزیں جنکی قسم کھائی گئی ہے موت کے بعد والے حالات کی تصویر وتفسیر ہیں (۱) غروب آفتاب کے بعد غروب شفق تک ایک درمیانی حالت ہوتی ہے۔ نہ تو دن کی طرح روشنی ہوتی ہے اور نہ پورے طور پر رات ہی آجاتی ہے۔ دن کے آثار بھی ہوتے ہیں اور رات کا سماں بھی۔ آفتاب زندگی غروب ہونے کے بعد ایک مدت تک روح انسانی کو دنیا سے مناسبت رہتی ہے اور دوسرے عالم سے بھی۔ اسی لئے مومن فرشتوں سے کہتا ہے کہ دَعُوْنِیْ اُصَلّی مجھے چھوڑو میں نماز پڑھ لوں اور ارجع الی اھلی فا خبرھم میں اپنے گھر جا کران کو اپنی کامیابی کی خبر کر دوں۔ مردہ اس حالت میں ایصال ثواب کا منتظر رہتا ہے۔ اور خوابوں میں بھی آتا ہے (۲) اسکے بعد اس عالم میں استغراق کی کیفیت ہوجاتی ہے۔ اور وہ اسی عالم کا ہو کر رہتا ہے اور اسکا وہ وقت والیل وما وسق کا مصداق بن جاتا ہے۔ دنیا سے انقطاع کلی ہوجاتا ہے۔ (۳) حشر ونشر بپا ہوگا تو اس پر اپنے اعمال اور ان کی جزا وسزا کا انکشاف ہوگا۔ جو منظر ہے والقمر اذا تسق کا۔ انہیں حالات کو لترکبن طبقاً عن طبق میں بیان فرمایا گیا۔ ہم نے یہ مضمون اشارۃً اور اجمالاً بیان کر دیا ہے۔ تفصیل بڑی تفاسیر میں دیکھئے۔

لَتَرْکَبُنّ الخ کی دوسری تفسیریں:

...... لَتَرْکَبُنّ کو باء کے ضمہ کے ساتھ جمع مذکر حاضر کا صغیہ پڑھا جائے تو یہی معنی ہونگے جو اوپر بیان کئے ہوئے ہیں۔ یعنی سارے انسانوں کو خطاب ہے اور ان کے مختلف حالات اور زندگی کے انقلابات یا موت کے بعد کی تمام منازل طبقا عن طبق کا مصداق ہوں گی۔ حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ نے دینوی احوال فقر ومالداری وغیرہ مراد لئے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے شدائد، مصائب، موت، حشر اور پیشی مراد لی ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے مختلف ادوار واطوار یعنی بچپن، جوانی بڑھاپا وغیرہ لئے ہیں۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ تم گذشتہ اقوام کے طریقوں پر چلو گے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ تم لوگ بالشت بالشت اور بانہہ بانہہ گذشتہ اقوام کے طریقوں پر چلو گے۔ یہاں تک کہ اگر گذشتہ اقوام میں سے کوئی گوہ کے سوراخ میں گھسا تھا تم بھی ایسا کرو گے۔ اوران میں سے کسی نے اپنی بیوی سے سرراہ جماع کیا تھا تو تم بھی کرو گے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اور امام بخاری نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اور اگر بفتح الباء صیغہ واحد مذکر حاضر پڑھا جائے۔ جیسا کہ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی رحمۃ اللہ علیہم کی قراءت ہے تو خطاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اس صورت میں بقول شعبی رحمۃ اللہ علیہ ومجاہد رحمۃ اللہ علیہ مطلب یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ایک آسمان کے بعد دوسرے آسمان پر چڑھے گے۔ یعنی یہ بشارت معراج ہے۔ اور طبقا عن طبق سے مراد آسمان ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ: الذی خلق سبع سموت طبا قا (۲) یہ بھی ممکن ہے کہ علو مراتب اور پے بہ پے ترقیات مراد ہوں۔ کما قال تعالیٰ وللا خرۃ خیر لک من الا ولی (۳) یا آپ فتح وظفر کی طرف اشارہ ہے۔

اور اگر اس میں واحد مونث غائب کا صیغہ قرار دیا جائے تو ضمیر فاعل السماء کی طرف راجع ہوگی۔ مطلب یہ ہوگا کہ آسمان ایک حال کے بعد دوسرا حال اختیار کرے گا۔ سعید بن منصورؒ، ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے اس کی تشریح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہا کا قول نقل کیا ہے کہ آسمان میں اولاً شگاف ہوں گے۔ پھر وہ پھٹ جائے گا پھر سرخ ہو جائے گا۔ واللہ اعلم (مظہری)۔ ان تمام انقلابات کا مشاہدہ کرنے اور قرآن پاک کی روشن ہدایات ملنے

کے باوجود غافل انسان اپنی خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے اس لئے ارشاد فرمایا فما لھم لا یومنون یعنی ان غافل و جاہل انسانوں کو آخر کیا ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ جانتے دیکھنے اور سننے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے و اذا قرئ الاٰیۃ اور قرآن پاک کی واضح ہدایات سن کر بھی اللہ کی طرف نہیں جھکتے۔

سجدہ سے کیا مراد ہے؟:......(س) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سننے سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے خواہ کہیں سے سنا جائے اور قرآن کوئی آیت بھی سنی جائے۔ کیونکہ آیت مذکورہ میں قرآن سن کر سجدہ نہ کرنے کی مذمت وارد ہوئی ہے حالانکہ آیات سجدہ کے علاوہ قرآن کے کسی حصہ کو بھی سن کر سجدہ واجب نہیں ہوتا۔ اس پر پوری امت محمد ﷺ کا اجماع ہے۔

(ج) سجدہ اور سجود کے معنی جھکنے کے ہیں۔ اس سے اطاعت شعاری اور فرنبرداری مراد ہے۔ اس کو خشوع خضوع بھی کہتے ہیں۔ قرآن پاک سن کر دل کا خضوع اور ظاہری خشوع (اطاعت) واجب ہے۔ سجدہ کے اصطلاحی معنی اس جگہ مراد نہیں ہیں۔ اور جن لوگوں نے اس جگہ سجدہ تلاوت مراد لیا ہے انہوں نے القرآن کے الف لام کو عہدی مانا ہے (جنسی نہیں) یعنی آیات سجدہ اس کا مفہوم قرار دیا ہے۔ اسکے معنی کے اعتبار سے بعض احناف سے اس کو یہاں وجوب سجدہ تلاوت پر دلیل بنا لیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر تفسیر کو متعین مان لیا جائے تو احناف کے اصول پر اس سے سجدہ تلاوت کی فرضیت ثابت ہونی چاہئے۔ حالانکہ احناف اس کے قائل نہیں صرف وجوب کے قائل ہیں۔ اگر آیت اس کے معنی کو محتمل ہے تو احتمال وشک سے وجوب بھی ثابت نہیں ہوتا۔ حکم وجوب کے ثبوت کے لئے بھی ایسی دلیل ظنی کی ضرورت ہے جو متعین المعنی ہو۔ فافہم

سجدہ تلاوت:......اس جگہ اجمالاً چند امور یاد رکھنے چاہئیں۔ (۱) آیت مذکورہ ان چودہ آیات میں سے ایک ہے جن کے تلاوت کرنے یا (قصداً یا بلا قصد) سننے سے احناف کے نزدیک سجدہ تلاوت واجب ہو جاتا ہے۔ (۲) قرآن پاک میں چودہ سورتوں میں آیات سجدہ ہیں (۱) سورۂ اعراف آیت ۲۰۶ (۲) سورۂ رعد آیت ۱۵ (۳) سورۂ نحل آیت ۵۰ (۴) سورۂ بنی اسرائیل ۱۰۹ (۵) سورۂ مریم آیت ۵۸ (۶) سورۂ حج آیت ۱۸ (۷) سورۂ فرقان آیت ۶۰ (۸) سورۂ نمل آیت ۲۶ (۹) سورۂ الم السجدہ آیت ۱۵ (۱۰) سورۂ ص آیت ۲۴ (۱۱) سورۂ حمٓ السجدۃ آیت ۳۸ (۱۲) سورۂ والنجم آیت ۶۲ (۱۳) سورۂ الانشقاق آیت ۲۱ (۱۴) سورۂ العلق آیت ۱۹۔

(۳) یہ آیات سجدہ احناف کے نزدیک ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وامام احمد رحمۃ اللہ علیہ سورۂ حج میں دو سجدے مانتے ہیں۔ آیت مذکورہ ۱۸ میں اور اخیر سورت میں آیت ۷۷ میں بھی۔ اور سورہ ص میں وہ سجدہ نہیں مانتے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مفصلات (النجم، الانشقاق اور العلق میں سجدے نہیں مانتے۔ اسی طرح جمہور کے نزدیک پورے قرآن میں چودہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گیارہ سجدے ہیں۔ (۴) ان سجدوں کی تعیین میں عقل کو چنداں دخل نہیں۔ بلکہ سب توفیقی ہیں اور ثبوت کے محتاج ہیں۔ اس لئے اسکا فیصلہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے تعامل سے ہی ہو سکتا ہے۔ (۵) سجدات تلاوت کے سلسلہ میں بھی احادیث وآثار میں اختلاف ہے اور رجب وجوب ورخصت میں بھی۔ اسلئے ائمہ مجتہدین میں بھی اختلاف ہو گیا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک سجدۂ تلاوت مذکورہ چودہ آیات میں واجب ہے۔ ان میں سے کوئی آیت پڑھے یا سنے بہر دو صورت سجدہ واجب ہوتا ہے۔ دیگر ائمہ کے نزدیک سجدۂ تلاوت سنت ہے۔ مقامات کی تفصیل اوپر مذکور ہے۔

(۶) حناف کا استدلال وجوب سجدہ تلاوت پر مندرجہ ذیل احادیث سے ہے۔ (الف) صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ میں نے ایک روز عشاء کی نماز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی انہوں نے سورۃ اذا السماء انشقت کی تلاوت نماز میں کی اور اس آیت مذکورہ پر سجدہ کیا۔ میں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ کیسا سجدہ ہے؟ انہوں نے فرمایا: میں نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں اس آیت پر سجدہ کیا تھا۔ اس لیے میں اس آیت پر ہمیشہ سجدہ کرتا رہوں گا جب تک کہ محشر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہو (ب) صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اذا لسمآءُ انشقت اور اقرا باسم ربک میں سجدہ کیا ہے۔ وغیرہ۔ (۷) قرطبی نے ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ آیت (مذکورہ) بھی آیات سجدہ میں سے ہے۔ اس کے پڑھنے اور سننے سے سجدہ واجب ہے مگر ابن عربی جن لوگوں میں مقیم تھے ان میں اس آیت پر سجدہ کرنے کا رواج نہ تھا۔ (شاید وہ کسی ایسے امام کے مقلد ہوں گے جن کے نزدیک یہ سجدہ نہیں۔ یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہوں گے۔ اور ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ خود محقق مالکی ہیں) ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ میں جب امامت اختیار کروں تو سورۂ انشقاق نہ پڑھوں۔ کیونکہ میرے نزدیک یہاں سجدہ واجب ہے۔ اگر سجدہ نہ کروں تو گنہگار رہوں گا اور اگر کرتا ہوں تو پوری جماعت میرے اس فعل کو برا سمجھے گی۔ اور خواہ مخواہ اختلاف ہوگا (معارف)۔

بل الذین کفروا یکذبون یعنی کافر لوگ سجدہ نہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اس کلام بلاغت نظام وصداقت تمام کو جھٹلاتے بھی ہیں۔

واللہ اعلم بما یوعون یعنی وہ لوگ جو کفر وعداوت اپنے سینوں میں جمع رکھتے اور چھپاتے ہیں حق تعالیٰ کو اس کا خوب علم ہے۔ ایعاء کے معنی ہیں برتن میں بھر لینا۔ یہاں مراد چھپانا ہے۔ ابن زید نے کہا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد نامہ اعمال میں جمع کرنا ہو۔ بہرصورت اللہ تعالیٰ کے واقف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو تکذیب وعداوت کی سزا دیگا۔

فبشر ھم بعذاب الیم اس میں فاء سببیہ ہے۔ یعنی تکذیب سبب بشارت عذاب ہے۔ فا وعدھم (ان کو عذاب سے ڈرا دیجئے) کی بجائے فبشر ھم استہزا لایا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فاء فصیحیہ ہو ای اذا کان حالھم ما ذکر فبشر ھم الا الذین الایۃ استثنا منقطع ہے اور مستثنیٰ منہ فبشر ھم کی ضمیر منصوب ھم ہے۔ اور متصل بھی ہوسکتا ہے۔ ای الا الذین امنو وعملو الصلحت منھم اور ماضی کے دونوں صیغے بمعنی مضارع ہیں۔ یا معنی ہیں فی علم اللہ وھذا ھو الانسب . واللہ اعلم۔

تم تفسیر سورۃ الانشقاق والحمد للہ رب الآفاق والصلوٰۃ والسلام علی النبی وآلہٖ وصحبہٖ الذین اوفوا بالعھد والمیثاق ومن تبعھم الی یوم التلاق

سُوْرَۃُ الْبُرُوْجِ

سُوْرَۃُ الْبُرُوْجِ مَکِّیَّۃٌ وَّ ھِیَ اثْنَتَانِ وَ عِشْرُوْنَ آیَۃً

(رکوع:۱،آیات:۲۲)　سورۂ بروج مکیہ ہے اور اس میں بائیس ۲۲ آیات ہیں　(کلمات:۱۰۹،حروف:۴۶۵)

ربط ومناسبت:

یہ سورت بھی بالاتفاق مکیہ ہے۔اس سورت کا ماقبل سے ربط لفظاً اور معنیً ظاہر ہے۔مضامین اور مطلع اور مقطع سب میں پوری پوری مناسبت ہے۔شروع میں آسمان کا ذکر آخر میں تکذیب کفار کا اور مومنوں کے لئے وعدہ ثواب اور کفار کے لئے وعید وعذاب کا ذکر ہے۔

شانِ نزول:

مکہ میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام شروع فرمائی،اور چند بندگان خدا ایمان لے آئے تو کفار مکہ ان مومنوں کو طرح طرح کی تکالیف پہنچانے لگے،غریب مسلمان گاہے گاہے اپنی ناقابل برداشت پریشانیوں کا حال اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تسلی دیتے،خوشخبریاں سناتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:کہ ایک دن ایسا آئیگا کہ تم کو امن وامان میسر آئیگا۔اور تم کو اپنے دشمنوں سے انتقام اور بدلہ لینے کی طاقت وقوت حاصل ہوگی۔کفار کو جب یہ باتیں معلوم ہوتیں تو وہ ہنستے،مذاق بناتے اور کہتے تھے کہ یہ ذلیل ومفلس لوگ کیا حقیقت رکھتے ہیں جو ہم سے بدلہ لے سکتے ہیں۔اگر ہم عزت وغلبہ کے لائق ومستحق نہ ہوتے تو حق تعالیٰ ہم کو ان کے مقابلہ میں باعزت وغالب کیوں کرتا درحقیقت عزت وشوکت ہمارے نصیب میں ہے۔اور ذلت وخواری ان مفلس مسلمانوں کے مقدر میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرما کر مسلمانوں کو تسلی دی اور کافروں کو تنبیہ کی ہے کہ ہم دنیا کے حالات کو پلٹتے رہتے ہیں۔چنانچہ برجوں والے آسمان کی قسم سے ان انقلابات کی طرف اشارہ فرمادیا جو شب وروز رونما ہوتے ہیں۔بہت سی چیزیں مثلاً ایک برج کی تاثیر سے عزیز اور دوسری کی تاثیر سے ذلیل ہوجاتی ہیں۔مثلاً جاڑوں کے موسم میں گرم لباس عزیز وقابل قدر اور برف ٹھنڈا پانی اور شربت بے قدر ہوجاتے ہیں۔اور گرمیوں میں اسکے برعکس ہوتا ہے اسی طرح عزت وغلبہ اور ذلت وپستی ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں ﴿تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ﴾ پھر بطور نمونہ ومثال اصحاب الاخدود کا واقعہ بیان فرما کر اس مسئلہ انقلاب پر ایک دلیل قائم فرمادی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد مہربان بہت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ(۱) وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ(۲) وَشَاھِدٍ وَّمَشْھُوْدٍ(۳)

قسم ہے برجوں والے آسمان کی اور وعدہ کے دن کی اور حاضر ہونے والے کی اور اس کی جس کے پاس حاضر ہوں

قسم	السماءِ	ذاتِ	البروجِ	و	الیومِ	الموعودِ	و	شاھدٍ	و	مشھودٍ
	آسمان	والا	برجوں	اور	دن	وعدہ دیا گیا	اور	حاضر ہونیوالا	اور	حاضر کیا گیا

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ (٤) النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ (٥) اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ (٦)

خندقوں والے (بہت سے ایندھن کی آگ والے ملعون ہو گئے) جس وقت وہ لوگ آگ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

قُتِلَ	اَصۡحٰبُ	الۡاُخۡدُوۡدِ	النَّار	ذَاتِ	الۡوَقُوۡدِ	اِذۡ	هُمۡ	عَلَيۡهَا	قُعُوۡدٌ
مارے گئے	والے	کھائیوں	آگ	والی	بہت ایندھن	جس وقت	وہ	اوپر اس	بیٹھے

وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ (٧) وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ

اور وہ جو کچھ ایمانداروں کے ساتھ کررہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے اور انکو مسلمانوں کی صرف یہ بات بری معلوم ہوئی کہ وہ کمالات والے زبردست اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

و	هُمۡ	عَلٰى	مَا	يَفۡعَلُوۡنَ	بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ	شُهُوۡدٌ	وَ	مَا	نَقَمُوۡا	مِنۡهُمۡ	اِلَّا	اَنۡ	يُّؤۡمِنُوۡا	بِاللّٰه
اور	وہ	اوپر	اس چیز	کرتے تھے	ساتھ مسلمانوں	حاضر	اور	نہیں	عیب پکڑا انھوں نے	سے ان میں	مگر	یہ کہ	ایمان لائے	ساتھ اللہ

الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ (٨) الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ (٩)

جسکے قبضے میں آسمان وزمین کی بادشاہت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے۔

الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡد	الَّذِىۡ	لَهٗ	مُلۡكُ	السَّمٰوٰتِ	وَ	الۡاَرۡضِ	وَ	اللّٰه	عَلٰى	كُلِّ	شَىۡءٍ	شَهِيۡدٌ
غالب، تعریف کیا گیا	وہ جو	واسطے اس	بادشاہی	آسمانوں	اور	زمین	اور	اللہ	اوپر	ہر	چیز	حاضر

لغات:

البروج برجیں برج کی جمع ہے۔ جس کے معنی بلند عمارت و محل کے ہیں۔ ستون، قلعہ، مینار اور گنبد کو بھی برج کہتے ہیں۔ ابراج اور ابرجۃ بھی جمع آتی ہیں۔ آسمانی برجیں بارہ ہیں۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے موضح القرآن سورۂ حجر میں لکھا ہے: حق تعالیٰ بندوں سے وہ خطاب کرتا ہے جو یہ سمجھیں۔ ان کے عرف میں آسمان مشرق سے مغرب تک اور مغرب سے مشرق تک بارہ پھانک ہیں۔ جیسے خربوزہ وہی بارہ برج ہیں اور سورج برس دن میں سب طے کرتا ہے موسم گرمی اور سردی اس سے بدلتا ہے اور گرمی سے مینہ آتا ہے اور مینہ سے دنیا بستی ہے۔ اور رونق آسمان کی ستارے ہیں۔ کسی شاعر نے ان بارہ برجوں کی ترتیب وار ایک قطعہ میں جمع کردیا ہے۔

بر جہا دیدم کہ از مشرق بر آوردند سر جملہ در تسبیح و در تہلیل حیّ لا یموت

چوں حمل چوں ثور و چوں جوزاء و سرطان اسد سنبلہ، میزان و عقرب، قوس و جدی دلو، حوت

الیوم الموعود روز قیامت باتفاق المفسرین الموعود اسم مفعول، باب ضرب، **الاخدود** جمع خد کی زمین میں بڑا لمبا سا گڑھا۔ خندق، کھائی، ندی، طریقہ، لوگوں کی جماعت۔ جمع اَخِدَّۃ۔ قَوخِدَادٌ وخِدَّانٌ واُخۡدُوۡدٌ بعض کہتے ہیں اخدود واحد ہے اس کی جمع اَخَادِيۡدُ ہے خَدَّ خَدًّا (ن) بدھی پڑنا، کھودنا۔ **الوقود** ایندھن وَقۡدٌ وَقۡدًا وَقُوۡدًا (ض) روشن ہونا۔ جلنا، بھڑکنا۔ **قعود** جمع قاعد کی (ن) بیٹھنا، کھڑے کھڑے بیٹھنا۔ اور **جُلُوۡس** لیٹے سے بیٹھنا لیکن ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ **شهود** جمع **شاهد** کی (س، ك) گواہی دینا، حاضر ہونا، قبول کرنا۔ **نقموا** صیغہ جمع مذکر غائب ماضی (ن ض) سزا دینا، عیب لگانا، مکروہ جاننا، برا کہنا، بدلہ لینا۔

ترکیب:

والسمآء جارمجرور اقسم فعل محذوف کے متعلق ہوگا۔ذات البروج مرکب اضافی السماء کی صفت الیوم الموعود مرکب توصیفی السماء پر معطوف اسی طرح وشاھد اور مشھود بھی السماء پر معطوف ہیں۔صحیح قول کی بناپر۔اوربعض نے چاروں کوالگ الگ قول مانا ہے۔اورچاروں جملے معطوفات ہیں کما مر مفصلاً۔قتل فعل مجہول اصحب مضاف الا خدود مبدل منہ النار موصوف ذات الوقود مرکب اضافی صفت۔موصوف وصفت مل کربدل اشتمال۔مبدل منہ اور بدل کرمل کرمضاف الیہ اصحاب اپنے مضاف الیہ سے ملکر مفعول مالم یسم فاعلہ ہواقتل کا.اذ مضاف ھم مبتدا قعود اپنے متعلق مقدم علیھا (ای علی الاخدود) سے مل کرخبر جملہ اسمیہ،مضاف الیہ اذکااذ اپنے مضاف الیہ سے مل کر قُتِلَ کاظرف ہوا۔قُتِلَ اپنے نائب فاعل وظرف سے مل کر جملہ فعلیہ خبر یہ ہوکر جواب قسم ہوا۔ (کیونکہ فعل ماضی مثبت متصرف جس کامعمول مقدم نہ ہوجب جواب قسم واقع ہوجا تا ہے تواس کے شروع میں لام وقد کا آنا ضروری ہوتا ہے۔اوردونوں میں سے ایک پراقتصار جائز نہیں ہوتا۔ہاں اگرطول کلام ہوجائے تواحد ھما پراکتفا جائز ہے۔جیسے کہ والشمس وضحھا کاجواب قد افلح من زکھا ہےاورطول کلام کی وجہ سے احد ھما پراکتفاکرلیا گیا ہےاس لئے لام وقد محذوف ہے۔اصل عبارت لقد قتل ہوگی۔یاجواب قسم محذوف ہے۔ای ان کفا رمکۃ لعنوا کما لعن اصحب الا خدود بعض کہتے ہیں کہ جواب قسم ان بطش ربک لشد ید ہےاورقسم وجواب قسم کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں۔وھم مبتدا شھود اپنے متعلق مقدم علی ما یفعلون (حسب ترکیب) سے ملکر خبر۔جملہ اسمیہ معطوف ہے ماقبل پر وما نقموا ماضی منفی اورضمیر اصحب الاخددود کی فاعل، منھم متعلق فعل الاحرف استثناءان یؤ منوا باللہ العزیز الحمید فعل۔فاعل متعلق سے علی الترتیب مل کر جملہ فعلیہ بتاویل مفرد ما نقموا کا مفعول بہ(اوراستثناءمفرغ ہے)الذی اسم موصول ملک مضاف السموت والا رض معطوفین مضاف الیہ مرکب مبتداموخر لہ متعلق محذوف خبرمقدم۔جملہ اسمیہ صلہ،موصول وصلہ مل کرلفظ اللہ کی صفت ثالثہ ہوئی۔اوراولیٰ وثانیہ العزیز الحمید تھیں۔واللہ مبتداعلی کل شی متعلق شھیدٌ کا۔خبر جملہ اسمیہ خبر یہ ہوا۔

تفسیر:

والسماء ذات البروج حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بروج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما،مجاہد،ضحاک،حسن بصری، قتادہ،سدی رحمۃ اللہ علیہم کا یہی قول ہے۔دوسرے بعض آئمہ تفسیر نے بروج سے اس جگہ قصوریعنی محلات مراد لئے ہیں۔ (کما فی قولہ تعالیٰ ولو کنتم فی برو ج مشیدۃٍ) اورمحلات سے مرادوہ مکانات ہیں جوآسمان میں پہرہ داروں اور نگراں فرشتوں کیلئے مقرر ہیں۔اوربعض متاخرین نے بروج سے مرادوہ بزوج بتائے ہیں جوفلاسفہ کی اصطلاح ہے کہ کل آسمانوں کوبارہ حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ کوبروج کہا جا تا ہےان کا خیال یہ ہے کہ ثوابت ستارے انہی برجوں میں اپنی اپنی جگہ مقیم ہیں۔اور فلک کی حرکت سے متحرک ہوتے ہیں۔اوران برجوں میں سیاروں کانزول ہوتا ہےمگر یہ سراسر غلط

ہے۔ قرآن کریم سیارات کو آسمان میں مرکوز نہیں قرار دیتا۔ بلکہ ہر سیارے کو اسکی اپنی ذاتی حرکت سے متحرک قرار دیتا ہے جیسا کہ سورۂ یٰس کی آیت وکل فی فلک یسبحون سے معلوم ہوتا ہے اور اس آیت میں فلک سے مراد آسمان نہیں۔ بلکہ سیارے کا وہ مدار مراد ہے جس میں وہ حرکت کرتا ہے (مظہری)۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ برجوں کی حقیقت یہ ہے کہ گردش آفتاب کی وجہ سے آسمان میں ایک دائرہ پیدا ہو جاتا ہے جس کو دائرۃ البروج کہتے ہیں۔ آفتاب سال بھر میں اس پورے دائرے کو طے کر لیتا ہے۔ اس دائرہ کو بارہ حصوں میں تقسیم کرلیں تو ان میں سے ہر حصہ کو برج کہتے ہیں۔ اس دائرہ کو بارہ پر تقسیم کر کے بارہ برجیں تجویز کرنا جناب الٰہی سے بنی آدم کے قلوب میں القاء ہوا ہے۔ چنانچہ ہندو، پارسی، یونانی، فرنگی، عجمی، عربی، ساری دنیا کے لوگ اس پر متفق ہیں۔ یا اس دائرے کو چار سے تقسیم کیا جائے تو ہر ربع میں آفتاب کی گردش سے ایک فصل پیدا ہوتی ہے اسی طرح فصلیں بھی چار ہیں۔ ربیع، خریف، صیف، شتاء اور ہر فصل کیلئے اوسط اور انتہا ہے جن میں ان فصلوں کے قوت وضعف کے انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ اس طرح سال میں بارہ فصلیں ہوئیں۔ ان بارہ حصوں کو بارہ برجوں کا نام دیا گیا۔ یا آفتاب سال بھر میں چاند سے بارہ مہینے ملتا ہے اور شمس وقمر کے ہر اجتماع کو برج سے تعبیر کیا گیا۔ اس طرح بارہ برجیں ہوئیں۔ اور اس اجتماع سے جو شکلیں آسمان میں ستاروں کی نمودار ہوئیں انہیں کی مناسبت سے ہر برج کا نام تجویز کیا گیا۔ واللہ اعلم (مزید تفصیلات فتح العزیز میں ملاحظہ فرمائیں)

حاصل کلام:

یہ ہے کہ بروج سے بڑے بڑے ستارے مراد ہوں یا محلات وقصور مراد ہوں، یا فلاسفہ کی تجویز کردہ منزلیں یہ سب تخمینی چیزیں ہیں۔ ان میں کوئی ایک چیز بھی قطعی اور یقینی نہیں۔ اس لئے سب ہی احتمالات ممکن ہیں۔ اور سب ہی قدرت خداوندی کے دلائل اور انقلابات پر نشانات ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ یہ فلاسفہ کا خیال فاسد ہے۔ اور متاخرین کی تحقیق سراسر غلط ہے درست نہیں۔ ان کی تحقیق پر کل فی فلک یسبحون جیسی آیت کی خلاف ورزی ہرگز لازم نہیں آتی۔ اور ان کے اختیار کردہ اول الذکر اقوال پر ان کے پاس کوئی دلیل قطعی موجود نہیں۔ جب سارے عالم کے انسان بالہام خداوندی جب کہ اصطلاحی بروج کے قائل اور انقلابات فصول کو ان سے وابستہ مانتے ہیں۔ اور یہ بھی طے ہے کہ کلام ربانی محاورات انسانی میں نازل ہوا ہے۔ تو یہاں راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین کا قول درست ہے کیونکہ اہل مکہ کے زعم فاسد کی اس میں سخت تردید ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے حال پر عزت وشوکت کے ساتھ قائم رہیں گے اور اے مسلمانو! تم ذلت ومصیبت پر دائم رہو گے۔ ان کو بتلایا گیا ہے کہ ایک حال پر دنیا میں کوئی چیز نہیں رہتی۔ موسمیات وفصول کا الٹ پھیر تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور ان کے انقلابات سے چیزوں کی قدر وعزت گھٹنا بڑھنا پیدا ونا پید ہونا بھی تم کھلی آنکھوں دیکھتے ہو۔ بس یاد رکھو کہ وہ خالق کائنات شوکت وعزت، ذلت ومصیبت میں بھی اسی طرح انقلاب برپا کر دے گا اور اصحاب الاخدود کا واقعہ جو تم سے قریب ہی زمانہ میں گذرا ہے اس پر شاہد عدل ہے۔

والیوم الموعود وشاھد ومشھود یوم موعود سے قیامت کا دن مراد ہے۔ شاھد سے جمعہ کا اور مشھود سے عرفہ کا دن مراد ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ یوم موعود قیامت کا دن، مشھود عرفہ کا دن، اور شاہد جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ کے دن ایک ساعت ایسی آتی ہے

کہ اگر اس میں کوئی بندہ مومن اللہ سے کوئی دعائے خیر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعاء قبول فرماتے ہیں۔اور جس شر سے پناہ مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اس شر سے اس کو پناہ عطاء فرماتے ہیں۔(احمد ترمذی)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ شاہد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وجئنا بک علی ھولآءِ شھیداً** اور مشہود سے مراد روز قیامت ہے۔حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وذلک یوم مجموع له الناس وذلک یوم مشھود** (لیکن اس قول پر تکرار لازم آئے گی **یوم موعود ویوم مشھود** دونوں ایک ہی ہوں گے) بعض نے کہا کہ شاھد اعمال لکھنے والے فرشتے ہیں اور مشہود آدمی ہے۔حسین بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شاھد امت محمدیہ علی نبیہا الصلوۃ والسلام ہے۔اور مشہود کا مصداق جملہ امم سابقہ ہیں۔اور استدلال **لتکونوا شھدآءَ علی الناس** سے کیا ہے۔سالم بن عبداللہ نے سعید بن جبیر سے اس آیت کی مراد پوچھی تو حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ شاھد اللہ اور مشہود ہم ہیں۔اور آیت **کفی باللہ شھیداً** سے استدلال کیا۔بعض نے کہا کہ اعضاء انسانی شاہد ہیں **لقوله تعالی: یوم تشھدُ علیھم السنتھم وایدیھم وارجلھم** بعض کے نزدیک شاھد انبیاء سابقین اور مشہود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں **لقوله تعالی: واذ اخذ اللہ میثاق النبین الی قوله تعالی: فاشھدوا وانا معکم من الشھدین** قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ للہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت کی تفسیر میں کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی اس کی تفسیر متعین ہوگی۔ورنہ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں بلکہ عموم پر باقی رکھنا ہی اولیٰ ہوگا۔یعنی شاہد سے ہر شاہد بالحق اور مشہود سے ہر مشہود بالحق مراد ہوگا۔ارشاد باری ہے: **شھد اللہ انه لا اله الا ھو والملئکة واولوا العلم** لہٰذا شاہد اللہ تعالیٰ بھی ہیں ملائکہ بھی، اعمال نامے لکھنے والے فرشتے بھی، انبیاء بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی، تمام مومنین خصوصاً امت محمدیہ کے اہل ایمان اور خاص طور پر علماء امت وغیرہ۔اور مشہود کلمہ توحید، صداقت، انبیاء، تبلیغ، رسالت، اعمال انسانی اور ہر کلمہ حق جو کسی سچے شاہد نے کہا ہو۔واللہ اعلم۔

چاروں قسموں میں مناسبت:

پہلی قسم **والسمآء ذات البروج** سے جس طرح فصول وموسمیات وغیرہ کے انقلابات وتغیرات مفہوم ہوتے ہیں۔اسی طرح **یوم الموعود** (روز قیامت) میں بھی انقلابات کا ظہور ہوگا کہ بہت سے اہل عزت ذلیل ہو جائیں گے، بلند پست ہو جائیں گے۔اور بہت سے پست وذلیل بلند وباعزت ہو جائیں گے، لیکن اس تغیر اور انقلابی فیصلہ کے لئے تین چیزیں ہونی ضروری ہیں: (۱) جزا یا سزا کا مستحق (۲) ایسا حاکم جو عمل کے موافق بدلہ دے (۳) وہ عمل نیک یا عمل بد جس کا بدلہ دیا جائے۔ان سب کے بیان کے لئے شاہد ومشہود کی دو قسمیں لائی گئی۔پھر یہ چاروں قسمیں قدرت خداوندی پر دلائل ہیں۔گو شاہد ومشہود کی تفسیر میں اقوال مختلف ہیں صاحب روح المعانی کے بیان کے مطابق ان کی تفسیر میں تقریباً تیس اقوال ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔مگر تفسیر انقلاب تغیر اور قدرت کے اظہار کو مشتمل ہے۔فتامّل۔

نکتہ:......ان چار قسموں میں سے اول دو معرف اور اخیر دو منکر لائی گئی ہیں۔وجہ یہ ہے کہ شاہد ومشہود سے راجح تفسیر کی بنا پر جمعہ اور عرفہ کا غیر معین دن مراد ہے۔یعنی کوئی خاص روز جمعہ یا خاص روز عرفہ مراد نہیں بخلاف

برجوں والے آسمان اور روز قیامت کے کہ وہ مخصوص ومعین ہیں۔فافھم .

قتل اصحب الا خدود النار ایک قول کی بنا پر یہ جواب قسم ہے اور قتل سے پہلے لقد محذوف ہے۔عنوان ترکیب میں دیگر چند احتمالات مذکور ہو چکے ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ بروج کو تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچتے تو یہ دعا کرتے۔اعوذ باللہ من جھد البلاء.

اصحاب الاخدود کون تھے؟

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ آگ کی خندقوں کے واقعات دنیا میں مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں پیش آئے ہیں پھر ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں سے تین واقعات کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان تینوں واقعات کو بیان کیا ہے۔

(۱) ایک واقعہ نجران میں ہوا جو ملک یمن میں واقع ہے۔دوسرا ملک شام میں، تیسرا فارس میں۔یمن میں یوسف ذونواس ابن شرجیل (جو حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا) نے کھائیاں کھدوا کر آگ سے بھروادی تھی۔اور اہل ایمان کو ان کے ایمان لانے کے جرم میں جھونک دیا تھا۔یہ واقعہ فترت کے زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ستر سال قبل پیش آیا تھا۔محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ذونواس نے بارہ ہزار آدمی جلا دیئے تھے پھر جب ارباط (حبشی) نے یمن کو فتح کر لیا تو ذونواس بھاگ کر گھوڑے سمیت سمندر میں گھس کر ڈوب گیا تھا۔

ملک شام میں ابطاموس رومی نے ایسا ہی کیا تھا۔اور فارس میں حضرت دانیال علیہ السلام کے عہد میں بخت نصر نے اہل ایمان کے ساتھ یہی حرکت کی تھی، ابن المنذر وامام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک چوتھا واقعہ نقل کیا ہے جو حبشہ میں اس وقت واقع ہوا جب بنی اسرائیل میں بت پرستی کا رواج عام ہو گیا تھا۔ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان آیات میں کون سے واقعہ کی طرف اشارہ ہے؟ حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ چاروں قصے مراد ہوں۔لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اوّل الذکر واقعہ ذونواس کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ: (۱) مکہ سے قریب ترین یہی واقعہ پیش آیا تھا۔(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین زمانے میں یہی واقعہ ہوا تھا۔(۳) اہل عرب اس واقعہ کو خوب جانتے تھے۔حتی کہ اس واقعہ کے دیکھنے والے بعض اشخاص بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک باقی تھے۔(۴) یہ واقعہ مسلم شریف وغیرہ کتب صحاح میں منقول ہے۔دوسرے واقعات روایت کے اعتبار سے مسلم کی راویت کے ہم پلہ نہیں ہیں۔اسلئے وہ زائد التفات کے لائق نہیں ہیں۔

واقعہ خندق کی تفصیل:

امام نسائی، امام احمد اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیھم نے اور امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں بروایت صہیب رومی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے (ان نقول میں کسی قدر کمی زیادتی ہے مگر ہم خلاصہ نقل کرتے ہیں) کہ کوئی بڑا جلیل القدر بادشاہ تھا اسکے یہاں ایک کاہن یا ساحر تھا جو اپنے فن میں کمال رکھتا تھا اس کی سلطنت گویا اسی کے جادو کے بل پر قائم تھی۔بادشاہ کے دشمنوں کو وہ اپنے جادو کے زور سے ہلاک کر دیتا تھا۔لڑنے بھڑنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔امرائے سلطنت

اورارکان دولت اگر بادشاہ سے ناراض ہوتے یا سرتابی کرتے تو یہ اپنے جادو سے ان کا رخ بادشاہ کی طرف موڑ دیتا اسی طرح وہ اپنے ہر کام جادو سے لیتا۔ جب وہ جادوگر بوڑھا ہوگیا اور اس کو اپنی زندگی سے ناامیدی ہوئی تو اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں میری عمر اخیر ہونے کو ہے۔ آپ کوئی ذہین وفطین لڑکا میرے سپرد کردیں تا کہ میں اس کو اپنا علم سکھادوں۔ تا کہ میرے بعد وہ آپ کے امور سلطنت کو درست رکھے۔ چنانچہ بادشاہ نے ایک عاقل وہوشیار لڑکا اس کے حوالے کردیا۔ وہ لڑکا اس جادوگر کے پاس صبح شام حاضر ہونے اور جادو کا فن سیکھنے لگا۔ راستہ میں ایک راہب (درویش) اپنے صومعہ (عبادت خانہ) میں رہتا تھا (معمر راوی کہتے ہیں کہ اسوقت تک راہب لوگ اپنے اصلی دین عیسوی پر قائم تھے) ایک دن اس لڑکے نے دیکھا کے بہت سے لوگ صومعہ سے نکل رہے ہیں اس نے معلوم کیا کہ یہاں کون رہتا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہاں ایک راہب (عابد) رہتا ہے۔ یہ سن کر لڑکا بھی اس راہب (تارک الدنیا عابد) کے پاس پہنچا۔ اس کی باتیں سنیں۔ راہب کی باتوں سے اسکا قلب متاثر ہوا راہب نے اس لڑکے کو دین حق اور توحید کی تعلیم دینی شروع کردی وہ ایمان لے آیا۔

لڑکا جادوگر کے پاس جاتے ہوئے راستہ میں راہب کے پاس ٹھہر جاتا دیر ہوجانے سے ساحر اس پر غصہ کرتا اور زدوکوب کرتا لڑکا کہہ دیتا کہ مجھے گھر میں دیر ہوگئی۔ آخر ساحر نے بادشاہ کے پاس شکایت کی۔ بادشاہ نے لڑکے کو تاکید کی کہ ساحر کے پاس سویرے پہنچا کرو۔ لوگوں نے کہا کہ یہ لڑکا سویرے جاتا ہے راستہ میں دیر کرتا ہے تو بادشاہ اور ساحر نے خیال کیا کہ کھیل میں لگ جاتا ہے اسلئے دونوں نے لڑکے کو خوب تنبیہ کی۔ لیکن لڑکا درویش کے پاس جاتا رہا۔ ایک دن یہ لڑکا راہب کے پاس سے بادشاہ کی بارگاہ کی طرف واپس ہورہا تھا دیکھتا کیا ہے کہ کسی مہلک جانور (شیر یا اژدہے) نے راستہ روک رکھا ہے۔ لوگ ادھر ادھر کے کھڑے ہیں۔ لڑکے نے دل دل میں خیال کیا کہ آج امتحان کرتا ہوں کہ راہب حق پر ہے یا ساحر۔ یہ خیال کر کے اس نے پتھر اٹھایا اور یہ کہہ کر اے خدا! اگر راہب کا مذہب حق ہے تو اس پتھر سے اس جانور کو ہلاک فرما وہ پتھر اس کے مارا وہ جانور فوراً ہلاک ہوگیا۔ لوگوں نے یہ واقعہ دیکھا تو کہنے لگے کہ اسکو جادوگری میں کمال حاصل ہوگیا ہے لڑکے کی ہر جگہ تعریف ہونے لگی اور خوب شہرت ہوگئی۔ شدہ شدہ یہ خبر راہب کو بھی پہنچی۔ اس نے لڑکے کو تنہائی میں بلا کر کہا بیٹا تجھ کو اللہ تعالیٰ نے بزرگی اور کمال سے نوازا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تیرا مرتبہ بہت بلند ہوگا لیکن تو کسی آزمائش میں مبتلا ہوگا لیکن یہ یاد رکھنا میں کمزور اور بوڑھا آدمی ہوں۔ کسی کو میرا پتہ نہ دینا۔ لڑکے سے قول وقرار لے کر راہب مطمئن ہوگیا۔ ادھر راہب کی صحبت اور انجیل مقدس کی تلاوت اور اتباع کی برکت سے حق تعالیٰ نے اس لڑکے کو ولایت عظمیٰ سے نوازا۔ یہاں تک کہ کوڑی مادرزاد نابینا اور لاعلاج مریض اس لڑکے کی دعا سے شفایاب ہونے لگے۔ لڑکا خوب مشہور ہوگیا۔ اس کی شہرت سن کر اس بادشاہ کا نابینا مصاحب بھی اس کے پاس آیا اور خوب تحفے نذرانے پیش کر کے عرض کیا کہ مجھ پر بھی توجہ فرمائیے۔ اور میری آنکھیں اچھی کردیجئے۔ لڑکے نے کہا مجھے نذرانہ اور ہدیہ درکار نہیں اور شفا میرے ہاتھ میں نہیں اللہ ہی شفا دینے والا ہے اگر آپ اللہ وحدہ لا شریک لہٗ پر ایمان لائیں اور شرک وبت پرستی سے توبہ کرلیں تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرونگا۔ پروردگار عالم آپ کی بینائی واپس فرمادیں گے۔ وہ اندھا شخص اسی مجلس میں مشرف با ایمان ہوا۔ لڑکے نے دعا کی۔ اور اس کی انکھیں روشن ہوگئیں۔ معمول کے مطابق جب یہ شخص بادشاہ کے مجلس میں حاضر ہوا تو بادشاہ کو اس کی بینائی پر تعجب ہوا اس سے معلوم کیا کہ میری مملکت کے تمام معالج تو تیری آنکھوں کے علاج سے عاجز ہوگئے تھے۔ آخر تجھ کو کس طرح شفاء حاصل ہوئی؟ مصاحب نے کہا کہ میرے پروردگار نے اپنی قدرت سے مجھے بینائی عطا فرمائی ہے۔ بادشاہ نے

کہا کہ میرے سوا تیرا پروردگار کون ہے؟ مصاحب نے کہا میرا آپ کا اور ساری کائنات کا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے ساری مخلوق کو پیدا کیا بادشاہ غضبناک ہوگیا اور مصاحب کو سخت سزا دی اور پوچھا کہ یہ عقیدہ تجھے کس نے سکھایا؟ سختی سے گھبرا کر اس نے لڑکے کا نام بتا دیا۔ بادشاہ نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تجھ کو میری پرورش اور میرے ساحر کے فیض سے یہ کمال حاصل ہوا ہے تو بیمار لوگوں کو تندرست، نابیناؤں کو بینا کرتا ہے اور پھر ناشکری کرتا ہے کہ دوسرے کسی کو اپنا پروردگار بتا تا ہے لڑکے نے کہا میرے، آپ اور ساحر کے ہاتھ میں شفاء نہیں۔ اللہ کی قدرت پر موقوف ہے بادشاہ سخت ناراض ہوا اس کو کڑی سزا دلوائی اور کہا کہ یہ لڑکا بہت غائب رہتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اور جگہ جاتا تھا بادشاہ نے کہا کہ اس سے سختی سے پوچھا جائے کہ یہ مدت سے کہاں رہا۔ اور کس کے پاس آتا جاتا ہے۔ جب سختی حد سے بڑھ گئی تو لڑکے نے مجبور ہوکر گوشہ نشین راہب کا نام بتا دیا۔ بادشاہ نے راہب کو گرفتار کروا کر حاضر دربار کیا اور اس سے کہا کہ اگر تو اپنے دین سے نہ پھرے گا تو تجھ کو آرے سے چیر دیا جائیگا۔ راہب نے کہا کہ میں ہرگز اپنے دین برحق سے نہ پھرونگا۔ اور جو مصیبت آئے گی اس پر صبر کرونگا۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے اس کو آرے سے چیر دیا گیا۔ پھر مصاحب کو بلا کر یہی کہا۔ مصاحب نے بھی دین برحق کو چھوڑنے سے انکار کر دیا اور اسکو بھی آرے سے چیر کر شہید کر دیا گیا۔ پھر لڑکے کو بلا کر سمجھایا گیا کہ اگر تجھ کو زندگی محبوب ہے تو باز آ جا ورنہ تو ان دونوں کا انجام دیکھ چکا ہے۔ تیرا حشر بھی یہی ہوگا۔ لڑکے نے بھی بادشاہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تو بادشاہ نے چند آدمیوں کو حکم دیا کہ لڑکے کو پہاڑ کی چوٹی پر لیجاؤ اور اسکو خوب سمجھاؤ اگر مان گیا تو اسکو بڑا مقام دونگا اور اپنا مصاحب بنالونگا اور اگر یہ باز نہ آئے تو پہاڑ کی چوٹی پر سے اسکو دھکیل دینا تا کہ اسکے اعضاء پاش پاش ہو جائیں۔ جب اسکو پہاڑ پر لے گئے اور سمجھایا دھمکایا تو لڑکے نے اللہ سے اپنی حفاظت کی دعا کی۔ اسی وقت زلزلہ پیدا ہوا شاہی لوگ پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو گئے۔ لڑکا بعافیت گھر واپس آیا۔ بادشاہ نے پوچھا وہ لوگ کہاں ہیں؟ جو تجھ کو لے گئے تھے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ میرے پروردگار نے ان کے شر سے میری حفاظت کی اور ان کو ہلاک کر دیا۔ بادشاہ نے دوسرے چند آدمیوں کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو ایک کشتی میں سوار کر کے دریا میں لے جاؤ یہ اپنے دین سے باز آ جائے تو بہتر ہے ورنہ دریا میں پھینک دو۔ چنانچہ وہ اس کو دریا میں لے گئے اور سمجھایا۔ لڑکے نے پھر دعا کی۔ کشتی الٹ گئی۔ شاہی لوگ غرق ہو گئے۔ اور لڑکا صحیح سالم واپس آ گیا۔ بادشاہ نے ماجرا پوچھا تو لڑکے نے پورا قصہ بیان کر دیا۔ اس لڑکے نے کہا کہ اے بادشاہ تو مجھ کو مار نہیں سکتا ہاں اگر تجھ کو میرا قتل ہی منظور ہے تو اس کی تدبیر میں بتا تا ہوں اگر وہ تدبیر اختیار کرے گا تو تو مجھ کو ہلاک کر سکتا ہے۔ بادشاہ نے تدبیر پوچھی۔ تو لڑکے نے کہا اس شہر کے تمام لوگوں کو شہر کے باہر ایک میدان میں جمع کر لے اور مجھ کو سولی پر چڑھا کر ایک تیر اپنی ترکش سے نکال کلمہ **بسم اللہ رب ھذا الغلام** کہہ کر میرے وہ تیر مار تو میں مرجاؤنگا۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ تیر اس لڑکے کی کنپٹی پر لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ کنپٹی پر رکھ لئے۔ اور یہ کہتا جاں بحق ہو گیا کہ میں اپنے پروردگار کے نام پر شہید ہو کر کامیاب ہو گیا۔ اور اس واقعہ کو دیکھنے پر تمام لوگوں نے با آواز بلند کہا **آمنا برب الغلام امنا برب الغلام** یہ سن کر بادشاہ کے لوگوں نے کہا کہ آپ نے ان تین شخصوں کو تو ہلاک کر دیا جو آپ کے مذہب کے خلاف تھے۔ مگر اب تو سب ہی لوگ آپ کے مذہب کے مخالف ہو گئے۔ یہ بات سن کر بادشاہ نہایت غضبناک ہوا اور شرمندگی سے جھنجھلا اٹھا اور خندقیں کھود کر ان میں آگ دہکانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ خندقیں کھود کر آگ دہکا دی گئی۔ ان کے کناروں پر اعیان سلطنت کرسیاں بچھا کر بیٹھ گئے۔ اور سب کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور کارندوں نے کہا کہ سب سے معلوم کرو۔ جو اپنے دین سے نہ پھرے اس کو آگ میں جھونک دو۔

چنانچہ شاہی فرمان کے مطابق ایمان والوں کو آگ میں ڈالنا شروع کیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک ایسی عورت کو بھی لایا گیا جس کی گود میں بچہ تھا عورت کو جب آگ میں ڈالنے لگے تو وہ ہچکچائی۔ بادشاہ نے کہا کہ رہنے دو پہلے اس کے بچے کو آگ میں ڈالو۔ شاید اس طرح وہ اپنے دین سے واپس ہو جائے۔ چنانچہ اس بچہ کو آگ میں پھینک دیا گیا بچہ نے با آواز بلند کہا اماں جی آپ صبر کریں اور بلا پس وپیش بسم اللہ پڑھ کر آگ میں کود پڑیں۔ یہ آگ گل وگلزار ہو جائیگی۔ عورت یہ سنکر بے جھجک آگ میں کود گئی اور وہ آگ ایسی بھڑکی کہ بادشاہ اور اسکے مصاحبین کو (جو کرسیوں پر بیٹھے مظلوموں کے جلنے کا تماشہ دیکھ رہے تھے) جلا کر خاک کر دیا۔ حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کے آگ میں گرنے سے پہلے ہی ان کی روح قبض کر لی تھی۔ اسطرح ان کو اس آگ کی تکلیف سے محفوظ رکھا۔ محمد بن اسحٰق مورخ نے اس واقعہ کو بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور اس لڑکے کا نام عبداللہ بن تامر بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ واقعہ ملک یمن کے شہر نجران میں پیش آیا ہے۔ اور اس حادثہ میں اس ظالم بادشاہ نے (ذونواس) نے تقریباً ۲۰۰۰۰ بیس ہزار آدمیوں کو ہلاک کیا ہے اس بارے میں دوسرے اقوال بھی ہیں محمد بن اسحٰق کی روایت میں بھی ہے کہ یہ لڑکا عبداللہ بن تامر جس مقام پر مدفون تھا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اتفاق سے کسی ضرورت کی بنا پر وہ زمین کھودی گئی تو اس میں عبداللہ بن تامر کی لاش صحیح سالم اس طرح برآمد ہوئی کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ اپنی کنپٹی پر رکھا ہوا تھا۔ کسی دیکھنے والے نے ان کا ہاتھ اس جگہ سے ہٹایا تو خون جاری ہو گیا پھر وہ ہاتھ اس جگہ رکھ دیا تو خون بند ہو گیا انکے ہاتھ پر ایک انگوٹھی تھی جس پر اللہ ربی کندہ تھا۔ عامل یمن نے اس واقعہ کی اطلاع فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ ان کو ان کی سابقہ حالت پر انگوٹھی سمیت دفن کر دو چنانچہ ایسا ہی کر دیا گیا۔

فائدہ...... عبداللہ بن تامر کی شہادت کے دن اہل نجران نے دین عیسوی قبول کیا تھا اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک اسی دین پر قائم رہے ان کے سرداروں (سید و عاقب وغیرہ) نے مدینہ منورہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحث کی۔ اور آیت مباہلہ ان ہی لوگوں کے بارے میں اتری تھی۔

الحاصل قتل اصحب الاخدود الی قولہ شھود میں مذکور واقعہ کی طرف اشارہ کر کے اہل ایمان کے لئے تسلی اور ان کو ستانے والے کفار مکہ کو تنبیہ مقصود ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ حق دبانے سے دبتا نہیں اور مظالم سے رکتا نہیں۔ بلکہ ایمان کا باغ ظلم وستم کے انگاروں کی برسات میں پھلتا پھولتا اور پھیلتا ہے۔ جس طرح چند مومنوں کی قربانیوں سے نجران کی کایا پلٹ گئی۔ اسی طرح مکہ کے چند بے کس ومظلوم اہل ایمان کی قربانیاں ملک عرب میں ایک انقلاب برپا کر دیں گی چنانچہ آیت کے اشاروں سے جو پیشین گوئی ثابت ہوئی دنیا نے دیکھا کہ وہ پوری ہو کر رہی۔

﴿فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ﴾

وما نقموا منھم ...... یعنی ایمانداروں کو یہ سزا کسی چوری ڈکیتی جیسے جرائم کی وجہ سے نہیں دی گئی۔ ان کا جرم وقصور صرف ایمان تھا۔ جو ان کافروں کو ناگوار تھا۔ یہ تاکید المدح بمایشبہ الذم کے قبیل سے ہے جیسے مشہور شعر ہے۔

وَلَا عَيْبَ فِيهِمْ غَيْرَ اَنَّ سُيُوْفَهُمْ　　بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قَرْعِ الْكَتَائِبِ

اور کسی نے فارسی کا یہ شعر بھی اسی طور پر کہا ہے

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے　　کہ ایں مقتول را جز بے گناہی گناہے نیست

اور وہ لوگ ایمان کس پر لائے؟ اللہ پر جو خالق و مالک کائنات ہے۔ العزیز یعنی ایسا زبردست ہے کہ وہ سرکشوں اور متکبروں کو پل بھر میں خاک میں ملا سکتا ہے۔ ان کفار نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ الحمید جس کی ذات عالی میں تمام کمالات اور خوبیاں موجود ہیں لـہ مـلک السموت والارض آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت اسی احکم الحاکیمن کی ہے ان تینوں صفات (العزیز، الحمید اور ملوکیت) میں اہل ایمان کی مدح و تحسین اور ان کی عقلمندی پر آفریں ہے کہ ایسی صفات والی ذات پر ایمان اور اسکی اطاعت تقاضائے عقل اور موجب عزت وافتخار ہے۔ اور کفار کی حماقت و بلادت کا اظہار اور ان کے کفر و ظلم پر وعید شدید بھی ہے کہ وہ زبردست باکمال بادشاہ ہے وہ اپنے دوستوں کی حمایت اور دشمنوں سے ضرور انتقام لے گا۔ ورنہ اس کی بادشاہت میں خلل واقع ہو جائے گا۔ اور دوستوں کی حمایت اور دشمنوں سے انتقام لینے کیلئے اسکا باخبر ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے اخیر میں فرمایا: واللہ عـلـی کـل شیء شهيدٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہیں ان سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ایمان والوں کا صبر اور کفار کے مظالم اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ وہ صبر استقامت پر انعام دے گا اور ظلم و ستم پر انتقام لیگا جو جس چیز کا مستحق ہے اس کو وہی چیز پہنچے گی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ (۱۰)

بیشک انہوں نے ایماندار مردوں اور ایماندار عورتوں کو ستایا پھر انہوں نے توبہ نہیں کی تو انکے لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کیلئے جلانیوالا عذاب ہے

اِنَّ	الَّذِیْنَ	فَتَنُوا	الْمُؤْمِنِیْنَ	وَ	الْمُؤْمِنٰتِ	ثُمَّ	لَمْ	یَتُوْبُوْا	فَلَهُمْ	عَذَابُ	جَهَنَّمَ	وَلَهُمْ	عَذَابُ الْحَرِیْقِ
بیشک	جن لوگوں	ایذادی	ایمان والے	اور	ایمان والیاں	پھر	نہ	توبہ کی	پس واسطے ان	عذاب	دوزخ	اور انکیلئے عذاب	جلنا

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ (۱۱)

بیشک جو لوگ ایمان لائے انہوں نے نیک کام بھی کئے ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔

اِنَّ	الَّذِیْنَ	اٰمَنُوْا	وَ	عَمِلُوا	الصّٰلِحٰتِ	لَهُمْ	جَنّٰتٌ	تَجْرِیْ	مِنْ	تَحْتِهَا	الْاَنْهٰرُ	ذٰلِكَ	الْفَوْزُ	الْكَبِیْرُ
بیشک	جو لوگ	ایمان لائے	اور	کام کئے	اچھے	واسطے ان	باغات	جاری ہیں	سے	انکے نیچے	نہریں	یہ	مراد پانا	بڑا

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ (۱۲) اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ (۱۳) وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ (۱۴) ذُو الْعَرْشِ

یقیناً آپکے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ زندہ کریگا اور وہی بہت بخشنے والا اور بہت محبت کرنیوالا، عرش کا مالک،

اِنَّ	بَطْشَ	رَبِّكَ	لَشَدِیْدٌ	اِنَّهٗ	هُوَ	یُبْدِئُ	وَیُعِیْدُ	وَهُوَ	الْغَفُوْرُ	الْوَدُوْدُ	ذُو الْعَرْشِ
بیشک	پکڑ	تمہارا رب	بڑی سخت	بیشک وہ	وہی	پہلی بار پیدا کرتا ہے	اور لوٹاتا ہے	اور وہ	بخشنے والا	محبت والا	عرش والا

الْمَجِیْدُ (۱۵) فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (۱۶) هَلْ اَتٰكَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ (۱۷) فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ (۱۸)

بڑی شان والا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے کیا آپ کو ان کے لشکروں کا قصہ معلوم ہے؟ یعنی فرعون اور ثمود کا

الْمَجِیْدُ	فَعَّالٌ	لِّمَا	یُرِیْدُ	هَلْ	اَتٰكَ	حَدِیْثُ	الْجُنُوْدِ	فِرْعَوْنَ	وَثَمُوْدَ
بڑی بزرگی والا	کرڈالنے والا	جو	وہ چاہے	کیا	تجھ تک پہنچی	بات	لشکروں	فرعون	اور ثمود

بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ تَكْذِیْبٍ (۱۹) وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِیْطٌ (۲۰)

بلکہ یہ کافر جھٹلانے میں لگے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

بَلِ	الَّذِیْنَ	كَفَرُوْا	فِیْ	تَكْذِیْبٍ	وَّ	اللّٰهُ	مِنْ وَّرَآئِهِمْ	مُحِیْطٌ
بلکہ	جو لوگ	کافر ہوئے ہیں	میں	جھٹلانے	اور	اللہ سے	سے انکے ہر طرف	گھیرے ہوئے

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ (۲۱) فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۲۲)

بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے۔ جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

بَلْ	هُوَ	قُرْاٰنٌ	مَّجِیْدٌ	فِیْ	لَوْحٍ	مَّحْفُوْظٍ
بلکہ	وہ	قرآن	بزرگ	میں	لوح	محفوظ

لغات:

الحریق صفت مشبہ کا صیغہ ہے جو فاعل ومفعول دونوں کے معنی دیتا ہے۔ یہاں بمعنی فاعل ہے یعنی جلانے والا (ن س) دانت پیسنا (س) کٹ جانا، گر جانا، حَرَّقَ اَحْرَقَ بِالنَّارِ، جلانا تحرق احترق جلنا **الفوز** اسم فعل ومصدر فتح وکامیابی (ن) کامیاب ہونا **بطش** مصدر (ن ض) پکڑنا **ودود** صیغہ مبالغہ بہت محبت کرنے والا۔ یعنی بہت ثواب دینے والا۔ بابہ سمع، **فعال** صیغہ مبالغہ، زبردست کام کرنے والا، خود مختاری سے کرنے والا۔ بابہ فتح **الجنود** جمع واحد **الجند** لشکر۔ **ورآء** آگے، پیچھے، سوا۔ **محیط** صیغہ واحد مذکر اسم فاعل احاطہ کرنے والا ہر طرف سے گھیرے ہوئے، پورا پورا قابو رکھنے والا (افعال) مجرد میں نصر سے، **لوح محفوظ** ام الکتاب، اللہ کی وہ کتاب علم جس میں ہر شئی مکتوب موجود ہے، جس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس لوح تک شیاطین کو دسترس ہے نہ کسی مخلوق کو علمی رسائی۔

ترکیب:

اِنَّ حرف مشبہ بہ فعل **الذین** اسم موصول **فتنوا** فعل ضمیر مستترہ هم فاعل **المؤمنین والمؤمنت** معطوفین مفعول بہ جملہ فعلیہ معطوف علیہ **ثم لم یتوبوا** جملہ فعلیہ معطوف، معطوفین صلہ اسم ان **فلهم** (فا فی الخبر لأن الموصول مع الفعل یکون متضمناً لمعنی الشرط، ولفظة أن لا تزیل ذلك التضمن عند الجمهور) خبر مقدم (وقد للتخصیص) ای ثابت لهم **لهم عذاب جهنم** مرکب اضافی۔ مبتدا موخر۔ جملہ اسمیہ معطوف علیہ **ولهم عذاب الحریق** کذلک معطوف، معطوفین ان کی خبر **ان الذین امنوا وعملوا الصلحت** موصول وصلہ اسم ان **لهم** خبر مقدم مثل سابق، **جنت** موصوف **تجری** فعل **من تحتها** متعلق **الانهر** فاعل جملہ فعلیہ صفت، مرکب توصیفی۔ مبتدا موخر جملہ اسمیہ خبر ان۔ جملہ اسمیہ۔ **ذلک** مبتدا **الفوز الکبیر** مرکب توصیفی خبر۔ جملہ اسمیہ خبریہ۔ **ان** اپنے اسم **بطش ربک** (مرکب اضافی) اور خبر **لشدید** سے مل کر جملہ اسمیہ **انه** حرف مشبہ بہ فعل مع اسم **هو** ضمیر فصل **یبدئ** فعل وفاعل ضمیر مستتر **هو** جملہ فعلیہ معطوف علیہ **ویعید** اسی طرح معطوف معطوفین خبر **ان** یا **هو** کی خبر ہو کر جملہ اسمیہ ہو کر پھر خبر **ان** و عاطفہ **هو** مبتدا **الغفور** خبر اول **الودود** خبر ثانی **ذوالعرش** خبر ثالث **المجید** خبر رابع **فعال** اپنے متعلق **لما یرید** سے مل کر خبر خامس (**یرید** فعل فاعل جملہ فعلیہ صلہ **ما** موصول صلہ سے مل کر مجرور لام) مبتدا اپنی پانچوں

خبروں سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوکر ماقبل پر عطف، بعض نے المجید اور فعال کو مبتدا محذوف (الذی خالقه) کی خبر مانا ہے المجید میں دوسری قراءت جر کی ہے اس صورت میں یہ العرش کی صفت ہوگا۔ هل اتک ...... اسکی ترکیب هل تک حدیث موسیٰ کی طرح ہے فرعون اور الجنود سے بدل ہے۔ لا ن المراد منه هو و قومه وثمود معطوف ہے فرعون پر۔ (ثمود غیر منصرف ہے اور دو سبب علمیت و تانیث ہیں لا نه فی معنی القبیلة سموا باسم ابیهم الأکبر، وقیل سمیت لقلة ما ئها من الثمد وهو الماء القلیل وکانت مساکنهم الحجر ما بین الحجاز والشام) بل للا ضراب الذین کفروا اسم موصول مع صلہ مبتدا فی تکذیب (ای ثا بتون فی تکذیب هذه القصص) خبر وَ عاطفه اللہ مبتدا محیط اپنے متعلق مقدم من ورآئهم سے مل کر خبر۔ بل مثل سا بق ای بل الذی کذبوا به هو الخ هو مبتدا قرا ن موصوف اپنی دونوں صفتوں مجید اور فی لوحٍ محفوظ (مرکب توصیفی مجرور ای مرقوم فی لوح محفوظٍ) سے مل کر۔ جملہ اسمیہ خبریہ معطوف سابق پر۔

تفسیر:

ان الذین فتنوا یہ ان ظالموں کی سزا کا بیان ہے جنہوں نے اہل ایمان کو صرف ان کے ایمان کی بناء پر آگ کی خندق میں ڈالا تھا۔ اور سزا میں دو باتیں ارشاد فرمائیں فلهم عذاب جهنم ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے ولهم عذاب الحریق اور ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے۔ ہوسکتا ہے کے دوسرا جملہ پہلے ہی جملہ کی تاکید اور اسی کا بیان ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ دوزخ میں جا کر ان کو ہمیشہ آگ میں جلنے کا عذاب ہوتا رہے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے جملہ میں اصل بڑے عذاب کا بیان ہو جو آخرت میں ہوگا۔ اور دوسرے جملہ میں اس سزا کا ذکر ہو جو ان کو بطور نمونہ دنیا میں ملی۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ جن مومنوں کو انہوں نے آگ کی خندق میں ڈالا تھا ان کو اللہ تعالیٰ نے جلنے کی تکلیف سے اسطرح بچادیا کہ آگ کے چھونے سے پہلے ہی ان کی روحیں قبض کر لی گئی پھر وہ آگ اتنی بھڑک اٹھی کہ خندق سے نکل کر شہر بھر میں پھیل گئی اور ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے اس آگ نے جلا ڈالا صرف بادشاہ ذونواس بھاگ نکلا۔ آگ سے بچنے کے لئے دریا میں کود کر ڈوب مرا۔ بعض مفسرین نے ثانی جملے سے عذاب قبر مراد لیا ہے۔ ان کی سزا میں ثم لم یتوبوا کی قید بھی ہے مطلب یہ ہے کہ اس ظلم وستم کے بعد بھی اگر وہ توبہ کر لیتے تو بخش دیے جاتے۔ اس جملہ میں عاصیوں کو توبہ کی دعوت بھی دی گئی ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کے جود وکرم کو دیکھو کہ ان ظالموں نے اولیاء اللہ اور اہل ایمان کو جلا کر ان کا تماشا دیکھا پھر بھی حق تعالیٰ نے توبہ ومغفرت کی ان کے لئے گنجائش رکھی تھی۔ یعنی اگر وہ توبہ کر لیتے تو ان کو معاف کر دیا جاتا۔

بعض حضرات نے اس قید سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جو مسلمان کسی کو عمداً قتل کر کے تائب ہو جائے تو اس کی توبہ قبول ہے۔ لیکن اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کافر اگر کسی مسلمان کو قتل کردے اور توبہ کر کے مسلمان ہو جائے تو اس کا جرم بھی معاف ہو جائے گا الا سلا م یهدم ما کان قبله اور اس پر علماء امت کا اجماع ہے۔ اور یہ بات کہ مسلمان کسی مسلمان کو عمداً قتل کر کے تائب ہو جائے تو اسکی توبہ قبول ہوگی کہ نہیں۔ آیت کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہاں قاتلین کفار ہیں۔ ہاں اگر آیت کے الفاظ کے عموم سے صرف استدلال کیا جائے تو بلاشبہ استدلال کی گنجائش ہے۔ اصحاب الا

خـدود کے واقعہ کو سن کر ایمان والوں کو جلنے والے بے کس مظلوم مومنوں کی اذیت وشہادت پر رنج وملال کا ہونا لابدی ہے۔ اور یہ انتظار بھی ضروری ہے کہ نہ معلوم قیامت کے دن ان کو کیا بدلہ ملے گا۔اسی لئے آئندہ آیت میں جملہ مستانفہ کے طور پر (بہ ترک حرف العطف) اہل ایمان کا اخروی حال بیان فرمایا چنانچہ ارشاد ہے۔

ان الذین امنو ا...... یعنی ایمان وعمل صالح والوں کو آخرت میں ایسے خوش نما باغات ملیں گے جن کے درختوں اور محلات کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔اور وہ بہت بڑی کامیابی ہے جو ان کو ایمان وعمل پر استقامت کی وجہ سے میسر آئے گی۔اوران کے تمام مصائب ان کے لئے راحت کا باعث ہوں گے۔

سوال: کافروں کی جزا کے بیان میں فاء جزائیہ لائی گئی (**فلھم عذا ب جھنم**) اور مومنوں کی جزا کے بیان میں اس حرف جزا کو ترک کر کے **لھم جنت** فرمایا گیا۔اس میں کیا نکتہ ہے۔**جواب**: نقطہ سمیں یہ ہے کہ ثواب آخرت محض اللہ کے فضل پر ہے عمل پر موقوف نہیں۔مثلاً نابالغ بچہ یا جو بلوغ سے قبل مجنون ہوگیا ہو۔یا کوئی ایسا آدمی جو علم وعمل کے ماحول سے دور پہاڑ یا کھوہ میں بالغ ہوا ہو یا دارالحرب میں ایمان لایا اور طریقہ اسلام سے واقف ہی نہ ہوا ہو اور عبادت واطاعت نہ کرسکا۔یہ سب لوگ بغیر عمل ہی جنت میں داخل ہونگے بلکہ اعمال والے بھی اللہ کے فضل وکرم اور رحمت ہی سے جنت میں جائیں گے۔چنانچہ بخاری ومسلم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **لن ینجی احدا منکم عملہ قالوا ولا انت یا رسول اللہ؟ قال انا الّا ان یتغمدنی اللہ منہ برحمتہ الحدیث (مشکوۃ ص ۲۰۷)**۔ہرگز تم میں سے کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے سکتا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا اور نہ آپ کو اے رسول خدا! فرمایا اور نہ مجھ کو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت میں چھپالے۔دوسری حدیث میں ہے۔**لا یدخل احدا منکم عملہ' فی الجنۃ ولا یجیرہٗ من النا ر ولا انا الا برحمۃ اللہ (رواہ مسلم)** تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرسکتا اور نہ اس کو دوزخ سے بچاسکتا ہے اور نہ مجھ کو مگر اللہ کی رحمت سے۔(یہ سب کچھ ہوگا)۔بخلاف عذاب کے کہ وہ بغیر کفر وفسق پر موقوف ہے۔اس لئے سزا کے بیان پر فاء لائی گئی ہے جس سے سبب پر دلالت ہو رہی ہے۔اور جزاوثواب کے ذکر میں فاء ترک کردی گئی۔

ان بطش ربک لشدید پچھلی آیات میں کفار کی سزا اور مومنین کی جزا کا بیان تھا یہاں **ان بطش** سے **فعال لما یرید** تک صفات قہر وجبروت اور صفات رحم وکرم کو بیان فرما کر ماقبل کے مضمون کو موکد فرمایا گیا ہے۔ارشاد فرمایا: کہ آپ کے رب کی گرفت سخت ہے اس سے بچا نہیں جاسکتا وہ مرنے کے بعد بھی گرفت کرسکتا ہے کیونکہ اس نے پہلی بار پیدا کیا ہے اور دوبارہ زندہ کرسکتا ہے اور وہ رحم وکرم اور بخشش کا معاملہ بھی فرماتا ہے کیونکہ وہ غفور (بے حد بخشنے والا) **ودود** (اپنے بندوں سے نہایت محبت کرنے والا ہے) اور وہ لازوال مجد وبزرگی والا ہے۔بادشاہوں کا بادشاہ ہے کائنات اسی کے قبضہ وقدرت میں ہے۔نظام کون ومکان اسی کے امر سے وابستہ ہے وہ جو چاہے کرے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شہنشاہ عالی صفات سے ڈرنا چاہیے۔اسکی مکمل اطاعت کرنی چاہیے۔ان صفات کے بیان میں دعوت ایمان وعمل بھی آگئی۔**واللہ اعلم**۔

سوال: **الغفور ،الودود ،ذوالعرش المجید** یہ صفات معرف بالّام یا مضاف الی المعرف بلام ہیں۔اور فعّال منکر ہے ایسا کیوں؟ نیز فعّال صیغہ مبالغہ کیوں لایا گیا؟

جواب: فعال لما یرید یا طا لعاً جبلاً کی طرح مشابہ مضاف ہے۔اور مشابہ مضاف بحکم مضاف ہوتا ہے اور مضاف پر الف لام نہیں آتا۔اور صیغہ مبالغہ مراد اور کثرت مفاعیل پر دال ہے۔جیسا کہ واقع بھی ہے۔یعنی جن اشیاء سے اللہ کے ارادے وفعل کا تعلق ہے وہ بہت کثیر ہیں جن کی کثرت پر یہ صیغہ مبالغہ دلالت کرتا ہے۔

ھل اتک ......پچھلی آیات میں مختلفۃ الآثار صفات کا ذکر تھا۔جن سے اللہ تعالیٰ کا منعم ومنتقم ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ اصحاب الا خدود اور مظلوم مومنین کا واقعہ اس کا ثبوت ہے کہ ھل اتک سے اسی کا مزید ثبوت بطور تاکید گذشتہ قوموں کے واقعات کی طرف اشارہ کر کے پیش کیا جارہا ہے۔لیکن بدقسمت کفار مکہ اس قسم کے واقعات کو سن کر بجائے عبرت ونصیحت اپنے انکار وتکذیب پر ڈٹے ہوئے تھے اس لئے فرمایا بل الذین کفروا فی تکذیب یعنی کفار عبرت ونصیحت حاصل نہیں کرتے بلکہ جھٹلانے ہی میں مشغول ہیں۔حالانکہ یہ اللہ کے قبضہ سے باہر نہیں ہیں۔وہ جب چاہے ان کی پکڑ کرسکتا ہے جس طرح اصحاب الا خدود ،فرعون وثمود اور دوسری قوموں کی کر چکا ہے۔یہ لوگ ان واقعات کی نہیں بلکہ قرآن کی (جو ان واقعات کو بیان کرتا ہے) تکذیب کرتے ہیں۔حالانکہ یہ قرآن جھٹلانے کی چیز نہیں۔اسمیں غلطی وتحریف کا احتمال نہیں۔بلکہ وہ لوح محفوظ میں ثبت ہے جہاں جن وانس اور شیاطین کی رسائی ممکن نہیں۔

تم تفسیر سورۃ البروج بعون اللہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہٖ الامین وعلیٰ آلہٖ اصحابہٖ اجمعین

سُوْرَۃُ الطَّارِق

سُوْرَۃُ الطَّارِقِ مَکِّیَّۃٌ وَّ ھِیَ سَبْعَ عَشَرَۃَ اٰیَۃً

(رکوع:۱،آیات:۱۷) سورۂ طارق مکہ میں نازل ہوئی اوراس میں سترہ آیتیں ہیں۔ (کلمات:۶۱،حروف:۱۳۹)

ربط ومناسبت

یہ سورت بالاتفاق مکیہ ہے سورۂ بروج سے اس کا ربط یہ ہے کہ اس کا آغاز آسمان اور برجوں (ستاروں) کی قسموں سے تھا۔اس سورت کی ابتدا بھی ایسی قسموں سے ہے سورۂ بروج میں مسئلہ مبدء ومعاد کا ذکر تھا یہاں بھی ہے۔سورۂ بروج کے اخیر میں احاطہ اور حفاظت کا بیان تھا۔یہاں اس آسمان کا جو تمام انسانوں کو محیط ہے اور آسمان کے محافظ ستاروں کا ذکر ہے نیز إن کل نفس لمّا علیھا حافظ میں حفاظت انسان کا بیان ہے۔وہاں کفار کی تکذیب قرآن کا ذکر تھا۔یہاں حقارت انسان،شان قرآن اور امہال مکذبین کا ذکر ہے وغیرہ۔

شان نزول:

قاضی ثناء اللہ پانی پتی وشاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی روٹی اور دودھ سے تواضع فرمائی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور زمین سے اس قدر قریب ہو گیا کہ تمام گھر اور اس کی تمام چیزیں چمک گئیں۔ابو طالب گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یہ کیا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ یہ تارا ہے جو فرشتے آسمان کی حفاظت کے لئے شیاطین کو مارتے ہیں۔اور قدرت خداوندی کی ایک نشانی ہے۔ابو طالب کو اس سے تعجب ہوا اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے،اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام یہ سورۃ لیکر آئے۔اس سورت میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان نشانات ودلائل سے کام لے کر صحیح راستہ (دین اسلام) کی طرف آنا چاہئے اور قدرت خداوندی،حشر ونشر اور معاد کا یقین کرنا چاہئے آسمان کو بایں عظمت حفاظت کی احتیاج ہے تو انسان بایں ناتوانی بدرجہ اولیٰ حفاظتِ خداوندی کا محتاج ہے،اس لیے اس کو ہمہ وقت حق تعالیٰ کا مطیع اسی اور اسی سے ہر آن ملتجی رہنا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم کرنیوالا بڑا مہربان ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (۱) وَمَآ اَدْرٰکَ مَاالطَّارِقُ (۲) النَّجْمُ الثَّاقِبُ (۳) اِنْ کُلُّ نَفْسٍ

قسم ہے آسمان کی اور رات میں آنے والے کی۔اور آپ کو معلوم ہے رات میں آنے والا کیا ہے؟ وہ روشن ستارہ ہے۔کوئی شخص ایسا نہیں

قسم	السَّمَآءِ	وَ	الطَّارِق	وَمَآ	اَدْرٰکَ	مَاالطَّارِقُ	النَّجْمُ	الثَّاقِبُ	اِنْ	کُلٌّ	نَفْس
	آسمان	اور	رات کوآنیوالا	اور کیا	تم نے سمجھا	کیا ہے طارق	ستارا	چمکتا ہوا	نہیں	کوئی	جان

لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (٤) فَلْيَنْظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ (٥) خُلِقَ مِن مَّآءٍ دَافِقٍ (٦) يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ

جس پر ایک محافظ مقرر نہ ہو۔ اسلئے انسان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے بنایا گیا اسکو ایک اچھلتے پانی سے بنایا گیا ہے جو

مِنْ بَيْنِ	يَخْرُجُ	دَافِقٍ	مَآءٍ	مِنْ	خُلِقَ	خُلِقَ	مِمَّ	الْإِنسَانُ	فَلْيَنْظُرِ	حَافِظٌ	عَلَيْهَا	لَمَّا
سے درمیان	نکلتا ہے	اچھلتا	پانی	سے	وہ پیدا کیا گیا	پیدا کیا گیا	کس چیز سے	انسان	چاہئے کہ دیکھے	نگہبان	اس پر	مگر

الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (٧) إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ (٨) يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (٩) فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ

پشت اور سینہ کے درمیان سے نکلتا ہے۔ بیشک وہ اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ جس دن سب کی قلعی کھل جائیگی پھر نہ اس کا کوئی زور ہوگا

مِنْ قُوَّةٍ	لَهُ	فَمَا	السَّرَآئِرُ	تُبْلَى	يَوْمَ	لَقَادِرٌ	رَجْعِهِ	عَلَى	إِنَّهُ	التَّرَآئِبِ	وَ	الصُّلْبِ
قوت	اسکے لئے	پس نہ	راز	جانچے جائینگے	دن	البتہ قادر	اسکو دوبارہ لوٹانا	پر	بیشک وہ	چھاتیوں	اور	پیٹھ

وَّلَا نَاصِرٍ (١٠) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (١١) وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (١٢) إِنَّهُ لَقَوْلٌ

اور نہ کوئی مددگار۔ قسم ہے بارش والے آسمان کی اور پھٹنے والی زمین کی۔ یقیناً یہ

لَقَوْلٌ	إِنَّهُ	ذَاتِ الصَّدْعِ	وَالْأَرْضِ	ذَاتِ الرَّجْعِ	وَالسَّمَآءِ	نَاصِرٍ	وَّلَا
بات	بیشک وہ	پھٹ جانیوالی	اور زمین کی	بارش والا	قسم آسمان کی	مددگار	اور نہ

فَصْلٌ (١٣) وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (١٤) إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا (١٥) وَّأَكِيدُ كَيْدًا (١٦)

فیصلہ کن کلام ہے اور وہ لایعنی کلام نہیں۔ واقعی وہ لوگ تدبیر کر رہے ہیں۔ اور میں بھی تدبیر کر رہا ہوں۔

كَيْدًا	وَّأَكِيدُ	كَيْدًا	يَكِيدُونَ	إِنَّهُمْ	بِالْهَزْلِ	هُوَ	وَّمَا	فَصْلٌ
ایک تدبیر	اور میں تدبیر کرتا ہوں	ایک مکر	مکر کرتے ہیں	بیشک وہ	بے فائدہ	وہ	اور نہیں	فیصلہ کر دینے والا

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (١٧)

لہٰذا آپ ان کافروں کو مہلت دیجئے ان کو تھوڑی سی مہلت دیدیجئے۔

رُوَيْدًا	أَمْهِلْهُمْ	الْكٰفِرِينَ	فَمَهِّلِ
ایک مدت تک	ڈھیل دے ان	کافروں	پس ڈھیل دے

لغات:

الطارق صیغہ واحد مذکر اسم فاعل طرقاً (ن) ہتھوڑا مارنا، بجانا، کھٹکھٹانا، رات کے وقت، ایسی ٹکر مارنا جس کی آواز سنائی دے۔ اسی سے مطرقۃ بمعنی ہتھوڑا اور طریق بمعنی راستہ ہے۔ پھر عرف لغت میں مسافر کا نام پڑ گیا کہ وہ راستہ کو اپنے قدم سے روندتا ہے اور مشہور ہو کر یہی اس کے حقیقی معنی بن گئے۔ پھر رات میں آنے والے کے لئے مختص ہوا۔ کیونکہ وہ آ کر اکثر بند دروازہ پیٹتا ہے۔ پھر وسعت دے کر ہر اس شئی پر بولا جانے لگا جو رات میں ظاہر ہو۔ حتی کہ ان خیالی صورتوں کے لئے بھی جو رات میں ظاہر ہوتی ہیں اس کا استعمال ہونے لگا۔ اور یہاں جمہور کے نزدیک رات میں ظاہر ہونیوالا ستارہ مراد ہے۔ یا تو جنس مراد ہے یا یہ ایک معہود ستارہ کا نام ہے۔ النَّجْمُ اسم جنس، ثریا، یا زحل، یا کل ستارے (ج) النجوم نجم نُجُوماً (ن) ظاہر ہونا، طلوع ہونا، بیلدار گھاس یا ستارہ کا نکلنا۔

الثاقب صیغہ واحد مذکر اسم فاعل چمکنے والا، جلا دینے والا ثَقَبَ ثَقْبًا ثُقُوْبًا (ن) روشن ہونا، سوراخ کرنا، چھیدنا ثَقُبَ ثُقَابَةً سرخی میں آگ کے مشابہ ہونا۔ لَمَّا کبھی حرف جازم ہوتا ہے لم کی طرح، اور کبھی حرف شرط یا حرف وجود لوجود یا وجوب لوجوب ہوتا ہے (اس صورت میں اکثر ماضی کے دو جملوں پر آتا ہے۔ ایک شرط ہوتا ہے دوسرا جزا۔ لَمَّا استثنائیہ بھی آتا ہے۔ یہاں استثنائیہ بمعنی الاّ ہے۔ تفصیل لغات القرآن جلد ۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مِمَّ مثل عَمَّ ہے دافق صیغہ واحد مذکر اسم فاعل اچھلنے والا۔ دفق دفقا دفوقا (ن ض) اچھل کر بہنا۔ بھر کر گرنا، زور سے گرانا، الصلب پیٹھ ج اصلاب ، اصلب قوت، حسب، سخت پتھریلی جگہ ج صِلَبَةٌ راغب کہتے ہیں کہ صلب کے معنی سخت کے ہیں۔ اور صلابت وشدت ہی کی وجہ سے پشت کو بھی صلب کہا جاتا ہے صلب (ن ض) سولی دینا، بھوننا، صلابة (ك س) سخت ہونا بخل کرنا، التر آئب چھاتیاں یہ تريبة کی جمع ہے۔ سینہ کی ہڈی۔ سینہ کا بالائی حصہ ترب تربا (س) خاک میں ملنا محتاج ہونا، تبلی مضارع مجہول کا صیغہ واحد مونث غائب بمعنی جانچی جائے گی۔ بلاءٌ سے ماخوذ ہے (ن) آزمانا۔ السرآئر سريرة کی جمع راز، بھید یاء کو جمع میں ہمزہ کر لیا گیا ہے حالانکہ واحد میں ہمزہ نہ تھا۔ کیونکہ جمع میں یا سے پہلے الف ساکن ہے جمع میں دو ساکن جمع ہوئے تو یاء کو ہمزہ سے بدل کر اس کو کسرہ دے دیا۔ التقاء ساكنين نہ رہا۔ تبدیل نہ کرتے تو یاء پر کسرہ ثقیل ہوتا۔ اسی طرح قبيلة کی جمع قبائل اور مَعِيْشَة کی جمع معايش میں یاء کو ہمزہ سے اس لئے نہیں بدلا کہ وہ یاء اصلی ہے۔ الرجع مصدر (ض) لوٹنا، بارش کے بعد بارش، نفع، موسم بہار کی سبزی وغیرہ ذات الرجع کا ترجمہ بعض نے چکر مارنے والا کیا ہے۔ بیضاوی، شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین وائمہ لغت نے ''بارش والا'' ترجمہ کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی مروی ہے، شاہ ولی اللہ، شاہ رفیع الدین اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی معنی پسند فرمائے ہیں۔ الصدع مصدر (ف) پھٹنا۔ یہاں مراد زمین سے کھیتی کا پھوٹ نکلنا ہے فَصْلٌ مصدر (ض) جدا کرنا، فیصلہ کرنا قَوْلٌ فَصْلٌ حق و باطل کی تمیز، حق بات، سچا فیصلہ کرنے والا قول۔ الهزل کھیل، باطل، بے ہودگی، بے ہودہ کام هزل هزلا (س ض) کھیل کرنا، بے ہودگی کرنا (ن ض) لاغر کر دینا یکیدون کیدا (ن) مکر کرنا، فریب کرنا، برا ارادہ کرنا، جنگ کرنا، تیار کرنا، اچھی یا بری تدبیر کرنا، لفظ استدراج اور مکر کی طرح کید کا استعمال بھی مذموم میں اکثر ہوتا ہے۔ مگر یہ سب محمود معنی میں بھی مستعمل ہیں۔ قرآن پاک میں جہاں بطور مذمت ہیں۔ معنی مذموم مراد ہیں۔ اور جہاں بطور مذمت نہیں وہاں معنی محمود مراد ہوں گے۔ مَهِّل واحد مذکر امر حاضر تفعیل سے مہلت دینا۔ (ف) اطمینان سے کام کرنا (س) بھلائی میں پیش قدمی کرنا۔ افعال سے مہلت سے دینا۔ رُوَيْدًا اسم فعل ہے تھوڑی مہلت ابن خالویہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل اِرْوَادٌ تھا رُوَيْدًا اس کی تصغیر ہے۔ جس کے معنی مہلت دینے اور ٹھہرنے کے ہیں اتقان میں ہے کہ رويد اسم ہے ہمیشہ مصغر و مامور ہو کر بولا جاتا ہے۔ یہ رَوْدٌ کی تصغیر ہے۔ جس کے معنی مہلت کے ہیں۔

ترکیب:

وَالسَّمَآءِ قسم (مرّ مثلهٗ) وَالطَّارِقِ عطفٌ عليه على الاصح كمامرّ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الطَّارِقُ تقدم مثله النَّجْمُ الثَّاقِبُ مرکب توصیفی الطَّارِق کا بیان ہے۔ یا هو مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور یہ جملہ اسمیہ خبریہ مستانفہ ہوگا۔ یہ سوال مقدر ماهو کا جواب ہے۔ اِنْ نافيه كل نفس مرکب اضافی مبتدا لَمَّا بمعنی الاّ حَافِظٌ اپنے متعلق مقدم عليها سے مل کر خبر، جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔ یا عليها کو ثبت فعل محذوف کے متعلق اور حافظ کو اس فعل کا فاعل قرار

دے کر جملہ فعلیہ اور پھر خبر بنالیا جائے۔ یا ثابت محذوف کے متعلق ہو کر خبر مقدم اور حافظ مبتدا موخر پھر یہ جملہ اسمیہ مبتدا کل نفس کی خبر ہوگا۔(وفی قرائة لما مخففة فیکون ان مخففة من المثقلة فحنئذٍ اسمه محذوف ای انهٗ، و کل نفس لما علیها حافظ خبرهٗ واللام فی لماهی الفارقة بین ان النافیة و المخففة وما زائدة فافهم۔ بہر دو صورت یہ جملہ جواب قسم ہے۔ اور وما أدرك...... جملہ معترضہ مضمون قسم کی تاکید کے لئے ہے۔ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ میں فاء تفریعیہ اور فعل، فاعل و متعلق جملہ فعلیہ خُلِقَ فعل مجہول ضمیر نائب فاعل مَآءٍ موصوف دَافِقٍ بمعنی مَدْفُوقٍ یا بمعنی ذی کذا) صفت اوّل يَخْرُجُ فعل ضمیر فاعل مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ متعلق جملہ فعلیہ صفت ثانی۔ مَآءٍ دونوں صفتوں سے ملکر مجرور، متعلق فعل، جملہ فعلیہ مستانفہ ہو۔ وقع جواباً لسوال مقدر کأنّه قیل مِمَّ خُلِقَ فقیل خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ ......اِنَّهٗ حرف مشبہ بہ فعل مع اسم لَقَادِرٌ اپنے متعلق مقدم عَلٰى رَجْعِهٖ سے ملکر خبر۔ جملہ اسمیہ خبریہ تُبْلَى اپنے نائب فاعل السَّرَآئِرُ سے ملکر جملہ مضاف الیہ یوم کا ہوا۔ اور وہ رَجْعِهٖ کا ظرف ہے۔ یا فعل محذوف يَبْعَثُهٗ کا ظرف ہوگا۔ فاء تفریعیہ مَا مشابہ بلیس لَهٗ متعلق محذوف خبر مقدم من زائدة لأنه یزید بعد النفی غالباً قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ معطوفین اسم اور لا ناصر میں لا زائدہ تاکید کے لئے ہے۔ جملہ اسمیہ خبریہ ہو اذات الرجع صفت ہے والسمآء کی اور ذات الصدع، والارض کی۔ مرمثله غیر مرة۔ اِنَّهٗ حرف مشبہ بہ فعل مع اسم لقول فصل مرکب توصیفی خبر انّ جملہ اسمیہ خبریہ مَا مشابہ بلیس هو اسم بِالْهَزْلِ خبر والباء زائدة لتاکید النفی و تحسین الکلام والجملة عطف علی ماسبق۔ اِنَّ حرف مشبہ بہ فعل هُمْ عائد الی مشرکی العرب اسم يَكِيْدُوْنَ فعل ضمیر جمع غائب فاعل كَيْدًا مفعول مطلق جملہ فعلیہ معطوف علیہ واکید کیدا مثلہ معطوف علیہ۔ فاء تفریعیہ لترتیب مابعد ها علی ما قبلها مَهِّلْ فعل با فاعل الکفرین مفعول بہ جملہ فعلیہ انشائیہ مؤکد یا مبدل منہ امهل فعل با فاعل هم مفعول بہ رويدا مصدر تاکید کیلئے یا مصدر محذوف امہالا کی صفت۔ مفعول مطلق۔ جملہ فعلیہ انشائیہ تاکید ماقبل یا بدل۔

تفسیر:

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے آسمان اور ستاروں کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا کہ ہر انسان پر ایک نگراں مقرر ہے۔ جو اسکے تمام افعال، اعمال، حرکات، سکنات اور حالات کو دیکھتا، جانتا اور سنتا ہے۔ اس کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے انجام پر غور و فکر کرے۔ اور اعمال کے نتائج کو پیش نظر رکھے کہ وہ دنیا میں جو کچھ کر رہا ہے وہ مالک کے یہاں محفوظ ہے۔ قیامت کے دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ جس طرح آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں۔ مگر ان کا ظہور صرف رات کے وقت ہوتا ہے اسی طرح اعمال سب کے سب نامہ اعمال میں اس وقت بھی محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور ایک وقت خاص یعنی قیامت میں ہوگا۔ اسلئے انسان کو چاہئے کہ وہ کسی وقت بھی آخرت سے غافل نہ ہو۔ یہاں پر قلب انسانی میں وسوسہ شیطانی سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بدنی منتشر اعضاء کا جمع ہونا دشوار ہے۔ بلکہ جہال کی نظر میں ناممکن ہے تو اس کو اپنی ابتدائی تخلیق میں غور کرنے کی دعوت و ہدایت کے ذریعہ زائل فرمایا کہ اللہ نے جس طرح مختلف ذرات و مواد کو اوّل بار جمع کر کے ایک سمیع و بصیر انسان بنا دیا ہے۔ اسی طرح وہ قادر مطلق دوبارہ اس کو عرصہ حیات پر لے آئیگا۔ اسکے بعد قیامت کا تھوڑا سا حال بیان فرما کر دوسری قسم زمین اور آسمان کی کھا کر غافل انسان کو یہ جتلایا گیا کہ جو کچھ اس کو فکر آخرت کی تلقین کی گئی ہے وہ اس قرآنی تلقین کو مذاق

ودل لگی نہ سمجھے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت واقعہ ہے جو اسکے سامنے آ کر رہے گی۔ پھر فرمایا کہ کفار ومشرکین فوری مواخذہ نہ ہونے سے یہ خیال نہ کریں کہ کفر وشرک اللہ کو پسند ہے۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ اللہ کی طرف سے تھوڑی سی مدت کیلئے ڈھیل دی جارہی ہے تاکہ اس فرصت میں انسان سوچ سمجھ لے۔ اس پر سورت ختم ہوگئی۔ والسمآء سے مراد جمہور کے نزدیک آسمان ہے۔ بعض نے اس سے مراد بارش لی ہے۔ والطارق آسمان کی قسم بھی کھائی گئی ہے اور اس کی وضاحت میں فرمایا گیا کہ طارق نجم ثاقب ہے۔

طارق اور نجم ثاقب:

اس سورت کے شروع میں آسمان کے ساتھ طارق کی قسم کھائی گئی ہے۔ طارق کے معنی رات کو آنیوالے کے ہیں، ستارے چونکہ دن میں چھپے رہتے اور رات کو ظاہر ہوتے ہیں اسلئے ستاروں کو بھی طارق کہا جاتا ہے۔ چنانچہ النجم الثاقب (وہ چمکدار ستارہ ہے) ہی سے اسکی تفسیر فرمائی گئی۔ قرآن پاک نے ستارہ متعین نہیں فرمایا اسلئے اس کا مصداق ہر ستارہ ہوسکتا ہے، جمہور کا مسلک یہی ہے۔ اس میں دوسرے اقوال بھی ہیں۔ مثلاً (۱) بعض نے اس سے ثریا ستارہ مراد لیا ہے۔ کیونکہ اہل عرب اس پر نجم کا اطلاق کرتے ہیں۔ یعنی نجم بول کر ثریا مراد لیتے ہیں۔ (۲) بعض نے زحل مراد لیا ہے۔ کیونکہ ثاقب کے معنی مرتفع (بلند) روشن چمکدار (تاریکی میں چھید کرنیوالے) کے آتے ہیں اور زحل سب ستاروں سے بلند بھی ہے۔ اور افلاک سے تاریکی کو زیادہ دور بھی کرتا ہے۔ کما زعم المنجمون المتقدمون (۳) فراء سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد قمر ہے۔ کیونکہ وہ سب سے زائد روشن ہے۔ اور قرآن نے اس کو آیۃ اللیل بھی قرار دیا ہے۔ لیکن نجم کا اطلاق قمر پر مشہور نہیں ہے۔ (۴) اس سے مراد صبح کا ستارہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ ستارہ ساتویں آسمان پر رہتا ہے جب آسمان پر ستارے جلوہ گر ہوجاتے ہیں تو وہ ان کے پاس آجاتا ہے اور ان کے پاس رہتا ہے۔ پھر لوٹ کر اپنے مقام پر چلا جاتا ہے۔ اور طارق کا مصداق وہی ہے (لیکن اہل نجوم اسی کو زحل کہتے ہیں اور اس کا نزول وصعود معروف ومعقول نہیں) اور اس روایت کی نسبت بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف درست نہیں معلوم ہوتی۔ (۵) ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ طارق سے مراد ہر رات کو آنیوالا ہے۔ خواہ وہ ستارہ ہو یا اور کوئی مخلوق۔

ان کل نفس لما علیھا حافظ یہ جواب قسم ہے۔ اس میں ان نافیہ اور لما مشدد بمعنی الا برائے استثناء ہے۔ یہ قبیلہ ہذیل کی لغت کے موافق ہے۔ اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ کوئی نفس ایسا نہیں جس پر حافظ نہ ہو۔ حافظ کے معنی نگراں کے بھی آتے ہیں۔ یعنی جو کسی کے اعمال کو نگاہ میں رکھے تاکہ ان کا حساب لے۔ اور حافظ بمعنی محافظ بھی آتا ہے جسکے معنی مصائب وآفات سے حفاظت کرنے والے کے ہیں۔ پہلے معنی کے اعتبار سے حافظ سے مراد فرشتہ کاتب عمل ہے اور یہاں اس کو اگرچہ بلفظ مفرد بمعنی جنس بیان کیا ہے۔ مگران کا متعدد ہونا دوسری آیت وان علیکم لحفظین کراما کاتبین وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے وہ فرشتے مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی حفاظت کیلئے مقرر فرمائے ہیں۔ جو دن رات آفات ومصائب سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہاں اس آفت کے پہنچنے کے وقت وہ ہٹ جاتے ہیں جس کا پہنچنا اللہ کی طرف سے مقدر ہوچکا ہوتا ہے۔ اس کو دوسری آیت میں صراحت کیساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ لـــه

معقبت من بین عدیه و من خلفه یحفظونه من امر اللہ یعنی انسان کے لئے نوبت بہ نوبت آنے والے محافظ فرشتے مقرر ہیں۔ جو بامرالٰہی آگے پیچھے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم نے فرمایا کہ ہر مومن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین سو ساٹھ فرشتے اس کی حفاظت کیلئے مقرر ہیں جو انسان کے ہر عضو کی حفاظت کرتے ہیں، ان میں سے سات فرشتے صرف انسان کی آنکھ کی حفاظت کیلئے ہیں۔ یہ فرشتے انسان سے ہر بلاؤ مصیبت کو جو اس کیلئے مقدر نہیں اسی طرح دفع کرتے ہیں۔ جیسے شہد کے برتن پر آنے والی مکھیوں کو پنکھے وغیرہ سے دفع کیا جاتا ہے اگر انسان پر یہ حفاظتی پہرہ نہ ہوتو شیاطین اسکو اچک لیں اور اس کی بوٹیاں نوچ لیں۔ بعض علماء نے لفظ نفس سے مطلق ذات الشیٔ مراد لی ہے۔ اور حافظ کا مصداق ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ ہر شیٔ ممکن ہے اور ممکن کے وجود و عدم مساوی ہوتے ہیں۔ اسکے لئے مرجح صرف ذات واجب تعالیٰ ہے۔ اور وہی خالق وقیوم بھی ہے۔ اور باقی رکھنے اور حفاظت کرنیوالا بھی وہی ہے۔ **کما قال تعالیٰ: إن اللہ یمسک السموت والارض أان تزولا ولئن زالتآ ان امسکھما من أحد من بعدہ** بیشک اللہ تعالیٰ نے ہی آسمان وزمین کو تھام رکھا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں اور اگر وہ ٹل جائیں تو اسکے سوا کوئی ان کو تھام نہیں سکتا) **وقال تعالیٰ: وکان اللہ علی کل شیء رقیبا واللہ علی کل شیء شھید** اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگراں ہے۔

اذا ما خلوت الدھر فلا تقل　　　خلوت ولکن قل علیّ رقیب

ایک قول یہ بھی ہے کہ حافظ کا مصداق عقل ہے۔ واللہ اعلم۔

فلینظر الانسان مم خلق اسمیں فاء سببیہ ہے۔ حافظ کا مصداق اگر ملائکہ ہیں تو مطلب یہ ہوگا۔ جب فرشتے محافظ ونگراں ہیں۔ اور ان میں سے وہ فرشتے بھی ہیں جو اعمال انسانی کی نگرانی کرتے ہیں تو انسان کو اپنے حالات درست رکھنے چاہئیں۔ اور آخرت سے غفلت نہ برتنا چاہئے۔ اور آخرت پر یقین کرنے کے لئے اپنے ابتدائی حالات میں غور فکر کرنا چاہئے۔ تاکہ اپنے ابتدائی تخلیقی حالات سے دوبارہ تخلیق کی صحت پر استدلال کر سکے۔ اور اس سے ایمان وعمل کی راہ ہموار ہو سکے۔ اور اگر حافظ کا مصداق ذات باری تعالیٰ ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ جل شانہٗ کے حافظ ونگراں ہونیکا ثبوت اور اس کی معرفت اے انسان خود تیری ذات میں ہے۔ اپنی تخلیق میں غور کر اور قدرت خداوندی کا مشاہدہ کر۔ نیز اسی سے آخرت وبعث پر استدلال کر۔ اور اگر حافظ کا مصداق عقل ہے تو اس میں عقل سے کام لے کر اپنی مصالح کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت ہے نیز اس بات کی دعوت ہے کہ انسان اپنی عقل سے ابتدائے خلقت میں غور کرے تاکہ اسپر قدرت حق واضح ہو جائے۔ اور وہ اس بات کا یقین کر لے کہ جس ذات گرامی نے عناصر میں اوّل بار حیات ڈالدی، حالانکہ حیات کا ان سے کبھی تعلق نہ ہوا تھا۔ تو دوبارہ حیات دینا کیا مشکل ہے۔ جبکہ ایک بار اس جسم سے حیات کا تعلق قائم ہو بھی چکا ہے۔ **وقد یقرر التفریع علی جمیع الاوجہ بنحو واحد فتامّل.**

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ اسی پیدا شدہ سوال کا جواب بطور استیناف ذیل میں مذکور ہے کہ: **خلق من مآء دافق** ......انسان ایک اچھلتے ہوئے پانی یعنی نطفۂ منی سے پیدا کیا گیا ہے۔ جو پیٹھ اور سینہ کے درمیان سے نکلتا ہے) یہ منی خواہ صرف مرد کی ہو یا مرد وعورت دونوں کی۔ اور عورت کی منی میں گو اندفاق (اچھلنا) مرد کی منی کے برابر نہیں ہوتا لیکن کچھ اندفاق ضرور ہوتا ہے۔ اور ماء سے عورت ومرد دونوں کی منی مراد لیجائے تو لفظ مآء کو مفرد اس وجہ سے لایا گیا کہ دونوں مادے ملکر مثل شیٔ واحد ہو جاتے ہیں۔

نطفہ کہاں سے نکلتا ہے؟

عام طور پر حضرات مفسرین نے یخرج من بین الصلب والترآئب کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ نطفہ مرد کی پشت اور عورت کے سینہ سے نکلتا ہے۔ لیکن محققین اطبا کی تحقیق وتجربہ یہ ہے کہ نطفہ انسان کے سارے بدن سے نکلتا ہے اور نطفہ کا جو حصّہ مرد عورت کے عضو سے نکلتا ہے بچہ کا وہ عضو اسی حصّہ سے بنتا ہے۔ البتہ دماغ کو اس میں سب سے زیادہ دخل ہے۔ اسی لئے مشاہدہ ہوتا ہے کہ جماع کی کثرت کرنے والے اکثر ضعف دماغ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ محققین اطباء کا کہنا ہے کہ نطفہ تمام اعضاء سے منفصل ہوکر اور اس کا معظم حصہ دماغ سے نکل کر نخاع (پشت اور سینہ کے پٹھوں) کے ذریعہ خصیتین میں جمع ہوتا ہے پھر وہاں سے احلیل کے ذریعہ نکلتا ہے۔

اگر یہ تحقیق درست ہے تو حضرات مفسرین نے جو نطفہ کا خروج مرد کی پشت اور عورت کے سینہ کے متعلق قرار دیا ہے۔ اس کی توجیہ بھی سہل ہے۔ کیونکہ اطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ منی کی تولید میں دماغ کو بڑا دخل ہے۔ اور دماغ کا خلیفہ وقائم مقام نخاع ہے۔ جو ریڑھ کی ہڈی کے اندر دماغ سے پشت اور پھر خصیتین تک آیا ہوا ہے۔ اسی کی کچھ شاخیں سینہ کی ہڈیوں میں بھی آئی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کہ عورت کی منی نکلنے میں سینہ کی ہڈیوں کو زیادہ دخل ہو اور مرد کے نطفہ میں پشت سے آنے والے نطفہ کا دخل زیادہ ہو۔ اور اگر قرآن کریم کے الفاظ میں غور کیا جائے تو ان میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں صرف اتنا مذکور ہے کہ نطفہ پشت اور سینہ کے درمیان سے نکلتا ہے اس کا مطلب بے تکلف یہ ہوسکتا ہے کہ نطفہ مرد و عورت دونوں کے پورے بدن سے نکلتا ہے اور سارے بدن کی تعبیر آگے پیچھے کے اہم اعضا سے کر دی گئی۔ سامنے کے حصہ میں سینہ سب سے اہم ہے۔ کیونکہ قلب وجگر وغیرہ اسی میں ہیں۔ اور پیچھے کے حصہ میں پشت سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ گردے وغیرہ اہم اجزاء اسی میں ہیں۔ لہٰذا دونوں میں سے نکلنے کا مطلب یہ ہوا کہ سارے بدن سے نکلتا ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پشت اور سینہ چونکہ بدن کے دو طرفین ہیں اسلئے کنایہ جمیع بدن سے ہوسکتا ہے۔

ترائب کو جمع کیوں لایا گیا؟

ترائب جمع تریبۃ کی ہے جسکے معنی سینہ کے آتے ہیں۔ سینہ گو ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر اہل عرب کے عرف میں اس کو جمع سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ امرؤ القیس کے شعر میں ہے۔

ومهفهفة بيضاء غير مفاضة　　ترائبها مصقولة كالسجنجل

اور وہ محبوبہ پتلی کمر والی گوری چٹی اور ستواں سڈول ہے۔ اس کا سینہ آئینہ کی طرح چمکدار ہے۔

گویا ماحول (آس پاس) کے اعتبار سے جمع لے آتے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ ترائب سینہ کی ہڈیاں یا وہ ہڈیاں جو دونوں طرف ہنسلی کی ہڈیوں سے ملی ہوئی ہیں۔ یا وہ ہڈیاں جو چھاتیوں اور ہنسلیوں کے درمیان ہیں۔ یا سینہ کے دائیں بائیں جانب کی چار چار پسلیاں، یا دونوں ہاتھوں دونوں ٹانگوں اور دونوں آنکھوں کا مجموعہ یا ہار پہننے کی جگہ۔ ان تمام معانی سے جمع مفہوم ہوتی ہے۔ اور معانی مذکورہ کے موافق مفسرین کے تمام اقوال ہیں۔

نیز اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں کہ صلب وترائب سے کس کے صلب وترائب مراد ہیں۔ مرد کے یا عورت کے یا دونوں کے۔ جمہور مفسرین کا قول گذر چکا۔ کہ صلب الرجل اور ترائب المراۃ مراد ہے۔ کقولک

یخرج من بین زید و عمرو خیر کثیر علیٰ معنی انهما سببان فیه بعض کہتے ہیں: یخرج من بین صلب الرجل و ترائبه گویاوہ اس بات کے قائل ہیں کہ عورت کے منی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ قول نصوص اور طب دونوں کے خلاف ہے۔ بعض نے کہا: ان ذلک باعتبار ان الرّجل والمرأۃ یصیران کالشئ الواحد فکأن الصلب والترائب لشخص واحد. وعن قتادۃ ان المعنی یخرج من بین صلب کل واحد من الرّجل و المرأۃ وترائب کل منهما۔) حضرت قتادہ کے قول کے اعتبار سے بھی یہ شبہ رفع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مافوق الواحد پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ...... مطلب یہ ہے کہ جو قادر مطلق پشت وسینہ کی ہڈیوں اور جسم کی تنگ وتاریک راہوں سے نطفہ منی کو گذار کر رحم مادر میں لاتا ہے۔ اور اس مقام پر خلقت کی نگاہوں سے چھپا کر اس نطفۂ منی کو انسان بنا دیتا ہے پھر اس کو ایک تنگ راستہ سے دنیا میں لا کر اس کی بقاء کے تمام انتظامات کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ خالق اکبر اس کو فناء کر کے دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔ گویا اوّل تخلیق دوبارہ تخلیق کے امکان کو بتا رہی ہے۔ اور ممکن شئی کے وقوع کی خبر اگر کوئی مخبر صادق دیدیتا ہے تو فطرت انسانی اس کے وجوب وقوع کا یقین کرتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی خبر سے اس امکان کا وجوب وقوع ثابت ہو گیا۔ لہٰذا آخرت میں دوبارہ زندہ ہونیکا انکار عقل وتقاضائے فطرت انسانی کے خلاف ہوا۔

یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ ...... (جس دن مخفی امور ظاہر کر دیئے جائیں گے) مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن انسان کے تمام عقائد، خیالات، نیات، عزائم اور مخفی اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انسان کے تمام پوشیدہ رازوں کو کھول دے گا۔ ہر اچھے بُرے عقیدہ وعمل کی علامت انسان کے چہرہ پر رونق وزینت یا ظلمت اور سیاہی کی صورت میں ظاہر کر دی جائیگی۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا عالم مادّہ ہے۔ یہاں مادّہ جسم کے احکام غالب ہیں اور روح کے مغلوب ہیں۔ اسلئے انسان اپنی روح کے اوصاف یہاں بہ تکلف چھپا سکتا ہے۔ اور آخرت عالم روحانیت ہے وہاں روحانی اوصاف مکمل طریقہ پر ظاہر ہوں گے۔ اور جسم ان کو روک نہ سکے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے ﴿فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ﴾ پھر نہ اس کو خود چھپانے کی قدرت ہوگی ﴿وَلَا نَاصِرٍ﴾ اور اظہار کے بعد اس کی سزا سے بچانے کیلئے اس کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا۔ جیسے دنیا میں انسان اپنے اعمال بد اپنی ذاتی تدبیروں اور قوتِ عقل وحواس سے چھپا لیتا تھا۔ اور ظاہر ہونیکے بعد اسکے حمایتی سزا سے بچا لیتے تھے۔ جسمانی کثافت کا تقاضا پوشیدگی اور روحانی لطافت کا مقتضیٰ ظہور ہے۔ اسلئے عالم مادہ وجسمانی حکومت میں ستر ہے۔ اور عالم روحانی وسلطنت روح میں ظہور ہوگا۔ فافہم۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ...... (اور قسم ہے بارش والے آسمان کی) رجع بارش کو اسلئے کہتے ہیں کہ وہ لوٹ کر (باربار) آتی ہے یا اس وجہ سے کہ بادل بارش کو زمین کے سمندر سے اٹھاتا ہے۔ اور پھر اس کو زمین کی طرف واپس کر دیتا ہے۔ (اور لفظ رجع (ض) لازم ومتعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) جمہور مفسّرین نے الرجع کی یہی تفسیر کی ہے۔

قالت الخنساء ؎

یوم الوداع تری دموعًا جاریة　　　كالرجع فی المدجنة السّارية

رخصت کے دن تو جاری ہونے والے ایسے آنسو دیکھے گا جیسے رات کی کالی کالی گھٹا کی بارش

حضرت ابن عباس وحضرت مجاہد رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ السَّمَآء سے بادل الرَّجْعِ سے بارش مراد ہے۔

ابن زید کہتے ہیں السَّمَآءِ سے آسمان مراد ہے اور الرَّجْعِ سے شمس وقمر اور کواکب کا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف رجوع کرنا مراد ہے۔ یعنی آسمان کے جس حصہ سے ستارے حرکت شروع کرتے ہیں چوبیس (۲۴) گھنٹہ میں یا ایک مہینہ میں یا سال بھر میں وہ اسی مقام پر آجاتے ہیں۔ اور شاہ عبدالعزیز و شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات نے خود آسمان کی حرکت مراد لی ہے۔ اور ترجمہ کیا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں چکر لگانے والے آسمان کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان خود حرکت کرتا ہے۔ **وهذا مبنيّ على ان السّماء والفلك واحد فهي يتحرك، وظاهر كلام السّلف ان السّماء غير الفلك وانها لا تدور ولا تتحرك.** (واللہ اعلم)

بعض نے الرَّجْعِ سے مراد ملائکہ لئے ہیں (**لرجوعهم باعمال العباد اوالىٰ جناب البارى والامور المفوضة اليهم**) وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (اور قسم ہے پھٹنے والی زمین کی) اشجار، نباتات، معدنیات، چشمے اور دریا وغیرہ نکلنے سے زمین پھٹتی ہے۔ **وقيل ذات الاموات لانصداعها عنهم عند النشور ۔ والعموم اولىٰ ۔**

ان دونوں قسموں کا انتخاب:

اوپر کی آیات میں دو باتیں ذکر کی گئی تھیں (۱) انسان کا دوبارہ پیدا ہونا (۲) مخفی اسرار اور پوشیدہ رازوں کا ظاہر ہو جانا۔ ان دونوں قسموں سے ان دونوں باتوں کے ثبوت و وضاحت پر ایسی دو مثالیں پیش فرمائی گئیں جن کا ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے۔ بارش کا بار بار آنا، کواکب و سیارات کا اپنی منزلوں میں واپس آنا جس سے رات دن موسمیات اور فصلوں کی آمد و رفت ہوتی ہے۔ یہ سب مشاہدات انسان کے دوبارہ پیدا ہونے اور اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ کے بین ثبوت ہیں، اسی طرح زمین سے مختلف اشیاء اشجار، نباتات وغیرہ کا برآمد ہونا۔ حشر اور ڈھکی چھپی چیزوں کے ظہور پر دلیل ہے۔ **فتفكر**

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ...... (بلاشبہ قرآن حق و باطل کا فیصلہ کرنیوالا ہے) اِنَّهٗ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے یعنی پورا قرآن پاک جو اس سورت اور آیت مذکورہ پر بھی مشتمل ہے قول فیصل ہے یعنی انتہائی فیصلہ کو پہنچا ہوا ہے۔ گویا کہ خود ہی فیصلہ ہے اسی لئے بجائے فاصل کے لفظ فصل (مصدر) لایا گیا۔ یہ جمہور کی تفسیر ہے۔ بعض نے کہا کہ مر کر جینے اور مخفیات کے ظاہر ہو جانیکی بات قطعی ہے۔ **وَالاوّل اولىٰ۔**

وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ...... یہ کوئی دل لگی اور مذاق کی بات نہیں۔ بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو پڑھنے اور سننے والا اس کی تصدیق کرے۔ اور قلبی خشوع و خضوع سے اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب فتنہ رونما ہوگا۔ میں نے عرض کیا اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ ارشاد فرمایا کتابُ اللہ ہے۔ جسمیں پہلوں کے واقعات اور بعد والوں کی خبریں ہیں۔ اور تمہارا فیصلہ ہے۔ **هو الفصل ليس بالهزل من تركه من جبار قصمه الله ومن ابتغى الهُدٰى فى غيره اضلّه الله وهو حبل الله المتين وهو الذكر الحكيم وهو الصراط المستقيم** ۔الحدیث۔ یعنی یہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہے۔ ہنسی اور دل لگی نہیں جو ظالم اس کو چھوڑ دے گا اللہ تعالیٰ اس کی کمر توڑ دیگا۔ اور جو شخص اسکے علاوہ میں ہدایت ڈھونڈیگا۔ خدا اس کو گمراہ کر دیگا۔ اور وہ اللہ کی مضبوط رسّی ہے۔ اور وہ حکمتوں والا ذکر ہے اور وہی صراط مستقیم ہے۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ ...... یعنی کفار مکہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکاری کرتے ہیں۔ یعنی زبان سے قلب

کے خلاف اظہار کرتے ہیں۔ یا رسول اللہ کام بگاڑنے اور نور حق کو بجھانے کے لئے مختلف تدبیریں اور سازشیں کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو ڈھیل دیکر ان کی غفلت بڑھا کر ان سے سخت مواخذہ کی تدبیر کرتے ہیں۔ اے ہمارے نبی آپ بھی تھوڑا صبر کیجئے اور ان کو تھوڑے عرصہ کھانے کھیلنے دیجئے۔ عنقریب ان کی پکڑ ہوگی۔ اس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو تسلی و تلقین صبر ہے۔ اور کفار کو دھمکی بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے یہ گرفت کی دھمکی ہے۔ چنانچہ بدر کی لڑائی میں اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔

تَمَّ تَفْسِيرُ سُوْرَةِ الطَّارِقِ بَحمْدِللّٰهِ الْخَالِقِ الرَّازِقِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى نَبِيِّهِ الْفَائِقِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَعَلٰى كُلِّ صَالِحٍ وَّصَادِقٍ

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعَ عَشَرَةَ اٰيَةً

(رکوع:١، آیات:١٩) سورۃ اعلیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں انیس آیات ہیں۔ (کلمات:٧٢، حروف:٧)

اس سورت کا دوسرا نام سورۃ سَبِّحْ بھی ہے۔ اس میں بالاتفاق انیس آیات ہیں۔ جمہور کے نزدیک یہ سورۃ مکیہ ہے۔ بعض نے اس کو مدنیہ کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس میں صلوٰۃ عید و صدقہ فطر کا ذکر ہے اس لئے یہ مدنیہ ہے۔ لیکن اس کو جمہور نے تسلیم نہیں کیا۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کی تردید کرتے ہوئے بخاری شریف کی حدیث کو استدلال میں پیش کیا ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے پہلے ہمارے پاس (مدینہ) حضرت معصب بن عمیر و حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہما آئے اور ہم کو قرآن مقدس کی تعلیم دینی شروع کی۔ اور پھر حضرت عمار، حضرت بلال اور حضرت سعد رضی اللہ عنہم تشریف لائے۔ پھر بیس صحابہ کے ساتھ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تشریف لائے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے تو میں نے اہل مدینہ کو کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اتنے خوش ہوئے ہوں جتنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے وہ خوش ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ چھوٹی بچیاں اور بچے بھی (خوشی سے) کہہ رہے تھے ھذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد جاء۔ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی میں نے چند سورتیں پڑھ لی تھیں۔ جن میں سبح اسم ربک الاعلی بھی تھی اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت ہجرت نبوی سے پہلے ہی نازل ہو چکی تھی۔

ربط و مناسبت:

سورۃ طارق میں اور اس سورت میں بھی دیگر سورتوں کی طرح مختلف وجوہ سے ربط ہے۔ مثلاً: (١) اس میں یہ تھا کہ ہر اک نفس پر ایک نگہبان مقرر ہے۔ اس میں یہ بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے نگہبان خود باری تعالیٰ ہیں تا کہ علوم غیبیہ و وحی ربانی آپ فراموش نہ کر پائیں۔ (٢) وہاں انسانی اور دیگر مخلوقات کی ابتدائے پیدائش کا ذکر تھا جو نطفہ منی اور پانی سے ہوئی تھی۔ اور یہاں اس کی انتہا کا ذکر ہے۔ (٣) وہاں قرآن کے اوصاف کا ذکر تھا کہ یہ کلام ربانی فیصلہ لاثانی ہے۔ یہاں بھی کلام اللہ کے اوصاف مذکور ہیں کہ اس پر عمل موجب نجات اور اس سے اعراض موجب ہلاکت ہے وغیرہ۔

شانِ نزول:

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑی بڑی سورتیں نازل ہونے لگیں اور غیب سے بے شمار علوم کا فیضان ہونے لگا تو قلب مبارک میں یہ خیال گذرا کہ میں خود امی ہوں، ایسا نہ ہو کہ قرآن مقدس یا علوم الہیہ میں سے کچھ حصہ بھول جاؤں۔ اس لیے اس سورت میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ آپ بھولیں گے نہیں، ہم خود آپ کے معلم ہیں اور خود ہی محافظ بھی ہیں۔

فضائل سورت اعلیٰ:

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت **سبح اسم ربک الاعلی** سے بہت محبت رکھتے تھے۔ (۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی رکعت **سورۃ سبح**، دوسری میں **قل یایھا الکفرون** اور تیسری میں **قل ھو اللہ احد** اور معوذتین پڑھتے تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے مگر اس میں معوذتین کا ذکر نہیں ہے (۳) ابو تمیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت **سبح اسم ربک الاعلی** کا نام افضل **المسبحات** رکھا۔ (۴) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ میں **سبح اسم ربک الاعلی** اور **ھل اتک حدیث الغاشیۃ** پڑھتے تھے۔ اور عید جمعے کے دن ہوتی تو دونوں نمازوں میں ان دونوں سورتوں کو پڑھتے تھے۔ (۵) حضرت عبداللہ بن الحرث رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آخری نماز مغرب کی پڑھی تو آپ نے پہلی رکعت میں **سبح اسم ربک الاعلی** اور دوسری میں **قل یا یھا الکفرون** پڑھی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان اور رحم کرنیوالا ہے

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى (۱) الَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲) وَالَّذِىۡ قَدَّرَ فَهَدٰى (۳) وَالَّذِىۡۤ اَخۡرَجَ

اپنے رب عالی شان کی پاکی بیان کیجئے۔ جس نے پیدا کیا اور ٹھیک کیا۔ اور جس نے مقدر فرما کر راہ دکھائی۔ اور جس نے چارہ اگایا

سَبِّحِ	اسۡمَ	رَبِّكَ	الۡاَعۡلَى	الَّذِىۡ	خَلَقَ	فَسَوّٰى	وَالَّذِىۡ	قَدَّرَ فَهَدٰى	وَالَّذِىۡ	اَخۡرَجَ
پاکی بیان کر	نام	اپنا رب	سب سے بلند	جس	پیدا کیا	پھر ٹھیک کیا	اور جس	اندازہ کیا، پس راہ دکھائی	اور جس	نکالا

الۡمَرۡعٰى (۴) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰى (۵) سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى (۶) اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ

پھر اس کو سیاہ کوڑا کرڈالا۔ ہم آپکو پڑھائیں گے۔ پھر آپ نہ بھولیں گے۔ مگر جتنا اللہ کو منظور ہوگا۔ بے شک وہ ظاہر پوشیدہ (ہر شئی) کو جانتا ہے۔

الۡمَرۡعٰى	فَجَعَلَهٗ	غُثَآءً	اَحۡوٰى	سَنُقۡرِئُكَ	فَلَا تَنۡسٰٓى	اِلَّا	مَا	شَآءَ اللّٰهُ	اِنَّهٗ	يَعۡلَمُ
چارہ	پھر اسے کردیا	خشک	سیاہ	ہم جلد پڑھائیں گے آپ کو	پس نہ بھولیں گے آپ	مگر	جو	اللہ چاہے	بیشک وہ	جانتا ہے

الۡجَهۡرَ وَمَا يَخۡفٰى (۷) وَنُيَسِّرُكَ لِلۡيُسۡرٰى (۸) فَذَكِّرۡ اِنۡ نَّفَعَتِ الذِّكۡرٰى (۹) سَيَذَّكَّرُ

اور ہم آپ کو سہولت دیں گے آسان چیز کی۔ تو آپ نصیحت کیجئے اگر نصیحت مفید ہو۔ جو خداترس ہوگا وہ جلد سمجھ جائے گا۔

الۡجَهۡرَ	وَمَا	يَخۡفٰى	وَنُيَسِّرُكَ	لِلۡيُسۡرٰى	فَذَكِّرۡ	اِنۡ	نَّفَعَتِ	الذِّكۡرٰى	سَيَذَّكَّرُ
ظاہر	اور جو	پوشیدہ	اور ہم آپ کو سہولت دینگے	آسان طریقہ	پس سمجھا دیں	اگر	نفع دے	سمجھانا	جلد سمجھ جائیگا

مَنْ يَّخْشٰى (۱۰) وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى (۱۱) الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (۱۲) ثُمَّ لَا يَمُوْتُ

اور جو بد نصیب ہوگا وہ اس سے گریز کرتا رہے گا۔ جو جہنم رسید ہوگا۔ پھر وہاں نہ مریگا۔

مَنْ	يَّخْشٰى	وَيَتَجَنَّبُهَا	الْاَشْقَى	الَّذِىْ	يَصْلَى	النَّارَ	الْكُبْرٰى	ثُمَّ	لَا يَمُوْتُ
جو	ڈرتا ہے	اور ایک طرف رہیگا اس	بدبخت	جو	داخل ہوگا	آگ	بہت بڑی	پھر	نہ مرے گا

فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۱۳) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۱۴) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (۱۵) بَلْ تُؤْثِرُوْنَ

اور نہ جئے گا۔ بے شک وہ کامیاب ہو گیا جو پاک ہوگیا۔ اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھتا رہا۔ بلکہ تم تو یہ حقیر پسند کرتے رہو۔

فِيْهَا	وَلَا يَحْيٰى	قَدْ اَفْلَحَ	مَنْ	تَزَكّٰى	وَذَكَرَ	اسْمَ	رَبِّهٖ	فَصَلّٰى	بَلْ	تُؤْثِرُوْنَ
اسمیں	اور نہ جئے گا	تحقیق بامراد ہوا	جو	پاک ہوا	اور یاد کیا	نام	اپنا رب	پھر نماز پڑھی	بلکہ	اختیار کرتے ہو

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۱۶) وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۱۷) اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (۱۸)

حالانکہ آخرت کا گھر بہتر اور سدا رہنے والا ہے۔ یہ ہی مضمون پہلے صحیفوں میں بھی تھا۔

الْحَيٰوةَ	الدُّنْيَا	وَالْاٰخِرَةُ	خَيْرٌ	وَّاَبْقٰى	اِنَّ	هٰذَا	لَفِى	الصُّحُفِ الْاُوْلٰى
زندگی	دنیا	اور آخرت	بہتر	اور باقی رہنے والی	بیشک	یہ	البتہ میں	صحیفوں، پہلوں

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (۱۹)

یعنی ابراہیم وموسیٰ کے صحیفوں میں۔

صُحُفِ	اِبْرٰهِيْمَ	وَمُوْسٰى
صحیفے	ابراہیم	اور، موسیٰ

لغات:

سبح صیغہ واحد مذکر حاضر امر الاعلیٰ صیغہ اسم تفضیل علو (ن) بلند ہونا۔ سَوّٰی واحد مذکر غائب ماضی تسویۃ برابر کرنا۔ مجرد میں (س) المَرْعیٰ چراگاہ (ف) غثآءً سیلاب کا کوڑا اور جھاگ، سوکھے، سڑے پتے مراد بے سود (ن ض) خراب فاسد اور بے کار ہونا۔ اَحْوٰی کالا، سیاہ، سبزی مائل، سیاہی مائل حُوَّۃٌ سے ماخوذ ہے بمعنی سیاہی یا مائل بسبزی یا وہ سرخی جو مائل بسیاہی ہو۔ حَوِیَ حَوًی (س) مائل بسبزی یا مائل بسیاہی یا سرخ مائل بسیاہی ہونا۔ اَحْوٰی صفت حَوَّاء مونث اور جمع حُوٌّ (ض) جمع کرنا۔ اَلْیُسْرٰی آسانی، جنت، یہاں اچھا عمل، شریعت یا جنت مراد ہے۔ جمع یُسْرَیَات والْیُسْرَۃ (ض) آسان ہونا، نرم ہونا، مطیع ہونا، (ک) کم ہونا، الذکریٰ مصدر (ن) نصیحت کرنا، ذکر کرنا یاد، پند ونصیحت اور موعظمت یہاں مراد ہے۔ ذِکْرٰی ذِکر سے زائد بلیغ ہے۔ یَتَجَنَّبُ تجنب (تفعل) سے واحد مذکر غائب مضارع، دور رہنا، (ن) دور کرنا، پہلو تہی کرنا، پہلو پر مارنا،۔ مصدر جَنَابَۃً آرزومند ہونا (ن س ک) جنب ہونا دور ہونا، (ن س) بے قرار ہونا۔ الاشقی اسم تفضیل (س) بڑا بدنصیب۔ مصدر شَقَاوۃ النَّار الْکُبْرٰی دوزخ، کیونکہ دوزخ کی آگ دنیا کی آگ سے انہتر حصہ زائد تیز ہے۔ الصُّحُف جمع صحیفہ کی، کتاب، نوشتہ، اوراق۔ واضح رہے کہ یہ جمع نادر ہے۔ کیونکہ فعیلۃ کی جمع فُعُل کے وزن پر نہیں آتی، ندرت میں اسکی نظیر سَفِیْنَۃ اور سُفُن ہے۔

ترکیب:

سَبِّحْ فعل بافاعل اسْمَ مضاف رَبِّ مضاف کَ مضاف الیہ الْاَعْلٰی صفت اوّل رَبِّ کی (اوللاسم والاوّل اظہر) اَلَّذِیْ اسم اپنے صلہ خَلَقَ (جملہ فعلیہ معطوف علیہ) فَسَوّٰی (جملہ فعلیہ معطوف) سے مل کر معطوف علیہ ھکذا وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی معطوف وھکذا وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی معطوف فَجَعَلَهٗ الفا للتفریع والھاللمرعیٰ مفعول اوّل غُثَآءً اَحْوٰی مرکب توصیفی مفعول ثانی او حالٌ من مفعول جَعَلَ جملہ تفریعیہ جملہ معطوفات صفت ثانی رَبِّ دونوں صفات سے مل کر مضاف الیہ مرکب اضافی مفعول بہ سَبِّحْ کا جملہ فعلیہ انشائیہ ہوا۔ سنقرئک فعل فاعل مفعول بہ والمفعول الثانی قرانًا محذوف۔ جملہ فعلیہ۔ فاء تفریعیہ لاتَنْسٰی جملہ فعلیہ ای فلا تنسی مما تقرؤہ شئیا من الاشیاء اِلَّا حرف استثناء مَا موصولہ شاء فعل اللہ فاعل جملہ فعلیہ (یہ استثنائے مفرغ ہے) مستثنیٰ منہ محذوف ہے۔ جیسا کہ ظاہر کیا گیا اور شآء کا مفعول بہ بھی محذوف ہے ای اَنْ یَنْسَاہُ. اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰی (دونوں جملے خبر اِنَّ اور یہ جملہ تعلیل ماسبق ہے) وَنُیَسِّرُکَ لِلْیُسْرٰی فعل فاعل مفعول بہ اور متعلق علی الترتیب جملہ فعلیہ ماقبل پر عطف ہے۔ فاء تفریعیہ ذَکِّرْ فعل بافاعل مفعول بہ محذوف۔ جملہ فعلیہ انشائیہ ماقبل پر متفرع ہے (ای فذکر الکفا ربا لقرآن) اِنْ شرطیہ نَفَعَتْ فعل الذِّکْرٰی فاعل جملہ فعلیہ شرط۔ جزا محذوف جس پر ماقبل دال ہے ای فَذَکِّرْ یا جملہ ماقبل ہی کو جزائے مقدم مان لیں سَیَذَّکَّرُ فعل مَنْ موصولہ اپنے صلہ یَخْشٰی (جملہ فعلیہ) سے مل کر فاعل جملہ فعلیہ معطوف علیہ۔ وَیَتَجَنَّبُ فعل ھا مفعول بہ (عائد الی الذکری) الْاَشْقَی موصوف الَّذِیْ اسم موصول اپنے صلہ یَصْلَی (فعل ضمیر فاعل) النَّارَ الْکُبْرٰی (مرکب توصیفی مفعول فیہ) سے مل کر صفت موصوف وصفت مل کر فاعل۔ فعل فاعل مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ معطوف ثم لا یموت جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَلَا یَحْیٰی جملہ فعلیہ معطوف۔ معطوفین کا عطف جملہ یَصْلٰی پر ہے۔ قد للتحقیق افلح فعل مَنْ تَزَکّٰی جملہ فعلیہ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فعل ضمیر فاعل ومفعول بہ۔ جملہ فعلیہ فَصَلّٰی جملہ فعلیہ ذَکَرَ پر معطوف۔ معطوفین کا عطف تَزَکّٰی پر ہے۔ تمام معطوفات مل کر صلہ مَنْ اپنے صلہ سے مل کر فاعل افلح کا جملہ فعلیہ ہوا بل اضراب عن المقدر ہے۔ ای لا تفعلون ما تفوزون بہ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ فعل بافاعل الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا مرکب توصیفی مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ۔ وَالْاٰخِرَۃُ مبتدا خَیْرٌ وَّاَبْقٰی معطوفین خبر جملہ اسمیہ تُؤْثِرُوْنَ کے فاعل سے حال ہے اِنَّ اپنے اسم ھٰذا اور خبر صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی مرکب اضافی بدل ہے الصُّحُفِ الْاُوْلٰی سے۔ مبدل منہ اور بدل مل کر مجرور فِی متعلق محذوف ہو کر خبر اِنَّ۔ جملہ اسمیہ ہوا۔

تفسیر:

سبح اسم ربک الاعلی (اپنے پروردگار کے نام کی پاکی بیان کرو) اس آیت گرامی کی تفسیر حضرات مفسرین نے مختلف وجوہ سے کی ہے۔ (۱) بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نام میں کوئی الحاد نہ کرو۔ اور الحاد یہ ہے کہ اس کے نام کو نقص وعیب والی چیزوں پر استعمال کیا جائے۔ یا غیر اللہ پر اس کے مخصوص ناموں کو بولا جائے کہ یہ بھی

اس کی تنزیہ وتقدیس کے خلاف ہے۔ جیسے رحمٰن، رزاق، غفار، قدوس وغیرہ اسماء کسی انسان پر بولے جائیں۔ آج کل اس معاملہ میں غفلت بڑھتی جارہی ہے۔ ناموں میں اختصار کا شوق آتا جارہا ہے۔ عبدالرحمٰن کو رحمٰن، عبدالقدوس کو قدوس، عبدالغفار کو غفار بے تکلف کہتے رہتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کے کہنے اور سننے والے دونوں گنہگار ہوتے ہیں اور یہ گناہِ بےلذت رات دن بلاوجہ ہوتا رہتا ہے۔ (۲) بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے نام کی تعظیم کرو۔ اور اپنی طرف سے اسکا کوئی نام نہ مقرر کرو۔ بلکہ وہی نام لو جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ ان ناموں میں خشوع وخضوع، ادب واحترام کا لحاظ رکھو۔ حاصل یہ ہے کہ اپنی طرف سے اللہ کا نام تجویز کر کے یا بےادبی سے اللہ کا نام لینا جائز نہیں۔ کیونکہ جس طرح اللہ کی ذات کو پاک جاننا اور اس کا ادب واحترام فرض ہے۔ اسی طرح اسکے ناموں کو پاک جاننا اور ان کا ادب واحترام بھی فرض ہے۔ (۳) ایک قول یہ ہے کہ زبان سے اپنے رب کی پاکی بیان کرو۔ اور بےدین لوگ جو اپنے رب کی صفات بیان کرتے ہیں ان سے حق تعالیٰ کا پاک ہونا ظاہر کرو۔ اس صورت میں لفظ اسم زائد اور تسبیح سے تسبیح قولی مراد ہوگی۔ اس قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبح اسم ربک الا علي تلاوت فرما کر سبحان ربی الاعلیٰ فرمایا۔ جس سے مفہوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کا مطلب تسبیح قولی سمجھ کر سبحان ربی الا علیٰ فرمایا اور اس حکم تسبیح کی اسطرح تعمیل فرمائی۔ صحابہ کرام حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ کا بھی یہی معمول تھا کہ وہ جب یہ سورت شروع کرتے تو سبحان ربی الا علیٰ کہا کرتے تھے۔ اسی لئے علماء نے تصریح کی ہے کہ نماز کے باہر جب قاری سبح اسم ربک الاعلی کی تلاوت کرے تو اسکو سبحان ربی الا علیٰ کہنا مستحب ہے۔ (۴) کچھ علماء کا خیال ہے کہ آیت شریفہ میں ہر نوع کی تنزیہ کا حکم ہے وہ قولی ہو یا عملی یا اعتقادی، تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ حدیث مذکور میں تسبیح قولی کی تخصیص پر کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ تسبیح کی ایک خاص صورت (قولی) کا اس میں ذکر ہے یوں بھی زبانی تسبیح بلا تائید وعقیدۂ قلبی ناقابل اعتبار اور بلا عمل ناقص ہے۔ (۵) اکثر مفسرین کے نزدیک اسم ربّ کنایہ ہے ذاتِ رب سے۔ یعنی لفظ اسم سے مسمّٰی مراد ہے۔ اسکی نظیر قرآن میں آیت مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ ہے کہ یہاں اسماء سے مسمیات مراد ہے۔ اسی طرح محاورہ عرب وعجم میں تعظیم وادب کے مقام پر ذات کو نام کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ شاہوں کی بارگاہوں میں عرض کیا جاتا ہے کہ حضور عالی کے نام سے یہ کام ہوا۔ فلاں قلعہ فتح ہوا وغیرہ۔ (۶) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ آیت کے معنی ہیں صَلِّ بِاسْمِ رَبِّكَ الْاَعْلٰى یعنی اپنے رب کے نام (یا حکم) سے نماز پڑھو۔ قال السیّد محمود الألوسی لااظنّ صحته۔ (۷) عصام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ مطلب آیت کا سَبِّحْ اٰثَارَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ہے۔ یعنی مخلوقاتِ خداوندی میں عیب نہ نکالو۔ جیسا کہ مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ سے معلوم ہوا ولا یخفی بُعدهٗ. (۸) اس سے نماز میں تسبیح پڑھنا مراد ہے۔ جیسا کہ حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب فسبح باسم ربک العظیم نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِجْعَلُوْهَا فِىْ رُكُوْعِكُمْ پھر جب سبح اسم ربک الا علی نازل ہوئی تو فرمایا اجعلوها فی سجودکم ۔ رکوع وسجود کی تسبیح کا مسئلہ سورۃ الحاقۃ کے اخیر میں گذر چکا ہے۔

تسبیح کا مطلب:

ذات باری کی تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ہماری عقل اور وہم وادراک سے بالاتر ہے۔کوئی صفت نقص وعیب اسکے جاہ وجلال کے سراپردوں کے گرد نہیں پھٹکتی ۔نہ وہ ذات پاک جسم وجوہر ہے ۔نہ عرض،کلیت وجزئیت،ترکیب وتحلیل،جہت وصورت،حدونہایت،مکان ومجلس،تحیز وشرکت ومشابہت وغیر جملہ صفات محدثات ولوازم حدوث سے ذات حق جل مجدہٗ وراء الوراء اور بلند وبرتر ہے۔**لیس کمثله شیء فی الارض ولا فی السمآء وھو السمیع العلیم.**

پھر جس طرح تنزیہ ذات ضروری ہے اسی طرح تنزیہ اسماء بھی لازم ہے۔(**کما مرَّ**)لہٰذا اگر لفظ اسم کو زائد مانا جائے۔تو روایات مذکورہ سے اس کی بھی تائید ہوتی ہے۔کہ اس حکم تسبیح کی تعبیر وتعمیل **سبحان ربی الاعلیٰ** سے کی گئی نہ کہ **سبحان اسم ربی الاعلیٰ** سے۔اور زائد ماننے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تسبیح وتنزیہ ذات واسماء سب کی ہوتی ہے۔جیسا کہ بیان سابق سے معلوم ہوا۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی اس رب کی تسبیح بیان کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔اور یونہی بیڈول،اینڈ اور بے کار نہیں بنایا۔بلکہ ہر مخلوق کو اس کے مناسب صورت،اعضاء،اجزاء وغیرہ دے کر درست اور ٹھیک بنایا۔**ما تری فی خلق الرحمن من تفوت** لفظ خلق میں عموم ہے۔ای **خلق کلّ شیء.** اس سے معتزلہ کا رد ہوتا ہے۔کیونکہ وہ افعال کا بندوں کو خالق مانتے ہیں۔**کذا قال الزمخشری مع ان مذھبه مذھبھم** ۔حضرت کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے معنی بیان فرمائے ہیں **خلق کل ذی روح فسوی بین یدیه وعینیه ورجلیه** (اللہ نے ہر ذی روح کو پیدا فرمایا۔اور اس کے ہاتھوں،آنکھوں اور پیروں کو برابر اور ہموار بنایا،زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا **خلق الانسان فعدل قامته ولم یجعله منکوسًا کالبھائم** ۔انسان کو پیدا فرمایا اور اسکے قد کو سیدھا رکھا حیوانات کی طرح جھکایا نہیں۔

خلق وتسویہ:

خلق کے معنی صرف صنعت گری کے نہیں بلکہ بغیر کسی مادہ سابقہ کے عدم سے وجود میں لانا خلق ہے۔اور یہ کام صرف خالق کائنات کی قدرت کا ہے۔کسی مخلوق کے بس میں نہیں۔کہ بغیر مادہ کسی چیز کو وجود میں لے آئے۔اور تسویہ کے معنی برابر کرنے کے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کو جو وجود بخشا۔اس کی جسامت وشکل وصورت اور اجزاؤ اعضاء کی ہیئت میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھ کر ایسا وجود بخشا گیا ہے کہ جو اسکی ضروریات کے مناسب ہو۔اور ایسا مزاج دیا جو ہر چیز کے مناسب اکتساب کمال کا ذریعہ بنے۔مثلاً انسان کے ہاتھ پاؤں اور انگلیوں کے پوروں میں ایسے جوڑے اور قدرتی اسپرنگ رکھے ہیں جو موڑے توڑے اور تہہ کئے جاسکتے ہیں۔اسی طرح دوسرے اعضاء مزاج وعقل اور حواس دیئے ہیں جو اسکو کمالات انسانیہ تک پہنچاسکتے ہیں۔اسی طرح ہر ذی روح میں اسکی کاریگری عیاں ہے۔**فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین .**

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی تقدیر کے معنی کسی چیز کو خاص انداز ے پر بنانے کے ہیں۔اور باہمی موازنت ومناسبت کے بھی آتے ہیں۔اور تقدیر قضاء وقدر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی مشیت

کے مطابق تمام چیزوں کے اجناس، انواع، افراد، مقادیر، احوال، افعال، رزق، مدت بقاوغیرہ کو تجویز ومقرر فرمادیا ہے۔ یہاں پر یہی معنی مراد ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو تمام کائنات میں سے جس چیز کو جس کام کے لئے مقرر فرمادیا گیا ہے وہ اسی کام میں لگی ہوئی ہے، آسمان ستاروں اور برق وباراں سے لے کر حیوانات، نباتات اور جمادات تک سب اپنے رب کی مقرر کردہ ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں۔

مولانا جامی فرماتے ہیں کہ ابر وباد مہ خورشید وفلک درکارند

خاک وباد وآب و آتش بندہ اند با من وتومردہ با حق زندہ اند

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر چیز مقدر ہے یہاں تک کہ فہم نارسائی وہوشیاری بھی مقدر ہیں (رواہ مسلم)۔ الحاصل انسان وحیوان وغیرہ کا میلان اوران کی رغبت قدرتی طور پر انہیں امور کی جانب ہے جن کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے۔

ہر یکے راہبر کارے ساختند میل او را دردلش انداختند

فَهَدٰی یعنی خیر ہو یا شر جس کام کے لئے جس چیز کو پیدا کیا گیا اسی پر اسکو لگا دیا گیا ہے۔ مجاہدؒ کا قول ہے کہ انسان کو اچھائی برائی، سعادت اور شقاوت کا راستہ بتادیا اور حیوانات کو چراگاہوں کا۔ مقاتل وکلبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا کہ مذکر کو مؤنث سے جفتی کا طریقہ بتادیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہدایت تمام مخلوقات کو شامل ہے، وہ مخلوق سماوی ہو یا ارضی۔ اور وہ مخلوق میں سے ہر ایک کو اس کے مناسب عقل وشعور بھی عنایت فرمادیئے ہیں۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدی یعنی حق تعالیٰ نے ہر شئی کو اس کے مناسب وجود بخشا اور متعلقہ امور کی ہدایت بھی فرمادی۔ اسی ہدایت عامہ کا اثر ہے کہ علوی وسفلی مخلوقات میں سے ہر ایک ابتدائے آفرینش سے اپنے کاموں میں انتھک مصروف ہیں خصوصاً انسان اور حیوانات جن کے عقل وشعور مشاہد ہیں۔ ان میں سے ہر نوع ہر صنف بلکہ ہر ہر فرد کو حق تعالیٰ نے اپنی اپنی ضروریات زندگانی حاصل کرنے اور دفع مضرت وجلب منفعت کے کیسے کیسے دقیق ہنر سکھلائے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے انسان تو سب سے زائد عاقل ہے ہی۔ لیکن درندوں، پرندوں اور حشرات الارض کے عجائبات زندگی کا مشاہدہ بھی حیران کن ہے۔ یہ سب کچھ خالق کائنات نے ان کو خود تعلیم فرمایا ہے۔ انہوں نے کسی اسکول اور کالج میں کسی استاذ سے یہ چیزیں نہیں سیکھیں۔ یہ سب ہدایت وتلقین ربانی ہی کے ثمرات اور کرشمے ہیں۔

سائنس عطائے ربانی ہے:

حق تعالیٰ نے حضرت انسان کو عقل وشعور واحساسات سب سے زیادہ مکمل عطاء فرمائے ہیں۔ اور زمین وآسمان کی تمام چیزیں اس کی خدمت ونفع کے لئے پیدا فرما کر اسکو مخدوم کائنات بنایا ہے۔ اور اشیائے کائنات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے اور منافع حاصل کرنے کے لئے ایسی عقل رسا وفہم کامل انسان کو عطاء فرمائی ہے کہ وہ مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز ایجاد کر لیتا ہے۔ پہاڑوں کو کھود کر، سمندروں اور دریاؤں میں غوطے لگا کر معدنیات اور دریائی خزانے حاصل کر لیتا ہے لکڑی، لوہے تانبے پیتل اور دوسری دھاتوں کو ملا کر نت نئی ایجادات کرتا ہے۔ یہ علم وہنر فلاسفی تحقیقات اور کالجوں کی تعلیمات پر موقوف نہیں، ابتدائے دنیا سے یہ سب کام جاہل ان پڑھ بھی کرتے آئے ہیں۔ جبکہ دنیا میں اسکولوں اور کالجوں کا

وجود بھی نہ تھا۔ اور یہی فطری سائنس ہے جو حق تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ودیعت رکھی ہے پھر فنی و علمی تحقیقات کے ذریعہ اس میں ترقی کرنے کی استعداد بھی قدرت ربانی ہی کا عطیہ ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا استعمال سکھاتی ہے۔ او رفطرت انسانی میں چیزوں کے استعمال اور فنی تحقیقات کی استعداد بھی اسی نے رکھی ہے۔ پھر بقدر استعداد انسان اس وسیع میدان میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ اسی فطری استعداد و صلاحیت کے مظاہر اسی سائنسی دور میں ہر روز نئے نئے سامنے آرہے ہیں۔ اور نہ معلوم آگے کیا کیا وجود میں آنے والا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ قرآن مقدس کے ایک لفظ **فھدی** کی روشن تفسیر اور زندہ تصویر ہے۔ مگر افسوس ہے کہ سائنس میں ترقی کرنے والے اس حقیقت سے نا آشنا بلکہ اندھے ہیں۔

والذی اخرج المرعی الخ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نباتات کے متعلق اپنی قدرت و حکمت کا بیان فرمایا ہے کہ زمین سے سرسبز گھاس پیدا کی پھر اسکو خشک کر کے سیاہ رنگ بنا دیا اور اس کی وہ سرسبزی معدوم ہوگئی۔ اس میں انسان کے انجام کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ جسم کی شادابی اور خوبصورتی اور چستی و چالاکی عطیہ ربانی ہے۔ اور عارضی چار دن کی چاندنی ہے۔

فائدہ...... چیزوں کا کمال ذاتی جسمانی ہوتا ہے یا باطنی وروحانی یا غیر کو نفع پہنچانے کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ صفت خلق وتسویہ سے کمال کی قسم اول کو بیان کیا گیا ہے اور **قَدَّرَ فَهَدٰى** سے قسم دوم کو اور **الَّذِىٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى** سے قسم سوم کو بیان فرما کر اس بات پر تنبیہ کی کہ جملہ کمالات کی ابتداؤ انتہاء اور ایجاد و بقاء فنا حق تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے اور اسی کی ذات عالی مرجع کمالات و مبدائے کمالات ہے فتامل۔

سنقرئک فلا تنسی الا ماشآء اللّٰہ سابقہ آیات میں اپنی قدرت و حکمت کے چند مظاہر بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فریضۂ پیغمبری کے متعلق چند ہدایات دی ہیں۔ اور ہدایات سے پہلے اپنے کام کو آسان کر دینے کی خوشخبری سنائی ہے۔ وہ یہ کہ ابتداء میں جب آپ پر قرآن نازل ہوتا اور جبرئیل امین علیہ السلام وحی سناتے تو آپ اس اندیشہ سے کہ ذہن سے نہ نکل جائے ان کے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ اس آیت میں اس اندیشہ کو ختم کر دیا گیا اور فرما دیا گیا کہ یاد کرا دینا اور صحیح صحیح پڑھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ یعنی **لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ** کا جو شان نزول مذکور ہوا وہی اس آیت کا ہے۔

الا ماشآء للّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و مصلحت سے قرآن کا کوئی حصہ محو کرنا چاہیں تو اسکو آپ کے ذہن سے نکال دیں گے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ آیات قرآنیہ کے نسخ کا معروف طریقہ تو یہ تھا کہ کوئی صاف حکم پہلے حکم کے خلاف آ گیا جس سے پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ ایک صورت منسوح ہونے کی یہ بھی ہوتی تھی کہ جن آیات کو منسوخ فرمانا ہوتا ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مومنین کے ذہن سے محو فرما دیا جاتا۔ جیسا کہ **مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا** میں نسخ کی مذکورہ دونوں صورتوں کو بیان فرما دیا گیا ہے۔

بعض حضرات نے استثناء **الا ماشا اللّٰہ** کا مفہوم نسیان عارضی کو قرار دیا ہے۔ جس کو نسخ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ بعض احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی سورت تلاوت فرمائی جس میں کوئی آیت رہ گئی تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے (جو کاتب وحی اور بڑے قاری صحابی تھے) یہ خیال کیا کہ شاید یہ آیت منسوخ ہو

گئی۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ سہواً ترک ہو گئی تھی۔اس استثناء کا پہلا مفہوم جمہور نے لیا ہے کہ اس سے منسوخ التلاوت ہونا مراد ہے۔اور دوسرا مفہوم بعض دیگر مفسرین کا بیان کردہ ہے کہ نسیان عارضی مراد ہے۔

آیت میں دو معجزے: ......اس تشریح کی بنا پر آیت مذکورہ دو معجزوں پر مشتمل ہے۔(۱) نسیان بالکل نہ ہو نا باوجود یہ کہ نسیان انسان کے فطری عوارض میں سے ہے۔(۲) آئندہ ہونے والی چیز کی پہلے سے خبر دینا (جو اخبار بالغیب کے قبیل سے ہے)

تنبیہ: یہ کل تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ لَا تَنسَىٰ کو فعل مضارع منفی کا صیغہ مانا جائے۔لیکن اگر صیغہ نہی قرار دیا جائے (جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ درحقیقت لاتَنسَ تھا سین کے بعد الف کی زیادتی رعایت فواصل کی بنا پر ہے) تو استثناء کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن کی یادداشت اپنی طاقت وقوت کے موافق واجب ہے لیکن اگر خدا ہی فراموش کرادینا چاہیں تو آدمی معذور ہے۔

آیت کی ایک اور تفسیر: ......بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں خطاب انسان کو ہے اور معنی یہ ہیں کہ اے انسان، ہم عنقریب (بعد الموت) تجھ کو تیرا اعمالنامہ پڑھوائیں گے۔تو اپنے اعمال میں سے کسی ایک عمل کو بھی فراموش نہ کر پائیگا۔تجھ کو سب نیک اور بداعمال یاد آجائیں گے۔مگر وہ اعمال جن کو اللہ ہی بھلا دینا چاہیں گے۔یعنی نیکوں کے وہ برے اعمال جن سے وہ توبہ و استغفار کر چکے ہیں۔اور ان کا محفوظ رہنا باعث شرمندگی ہے اعمالناموں سے بھی مٹا دیئے جائیں گے۔ اور مخلوق سے بھی بھلا دیئے جائیں گے۔

اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ وَمَا يَخۡفٰى بے شک اللہ تعالیٰ ظاہر قول وفعل کو بھی جانتا ہے اور پوشیدہ گفتار واطوار وغیرہ کو بھی یعنی وہ ظاہر و باطن دونوں سے یکساں واقف ہے۔آپکا آواز سے پڑھنا اور دل میں اندیشہ نسیان چھپانا یہ دونوں باتیں بھی حق تعالیٰ کو خوب معلوم ہیں۔یہ جملہ ماقبل کی علت ہے شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر و پوشیدہ سے کمالات محمد یہ مراد ہے۔اوراس میں پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی دی گئی ہے اور خوشخبری بھی کہ آپ کی ذات عالی میں بے انتہا کمالات کی استعداد موجود ہے۔جن میں سے بہت سے کمالات منصۂ شہود سے جلوہ گر ہو چکے ہیں۔اور بہت سے ابھی پوشیدہ ہیں جو آئندہ رونما ہوں گے۔واللہ اعلم۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلۡيُسۡرٰى ......اسکا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ (اور ہم آپ کو یسری کے لئے آسان کر دیں گے) حالانکہ مقام کا تقاضا یہ تھا کہ فرماتے وَنُيَسِّرُ لَكَ يُسۡرٰى (ہم آپ کے لئے یسری کو آسان کر دیں گے) اس قلب میں حکمت یہ ہے کہ اس میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہم آپ کو ایسی قوت تامہ وملکہ راسخہ عطا فرمائیں گے کہ یسری آپ کی طبیعت ثانیہ بن جائے گی۔ **ای نوفقک توفیقاً مستمراً للطریقة الیسریٰ فی کل باب من ابواب الدین علماً وتعلیماً واھتداءً وھدایة الی غیر ذلک** ۔خلاصہ یہ ہے کہ اصل کلام میں سہولت مطلوب ہے۔اور رسول علیہ السلام طالب۔الٹنے کے بعد سہولت طالب ہوگئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلوب۔جیسے آدمی رزق کا طالب ہے اور رزق مطلوب ۔لیکن اگر رزق کا ملنا یقینی ہوتا ہے تو محاورہ میں کہہ دیتے ہیں کہ تمہارا رزق تمہیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔لہٰذا اس منعکس تعبیر میں مبالغہ ہے۔اور خالص محبوبیت کا تقاضا بھی یہی تھا۔فافہم۔

اور یُسریٰ سے مراد حفظِ وحی کا آسان طریقہ ہے۔ یا شریعت مطہرہ جو تمام ادیان سے سہل ہے۔ کما قال اللہ ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ، يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ وقال علیہ السلام: الدین یُسرٌ تیسرا قول یہ ہے کہ جملہ امور حسنہ مراد ہیں خواہ دنیوی ہوں یا اخروی مثلاً نصرت خداوندی، دارین میں بلند درجات جس میں دین وشریعت اور حفظ وحی وغیرہ سب امور داخل ہیں۔ واللہ اعلم۔

فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۔ سابقہ آیات میں تسبیح کا امر، تعلیم وشریعت اور جملہ امور حسنہ میں سہولت وآسانی عطا فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل کا ذکر تھا۔ اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کی تکمیل اور وحی وشریعت کی تبلیغ کا حکم ہے۔ لفظی معنی آیت کے یہ ہیں کہ ''آپ نصیحت کیجئے اگر نصیحت نفع دیتی ہو'' اس آیت میں اگر چہ تذکیر بشرط نفع کا حکم ہے مگر مقصود تذکیر کو نفع کے ساتھ مشروط کرنا نہیں ہے بلکہ تاکید مقصود ہے کیونکہ بسا اوقات حکم کو تاکید کیلئے مشروط کر دیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے عرف میں بولا جاتا ہے کہ اگر تو آدمی ہے تو فلاں کام کرنا ہوگا' اگر تو فلاں کا بیٹا ہے تو تجھ کو ایسا کرنا چاہیے۔ یہاں شرط مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ تو آدمی ہے یا فلاں بزرگ یا شریف آدمی کا بیٹا ہے، اس لئے تجھ کو یہ کام لازم ہے، لہٰذا مطلب آیت کا یہ ہوا کہ نصیحت وتبلیغ کا نافع ومفید ہونا تو متعین ومتیقن ہے۔ اس لئے آپ اس مفید کام کو کسی وقت نہ چھوڑیں۔ اس تقریر سے یہ اشکال ختم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کا منصب تو تذکیر ونصیحت کا ہے خواہ کوئی مانے یا نہ مانے قبول کرے یا نہ کرے۔ پھر حکم تذکیر کو نفع کے ساتھ کیوں مشروط کیا گیا ہے؟

اس اشکال کے علماء نے اور جوابات بھی دیئے ہیں مثلاً: (۱) بعض علماء نے کہا ہے کہ اصل عبارت فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَىٰ أَوْ لَمْ تَنْفَعْ تھی یعنی آپ نصیحت کیجئے نفع دے یا نہ دے۔ مگر دوسرے جزو (أَوْ لَمْ تَنْفَعْ) کو حذف کر دیا گیا تاکہ معلوم ہو کہ مقصود اصلی نفع ہی ہے۔ اس کی نظیر سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ ہے کہ اس سے جزو ثانی وَالْبَرْدَ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ (۲) اس جملہ شرطیہ کو لانے سے غرض یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو اتنی عظیم مشقت اور تعب میں نہ ڈالیں کہ خود کو ان کے پیچھے پڑ کر گھلا دیں۔ بلکہ آپ ہمارا پیغام پہنچا دیجئے اور زیادہ فکر نہ کیجئے حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں آپ کو زائد مشقت سے روکا گیا ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ نفع کو ملحوظ رکھتے ہوئے دعوت دیں۔ اور جہاں نفع کی امید نہ ہو ان کے پیچھے پڑ کر اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں۔ جیسے دوسری آیات فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا. وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ وغیرہ سے بھی یہی مقصود ہے۔ (۳) وہ حکم جو کسی شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے وجود شرط کے وقت تو اسکا وجود ضروری ہے۔ لیکن انتفائے شرط کے وقت وہ حکم مسکوت عنہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور وہ کسی دوسرے سبب یا شرط کی وجہ سے موجود بھی ہو سکتا ہے یہاں بشرط نفع تذکیر کا حکم ہے۔ لیکن نفع نہ ہونے کی شکل میں حکم تذکیر کا ثبوت دوسری نصوص سے ثابت ہے۔ (۴) بعض نے کہا ہے کہ اس شرط سے کفار کی مذمت مقصود ہے کہ ان پر نصیحت کا نفع غیر متوقع ہے جیسے کہ کوئی باپ اپنے ایسے نافرمان بیٹے کے بارے میں کسی سے کہے جس کی اصلاح کی توقع نہ ہو کہ آپ اس کو سمجھا کر دیکھ لیجئے۔ اگر وہ سمجھ جائے اسکا مفہوم سمجھانا تو ضروری اور اس کا نفع غیر متوقع ہوتا ہے ایسے ہی آیت کا بھی مفہوم ہے۔ (۵) تبلیغ وتذکیر میں فرق ہے۔ تبلیغ عام ہے۔ نفع ہو یا نہ ہو۔ بہر حال پہنچانا ضروری ہے۔ اور تذکیر ان لوگوں کو ہوتی ہے جن کو تبلیغ ہو چکی۔ جہاں عدم نفع اغلب ہو وہاں ترک تذکیر جائز ہے۔ اور یہاں تذکیر کا ذکر ہے۔

(۶) بعض علماء نے کہا کہ جہاں عدم نفع متیقن ہو وہاں ترک تبلیغ بھی جائز ہے۔ نمبر ۵، ۶ میں شرط میں کسی توجیہ کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ اور فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى وغیرہ آیات میں حکم ہے۔ (۷) بعض مفسرین نے آیت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ آپ تذکرہ کیجئے اگر تذکیر کسی کو فائدہ دے۔ ظاہر ہے کہ تذکیر سے کسی کو ضرور فائدہ ہوگا گو ہر کسی کو نہ ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ تذکیر بہر حال ضروری ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث میں ہے **قد كان فيما قبلكم من الامم محدثون فان يك في امتي احد فانه عمر** ۔ ان میں وہ جوابات راجح ہیں جن میں شرط اپنی حقیقت پر باقی رہتی ہے۔ اور اگلی آیت سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى کے بھی یہ ہی جوابات زیادہ مناسب ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى اس آیت میں فائدہ اٹھانے والے کا ذکر ہے کہ نصیحت سے مستفید و بہرہ ور وہی ہوگا جسکو (فی الحال یا فی المآل) خدا کا خوف حاصل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ہر شخص کو نصیحت فرمایئے۔ لیکن فائدہ اس سے وہی اٹھائے گا جس میں استعداد ہے۔

اصل استعداد شرط صحبت است ... مرد چوں کور ست عینک لعبت است

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ فَذَكِّرْ باب تفعیل سے ہے۔ جس کے معنی میں تکرار ہے۔ یعنی آپ بار بار نصیحت کیجئے مطلب یہ ہے کہ ایک بار نہیں تو بار بار نصیحت سے فائدہ حاصل ہوگا کہ جس میں استعداد کسی بھی درجہ میں موجود ہے وہ نصیحت پذیر ہو جائیگا۔ کیونکہ آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) جو جزا و سزا کے قائل اور اللہ جل شانہ' کی عظمت وجلال سے خائف ہیں۔ یہ قسم تو اول بار ہی نصیحت قبول کر لیتی ہے۔ (۲) جو نہ قائل و خائف ہیں اور نہ منکر۔ بلکہ خالی الذہن ہیں یا متردد۔ یہ قسم بار بار سمجھانے سے اثر قبول کر لیتی ہے۔ آیت شریفہ دونوں قسموں پر مشتمل ہے۔ (۳) تیسری قسم منکرین اور سخت معاندین کی ہے۔ یہ ایسے پتھر ہیں جن میں تذکیر کی میخ نہیں ٹھوکی جاسکتی۔ اور ایسی بنجر زمین ہیں جس سے نفع کا ایک پودا بھی نہیں اگتا۔ چنانچہ اگلی آیت میں ارشاد ہے۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى (اور ذکریٰ (نصیحت) سے وہی گریز کرے گا جو بڑا بد بخت ہے) اَلْاَشْقٰى اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اور الف لام اسپر عہد کا ہے۔ مراد اس سے مخصوص و معہود کافر یعنی ولید بن مغیرہ یا عتبہ بن ربیعہ ہے۔ لیکن بہتر ہے کہ یہاں الف لام جنسی مانا جائے اور ہر کافر کو اسمیں داخل مانا جائے۔ اسلئے کہ جس کا اعتقاد درست ہو اور عمل خراب یعنی فاسق۔ وہ بھی شقی اور بدنصیب ہے۔ لیکن جس کے اعتقادات و اعمال دونوں خراب ہوں یعنی کافر وہ بڑا بدنصیب اور اشقیٰ ہے۔ پھر نوع اشقیٰ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جسکے اعمال و اعتقادات جہل بسیط یا کورانہ تقلید کا نتیجہ ہوں۔ اس قسم کے لوگوں کی ہدایت ممکن ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو جہل مرکب اور سخت عناد کے شکار ہوں کہ جان بوجھ کر حق سے متنفر اور اسکے منکر ہوں اس قسم کے لوگوں کی ہدایت ممکن نہیں۔

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند ... در جہل مرکب ابد الدہر بماند

وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں وارد ہوا ہے۔ ان کی سزا یہ ہے کہ اَلَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (وہ بڑی آگ میں داخل ہوگا) دنیا کی آگ صغریٰ ہے وہاں کی آگ کبریٰ ہے۔ حدیث میں وارد ہے۔

نَارُكُمْ هذه جزء من سبعين جزء امن نار جهنم (رواه البخاری و مسلم عن ابی هریرةؓ)۔

یعنی تمہاری یہ آگ جہنم کی آگ کا ستّرواں (۷۰) حصہ ہے۔ اور امام احمد نے حضرت ابو ہریرۃؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے ان هذه النار جزء من مائة جزء من جهنم یہ دنیا کی آگ جہنم کی آگ کا سوواں (۱۰۰) حصہ ہے۔ فلعل السبعین وارد مورد التکثیر وهو کثیرٌ ۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے کہ نارِ صغریٰ دنیا کی آگ اور نارِ کبریٰ جہنم کی آگ ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں نارِ کبریٰ سے جہنم کے طبقہ سفلیٰ (نچلے درجہ) کی آگ مراد ہے۔ جو دوسرے طبقات جہنم کی آگ سے بہت شدید ہے۔ یہی ساتواں درجہ فرعونیوں، منافقوں اور عیسیٰ علیہ السلام کے مائدہ کے منکروں کا مقام ہے۔ پھر دنیا کے ناقابل برداشت مصائب سے موت چھٹکارا دلا دیتی ہے۔ اسی لئے سخت مصیبت میں لوگ موت کی آرزو کرتے ہیں اور بعض خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ مگر وہاں موت بھی نہ آئیگی کہ اس عظیم مصیبت سے چھٹکارا مل جائے۔

ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا (پھر اس آگ میں اس کو موت بھی نہ آئیگی) کیونکہ اس عالم میں روح کے احکام بدن پر غالب ہوں گے۔ اور روح کبھی فنا نہ ہوگی تو ابدان بھی فنا نہ ہوں گے۔ اور جس طرح موت نہ آئیگی وہ ایسی حیات سے بھی محروم ہوں گے جس کو حیات کہا جاسکے۔ وَلَا يَحْيَىٰ اور نہ وہ زندہ رہیگا۔ کیونکہ وہ موت سے زائد شدید تلخی سے ہمہ وقت دوچار ہوگا۔ ایسی بُری زندگی کو عرف میں زندگی نہیں کہتے ۔

عمر چوں خوش گذرد زندگی خضر کم است ورنہ ناخوش گذرد نیم نفس بسیار است

حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ کفار کو عذاب سے کبھی نجات نہ ہوگی اور ان کے لئے خلود فی النار ہوگا۔

فائدہ......۱: لفظ ثُمَّ اس جگہ تراخی زمان کیلئے نہیں بلکہ تراخی رتبہ کے لئے ہے۔ جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نفس عذاب سے دوام عذاب زیادہ ہولناک ہے۔ گو یہ ہولناکی اور شدت زمانہ کے اعتبار سے بھی موخر ہے۔

فائدہ......۲: جہنم میں موت کا نہ آنا کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ انکے برخلاف جو مسلمان گنہگار دوزخ میں جائیں گے۔ ان کو وہاں موت آجائیگی چنانچہ مسلم شریف میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اہل نار کفار نہ تو مرینگے نہ زندگی پائیں گے۔ لیکن گناہگاروں کو اللہ تعالیٰ موت دے دیں گے۔ جب وہ جل کر کوئلہ ہوجائیں گے اور ان کے بارے میں شفاعت کی اجازت ہوگی تو ان کی جنت کی نہروں میں (نهر حیوٰة میں) ڈالدیا جائیگا۔ وہ اس میں اس طرح اگینگے جس طرح سیلاب کے خس و خاشاک میں دانہ اگتا ہے یعنی از سرنو ان کو حیات ملے گی۔ حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ گنہگار مومنوں کی روحیں دوزخ میں ان کے جسموں سے جدا ہوجائیں گی۔ اور اس کی تائید بزاز کی اس مرفوع روایت سے ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جس میں ادنیٰ درجہ کے جنتیوں کا ذکر ہے۔ کہ ان کو دوزخ سے نکال کر ایک میدان میں ڈال دیا جائیگا۔ تو وہ سبزی کی طرح اگیں گے حتی اذا دخلت الارواح اجسادهم فیقولون ربنا کما اخرجتنا من النار وارجعت الارواح الی اجسادنا فاصرف وجوهنا عن النار الخ۔ یہاں تک کہ جب روحیں انکے جسموں میں داخل ہوجائیں گی۔ تو وہ یہ دعا کریں گے۔ اے پروردگار جس طرح آپ نے ہم کو دوزخ سے نکال دیا اور روحوں کو ہمارے جسموں میں واپس کیا تو ہمارے چہروں کو بھی دوزخ سے دوسری طرف پھیر دیجئے الخ۔

اکثر علماء کا کہنا ہے کہ عقوبت کی مدت کے بعد ان کو موت دے دی جائے گی اور شفاعت تک وہ اسی میں پڑے رہیں گے۔ اس مدت میں نہ انکو عذاب ہوگا نہ ثواب۔ درحقیقت یہ ان کی سزا کا تتمہ ہوگا۔ جیسے دنیا میں کسی جرم کی سزا دے کر

کچھ عرصہ قید بھی کر دیا جاتا ہے۔ گو ان کو زندہ رکھتے ہوئے بھی غیر معذب رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن رحمت خداوندی ان کو دوزخ کی ہولناکیوں کے دیکھنے سے بھی محفوظ فرمادے گی۔ اور ممکن ہے کہ یہ موت اور روح کا نکلنا بھی عقوبت کا تتمہ ہو۔ واللہ اعلم
علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے دوزخ میں داخلہ کے وقت ہی ان کو موت دے دی جائے اور ان کی سزا صرف دخول جہنم اور ایک مدت تک جنت کی نعمتوں سے محرومی ہی ہو جیسا کہ دنیا میں بھی جیل میں بند کر دینا سزا شمار ہوتا ہے خواہ وہاں اس کو کوئی مشقت نہ ہو۔ واللہ اعلم (روح المعانی)۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى :...... یہاں اس شخص کا بیان ہے جو تذکیر سے نفع اٹھاتا ہے۔ تذکیر و نصیحت سن کر اس سے متاثر ہونا ابتدائی درجہ ہے جس میں فلاح کی ضمانت نہیں۔ اصل فلاح و کامیابی کمال میں ہے۔ اور کمال دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ تمام ظاہری و باطنی گندگیوں اور آلودگیوں سے تخلیہ و پاکیزگی اور نیکیوں کے ساتھ تحلیہ و آراستگی جن میں سرفہرست ذکر اسم رب اور نماز ہیں، آیت مذکورہ میں تخلیہ کا بیان ہے۔

لفظ تَزَكّٰى زکوٰۃ سے مشتق ہے جس کے اصل معنی پاک کر دینے کے ہیں۔ مال کی زکوٰۃ کو بھی اسی لیے زکوٰۃ کہتے ہیں کہ اس سے باقی مال اور زکوٰۃ دینے والے کا قلب بخل کی نجاست سے پاک ہو جاتا ہے۔

یہاں لفظ تزکّٰی کا مفہوم ہر قسم کی پاکی کو مشتمل ہے جیسا کہ لفظ اَفْلَحَ میں تعمیم ہے کہ ہر قسم کی فلاح اس میں آگئی۔

پاکی کی اقسام:

(۱) دل کی پاکی۔ کفر و شرک، عقائد فاسدہ اور تمام رذائل نفسانیہ سے (۲) بدن کی پاکی حدث اکبر و حدث اصغر اور جملہ نجاستوں سے (۳) کپڑوں کی پاکی ہر قسم کی نجاستوں سے اور حرام مال سے۔ (۴) بدن اور لباس کی پاکی خلاف شرع وضع سے (۵) مال کی پاکی کمانے میں ممنوعات و محرمات سے اور کمانے کے بعد زکوٰۃ و صدقات نکال کر (۶) جگہ وغیرہ متعلقات کی پاکی۔ ان تمام پاکیوں کے حصول سے تخلیہ حاصل ہوگا۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی) ظاہر یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کی نماز (فرض و نفل) آگئی۔ بعض مفسرین نے خاص نماز عید سے اس تفسیر کی وہ بھی اس میں داخل ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قد افلح من تزکی یہ ہے کہ لاالہ الا اللّٰہ کی شہادت دے اور اللہ کے شرکاء کو (قلب سے) باہر نکال دے۔ اور میرے رسول ہونے کی شہادت دے اور و ذکر اسم ربه فصلی سے مراد پنجگانہ نمازیں اور ان کی نگہداشت و اہتمام ہے (مظہری)
جو روایت مرفوعہ سے تفسیر ثابت ہے وہ یقیناً راجح ہوگی۔ واللہ اعلم

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استنباط:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو صدقہ فطر ادا کرے اور عید گاہ کے راستہ میں تکبیرات پڑھے اور عید گاہ پہنچ کر نماز ادا کرلے تو میں امید رکھتا ہوں کہ وہ اس بشارت (فلاح) کا مستحق ہو جائے گا۔ یعنی انہوں نے لفظ تزکّی سے صدقہ فطر اور ذکر اسم رب سے تکبیرات اور لفظ صلّٰی سے صلوۃ عید مراد لی ہے۔ وجہ ان کی اس تفسیر کی یہ ہے کہ قرآن میں ہر

جگہ زکوٰۃ کا ذکر نماز کے بعد آیا ہے۔ اور یہاں نماز سے پہلے ذکر آیا ہے۔ تو اس سے کوئی مخصوص صورت مراد ہے۔ تو عید میں صدقہ فطر جس کو زکوٰۃ فطر بھی کہہ دیتے ہیں نماز سے پہلے ادا کیا جاتا ہے۔ بلکہ تینوں کام عید میں اسی ترتیب سے ہوتے ہیں۔ جس ترتیب سے آیت میں مذکور ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عطاء، ابن سیرین اور ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہم سے بھی اسی کے مثل منقول ہے۔ مگر یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں نہ عید تھی نہ زکوٰۃ نہ صدقہ فطر اس لئے یہ تفسیر مرجوح ہے۔

فقہائے احناف کا استنباط:

مسئلہ (۱) احناف کے نزدیک تکبیر تحریمہ رکن نہیں بلکہ شرط صلوٰۃ ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے نزدیک رکن (جز و صلوٰۃ) ہے۔ حنفیہؒ نے کہا کہ ذکر اسم رب سے مراد تکبیر تحریمہ ہے اور فصلی میں فاء عاطفہ تعقیبیہ ہے۔ عطف تعقیبی کا تقاضا یہ ہے کہ معطوف علیہ اور معطوف غیر غیر بھی ہوں اور معطوف معطوف علیہ کے بعد آئے۔ معلوم ہوا کہ ذکر اسم رب نماز سے باہر کی ایک جدا شے ہے رکن اور جز و صلوٰۃ نہیں۔ ورنہ دونوں کے درمیان فاء نہ آتی۔ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ ذکر اسم رب کے بعد نماز پڑھی۔

سوال: جس طرح حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں صَلٰوةُ الْوُسْطٰى کا عطف الصلوات پر ہے۔ اور مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكَالَ میں جبریل ومیکال کا عطف ملئکۃ پر ہے۔ کیا اسطرح صلّٰی کا عطف ذکر اسم ربہ پر نہیں مان سکتے۔ اور جس طرح صلوٰۃ وسطیٰ صلوات میں اور جبریلؑ و میکائیلؑ ملائکہ میں داخل ہیں اس طرح ذکر اسم رب کو صلوٰۃ میں داخل مان کر رکن قرار نہیں دے سکتے؟

جواب: آپ نے جو الصلوۃ الوسطی اور جبریل ومیکال کی دو مثالیں بیان کی ہیں وہ عطف الخاص علی العام کی مثالیں ہیں۔ جو زبان عرب میں مستعمل ورائج ہیں۔ اور ذکر اسم ربہ پر فصلّٰی کا عطف عطف العام علی الخاص ہوگا۔ جس کی کلام عرب میں کوئی نظیر نہیں۔ اور اہل عربیہ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ اسلئے ذکر اسم رب اور صلوۃ کو دو جدا جدا چیزیں مانتے ہوئے عطف کیا جائے گا فافہم۔

ثمرہ اختلاف: ...... اگر بدن یا کپڑے پر نجاست ہو یا واجب الستر حصہ بدن کھلا ہو یا نماز ظہر میں زوال آفتاب نہ ہوا ہو، یا قبلہ کی طرف منہ نہ ہوا اور اس حالت میں تکبیر تحریمہ کہہ لی جائے مگر تکبیر کا آخری لفظ کہتے کہتے یہ موانع ہو گئے ہوں مثلاً عمل قلیل کے ذریعہ ستر عورت کر لے۔ اور آفتاب ڈھل جائے اور قبلہ کو رخ کر لے، یا نجاست دور ہو جائے۔ تو چونکہ قیام صلوٰۃ کے ساتھ جس جز و تحریمہ کا اتصال ہے وہ صحیح شرائط کے ساتھ ہوا اس لئے احنافؒ کے نزدیک نماز درست ہو جائیگی۔ شوافعؒ کے نزدیک نہ ہوگی۔ چونکہ یہ موانع اندورن صلوۃ موجود ہیں۔ البتہ بعض احناف مثلاً امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ رکن صلوٰۃ ہے۔ ان کے نزدیک تفریع مذکور درست نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر ذکر اسم رب سے مراد اذان واقامت لی جائے جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے تو تکبیر تحریمہ کے عدم رکنیت پر ہی آیت دلیل نہ بن سکے گی۔

مسئلہ (۲):۔ حنابلہ ومالکیہ رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک تحریمہ میں اللّٰہ اکبر کہنا فرض ہے۔ شوافع کے نزدیک اللّٰہ اکبر اور اَللّٰہُ الْاَکبر دونوں میں سے جو چاہے کہہ لے فرضیت ادا ہو جائیگی۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چار الفاظ میں سے کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔ اللّٰہ اکبر، اَللّٰہُ الْاَکبر، اَللّٰہُ کَبِیْر، اَللّٰہُ الْکَبِیْر۔ طرفین فرماتے ہیں کہ ہر ایسے

اسم رب سے نماز کا شروع کرنا درست ہے جو خالص تعظیم رب پر دلالت کرے اور اس میں اپنی حاجت کا شائبہ نہ ہو۔ مثلاً الفاظ مذکورہ میں سے کوئی کلمہ یا الله اجل۔ الله اعظم. الله الرحمن .الرحمن اعظم . لا اله الا الله .سبحان الله وغیرہ ایسے تمام کلمات سے افتتاح صلوۃ صحیح ہو جائیگا۔ کیونکہ مطلق ذکر اسم رب کا حکم ہے (وذکر اسم ربه) البتہ الله اکبر کہنا واجب ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مواظبت فرمائی ہے۔ لیکن اللھم اغفرلی اللھم ارزقنی جیسے الفاظ سے نماز کی ابتدا درست نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ الفاظ ذکر خالص نہیں ہیں۔ بلکہ بندہ کی حاجت کی ملاوٹ بھی ان میں ہے۔

صوفیہ کا استنباط: شیخ یعقوب کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ (۱) تزکّٰی سے توبہ وتزکیہ کیطرف اشارہ ہے: (۲) وذکر اسم ربه سے زبانی، قلبی، روحی اور سری ذکر کی پابندی کی طرف اشارہ ہے۔ (۳) فصلّٰی سے دوام مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ نماز معراج المومنین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک (انتہائی خوشی) ہے۔ اور یہ ہی پورے تصوف کا خلاصہ ہے۔

ایک اور تفسیر:

بعض علماء نے فصلّٰی کی تفسیر دعا سے کی ہے۔ اور دعا کا مسنون طریقہ (۱) خلق سے یکسو ہو کر حق کی طرف متوجہ ہونا پھر (۲) اللہ کی حمد وثنا وغیرہ کرنا پھر (۳) دعاء مانگنا ہے۔ تزکّی سے امر اوّل ذکر اسم رب امر ثانی اور صلّی سے دعا مراد ہے والتفسیر الاوّل اقوی واشهر وعليه جمهور المفسرين بل تؤثرون الحيوة الدنيا اس میں خطاب کفار کو ہے۔ یعنی اے بدبختو! تم فلاح کے (مذکورہ) کام نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دیتے ہو۔ یا کفار کے سوال کا اس میں جواب ہے۔ وہ یہ کہ ہم کو تو امور مذکورہ میں کوئی فلاح نظر نہیں آتی۔ تو جواب دیا کہ تمہاری نظریں تو اس حقیر زندگی پر مرکوز ہیں۔ فلاح کو تم کیسے دیکھ سکتے ہو۔ تمہاری عقل کی نگاہیں اس کی جانب مخالف لگی ہوئی ہیں۔ جس کی طرف پشت کر لی ہو اسکو انسان آخر کیسے دیکھ سکتا ہے؟ حالانکہ آخرت کی زندگی بہتر ہے۔ وہاں کی عظیم لذتیں تمام کدورتوں سے خالی ہیں۔ ہمیشہ کا دیدار و وصال ربانی اور ابدی رضاؤ خوشنودی رحمانی جیسے بہترین تحفے آخرت ہی کے تحفے تو ہیں اور دنیوی زندگی کے برخلاف وہ زندگی ابدی ولا زوال بھی ہے۔ یہاں دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کے بطلان پر نہایت اختصار کیساتھ دو مضبوط دلیلیں بیان فرمائی گئیں۔ خیر وابقی عقل کا تقاضا ہے کہ بہتر اور پائیدار شی کو اپنایا جائے اور ان کے بدلے بدتر و ناپائیدار چیز کو اختیار کرنا خلاف عقل اور بدترین حماقت ہے۔ اللھم احفظنا منه۔

اِنَّ هٰذَا الخ هذا کا مشار الیہ تمام مضامین سورت ہیں یا قد افلح سے اخیر تک یا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ہے اور صُحُفِ مُوْسٰى سے مراد یا تو وہ صحیفے ہیں جو ان کو تورات سے قبل عطا ہوئے تھے یا تورات ہی مراد ہے۔

تمام کتب آسمانی:

عبد بن حمید، ابن مردویہ اور ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہم کرنے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالی نے کل کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ ارشاد فرمایا ایک سو چار کتابیں، حضرت شیثؑ پر پچاس صحیفے، حضرت ادریسؑ پر تیس صحیفے، حضرت ابراہیمؑ پر دس صحیفے،

حضرت موسیٰ پر تورات سے قبل دس صحیفے نازل فرمائے۔اور چار کتابیں (مشہور) تورات ،انجیل ،زبور،قرآن اور نازل فرمائیں (بعض روایات میں دس صحیفے حضرت آدم کے مذکور ہیں۔حضرت موسیٰ کے نہیں ہیں۔)اور طیبی رحمۃ اللہ علیہ وحاشیہ کشاف میں کل تعداد ۱۱۴ ہے۔وہاں حضرت موسیٰ وآدمؑ دونوں کے دس دس صحیفے ذکر کئے ہیں۔)

ابراہیمی صحیفوں کے مضامین:

مذکورہ روایت میں ہے کہ میں نے (ابوذرؓ نے) پوچھا یا رسول اللہ!صحف ابراہیم کیسے تھے؟فرمایا ان میں تمام امثال (عبر ونصائح) تھیں (ایک مثال میں ظالم بادشاہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ) اے لوگوں پر مسلط ہوجانے والے مغرور ومبتلیٰ میں نے تجھے حکومت اس لیے نہیں دی تھی کہ تو دنیا کا مال تہ برتہ جمع کرتا چلا جائے۔بلکہ میں نے تجھے اقتدار اسلئے عطاء کیا تھا کہ تو مظلوم کی بددعاء مجھ تک نہ پہنچنے دے۔کیونکہ میرا قانون یہ ہے کہ میں مظلوم کی دعا کو رد نہیں کرتا اگرچہ وہ کافر کی زبان سے نکلی ہو۔اور ایک مثال میں عام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ) عقل مند آدمی کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات کے تین حصے کرے۔ایک حصہ اپنے رب عبادت ومناجات کیلئے دوسرا حصہ اپنے اعمال کے محاسبہ اور اللہ تعالی کی صنعت وقدرت میں غور وفکر کا تیسرا حصہ جائز طریقوں سے اپنی معاشی ضروریات اور طبعی حاجات کا۔یہ تیسرا حصہ تمام اوقات کا معین اور اطمینان کا باعث ثابت ہوگا۔اور صاحب عقل کے لئے لازم ہے کہ اپنے زمانے کے حالات سے واقف رہے اور اپنے مقصود کام میں لگا رہے۔اپنی زبان کی حفاظت کرتا رہے۔اور جو شخص اپنے کلام کو اپنا عمل سمجھ لے گا۔اسکا کلام بہت کم صرف ضروری کاموں میں رہ جائے گا۔اور ردانشمند کو چاہیے کہ وہ تین چیزوں کا طالب رہے۔معاش کی درستی کا آخرت کے توشہ کا،حرام سے بچ کر لذت کا۔

موسوی صحیفوں کے مضامین:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے عرض کیا کہ صحف موسیٰ کیا تھا؟ارشاد فرمایا ان میں سب عبرتیں ہی عبرتیں تھیں۔(ان میں سے چند کلمات یہ ہیں) مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو مرنے کا یقین ہو پھر وہ کیسے خوش ہوتا ہے۔اور مجھے تعجب ہے اس پر جو جہنم کا یقین رکھتا ہے پھر وہ ہنستا ہے۔اور مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا اور اس کے انقلابات اور لوگوں کے عروج وزوال کو دیکھتا ہے پھر وہ دنیا پر مطمئن ہوا بیٹھا ہے اور مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر کا یقین رکھتا ہے۔پھر وہ ناراض ہوتا ہے۔اور مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو حساب کا یقین رکھنے کے باوجود عمل نہیں کرتا۔حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ابراہیم وموسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں سے آپ ﷺ پر بھی کوئی چیز نازل ہوئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا:اے بوذر رضی اللہ عنہ یہ آیات قد افلح من تزکی الی قولہ خیر وابقی اتری ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم بصحتھذا الحدیث (روح المعانی).

تم تفسیر سورۃ الاعلیٰ بفضل اللہ سبحانہ وتعالیٰ وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہٖ صاحب قاب قوسین اوادنی وعلی الہٖ و صحبہ اولی لعدل اولتُقی وعلی اتباعھم کما یحب ربنا ویرضی

سُورَةُ الْغَاشِيَةِ

سُورَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتٌّ وَّ عِشْرُوْنَ ايَةً

رکوع:۱۰،آیات:۲۶) سورۂ غاشیہ مکیہ ہے۔اوراس میں چھبیس آیات ہیں (کلمات:۹۲،حروف:۳۱۸)

ربط ومناسبت:

یہ سورت بھی بالاتفاق مکیہ ہے۔احادیث میں وارد ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں خصوصاً عشاء اور جمعہ وعیدن میں اس سورت کوسورہ اعلی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ایک رکعت میں اس کواور ایک میں اس کو)لہذا معلوم ہوا کہ دونوں سورتوں میں خاص مناسبت ہے۔یوں بھی اگر غور کیا جائے تو دونوں سورتوں کے الفاظ اور مضامین نہایت مربوط ومناسب ہیں۔مثلاً سورۂ اعلی میں تذکیر کا امر ہےفذکر ان نفعت الذکر ی تواس سورت میں بھی فذکر انما انت مذکر ہےوہاں یصلی النار الکبری ہےتویہاں بھی تصلی ناراً حامية ہے۔پھرسورہ اعلی کے اخیر میں مومن وکافراوران کے اخروی حالات جنت ونار کی طرف اشارہ تھاتواس سورت میں بھی حالات کی تفصیل ہےوغیرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (١) وُجُوْهٌ يومئذٍ خاشعةٌ (٢) عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (٣) تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً (٤)

آپ کواس چھاجانے والے حادثہ کی خبر پہنچی ہے؟ بہت سے چہرے اس دن ذلیل ، مصیبت جھیلتے ،تھکے ہوئے دہکتی آگ میں داخل ہونگے۔

هَلْ	اَتٰكَ	حَدِيْثُ	الْغَاشِيَةِ	وُجُوْهٌ	يَّوْمَئِذٍ	خَاشِعَةٌ	عَامِلَةٌ	نَّاصِبَةٌ	تَصْلٰى	نَارًا	حَامِيَةً
کیا	آئی ہے تیرے	بات	ڈھانک لینے والی	کتنے منہ	اس دن	ذلیل ہونیوالے	عمل کرنیوالے	محنت کرنیوالے	داخل ہونگے	آگ	جلتی

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ (٥) لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ (٦) لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِىْ مِنْ جُوْعٍ (٧)

ان کوکھولتے چشمہ کاپانی پلایا جائے گا۔ ان کوضریع کے سوا کوئی کھانا نہ ملے گا۔ جونہ موٹا کریگااور نہ بھوک کو دفع کریگا

تُسْقٰى	مِنْ	عَيْنٍ	اٰنِيَةٍ	لَيْسَ	لَهُمْ	طَعَامٌ	اِلَّا	مِنْ	ضَرِيْعٍ	لَا يُسْمِنُ	وَلَا يُغْنِىْ	مِنْ جُوْعٍ
پلائے جائینگے	سے	چشمہ	کھولتا ہوا	نہیں	انکے لئے	کھانا	مگر	سے	خادار گھاس	نہ موٹا کریگی	اور نہ کفایت کریگی	سے بھوک

وَجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ (٨) لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ (٩) فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (١٠) لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (١١)

بہت سے چہرے اس دن تروتازہ اپنی محنت پرخوش ہوں گے۔وہ عالیشان جنت میں رہیں گے۔جہاں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے۔

وُجُوْهٌ	يَّوْمَئِذٍ	نَّاعِمَةٌ	لِّسَعْيِهَا	رَاضِيَةٌ	فِىْ	جَنَّةٍ	عَالِيَةٍ	لَا تَسْمَعُ	فِيْهَا	لَاغِيَةً
کتنے منہ	اس دن	تروتازہ	اپنی کوشش سے	خوش خوش	میں	باغ	بلند	نہیں سنتے	اس میں	بیہودہ

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۱۲) فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ (۱۳) وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ (۱۴) وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ (۱۵)

وہاں بہتا ہوا چشمہ ہوگا۔ وہاں اونچے تخت ہوں گے۔ اور آبخورے (گلاس) رکھے ہوں گے۔ اور ترتیب سے لگے ہوئے گاؤ تکیے ہونگے

فِيْهَا	عَيْنٌ	جَارِيَةٌ	فِيْهَا	سُرُرٌ	مَّرْفُوْعَةٌ	وَّاَكْوَابٌ	مَّوْضُوْعَةٌ	وَّنَمَارِقُ	مَصْفُوْفَةٌ
اسمیں	چشمہ	بہتا ہوا	اسمیں	تخت	اونچے اونچے	اور آبخورے	چنے ہوئے	اور غالیچے	برابر بچھے ہوئے

وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ (۱۶) اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۱۷) وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ (۱۸)

اور قالین بچھے ہوں گے۔ پھر کیا لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح بنایا گیا؟ اور آسمان کو (نہیں دیکھتے) کہ وہ کیسا بلند کیا گیا؟

وَّزَرَابِيُّ	مَبْثُوْثَةٌ	اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ	اِلَى	الْاِبِلِ	كَيْفَ	خُلِقَتْ	وَ	اِلَى	السَّمَآءِ	كَيْفَ	رُفِعَتْ
اور گدے	بکھرے ہوئے	کیا وہ نہیں دیکھتے	طرف	اونٹ	کیسے	وہ پیدا کیا گیا	اور	طرف	آسمان	کیسے	بلند کئے

وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ (۱۹) وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۲۰) فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ (۲۱)

اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ وہ کس طرح کھڑے کئے گئے اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ وہ کس طرح بچھائی گئی۔ پھر آپ تو سمجھاتے رہئے آپ کا کام سمجھانے ہی کا ہے۔

وَاِلَى	الْجِبَالِ	كَيْفَ	نُصِبَتْ	و	اِلَى	الْاَرْضِ	كَيْفَ	سُطِحَتْ	فَذَكِّرْ	اِنَّمَا	اَنْتَ	مُذَكِّرٌ
اور طرف	پہاڑوں	کیسے	نصب کئے گئے	اور	طرف	زمین	کیسے	بچھائی گئی	پس سمجھاتے رہیں	صرف	آپ	سمجھانے والے

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۲۲) اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ (۲۳) فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ (۲۴)

آپ ان پر نگہبان نہیں ہیں۔ لیکن جو روگردانی اور کفر کریگا۔ تو اس کا اللہ تعالی بڑی سزا دیں گے۔

لَسْتَ	عَلَيْهِمْ	بِمُصَيْطِرٍ	اِلَّا	مَنْ	تَوَلّٰى	وَ	كَفَرَ	فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ	الْعَذَابَ	الْاَكْبَرَ
نہیں تو	ان پر	داروغہ	مگر	جس	منہ پھیرا	اور	کفر کیا	پھر اس اللہ عذاب دیگا	عذاب	بڑا

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ (۲۵) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۲۶)

یقیناً ان کو ہمارے پاس لوٹ آنا ہے۔ پھر ہمارے ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔

اِنَّ	اِلَيْنَآ	اِيَابَهُمْ	ثُمَّ	اِنَّ	عَلَيْنَا	حِسَابَهُمْ
بیشک	ہماری طرف	ان کا لوٹنا	پھر	بیشک	ہم پر	حساب ان کا

لغات:

الغاشية غشي غشاءً (س) سے اسم فاعل واحد مونث ہر چھپانے والی، ڈھانک دینے والی، چھا جانے والی چیز، یہ اسکے اصل وضعی معنی ہیں، لیکن اس سے مراد قیامت ہے۔ اسلئے کہ اس کی ہولناکیاں سب پر چھا جائیں گی۔ الحاصل اس کو وصفیت سے علمیت کی طرف منتقل کیا گیا۔ عاملة ایضا (س) محنت کرنے والی، عمل کرنے والی (ناصبة ایضاً (س) عاجز، مصیبت میں مبتلا ہونے والی۔ حامیة ایضاً (س) دہکتی ہوئی، جلتی ہوئی مصدر حَمْيًا حُمِيًّا حُمُوًّا تیز گرم ہونا، غضبناک ہونا، اٰنِيَة ایضاً (ض) سخت کھولتی ہوئی مصدر اَنْيًا اِنًى اَنَاءً قریب ہونا، پک جانا، ضریع خاردار جھاڑ۔ کانٹے۔ بخاری شریف کتاب التفسیر میں ہے کہ ضریع ایک گھاس ہے جس کو شبرق کہا جاتا ہے۔ یہی گھاس جب سوکھ جاتی ہے تو اہل حجاز اس کو ضریع کہتے ہیں۔ اور یہ زہریلی ہوتی ہے۔ بدرالدین عینیؒ کہتے ہیں کہ یہ فراء کا قول ہے۔ خلیلؒ نے کہا یہ

ایک بدبودار گھاس ہوتی ہے۔ جس کو سمندر کنارہ پر ڈال دیتا ہے۔ (عینی ج ۹/۳۲۵) مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ ایک خاردار گھاس ہوتی ہے۔ جو زمین سے چسپاں رہتی ہے۔ قریش اسکو شبرق کہتے ہیں اور سوکھ جانے کے بعد ضریع کہلاتی ہے یہ سب سے زائد خبیث اور بری خوراک ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ گھاس خشک ہو جاتی ہے تو جانور اس کے قریب بھی نہیں آتا۔ ابن زید کہتے ہیں کہ دنیا میں تو ضریع خشک کانٹے ہیں کہ یہ گھاس خشک ہو جاتی ہے۔ تو جانور اسکے قریب بھی نہیں جاتا۔ اور آخرت میں آگ کے کانٹے ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت میں ہے کہ ضریع دوزخ میں کانٹوں کی طرح ایک درخت ہے جو ایلوے سے زیادہ تلخ، مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ گرم ہے۔ (جمل ج ۴/۵۴۱) لایسمن واحد مذکر غائب مضارع منفی بلا (افعال) سَمِنَ سمناً و سمانۃً (س) موٹا ہونا سمن گھی (ن) گھی ڈالنا، مرغن کرنا۔ جوع بھوک (ن) بھوکا رہنا۔ ناعمۃ اسم فاعل واحد مونث نعومۃ (س) خوش اور تروتازہ ہونا۔ لاغِیَۃ ایضاً بیہودہ، لغو ناکارہ بات، بابہٗ نصر و سمع. سُرُرٌ جمع سریر کی تخت جس پر سرور سے بیٹھا جائے، کیونکہ سریر ارباب نعمت ہی کے پاس ہوتا ہے۔ اکواب جمع کوب کی پیالے، کوزے۔ نمارق جمع نمرقۃ کی تکیۓ چھوٹے تکیۓ۔ گاؤ تکیۓ یا گدے۔ زَرَابِی زرب کی جمع ہے۔ مخمل کے نہالچے، ایک قسم کا آراستہ کپڑا، غالیچے، فرش یا ہر وہ چیز جو بچھائی جائے اور اس پر تکیہ لگایا جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا واحد ذُربی بکسر الزاء وضمہا ہے۔ مبثوثۃ اسم مفعول واحد مونث (ن ض) بچھی ہوئی۔ الابل اونٹ۔ یہ اسم جنس ہے واحد جمع سب پر اطلاق آتا ہے۔ سطحت واحد مونث غائب ماضی (ف) بچھانا مُصَیْطِرٍ یہ لفظ دراصل مسیطر بالسین تھا۔ سین کو صاد سے بدل دیا گیا۔ سیطرۃ مصدر ہے۔ کسی کام پر مقرر کرنا۔ ذمہ دار ہونا۔ نگراں ہونا۔ اِیَاب مصدر (ن) اَوْباً و اِیَاباً۔ لوٹنا۔

ترکیب:

ھل استفہام کا ہے۔ مقصود اس سے غاشیہ کی بات سننے کا شوق دلانا ہے۔ اور اس کے عجیب غریب ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یا ھل برائے تحقیق بمعنی قد ہے۔ ھل اتک حدیث الغاشیۃ جملہ فعلیہ مرشلہٗ وجوہ مبتدا (ولا باس بتنکیرھا لان التنوین فیہ عوض عن المضاف الیہ کما مر فی القیمۃ ای وجوہ الکفار) یومئذٍ ای یوم اذ کان کذا یہ خاشعۃ کا ظرف ہے خاشعۃ خبر اول عاملۃ خبر ثانی ناصبۃ خبر ثالث تصلی فعل ضمیر مونث عائد الی وجوہ فاعل نارا حامیۃ موصوف وصفت ظرف جملہ فعلیہ۔ خبر رابع (ومن قال ھی خبرھا وما قبلھا صفات للوجوہ فلم یفھم ان الصفۃ لا بد لھا ان یکون المخاطب عالما باتصاف الموصوف بھا قبل جعلھا صفۃ لہ، والخبر محکوم بہ والحکم بالمجھول اولی فافھم) ہاں یہ ممکن ہے کہ جملہ تصلی الخ اور اسکے بعد کے دونوں جملوں کو مستانفہ قرار دیا جائے کہ یہ احوال وجوہ کی تفاصیل ہیں۔ گویا کہ سائل نے مذکورہ احوال وجوہ کے بارے میں تفصیل کا سوال کیا اور یہ جملے اسکے جواب میں واقع ہوئے۔ تسقی فعل مجہول ضمیر نائب فاعل من حرف جر عین انیۃ مرکب توصیفی مجرور متعلق تسقی جملہ فعلیہ وُجُوہٌ کی خبر خامس 'لیس' فعل ناقص لھم متعلق محذوف خبر مقدم طعام مستثنیٰ منہ الا حرف استثناء لغو من زائدہ ضریع موصوف لا یسمن فعل فاعل جملہ فعلیہ معطوف علیہ ولا یغنی من جوع فعل فاعل متعلق جملہ فعلیہ معطوف۔ معطوفین صفت۔ ضریع اپنی صفت سے مل کر مجرور طعام سے مستثنیٰ یا اس سے

بدل کر طعام اپنے مستثنیٰ یا بدل سے مل کر اسم لیس جملہ فعلیہ حال ضمیر تسقی سے یا جملہ مستانفہ۔ اسی طرح تسقی میں بھی دو احتمال ہیں۔ تصلی کی ضمیر سے حال یا خبر خامس وجوہ اپنی پانچوں خبروں سے ملکر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

وجوہ یومئذٍ ناعمۃ الی قولہٖ تعالیٰ مبثوثۃ بھی حسب سابق سوال مقدر کا جواب جملہ مستانفہ ہے۔ وجوہ مبتدا حسب سابق ناعمۃ اپنے ظرف یومئذٍ اور متعلق لسعیھا سے مل کر خبر اول راضیۃ خبر ثانی فی جنۃ موصوف عالیۃ صفت اول لا تسمع فعل ضمیر فاعل عائد الی وجوہ فیھا ای فی الجنۃ متعلق لاغیۃ مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ صفت ثانیہ ہے۔ جنۃ کی فیھا ای فی الجنۃ خبر مقدم عین جاریۃ مرکب توصیفی معطوف۔ اسی طرح ونمارق مصفوفۃ اور وزرابی مبثوثۃ جملہ معطوفات مل کر مبتدا موخر۔ جملہ اسمیہ صفت رابعہ جنۃ کی جنۃ اپنی تمام صفات سے مل کر مجرور فی ای دائمۃ فی الجنۃ الخ خبر ثالث وجوہ کی۔ جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔ افلاینظرون ہمزہ استفہام انکاری کا ہے اور فاء عاطفہ ہے۔ معطوف علیہ مقدر ہے۔ ای اینکرون ماذکر من البعث واحوال الاخرۃ ویستعبدونھا وقوعہٗ من قدرۃ اللہ فلا ینظرون الخ۔ جملہ فعلیہ مقدر معطوف علیہ فاء عاطفہ ینظرون فعل ضمیر عائد الی اہل مکہ فاعل المذکورون (معنیٰ) الی الابل متعلق خلقت فعل ضمیر ذوالحال کیف حال۔ ذوالحال حال سے مل کر نائب فاعل۔ ای علیٰ ایِّ حالٍ۔ خُلِقَتْ یا مصدر محذوف کی صفت ہے۔ ای خلقت خلقاً حاصلاً علی صفۃ۔ استفہامیت کی بناء پر مقدم کر دیا گیا۔ بہر دو صورت جملہ الا بل سے بدل اشتمال ہے۔ اسی طرح اگلے تینوں جملے ہیں۔ اور چاروں الی کا تعلق لا ینظرون سے ہے۔ فذکر فاء تعقیبیہ ذکر امر حاضر معروف واحد مذکر فعل با فاعل مفعول محذوف جملہ انشائیہ۔ انّما کلمہ حصر انت مبتدا مذکر خبر جملہ اسمیہ علت امر۔ لست فعل ناقص ضمیر بارز اسم علیھم متعلق بِمُصَیطر خبر اس میں باء زائدہ تاکید نفی وتحسین کلام کے لئے ہے۔ جملہ فعلیہ الا حرف استثناء من موصولہ متضمن لمعنی الشرط ولذلک دخل الفاء فی خبرہ۔ تولی فعل فاعل جملہ فعلیہ معطوف علیہ وکفر جملہ فعلیہ معطوف، معطوفین صلہ۔ موصول وصلہ مل کر مبتدا فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ فعل مفعول بہ فاعل العذاب الاکبر مرکب توصیفی مفعول مطلق جملہ فعلیہ خبر۔ انّ اپنی خبر مقدم الینا اور اسم موخر اِیَابَھُم سے مل جملہ اسمیہ معطوف علیہ ثم ان علینا حسابھم بعینہ اسی ترکیب سے معطوف۔ تعلیل لتعذیبہ تعالیٰ۔ وجمع الضمیر باعتبار معنی من وافراد ہ فیما سبق باعتبار لفظھا۔

تفسیر:

ھل اتک حدیث الغاشیۃ ھل بمعنی قد ہے۔ ای قد جاء یا محمد حدیث الغاشیۃ، لیکن جمہور کے نزدیک ھل استفہامیہ تشویق وتعجیب کے لئے ہے۔ محمد بن کعب وابن جبیر رحمۃ اللہ علیہما کہتے ہیں کہ الغاشیۃ سے مراد دوزخ کی آگ ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں دوسری آیات تغشی وجوھھم النار اور من فوقھم غواش سے مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن الغاشیۃ کے بعد چونکہ احوال مومنین کا بھی ذکر ہے۔ اسلئے یہاں غاشیہ سے مراد نار جہنم نہیں ہے۔ بلکہ قیامت مراد ہے۔ اور جمہور مفسرین کا یہی قول ہے۔ کما قال تعالیٰ: افامنوا ان تاتیھم غاشیۃ من عذاب اللہ (۲) وہ دن سب کے ہوش وحواس اپنی ہولناکیوں میں چھپالیگا (۳) اس دن کا عذاب مجرموں کے بدنوں کو چاروں طرف سے ڈھانک لیگا۔ کما قال تعالیٰ ﴿یوم یغشھم العذاب من فوقھم ومن تحت ارجلھم﴾۔ (۴) مومنوں کی

خطاؤں اور لغزشوں کو بھی چھپالیگا کہ ان کی مغفرت ہو جائیگی۔ اور کفار کے نیک اعمال کو بھی کیونکہ وہ قبول نہیں ہوئے۔ اسی کو حبط اعمال سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ وغیرہ۔

کفّار مجرمین کے حالات:

وجوہ یومئذٍ خاشعة الخ سابقہ آیت میں قیامت کے حادثہ اور اس کے حالات کے سننے کی طرف متوجہ فرما کر یہاں سے اس کے حالات کی قدرے تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ قیامت کے دن دونوں فریق مومن و کافر، الگ الگ ہو جائیں گے ان کے حالات جدا جدا ہونگے ان کے چہروں میں امتیاز ہوگا۔ اوّل ان آیات میں کافروں کے چہروں کے چند حالات کا ذکر ہے۔ (۱) **خاشعة** : خشوع کے معنی جھکنے اور ذلیل ہونے کے ہیں۔ نماز میں خشوع کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک کر اپنے اوپر ذلت و پستی کی کیفیت طاری کی جائے۔ جن لوگوں نے دنیا میں اللہ کے سامنے تذلل و خشوع اختیار نہیں کیا اس کی سزا ان کو قیامت کے دن یہ ملیگی کہ وہاں ان کے چہروں پر ذلت و رسوائی کے آثار نمایاں ہوں گے۔ (۲،۳) **عاملة ناصبة** : عاملة کے معنی عمل اور محنت کرنیوالے کے ہیں۔ محاورات میں عامل اور عاملہ اس شخص کیلئے بولا جاتا ہے جو مسلسل عمل و محنت میں تھک کر چور ہو گیا ہو۔ اور ناصبة نصب سے مشق ہے جسکے معنی تھکنے اور مشقت میں پڑ جانے کے ہیں۔ بظاہر کفار کے ان دونوں حالات (عمل و محنت سے تھک جانے) کا تعلق دینوی زندگی سے ہے۔ کیونکہ آخرت میں کوئی عمل و محنت نہیں ہے۔ اسی لئے علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ پہلے حال (خاشعة) کا تعلق آخرت سے ہے۔ اور عاملة ناصبة یہ دونوں حال ان کے دنیا ہی میں ہوتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے کفار، فجار اور رہبان مشرکانہ عبادات اور باطل طریقوں میں ریاضت و مجاہدہ دنیا میں کرتے ہیں۔ بہت سے ہندو جوگی اور نصرانی راہب ایسے بھی ہیں جو اخلاص کیساتھ اللہ تعالیٰ ہی کی رضا جوئی و خوشنودی کیلئے دنیا میں عبادت و ریاضت کرتے اور اس میں زبردست محنتیں کرتے ہیں۔ مگر طریقہ کار غلط ہونے کیوجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے لئے کوئی اجر و ثواب نہیں ہے۔ تو ان باطل پرستوں کے چہرے دنیا میں **عاملہ** اور **ناصبہ** ہے اور آخرت میں **خاشعہ** ہوں گے۔

بوڑھے راہب کا واقعہ:

حضرت حسن بصریؒ نے روایت کیا کہ حضرت فاروق اعظم رحمۃ اللہ علیہ ملک شام تشریف لے گئے تو ایک نصرانی راہب آپ کے پاس آیا جو بہت بوڑھا تھا۔ اور اپنے مذہب کے موافق عبادت و ریاضت میں ایسا لگا ہوا تھا کہ مجاہدہ و مشقت سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا، اس کا بدن خشک، لباس خستہ اور حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کا یہ حال دیکھا تو رو دیئے۔ لوگوں نے آپ سے رونے کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس بوڑھے کے حال پر رحم آرہا ہے کہ اس بیچارے نے ایک عظیم مقصد کے پیش نظر بڑی محنت و جانفشانی کی مگر اس مقصد یعنی رضاء الٰہی کو نہ پاسکا۔ اسکے بعد حضرت عمرؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی **وجوہ یومئذ خاشعة عاملة ناصبة** ۔ اس واقعہ کو قرطبی نے اپنی تفسیر مذکور کی تائید میں پیش کیا ہے۔

یہی تفسیر سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ اور زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مطلب آیت کا یہ ہے کہ وہ لوگ دنیا میں گناہوں کی مشقت اور آخرت میں دوزخ کا دکھ اٹھانے والے ہوں گے۔ صاحب تفسیر حقانی فرماتے ہیں کہ کفار دنیا میں

عبادت اور دینی کاموں میں مشقت اٹھانے سے یکسورہ کر آرام طلبی وعیش کوشی کرتے، روزوں کی خشک لبی سے بچ کر سزا ان کو یہ ملے گی کہ وہ وہاں مشقت میں پڑے ہوں گے۔ کسی کو دوزخ کے صعود پہاڑ پر چڑھایا اتارا جائیگا۔ **سأرهقه صعودا** کوئی میدان قیامت میں سہارے تلاش کرتا سرگرداں پھریگا۔ کسی کو ملائکہ زنجیروں اور ہتھکڑیوں میں جکڑ کر کھینچتے پھریں گے۔ کسی پر مار پکڑی جائیگی۔ اور جہنم کے عذابوں میں گھسیٹا جائیگا۔ یہ مشقتیں ہوں گی جن کے نتیجہ میں وہ تھک کر چور چور ہو جائیں گے۔ کلبی وضحاک رحمۃ اللہ علیہم سے بھی اسی قسم کی تفسیریں منقول ہیں۔

تصلی نارا حامیۃ حامیۃ کے لفظی معنی گرم کے ہیں۔ اور آگ کا گرم ہونا اسکی طبعی کیفیت ہے۔ پھر نار کی صفت اس کو بنانے کا منشاء یہ بتلانا ہے کہ وہ آگ دنیوی آگ کی طرح نہیں کہ کسی وقت کم یا ختم ہو جائے بلکہ وہ شدید بھی ہے اور دائم بھی۔ یہ دہکتی ہوئی آگ کفر و فجور، حبّ مال، حبّ جاہ اور حبّ باہ کا نتیجہ اور پھل ہوگی۔ اور دنیوی آرام وعیش کے مکانوں میں نافرمانی کی زندگی بسر کرنے کے بدلہ اسکو یہ تکلیف دہ مکان (دوزخ) ملے گا۔

تسقی من عین انیۃ جب دوزخ کی گرمی سے دوزخی سخت پیاس کی مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ اور پینے کے لئے پانی مانگیں گے تو ان کو دوزخ کے کھولتے ہوئے چشمے کا پانی پلایا جائے گا۔ جس کے سامنے آتے ہی چہرہ کا گوشت اور پیٹ میں پہونچتے ہی پیٹ کے اندر کی آنتیں وغیرہ ٹکڑے ہو کر گر پڑیں گی۔ یہ دنیا کے ان ٹھنڈے پانیوں، لذیذ شربتوں اور برف آمیز شرابوں کا بدلہ ہوگا۔ جن کی لذتوں کا شکار ہو کر وہ خدا کو بھول گئے تھے۔ انیۃ کے معنی ہیں گرمی کی آخری حد کو پہونچا ہوا۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جس چیز کی گرمی اس کی آخری حد کو پہونچ جائے تو اہل عرب اس کے بارے میں کہتے **قد انی حرہ** (اس کی گرمی انتہاء کو پہونچ چکی) تفسیر مظہری میں ہے کہ ابتدائے آفرینش سے جہنم اس چشمہ پر دہک رہی ہے۔ اسلئے اسکی گرمی آخری نقطہ پر پہونچی ہوئی ہے۔ اور اس کا پانی ایسا کھولتا ہوا ہے کہ اگر اس کا ایک قطرہ دنیا کے پہاڑوں پر گر جائے تو پہاڑ پگھل جائیں۔

لیس لھم طعام الا من ضریع دوزخیوں پر بھوک کا عذاب مسلّط ہوگا۔ اور وہ بھوک بھوک پکاریں گے۔ تو ان کو دنیا کی ان لذیذ و مرغن غذاؤں کے عوض جن کو کھا کر وہ خدا کی بغاوت کرتے تھے۔ ضریع کے علاوہ کوئی مفید خوراک نہ ملے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ضریع ایک چیز ہے جو ایلوے سے زیادہ تلخ، مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ گرم کانٹے کی طرح ہوگی۔ جب کسی دوزخی کو کھلائی جائیگی تو وہ نہ پیٹ میں اترے گی نہ منہ سے باہر نکلے گی، نہ فربہی پیدا کریگی، نہ بھوک کو دفع کریگی۔ ایک حدیث میں ہے کہ دوزخیوں پر بھوک مسلط کیجائیگی وہ ان سب عذابوں کے برابر ہوگی جن میں وہ مبتلا ہوں گے۔ **نوٹ**: ضریع کی حقیقت میں علماء کے مختلف اقوال ہیں عنوان لغات میں ملاحظہ فرمالیں۔

شبہات اور جوابات:

(۱) یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ گھاس اور درخت تو آگ میں جل جاتے ہیں اور ضریع گھاس ہے تو وہ دوزخ کی آگ میں کیسے باقی رہے گی۔ کیونکہ جس خالق و مالک نے نباتات کو دنیا میں ہوا اور پانی سے پالا ہے۔ اس کو یہ بھی قدرت ہے کہ جہنم میں ان درختوں کی غذا آگ بنا کر اسکو ان کی بقا کا سبب بنادے۔ پھر دنیاوی حیوانات ونباتات کی طبیعت پر جوہر خاک و آب کا غلبہ ہے اسلئے آگ میں انکا بقا ناممکن ہے۔ اور خاک و آب وہوا سے ان کی بقاء وابستہ ہے۔ اور دوزخ کے حیوانات ونباتات کا مزاج آتشیں ہوگا۔ جو ہر ناری کا ان کی طبیعتوں پر غلبہ ہوگا۔ اسلئے ان میں اور آگ میں زبردست مناسبت ہوگی۔ اور آگ انکی غذا اور سبب بقا بن جائیگی۔ (۲) قرآن پاک میں دوزخیوں کی غذا کے بارے میں مختلف چیزوں کا

ذکر آیا ہے۔ کہیں زقوم ہے تو کہیں غسلین اور یہاں ضریع کا ذکر ہے۔ اور یہاں پر اسکو حصر کیساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ضریع کے سوا ان کی غذا اور کچھ نہ ہوگی۔ حالانکہ زقوم و غسلین بھی ان کی غذا ہوگی۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ حصر حقیقی نہیں حصر اضافی ہے۔ یعنی ان کھانے کے اعتبار سے حصر ہے جو چیزیں کھانے کے لائق، خوشگوار اور جزو بدن بننے کے قابل ہیں۔ اور ضریع کو بطور مثال لایا گیا ہے۔ حاصل مطلب یہ ہوگا کہ دوزخیوں کو کوئی کھانے کے لائق غذا نہ دی جائیگی بلکہ ضریع جیسی تکلیف دہ اور مضر چیزیں دی جائیں گی۔ کیونکہ ضریع میں حصر مقصود نہیں ہے۔ اسلئے اسمیں زقوم و غسلین بھی داخل ہیں۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ دوزخ کے مختلف طبقات ہیں۔ اور ان کی مختلف غذائیں ہیں۔ کسی طبقہ والوں کے لئے زقوم، کسی طبقہ والوں کے لئے غسلین اور کسی طبقہ میں ضریع۔ تو یہ حصر خاص اسی طبقہ جہنم کے اعتبار سے ہے۔ (معارف ج ۶/۷۳۱)

لایسمن ولا یغنی من جوع جب اوپر کی آیت نازل ہوئی اور اسمیں دوزخیوں کی غذا **ضریع** بتلائی گئی تو بعض کفار نے کہا کہ **ضریع** گھاس کھا کر تو اونٹ خوب موٹے ہوجاتے ہیں۔ ان کے جواب میں فرمایا گیا کہ جہنم کے **ضریع** کو دنیا کے **ضریع** پر قیاس نہ کرو۔ وہاں کے **ضریع** سے نہ موٹاپا آئیگا اور نہ بھوک کے عذاب سے نجات ملے گی غذا کے یہی دو فائدے ہوتے ہیں۔ بھوک دور ہوجائے اور جسم کی پرورش ہو۔ دوزخ کی غذا میں یہ دونوں فائدے معدوم ہیں۔

وجوہ یومئذ ناعمۃ دوزخیوں کے حالات اور ان کے کھانے پینے اور رہنے کی جگہ کو بیان فرما کر ان کے مقابلہ میں جنتیوں کے حالات اور ان کے کھانے پینے اور رہنے کے مکانات کا ذکر فرماتے ہیں کہ بہت سے چہرے اس دن خوش وخرم اور تروتازہ ہوں گے، تعب و مشقت، ذلت و مصیبت سے وہ قطعی مبرا ہوں گے۔ کیونکہ دنیا میں رضاء الٰہی کیلئے انہوں نے تکالیف شاقہ اور مجاہدات عظیمہ برداشت کئے تھے۔

لسعیھا راضیۃ ۔ دنیا میں رہ کر جو کوششیں انہوں نے کی تھیں ان کا اجر و ثواب دیکھ کر وہ خوش ہوں گے۔ ﴿**فی جنۃ عالیۃ**﴾ وہ عالی مرتبہ اور بلند مقام والی جنت میں رہیں گے۔ جنت مرتبہ کے اعتبار سے بھی بلند ہے اور مکان کے اعتبار سے بھی بلند ہے۔

لاتسمع فیھا لاغیۃ **لاتسمع** کی ضمیر **وجوہ** کی طرف راجع ہے۔ اور ظاہر وراجح نیز سیاق کلام کا تقاضا بھی یہی ہے۔ بعض نے کہا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ یا مخاطب غیر معین ہے۔ **لاغیۃ** بیہودہ اور بے فائدہ کلام، اسمیں کلمات کفریہ، گالی گلوچ، افتراء و بہتان، غیبت والزام تراشی اور دلخراش و تکلیف دہ باتیں سب ہی داخل ہیں۔ دوسری جگہ ہے **لایسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما** یعنی جنت میں کوئی لغو یا گناہ کی بات نہ سنیں گے قرآن پاک میں یہ مضمون مختلف پہلوؤں سے بہت سی جگہوں پر آیا ہے۔

فیھا عین جاریۃ **عین** میں تنوین تعظیم کیلئے ہے۔ یعنی جنت میں عظیم الشان چشمہ رواں ہوگا جو کبھی منقطع نہ ہوگا حدیث میں ہے کہ جنت کے دریا مشک کے پہاڑ سے پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ (مظہری)

فیھا سرر مرفوعۃ جنت میں بلند تخت ہوں گے۔ جن پر کمال عزت وعظمت کیساتھ بادشاہوں کی طرح جنتی بیٹھیں گے۔ یہ تخت مرتبہ کے اعتبار سے بھی بلند ہوں گے اور مکانیت کے اعتبار سے بھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان تختوں (ممبروں) کے تختے سونے کے ہوں گے۔ اور ان کا حاشیہ زمرد، موتی اور یاقوت سے آراستہ ہوگا۔ لیکن

جب بیٹھنے والا ان پر بیٹھنا چاہے گا تو وہ نیچے جھک جائیں گے۔ اور پھر بلند ہو کر اپنے مقام پر چلے جائیں گے۔ ترمذی شریف کی حدیث میں ان کی بلندی پانچسو برس (۵۰۰) چلنے کی مقدار یعنی زمین وآسمان کے درمیانی فاصلہ کے برابر بتائی گئی ہے۔ ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے فرش مرفوعۃ کے بارے میں ابوامامہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر بالائی فرش زیریں فرش پر گر جائے تو وہ اسپر چالیس برس میں بھی نہ پہنچے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ اوپر کا فرش انتہائی نشیب میں سو (۱۰۰) سال تک گرتا چلا جائیگا۔

معاشرت کا ایک اہم ادب:

واکوابٌ مّوضوعة ۔ اکوابٌ جمع کوبٌ کی ہے۔ پانی کے برتن کو کہا جاتا ہے۔ جیسے آبخورہ، گلاس وغیرہ۔ اکواب کی صفت موضوعة کا مطلب یہ ہے کہ وہ آبخورے اپنی مقررہ جگہ پر قرینہ سے رکھے ہوں گے۔ اس میں آداب معاشرت کے ایک اہم اصول کی تلقین ہے۔ کہ پانی پینے کا برتن پانی کے قریب مقررہ جگہ پر رکھنا چاہئے۔ تا کہ وقت ضرورت تلاش کرنے میں پریشان نہ ہونا پڑے۔ اہل خانہ کو اس کا بہت اہتمام کرنا چاہئے۔ کہ سب چیزوں کے لئے جگہ مقرر کریں۔ اور ہر چیز کو استعمال کر کے اسکے مقام پر رکھدیا جائے۔ تا کہ وقت ضرورت تلاش کرنے میں زحمت اور تضیع اوقات نہ ہو۔ خصوصاً ایسی چیزیں جو سب گھر والوں کے کام میں آتی ہیں۔ جیسے لوٹا، گلاس، صابن، تولیہ، منجن وغیرہ ان سب کی جگہ مقرر ہونی چاہئے۔ اور ہر استعمال کرنیوالا استعمال کے بعد ان چیزوں کو ان کی مقرر جگہ پر رکھ دیا کرے۔ تا کہ کسی کو تکلیف اور زحمت نہ ہو۔ یہ اشارہ لفظ موضوعہ سے اسلئے نکلا کہ حق تعالیٰ نے اہل جنت کی راحت وآسائش کیلئے اسکے ذکر کا اہتمام فرمایا ہے کہ ان کے پانی پینے کے برتن پانی کے قریب رکھے ہوئے ملیں گے۔

افلاینظرون ...... سابقہ آیات میں قیامت کے حالات اور مومن وکافر کی جزاوسزا کا بیان تھا۔ ان آیتوں میں ان جاہل معاندین کو ہدایت کی طرف توجہ فرمائی گئی ہے جو اپنی بیوقوفی سے قیامت اور حشر ونشر وغیرہ کو ناممکن سمجھتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان آیات میں اپنی قدرت کی چند نشانیاں ذکر فرما کر ان میں غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ یوں تو زمین وآسمان میں قدرت خداوندی کی بیشمار نشانیاں موجود ہیں۔ مگر ان سب میں سے یہاں چار چیزوں کو عرب کے بادیہ نشین لوگوں کے حال کے مناسب ذکر فرمایا ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں اہل عرب اونٹوں پر سوار ہو کر بڑے طویل سفر طے کرتے تھے۔ اسوقت ان کے سب سے زیادہ قریب اونٹ ہوتا، اوپر آسمان، نیچے زمین اور ان کے دائیں بائیں آگے پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ ہوتا تھا۔ انہیں گردوپیش کی چار چیزوں میں غور وفکر کی ان کو دعوت دی گئی ہے۔ اگر ان چار چیزوں ہی میں غور کر لیا جائے تو حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ ہو کر دل میں ان اللّٰہ علیٰ کل شیءٍ قدیر کا یقین پیدا ہو سکتا ہے۔

ان چار چیزوں کی خصوصیات:

جب مذکورہ آیات کا نزول ہوا جن میں دوزخیوں اور جنتیوں کے حالات کا بیان ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تفصیلات بیان فرمائیں تو کفار ومشرکین نے مذاق اڑایا اور کہا۔ تعجب ہے کہ دوزخیوں کا کھانا پینا ایسا ہوگا۔ اور وہ اتنے سخت عذاب سے نہ مریں گے۔ بلکہ ابدالآباد تک زندہ رہیں گے۔ حالانکہ کوئی جاندار اتنی شدید تکلیف میں ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اہل جنت کو کسی قسم کا رنج وغم نہ ہوگا۔ اور وہ لوگ اتنی بلند مسہریوں پر بیٹھیں گے جتنی بلندی زمین سے آسمان کی ہے ان مسہریوں پر اترنا چڑھنا کس قدر دشوار ہوگا؟ اور اہل جنت کے لئے جن نعمتوں کا ذکر کیا جاتا ہے وہ تو بڑے

بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں ہیں۔ وغیرہ۔ مشرکین و کفار کے اس تعجب وحیرت کو دور کرنے کیلئے ان چیزوں میں غور کرنے کی دعوت دی گئی جو ان کے سامنے ہمہ وقت موجود ہیں۔ اور ان میں بہشت و دوزخ کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ اور وہ چیزیں اس قادر مطلق کی قدرت کاملہ پر ایسے روشن دلائل بھی ہیں جن کو ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ سفر کی حالت میں آدمی کاروبار اور اہل وعیال کے جھمیلوں سے فارغ البال ہوتا ہے۔ اسی لئے مسافر سفر میں کوئی نہ کوئی مشغلہ ڈھونڈھتا ہے، رفقاء سفر سے گفتگو، دنیوی امور میں غور وخوص، اہل دل ذکر وفکر اور شعراء سفر میں غزلیں، قصیدے اور نعتیں کہہ ڈالتے ہیں۔

عرب کے لوگ اونٹ پر سوار ہوتے تو اونٹ انکے قریب تر ہوتا، عموماً شعراء عرب اپنے اونٹ کی رفتار وغیرہ کے تذکروں میں سفر ہی میں قصیدے تیار کر لیتے تھے۔ اسلئے انکو اولاً اس عجیب الخلقت جانور کی خلقت میں غور وفکر کی دعوت دی گئی۔ اونٹ پر بیٹھنے والا اونٹ کی رفتار سے حرکت کرتا ہے تو اس کا رُخ آسمان کی طرف ہوتا ہے۔ اسلئے ثانیاً آسمان کی بلندی میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ جب وہ سیدھا ہوتا ہے تو اسکے سامنے پہاڑوں کا سلسلہ موجود ہے۔ تو اس تیسری چیز (پہاڑ) میں فکر وتامل کو کہا گیا۔ انکے عجائبات پر جب عبرت کی نگاہ پڑے گی تو عرب کا انسان حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا معترف ہو کر سر جھکالیگا تو اسکی نگاہ زمین پر پڑے گی۔ چوتھی چیز جس میں غور وفکر کو کہا گیا وہ زمین ہی ہے۔ یہ چاروں چیزیں مشاہد ہیں۔ اور ان میں جنت وجہنم اور عذاب وثواب کے بیشمار نمونے موجود ہیں۔ اسلئے خصوصیت سے ان چار چیزوں کو ذکر کر کے مضمون سابق پر گویا ان کو دلائل قرار دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

اونٹ کی خصوصیات:

اونٹ میں کچھ ایسی خصوصیات وعجائبات ہیں کہ جو خاص طور پر غور کرنیوالے کیلئے حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ وحکمت بالغہ کا آئینہ بن سکتی ہیں۔ اس کی خلقت میں جنت وجہنم دونوں کے نمونے موجود ہیں۔ وہ اپنی ذات ومعاش میں اگر دوزخیوں کی زندگی سے مشابہت رکھتا ہے تو منافع وفوائد میں جنت کی نعمتوں کے نمونے پیش کرتا ہے۔ اونٹ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا جانور ہونے کے باوجود اتنا ذلیل وخوار ہے کہ ایک بچہ بھی اسکی مہار پکڑ کر جہاں چاہے لئے پھرے۔ اور پھر جب چاہے بٹھلا دے، جو چاہے لاد لے، ورلاد کر جہاں جی چاہے لے جائے۔ اس کی اس ذلت وتابعداری سے صفت خشوع آشکارا ہے۔

اس کی بارکشی، اعمال شاقہ، طویل اسفار اور پہاڑوں پر اُترنا چڑھنا عاملة اور ناصبة کے مظاہر ہیں۔ اکثر اسکے رہنے کی جگہ کا گرم مقام اور ریگستان کا ہونا، گرم ہواؤں اور لوؤں میں سفر اور شدید گرمی میں سخت پیاس کا جھیلنا۔ یہ سب چیزیں تصلیٰ نارًا حامية کی مثال پیش کرتی ہیں۔ پیاس میں گرم پانی پر اکتفاء کر لینا تسقى من عينٍ انية کا منظر دکھاتا ہے۔ اور ''گوکھرو، جواسا'' جیسے خاردار اور تلخ درختوں سے غذا حاصل کرنا ضريع کے مشابہ ہے۔ اگر اس کے فوائد ومنافع میں غور کریں تو اس کی پیٹھ ایک بلند تخت ہے جو چار ستونوں پر قائم ہے۔ اور اس بلندی کے باوجود جب چاہیں اس کو بٹھلا کر اس پر سوار ہو جائیں۔ جنت کی بلند مسہریوں کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ جب جنتی ان پر بیٹھنا چاہیں گے تو وہ اتنی پست ہو جائیں گی کہ جنتی آرام سے ان پر بیٹھ جائے۔ پھر وہ خود بلند ہو جائیں گی۔ اس کے چاروں تھن گویا دودھ کے بھرے ہوئے آبخورے ہیں یا دودھ کے بہتے چشمے ہیں، اس کی اون سے نمدے، قالین اور مخملیں مسندیں اور عمدہ فرش فروش تیار ہوتے ہیں اس کا دودھ پینے، گوشت کھانے اور پیٹھ سوار ہونے کے کام آتی ہے اس کے بالوں سے پہننے، اوڑھنے کے اسباب تیار ہوتے ہیں اس کو لاد کر چلیں تو ایک کشتی معلوم ہوتی ہے جو خود بخود چل رہی ہے پورے گھر کا اسباب اس پر لادا جاسکتا ہے

اس کا دودھ سارے گھر کو اور گوشت سارے محلے کو کافی ہو جاتا ہے، حدیث میں ہے **الابل عز لاھلھا والغنم برکۃ والخیل معقود بنو اصیہ الخیر الی یوم القیمۃ** (اونٹ اونٹ والوں کے لئے عزت کا سبب ہے اور بکریوں میں برکت ہے اور گھوڑوں کی پیشانیوں سے قیامت تک خیر وابستہ ہے) اونٹ کی یہ سب خصوصیات جنت کی نعمتوں کے نمونے پیش کرتی ہیں لیکن یہ عجیب الخلقت جانور ہر وقت قریب رہتا ہے اس لئے اس کی خصوصیات وعجائبات کی طرف التفات نہیں ہوتا۔

اونٹ کے اور چند عجائبات: ...... مذکورہ خصوصیات کے علاوہ اونٹ میں اور بھی بہت سے عجائبات پائے جاتے ہیں جن میں سے چند ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱) اس عظیم الجثہ جانور میں اطاعت کی شان حد درجہ نمایاں ہیں کہ سوسو اونٹوں کی قطاریں ایک چھوٹا سا بچہ جہاں چاہے لیجائے (۲) کمال درجہ کا صبر اس میں پایا جاتا ہے کہ آٹھ دس دن تک پیاسا رہ جاتا ہے مگر محنت ومشقت میں قصور وکوتاہی نہیں کرتا۔ (۳) اس کے عجائبات میں سے یہ بات بھی ہے کہ روبقبلہ چلتا ہے۔ (۴) اس کے بالوں کو جلا کر زخم پر رکھدیں تو جاری خون بند ہو جاتا ہے۔ (۵) اس کا پیشاب اور دودھ مرض استسقاء، تلی اور بواسیر والوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ (۶) عرب کے جنگلوں میں پانی بہت کمیاب ہے قدرت نے اس کے پیٹ میں ایک ریزروٹنکی ایسی لگادی ہے کہ یہ اس میں ہفتہ بھر کا پانی بھر لیتا ہے۔ اور اس سے تدریجی طور پر اپنی ضرورت پوری کرتا رہتا ہے۔ (۷) اتنے اونچے جانور پر سوار ہونے کے لئے سیڑھی لگانی پڑتی ہے، مگر قدرت نے اس کے پاؤں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، یعنی ہر پاؤں میں دو گھٹنے لگا دیئے ہیں کہ ان کو طے کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اس پر چڑھنا اور اترنا آسان ہو جاتا ہے۔ (۸) اونٹ کی کلنی کو اگر عاشق کی آستین پر باندھ دیں تو اس کا عشق زائل ہو جاتا ہے۔ (۹) اونٹ کی غیرت وحیا جانوروں میں سب سے زیادہ مشہور ہے وہ اپنی ماں بہن سے کبھی دانستہ جفتی نہیں کرتا۔ (۱۰) اس میں سچے عاشقوں کی صفت پائی جاتی ہے وہ مستی کے وقت کھانا پینا بھی ترک کر دیتا ہے، نیز جنون کے جوش اور ولولے بھی اس میں نظر آتے ہیں۔ (۱۱) اس کی گردن کی درازی بھی عجائبات میں سے ہے، کسی حکیم کے سامنے بیان کیا گیا کہ ایک جانور ایسا ہے جس کو بٹھلا کر اس پر خوب گراں وزن لاد دیتے ہیں پھر وہ خود کھڑا ہو جاتا ہے اس حکیم نے کہا شاید اس کی گردن لمبی ہوگی اس کے بل پر وہ کھڑا ہو جاتا ہے اس طرح بوجھ لیکر کھڑا ہو جانا بھی اونٹ ہی کی خصوصیت ہے۔ (۱۲) اس کی خوراک بیشتر بلند درختوں کے پتے ہیں، اگر اس کو لمبی گردن نہ ملتی تو وہ ایسی خوراک سے محروم ہوتا۔ (۱۳) اس کے جثہ کے اعتبار سے اس کا آلہ تناسل انتہائی چھوٹا اور پیچھے کی جانب لگا ہوتا ہے۔ (۱۴) عرب کے میدانوں میں گرمی کی وجہ سے دن میں سفر دشوار ہوتا ہے قدرت نے اس جانور کو رات بھر چلنے کا عادی بنا دیا ہے علاوہ ازیں بیسیوں عجائب اس میں پائے جاتے ہیں۔

یہاں ہاتھی کو کیوں ذکر نہیں کیا؟

ہاتھی بھی اگرچہ عظیم الجثہ وعجیب الخلقت جانور ہے لیکن اول تو وہ سرزمین عرب میں پایا نہیں جاتا اور قرآن کے وہی لوگ اول مخاطب ہیں۔ دوسرے اس میں وہ فوائد ومنافع نہیں جو اونٹ میں پائے جاتے ہیں، نہ اس کا گوشت کھایا جاتا ہے، نہ دودھ پیا جاتا ہے نہ اسکے ایسے بال ہیں جن سے لباس اور پوشاک وغیرہ تیار ہوسکیں نہ اس میں اطاعت وصبر ومسکنت اونٹ کی طرح ہے نہ اس کو پالنا اتنا آسان ہے کہ غریب ومفلس اس کو پال لے اور وہ خود اپنا پیٹ بھر لے، علاوہ ازیں جنت ودوزخ کے نمونے بھی اس کی ذات میں یکجا نہیں ہیں۔ فافہم۔

فائدہ.....بعض لوگوں نے کہا کہ ابل سے مراد یہاں ابر ہے، ابل اس ابر کو کہتے ہیں جو پانی سے بھرا ہوا ہوتا ہے، حدیث قدسی میں ہے کہ میرے سوا کوئی ابل (ابر) کی طرح پیدا کر سکتا ہے؟ اور کوئی آسمان جیسی (چھت) بلند کر سکتا ہے؟ اور پہاڑوں کی طرح (کوئی چیز) بپا کر سکتا ہے؟ اور زمین جیسا (فرش) بچھا سکتا ہے؟ (مظہری) لیکن اول قول جمہور کا ہے اور وہی صحیح ہے بلکہ اس حدیث میں بھی ابل سے مراد اونٹ ہی ہے۔ واللہ اعلم

والی السمآء کیف رفعت (اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا) یہ دوسرا نمونہ ہے جس کا دنیا میں بسنے والے سب ہی مشاہدہ کرتے ہیں، آسمانوں کی بلندی اللہ کی قدرت کاملہ پر دلیل بھی ہے اور بہشت بریں کا نمونہ بھی پیش کرتی ہے اس کے روشن ستارے جو جنت کے اکواب کی مثال پیش کرتے ہیں گرنے اور ٹوٹ جانے سے بھی محفوظ ہیں، قدرت خداوندی پر تابناک دلیلیں ہیں، آفتاب کو دیکھئے جو زمین سے لاکھوں حصے زائد بڑا جسم رکھتا ہے، یہ کس نے بنایا اور اس میں نور اور اس کے نور میں گرمی کس نے بھر دی، یہ اس ظلمت کدہ کا روشن چراغ ہے اگر یہ نہ ہو تو بحر و بر کو کونسی شمع روشن کر سکتی ہے اور کس تنور کی گرمی سے پھل و پھول اور غلے پک سکتے ہیں؟ اس کا کیسا انعام عام ہے اگر یہ نہ ہو تو دنیا والوں کی زندگی دوبھر ہو جائے، قدرت حق پر اس سے زیادہ روشن اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ یہی چشمہ آفتاب اہل عقل کو بہشت بریں کی ان نورانی نہروں کا نمونہ پیش کرتا ہے جس میں شراب طہور تیز و تند فوارے کی طرح جوش مارتی ہے، مہتاب اپنی خنک و شیریں روشنی سے عالم کو سیراب کرتا ہے، یہ عالم ناسوت کو رات کے مناسب نور پہنچاتا ہے جو بنی آدم کے آرام میں مخل نہیں ہوتا، بلکہ راحت میں اضافہ کرتا ہے اور اہل دل حضرات کو جنت کی سرد جوئے شیر کا نمونہ دکھلاتا ہے اور اگر آسمان میں دوسرے اعتبار سے غور کیا جائے مثلاً شیاطین کے رجم سے ان کی ذلت و خواری، سورج کی تپش وغیرہ تو اس میں دوزخ کے نمونے بھی موجود ہوں گے۔

والی الجبال کیف نصبت (اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح قائم کئے گئے ہیں) یہاں قدرت خداوندی کا تیسرا نمونہ پہاڑوں کو قرار دیا گیا ہے، پہاڑ زمین کا ایک جزء ہونے کے باوجود اس سے کس طرح ممتاز ہیں، ان کی بلندی، ان کا مضبوط قیام قابل حیرت اور طول و عرض قابل دید ہے، عقلاء اور فلاسفہ نے عقلی گھوڑے خوب دوڑائے تا کہ یہ معلوم کر سکیں کہ پہاڑوں کو یہ امتیازات (رفعت و بلندی، سختی اور گوناگوں رنگینیاں) کیوں حاصل ہیں، لیکن آج تک وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے، جس طرح پہاڑ قدرت خداوندی کے آئینے ہیں اسی طرح یہ جنت و دوزخ کے نمونے بھی پیش کرتے ہیں، پہاڑ بلندی کے باوجود اپنی جگہ پر ایسے مضبوطی سے قائم ہیں کہ بارشوں اور زلزلوں اور آندھیوں سے نہیں گرتے ان کی یہ مضبوطی جنت کے محلات اور اکواب موضوعہ کی مثال پیش کرتے ہیں، پہاڑوں کی بلندی صاف اور عمدہ فضاء کہ وہاں مکدر ہوا، بدبو اور زمین کے موذی جانوروں کی رسائی نہیں ہوتی، گندے بخارات، بیہودہ بکواس، لڑائی، جھگڑے اور اقسام وانواع کی خرافات وہاں نہیں پہونچتیں، جگہ جگہ میٹھے پانی کے چشمے، خوشنما آبشار، ہرے بھرے سبزہ زار، درختوں پر مختلف رنگوں کے میوے، جنت کی بہاروں اور فضاؤں کے مناظر کے نمونے ہیں، صاف ستھرے، اونچے اونچے پتھر سرر مرفوعة کی یاد تازہ کرتے ہیں، اس کے برعکس پہاڑوں پر اترنے چڑھنے کی مشقت، ناموافق آب و ہوا، کوہ آتش فشاں وغیرہ دوزخ کا نقشہ پیش کرتے ہیں، وہاں کے خاردار درخت اور کڑوے کسیلے پیڑ پودے، ضریع و زقوم کے نمونے ہیں۔

والی الارض کیف سطحت (اور زمین پر نظر نہیں کرتے کہ وہ کس طرح بچھائی گئی) یہ قدرت خداوندی کا چوتھا نمونہ ہے اگر غور کیا جائے تو زمین ایسا عجیب و غریب فرش ہے جس کے اندر حق تعالیٰ نے بیشمار دولتیں رکھی ہیں جن سے

ضروریات کائنات پوری ہوتی ہیں یہ زندوں اور مردوں سب کے لئے ایک عظیم نعمت ہے باوجود کروی الشکل ہونے کے اس قادر مطلق نے اس میں ایسی وسعتیں رکھی ہیں کہ یہ عالم انسان کے لئے جنت نشان، راحت کدہ بنا ہوا ہے، جس قادر مطلق نے ایسی نعمتوں بھری زمین پیدا کی، کیا وہ اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی جنت نہیں بنا سکتا جسمیں وہ عظیم الشان انعامات موجود ہوں جن کا ذکر اس سورت میں فرمایا گیا ہے؟ اگر اہل دولت واصحاب ثروت کی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے تو یہی زمین جنت کا نمونہ ہے اور اگر محتاجوں، مفلسوں اور بدنصیبوں کی حیات پُر آفات کو دیکھا جائے تو یہی زمین دوزخ کی مثال ہے، حاصل یہ ہے کہ اہل عقل کو ان مذکورہ چاروں چیزوں میں ایک طرف تو اس قادر وقیوم کی قدرت کے جلوے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کو جنت وجہنم کے نمونوں کا بھی ان میں مشاہدہ ہوتا ہے۔فتبارک اللہ احسن الخالقین .

حکمت انتخاب

اس کلام اعجاز نظام کے مخاطبین اولین اہل عرب ہیں جن کے نزدیک عمدہ مال اونٹ تھا، ان کی گذر بسر اسی پر تھی اسی کا گوشت کھاتے اسی کا دودھ پیتے اسی پر سوار ہوتے، اسی کی کھال کے خیمے بنا کر ان میں رہتے اور اسی کے بالوں کا لباس پہنتے تھے۔اسلئے اہل تجربہ کا قول ہے کہ اہل عرب کی زندگی اونٹ پر موقوف ہے، اہل ایران کی خچر پر، اہل توران کی گھوڑے پر، اور اہل ہند کی بیل پر۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ جانور پالتے ہیں وہ جنگلوں میں بیشتر زندگی گزارتے ہیں، اور جانوروں کے لئے چارے اور پانی کے محتاج ہوتے ہیں اس لئے ان کی نظر آسمان پر ہوتی ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ کونسی ہوا چل رہی ہے اور بارش کب ہوگی اور پہاڑوں میں پناہ لیتے ہیں خصوصاً سبزہ کی نایابی اور قحط کے زمانہ میں وہ لوگ پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں، پھر اس قسم کے لوگ بلکہ تمام بنی آدم خواہ وہ بادشاہ ہوں یا فقیر اپنی غذاؤں، دواؤں، لذتوں اور ہر قسم کی ضرورتوں میں زمین کے محتاج ہوتے ہیں لہذا یہ چاروں چیزیں ہمیشہ ان کے دل ودماغ پر چھائی رہتی ہیں، اور قرآن مقدس محسوسات ومشاہدات میں فکر کی دعوت دیتا ہے تاکہ غیر محسوس وغیر مشاہد چیزوں کی طرف سہولت کے ساتھ عقلوں کی رسائی ہو سکے، اسلئے یہاں مذکورہ غیر مشاہد احوال جنت وجہنم کو ان چاروں چیزوں کی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔

فائدہ......۱: قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت وحکمت کی معرفت کے لئے عام انعامات کو ذکر فرمایا ہے ان نعمتوں کو جو خاص طور پر کسی کو عطا ہوئی ہیں ذکر نہیں فرمایا اور ان میں فکر وتدبر کی دعوت نہیں دی، زمین وآسمان، چاند سورج وغیرہ میں غور وفکر کرنے پر متوجہ کیا ہے، کسی کے حسن وجمال، کسی کے مال، کارخانہ، سروسامان میں غور وفکر کرنے کا حکم نہیں دیا کیونکہ ان خصوصی انعامات کی طرف متوجہ کرنے سے غور وفکر کرنے والوں میں حرص وطمع اور حسد وعداوت پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

فائدہ......۲: بعض علماء نے لفظ سطحت سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ زمین مسطح ہے، کروی (گول) نہیں لیکن یہ استدلال ضعیف ہے، اسلئے کہ یہ ممکن ہے کہ زمین واقعہ میں کروی ہو، لیکن اس کی عظمت ووسعت کی بنا پر زمین پر بسنے والوں کو مسطح معلوم ہوتی ہو، اور باشندوں کے مشاہدہ کے اعتبار سے سطحت کا لفظ استعمال ہوا ہو۔

فذکر انما انت مذکر (پس آپ سمجھاتے رہیں آپ کا کام سمجھانے ہی کا ہے) یعنی جب ترغیب وترہیب کی آیات مع دلائل آچکیں، اور اچھے برے کاموں کا انجام بھی معلوم ہو چکا، تو اے ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے فرض منصبی پر قائم رہیے، اور ان لوگوں کو دلائل کی روشنی میں وعظ ونصیحت فرماتے رہیے اگر وہ قبول نہ کریں تو اس میں

آپ کا کچھ حرج نہیں آپ کی ڈیوٹی تو سمجھانا ہے کیونکہ آپ کو مذکر بنا کر ہی بھیجا گیا ہے، ہدایت کرنا نہ کرنا ہمارے اختیار میں ہے۔

لست علیهم بمصیطر (آپ کو ان پر مسلط نہیں کیا ہے) اور آپ ان کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہیں، کہ آپ زبردستی ان کو ایمان پر لائیں، یہ کام تو مقلب القلوب کا ہے۔

فائدہ...... بعض مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت اور اس قسم کی دوسری آیات اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهم جیسی آیات جہاد سے منسوخ ہیں، لیکن یہ رائے صحیح نہیں اس لئے کہ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی کا حکم ان آیات جہاد کے بعد نازل ہوا ہے اور بالاتفاق غیر منسوخ ہے ہاں وقتِ قتال و جہاد اُقْتُلُوْا کا حکم ہے۔

الا من تولیٰ و کفر (لیکن جو منہ پھیر لے اور منکر ہو جائے) بعض مفسرین نے اس کو ذکّر کے مفعول عام محذوف سے استثنائے متصل مانا ہے ای فذکر کل واحد منهم الا من تولیٰ و کفر یعنی آپ سب کو نصیحت کیجئے، مگر اس کو نصیحت کرنا آپ کے ذمہ ضروری نہیں جو منہ موڑ لے اور ہٹ دھرمی سے کفر پر ڈٹا رہے یعنی جس سے قبول نصیحت کی امید نہیں اس کو اگر آپ نصیحت نہ کریں تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ فذکر ان نفعت الذکریٰ میں مفصل ذکر ہو چکا ہے، بعض مفسرین نے اسکو علیهم کی ضمیر سے استثنائے منقطع مانا ہے اور الا لکن کے معنی میں ہے، یعنی آپ ان پر مسلط نہیں ہیں، لیکن جو منہ موڑے اور انکار کریگا اللہ تعالیٰ اس پر قابو رکھتا ہے وہ اس کو بڑی سزا دیگا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ و قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو الا کلمۂ تنبیہ قرار دیا ہے تب بھی یہی معنی ہوں گے۔

فیعذبه الله العذاب الاکبر (اللہ تعالیٰ اس کو بڑی سزا دیگا) عذاب اکبر کا مصداق عذاب دوزخ ہے۔ انّ الینا ایابهم ...... (بیشک ان کو ہمارے پاس واپس آنا ہے پھر ان سے حساب لینا ہمارا ہی کام ہے)

ان دونوں آیتوں میں لست علیهم الخ کی وضاحت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید تسلی دینا مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام بس پیغام پہونچا دینا ہے، منوانا آپ کے فرض منصبی اور اختیار میں نہیں ہے، پھر ماننے اور نہ ماننے والوں (سب ہی کو) ہمارے پاس آنا ہے اور ہم سب کا حساب لیکر استحقاق کے موافق ہر ایک کو جزاء و سزا دیں گے حق سے منہ پھیر لینا اور ہدایت و ایمان سے روگردانی کر کے کفر و بغاوت اختیار کر لینا سب سے بڑا جرم ہے ایسے مجرموں کو سزا بھی سب سے بڑی اور بیحد کڑی دی جائیگی۔

فائدہ...... انّ الینا ایابهم میں احوالِ برزخ کی طرف اشارہ ہے اور ثم انّ علینا حسابهم میں احوال قیامت کی طرف اشارہ ہے اس لئے پہلی آیت کو لفظ ثم سے شروع نہیں کیا گیا، اور دوسری آیت کو لفظ ثم سے شروع کیا گیا جو تراخی و مہلت دراز پر دلالت کرتا ہے اور قیامت بھی مدت دراز کے بعد آئیگی۔ واللہ اعلم

تم تفسیر سورۃ الغاشیة فالحمد للہ حمدا یوصلنا الیٰ جنة عالیة و الصلوٰة و السلام علیٰ نبیه و اٰله و اصحابه و اتباعه الیٰ یوم الواقعة

سورة الفجر

سورة الفجر مكية وهي ثلثون آية

(رکوع:۱، آیات:۳۰)　سورۃ فجر مکہ میں نازل ہوئی اس میں تیس آیات ہیں　(کلمات:۱۳۹: حروف ۵۹۷)

ربط ومناسبت:

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے، جمہور کا اس پر اتفاق ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن عباس اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے، سورت سابقہ کی طرح اس سورت میں بھی قیامت اور جزاء وسزا کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے مگر مضامین کا تکرار ہر سورت میں ایک نئے دلکش اور پر اثر انداز سے ہوتا ہے جو انسان کو قعر شقاوت سے نکال کر رفعت سعادت پر پہنچانے کے لئے کافی ہوتا ہے، اور یہی بعثت انبیاء علیہم السلام کا مقصود اصلی ہے، اس لئے اس سورت کی ابتدا چند ایسی قسموں سے ہوئی ہے کہ ان میں غور وفکر مقصود کو واضح اور شبہات کو زائل کر دیتا ہے دونوں سورتوں کے مضامین کی مناسبت ادنی تامل سے واضح ہو جاتی ہے، مثلاً سابقہ سورت میں نیکیوں کے لئے لسعیھا راضیة تھا اس سورت میں راضیة مرضیة ہے، وہاں فیعذبه الله العذاب الأكبر تھا، یہاں لایعذب عذابه أحد ہے وغیرہ۔ اس سورت کا نام سورة الفجر ہے اور وجہ تسمیہ ظاہر ہے کہ اس کی ابتدا و الفجر سے ہے۔

شان نزول

اس سورت کے نزول کا سبب کفار ومشرکین کے شبہات ہیں جن کو اس سورت میں زائل کیا گیا ہے مثلاً (۱) بندوں کے گناہوں سے اللہ کا کوئی نقصان نہیں، اور نیکیوں سے کوئی فائدہ نہیں، لہٰذا حساب وکتاب اور اس کے لئے حشر ونشر وغیرہ بے سود ہیں (۲) اگر وہ نیکیوں سے خوش اور گناہوں سے ناخوش ہوتا تو نیکیوں پر نوازش ہوتی اور بروں کو سزا مل جاتی، تاخیر بے فائدہ ہے، معلوم ہوا کہ جزا وسزا کا تصور عبث ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ شبہات خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ خالق ومالک اور منعم ہیں، ظاہر ہے کہ مالک ومنعم اپنے انعامات اور عطاؤں کا حساب لینے کا حق رکھتا ہے خواہ اس کا اس میں کوئی نفع ونقصان نہ ہو، (۲) دنیا دار الجزاء نہیں، یہاں بندوں کو حسب حکمت ومصلحت دیا جاتا ہے لیکن کسی کو دینے میں قہر کی نظر ہوتی ہے اور کسی کو دینے میں مہر کی نگاہ، جیسے طوطے کے پنجرہ میں ٹکڑا لگاتے ہیں تو مہر ومحبت سے، اور چوہے دان میں قہر وغضب سے، بلکہ بسا اوقات چوہے دان میں ٹکڑا گھی چپڑ کر لگاتے ہیں تاکہ اس کو جلد پکڑ لیا جائے (۳) عالم دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء، عمل کا مقام دنیا میں بھی اور ہوتا ہے اور پھل کا دوسرا، جرم گھر اور بازار میں ہوتا ہے اصل سزا جیل خانہ میں ملتی ہے۔ ڈیوٹی کسی اور جگہ ہوتی ہے اور تنخواہ دفتر سے ملتی ہے۔ دنیا اور آخرت کے درمیان ایک اور عالم ہے جس کو عالم برزخ کہتے ہیں، وہ دونوں کے درمیان ایک عالم ہے۔ بعض احکام کے اعتبار سے وہ بھی دار العمل (دنیا) کا حکم رکھتا ہے، کیونکہ اعزاء واقرباء کا بھیجا ہوا ثواب اس کو وہاں ملتا ہے، اور یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ عمل ختم ہونے کے بعد ہی اس کا بدلہ ملتا ہے اس لئے دنیا اور برزخ کے بعد دار الجزاء (آخرت) کو بدلہ کے لئے معین ومقرر فرمایا گیا۔ فَتَأَمَّلْ وَتَفَكَّرْ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

وَالفَجرِ (۱) وَلَيَالٍ عَشرٍ (۲) وَالشَّفعِ وَالوَترِ (۳) وَاللَّيلِ اِذَا يَسرِ (۴) هَل فِى ذٰلِكَ قَسَمٌ

قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت وطاق کی ۔ اور رات کی جب وہ ڈھلے۔ بیشک ان چیزوں کی قسم

وَ	الفَجرِ	وَ	لَيَالٍ	عَشرٍ	وَ	الشَّفعِ	وَ	الوَترِ	وَ	اللَّيلِ	اِذَا	يَسرِ	هَل	فِى	ذٰلِكَ	قَسَمٌ
قسم	فجر	اور	راتوں	دس	اور	جفت	اور	طاق	اور	رات	جب	چلنے لگے	کیا	میں	اس	قسم

لِذِى حِجرٍ (۵) اَلَم تَرَ كَيفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (۶) اِرَمَ ذَاتِ العِمَادِ (۷) الَّتِى لَم يُخلَق مِثلُهَا

عقلمند کے لئے کافی قسم ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم عاد یعنی اس قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قد ستونوں جیسے تھے۔ جنکے مثل

لِذِى	حِجرٍ	اَلَم	تَرَ	كَيفَ	فَعَلَ	رَبُّكَ	بِعَادٍ	اِرَمَ	ذَاتِ	العِمَادِ	الَّتِى	لَم	يُخلَقُ	مِثلُهَا
واسطے صاحب	عقل	کیا نہ	تونے دیکھا	کیونکر	کیا	پروردگار تیرے	ساتھ عاد	ارم	والے	ستونوں	وہ جو	نہیں	پیدا کیا	کیا مانند،ان

فِى البِلَادِ (۸) وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخرَ بِالوَادِ (۹) وَفِرعَونَ ذِى الاَوتَادِ (۱۰) الَّذِينَ

دنیا بھر میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا۔ اور اس قوم ثمود کے ساتھ جو وادی قریٰ میں پتھر تراشتے تھے۔ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ کیا کیا؟ ان سب نے

فِى	البِلَادِ	وَ	ثَمُودَ	الَّذِينَ	جَابُوا	الصَّخرَ	بِالوَادِ	وَ	فِرعَونَ	ذِى	الاَوتَادِ	الَّذِينَ
میں	شہروں	اور	ثمود	جنہوں	تراشا تھا	پتھروں	بیچ وادی	اور	ساتھ فرعون	والا	میخوں	جنہوں

طَغَوا فِى البِلَادِ (۱۱) فَاَكثَرُوا فِيهَا الفَسَادَ (۱۲) فَصَبَّ عَلَيهِم رَبُّكَ سَوطَ عَذَابٍ (۱۳)

دنیا میں سرکشی کر کے بہت فساد مچا رکھا تھا ، پھر آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔

طَغَوا	فِى	البِلَادِ	فَاَكثَرُوا	فِيهَا	الفَسَاد	فَصَبَّ	عَلَيهِم	رَبُّكَ	سَوطَ	عَذَاب
سرکشی کی	میں	شہروں	پس بہت کیا	میں ان	فساد	پس ڈالا	اوپر انکے	رب تیرے	کوڑا	عذاب

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالمِرصَادِ (۱۴) فَاَمَّا الاِنسَانُ اِذَا مَا ابتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُولُ

بیشک آپ کا رب گھات میں ہے۔ لیکن انسان کا یہ حال ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزماتا ہے یعنی اس کو عزت وانعام دیتا ہے، تو وہ کہتا ہے

اِنَّ	رَبَّكَ	لَبِالمِرصَادِ	فَاَمَّا	الاِنسَانُ	اِذَا	مَا ابتَلٰهُ	رَبُّهٗ	فَاَكرَمَهٗ	وَ	نَعَّمَهٗ	فَيَقُولُ
تحقیق	رب تیرا	البتہ بیچ گھات	پس ایپر	انسان	جب	آزماتا ہے اسکو	رب اسکا	پس عزت دیتا ہے اس	اور	نعمت دیتا ہے اس	پس کہتا ہے

رَبِّى اَكرَمَنِ (۱۵) وَاَمَّا اِذَا مَا ابتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيهِ رِزقَهٗ فَيَقُولُ رَبِّى اَهَانَنِ (۱۶)

کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی اور جب اس کو یوں آزماتا ہے کہ اسکی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا ہے۔

رَبِّى	اَكرَمَنِ	وَ	اَمَّا	اِذَا	مَا ابتَلٰهُ	فَقَدَرَ	عَلَيهِ	رِزقَهٗ	فَيَقُولُ	رَبِّى	اَهَانَنِ
رب میرے	بزرگ کیا مجھ	اور	ایپر	جب	آزماتا ہے اس	پس تنگ کرتا ہے	اوپر اس	رزق اس	پس کہتا ہے	رب میرے	ذلیل کیا مجھ

كَلَّا بَل لَّا تُكرِمُونَ اليَتِيمَ (۱۷)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم یتیم کی قدر نہیں کرتے

كَلَّا	بَل	لَّا	تُكرِمُونَ	اليَتِيمَ
ہرگز یوں نہیں	بلکہ	نہیں	تم حرمت کرتے	یتیم

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ(۱۸) وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا(۱۹) وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ

اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔ اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر چٹ کر جاتے ہو۔ اور تم لوگ مال سے بہت

وَ	لَا	تَحٰٓضُّوْنَ	عَلٰى	طَعَامِ	الْمِسْكِيْنِ	وَ	تَاْكُلُوْنَ	التُّرَاثَ	اَكْلًا	لَّمًّا	وَ	تُحِبُّوْنَ	الْمَالَ
اور	نہیں	رغبت کرتے تم	اوپر	کھلانے	فقیر	اور	کھاتے ہوتم	میراث	کھانا	پے درپے	اور	دوست رکھتے ہو	مال

حُبًّا جَمًّا(۲۰) كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا(۲۱) وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا(۲۲)

محبت رکھتے ہو۔ ہرگز نہیں جب زمین کو چکنا چور کر دیا جائیگا اورآپ کا رب اورجوق جوق فرشتے آجائیں گے

حُبًّا	جَمًّا	كَلَّا	اِذَا	دُكَّتِ	الْاَرْضُ	دَكًّا	دَكًّا	وَ	جَآءَ	رَبُّكَ	وَ	الْمَلَكُ	صَفًّا صَفًّا
دوست رکھنا	بہت	ہرگزنہیں	جسوقت	توڑی جائیگی	زمین	ریزہ	ریزہ	اور	آئیگا	رب تیرا	اور	فرشتے	صف باندھ کر

وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى(۲۳) يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ

اوراس دن دوزخ کولایا جائیگا۔ اس دن انسان کی سمجھ میں آجائیگا اوراس وقت سمجھنا بے سود ہوگا۔ وہ کہے گا اے کاش! میں اپنی زندگی کے لئے

وَجِايْٓءَ	يَوْمَئِذٍ	بِجَهَنَّمَ	يَوْمَئِذٍ	يَّتَذَكَّرُ	الْاِنْسَانُ	وَاَنّٰى	لَهُ	الذِّكْرٰى	يَقُوْلُ	يٰلَيْتَنِيْ	قَدَّمْتُ
اورلائی جائیگی	اس دن	دوزخ	اس دن	نصیحت پکڑیگا	انسان	اورکہاں	اسکے لئے	نصیحت پکڑنا	کہے گا	اے کاش کہ میں	پہلے بھیج لیتا

لِحَيَاتِيْ(۲۴) فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ(۲۵) وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ(۲۶) يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ

کچھ آگے بھیج دیتا۔ پھراس دن اس جیسی سزا دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور نہ اس جیسا جکڑنے والا کوئی اور ہوگا۔ اے اطمینان والی روح

لِحَيَاتِيْ	فَيَوْمَئِذٍ	لَا يُعَذِّبُ	عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ	وَلَا يُوْثِقُ	وَثَاقَهٗ	اَحَدٌ	يٰٓاَيَّتُهَا	النَّفْسُ
اپنی زندگی کیلیۓ	پس اس دن	نہ عذاب دیگا	کوئی	اور نہ باندھکر رکھے	اسکا باندھنا	کوئی	اے	جان (روح)

الْمُطْمَئِنَّةُ(۲۷) ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً(۲۸) فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ(۲۹) وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ(۳۰)

تو اپنے پروردگار کے پاس ایسی حالت میں چل کہ تو اس سے خوش ہے اوروہ تجھ سے خوش ہے۔ پھر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں چلی جا

الْمُطْمَئِنَّةُ	ارْجِعِيْ	اِلٰى	رَبِّكِ	رَاضِيَةً	مَّرْضِيَّةً	فَادْخُلِيْ	فِيْ	عِبٰدِيْ	وَادْخُلِيْ	جَنَّتِيْ
اطمینان والی	لوٹ چل	طرف	اپنے رب	خوش	پسند کی گئی	پس داخل ہو	میں	میرے بندے	اورداخل ہو	میری جنت

لغات:

وَالْفَجْرِ مصدر (ن) پو پھٹنا، صبح کی روشنی نمودار ہونا، پھاڑ کر بہانا، وقت فجر، نماز فجر وغیرہ۔ قرآن میں وقت فجر، نماز فجر اور طلوع سحر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لَيَالٍ دراصل لَيَالِيَ تھا لَيْلٌ کی جمع: رات۔ عشر دس، یہ بغیر ہاء مونث کا عدد ہے جو پہلی دہائی کے لئے مستعمل ہے اور جب اَحَدٌ سے تِسْعَةٌ تک کسی لفظ سے ملاکر استعمال کرتے ہیں تو عشر کے شین کو فتح دیتے ہیں عشر عشراً وعشوراً (ن) دسواں حصہ لینا، دسواں ہونا ۔ الشفع جفت (جوڑا) جو طاق (الوتر) کی ضد ہے، شفع شفعا (ف) جوڑا کرنا، دہرا کرنا، جفت کرنا، شفاعة (ف) سفارش کرنا، شفع جفت عدد جو برابر تقسیم ہو سکے۔ الوتر شفع کی ضد (ض) گھبرا دینا، ستانا، تکلیف دینا، گھٹا دینا، جفت کو طاق کرنا وغیرہ يَسْرِ (ض) رات میں چلنا، زائل ہونا، ڈھلنا حجر عقل، ممنوع، اصل میں جس مکان کا پتھروں سے احاطہ کر دیا جائے اس کو حجرٌ کہتے ہیں قوم ثمود کی بستیوں کو اسی لیے حجر کہا گیا ﴿كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ حَجَرَ حَجْراً وحُجْرَاناً

بتثلیث الحاء فیھما (ن) منع کرنا، روکنا، محروم کرنا۔ العماد ستون (ج) عَمَدٌ، قاموس میں ہے کہ بلند عمارتوں کو عماد کہتے ہیں، اور العماد العمادۃ کی جمع ہے بعض نے ذات العماد کے معنی بلند قامت بیان کئے ہیں، بعض نے ستونوں والی عمارت اور بعض نے بلند عمارتوں والے ترجمہ کیا ہے۔ البلاد البلد کی جمع شہر (ن) اقامت کرنا، شہر بنانا (س) کشادہ ابرو ہونا (ک) سست وکند ذہن ہونا۔ جابوا صیغہ جمع مذکر غائب ماضی جوْباً (ن) قطع کرنا، تراشنا، الصخر صَخْرَۃٌ کی جمع سخت پتھر۔ الواد دو پہاڑوں کے درمیان کا میدان۔ الاَوْدِیَۃُ اس کی جمع ہے۔ الْوَادِ اصل میں الْوَادِیْ تھا یہاں وادی القریٰ سے مراد وہ موضع ہے جو مدینہ کے قریب بجانب شام ہے، یا وہ پہاڑی وادی مراد ہے جہاں پتھروں کو تراش کر مکان نما غار بنا کر قوم ثمود رہتی تھی۔ ذی الاوتاد، اوتاد جمع وتد بفتح التاء و کسرھا وعند اھل النجد بسکونھا کھونٹی، میخ، یہاں اوتاد سے مراد جنود (لشکر) ہیں لانّ الملک یشدُّ بھا، فرعون کو ذوالاوتاد کہنے کی مختلف وجوہ تفسیر میں آرہی ہیں۔ الفساد مصدر (ن، ض، ک) خراب ہونا، بگڑ جانا، افعال سے متعدی۔ صبّ (ن) انڈیلنا، مصیبت ڈالنا، بہانا (ض) گرنا۔ سوط کوڑا، چابک، جمع اسواط، سیاط، ساط سوطا (ن) کوڑے مارنا۔ اکرم افعال سے تعظیم کرنا (ن) کرم میں غالب ہونا (ک) عزیز و نفیس ہونا، بخشش کرنا، فیاض ہونا۔ اکرمن صیغہ واحد مذکر غائب نون وقایہ ی متکلم محذوف اکرمنی تھا اسی طرح اھانن اھاننی تھا اھانۃ ذلیل کرنا حذفت الیاء منھما اتباعا لرسم المصحف وبقیت الکسرۃ دلیلا علیھا۔ ولا تحٰضون محاضۃ (مفاعلۃ) مضارع کا صیغہ جمع مذکر حاضر، یعنی تم ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے، مجرد میں نصر سے گذر چکا۔ التراث میراث، مردے کا مال، اصل میں وراثۃ تھا واؤ کو تاء سے بدل دیا گیا، وَرِثَ، وِرْثاً، وَارْثاً، وَارْثَۃً، وَرِثَۃً، وَتُرَاثاً (ح) وارث ہونا۔ لمّا مصدر (ن) اپنا اور دوسروں کا حصہ کھالینا، سمیٹ لینا جمّا مصدر (ن) ہر شئی کی کثرت اور زیادتی میں مستعمل ہے یہاں معنی ہیں بہت، جی بھر کر۔ دکت دکا (ن) ریزہ ریزہ کرنا، ڈھا کر برابر کرنا، کوٹ کر ہموار کرنا، صفا مصدر (ن) قطار باندھنا، صف قطار کے معنی میں بطور اسم مستعمل ہے ج: صفوف یہاں بمعنی قطار ہے، یوثق باب افعال سے باندھنا جکڑنا، وثاق اسم بندھن وثق، وثقا، وثقۃ ووثوقا (ض ک) بھروسہ کرنا وثاقۃ (ک) قوی ومضبوط ہونا، مضبوط کرنا، استوار کرنا۔

ترکیب:

وَالْفَجْرِ مثل والسمآء جملہ قسمیہ اور ولیال کا اس پر عطف ہے (منصرف بعد حذف الیاء لعدم بقائھا علی صیغۃ منتھی الجموع والتنوین للصرف وقیل غیر منصرف لان المحذوف کالمذکور فالتنوین فیھا عوض عن الیاء المحذوفۃ او عن حرکتھا فافھم) عَشْرٍ لَیَالٍ کی صفت ہے والشفع والوتر دونوں کا عطف وَالْفَجْرِ پر ہے واللیل اذا یسر مثل واللیل اذا عسعس یہ بھی حسب سابق والفجر پر معطوف ہے ھل استفہامیہ فی ذلک جار مجرور متعلق خبر محذوف مقدم کا (ای ھل یحق عند ذی حجر ان یقسم بھذہ الاشیاء او ھل دلالۃ فی الاقسام المذکور لذی حجر علیٰ ما قلناہ) قسم مبتدأ مؤخر لذی حجر متعلق محذوف اقسام یامسکت کے ہوکر نعت قسم کی (ای اقسام لذی حجر ومقبول عندہ) برائے استفہام تقریری لم تر فعل کیف مصدر محذوف فعلا کی صفت ہوکر مفعول مقدم ای فعل فعلا حاصلا علیٰ ای صفۃ یا حال ہے ربک سے جو فاعل فعل ہے، دونوں صورتوں میں تقدیم کی علت صدارت استفہامیت ہے اس لئے یہ تر کا

مفعول نہ بنایا جائیگا کیونکہ صدارت کلام فوت ہو جائیگی ارم عطف بیان ہے عاد کا، ذات العماد مرکب اضافی ارم کی صفت اول التی اسم موصول اپنے صلہ جملہ لم یخلق مثلھا فی البلاد سے مل کر صفت ثانی وثمود اپنی صفت سے مل کر صفت الذین الخ سے مل کر عاد پر معطوف، اسی طرح فرعون اپنی صفت سے مل کر دوسرا معطوف، معطوفات مل کر موصوف الذین اسم موصول طغوا فی البلاد جملہ فعلیہ معطوف علیہ فاکثروا فیھا الفساد جملہ فعلیہ معطوف، جملہ فصب الخ بھی اسی طرح معطوف ماسبق جملہ معطوفات صفت مرکب توصیفی مجرور باء متعلق فعل کا ہوا، جملہ فعلیہ لم تر کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہو کر جملہ فعلیہ ہوگیا۔ ان ربک لبا لمرصاد .ان الابرار لفی نعیم کی طرح ہے اور جملہ ماقبل کی علت ہے اور مذکورہ قسموں کا جواب محذوف ہے ای لیعذبن الکافر یا یہی جملہ آخیرہ ان ربک الخ جواب قرار دیا جائے، فا تفریعیہ اما تفصیلیہ الانسان مبتداء اذا ظرفیہ متضمن لمعنی الشرط ما زائدہ ابتلی فعل اپنے فاعل ربہ اور مفعول بہ ہ سے مل کر جملہ فعلیہ اذا کا مضاف الیہ جو آنے والے یقول کا ظرف ہے اور شرطیہ ہونے کے اعتبار سے وہی اس کی جزا ہے۔ فاکرمه ونعمه اس میں فاء تفسیر یہ ہے دونوں جملے ابتلیٰ کی تفسیر اور اس پر معطوف ہیں، ف جزائیہ یقول فعل ضمیر الانسان کی طرف عائد فاعل ربی مرکب اضافی مبتدا اکرمن جملہ فعلیہ خبر، مبتدا خبر جملہ اسمیہ یقول کا مقولہ مفعول بہ اور یہ جملہ جزا، شرط و جزا مل کر مبتدا الانسان کی خبر، جملہ اسمیہ ہوا، واما اذا ما الخ مثلہ کلا حرف ردع بل للانتقال من بیان سوء اقواله الی سوء افعاله لاتکرمون الخ جملہ فعلیہ ولا تحضون الخ جملہ فعلیہ معطوف اول وتاکلون الخ جملہ فعلیہ معطوف ثانی اکلا لما مفعول مطلق ہے وتحبون الخ مثلہ معطوف ثالث کلا ردع لهم عن تلك الافعال السيئة ، دکت الارض الخ فعل مجہول نائب فاعل و مفعول مطلق سے مل کر جملہ فعلیہ معطوف علیہ، دکا ثانی اول کی تاکید ہے وجآء ربک الخ جملہ فعلیہ معطوف اول والملک کا عطف ربک پر ہے وجآیٔ فعل مجہول اپنے ظرف یومئذ اور بجھنم فعل مالم یسم فاعلہ سے مل کر جملہ معطوف ثانی اور بجھنم میں باء تعدیہ کے لئے ہے یتذکر فعل الانسان فاعل اور ظرف مقدم یومئذ سے مل کر جملہ فعلیہ، اذا دکت کی جزا، وانی استفہامیہ خبر مقدم الذکری اپنے متعلق مقدم لہ سے مل کر مبتدا، جملہ اسمیہ معترضہ ہوا (جیٔ به لاستبعاد الذکر منه) یقول فعل اپنے فاعل ضمیر غائب راجع الی الانسان اور مقولہ مفعول بہ (جو اگلا جملہ ہے) سے مل کر جملہ مستانفہ ہوا (کانه قیل ماذا یقول عند تذکره) یہ بھی احتمال ہے کہ جملہ یتذکر سے بدل اشتمال ہو، یا تنبیہ کے لیے، لیت حرف تمنی مشبہ بہ فعل ن وقایہ ی اسم لیت قدمت فعل بافاعل لحیاتی متعلق جملہ فعلیہ خبر لیت قدمت کا مفعول بہ محذوف ہے (ای قدمت فی حیاتی الدنیویة اعمالا صالحة او قدمت لاجل حیاتی هذه الاخرویة أعمالا صالحة أنتفع بها الیوم) لا یعذب اپنے فاعل احد مفعول مطلق عذابه اور ظرف مقدم یومئذ سے مل کر جملہ فعلیہ معطوف علیہ ولا یوثق الخ مثلہ معطوف ، یا حرف نداء قائم مقام ادعوا کے، ایة منادیٰ مفرد معرفہ، ھا تنبیہ کے لئے مضاف الیہ کے عوض النفس موصوف المطمئنة صفت، مرکب توصیفی، صفت منادیٰ، جملہ فعلیہ ندا ارجعی اپنے ضمیر مخاطبہ اور متعلق إلی ربك سے مل کر جملہ فعلیہ معطوف علیہ راضية مرضية یہ دونوں ارجعی کی ضمیر سے حال مترادفہ یا حال متداخلہ ہیں، فادخلی فعل بافاعل فی عبٰدی متعلق، جملہ فعلیہ معطوف علیہ وادخلی جنتی فعل فاعل مفعول بہ، جملہ فعلیہ معطوفین مل کر جملہ ارجعی الخ پر عطف، پھر معطوفین مل کر جواب نداء۔

تفسیر:

اس سورت میں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر اس مضمون کی تاکید کی گئی جو آگے ان ربک لبالمرصاد میں بیان ہوا ہے یعنی اس دنیا میں تم جو کچھ کر رہے ہو اس پر جزاء وسزا ہونا لازمی ویقینی ہے، تمہارا رب تمہارے سب اعمال کی نگرانی کر رہا ہے خواہ اسی آیت مذکورہ اِن ربک کو جواب قسم قرار دیا جائے یا جواب قسم محذوف مانا جائے جیسا کہ ترکیب میں معلوم ہوا۔

پہلی قسم...... **والفجر** (قسم ہے فجر کی) فجر سے کیا مراد ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں (۱) روزانہ کی صبح مراد ہے، حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے یہی منقول ہے (۲) ماہ محرم کے پہلے دن کی صبح مراد ہے، اسی سے نیا سال شروع ہوتا ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وقتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے (۳) اس سے مراد سویں ذی الحجہ (یوم النحر) کی صبح ہے، مجاہد وعکرمہ کا بھی یہی قول ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک قول ایسے ہی منقول ہے۔

وجہ تخصیص یوم النحر کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن کے ساتھ ایک رات لگائی ہے جو اسلامی اصول کے مطابق دن سے پہلے آتی ہے صرف **یوم النحر** ایسا دن ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رات نہیں کیونکہ **یوم النحر** سے پہلے جو رات ہے وہ **یوم النحر** کی نہیں بلکہ شرعاً وہ عرفہ ہی کی رات قرار دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حج کرنیوالا عرفہ کے دن میدان عرفات میں نہ پہنچ سکا تو وہ رات کو صبح صادق سے پہلے پہلے کسی وقت بھی عرفات پہنچ جائے تو اس کا وقوف معتبر اور حج صحیح ہو جائیگا، اس سے معلوم یہ ہوا کہ عرفہ کے دن شرعاً دو راتیں ہیں ایک اس سے پہلے دوسری اس کے بعد اور **یوم النحر** کی کوئی رات نہیں، اس لحاظ سے **یوم النحر** کی صبح دنیا کے تمام ایام میں ایک خالص نرالی شان رکھتی ہے۔

(۴) ماہ ذی الحجہ کی پہلی صبح مراد ہے کیونکہ اس سے ذی الحجہ کی دس راتیں (لیال عشر) متصل ہیں (۵) عطیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز فجر مراد ہے، لیکن قول اول مشہور ومختار جمہور ہے۔

اس قسم کی حکمت...... جمہور مفسرین کے نزدیک **والفجر** سے روزانہ کی صبح مراد ہے، صبح میں قیامت بپا ہونے کا پورا نمونہ موجود ہے، رات میں ایک سناٹا ہوتا ہے، انسان اور تمام حیوانات نیند کی آغوش میں بے خبر پڑے ہوتے ہیں، النوم أخو الموت ، رات کا منظر قبرستان اور اس کے مردوں کے مشابہ ہے، صبح ہوتے ہی سب انسان وحیوانات چرند پرند بیدار ہو جاتے ہیں اور دنیا کی چہل پہل حشر کا منظر پیش کرتی ہے پھر جس کا دن کسی مصیبت میں گذرتا ہے وہ دوزخ کا نمونہ ہے اور عیش وآرام والوں کا دن جنت کا نمونہ ہے علاوہ ازیں قیامت کی طرح وقت صبح بھی متعین ہے ہر حیوان وانسان اسی وقت معین پر اٹھ کر اپنے کاروبار اور مقاصد کی طرف چلتا ہے۔ اور اگر خاص دن کی صبح مراد ہے تب بھی یہی مناظر وہاں موجود ہیں مثلاً محرم کی پہلی صبح پورے سال کے دنوں کا دیباچہ وپیش خیمہ ہے تو پورے سال کے ایام کا منظر اس سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور **یوم النحر** کی فجر مراد ہے، تو یہ دن مناسک ابراہیم وحج بیت اللہ ادا کرنے کا ہے وہاں کا اجتماع حشر کا نمونہ ہے روحانی راحتیں اور جسمانی مشقتیں اخروی راحت وکلفت کے نمونے ہیں اور ماہ ذی الحجہ کی پہلی صبح مراد ہے تو یہ حج کے خاص عشرہ کی ابتداء ہے جس میں حشر کا نمونہ کھلی آنکھوں دیکھا جا سکتا ہے خصوصاً میدان عرفات میں، نیز یہ سب ایام اپنی تعیین سے قیامت کی تعیین کی خبر بھی دیتے ہیں۔

دوسری قسم...... **ولیال عشر** (اوردس عظیم الشان راتوں کی قسم) وہ دس عظیم الشان راتیں کونسی ہیں؟ اس بارے میں بھی کئی اقوال ہیں (۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، مجاہد، سدی، کلبی، ضحاک رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کے نزدیک ماہ ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں، کیونکہ حدیث میں ان کی بہت فضیلت آئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبادت کرنے کے لئے اللہ کے نزدیک سب دنوں میں عشرۂ ذی الحجہ سب سے افضل ہے اس کے ہر دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر اور اس میں ہر رات کی عبادت شب قدر کی برابر ہے۔ (مظہری بحوالہ الترمذی واسنادہ ضعیف)۔

اور ابو الزبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **والفجر ولیال عشر** کی تفسیر میں فرمایا کہ اس سے مراد عشرہ ذی الحجہ ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ دس راتیں وہی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہیں، **واتممنا ھا بعشر** کیونکہ یہی دس راتیں سال بھر کی راتوں میں سب سے افضل ہیں، امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور سے ذی الحجہ کے پہلے عشرہ کا سال بھر کے تمام ایام ولیال سے افضل ہونا معلوم ہوا، اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی یہی دس راتیں (چلہ پورے ہونے کے لئے) مقرر کی گئی تھیں۔ جمہور مفسرین نے اسی قول کو اپنایا ہے ان میں دور دراز کے حجاج بارگاہ خداوندی میں جمع ہوتے ہیں اس اجتماع کی خاص تاریخیں متعین ہیں (جیسے قیامت کا وقت مقرر ہے) اور یہ اجتماع حشر کا نمونہ بھی ہے، اور حسب بیان سابق تکلیف وراحت ہر دو چیزیں اس اجتماع میں موجود ہیں۔

(۲) دوسرا قول بعض مفسرین کا یہ بھی ہے کہ **لیال عشر** سے ماہ رمضان کی اخیر دس راتیں مراد ہیں جن میں شب قدر بھی ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان راتوں میں پوری توجہ اور اہتمام کیساتھ شب بیداری واعتکاف فرماتے اور اہل خانہ کو بھی ترغیب دیتے تھے (**ھکذا روی عن ابی الظبیان رحمۃ اللہ علیہ**) (۳) تیسرا قول ضحاک کا بروایت ابو وراق یہ ہے کہ اس سے ماہ رمضان کی ابتدائی دس راتیں مراد ہیں۔ (۴) ایمان بن رباب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان راتوں سے محرم کا پہلا عشرہ مراد ہیں جس کا دسواں دن یوم عاشوراء کہلاتا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کے بعد افضل روزے ماہ محرم کے ہیں، اور فرض نماز کے بعد افضل نماز تہجد کی ہے (مسلم) صوم عاشوراء کے فضائل احادیث میں بہت ہیں اسی تاریخ میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا ہے تاکہ ان کے لئے رفع درجات کا سبب ہو۔

(۵) بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ دس راتیں سال بھر کی متفرق راتیں ہیں جن میں سے پانچ راتیں رمضان کے عشرہ اخیرہ کی ہیں (۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹) انہیں میں عموماً لیلۃ القدر واقع ہوتی ہے اور ایک رات عید الفطر کی، ایک عرفہ کی، ایک یوم النحر کی، ایک لیلۃ المعراج یعنی رجب کی ستائیسویں رات) اور ایک شب برأت، چونکہ یہ راتیں اپنے اندر وہ خصوصیات رکھتی ہیں جن میں قیامت وآخرت کے کھلے نمونے موجود ہیں ذرا سی فکر سے یہ بات خوب سمجھ میں آسکتی ہے۔

فائدہ...... چونکہ یہ راتیں فی الجملہ مبہم تھیں، اس لئے ان کی تعیین میں اختلاف ہے نیز ان کی تعظیم بھی مقصود تھی اس لئے ان کی قسم کھائی گئی اور اسی لئے لیال کو منکر لایا گیا اور تنوین تنکیر اس پر برائے تعظیم ہے اس طرح لیال میں ہر احتمال مذکور کی گنجائش بھی ہوئی۔ بعض صوفیہ نے ان دس راتوں کا مصداق حواس عشرہ (پانچ ظاہری حواس اور پانچ باطنی) کو قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کو رات سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جب انوار الہیہ کی تجلیات سالک کے قلب پر پڑتی ہیں تو یہ

جسمانی آلات معطل اور شب تاریک کی طرح مکدر ہو جاتے ہیں مگر چونکہ کسب کمالات کا یہ ذریعہ ہیں اس لئے ان کی قسم کھائی گئی ہے، واللہ اعلم

تیسری اور چوتھی قسم:...... والشفع والوتر (قسم ہے جفت وطاق کی) یہاں قرآن پاک کے الفاظ میں یہ متعین نہیں ہے کہ شفع ووتر سے کیا مراد ہے؟ اس لئے ائمہ تفسیر کے اقوال اس میں بے شمار ہیں، مگر اس سلسلہ میں حدیث مرفوع جو ابوالزبیرؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

﴿والفجر وليال عشر﴾ هو الصبح وعشر النحر . والوتر يوم عرفه والشفع يوم النحر

(ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والفجر وليال عشر کے متعلق فرمایا کہ فجر سے مراد صبح اور عشر سے مراد عشرۂ نحر (ذی الحجہ کا پہلا عشرہ ہے جس میں یوم نحر بھی ہے اور وتر سے مراد عرفہ کا دن اور شفع سے مراد یوم النحر (دسویں ذی الحجہ) ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ اسناد کے اعتبار سے اصح ہے اس حدیث سے جو حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور اس میں شفع ووتر نماز کا ذکر ہے (یعنی شفع سے دو یا چار رکعات والی اور وتر سے تین رکعات والی نمازیں مراد ہیں) اسی لئے حضرت ابن عباس، عکرمہ رضی اللہ عنہم، نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ شفع سے مراد یوم النحر اور وتر سے مراد یوم عرفہ ہے۔

اور بعض ائمہ تفسیر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، ابن سیرین، عوفی، مسروق، ابوصالح، قتادہ، سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور مجاہد وغیرہ نے فرمایا کہ شفع سے مراد تمام مخلوقات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا ہے، کما قال تعالیٰ ومن كل شيءٍ خلقنا زوجين یعنی ہم نے ہر چیز کا جوڑ پیدا کیا ہے، جیسے کفر وایمان، زمین وآسمان، سعادت وشقاوت، نور وظلمت، لیل ونہار، گرمی وسردی، جن وانس، مرد وعورت وغیرہ اور ان سب کے بالمقابل وتر حق تعالیٰ کی ذات عالیشان ہے، هو الله احد الله الصمد .

(۲) بعض مفسرین کہتے ہیں کہ شفع سے مراد مخلوق کے احوال وصفات ہیں جن میں باہمی تضاد ہے، جیسے زندگی وموت، عزت وذلت، عجز وقدرت، ضعف وقوت، علم وجہالت وغیرہ، اور وتر سے مراد حق تعالیٰ کی صفات ہیں کہ وہاں حیات بغیر موت ہے، عزت بغیر ذلت ہے، قدرت بغیر عجز ہے، قوت بغیر ضعف ہے، علم بغیر جہالت ہے، غنا بغیر فقر ہے، کلام بغیر سکوت ہے وغیرہ۔ (۳) حسن بصری، ابن زید رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے کہ شفع ووتر دونوں مخلوق ہی ہیں، کوئی مخلوق شفع ہے کوئی وتر، مثلاً یوم النحر شفع ہے اور یوم عرفہ وتر، یوم النحر میں قربانی ہوتی ہے اور یوم عرفہ میں حج کا سب سے بڑا رکن وقوف ہوتا ہے (۴) ربیع بن انس وابوالعالیہ کہتے ہیں کہ دونوں سے مراد نماز مغرب ہے کہ اس کی پہلی رکعتیں شفع ہیں اور تیسری رکعت وتر ہے (۵) ضحاک عطا رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ شفع ذوالحجہ کا پہلا عشرہ ہے اور وتر اس کے بعد کے تین دن ہیں۔ (۶) بعض کہتے ہیں کہ آدم وحواء مراد ہیں کہ پہلے آدم وتر (اکیلے) تھے حضرت حواء پیدا ہوئیں تو شفع (جوڑا) بن گیا۔ (۷) مقاتل کہتے ہیں کہ شفع تمام ایام ہیں، رات ودن مل کر۔ اور وتر آخری دن ہے یعنی قیامت کا کہ اس کی رات نہیں ہوگی۔ (۸) حسین بن فضیل کہتے ہیں کہ شفع جنت کے درجات ہیں کیونکہ وہ آٹھ ہیں اور وتر جہنم کے طبقات ہیں کیونکہ وہ سات ہیں (۹) شفع انسان کے بعض اعضاء ہیں دو کان، دو ہاتھ، دو پیر، دو آنکھیں وغیرہ، اور وتر بھی اعضاء ہی ہیں جیسے ناک، سر، قلب وغیرہ۔ (۱۰) شفع سجدہ اور وتر رکوع ہے۔ (۱۱) شفع بارہ برجیں اور وتر سات ستارے (سیارات) ہیں۔ (۱۲) شفع سے مراد چار

وقتوں کی نمازیں اور وتر سے مغرب اور وتر مراد ہیں۔ (۱۳) شفع سے وہ چاند مراد ہے جو پورے تیس دن کا ہو اور وتر سے وہ چاند مراد ہے جو انتیس کا ہو۔ (۱۴) شفع سے مراد وہ بارہ چشمے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لئے پتھر سے جاری ہوئے تھے اور وتر سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات ہیں ولقد اٰتینا موسیٰ تسع ایٰت بینات ۔ (۱۵) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے شفع و وتر سے اعداد مراد ہیں کوئی عدد جفت ہے کوئی طاق، اور انہی پر دنیا کے کاروبار اور معاملات دائر ہیں ان کے علاوہ اور اقوال بھی ہیں اور قرآنی الفاظ میں بڑی وسعت ہے مگر ان میں ٹھیک وہی اقوال ہیں جن کی طرف احادیث صحیحہ میں اشارہ ہو مثلاً سب سے پہلا قول جس کو جمہور مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم

تنبیہ...... اگر ان سب اقوال میں غور کیا جائے تو قیامت کا ثبوت اور آخرت کے نمونے ان میں موجود ہیں طوالت کے خوف سے ہم مزید تفصیل کرنا نہیں چاہتے۔

پانچویں قسم...... والیل اذا یسر (اور رات کی قسم ہے جبکہ وہ ڈھلے) اسی مفہوم کی آیت سورۂ مدثر میں والیل اذادبر اور سورۂ تکویر میں والیل اذا عسعس گذر چکی ہے، یسر ، سری سے مشتق ہے جس کے اصل معنی رات کو چلنے کے ہیں، یہاں مجازاً رات کو کہا گیا ہے کہ وہ چلنے لگے، یعنی ختم ہونے اور ڈھلنے لگے، ابوالعالیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اذا یسر کا ترجمہ کیا ہے اذا جاء واقبل، یعنی آتی ہوئی رات کی قسم، لیل سے مراد جنس لیل ہے کوئی رات بھی ہو، رات کا جانا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ وانعامات کثیرہ پر دلالت کرتا ہے، اخیر شب کے احادیث میں بہت سے برکات وفضائل آئے ہیں اسی لئے حضرات انبیاء علیہم السلام، اولیاء کرام اور صالحین کا دستور پچھلی رات میں جاگنے اور عبادت کرنے کا رہا ہے، اسی طرح رات کا آنا بھی بہت سے انعامات پر مشتمل ہے جس طرح مخلوق رات کے جانے کی منتظر ہوتی ہے اور رات کے جانے کے لئے وقت معین ہوتا ہے اور وہ حشر ونشر اور جنت ودوزخ کا نمونہ ہے اسی طرح رات کا آنا بھی انہیں چیزوں پر دلالت کرتا ہے، نیکوں، بدوں، چوروں، عیاشوں، عاشقوں وغیرہ کو رات کے آنے کا انتظار رہتا ہے اس میں پردہ پوشی وسامان راحت بھی ہے جو جنت کی مثال ہے، مریضوں، مسافروں اور مہجور عاشقوں کے لئے دوزخ کا نمونہ ہے اور اللہ جل شانہ کی قدرت ورحمت پر یہ سب چیزیں روشن دلائل اور کھلی ہوئی نشانیاں تو ہیں ہی۔

حاصل کلام:

حاصل کلام یہ ہے کہ ان پانچ قسموں سے قیامت میں شکوک وشبہات کا ازالہ فرمادیا گیا اور بتادیا گیا کہ اللہ کی حکمت کاملہ کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اعمال کی جزاء کے لئے ایک مقرر دن ہو جس کا انتظار کیا جائے کیونکہ (۱) یہ زندگانی عمل کے لئے ہے پھل کے لئے نہیں۔ (۲) اس عالم میں جزاء وسزاء کا تحمل نہیں۔ (۳) فوراً پکڑ کر لینا حلم کے خلاف ہے (۴) عمل اور گناہوں سے توبہ کے لئے مہلت اللہ کی رحمت کا تقاضا اور اس کی مہربانی پر دلیل ہے (۵) مجرم کو اس عذر کا موقع بھی نہ ہوگا کہ توبہ واصلاح حال کی فرصت ومہلت نہ دی گئی۔ (۶) یہاں سزا سے متعلقین اور اہل وعیال پر مصیبت کا دروازہ کھل جاتا، (۷) ایک کے حق پر سزا دینا دوسرے اہل حقوق کو محروم کردیتا۔ (۸) بہت سے مظلوم ظالموں سے پہلے مرجاتے ہیں انہیں ظالم کی سزا کا علم ومشاہدہ نہ ہوگا جس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل کو تسلی ہوتی اور عدل خداوندی ان پر آشکارا نہ ہوتا (۹) بندوں کی آزادی ختم ہوجاتی اور اس عالم میں آزمائش کا سلسلہ ختم ہوجاتا۔

ان امور کی روشنی میں ان پانچوں چیزوں میں غور کیا جائے جن کی قسمیں کھائی گئیں ہیں تو ان میں قدرت وحکمت اور رحمت کی روشنیاں نظر آئیں گی وقت کی تعیین اور مخلوق خداوندی کو اس کا انتظار معلوم ہوگا، بعض لوگوں کے لئے یہ چیزیں باعث راحت ہیں تو دوسروں کے لئے سبب کلفت، حشر ونشر کے نمونے بھی سب میں موجود ہیں پھر شب وروز میں جو دنیا کے حاکموں اور محکوموں کی عادتیں اور معمولات ہیں وہ ان شبہات کو جو کفار ومشرکین نے پیش کئے زائل کر دیتے ہیں۔

ھل فی ذالک قسم لذی حجر (کیا ان چیزوں کی قسم اہل عقل کے نزدیک کافی قسم ہے) **حجر** کے لفظی معنی روکنے کے ہیں، انسان کی عقل اس کو برائی اور مضرت رساں چیزوں سے روکتی ہے اس لئے حجر بمعنی عقل بھی استعمال ہوتا ہے یہاں یہ بمعنی عقل ہی ہے، آیت کے معنی یہ ہیں کہ کیا عقل والے آدمی کو یہ قسمیں کافی ہیں یا نہیں، یہ صورت استفہام کی ہے، مگر درحقیقت انسان کو غفلت سے بیدار کرنیکا ایک طریقہ ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت پر اور اس کے قسم کھا کر ایک بات کو بیان کرنے پر اور خود ان چیزوں کی عظمت وقدرت پر جنکی قسم کھائی گئی ہے ذرا سا غور کرو تو جس چیز کو ثابت کرنے کے لئے قسم کھائی ہے اس کا یقینی ہونا ثابت ہو جائیگا کہ انسان کے ہر عمل کا آخرت میں حساب ہونا اور اس پر جزاء وسزا ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہے، یہ جواب قسم اگرچہ صراحۃ مذکور نہیں مگر سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ **ان ربک لبا لمرصاد** کو جواب قسم بنایا جائے **کمامر**۔ صاحب مظہری رحمۃ اللہ علیہ نے آیت مذکورہ میں **ھل** کو استفہام تقریری کے لئے قرار دیا ہے۔

الم تر کیف ...... (آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے رب نے قوم عاد کی کیا حالت کر دی الخ) بیوقوفوں کو شاید تعجب ہو کہ ایک دن میں ایک جگہ تمام اولین وآخرین جمع ہوں گے، ایک بڑے مجمع کو سزا دینا بڑا مشکل کام ہے پھر اگر اتنی مخلوق بگڑ جائے اور سب متحد ہو جائیں تو ان پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے دنیا میں جب گورنمنٹ کا کوئی محکمہ اسٹرائک کر دیتا ہے یا کارخانہ کے مزدور یا کسی کالج کے لڑکے متحد ہو جاتے ہیں تو ذمہ داروں کو ان پر کنٹرول کرنا دوبھر ہو جاتا ہے جبکہ اسٹرائیکوں کی تعداد اتنی کثیر نہیں ہوتی اس لئے گورنمنٹ کسی خطہ یا قوم پر قبضہ پانے کے لئے پہلے وہاں کی جمعیت کے ٹکڑے کرتی ہے پھر گرفتاریاں کر کے ان کو کمزور کرتی ہے تب بڑی تدبیروں سے اس پر قابو پاتی ہے اسی طرح بہت سے مجرموں کو یک لخت سزا نہیں دیتی۔

اگلی آیات میں اس قسم کے شبہات کا ازالہ فرما دیا گیا ہے کہ اس قادر مطلق کو ضعیف انسانوں پر قیاس نہ کرو اسی سلسلہ میں تین قوموں کے قصے بیان کئے ہیں وہ تینوں قومیں شوکت وقوت میں مشہور تھیں حق تعالیٰ نے جب اسی دنیا میں ان کی پکڑ فرمائی تو ان کی قوت وشوکت اور اسباب کچھ کام نہ آئے اور تین قصے اس لئے بیان فرمائے کہ ایک آدھ واقعہ اتفاقات میں شمار کر لیا جاتا ہے اور مکرر سہ کرر سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ کام اس کے کرنے والے پر آسان ہے۔ الحاصل ان واقعات سے یہ معلوم ہوا کہ مجرموں کو سزا ملنا آخرت میں طے ہے اللہ کی قدرت میں ہے کہ کبھی کبھی نمونہ کے طور پر دنیا میں بھی اسکا ظہور ہو جاتا ہے جیسے ان تین معذب قوموں میں ہوا، یہ واقعات بھی قیامت کے اور جزا وسزا کے نمونے ہیں۔

(فائدہ......۱) **الم تر** سے اس طرف اشارہ کیا کہ یہ واقعات اپنی شہرت کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ ہر ایک کو ان کا علم ہونا چاہئے اسی لئے ان قصوں کو جن کا سماعت (سننے) سے تعلق ہے رؤیت (دیکھنے اور مشاہدہ کرنے) سے شروع کیا گیا۔ فافہم

(فائدہ......۲) صفت ربوبیت کو اس سورت میں اور دوسری سورتوں میں ذکر کر کے اس بات پر تنبیہ کر دی گئی کہ صفت ربوبیت کا تقاضا ہی عدل وانصاف کا قیام ہے جس میں مجرموں اور سرکشوں کی ہلاکت ضروری ہے۔

پہلا واقعہ:

ان تین واقعات میں سے پہلا واقعہ قوم عاد کا ہے، قوم عاد کے دو لقب ہیں، عاد اور ارم، کیونکہ یہ قوم عاد بن عاص بن ارم بن سام بن نوح کی اولاد تھی، اس کو کبھی باپ کے نام پر عاد اور کبھی پردادا کے نام پر ارم کہہ دیتے ہیں، اور ثمود بن عابر بن ارم کی اولاد ثمود کے نام سے مشہور ہے تو عاد وثمود دونوں ایک ایک واسطہ سے ارم میں جا ملتے ہیں یہاں عاد کے ساتھ ارم اس لئے بڑھا دیا کہ قوم عاد میں دو طبقے تھے ایک متقدمین کا جن کو عاد اولیٰ کہتے ہیں دوسرا متاخرین کا جنہیں عاد اخریٰ کہا جاتا ہے لفظ ارم بڑھا کر اشارہ کر دیا گیا کہ یہاں متقدمین (عاد اولیٰ) مراد ہیں کیونکہ قرب اور واسطوں کی قلت کی بنا پر ارم کا اطلاق عاد اولیٰ پر ہوگا، (مزید تحقیق سورہ الحاقہ میں ملاحظہ فرمائیں) بعض کہتے ہیں کہ ارم اس قوم کی بستی کا نام بھی تھا جس میں بڑی عالیشان عمارتیں تھیں انہوں نے اپنے دادا کے نام پر اس بستی کا نام ارم رکھا تھا اور یہ بستی عدن کے قریب تھی جس میں یہ قوم (عاد اولیٰ) آباد تھی۔

ذَاتَ الْعِمَادِ ...... قوم عاد کو ذات العماد اس لئے فرمایا گیا کہ ان کے قد وقامت بڑے طویل تھے اور یہ قوم اپنے ڈیل ڈول اور طاقت وقوت میں دوسری سب قوموں سے ممتاز تھی اس کے امتیاز کو خود قرآن عزیز نے بڑے واضح الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا کہ لم یخلق مثلها فی البلاد (یعنی ان جیسے قد آور لوگ دنیا میں پیدا نہیں کئے گئے، قرآن کریم نے ان کے طول قامت اور ڈیل ڈول کو دنیا کی ساری قوموں سے زائد ہونا تو بیان فرما دیا مگر ان کی کوئی پیمائش ذکر کرنا ضرورت سے زائد کام تھا اس لئے اس کو چھوڑ دیا، اسرائیلی روایات میں ان کے قد وقامت اور قوت کے متعلق عجیب اقوال مذکور ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ومقاتل رحمۃ اللہ علیہ سے اس کا طول قامت بارہ ہاتھ یعنی اٹھارہ فٹ (گز) منقول ہے، بظاہر یہ روایت بھی اسرائیلی ہے، صاحب مظہریؒ نے بیان کیا، مقاتل کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذراع سے بارہ ذراع ان کے قدموں کا طول تھا، بعض نے اس سے بھی زائد کہا ہے۔

شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ ان میں سے کم سے کم قد کا آدمی بارہ گز کا ہوتا تھا اور ایسے بڑے پتھروں کو جن کو بہت سے لوگ مل کر مشکل سے اٹھا سکتے ہوں، ان میں کا ہر شخص ایک ہاتھ سے اٹھا کر پھینک دیتا تھا، بعض مفسرین نے کہا کہ یہ قوم اپنے خیمے، خیموں کے ستون اور مویشی لے کر موسم بہار میں جنگلوں کو نکل جاتی اس لئے اس کو ذات العماد کہا گیا۔ بعض لوگوں نے قوم عاد کو ذات العماد کہنے کی ایک اور وجہ بتلائی ہے کہ وہ اونچی عمارتیں اور بلند ستون تعمیر کرتے تھے۔

شہر ارم یا شداد کی جنت:

کہتے ہیں اس قوم میں دو بادشاہ بڑے زبردست ہوئے ہیں ایک شدید، دوسرا شداد، شداد نے اپنے بھائی شدید کے مرنے کے بعد سلطنت کو کمال عروج پر پہنچا دیا تھا، کہ چار سو سے زائد بادشاہ اس کے مطیع وفرمانبردار تھے اور روئے زمین کے کسی بادشاہ کو اس سے مقابلہ کی طاقت نہ تھی اس لئے مغرور اور متکبر ہو کر اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا اس زمانہ کے علماء نے اس کو بہت سمجھایا، خدا کا خوف دلایا، اللہ کی عبادت کی رغبت دلائی، مگر وہ نہ مانا اور کہا میرے پاس سب کچھ موجود ہے کسی کی عبادت سے اور کیا حاصل کروں؟ اس سے کہا گیا کہ دنیا کی یہ دولت وسلطنت فانی ہے اللہ کی عبادت سے ایسی جنت ملے

گی جو ہمیشہ رہنے والی ہے کبھی فنا نہ ہوگی اور وہ اس تمام دنیا سے بہتر ہوگی اس نے پوچھا اس جنت کی اور کیا خوبیاں ہیں؟ چنانچہ انہوں نے جنت کی خوبیاں بیان کیں، اس نے کہا مجھے جنت کی ضرورت نہیں میں تو دنیا میں ایسی جنت بنا سکتا ہوں چنانچہ اس نے اپنے سو معتبر اور فن تعمیر کے ماہرین کو جنت کی تعمیر پر مقرر کیا اور ہر ایک کے ساتھ ہزار ہزار آدمی متعین کئے اور حکم دیا کہ سونے چاندی کی کانیں تلاش کرو اور ان کی اینٹیں بناؤ، دفینے اور خزانے سب نکلوالو، اور کوہ عدن کے قریب ایک چالیس کوس مربع شہر ارم کی بنیاد ڈال دی۔

کہتے ہیں کہ اس کی بنیادیں اتنی گہری کھودی گئی کہ پانی کے قریب پہنچ گئی تھیں اور ان کو سنگ سلیمانی سے بھروادیا تھا جب بنیادیں زمین کے برابر ہوگئی تو اوپر سونے چاندی کی اینٹوں سے تعمیر کی گئی اور پانچ سو گز کی بلندی دیواروں کی رکھی گئی، جب سورج نکلتا تو دیواروں کی روشنی اور چمک سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں پھر اس چار دیواری میں ہزار محل اور ہر محل میں ہزار ستون تعمیر کئے گئے اور ہر ستون کو جواہرات سے مرصع کیا گیا اور درمیان شہر میں ایک نہر جاری کی گئی اور ہر ہر مکان میں حوضیں بنائی گئیں اس نہر سے ہر مکان تک ایک چھوٹی نہر جاری کی گئی جن سے وہ حوضیں لبالب بھری رہتیں، اور ہر مکان میں فوارے اچھلتے رہتے تھے ان نہروں کی پٹریاں یاقوت، زمرد مرجان اور نیلم سے سجائی گئی تھیں نہروں کے کناروں پر درخت لگائے گئے تھے جن کی جڑیں شاخیں اور پتے زمرد کے اور پھول پھل موتیوں اور یاقوتوں کے تھے محلات کی دیواروں پر مشک وزعفران، عنبر وگلاب کی لپائی کی گئی تھی اور سونے چاندی کے پانی سے ترائی کرائی گئی تھی یاقوت وجواہرات کے خوبصورت وخوش آواز پرندے بنا کر درختوں پر بٹھائے گئے تھے، شہر کے اردگرد سونے کے ہزار مینار تعمیر کرائے تھے جن پر حفاظتی فوجیں بیٹھتیں۔

جب شہر بن کر تیار ہو گیا تو حکم دیا کہ پورے شہر میں عمدہ قالین اور ریشمی فرش بچھا دیئے جائیں اور سونے کے برتنوں سے محلات کو سجا دیا جائے اور کسی نہر میں دودھ، کسی میں شہد، کسی میں شراب وشربت اور کسی میں پانی جاری کر دیا جائے، بازاروں اور دوکانوں کو بھی کمخواب وزربفت سے سجا دیا گیا، سب کو حکم دیا گیا کہ اپنے کام میں مصروف رہیں اور شہر کے باشندوں کو انواع واقسام کے پھل عمدہ کھانے پہنچائے جائیں، بارہ برس میں (اور صاحب تفسیر حقانی لکھتے ہیں کہ تین سو برس میں) یہ شہر ارم تعمیر ہوا اور حکم ہوا کہ تمام امراء وارکان دولت اس شہر میں جا کر آباد ہوں اور خود بڑے غرور کیساتھ اپنے لشکروں کے ہمراہ اپنی اس جنت کی طرف چلا اور واعظوں سے کہا کہ تم ایسی جنت کے لئے مجھے کہتے ہو کہ کسی دوسرے کے سامنے پست وذلیل بنوں اور سر جھکاؤں؟ میری شان وشوکت والی جنت، میری بے نیازی اور دولت وثروت کا تم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرلو، جب وہ اپنی جنت کے قریب پہنچا تو لوگ غول کے غول شہر ارم (جنت) کے دروازوں پر آئے اور زر وجواہر اس پر نچھاور کرنے لگے، جب وہ اپنی خود ساختہ جنت کے دروازہ پر پہنچا تو ایسی حالت میں کہ اس کا ایک قدم دروازہ کے اندر اور ایک باہر تھا آسمان سے ایک ایسی کڑک (سخت آواز) آئی کہ وہ سب وہیں ہلاک ہو گئے اور بادشاہ بھی دروازہ پر گر کر مر گیا اور اپنی بنائی ہوئی جنت کے دیدار کی حسرت بھی اپنے دل میں لے گیا۔

بعض کتابوں میں یہ ہے کہ ملک الموت سے حق تعالیٰ نے یہ پوچھا کہ کسی کی روح قبض کرتے ہوئے تجھ کو رحم بھی آیا؟ عرض کیا دو شخصوں پر رحم آیا اگر آپ کا حکم نہ ہوتا تو میں ہرگز ان کی روح نہ نکالتا، ایک تو جب سمندر میں کشتی الٹ گئی تھی اور وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک تختہ پر رہ گیا تھا اور حکم ہوا کہ اس کی ماں کی روح قبض کرلے، اس وقت اس بے آسرا بچہ پر مجھے

بہت رحم آیا تھا، دوسرا وہ بادشاہ جس نے دنیا میں جنت تعمیر کروائی تھی اور وہ اس کو ایک نظر دیکھ بھی نہ سکا، حق تعالیٰ کہ طرف سے ارشاد ہوا: یہ بادشاہ وہی بے آسرا بچہ ہی تو تھا اس کو ہم نے اپنی قدرت سے پالا پوسا اور اس مرتبہ اور جاہ وجلال تک پہنچایا، مگر اس نے ہماری عبادت سے تکبر کیا اور وہ بدنصیب اس طرح ہلاک کردیا گیا وہ تختہ بہتا ہوا جب کنارے پر پہنچا تو دھوبی نے اسکو کھینچ کر اس کی ماں کی لاش کو دفنا دیا اور اس بچہ کو اس مہتر کو دیدیا تھا جس کی کوئی اولاد نہ تھی جب وہ سات سال کا ہوا تو وہ ایک دن بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ یکبارگی شور ہوا کہ بادشاہ کی سواری آتی ہے، سب بچے مارے خوف کے بھاگ گئے مگر یہ وہیں کھڑا بادشاہ اور اس کے لشکر کا تماشا دیکھتا رہا، بادشاہ مع لشکر گزر گیا گری پڑی چیز اٹھانیوالے جو لشکر کے پیچھے چلا کرتے تھے گزرے تو ان میں سے ایک کو ایک پوٹلی ملی جس میں سرمہ دانی اور سلائی تھی اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اگر تمہاری رائے ہو تو میں اسے استعمال کرلوں، شاید یہ میری آنکھوں کی تکلیف کے لئے مفید ہو، انہوں نے کہا کہ مناسب نہیں، نہ معلوم فائدہ دے یا نقصان کرے، پہلے کسی اور کی آنکھوں میں لگا کر دیکھ، اگر فائدہ ہو تو تو بھی لگالینا، اس نے ادھر ادھر دیکھا تو ایک ٹیلہ پر اس لڑکے کو کھڑے ہوئے دیکھا اور یہ سرمہ اس کی آنکھوں میں لگا دیا، اس سرمہ کے لگتے ہی زمین کے خزانے اس کو نظر آنے لگے یہ لڑکا بڑا چالاک تھا شور مچانے لگا اے ظالمو! تم نے میری آنکھیں پھوڑ دیں، میں بادشاہ سے تمہاری شکایت کروں گا وہ لوگ گرتے پڑتے سرمہ دانی وہیں چھوڑ کر بھاگے، یہ گھر آیا اور مہتر سے یہ حقیقت بیان کردی، مہتر نے کہا یہ گدھے خچر موجود ہیں رات میں مخصوص اور معتبر مزدوروں کو لیجا کر کھودلائیں گے۔ چنانچہ بہت سا مال جمع کرلیا اور سب گاؤں والوں کو اپنی طرف مائل کر کے اس گاؤں کے سردار کو مار ڈالا اور یہ لڑکا خود گاؤں کا سردار بن گیا۔ حکام کو خبر پہنچی تو انہوں نے اس کو سزا دینی چاہی مگر اس نے اپنی فوج تیار کر کے ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا، چند روز میں بادشاہ مر گیا تو اسکے تخت وتاج پر بھی قبضہ کرلیا پھر اس کی بادشاہت کو اتنی ترقی ہوئی کہ بہت سے بادشاہ اس کے اطاعت گذار بن گئے۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ معتبر تفسیروں میں لکھا ہے کہ جب یہ بادشاہ اور اس کا لشکر آسمانی کڑک سے ہلاک ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے اس شہر ارم کو دنیا کی نگاہوں سے چھپا دیا، مگر کبھی کبھی عدن کے گردونواح کے لوگوں کو اس کی روشنی اور جھلک اس جگہ محسوس ہوتی ہے اور یہ اس کی دیواروں کی روشنی ہے۔ عبداللہ بن قلابہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اتفاق سے صحابہ کی ایک جماعت کا گذر اس طرف کو ہوا وہاں جا کر ایک اونٹ بھاگ گیا جب لوگ اس کو ڈھونڈھنے نکلے تو اس شہر کے میناروں اور دیواروں کو دیکھ کر حیران ہوگئے اور کہنے لگے کہ یہ تو اس جنت کا نمونہ ہے جس کی خبر ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے سوچا شاید یہ خواب ہے اندر پہنچے شہر کو دیکھا کوئی آدمی وہاں نہ تھا کچھ جواہرات اور یاقوت نظر پڑے تو اپنی چادر میں بھر لئے اور امیر المومنین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا واقعہ بیان کیا پوچھا کہ تم نے یہ خواب میں دیکھا ہے یا بیداری میں؟ انہوں نے کہا صاحب! بیداری میں دیکھا ہے اس شہر کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ یاقوت وجواہر بھی پیش کردیئے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا، اہل علم سے معلوم کیا کہ دنیا میں کوئی شہر ایسا بھی ہے، علماء نے قرآن کی یہ آیت ارم ذات العماد پڑھ کر بتایا کہ شہر ارم ہے جو لوگوں کے نظروں سے پوشیدہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک شخص وہاں جائے گا جس کا حلیہ یہ ہوگا کہ وہ کوتاہ قد، سرخ رنگ کا ہوگا اور اس کی آبرو و گردن پر دو تل ہوں گے وہ اپنے اونٹ کو تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچے گا، دیکھا گیا تو وہ سب نشانیاں اس شخص میں ثابت ہوئیں (ملخص از فتح العزیز)

اس واقعہ کو اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ واقعہ قوم عاد کے ایک خاص شخص شداد بن عاد کا ہوگا، کہ اس پر اور اس کی بنائی ہوئی جنت پر عذاب نازل ہوا، اور پہلی تفسیروں پر (جن کو جمہور مفسرین نے اختیار کیا ہے) یہاں قوم عاد کے معذب ہونے کا بیان ہے، **واللہ تعالیٰ أعلم بحقیقۃ الحال۔**

دوسرا واقعہ:

وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (اور آپ کے رب نے اس قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا جنھوں نے وادی قریٰ میں چٹانیں تراشی تھیں) قوم ثمود عرب کے شمال میں رہتی تھی مقام حجر سے وادی القریٰ تک ان کی بستیاں تھیں، فتح العزیز میں ان کی بستیوں کی تعداد سترہ سو لکھی ہے حجاز کے متصل ان کا شہر وادی القریٰ تھا اور ملک شام کی طرف ان کا آخری شہر حجر تھا یہ قوم فن سنگ سازی میں نہایت ماہر تھی عمدہ مکانات خوبصورت تصویریں، پھولوں پھلوں کی خوشنما صورتیں پتھر تراش کر بنالیا کرتی، اس کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام تھے قوم عاد کے قصہ کی طرح اس قوم کا قصہ بھی قرآن پاک میں بار بار آیا ہے۔

تیسرا واقعہ:

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ (اور آپ کے رب نے میخوں والے فرعون کے ساتھ کیا معاملہ کیا) **اوتاد** **وتد** کی جمع ہے **وتد** میخ کو کہتے ہیں، فرعون کو میخوں والا کہنے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں (۱) درمنثور میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ، مقاتل، کلبی، سعید بن جبیر، مجاہد، حسن، اور سدی رحمۃ اللہ علیہم سے اس کی تفسیر میں منقول ہے کہ وہ جس کو سزا دیتا تھا اس کے چاروں ہاتھوں پاؤں کو چار میخوں میں باندھ کر سزا دیتا تھا، بعض علماء نے لکھا ہے کہ چاروں ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑ دیتا اور سانپ بچھو چھوڑ دیتا تھا، (۲) لفظ **ذی الاوتاد** سے اس کی حکومت کی مضبوطی و استحکام کی طرف اشارہ ہے، عرب کہتے ہیں کہ: **هُمْ فِيْ الْعِزِّ ثَابِتُ الْأَوْتَادِ** (انہوں نے عزت کی میخیں گاڑ دیں اور وہ دوامی عزت کے مالک ہیں) مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ ص میں **ذو الاوتاد** کا ترجمہ: ''جس کے کھونٹے گڑ گئے تھے'' کیا ہے۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما و محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ **الاوتاد** کے معنی مضبوط عمارتیں ہیں (۴) بعض کہتے ہیں کہ وہ رسّی اور میخوں سے کوئی خاص کھیل کھیلتا تھا (۵) عطیہ کا قول ہے کہ اوتاد سے مراد فوجیں ہیں، فوجیں اپنے ساتھ بکثرت خیمے رکھتی تھیں اور جہاں پڑاؤ کرنا ہوتا تھا میخیں گاڑ کر ڈیرے قائم کرتی تھیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بروایت عطیہ یہی منقول ہے۔ (۶) بعض کہتے ہیں کہ گھوڑوں، ہاتھیوں اونٹوں اور خچروں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ سب جانور کھونٹوں میں بندھتے ہیں۔

فائدہ......۱: اس مقام پر مفسرین نے جو میخا کئے جانے والوں کے دو واقعات بھی ذکر کئے ہیں (۱) حضرت حزقیل (مومن آل فرعون) کی بیوی کا جو فرعون کی لڑکی کی کنگھی چوٹی کرتی تھی (۲) حضرت آسیہ بنت مزاحم کا جو فرعون کی بیوی تھی، اور جنت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں داخل ہوں گی، ان قصوں کے ذکر میں طوالت ہے اس لئے جو چاہیں مظہری وغیرہ بڑی تفاسیر میں دیکھ لیں۔

اَلَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ......(جنھوں نے بستیوں میں حد سے بڑھ کر نافرمانیاں کی تھیں) مذکورہ تینوں قصوں کو اجمالا بیان کر کے اس آیت میں اور اس سے اگلی آیت میں ان کی بدکاریوں کا اجمالی بیان اور ان پر قہر و عذاب خداوندی ٹوٹ پڑنے کی وجہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ...... (تو آپ کے رب نے ان پرعذاب کا کوڑا برسایا) لفظ صب سے اشارہ ہے کہ ان پرعذاب بارش کی طرح برسا اور سوط عذاب میں اضافت اخلاق ثیاب کی طرح (اضافة الصفة الى الموصوف) ہے عذاب کے کوڑے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوڑا بدن کے مختلف اطراف میں پڑتا اور چاروں طرف سے لپٹ جاتا ہے اسی طرح ان پرعذاب ہمہ گیر اور انکے ہر طرف سے آیا، بلکہ سوط کے لغوی معنی مخلوط کرنے اور ملانے کے ہیں، اور کوڑے کو بھی بل دیکر مخلوط کیا جاتا ہے اس لئے کوڑے کو سوط کہتے ہیں اسی طرح مختلف عذابوں سے بھی کنایہ ہوسکتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ان تینوں قوموں پر جو عذاب نازل ہوا وہ بارش کی طرح مسلسل اور کوڑوں کے مانند ہمہ جہتی کے ساتھ مختلف الانواع بھی تھا پھر آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں دنیا کا عذاب ایسا ہی ہے جیسے تلوار کے مقابلہ میں کوڑا، یعنی دنیا کا عذاب ادنیٰ اور آخرت کا عذاب اکبر ہے اسلئے اس دنیوی عذاب کو کوڑے سے تشبیہ دینا نہایت برمحل ہے، قتادہ کہتے ہیں کہ یہاں اضافت بتقدیر من ہے ای سوطاً من عذاب جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ آپ کے رب نے ان پرعذاب سے بنا ہوا کوڑا برسایا۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ...... مرصاد اور مرصد، رصدگاہ، انتظارگاہ، گھات، یعنی ایسا بلند مقام جہاں بیٹھ کر کوئی شخص دور دور تک لوگوں کو دیکھ سکے، اور انکے افعال و اعمال کی نگرانی کر سکے اور وہ لوگ اس کو نہ دیکھ سکیں، یہ کلام بطور تشبیہ ہے مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات حق تعالیٰ کی نظر میں ہیں، گو وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے یہ جملہ مذکورہ پانچوں قسموں کا جواب ہے یا جواب محذوف کی تاکید ہے۔

رزق کی فراخی اور تنگی مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں

فاما الانسان الخ یہاں انسان سے مراد دراصل کافر انسان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جو چاہتا ہے خیال باندھ لیتا ہے لیکن عام مفہوم کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس میں شامل ہیں جو اس جیسے خیالات میں مبتلا ہوں، اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو رزق میں وسعت، مال و دولت، صحت و تندرستی سے نوازتے ہیں تو شیطان اس کو دو باطل خیالوں میں مبتلا کر دیتا ہے اول یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ میری ذاتی صلاحیت اور میری عقل و فہم اور سعی عمل کا لازمی نتیجہ ہے اور میں اس کا بجا طور پر مستحق ہوں، دوسرے یہ کہ ان چیزوں کے حصول سے وہ اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں اللہ کے نزدیک مقبول ہوں اگر مردود ہوتا تو وہ مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا، اسی طرح جب کسی انسان پر تنگی و تنگدستی اور فقر و فاقہ آجاتا ہے تو وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردود ہونے کی دلیل خیال کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو جاتا ہے کہ میں تو انعام و اکرام کا مستحق تھا اس نے بلاوجہ مجھے حقیر و ذلیل کر دیا، ایسے خیالات کفار و مشرکین میں تو ہوتے ہی ہیں اور قرآن عزیز نے ان کے ان خیالات کو متعدد جگہوں میں بیان اور رد بھی فرمایا ہے مگر افسوس ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان بھی اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں حق تعالیٰ نے ان آیات میں ایسے انسانوں کا حال بیان فرما کر کلّا سے ان کے ان خیالات فاسدہ کی تردید کی ہے کہ تمہارا یہ خیال بالکل باطل اور بے بنیاد ہے اس دنیا میں وسعت رزق نیک اور مقبول عند اللہ ہونیکی علامت ہے اور نہ تنگدستی مردود و ذلیل ہونے کی دلیل، بلکہ اکثر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے فرعون کو دعوائے خدائی کی ساتھ کبھی دردِ سر بھی نہ ہوا، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک مردود و ذلیل تھا اور بعض پیغمبروں کو دشمنوں نے شہید کیا، آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا مگر وہ حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول و باعزت تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرات مہاجرین میں سے جو مفلس تھے وہ

اغنیاءمہاجرین سے چالیس سال پہلے جنت میں جائیں گے (رواہ مسلم ع عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ سے محبت فرماتے ہیں اس کو دنیا سے ایسا بچاتے ہیں جیسا کہ تم اپنے بیمار کو پانی سے پرہیز کراتے ہو (رواہ احمد والترمزی، مظہری) اگر افلاس وفقر کے ساتھ صبر ورضا بھی ہو تو ایسا فقر نعمت ہے، بے عزتی نہیں اور مالداری کیساتھ اگر شکر گذاری نہیں تو وہ وجہ ذلت وباعث مصیبت ہے، فقیر صابر اور غنی شاکر ہی اللہ تعالیٰ کے محبوب وباعزت بندے ہیں، اور بے صبر فقیر اور ناشکر اغنی اللہ کے نزدیک مردود وذلیل بندے ہیں۔

چند سوالات اوران کے جوابات

(س۱) فامّا میں فـ تفریعیہ ہے اور لفظ اما مجمل کی تفصیل کے لئے ہوتا ہے تو یہاں کس چیز پر یہ تفریع ہورہی ہے اور وہ مجمل کہاں ہے جس کی تفصیل لفظ اما سے ہورہی ہے؟

(ج) ان ربک لبا المرصاد کے مضمون سے اجمالاً یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ اللہ جل شانہ بندوں کے اعمال پر نگاہ رکھتے ہیں اور وہ احوال عباد سے غافل نہیں ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ بندے ہوشیار رہیں، مگر وہ غفلت کا شکار ہوگئے جس کی تفصیل فامّا سے ہے اور اسی مضمون سابق سے فاما کے بعد والا مضمون متفرع ہے۔

(س۲)...... اللہ تعالیٰ نے بندوں کی آزمائش دوطرح پر کی ہے (۱) عزت ودولت اور عیش وراحت دیکر، (۲) فقر ومصیبت اور ذلت وآفت دے کر، اور پہلے حال کے بیان میں اکـرم اور اکـرمـن ہے اس کے مقابلہ میں اھـان او راھانن ہونا قرین قیاس تھا مگر اکرمن کے مقابلہ میں بندہ کی زبانی تو اھانن ہے لیکن اکرم کے مقابلہ میں اللہ کی جانب سے اھـان نہیں ہے؟ (ج)...... درحقیقت رزق کی تنگی یا مصائب وآلام اہانت کی علت نہیں بلکہ وہ بسا اوقات راحت وعزت کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں تنگدستی ومصیبت کو باعث اہانت سمجھنا غافل بندہ کا شیوہ ہے اگر فقر ومصیبت اہانت کا سب ہوتے تو انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کو یہ چیزیں ہرگز نہ پہنچتیں حالانکہ ان کو یہ چیزیں پیش آتی رہی ہیں۔

(س۳)...... قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ کلام اس طرح ہوتا فـامـا الانسان فیـقـول ربـی اکرمن اذا مابتلٰه فاکرمه اسی طرح اس سے اگلا جملہ بھی اسی ترتیب سے ہوتا کیونکہ الانسان مبتدا اور فیقول مع مقولہ خبر اور اذا مع مدخول ظرف ہے مگر ترتیب آیت میں بدلی ہوئی ہے؟ (ج)...... درحقیقت لفظ امـا سے انسان کی تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی آزمائش کے دونوں حالات (دولت وفقر) کی تفصیل مقصود ہے لیکن فقط انسان کو مقدم کر کے امّا سے متصل اس لئے ذکر کیا کہ وہ آنے والی ضمائر کا مرجع بن رہا ہے جو ہنوز غیر مذکور ہے اس کے بعد ابتلا جو مقصود تھا لایا گیا ورنہ قیاس ترکیبی کے تقاضے پر اصل کلام اس طرح ہے ان ربک لبـالـمـرصـاد والانسان غـافـل عـن ذالـک فی کلتاالحالتین فامااذا مابتلٰه ربه فاکرمه ونعمه فیقول ربی اکرمن وامااذامابتلٰه فقدر علیه رزقه فیقول ربی اھانن ۔ بلکہ یہاں دوچیزوں کی تفصیل مقصود ہے ایک انسان کی غفلت کی دونوں قسم کے حالات میں دوسرے غفلت انسانی کی نوعیت کی تفصیل دونوں حالات میں لفظ انسان اما کے قریب لاکر تفصیل اول کی جانب اشارہ کیا گیا اس کے بعد ابتلاء کا ذکر کر کے نوع ثانی کی تفصیل کی گئی، فافهم ولاتکن من الغافلین.

(س۴)...... اللہ تعالیٰ نے بندہ کی اول الذکر حالت کو اکرام سے تعبیر فرمایا اور دوسری حالت کو پہلی حالت کے

مقابلہ پر ذکر کیا جس کا مطلب اکرمہ کے مقابلہ میں اھانہ کے سوا کچھ نہیں کہا ہوسکتا، اور واقعۃً بھی ایسا ہی ہے تو اگر انسان رَبِّیْ اَکْرَمَن اور رَبِّیْ اَھَانَن کہتا ہے تو اللہ کے کلام کے موافق اور واقع کے مطابق کہتا ہے پھر اس کہنے پر انسان کی مذمت وتردید کیوں کی گئی؟ (ج)...... یہ انکار ومذمت جو لفظ اکرمن واھانن سے مفہوم ہے گو اس بات کے کہنے میں انسان سچا بھی ہے اور اس کی بات واقع کے مطابق بھی ہے مشہور ہے عزۃ الدنیا بالمال وعزۃ الاخرۃ بالاعمال ،لیکن اس اعتبار سے وہ اس بات کے کہنے میں قابل مذمت ہے کہ وہ دنیا کے اکرام واہانت کی تو فکر رکھتا ہے اور اس اکرام واہانت کی حکمت اس کے منشاء ومقصود اور اسباب پر غور نہیں کرتا اور اس سے بڑھ کر وہ آخرت کے اکرام واہانت کی فکر سے بے نیاز ہے گویا وہ دنیوی فکر میں گرفتار ومنہمک ہے اور آخرت سے قطعاً غافل، تو اس کے دنیا دار ہونے پر حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی مذمت کیجا رہی ہے نہ کہ صرف ان الفاظ کے کہنے پر اور انسان بے شعور بچے کی طرح ہے کہ شکر آلود زہر کو شکر سمجھ کر کھالینے کی طرف راغب ہے اور اس بدمزہ دوا سے منہ موڑتا ہے جو اس کے حق میں نافع وشافی ہے تو یہ جھڑکیاں اس کی اس حماقت کی بنا پر ہیں کہ وہ حقیقت کو نظر انداز کرتا اور ظاہر پر ریجھتا ہے اور اپنی خداداد عقل کو کام میں نہیں لاتا۔

(س۵) عرفاً ابتلاء وآزمائش کے معنی فقر وتنگدستی میں ظاہر ہیں، عیش وفراخدستی میں آزمائش کا کیا مطلب ہے؟
(ج) جس طرح فقر ومصیبت میں اس کے صبر کا امتحان ہے اسی طرح آرام وراحت میں اسکے شکر کی آزمائش منظور ہے، حاصل یہ ہے کہ امتحان کے عرفی معنی یہاں مراد نہیں لغوی معنی مراد ہیں۔

(س۶) امتحان تو قابلیت وصلاحیت معلوم کرنے کے لئے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ازل ہی سے سب کچھ معلوم ہے تو امتحان وابتلاء عبث کا ارتکاب ہوا؟ (نعوذ باللہ) (ج) کسی کا امتحان دووجہ سے ہوتا ہے، خود قابلیت معلوم کرنے کے لئے یا دوسروں کو اس کی قابلیت پر آگاہ کرنے کے لئے جس کا امتحان کیا جارہا ہے حق تعالیٰ جب کسی بندہ کی آزمائش فرماتے ہیں تو منشاء دوسروں پر اس کی قابلیت ظاہر کرنا ہوتا ہے کلا بل لاتکرمون الیتیم ،یعنی ہرگز ایسا نہیں کہ دولت وفراخدستی عزت کا سبب اور مصیبت وتنگدستی ذلت کا سبب ہو، بلکہ عزت وذلت کا مدار اعمال پر ہے، فراخدستی کیساتھ بداعمالیاں ذلت کا سبب ہیں، اوتنگدستی کے باجود اچھے اعمال عزت کا باعث ہیں بلکہ اے کافرو! تمہاری یہ بداعمالیاں اور بری خصلتیں جن کے تم خوگر ہو تمہاری ذلت کا پیش خیمہ ہیں، (۱) تم یتیموں کی عزت وقدر نہیں کرتے، حالانکہ وہ بے سہارا، بے آسرا، مصیبت زدہ اور کم سن ہیں، باپ کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ چکا ہے۔ (۲) تم غریب ومسکین کو خود تو کیا کھانا کھلاتے دوسری کو بھی ترغیب نہیں دلاتے حالانکہ محتاج پر رحم کرنا سارے ہی انسانوں کے نزدیک مسلم نیکی ہے۔ (۳) مردوں کا مال خود سمیٹ لیتے ہو، یتیموں، بیواؤں اور کمزور وارثوں کو نہیں دیتے اس مال کے ذریعے خود گل چھرے اڑاتے اور عیاشی کرتے ہو، (۴) مال سے بیحد محبت رکھتے ہو، جس کی وجہ سے تمہارے اندر ذلت کے اسباب طمع لالچ حرص بخل اور کبر جیسے موذی امراض پیدا ہوگئے ہیں، اسی وجہ سے تم قتل وغارتگری، بے رحمی، حق تلفی جیسی کمینہ خصلتوں میں گرفتار ہو، یہ ہیں اسباب ذلت نہ تنگی وتنگدستی۔

یتیموں کی پرورش کے ساتھ احترام کا حکم

لاتکرمون میں کفار کی یتیموں کی حق تلفی پر مذمت کی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ یتیموں کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام ضروری ہے اور صرف حق کی ادائیگی کافی نہیں ان کا اکرام واحترام بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مال عطا فرمایا ہے

عقل اور انسانیت کا تقاضا ہے کہ اس کے شکریہ میں یتیموں اور محتاجوں کی پرورش کی جائے اور ان کو ذلت وحقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ اپنے بچوں کے مقابلہ میں یتیموں کو ذلیل وحقیر نہ سمجھیں، یہ بھی ان کے اکرام میں داخل ہے۔ کفار مکہ اکرام تو کیا کرتے وہ ان کا حق واجب بھی نہ دیتے تھے، مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ قدامہ بن مظعون یتیم، امیہ بن خلف کی پرورش میں تھا مگر امیہ قدامہ کی حق تلفی کیا کرتا تھا ابوجہل اور دوسرے کفار بھی اس جرم میں مبتلا تھے بلکہ اس کا عام رواج تھا جس کو اسلام نے مٹایا اور یتیموں کے حقوق کی ادائیگی کا اپنے ماننے والوں کو حکم دیا، یتیم کی پرورش اور انکے ساتھ حسن سلوک پر احادیث میں بڑے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں افسوس ہے کہ دور حاضر میں زمانہ جاہلیت کا یہ رواج مسلمانوں میں عام ہوتا جارہا ہے بہت سے لوگوں کو اس کا احساس تک نہیں اور بہت سے دیندار قسم کے لوگ خود ساختہ رسوم میں یتیموں کا مال اڑادیتے ہیں، افسوس صد افسوس۔

کلا اذا دکت الارض ...... جس مضمون کو ثابت کرنے کے لئے شروع سورت میں پانچ قسمیں ذکر کی گئی تھیں۔ یہاں سے اسی مضمون جزا وسزا کی طرف عود ہے اول قیامت کے آنے کا ذکر ہے اول بار صور پھونکے جانے کے بعد جب ایک زبردست زلزلہ آئیگا تو زمین اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بلندی وپستی ہموار ہو جائینگی پھر دوسرا جہان پیدا ہوگا اور مردے زندہ ہو کر قبروں سے نکلیں گے تمام اولین آخرین عدالت خداوندی میں حاضر ہوں گے ملائکہ کا نزول ہوگا، حق تعالیٰ تخت پر جلوہ افروز ہوں گے حساب کتاب کے بعد فیصلے ہوں گے اور ہر شخص اپنے اپنے استحقاق کے موافق اپنے اعمال کا پھل جنت یا جہنم میں پالیگا۔

وجآء ربک ...... حق تعالیٰ کے آنے کی کیا شان ہوگی، اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہ ان آیات متشابہات میں سے ہے جن کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور فرشتوں کا صف بہ صف آنا ظاہر ہے اس میں کوئی اشکال نہیں فرشتوں کے نزول کی تفصیل سورہ الحآقہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

وجآی ...... جہنم کو لائے جانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کی حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے ظاہر یہ ہے کہ جہنم جواب ساتویں زمین کے نیچے ہے اس وقت وہ بھڑک اٹھے گی اور سمندر سب آگ ہو جائیں گے اور جہنم میدان حشر میں سامنے آجائیگی اس کا بیان سورہ تکویر وسورہ تطفیف وغیرہ میں بھی آگیا ہے۔

یومئذ یتذکر الانسان ...... یہاں **تذکر** سے مراد سمجھ میں آجانا ہے اور **الانسان** میں الف لام عہد کا ہے مراد انسان کافر ہے یعنی اس دن کافر کی سمجھ میں آجائیگا کہ مجھے دنیا میں کیا کرنا چاہئے تھا اور میں نے کیا کیا، مگر اس وقت یہ سمجھ میں آنا بے سود ہوگا کیونکہ دار العمل اور اصلاح حال واعمال کا وقت گذر چکا ہوگا، آگے اس تذکر کی تفصیل ہے۔

یقول یلیتنی ...... کافر تمنا کریگا کاش میں اچھے اعمال آگے بھیجتا تو آج ان مصائب سے جو کفر وشرک اور سرکشی کے نتائج سامنے آرہے ہیں دوچار نہ ہوتا لیکن یہ تمنا عبث ہے، اب تو عذاب اور پکڑ کا وقت ہے اور اللہ کی پکڑ ایسی سخت ہے کہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ **لحیاتی** میں لام بمعنی وقت، اور **حیوۃ** سے مراد دنیوی زندگی ہے مطلب یہ ہے کہ کاش میں اپنی دنیوی زندگی کے زمانہ میں اعمال صالحہ پہلے ہی کر لیتا، یا لام اجلیہ ہے اور **حیوۃ** سے مراد اخروی حیات ہے، یعنی اے کاش میں اپنی اس زندگی کے لئے اچھے اعمال بھیج دیتا تو آج مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

فیومئذٍ ...... **عذابہ** اور **وثاقہ** دونوں مفعول مطلق ہیں بیان نوع کے لئے ای کعذابہ اور کوثاقہ، پھر دونوں

کی ضمیر (ہ) میں بھی دو احتمال ہیں فاعل (اللہ) کی طرف راجع ہوں یا مفعول (الانسان) کی طرف راجع ہوں اول صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جس طرح عذاب دیگا اور جکڑ بندی کریگا دوسرا کوئی نہ کر سکے گا، کیونکہ **الامر یومئذ للہ** سارا اختیار اسی کو ہوگا اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ (یا دوزخ کا مامور فرشتہ) جیسا عذاب انسان کافر کو دے گا اور کسی کو نہ دے گا اور جیسی گرفتاری وجکڑ بندی وہ کافر کی کرے گا کسی اور کی نہ کرے گا۔

پھر **یومئذ** میں بھی دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس کو **لایعذب** اور **لایوثق** کا ظرف زمان مانا جائے تو مذکورہ بالا مطالب اس پر چسپاں ہوں گے اور اگر عذابہ اور وثاقہ کا اس کو ظرف قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ازل سے ابد تک کسی نے کسی کو ایسا عذاب نہ دیا ہوگا جیسا کہ اس دن اللہ تعالیٰ کافر کو دے گا اور کبھی کسی نے کسی کو نہ باندھا ہوگا اور نہ باندھے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ اس دن کافر کو باندھے گا، یہ تمام مطالب مشہور قراءت کی بنا پر ہوئے۔

امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ وامام یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے **لایعذب** اور **لایوثق** کو مجہول کا صیغہ قرار دیا ہے اس صورت میں مطلب صاف ہے کہ اس دن کسی کو ایسا عذاب نہ دیا جائیگا جیسا کہ کافر کو دیا جائیگا الخ، پھر ماقبل میں الانسان سے مراد عام کافر ہے یا مخصوص کافر، یعنی امیہ بن خلف، تو یہاں ضمیر میں بھی دونوں احتمالات ہوں گے۔ **فافھم**

بے مثال عذاب کی وجوہات

(سوال) کافر کو عذاب اور اس کی بندش کے بے مثال ہونی کی وجہ کیا ہے؟ **(جواب)** کفر وشرک بغاوت ہے، اور بغاوت سب جرائم سے بڑا جرم ہے اس لئے اس کا عذاب اور بھی سخت ترین اور بے مثال ہوگا (۲) وہ عذاب جسمانی بھی ہوگا اور روحانی بھی۔ (۳) دنیا میں ایسا عذاب ممکن نہیں اور آخرت میں اہل ایمان کو بھی اتنا سخت عذاب نہ ہوگا (۴) دنیا کے عذاب کی انتہاء ہے، آخر کار موت تو چھٹکارا دلا ہی دے گی، اور وہاں کا عذاب ابدی ہے موت بھی نہ آئیگی، اسی طرح بعض اہل ایمان کو جو سزا ہوگی وہ بھی عارضی ہوگی ابدی نہ ہوگی۔

یاایتھا النفس المطمئنۃ ؛...... یہاں یُقال محذوف ہے اور یہ جملہ مستانفہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کافر کا انجام اور اس کی اُخروی حالت کا تو علم ہوگیا مگر مؤمن کو آخرت میں کیا حالات پیش آئیں گے اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ تو یہاں سے اس سوال کا جواب ہے، کہ مومن کے حالات ایسے ہوں گے، آیات کا مطلب یہ ہے کہ اس خوف وہراس کے عالم میں فرشتے مومن کو تسلی دیں گے اور اس سے کہا جائیگا اے نفس مطمئنہ خوشی خوشی اپنے رب کی عدالت وبارگاہ میں ایسی حالت میں پیش ہوجا کہ وہ تجھ سے راضی ہے، اور تو اس سے خوش ہے جب وہ بندہ مومن بارگاہ حق میں پہنچے گا تو پروردگار عالم بصد اکرام وعنایت ارشاد فرمائیگا، جا میرے خاص معزز مقرب بندوں میں شامل ہوجا، اور میری سدا بہار جنت کے عالیشان محلات کو اپنا وطن بنالے۔

فائدہ...... نفس **مطمئنہ** وہ نفس ہے جس کو اللہ کی عبادت وذکر میں ایسا لطف وسکون حاصل ہوتا ہے جیسا کہ مچھلی کو پانی میں حاصل ہوتا ہے اور نفس کی یہ کیفیت اہل معرفت ہی کو حاصل ہوتی ہے نفس کے اقسام (امارہ، لوامہ، مطمئنہ) کی تفصیلات ہم ''سورہ قیامہ'' کے شروع میں لکھ آئے ہیں وہیں ملاحظہ فرمالیں۔

مؤمن کی روح اپنے وطن اصلی کی جانب واپس ہوتی ہے:

ارجعی الیٰ ربک ارجعی کے لفظ سے معلوم ہوا کہ اس کا پہلا مقام بھی رب کے پاس تھا اب پھر وہیں واپس جانیکا حکم ہو رہا ہے اس سے اس روایت کی تقویت ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ مؤمنوں کی روحیں اپنے اعمالناموں کے ساتھ علیین میں رہیں گی اور علیین ساتویں آسمان پر عرش کے سایہ میں کوئی مقام ہے، تمام روحوں کا اصلی مستقر وہی ہے وہیں سے روح لاکر انسان کے جسم میں ڈالی جاتی ہے پھر موت کے بعد مؤمنین کی روحیں وہیں واپس ہوجاتی ہیں۔

مقام رضائے حق:

صاحب نفس مطمئنہ اللہ جل شانہ سے اس کے تکوینی وتشریعی احکام پر راضی رہتا ہے جس سے اس کو رضائے حق نصیب ہوتی ہے کیونکہ بندہ کا اللہ تعالیٰ کے تقدیری احکام پر راضی ہونا ہی حق تعالیٰ کی رضا کی علامت اور دلیل ہے اگر حق تعالیٰ اس سے راضی نہ ہوتا تو اس کو رضا بالقضا کی توفیق ہی نہ ہوتی، یہ نفس اپنی موت کے وقت اپنی موت پر بھی راضی ہوتا ہے

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مــــن احب لقاء اللہ احب اللہ لقاء ہ ومن کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاء ہ (جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند فرماتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند فرماتے ہیں) یہ حدیث سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ سے ملاقات تو موت ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے اور موت کسی کو بھی پسند نہیں، ارشاد فرمایا یہ بات نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موت کے وقت مؤمن کو فرشتوں کے ذریعہ اللہ کی رضا وخوشنودی، جنت اور اس کے انعامات کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو مومن کو موت محبوب ہوجاتی ہے اور کافر کو موت کے وقت عذاب وسزا اور اللہ کی ناراضگی کی خبر دیجاتی ہے تو اس کے دل میں موت کی سب سے زیادہ نفرت وکراہیت پیدا ہوجاتی ہے (راوہ البخاری ومسلم، مظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ موت کی محبت وکراہت اس وقت کی معتبر نہیں بلکہ نزع روح کے وقت جو مرنے اور اللہ سے ملنے پر راضی ہے اللہ بھی اس سے راضی ہے، حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب نفس مطمئنہ کو قبض کرنا چاہتے ہیں تو نفس کو اس سے سکون میسر آتا ہے اور وہ اس سے راضی ہوتا ہے اور اللہ اس سے راضی ہوتا ہے اس سلسلہ میں احادیث بھی بکثرت وارد ہیں جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

نیکوں کی صحبت جنتی ہونیکی علامت ہے:

نفس مطمئنہ سے (موت کے وقت یا قبر سے اٹھتے وقت یا حشر میں) یہ کہا جائیگا کہ میرے خاص بندوں میں شامل ہوجا، اور میری جنت میں داخل ہوجا، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی اس میں پہلے مخلص بندوں میں شمول کا حکم ہے پھر جنت میں داخلہ کا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ جنت میں داخلہ مخلص بندوں کی جماعت میں شامل ہونے پر موقوف ہے معلوم ہوا کہ جو لوگ دنیا میں صالحین کی صحبت ومعیت اختیار کرتے ہیں یہ ان کے جنتی ہونے کی علامت ہے اسلئے علوم سے فراغت کے بعد خصوصا کسی متبع سنت شیخ سے بیعت کر کے اس کی معیت وصحبت میں رہنا ہمارے اکابر کا معمول رہا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے: وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین اور حضرت یوسف علیہ السلام کی

دعا ہے: والحقنی بالصٰلحین ،معلوم ہوا کہ صالحین کی معیت وصحبت ایسی نعمت کبریٰ ہے کہ انبیاء علیہ السلام نے بھی اپنی دعاؤں میں اسکا اہتمام فرمایا ہے۔

فائدہ...... وادخلی جنّتی ،اس میں جنت کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف سے منسوب کر کے میری جنت فرمایا جو بڑا اعزاز واکرام ہے اور اس میں اشارہ ہے پایا جاتا ہے کہ جنت میں صرف یہی نہیں کہ ہر طرح کی دائمی راحتیں جمع ہیں بلکہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام ہے۔

یہ خطاب کب ہوگا؟

مومنوں کی ارواح کو یاایّتھا النفس المطمئنة کہہ کر خطاب کب ہوگا؟ بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ قیامت میں حساب کتاب کے بعد یہ خطاب ہوگا اور اوپر کی آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ان میں کفار کے عذاب کا بیان ہوا ہے جو آخرت میں ہوگا ،اور مؤمنوں کے اجر وثواب کو ان کے مقابلہ میں ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ خطاب بھی اسی وقت ہوگا اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ خطاب موت کے وقت دنیا ہی میں ہوتا ہے بہت سی صحیح احادیث اس پر شاہد ہیں۔

اس لئے ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظاہر یہ ہے کہ دونوں وقتوں میں مؤمنوں کی روحوں کو یہ خطاب ہوگا، موت کے وقت بھی پھر قیامت میں بھی ،شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل وقت اس نداء وبشارت کا فزع اکبر کا وقت ہے لیکن موت کے وقت بھی اس کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے وہ احادیث جن سے اس خطاب کا موت کے وقت ہونا معلوم ہوتا ہے ایک تو عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی وہی حدیث ہے جو اوپر گذر چکی ہے اور ایک طویل حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مسند احمد ،نسائی ،اور ابن ماجہ میں ہے ،جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب مومن کی موت کا وقت آتا ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا (جنتی کفن) سامنے کر کے اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں: اخرجی راضية مرضية الى روح الله وريحانه یعنی اس بدن سے ایسی حالت میں نکل کہ تو اللہ سے راضی ہے اور اللہ تجھ سے راضی ہے اور یہ نکلنا اللہ تعالیٰ کی رحمت وجنت کی دائمی راحتوں کی طرف ہوگا۔ (الحدیث)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے ایک دن یہ آیت یاایّتھا النفس المطمئنة آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو مجلس میں موجود تھے کہنے لگے یا رسول اللہ یہ کتنا اچھا خطاب اور اکرام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سن لیجئے فرشتہ موت کے بعد آپ کو یہ خطاب کریگا (ابن کثیر)

چند عجیب واقعات

(۱) حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا طائف میں انتقال ہوا جنازہ تیار ہونے کے بعد ایک ایسا عجیب وغریب پرندہ (کہ اس جیسا کبھی نہ دیکھا گیا تھا) آیا اور نعش میں داخل ہوگیا پھر کسی نے اس کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا جس وقت نعش قبر میں رکھی گئی تو قبر کے کنارہ سے ایک غیبی آواز نے یہ آیت یاایّتھا النفس المطمئنة پڑھی سب نے تلاش کیا کون پڑھ رہا ہے؟ لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا (ابن کثیر)

(۲) امام طبرانی نے کتاب العجائب میں اپنی سند سے قتادہ بن رزین بن ابی ہاشم سے ان کا اپنا واقعہ نقل کیا ہے وہ

فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہمیں بلاد روم میں قید کر کے وہاں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اس کافر بادشاہ نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اسکا دین اختیار کریں اور جو اس سے انکار کرے اس کی گردن ماردی جائیگی، ہم چند آدمی تھے ان میں سے تین آدمی تو جان کے خوف سے مرتد ہو گئے اور بادشاہ کا دین اختیار کر لیا، چوتھا آدمی پیش ہوا تو اس نے اس بادشاہ کا دین (کفر) اختیار کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا اس کا سر کاٹ کر ایک قریبی نہر میں ڈال دیا گیا اس وقت تو وہ سر پانی کی تہ میں چلا گیا اس کے بعد پانی کی سطح پر ابھر آیا اور ان لوگوں کی طرف دیکھ کر اور ان کا نام لے لے کر آواز دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا **یایتھا النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیة ، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی** اس کے بعد پھر پانی میں غوطہ لگا دیا۔

یہ عجیب واقعہ سب حاضرین نے دیکھا اور سنا اور وہاں کے نصاریٰ یہ دیکھ سن کر تقریباً سب ہی مسلمان ہو گئے اور بادشاہ کا تخت ہل گیا وہ تین آدمی بھی جو مرتد ہو گئے تھے پھر مسلمان ہو گئے خلیفہ ابو جعفر منصور نے ہم سب کو اس کی قید سے رہا کرایا۔ (معارف بحوالہ ابن کثیر (ف) ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت **یایتھا النفس** الخ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا تھا، (مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے سب حضرات آیت کے مفہوم میں داخل ہیں) واللہ اعلم۔ بعض صوفیہ نے اس آیت مذکورہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اے وہ نفس جو دنیا پر مطمئن ہو بیٹھا ہے دنیا چھوڑ کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہو اور میرے خاص بندوں میں شامل ہو کر میری جنت میں آجا (مظہری)

تم تفسیر سورة الفجر فالحمدللہ رب الشفع والوتر والصلوة والسلام علیٰ من قال انا سید ولد ادم ولا فخر وعلیٰ اٰلہ وصحبہ مادام البحر والبر

سورة البلد

سورة البلد مكية وهي عشرون آية

(رکوع:۱،آیات:۲۰) سورۃ بلد مکہ میں نازل ہوئی اوراس میں بیس آیات ہیں۔ (کلمات:۸،حروف:۳۲۰)

ربط ومناسبت

اس سورت کا سورۂ فجر سے ربط یہ ہے کہ سورۂ فجر میں اکرام یتیم واطعام مساکین کی ترغیب اور نہ کرنیوالوں کی مذمت تھی اس صورت میں بھی یہی مضمون ایک دوسرے انداز سے ہے،سورۂ فجر میں محبت مال کی مذمت تھی اس سورت میں بھی یہی مضمون ہے،سورۂ فجر میں عاد،ثموداورفرعون جیسے سرکشوں کی ہلاکت کے واقعات بیان ہوئے ہیں تواس سورت میں بھی کفارکودھمکی دی گئی ہے۔

نزول وشان نزول

یہ سورت بھی جمہور کے نزدیک مکہ میں نازل ہوئی،حضرت ابن عباس وحضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔اس سورت کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک شخص کلدہ بن اسید نامی پہلوان تھا،ابوالاشد اس کی کنیت تھی،یہ شخص بڑا قوی ہیکل وزورآور تھا،اس کی قوت کا یہ عالم تھا کہ یہ گائے کا عکاظی چمڑہ یا اونٹ کا چمڑہ اپنے پیر کے نیچے دبالیتا اورلوگوں سے کہتا کہ اس کوکھینچو!لوگ کھینچتے تو وہ چمڑہ پھٹ کرٹکڑے ہوجاتا مگراس کے پیر کے نیچے سے نہ نکلتا،جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کواسلام کی دعوت دی اوراخروی عذابوں سے ڈرایا تو وہ کافر ایمان نہ لایا اورسخت کلامی پراتر آیا کہا کہ آپ مجھ کودوزخ کے ان فرشتوں سے ڈراتے ہیں جن کی تعداد بس انیس ہے،میں توان کوبائیں ہاتھ سے دھکیل دونگا،ایسا کون ہے جومیرا مقابلہ کرسکے؟ آپ مجھ کوایک باغ (جنت) کا لالچ دیتے ہیں،میں نے شادیوں میں اوردعوتوں میں اتنا کثیر مال خرچ کردیا ہے کہ اگرآپ حساب لگائیں تووہ آپ کے اس باغ،سروسامان،نہروں اوردرختوں سے بہت زائد ہے،اسکی ان گستاخانہ باتوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

مضمون سورت

اس سورت کا مضمون یہ ہے کہ آدمی کواپنی قوت وزوراورزرومال پرنازاں اوراپنے جاہ ومرتبہ پرمغرور نہ ہونا چاہئے،بلکہ اپنی ابتداء (ولادت) اورانتہا (موت) پرنظررکھنی چاہئے اپنی اس زندگی کی سختیوں کوبھی انظرانداز نہ کرنا چاہئے، کہ بغیرامدادالٰہی ان سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اورمال اگراخروی مصائب سے چھٹکارادلوادے تو واقعی وہ مفید چیز ہے،ورنہ تواس کی چمک دمک ایک دھوکہ ہے،اس لئے اپنے مال کواچھے مصارف میں صرف کرکے مؤمنین کاملین کے زمرے میں داخل ہوجانا اوراپنے انجام کودرست کرلینا چاہئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (١) وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ (٢) وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (٣) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی، حالانکہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں، اور قسم ہے باپ کی اور اس کی اولاد کی کہ ہم نے انسان کو

لَآ اُقْسِمُ	بِهٰذَا	الْبَلَدِ	وَاَنْتَ	حِلٌّ	بِهٰذَا	الْبَلَدِ	وَوَالِدٍ	وَّمَا وَلَدَ	لَقَدْ خَلَقْنَا	الْاِنْسَانَ
قسم کھاتا ہوں میں	کی اس	شہر	اور آپ	داخل ہونیوالے	میں اس	شہر	اور جنانے والا	اور جسکو جنا	تحقیق پیدا کیا ہم	انسان

فِیْ كَبَدٍ (٤) اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ (٥) يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (٦) اَيَحْسَبُ اَنْ

بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے، کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا، کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ

فِیْ	كَبَدٍ	اَيَحْسَبُ	اَنْ	لَّنْ	يَّقْدِرَ	عَلَيْهِ	اَحَدٌ	يَقُوْلُ	اَهْلَكْتُ	مَالًا	لُّبَدًا	اَيَحْسَبُ	اَنْ
میں	محنت	کیا گمان کرتا ہے	یہ کہ	ہرگز نہ	قادر ہوگا	اوپر اس	کوئی	کہتا ہے	خرچ کیا میں	مال	تہ بہ تہ	کیا گمان کرتا ہے	یہ کہ

لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ (٧) اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ (٨) وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ (٩) وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (١٠)

اس کو کسی نے دیکھا ہی نہیں، کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں، اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے، اور اس کو دونوں واضح راستے بھی دکھادئے

لَّمْ	يَرَهٗ	اَحَدٌ	اَلَمْ	نَجْعَلْ	لَّهٗ	عَيْنَيْنِ	وَ	لِسَانًا	وَّ	شَفَتَيْنِ	وَ	هَدَيْنٰهُ	النَّجْدَيْنِ
نہیں	دیکھا اس	کسی	کیا نہیں	کیں ہم نے	واسطے اس	دو آنکھیں	اور	زبان	اور	دو ہونٹ	اور	راہ دکھائی ہم اس	دو راہیں

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (١١) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ (١٢) فَكُّ رَقَبَةٍ (١٣) اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ يَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (١٤)

پھر بھی وہ گھاٹی میں داخل نہ ہوا، اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی کیا ہے؟ گردن چھڑا دینا ہے، یا فاقہ کے دن کھانا کھلانا

فَلَا	اقْتَحَمَ	الْعَقَبَةَ	وَ	مَا	اَدْرٰىكَ	مَا	الْعَقَبَةُ	فَكُّ	رَقَبَةٍ	اَوْ	اِطْعٰمٌ	فِیْ	يَوْمٍ	ذِیْ مَسْغَبَةٍ
پس نہیں	داخل ہوا	گھاٹی	اور	کیا	جانے تو	کیا ہے	گھاٹی	چھڑانا	گردن	یا	کھانا کھلانا	میں	دن	والا بھوک

يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (١٥) اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (١٦) ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی خاک نشین محتاج کو پھر وہ ان لوگوں میں سے ہوتا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی تاکید

يَّتِيْمًا	ذَا مَقْرَبَةٍ	اَوْ	مِسْكِيْنًا	ذَا مَتْرَبَةٍ	ثُمَّ	كَانَ	مِنَ	الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وَتَوَاصَوْا	بِالصَّبْرِ
یتیم	قرابت دار	یا	مسکین	خاک افتادہ	پھر	ہوا	سے	جو ایمان لائے	اور باہم نصیحت کی	صبر کی

وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (١٧) اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (١٨) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ

اور رحم کی تاکید کرتے رہے، وہی لوگ بڑے خوش نصیب ہیں، اور جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا

وَتَوَاصَوْا	بِالْمَرْحَمَةِ	اُولٰٓئِكَ	اَصْحٰبُ	الْمَيْمَنَةِ	وَ	الَّذِيْنَ	كَفَرُوْا	بِاٰيٰتِنَا	هُمْ
اور باہم نصیحت کی	رحم کھانے کی	یہی وہ لوگ	صاحب	یمین (خوش نصیب)	اور	جن لوگوں	کفر کیا	ہماری آیات	وہ

اَصۡحٰبُ الۡمَشۡئَمَۃِ(۱۹) عَلَیۡہِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَۃٌ(۲۰)

وہ بد بخت ہیں، ان پر آگ بند کر دی جائیگی۔

مُّؤۡصَدَۃٌ	نَارٌ	عَلَیۡہِمۡ	اَصۡحٰبُ الۡمَشۡئَمَۃِ
مونڈی (بند) کی ہوئی	آگ	ان پر	نحوست والے، بدبخت

لغات:

اَلۡبَلَدَ شہر جمع بلاد، بَلَدَ بُلُوۡدًا (ن) اقامت کرنا، شہر بنانا، بَلَدَ بَلَادَۃً (ک) سست ہونا، کند ذہن ہونا (سؔ) کشادہ ابرو ہونا۔ حِلٌّ مصدر (ض) حلال ہونا، اَلۡحِلُّ مکہ معظمہ کے اردگرد حرم محترم کے علاوہ جگہ، کسی جگہ میں اترنے والا، کَبَدٍ دشواری، سختی، مشقت کَبَدَ کَبِدٌ جگر (ن ض) جگر پر مارنا کَبِدَ کَبَدًا (س) جگر میں درد ہونا، لُبَدًا مرّ فی سورۃ الجن، لِسَانًا زبان جمع لِسَانَات، اَلۡسِنَۃٌ اَلۡسُنٌ (س) زبان آور ہونا، فصیح ہونا، شَفَتَیۡنِ دو ہونٹ شَفَۃٌ کا تثنیہ، بعض کے نزدیک اس کا لام کلمہ ہا ہے، کہ اصل شَفَھَۃٌ تھا، ہائے اصلیہ حذف کی گئی اور ہائے تانیث باقی رکھی گئی اور بعض کے نزدیک اس کی اصل شَفَوَۃٌ تھی واؤ کو حذف کر کے اس کا فتحہ ما قبل فاء کو دیدیا گیا، ج شِفَاۃٌ وشَفَوَاتٌ ہے، اَلنَّجۡدَیۡنِ النَّجۡد کی تثنیہ ہے، دو روشن راستے یعنی نیکی اور بدی کے راستے، ج اَنۡجُد، اَنۡجَاد، نِجَاد، نُجُوۡد، نُجُد (ن) جاری ہونا، راستہ کا روشن ہونا، غلبہ پانا (س) تھک جانا، تھک کر پسینہ آ جانا (ک) دلیر ہونا، اِقۡتَحَمَ افتعال سے داخل ہونا، گھس پڑنا، جھونک دینا، قَحَمَ قُحُوۡمًا (ن) بے سوچے سمجھے کسی معاملہ میں گھس پڑنا، قریب ہونا (ف) طے کرنا، اَلۡعَقَبَۃَ گھاٹی، پہاڑ میں چڑھائی کا دشوار گذار راستہ، ج عُقَب اور عِقَاب، عَقَبَ عَقۡبًا (ن ض) ایڑی مارنا، پیچھے آنا، جانشین ہونا، فَکُّ (ن) چھڑانا، جدا جدا کرنا، گرہ کھولنا وغیرہ، رَقَبَۃٍ گردن ج رِقَاب، رَقَبَات، رُقُبٌ، اَرۡقُبٌ (ن) نگہبانی کرنا، انتظار کرنا، مَسۡغَبَۃٍ اسم مصدر، بھوک سَغَبَ سَغۡبًا وَسُغُوۡبًا وسَغَابَۃً ومَسۡغَبَۃً (س ن) بھوکا ہونا، مَتۡرَبَۃٍ اسم سخت ناداری، ایسی مفلسی جو زمین سے چمٹا دے، تُرَاب خاک (س) محتاج ہونا، خاک آلود ہونا، تَوَاصَوۡا تفاعل سے صیغہ جمع مذکر غائب مضارع، ایک دوسرے کو وصیت اور نصیحت کرنا، وَصٰی وَصۡیًا (ض) ملنا، مرتبہ کے بعد خسیس ہونا، اَلۡمَیۡمَنَۃ سیدھا ہاتھ، دائیں سمت، اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ، دائیں سمت یا ہاتھ والے، اہل سعادت، مَشۡئَمَۃ اس کی ضد ہے، مُؤۡصَدَۃ افعال سے اسم مفعول اِیۡصَاد بند کرنا، وَصَدَ وَصۡدًا (ن) ثابت ہونا، اقامت کرنا، پائیدار ہونا، بننا، وَصِیۡد، وَصِیۡدَۃ چوکھٹ، صحن، باڑہ۔

ترکیب:

اُقۡسِمُ بِھٰذَا الۡبَلَدِ کی ترکیب: اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ کی طرح ہے۔ وَحالیہ۔ اَنۡتَ مبتدا حِلٌّ اپنے متعلق بِھٰذَا الۡبَلَدِ سے ملکر خبر، جملہ اسمیہ خبریہ، ھٰذَا الۡبَلَد سے حال ہے (وإنما قید القسم بحلوله علیه السلام للاظهار بمزید فضلها وللاشعار بأن شرف المکان بشرف أهله) بعض کا قول ہے کہ یہ جملہ قسم اور مقسم علیہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے، اس صورت میں واؤ اعتراضیہ ہوگی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی و وعدۂ فتح، وَاَنۡتَ حِلٌّ کا مفہوم ہوگا۔ والتفصیل فی التفسیر. واؤ عاطفة علی الاصح والدِ میں تنوین بعوض مضاف الیہ معطوف قسم پر۔ وَ

عاطفہ مَا موصولہ یا موصوفہ وَلَدَ فعل ضمیر فاعل جملہ فعلیہ صلہ یا صفت و العائد مفعولہ محذوف اس کا عطف بھی مثل سابق ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی کَبَدٍ فعل فاعل مفعول بہ اور متعلق علی الترتیب مل کر جملہ فعلیہ جواب قسم، اَ ہمزہ توبیخ وزجر کے لئے یَحْسَبُ فعل فاعل ضمیر فاعل، اَنْ مخففۃ من المثقلۃ اسم محذوف ای اَنَّهُ لَنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ فعل متعلق اور فاعل علی الترتیب جملہ فعلیہ بتاویل مفرد مجرور۔ اَنَّ اپنے اسم وخبر سے مل کر بتاویل مفرد یَحْسَبُ کے دومفعولوں کے قائم مقام ہوا۔ جملہ فعلیہ، یہاں پر وقف لازم ہے، آگے سے اس کا تعلق نہیں۔ یَقُوْلُ فعل ضمیر فاعل اَهْلَکْتُ فعل بافاعل مَالًا لُّبَدًا موصوف صفت مل کر مفعول بہ، جملہ فعلیہ مقولہ مفعول بہ۔ یَقُوْلُ اپنے فاعل ومفعول بہ سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔ اَیَحْسَبُ الخ کی ترکیب اَیَحْسَبُ الخ سابق کے مثل ہے۔ اَ ہمزہ استفہام انکاری کے لئے، لَمْ نَجْعَلْ فعل بافاعل لَهٗ متعلق عَیْنَیْنِ اپنے دونوں معطوفات وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ، سے مل کر مفعول بہ جملہ فعلیہ، معطوف علیہ۔ وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ فعل با فاعل اور مفعولین علی الترتیب جملہ فعلیہ معطوف۔ فَ تفریعیہ لَا نافیہ اقْتَحَمَ فعل ضمیر غائب فاعل۔ الْعَقَبَةَ مفعول فیہ جملہ فعلیہ۔ **اعلم أن لاالنافية لا تستعمل فی الماضی إلّا مكررة وإنما لم تكرر فی هٰذا الكلام الأفصح لأنه لمافسر الاقتحام بثلٰثة أشياء صار كأنه أعيد "لا" ثلث مرات تقديره فلا فک رقبة ولاأطعم مسكينا الخ**

وَمَآ اَدْرٰکَ الخ مر مثلہ، فَکُّ رَقَبَةٍ مرکب اضافی معطوف علیہ اَوْ عاطفہ اِطْعٰمٌ مصدر یَوْمٍ اپنی صفت ذِیْ مَسْغَبَةٍ (مرکب اضافی) سے مل کر مجرور فِی متعلق مصدر یَّتِیْمًا موصوف ذَا مَقْرَبَةٍ مرکب اضافی صفت۔ پھر مرکب توصیفی معطوف علیہ۔ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ اسی طرح معطوف۔ معطوفین مل کر اِطْعَامٌ کا مفعول بہ، اور وہ اپنے متعلق ومفعول بہ سے مل کر معطوف۔ معطوفین مبتداء محذوف هُوَ کی خبر، جملہ اسمیہ ای اقتحام العقبة هو فک رقبة الخ ثُمَّ عاطفہ کَانَ تامہ ضمیر غائب فاعل مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ متعلق جملہ فعلیہ۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ اور اس سے اگلے جملہ کا عطف اٰمَنُوْا پر ہے۔ اُولٰٓئِکَ مبتدا اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ مرکب اضافی خبر جملہ اسمیہ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا موصول وصلہ مل کر مبتدا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ خبر عَلَیْهِمْ متعلق محذوف خبر مقدم نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ مرکب توصیفی مبتدا موخر۔

تفسیر:

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (میں قسم کھاتا ہوں اس شہر مکہ کی) حرف لَا اس جگہ زائد ہے، اور قسموں میں یہ حرف زائد لانا عرب کے محاورہ میں مشہور ہے اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حرف لَا مخاطب کے خیال باطل کی تردید کے لئے قسم کے شروع میں لایا جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "جو تم نے خیال باندھ رکھا ہے وہ صحیح نہیں بلکہ میں قسم کے ساتھ کہتا ہوں کہ حقیقت وہ ہے جو میں بیان کرتا ہوں" اور اَلْبَلَدِ سے مراد مکہ مکرمہ ہے، "سورۂ وَالتِّیْنِ" میں بھی اسی شہر مکہ کی قسم کھائی گئی۔ اور اس میں صفت "الاَمِیْن" کا اضافہ ہے وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ۔

شہر مکہ کی قسم کیوں کھائی گئی:

شہر مکہ کی قسم کھا کر اس کی افضلیت اور عظمت وشرافت کو ظاہر کرنا ہے، مکہ معظمہ کو دنیا کے شہروں کے مقابلہ میں فضیلت وعظمت بہت سی وجوہ سے حاصل ہے، (۱) وہاں پر بیت اللہ ہے (۲) وہ مقام امن ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا (۳) وہ مرجع خلق ہے، ہر سال دنیا بھر سے لاکھوں انسان حج وعمرہ کے لئے وہاں جاتے ہیں (۴) وہ حج وعمرہ کا مقام ہے،

(۵) دنیا کی سب سے پہلی بنا (کعبہ) وہیں ہے، اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ (۶) وہ شہر قبلۂ عالم ہے (۷) وہاں مقام ابراہیم ہے (۸) زمزم ہے (۹) وہاں جنت کا پتھر (حجر اسود) ہے (۱۰) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سراپا سعادت وہیں ہوئی (۱۱) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت وہیں ہوئی (۱۲) قرآن مقدس کا نزول وہیں شروع ہوا (۱۳) اللہ کے نزدیک تمام روئے زمین میں سب سے زیادہ محبوب و برتر مکہ مکرمہ ہے حضرت عبداللہ بن عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت مکہ معظمہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ خدا کی قسم تو ساری زمین سے اللہ کے نزدیک بہتر اور محبوب تر ہے، اور اگر مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کر دیا جاتا تو میں تیری زمین سے نہ نکلتا۔ (مظہری بحوالۂ ترمذی و ابن ماجہ) (۱۴) علاوہ ازیں شہر مکہ تمام روئے زمین کی اصل ہے یہیں سے پوری زمین پھیلائی گئی تھی۔

حِلّ کے معنی:

لفظ حِلّ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ بمعنی حلول ہو، جس کے معنی باب نصر سے کسی شیٔ کے اندر رہنے، سمانے اور اترنے کے آتے ہیں، اس اعتبار سے حلّ کے معنی اترنے والے اور رہنے والے کے ہوں گے، اور مطلب آیت شریفہ کا یہ ہوگا کہ شہر مکہ خود بھی محترم و مقدس ہے، خصوصاً جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس شہر میں تشریف فرما ہیں تو مکین کی عظمت سے بھی مکان کی فضیلت بڑھ جاتی ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے سے اس شہر کی عظمت و حرمت میں چار چاند لگ گئے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ حل بمعنی حلت ہو، باب ضرب سے، اس کے معنی حلال ہونے کے آتے ہیں، اس اعتبار سے لفظ حل کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ آپ کو کفار مکہ نے حلال سمجھ رکھا ہے، کہ وہ آپ کے قتل کے درپے ہیں، حالانکہ وہ لوگ خود شہر مکہ میں کسی شکار کو بھی حلال نہیں سمجھتے، چہ جائیکہ کسی انسان کے قتل کو حلال سمجھتے ہوں، مگر ان کا ظلم اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ جس مقدس مقام پر کسی جانور کا قتل بھی جائز نہیں، اور خود ان کا عقیدہ بھی یہی ہے، وہاں انہوں نے اللہ کے محبوب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل و خون کو حلال سمجھ لیا ہے، دوسرے معنی (حِلّ کے) یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کے لئے حرم مکہ میں قتال مستقبل قریب میں حلال ہونے والا ہے، چنانچہ فتح مکہ میں ایک ساعت کے لئے آپ سے احکام حرم اٹھا لئے گئے تھے، اور کفار کا قتل آپ کے لئے حلال کر دیا گیا تھا، آیت کے الفاظ میں تینوں معنی کی گنجائش ہے، صاحب مظہری نے تینوں احتمالات ذکر کئے ہیں، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تیسرے معنی کو اختیار کیا ہے، اور یہی معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر، ابی صالح، عطیہ، ضحاک، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم اجمعین وغیرہ سے منقول ہیں۔

یہ قسم کفار کے مطالبہ کا جواب بھی ہے:

پچھلی قوموں کی ہلاکت کے واقعات سن کر کفار مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو ہم پر بھی عاد و ثمود جیسا عذاب نازل کرا دیجئے، اور ان کی بستیوں کی طرح مکہ کو بھی برباد کرا دیجئے، حِلّ کی پہلی توجیہ پر جواب یہ کہ مکہ کو ایسی خصوصیات مثلاً وہاں کعبہ ہونا، اول معبد ہونا وغیرہ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے حاصل ہیں کہ ہم اس کو غارت نہ کریں گے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف رکھتے ہیں وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ دوسری توجیہ پر جواب اس طرح ہے کہ یہ امن کا شہر ہے، محرم محترم ہے، اس کو یہ بھی

تسلیم کرتے ہیں، پھر ہم نے اس کو محترم و ماموں بنایا ہے، تو ہم خود ہی اس کو کیسے تباہ کریں؟ لیکن اہل مکہ اس کا دھیان نہیں رکھتے، اپنے عقیدہ کو پامال کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم ڈھاتے ہیں، اور مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کے اصول سے بغاوت کرتے ہیں، تیسری توجیہ پر مطلب یہ ہوگا کہ ذرا صبر کیجئے عنقریب ہم آپ کے لئے مکہ کو حلال کئے دیتے ہیں، اور ان ظالموں کی گردنیں مارنے کا حکم دئے دیتے ہیں، گویا ان کے مطالبہ کی منظوری ہو چکی ہے، چنانچہ فتح مکہ کے دن اس حکم کو نافذ کر دیا گیا۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ وَالِدٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، جو سب انسانوں کے باپ ہیں۔ اور مَا وَلَدَ سے ان کی اولاد مراد ہے، جو ابتدائے دنیا سے قیامت تک ہوگی۔ اس طرح اس لفظ میں حضرت آدم اور تمام بنی آدم کی قسم ہوگئی۔ بعض نے والد و ولد سے عام معنی مراد لئے ہیں، کوئی بھی اولاد ہو اور کوئی بھی ولد ہو، اور والد سے بھی مراد ذو ولد ہے جو ماں اور باپ دونوں کو شامل ہے، ایک تیسرا قول یہ بھی ہے کہ والد سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ولد سے ان کی نسل کے پیغمبر مراد ہیں، خصوصاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کیونکہ مَا برائے تکثیر تعظیم پر دال ہے، اور بمعنی من ہے، جیسے واللہ اعلم بمــا وضعت میں ما بمعنی من ہے، اور سب سے معظم اولاد ابراہیم علیہ السلام میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذات گرامی ہے۔ واللہ اعلم

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (بیشک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے) مطلب یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ پوری عمر محنتوں اور مشقتوں میں رہتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، کہ ابتدائے حمل سے رحم مادر میں محبوس رہا، پھر ولادت کے وقت کی محنت و مشقت برداشت کی، پھر ماں کا دودھ پینے کے زمانہ کی اور دودھ چھوٹ جانے کے بعد کی محنت، پھر اپنے معاش اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کی مشقت، پھر بڑھاپے کی تکالیف پھر موت کی پھر قبر کی پھر حشر کی مصیبتیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اعمال کی جوابدہی پھر جزا و سزا۔ یہ سب دور انسان پر محنتوں ہی کے آتے ہیں، اور مشقت کے حالات گو انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، حیوانات بھی ان میں شریک ہیں، مگر انسان کی محنت و مشقت کو خاص طور پر اس لئے بیان فرمایا گیا کہ اول تو وہ سب جانوروں سے زائد شعور و ادراک رکھتا ہے، اور محنت کی تکلیف اور اس کا احساس بھی بقدر شعور ہوتا ہے، دوسرے سب سے بڑی اور آخری محنت و مشقت محشر میں حساب کتاب اور سزا کی صرف اسی کو ہوگی، دوسرے جانور اس میں اس کے شریک نہیں ہیں، زائد سے زائد حیوانات کو زندہ کر کے آپس میں ان کے ایک دوسرے کے بدلے ہو جائیں گے، اور ان سب کو مٹی بنا دیا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ کوئی مخلوق اتنی مشقتیں نہیں جھیلتی جتنی انسان برداشت کرتا ہے، حالانکہ جسم و جثہ میں وہ اکثر حیوانات سے کمزور ہے، ظاہر یہ ہے کہ انسان دماغی قوت اور عقل و ادراک میں سب سے بڑھ کر ہے، اسی لئے اس کو سخت دشواریوں میں مبتلا کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

قسمیں اور ان کے جواب میں مناسبت:

مکہ مکرمہ اور والد و ولد کی جو قسمیں کھائی گئیں اور ان کا جواب لَقَدْ خَلَقْنَا ...... ہے اس میں سوال یہ ہے کہ ان میں مناسبت کیا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ شہر مکہ جس کی قسم کھائی گئی ہے تمام روئے زمین کی اصل ہے یہیں سے پوری زمین پھیلائی گئی ہے اور زمین سے انسان پیدا ہوا ہے، یعنی اول انسان (آدمؑ) خاک کا پتلہ ہے، اور ہر انسان کی پیدائش کا مادہ بھی خاک سے منتقل ہوتا ہوا آیا ہے، اور رحم میں بھی اسکے مدفن کی مٹی ملائی جاتی ہے جیسا کہ سابق میں اس کی تفصیلات گذر چکی

ہیں، حاصل یہ ہے کہ سرزمین مکہ انسان کی اصل الاصل ہوئی، اور شہر مکہ مشقتوں کا مرکز ہے اسلئے کہ: (۱) سرزمین مکہ ریگستان وسنگلاخ اور نا قابل زراعت ہے، وہاں پانی بھی گہرائی میں ہے اور اس کی اکثر جگہوں کا پانی کھاری بھی ہے وہاں کنواں کھودنا یا نل گاڑنا بہت دشوار ہے، اسی لئے زمانۂ قدیم میں خشک سالی وافلاس کی فراوانی رہی ہے۔ (۲) وہاں شدید گرمی ہوتی ہے، پہاڑوں اور ریت کے تودوں کی تپش اور ہلاکت خیز لوؤں کے جھونکوں کی وجہ سے موسم گرما نہایت صبر آزما ہوتا ہے، عیاشوں اور تفریح بازوں کے لئے وہ خطہ قطعاً نا قابل التفات ہے، اسی لئے زمانۂ قدیم میں کسی بادشاہ نے اس کو فتح کر کے وہاں حکومت کرنے کا ارادہ نہیں کیا، جو وہاں گیا یا جاتا ہے وہ حج وزیارت کی نیت سے جاتا ہے۔ (۳) حرمین کی زیارت کے لئے جو لوگ جاتے ہیں ان کے بحری وبری اور فضائی سفروں کی محنت ومشقت بھی کسی پر مخفی نہیں۔ (۴) بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اختلافات کی مشقتیں اور رات دن کی مصیبتیں بھی سب پر ظاہر ہیں۔

اسی طرح والد (ماں باپ) کی مشقتیں اولاد کے سلسلہ میں سب کو معلوم ہیں، حمل ووضع اور پرورش کی سختیوں سے کون واقف نہیں۔ اور والد سے مراد اگر آدمؑ یا ابراہیمؑ ہیں تو ان کے شدید مصائب اور بے مثال مجاہدے بھی سب کو معلوم ہیں، اسی طرح ولد کی مشقتیں، حمل کی قید و بند، ولادت کے خطرات، بچپن کی محتاجی وغیرہ سب پر عیاں ہیں، اور ولد سے حضرت اسماعیلؑ یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں تو حضرت ذبیح اللہ وحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہما وسلم کی مشقتوں، مصیبتوں اور عظیم مجاہدوں سے کون بے خبر ہے؟ غرض یہ تمام نمونے اور دلائل ہیں اس دعوے کے کہ ''ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے'' اس اجمالی تحریر سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ قسم اور جواب قسم میں نہایت مناسبت ہے۔

ہر انسان محنت کے لئے تیار رہے:

اس قسم وجواب قسم میں انسان کو اس بات پر بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ انسان کی یہ خواہش کہ اس کو کسی تکلیف سے سابقہ نہ پڑے، اور وہ راحت وآرام ہی میں رہے۔ یہ اس کا خیال خام اور فطرت کے خلاف ایسا جذبہ ہے جس کا حصول ممکن نہیں۔ اس دنیا میں یہ ضروری ہے کہ ہر انسان محنت ومشقت اور رنج وغم میں مبتلا ہو ؎

دریں دنیا کسے بے غم نباشد — اگر باشد بنی آدم نباشد

اور جب رنج وکلفت کا پیش آنا ضروری ہے، تو عقلمند کو چاہئے کہ وہ محنت اس چیز کے لئے کرے جو ہمیشہ اس کے کام آنیوالی ہو اور اس کے لئے دائمی راحت کا سامان بنے اور وہ صرف ایمان وعمل کی محنت ہے، لہٰذا ہر آدمی کو اس عظیم مقصد کے لئے ہر وقت چاق وچوبند رہنا چاہئے۔

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ يَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ اَحَدٌ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پاسکے گا یہاں سے منکر آخرت غافل وجاہل انسان کی چند جاہلانہ خصلتوں کا بیان فرما کر اس کے خیالات فاسدہ کی تردید کی گئی ہے، ان آیات میں مذکورہ افعال کا فاعل الانسان ہے، اس سے جنس انسان (عام انسان) بھی مراد ہوسکتی ہے، لیکن خارج میں کلی کا وجود وتحقق چونکہ افراد واشخاص کے ضمن ہی میں ہوسکتا ہے اس لئے بعض خصوصی افراد کا لحاظ کر کے ایسے مخصوص لوگ اس سے مراد ہوں گے، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ایذا پہنچتی تھی، خواہ ابو الاشد ہو یا ولید بن مغیرہ ہو، اور اگر الانسان میں الف لام عہد کا ہے تو اس سے مراد خاص کافر (ابو الاشد) ہوگا، بہرحال ان آیات میں ولید وابو الاشد جیسے کفار کو زجر اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور دلاسا مقصود ہے۔

آیات کا مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی بھر محنت کش اور دکھیا رہنے کے باوجود غرور میں مبتلا ہے، اور وہ اس خیال فاسد میں گرفتار ہے کہ میں کسی کے قابو میں نہ آؤں گا، مجھے کوئی سزا نہیں دے سکے گا، وہ حشر ونشر اور حساب، کتاب کا منکر ہے، تھوڑے سے دنیوی اسباب پر گھمنڈ کر کے یوں کہتا ہے کہ وہ اور ہی لوگ تھے جن کو عذاب سے ہلاک کر دیا گیا، میں نے تو بہت مال خرچ کر کے اپنی حفاظت کے اسباب مہیا کر لئے ہیں، اپنی عزوجاہ، پارٹی، اسباب واسلحہ وغیرہ پر اکڑنیوالا انسان کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال صرف کر دیا ہے، اور اپنی حفاظت وقیام دوام کا انتظام کرالیا ہے، اس بیوقوف کو یہ پتہ نہیں کہ وہ ایک قطرہ منی سے پیدا ہوا ضعیف البنیان انسان ہے جو ہر قدم اور ہر سانس میں آج بھی اپنے رب کا محتاج ہے، اس کی کمزوری سے سب واقف ہیں، وہ یہ بھی خیال نہ کرے کہ میرے اعمال بد کو، ریاء کاری ومکاری، فخر وغرور وکبر کو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عداوت ومخالفت اور اس کے کفر وشرک وسرکشی کو کوئی نہیں جانتا، اس کا خالق اس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔

آنکھیں، زبان اور ہونٹ عظیم انعامات ہیں:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ...... (کیا ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے) اوپر کی آیات میں انسان کو اس کی غفلت وجہالت پر تنبیہ تھی، کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس پر حق تعالیٰ کو بھی قدرت نہیں، اور اس کے اعمال بد کو کوئی دیکھنے والا نہیں، اسلئے وہ مؤاخذہ سے غافل وبے فکر ہے، ان دونوں آیتوں میں ان چند ایسی نعمتوں کا ذکر ہے کہ اگر انسان ان ہی میں غور وفکر کرے تو اس کو حق تعالیٰ کی بے مثال صنعت وحکمت اور قدرت ورحمت کا مشاہدہ ونظارہ کھلی آنکھوں ہو جائے، ان میں سے اول دو آنکھوں کا ذکر فرمایا، آنکھ کے نازک پردے، نازک شرائین (رگیں) ان میں قدرتی روشنی پھر آنکھوں کی وضع وہیئت اور ان نازک ترین اعضاء کی حفاظت کا سامان پپوٹوں اور پلکوں کے ذریعہ جو آٹو میٹک (خودکار) مشین کی طرح آنکھوں کی ہمہ وقت حفاظت میں مصروف ہیں، جب کوئی مضرت رساں چیز سامنے آتی ہے تو یہ پردے بلا اختیار خود بخود آنکھوں کو چھپا لیتے ہیں، پلکوں کے بال گرد وغبار اور تنکوں سے آنکھوں کی حفاظت کرتے ہیں، آنکھوں کے اوپر سے بھوؤں کے بال محافظ ہیں، تاکہ اوپر سے آنیوالی چیز براہ راست آنکھوں میں نہ پہونچ جائے، ان کو چہرہ میں اس طرح فٹ کیا گیا کہ ان کے چاروں طرف سے ہڈیوں کا ایک ایسا دائرہ بنا دیا گیا کہ انسان چہرے کے بل گر جائے یا اس کے چہرہ پر کوئی چیز آپڑے تو اوپر نیچے کی ہڈیاں آنکھوں کی محافظ بن جائیں۔

دوسری چیز زبان ہے، اس کی عجیب وغریب تخلیق اور دل کی باتوں کی ترجمانی جو اس پر اسرار وخودکار مشین کے ذریعہ ہوتی ہے، اس کے اس حیرت انگیز طریقۂ کار پر غور کیجئے کہ دل میں ایک مضمون آیا، دماغ نے اسپر غور کیا، اسکے لئے عنوان والفاظ تیار کیجئے اور وہ الفاظ اس زبان کی مشین سے نکلنے لگے، یہ اتنا بڑا کام کتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ سننے والے کو یہ احساس بھی نہیں ہوسکتا کہ ان الفاظ کے زبان پر آنے میں اس کے پیچھے کتنی مشینوں نے کام کیا ہے، تب یہ کلمات زبان پر آئے ہیں۔

تیسری چیز شفتین ہیں، شفتین یعنی ہونٹوں کا ذکر اسلئے بھی فرمایا کہ وہ زبان کے کام میں بڑے مددگار ہیں، آواز حروف کی ممتاز شکلیں وہی بناتے ہیں اور شاید ان کا ذکر اسلئے بھی ہوا ہے کہ قدرت نے زبان ایسی سریع العمل مشین بنائی ہے، کہ پل بھر میں اس سے ایسا کلمہ بھی بولا جاسکتا ہے جو اس کو جنت کے اعلیٰ مقامات پر پہونچادے، مثلاً کلمۂ ایمان بولدے، یا دنیا میں بدترین دشمن کا محبوب بنادے، مثلاً پچھلے قصور کو معافی یا صلح کی عاجزانہ درخواست وغیرہ، اور اتنے ہی وقفہ میں ایسا کلمہ

بھی بولا جاسکتا ہے جو بولنے والے کو جہنم کا مستحق بنادے جیسے کلمۂ کفر، یا بہترین دوست کو دشمن بنادے، جیسے گالی گلوچ وغیرہ۔

الغرض جس طرح زبان میں منافع بیشمار ہیں اس کی ہلاکت آفرینی اور مضرتیں بھی بہت ہیں، گویا زبان ایسی تیز تلوار ہے کہ وہ دشمن پر بھی چل سکتی ہے، اور اس سے اپنا گلا بھی کاٹا جاسکتا ہے، اس لئے اس حکیم مطلق نے اس تلوار کو دو ہونٹوں کے غلاف اور میان کے اندر رکھا ہے، اس جگہ ہونٹوں کے ذکر میں یہ اشارہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس مالک نے انسان کو زبان دی تو اس کو روکنے اور بند کرنے کے لئے ہونٹ بھی دئے ہیں، اس لئے اس کا استعمال احتیاط سے کیا جائے، بے موقع اس کو ہونٹوں کے میان سے نہ نکالا جائے ؎

دو چیز از طیرۂ عقل است لب فر بستن　　　بوقت گفتن وگفتن بوقت خاموشی

(دو چیزیں حماقت کی نشانیاں ہیں، کہنے کے وقت خاموشی اور خاموشی کی وقت بکواس کرنا)

ترمذی میں عقبہ بن عامر کی روایت ہے، انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ نجات کس چیز میں ہے؟ ارشاد فرمایا: اپنی زبان بند کرلو اور اپنے گھر میں گوشہ نشین بن جاؤ، اور اپنے گناہوں پر رویا کرو، بزرگوں کا مقولہ ہے کہ زبان سانپ ہے، اور اس کا بل منہ ہے، اسی کو کسی شاعر نے اس طرح کہا ہے ؎

اِحْفَظْ لِسَانَکَ اَیُّهَا الاِنْسَان　　　لَا یَلْدَ غَنَّکَ اِنَّهُ ثُعْبَانُ

یعنی اے انسان اپنی زبان کی حفاظت رکھ۔ یہ سانپ ہے تجھے ڈس نہ لے

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حدیث میں حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد مذکور ہے، کہ اے ابن آدم اگر تیری زبان ناجائز باتوں کیلئے تجھ سے کشاکش کرے تو میں نے اس کے خلاف تیری مدد کیلئے دو ڈھکن (ہونٹ) تجھے دیدیئے ہیں، تو اسے ان ڈھکنوں میں بند کردے، (اور ناجائز بات زبان سے نہ نکال) اور اگر تیری نگاہ ناجائز چیزوں کی طرف تجھ کو کھینچے تو میں نے تیری مدد کیلئے دو غلاف دیدئے ہیں، تو ان غلافوں میں ان کو بند رکھ، اور اگر تیری شرمگاہ تجھ کو ناجائز امور کی طرف لیجانا چاہے تو میں نے اس کے مقابلہ میں تجھ کو دو پردے (پیر) دیدیئے ہیں ان کے درمیان اس کو محفوظ رکھ۔

ان تینوں اعضاء کی تخصیص کیوں کی گئی؟

یہاں خاص طور پر ان تین اعضاء ہی کو کیوں ذکر کیا گیا؟ اس کی مذکورہ وجوہ کے علاوہ اور بہت سی وجوہ ہیں، جن میں سے چند مندرجۂ ذیل ہیں۔ (۱) یہ تینوں نعمتیں معرفت ربوبیت وقدرت کے اولین باب ہیں، کیونکہ جب بچہ ماں کے پیٹ سے اس دنیا میں آتا ہے تو وہ بے سروسامان مسافر بھوکا ہوتا ہے، اس کی پرورش کا قدرتی سامان ماں کا دودھ ہوتا ہے، دودھ پینے میں یہ تینوں اعضاء کام آتے ہیں، آنکھوں سے دودھ پلانیوالی کو دیکھتا ہے، ہونٹوں سے پستانوں کو چوستا اور زبان کی مدد سے دودھ کا ذائقہ لیکر اس کو حلق میں اتارتا ہے، اس طرح وہ اپنے پیٹ کو بھرتا ہے، ایسا انسان جو دنیا میں آکر اپنی کمائی سے پیٹ نہ بھر سکتا ہو اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کے سہارے پرورش پاکر قوت پاتا ہو، پھر اس قوت کے ذریعہ مال کما کر وہ اتراتا پھرے، یہ اس کے لئے نہایت نازیبا ہے۔ (۲) جس انسان کا آیات میں ذکر ہے اس کو اللہ نے اندھا نہیں بنایا وہ آنکھوں سے دیکھ لے کر کہ وہ مال کو بیجا خرچ کررہا ہے یا بجا صرف کررہا ہے، یہ بات گویا ایسی محسوس ہے کہ آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرسکتا ہے، اگر خود آنکھوں سے کام نہیں لیتا تو وہ کسی سے پوچھ لے، زبان اور ہونٹ اسی لئے بنائے ہیں۔ (۳) اللہ

نے آنکھیں اور زبان دی ہیں جن کی وجہ سے اس نے علم و ہنر سیکھے اور مال کمایا، اگر قدرت یہ آلات انسان کو نہ دیتی تو وہ کس طرح مال کمالیتا، جس پر انسان بیجا اکڑتا ہے۔ (۴) انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو کوئی دیکھ نہیں رہا ہے، جس نے تجھ کو آنکھیں دیکر بینا بنادیا کہ تو کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو کیا خالق کائنات ایسا بینا نہیں کہ ساری کائنات کی عیاں اور نہاں چیزوں کو دیکھ سکے اور اگر دل میں یہ شیطانی خیال پیدا ہو کہ وہ دیکھتا تو ہوگا لیکن میرے دل میں چھپی ہوئی نیتوں کو کس طرح جان سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک زبان اور دو ہونٹ دیے ہیں جو دل کے اسرار اور بھیدوں کو ظاہر کردیتے ہیں تو وہ خالق جس نے زبان کو اسرار قلب مطلع فرمایا اور ان کو ظاہر کرنیکی قدرت بخشی وہ کیوں دلوں کے بھیدوں پر مطلع نہ ہوگا؟

(فائدہ) حکماء کا قول ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو دو آنکھیں اور ایک زبان دیکر تنبیہ فرمادی کہ بولنا دیکھنے سے کم ہونا چاہئے، دیکھنا تو خیر و شر سب کو عام ہے لیکن بولنا خیر کے ساتھ مخصوص ہے، کلمۂ شر بولنے کی اجازت نہیں، اسی لئے زبان کے دو چوکیدار (ہونٹ) بھی مقرر کردیے گئے ہیں، بلکہ زبان کو ایک گھر میں بند کرکے بتیس فوجیوں کا دستہ اس کے اردگرد کھڑا کردیا ہے، اور گھر کے دروازے پر دو مضبوط کواڑ (ہونٹ) لگادیے ہیں، حفاظت کا اتنا اہتمام بدن کے اور کسی حصہ کا نہیں کیا گیا، حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ بھلی بات کہے یا چپ رہے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (اور ہم نے انسان کو دونوں راستے بجھادیئے) یہ حق تعالیٰ شانہٗ کا مستقل انعام ہے کہ اس نے انسان کو خیر و شر اور بھلے برے کی تمیز عطا فرمادی، اس کے نفس میں ایسی استعداد ودیعت کی گئی ہے، کہ اگر وہ اس سے کام لے تو حق و باطل، خیر و شر اور مفید و مضر میں بخوبی امتیاز کرسکتا ہے، سب سے پہلا ہادی خود انسان کا ضمیر ہے، پھر اس ہدایت کی تائید و تقویت کیلئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، کتب آسمانی کا نزول ہوا، اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے نائبین راہنمائی کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، حاصل یہ ہے کہ ایک غافل و جاہل انسان بارگاہ خداوندی میں یہ عذر نہیں کرسکتا کہ مجھے حق و باطل کا علم نہ تھا یا میں اپنے طرز زندگی کو درست سمجھتا تھا، ایک منکر اپنے وجود ہی کی چند نمایاں چیزوں میں غور کرلے تو وہ قدرت و حکمت حق کے کمالات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرسکتا ہے، آنکھیں، زبان اور ہونٹ ہی اس کی رہبری کرسکتے ہیں۔

فائدہ...... نجدین سے جمہور مفسرین نے تو خیر و شر کے دو واضح راستے ہی مراد لئے ہیں، لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن المسیب اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے کہ اس سے ماں کی چھاتیاں مراد ہیں، ان دونوں کو دو بلند راستوں سے تشبیہ دی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بے شعور بچہ کے قلب میں دودھ پینے کا الہام کیا، اور ان بلند اور واضح راستوں تک پہنچایا، جس سے وہ پلا بڑھا۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ...... جبکہ انسان پر اس کی اپنی استعداد اور روشن دلائل سے خیر و شر ممتاز ہوگئے، حق و باطل کی راہیں واضح ہوگئیں، تو پھر وہ یقین کامل کی طاقت سے نیک اعمال کی بلندیوں پر کیوں نہیں چڑھتا، وہ مخلوق کے ساتھ پوری پوری ہمدردی کا معاملہ بھی کرے، لوگوں کو پریشانیوں سے چھڑائے، بھوکے، یتیموں محتاجوں کی پرورش کرے، اور خالق و مالک سے بھی رواداری کا برتاؤ کرے، ایمان و عمل پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو بھی حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے کی دعوت دیتا رہے اس طرح وہ اللہ کے کامیاب و مبارک بندوں میں شامل ہوجائے، کیونکہ جو لوگ یہ کام نہیں کرتے بلکہ احکام خداوندی کا انکار کرتے ہیں وہ ناکام و نامبارک لوگ ہیں جن کو اللہ کے جیل خانہ (دوزخ) میں بدترین اور دائمی سزا بھگتنی پڑے گی۔

گھاٹی میں گھسنے کا مطلب:

عقبہ پہاڑ کی بڑی چٹان کو بھی کہتے ہیں اور دو پہاڑوں کے درمیانی راستے (گھاٹی) کو بھی کہتے ہیں، دشمن سے بچاؤ کے لئے انسان پہاڑ پر چڑھ جائے یا گھاٹی میں داخل ہو کر نکل جائے تو اس کو دشمن سے نجات مل جاتی ہے، اس جگہ طاعات وعبادات کو عقبہ سے تعبیر فرمایا گیا۔ (۱) کیونکہ جس طرح عقبہ کے ذریعہ دشمن سے نجات میسر ہوسکتی ہے اسی طرح عبادات واعمال صالحہ کے ذریعہ عذاب خداوندی سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ (۲) جس طرح گھاٹی میں داخل ہو کر انسان خود کو دشمن سے محفوظ کر لیتا ہے اسی طرح عبادات کا پابند ہو کر وہ خود کو شیطان اور اس کے حملوں سے بچا سکتا ہے۔ (۳) نیکیاں چونکہ نفس پر دشوار ہیں اسلئے نیکیوں پر عمل پیرا ہونے کو اونچی چڑھائی اور دشوار گذار گھاٹی پر چڑھنے سے تعبیر فرمایا گیا، اور بدی کا راستہ خواہش نفسانی کے موافق ہوتا ہے اسلئے اس پر چلنا سہل ہوتا ہے۔ مگر نیکیوں کی دشوار گذار راہوں کو تو وہ جوانمرد ہی طے کرتے ہیں جن کو بارگاہ حق سے سعادت ازلی مقدر ہو چکی ہے ؎

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند   کس بمیداں درنمی آید سواراں راچہ شد

آگے نیکیوں کی چند اہم اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی قسم...... فَكُّ رَقَبَةٍ (گردنوں کا چھڑانا) گردن چھڑانا کئی طرح سے ہوتا ہے۔ (۱) غلام یا باندی کو آزاد کر دینا، خواہ اپنے غلام یا باندی کو آزاد کر دینا یا مالک کو قیمت ادا کر کے آزاد کرا دینا۔ یا مکاتب کا کل بدل کتابت ادا کر کے یا کچھ حصہ ادا کر کے مکاتب کی مدد کر دینا، زمانۂ جاہلیت میں غلاموں، باندیوں پر بڑی سختی ہوتی تھی، اسلام نے اس رسم کی اصلاح کی، اول تو آزادی کی بڑی ترغیبات دیں اور آزادی کی مختلف راہیں کھولدیں، اس کے باوجود جو غلام باندیاں کسی کے پاس رہ جائیں تو ان کے ایسے حقوق قائم کر دیئے کہ غلامی کو رسمی آزادی سے بہتر بنا دیا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے جنت میں لیجائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تو نے اگرچہ لفظ چھوٹا سا بولا ہے مگر درخواست بڑی لمبی چوڑی اور اہم ہے، غلام آزاد کرو اور گلو خلاصی کرو، اعرابی نے عرض کیا یہ دونوں چیزیں تو ایک ہی ہیں، فرمایا غلام آزاد کرنا تو یہ ہے کہ تم تنہا پورا غلام آزاد کر دو، اور گلا خلاصی کا مطلب یہ ہے کہ (مکاتب) غلام (یا باندی) کی قیمت ادا کرنے میں مدد کر دو، اور منحہ (بخشش) یہ ہے کہ تم مہربانی کر کے اپنے ظالم رشتہ دار کی طرف رجوع کر لو، اگر اسکی تم میں طاقت نہ ہو تو بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور پیاسے کو پانی پلاؤ، اچھا کام کرنے کی ترغیب دو، اور بری بات سے روکو۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو کلمہ خیر کے علاوہ سے زبان بند رکھو۔ (مظہری بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے مسلمان غلام آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو دوزخ سے آزاد فرما دیتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی شرمگاہ کے مقابلہ میں اس کی شرمگاہ کو بھی آزاد فرما دیتے ہیں۔ (بخاری ومسلم) (۲) جو قصاص میں گرفتار ہو تو صاحب حق قصاص معاف کر کے دیت لے لے، یا کوئی دوسرا دیت دیکر اس سے قصاص معاف کرا دے۔ (۳) کسی نادار قرضدار کا قرضہ معاف کر کے اس کو قرض سے سبکدوش کر دے، یا ادا کرا کر یا معاف کرا کر اس پھندے سے مقروض کی گردن

چھڑادے۔(۴) کسی ظالم کے پنجہ سے قوت بازو یا مال کے ذریعہ مظلوم کی گردن چھڑادے۔(۵) بندہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کر کے خداوند تعالیٰ کے قہر وعذاب سے خود اپنی گردن چھڑالے۔یہی وہ حریت کبریٰ واصل آزادی ہے جو سعادت عظمٰی کا وسیلہ ہے۔(۶) حضرت عکرمہؒ نے کہا کہ فَكُّ رَقَبَةٍ سے مراد گناہوں سے توبہ کر کے اپنے نفس کو آزاد کرنا ہے۔

دوسری قسم...... اَوْ اِطْعٰمٌ...... یتیم ومسکین کو کھانا کھلانا بہر حال کارثواب ہے،لیکن شدید حاجت کے وقت مثلاً قحط سالی ہے،غلہ کی نایابی ہے،یا سیلاب زدگی کے ایام ہیں ایسے اوقات میں کھانا کھلانا دوسری بہت سی نیکیوں سے بڑھ جاتا ہے،اسی طرح یتیم کو کھانا کھلانا کارثواب ہے لیکن اگر وہ قریبی رشتہ دار بھی ہو تو ثواب دوہرا ہو جاتا ہے،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے عمدہ کام دریافت کئے گئے تو فرمایا: کھانا کھلانا،اور سب مسلمانوں کو سلام کرنا خواہ ان سے جان پہچان ہو کہ نہ،اور رات میں جب لوگ پڑے سوتے ہوں اس وقت نماز پڑھنا ؎

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے ہم رات کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

پھر مسکین اس کو بھی کہہ دیتے ہیں جس کے پاس معمولی سامان اور نا کافی گذران ہو،جیسے قرآن میں وَاَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ فرمایا گیا ہے،ایسے مساکین کو کھلانا بھی ثواب ہے،لیکن ایسے مسکین کو کھلانا جس کے پاس اسباب معاش بالکل نہیں،اور وہ بے چارہ عاجز وخاک نشین ہے،بہت ضروری بھی اور اس کو کھانا کھلانے میں ثواب بھی اور بہت سی نیکیوں سے بڑھ کر ہے۔اسی لئے يَتِيْمًا کے ساتھ ذَا مَقْرَبَةٍ اور مِسْكِيْنًا کے ساتھ ذَا مَتْرَبَةٍ کی قید لگائی گئی ہے۔یہاں تک وہ نیکیاں بتلائی گئی ہیں جن کا صرف مال سے تعلق تھا۔اور ان مصارف میں مال صرف کرنا تمام اہل عقل کے نزدیک بہتر ہے،کسی مذہب وملت کے ماننے والے کا اس میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔لیکن کوئی بڑے سے بڑا عمل ایمان کے بغیر عند اللہ مقبول ومعتبر نہیں ہوتا اس لئے اس کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی ان تمام چیزوں کے باوجود اس کو اہل ایمان کے زمرہ میں بھی شامل ہونا ضروری ہے،کیونکہ ایمان ہی ایسی بنیاد ہے کہ جس پر تمام اعمال صالحہ کی عمارت قائم ہوتی ہے۔

فائدہ......لفظ ثُمَّ تراخی زمانی کیلئے آتا ہے،یعنی ثُمَّ کے مابعد کا زمانہ اس کے ماقبل کے زمانہ سے مؤخر ہوتا ہے، اس لئے بظاہر یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کا زمانہ مقدم ہوگا اور ایمان کا مؤخر۔حالانکہ ایمان تو تمام اعمال کی قبولیت کے لئے شرط ہے،اور شرط کا مشروط پر تقدم ضروری ہے،اس لئے یہاں پر ثُمَّ یا تو تراخی زمانی کے لئے نہیں ہے بلکہ تراخی ذکر وبیان کے لئے ہے،یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ محاورات میں بولتے ہیں کہ نماز اس وقت قبول ہوتی ہے جبکہ اول سے اخیر تک ارکان ترتیب سے ادا کریں۔پھر وضو بھی کیا ہو،حالانکہ وضو نماز کے لئے شرط اور اس سے مقدم ہے،یا تاخیر رتبی کے لئے ہے،یعنی ایمان کے مرتبہ کی بلندی وبعد کو بیان کرنے کے لئے ہے،مطلب یہ ہے کہ ایمان کا مرتبہ اعمال کی بہ نسبت انتہائی بلند ہے،کیونکہ اعمال بغیر ایمان مقبول ومعتبر نہیں ہیں،اور ایمان بغیر اعمال بھی مقبول ومعتبر ہے،نجات ایمان پر موقوف ہے، اعمال نہیں،اگر بغیر لفظ ثُمَّ پہلے ہی ایمان کا ذکر کر دیا جاتا تو یہ وہم ہوسکتا تھا کہ عقبہ کی ایک قسم ایمان بھی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ یہاں لفظ ثُمَّ تاخیر وقوع کے لئے ہے،کیونکہ کفار کے اعمال خیر موقوف رہتے ہیں،اگر خاتمہ ایمان پر ہو جائے تو نیک اعمال جو حالت کفر میں ہوئے ہیں مقبول ہوں گے اور ان پر ثواب ملے گا ورنہ نہیں۔اور آیت

کا مطلب یہ ہوگا کہ ان اعمال صالحہ مذکورہ کے بعد اگر خاتمہ ایمان پر ہوگیا تو یہ اعمال مقبول ہو جائیں گے، چنانچہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے مسلمان ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں نے حالت کفر میں بہت سے نیک کام کیے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے ایمان نے ان تمام اعمال کو مقبول بنا دیا۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ فَكُّ رَقَبَةٍ میں عموم ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کر کے خود اپنی گردن چھڑانے کو بھی شامل ہے، جس میں نفس ایمان بھی آ گیا، اس کے بعد شان نزول کے مناسب اعلیٰ درجہ کے مالی مصارف کو بیان فرما کر اعلیٰ درجہ کے ایمان والوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی گئی ہے، اور اعلیٰ ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اپنی تکمیل کے بعد اوروں کو بھی تکمیل و کمال کی دعوت دیتے ہیں اور ایمان والے کو یہ مقام کمال اس کے بعد حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ جانی و مالی قربانیوں اور اچھے اعمال کو اپنا وظیفہ حیات بنا لے۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

اس صورت میں لفظ ثُمَّ میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وہ اپنے حقیقی معنی تراخی زمانی پر رہے گا۔

ایک ترکیبی شبہ:

یہاں پر ایک مشہور ترکیبی شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ کلام عرب میں فعل ماضی کی نفی لفظ لا کیساتھ آتی ہے تو اس کا دوبار آنا ضروری ہے، جیسے فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی اس کا اجمالی حل عنوان ترکیب میں ہو چکا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں معنی کے اعتبار سے تکرار موجود ہے، فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَلَا فَكَّ اَوْ لَا اَطْعَمَ دوسری بات یہ ہے کہ قواعد نحویہ قرآن اور زبان عرب کے محتاج ہیں اور قرآن و زبان قواعد کے محتاج نہیں ہیں، لہٰذا اس افصح الکلام کو مورد اشکال قرار نہ دیا جائیگا بلکہ قاعدہ نحویہ ناقص ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ قاعدہ اکثریہ ہیں، چوتھا جواب بعض نے یہ دیا ہے کہ لا یہاں بددعاء کیلئے ہے اِی لا یرزقه الله خیرا۔ اس صورت میں تکرار ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے

اَلَا لَا بَارَكَ اللّٰهُ فِي سُهَيْلٍ ☆ اِذَا مَا بَارَكَ اللّٰهُ فِي الرِّجَالِ

یعنی اللہ تعالیٰ سہیل میں برکت نہ دے جب اللہ تعالیٰ دیگر مردوں میں برکت دے

اس شعر میں لَا بَارَكَ میں لَا ماضی پر داخل ہے، اور بددعاء کے لئے ہے، اس لئے تکرار نہیں۔ اسی طرح یہاں بھی بددعاء کے لئے ہے جس میں تکرار کی ضرورت نہیں ہے، پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ اَلَّا کا مخفف ہے جو ھَلَّا کی طرح تحضیض و تندیم کے لئے آتا ہے۔

کمال کا تقاضا دوسروں کی تکمیل ہے:

برف ٹھنڈک میں کمال رکھتا ہے تو وہ دوسری اپنے پاس والی چیزوں کو بھی ٹھنڈا کر دیتا ہے، اور آگ کو گرمی میں کمال حاصل ہے تو وہ اپنے ماحول کو بھی گرم کر دیتی ہے، اسی طرح جب کسی کو ایمان و اعمال صالحہ کا کمال حاصل ہوتا ہے تو اس کے اثرات ماحول پر پڑنے ضروری ہیں، اسی لئے جب کسی بندۂ خدا کو ایمان و اعمال صالح میں کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی ان کی دعوت دیتا اور اپنے رنگ میں رنگ لینے کی کوشش کرتا ہے جس سے اس کے کمال میں چار چاند لگ جاتے ہیں، اور اس کا وہ کمال پائیدار و لازوال ہو جاتا ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ آگ کی طرح بجھ کر نہ رہ جائے، چنانچہ وَتَوَاصَوْا

بِالصَّبْرِ میں اسی کمال کے فطری تقاضے کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے، کہ اعمال مذکورہ کرنے والا صرف اپنے ایمان وعمل پر اکتفاء نہ کر بیٹھے بلکہ ان مؤمنین کاملین کے زمرہ میں خود کو شامل کر لے جو ایک دوسرے کو صبر کی وصیت وتاکید اور ایک دوسرے کو خلق خدا پر رحم وہمدردی کی تلقین کرتے رہتے ہیں، سابقہ سورت (سورۃ الفجر) کے اخیر میں فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ کے ضمن میں بھی اسی حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے، جس کو ہم اس مقام پر لکھ چکے ہیں، اس سے دونوں سورتوں میں کمال مناسبت کی ایک صورت اور بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

صبر اور اس کی قسمیں:

صبر کی مختصر وضاحت مع اقسام سورۃ القلم ص ۷۷ ج ۱ میں عنوان لغات کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں، یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن پاک میں چونتیس مقامات پر صبر کی تاکید وفضیلت مذکور ہے، صبر کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ آدمی خود کو عقل وشرع کے تقاضوں پر ثابت قدم رکھے، اسی کو بعض نے حبس النفس علی ما تکرہ سے تعبیر کیا ہے، صبر کی اولاً دو قسمیں ہیں جسمانی اور نفسانی۔ جسمانی صبر یہ ہے کہ جسم کو عقل وشرع کے تقاضوں پر استعمال کیا جائے، ان میں سستی وکاہلی نہ ہونے پائے۔ نفسانی صبر یہ ہے کہ انسان کو جو حق تعالیٰ نے تین قوتیں (قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ) دی ہیں ان کو اعتدال پر قائم اور افراط وتفریط سے محفوظ رکھے، تاکہ اس کو حکمت وعفت اور شجاعت کے جواہر حاصل ہوں، اور وہ عدالت کے مقام پر آکر تقویٰ کی کرسی پر جلوہ افروز ہو جائے اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ کیونکہ قوت عقلیہ کے افراط کو جزبرہ، تفریط کو بلادت، اور توسط کو حکمت کہتے ہیں، اور قوت شہویہ کے افراط کو فجور، تفریط کو عنۃ اور اعتدال کو عفت سے تعبیر کرتے ہیں، اور قوت غضبیہ کے افراط کو تہور، تفریط کو جُبن اور اس کے درمیانی درجہ کا نام شجاعت ہے۔ ان تینوں قوتوں کے افراط وتفریط کے دونوں پہلو مذموم ہیں، ان سے اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، اور ان کا توسط واعتدال محمود ہے، ان سے اخلاق حمیدہ وجود میں آتے ہیں، اور یہ تینوں وصف (حکمت، عفت اور شجاعت) تمام خوبیوں کے اصل الاصول ہیں، جو انسان ان تینوں اوصاف کو جامع ہے وہ مؤمن کامل، صاحب عدالت وتقویٰ کہلاتا ہے۔

بعض حضرات نے صبر کی تین قسمیں بیان کی ہیں، صبر علی الطاعات، صبر علی البلیات، صبر عن المنہیات، ان مذکورہ اقسام وتقسیمات کے علاوہ صبر مختلف معانی میں مستعمل ہے۔ مثلاً: (۱) صبر مطلق، اس کی ضد اضطرار ہے۔ (۲) صبر بمعنی تحمل واستقلال، اس کا مقابل جزع وفزع اور تردد ہے۔ (۳) وسعت حوصلہ اور بلندی ہمت، اس کے مقابلہ میں کم ہمتی وتنگدلی ہے۔ (۴) شجاعت وبہادری۔ اس کا مقابل جبن وبزدلی ہے۔ (۵) حلم اس کی ضد طیش ہے۔ (۶) کتمان اسرار، اس کی ضد اظہار ہے۔ (۷) امانت اس کی ضد خیانت ہے۔ (۸) زہد وقناعت اس کے مقابل حرص وطمع ہیں۔ (۹) رضا بالقضاء، اس کے مقابل عدم رضا بالقضاء وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اول الذکر دونوں تقسیمیں صبر کی جملہ اقسام اور اس کے تمام اطلاقات کو شامل ہیں۔

اس بیان سے یہ ثابت ہوا کہ صبر ایک ہمہ گیر حقیقت کا نام ہے۔ اکثر اخلاق حمیدہ واوصاف ایمانیہ صفت صبر ہی سے پیدا ہوتے ہیں، اسی لئے صحیح حدیث میں وارد ہے: الصبر نصف الایمان. صبر آدھا ایمان ہے۔ کیونکہ مؤمن مصیبت میں صبر اور راحت میں شکر کرتا ہے، اور تیسرا کوئی حال نہیں ہے، اس لئے صبر کو آدھا ایمان قرار دیا گیا ہے، قرآن

پاک میں کہیں پر صبر اولوالعزم رسولوں کا کام قرار دیا گیا ہے، کہیں نماز سے بھی مقدم ذکر فرمایا گیا ہے، کہیں صابرین کو بے حساب اجر دینے کا وعدہ فرمایا گیا ہے، کہیں امامت اور مقتدا بننے کی بنیاد صبر کو قرار دیا گیا ہے، غرض قرآن پاک واحادیث میں صبر کے بیشمار فضائل آئے ہیں۔

خصائل حمیدہ کا دوسرا رکن رحمت ہے:

جس طرح صبر اخلاق ایمانیہ کا سرچشمہ ہے، اسی طرح رحمت بھی صدہا خصائل حمیدہ کا رکن اعظم ہے، یتیموں پر شفقت، چھوٹوں پر مہربانی، بیکسوں، بیواؤں، بے زبانوں کی چارہ سازی، اہل ملک وملت کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی، بھوکوں، ننگوں کو کھلانا پلانا اور پہنانا بیماروں کی دوا وتیمارداری کرنا، بھولوں، بھٹکوں کو راستہ بتانا، کمزوروں کی مدد کرنا وغیرہ سب مرحمت کی شاخیں ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم فی السماء** (ترمذی، ابوداؤد) رحم کرنیوالوں پر رحمٰن رحمت کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

حق تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ میں رحمٰن ورحیم بھی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں رؤف ورحیم اور رحمۃ للعالمین فرمایا گیا، قرآن پاک کو ہدایت ورحمت کے القاب دیئے گئے، حلم وعفو، لطف وکرم جیسی صفات کا سرچشمہ یہی صفت رحمت ہے، احادیث میں بکثرت رحمت وہمدردی کی ترغیب دی گئی ہے، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (۱) حق تعالیٰ رحم کرنیوالوں پر رحم فرماتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص رحم کرتا ہے، فرمایا اپنی جان یا اعزہ واقربا پر رحم کرنا مراد نہیں، رحیم تو وہ ہے جو تمام مسلمانوں پر مہربان ہو، بڑے کو باپ برابر والوں کو بھائی اور چھوٹوں کو اپنی اولاد سمجھے۔ (طبرانی) (۲) حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے کہ تم میری رحمت چاہتے ہو تو میری مخلوق پر رحم کرو۔ (کامل ابن عدیؒ) (۳) جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے وہ ہمارا نہیں۔ الخ (بخاری ومسلم) (۴) اہل ایمان کو تم باہمی رحمدلی ونرمی میں ایسا پاؤ گے جیسے کہ ایک جسم ہوتا ہے، اس کا ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضاء میں درد وبخار پیدا ہو جاتے ہیں (بخاری ومسلم)۔

بنی آدم اعضائے یکدیگراند — کہ در آفرینش زیک جوہراند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضو ہارا نماند قرار

الحاصل تمام نیکیوں کی اصل دو چیزیں ہیں۔ (۱) **التعظیم لامر اللہ** جو صبر سے متعلق ہے (۲) **الرحمۃ لخلق اللہ** جس کو مرحمت سے تعبیر فرمایا گیا، اور امر اللہ کی تعظیم خلق اللہ پر شفقت سے مقدم ہے، اسی لئے صبر کو مرحمت پر مقدم کیا گیا۔

لطیفہ: .... بعض جگہ بے صبری محمود اور صبر مذموم ہوتا ہے، چنانچہ عرب کا مقولہ ہے **صبرک فی مصیبتک خیر من جزعک وجزعک فی مصیبۃ اخیک خیر من صبرک۔**

اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَۃِ یعنی جو لوگ مذکورہ اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں وہ یُمن وبرکت والے ہیں، کیونکہ ان کی تاکید صبر وتلقین مرحمت کا فیض ان کی حیات میں اور ان کی وفات کے بعد بندگان خدا کو برابر پہنچتا رہے گا۔ بعض علماء نے میمنہ کا مطلب داہنی جانب یعنی داہنا ہاتھ بتایا ہے، اس صورت میں اس کے معنی اصحاب الیمین کے ہوں گے، اسی طرح مشئمۃ کے بھی دونوں معنی ہیں، منحوس ونامبارک اور شمال (بایاں) مؤمنین کے مقابلہ میں کفار کو، اہل برکت کے

مقابلہ میں اہل نحوست کو اور اصحاب الیمین کے مقابلہ میں اصحاب الشمال کو ذکر کرنے سے ترغیب وترہیب، ایضاح وتبیین کے علاوہ کلام میں اعتدال کی ایک خاص شان پیدا ہو جاتی ہے۔ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ان پر ایسی آگ مسلط ہوگی جس کو بند کر دیا جائے گا، تاکہ اس کی گرمی اور حبس کم نہ ہو۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ.

تَمَّ تَفْسِيْرُ سُوْرَةُ الْبَلَدِ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الْاَحَدِ الصَّمَدِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اِلَى الْاَبَدِ.

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسَ عَشَرَةَ اٰيَةً

(رکوع:۱، آیات:۱۵) سورۂ شمس مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پندرہ آیات ہیں۔ (کلمات:۵۴، حروف:۲۴۷)

فضائل سورت:

یہ سورت بھی بالاتفاق مکہ میں نازل ہوئی ہے، حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز میں وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا اور ایسی ہی سورتیں پڑھا کرتے تھے (احمد، ترمذی، نسائی) طبرانیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے حکم دیا تھا کہ وہ نماز صبح میں وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى اور وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا پڑھا کریں، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت عقبہ بن عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ ہم چاشت کی نماز کی دو رکعتوں میں وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا، اور وَالضُّحٰى پڑھا کریں، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا کہ تم سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى، اور وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا اور وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى کیوں نہیں پڑھتے۔ (یہ اس وقت ارشاد فرمایا تھا جبکہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز عشاء میں سورۂ بقرہ پڑھی تھی۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے طوالت صلوٰۃ کی شکایت کی گئی تھی)

ربط ومناسبت

اس سورت کا سورۂ بلد سے ربط کئی طرح ہے۔ (۱) سورۂ بلد کو اصحاب میمنة و اصحاب مشئمة کے ذکر پر ختم کیا گیا تو اس سورت میں قَدْ اَفْلَحَ سے اسی مضمون کا تتمہ ذکر کر دیا گیا۔ (۲) سورۂ بلد میں وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ سے خیر وشر کی راہوں کو واضح کر دینے کا ذکر تھا، اس سورت میں فجور وتقویٰ کا ذکر فرما کر اسی ہدایت خیر وشر کا بیان کیا گیا۔ (۳) سورۂ بلد کے خاتمہ پر کافروں کے اخروی احوال بیان کئے گئے تھے، اس سورت کے خاتمہ پر مواخذۂ کفار کے دنیوی حالات کا ذکر ہے۔ (۴) اور سب سے بڑھ کر مناسبت یہ ہے کہ خیر کی رہنمائی اور شر سے اجتناب میں آفتاب نبوت کی روشنی درکار ہے، اسی سے نیک وبد میں تمیز ہو سکتی ہے، اس لئے سورۂ بلد میں خیر وشر کی رہنمائی کا ذکر کر کے سورۂ شمس نازل کی گئی۔ اور ترتیب میں بھی اس کے بعد رکھی گئی۔ تاکہ معلوم ہو کہ شمس یعنی آفتاب کے بغیر جس طرح حیات دنیوی دشوار ہے اسی طرح آفتاب نبوت کے بغیر حیات روحانی اور ہدایت خیر وشر ممکن نہیں۔ واللہ اعلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (۱) وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۲) وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (۳) وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا (۴)

قسم آفتاب کی اور اسکی دھوپ کی اور قسم ہے چاند کی جب وہ سورج غروب ہونے کے بعد آئے اور قسم ہے دن کی جب وہ سورج کو خوب روشن کردے اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ سورج کو چھپادے

وَ	الشَّمْسِ	و	ضُحٰهَا	وَ	الْقَمَرِ	اِذَا	تَلٰهَا	وَ	النَّهَارِ	اِذَا	جَلّٰهَا	وَ	الَّيْلِ اِذَا	يَغْشٰهَا
قسم	سورج	اور	دھوپ اس	اورقسم ہے	چاند	جب	پیچھے آئے اس	اورقسم	دن	جب	ظاہر کرے اس	اور	رات جب	ڈھانک لے

وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا (۵) وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۶) وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا

اور قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے والے کی، اور قسم ہے زمین کی اور اس کے بچھانے والے کی۔ اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کی جس نے اس کو درست بنایا۔ پھر اس کے

وَ	السَّمَاءِ	وَ	مَا	بَنٰهَا	وَ	الْاَرْضِ	وَ	مَا	طَحٰهَا	وَ	نَفْسٍ	وَ	مَا	سَوّٰهَا	فَاَلْهَمَهَا
اور	آسمان	اور	اس ذات	پیدا کیا اس	اورقسم	زمین	اور	جس	بچھایا اس	اور	جان	اور	جس	تندرست کیا	پس جی میں ڈالی اس

فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۱۰)

دل میں اس کی بدی اور اسکی نیکی ڈالدی، وہ کامیاب ہوا جس نے روح کو پاک کیا۔ اور وہ ناکام ہوا جس نے اس کو گندا کردیا

فُجُوْرَهَا	وَ	تَقْوٰهَا	قَدْ	اَفْلَحَ	مَنْ	زَكّٰهَا	وَ	قَدْ	خَابَ	مَنْ	دَسّٰهَا
بدکاری اس	اور	پرہیزگاری اس	تحقیق	مراد کو پہنچا	جس	پاک کیا اس	اور	تحقیق	نامراد ہوا	جس	گاڑ دیا اس

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا (۱۱) اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا (۱۲) فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

قوم ثمود نے اپنی شرارت کی وجہ سے جھٹلا دیا۔ جبکہ ان کا سب سے بڑا بدبخت اٹھا تو ان لوگوں سے اللہ کے رسول نے فرمایا کہ

كَذَّبَتْ	ثَمُوْدُ	بِطَغْوٰهَا	اِذِ	انْبَعَثَ	اَشْقٰهَا	فَقَالَ	لَهُمْ	رَسُوْلُ	اللّٰهِ
جھٹلایا	ثمود	بسبب سرکشی اپنی	جب	اٹھا	بڑا بدبخت ان	پس کہا تھا	واسطے ان	پیغمبر	خدا

نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا (۱۳) فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا (۱۴) فَدَمْدَمَ

اللہ کی اونٹنی اور اسکے پانی سے تعرض نہ کرنا، تو انہوں نے ان کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا پھر ان کے رب نے ان کی اس نافرمانی کی وجہ سے

نَاقَةَ	اللّٰهِ	وَ	سُقْيٰهَا	فَكَذَّبُوْهُ	فَعَقَرُوْهَا	فَدَمْدَمَ
اونٹنی	خدا	اور	پانی پلانے اس	پس جھٹلایا اس	پس پاؤں کاٹے اس	پس ہلاکی ڈالی

عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا (۱۵) وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (۱۶)

ان پر ہلاکت نازل فرمادی پھر اس ہلاکت کو عام کردیا، اور اس نے اس کے انجام کی پرواہ ہی نہ کی۔

عَلَيْهِمْ	رَبُّهُمْ	بِذَنْۢبِهِمْ	فَسَوّٰهَا	وَ	لَا	يَخَافُ	عُقْبٰهَا
اوپر ان	رب ان	بسبب گناہ ان	پس برابر کردیا ان	اور	نہ	ڈرا	پچھاڑی (انجام) ان

لغات

ضُحٰی وقت چاشت، دن چڑھے کا وقت، اس کے معنی دھوپ کے پھیلنے اور دن کے چڑھنے کے ہیں۔ ضُحٰی مثل هُدٰی مؤنث ہے جبکہ ضَحْوَۃ کی جمع مانیں، اور صَرْدٌ کے وزن پر اسم مانیں تو مذکر ہے (ن س) دھوپ کھانا، دھوپ لگنا، تَلٰی واحد مذکر غائب تُلُوًّا (ن) پیچھے چلنا، تِلَاوَۃً پڑھنا، جَلّٰی ایضاً باب تفعیل سے ظاہر کرنا، جَلَا جَلْوًا جَلَاءً (ن) واضح کرنا، ظاہر کرنا طَحٰی ایضاً طَحْوًا (ف) پھیلانا، دراز کرنا، پھیلنا، دراز ہونا (ن) بعید ہونا، ہلاک ہونا، دفع کرنا۔ اَلْهَمَ اِلْهَام (افعال) دل میں ڈالنا (س) نگلنا، تَقْوٰی پرہیز گاری، بچنا، یہ اِتَّقٰی سے اسم ہے، اس کے لغوی معنی نفس کو خوف والی چیز سے بچانے کے آتے ہیں، لیکن کبھی کبھی خوف کو تقویٰ سے اور تقویٰ کو خوف سے بھی موسوم کرتے ہیں، جس طرح سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیتے ہیں، عرف شرع میں تقویٰ نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام ہے جو گناہ کی طرف لیجائے، یہ بات ممنوعات کے اجتناب سے حاصل ہوتی ہے، مگر اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جبکہ بعض مباحات کو بھی احتیاطاً ترک کر دیا جائے، چنانچہ حدیث میں مروی ہے اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَمَنْ وَقَعَ حَوْلَ الْحِمٰى فَحَقِيْقٌ اَنْ يَقَعَ فِيْهِ (حلال کھلا ہوا ہے اور حرام کھلا ہوا ہے، اور جو چراگاہ کے گرد چرائے گا تو وہ اس میں واقع ہو جائے گا) تقویٰ کے تین درجے ہیں، ادنیٰ، اوسط، اعلیٰ ادنیٰ درجہ ایمان ہے، جس کے ذریعہ دوزخ کے دائمی عذاب سے نجات حاصل ہوتی ہے، اوسط درجہ کبائر سے مکمل پرہیز اور صغائر پر اصرار سے اجتناب ہے، اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ باطن کو ماسوی اللہ سے بالکل پاک رکھا جائے، اور یہی حقیقی تقویٰ ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

اَفْلَحَ اِفْلَاح سے ہے کہ جس کے معنی کامیابی ومقصدوری کے ہیں، فلاح کی دو قسمیں ہیں۔ دنیوی، اخروی، دنیوی فلاح ان کامیابیوں کا حصول ہے جن سے دنیوی زندگی سنور جائے۔ مثلاً مال ودولت، صحت عزت، اور اخروی فلاح چار چیزوں میں ہے بقاء بلا فنا، غنا بلا فقر، عزت بغیر ذلت، علم بغیر جہالت، فَلَحَ فَلْحًا (ف) کاشتکاری کرنا، دھوکہ دینا، مکر کرنا (س) نیچے کے ہونٹ کا پھٹنا، صفت اَفْلَحَ ہے، خَابَ خَيْبَةً (ض) محروم ہونا، ناامید ہونا، ناکام ہونا، افعال سے متعدی دَسّٰی صیغہ واحد مذکر غائب ماضی تَدْسِيَةً (باب تفعیل) سے ہے، جس کے معنی چھپانے اور گمنام کرنے کے ہیں، دَسَّ دَسًّا (ن) دھنسانا، چھپانا، گاڑنا، حیلہ ومکر کرنا، سازش کرنا، دَسِيْسَةٌ خفیہ سازش وعداوت، اِنْبَعَثَ انفعال سے ماضی کا واحد مذکر غائب، اٹھ کھڑا ہوا بَعَثَ بَعْثًا وَتَبْعَاثًا (ف) بھیجنا، برانگیختہ کرنا، ابھارنا، جوش دلانا، اکسانا، بیدار کرنا، زندہ کرنا وغیرہ، (س) نیند سے بیدار ہونا، ظاہر ہونا، اَشْقٰی اسم تفضیل بڑا بدبخت، بڑا بدقسمت، یہ شَقَاوَۃٌ (س) سے ہے جس کے معنی بدبختی کے ہیں، یہاں قوم ثمود کا وہ بدکار مراد ہے جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اس کا نام قدار بن سالف تھا، قدار بروزن غلام، اس کے معنی اونٹ ذبح کرنے والے کے ہیں، عرب میں مثل مشہور ہے فُلَانٌ اَشْاَمُ مِنْ قُدَارٍ (یعنی فلاں قدار سے بھی زیادہ منحوس ہے) نَاقَةٌ اونٹنی ج نَاقٌ، نِيَاقٌ، اَنْوَاقٌ، نُوْقٌ جمع الجمع اَنِيْقُ، اَنَايِقُ، نِيَاقَاتٌ، عَقَرُوْا صیغہ جمع مذکر غائب ماضی (ض) کونچیں کاٹنا، کونچیں پاؤں کے وہ پٹھے کہلاتے ہیں جو پیچھے ایڑی کی طرف ہوتے ہیں، عرب میں دستور تھا کہ اونٹ کو حلال کرنا ہوتا تو اس کی کونچیں کاٹ دیتے تا کہ وہ بھاگ نہ سکے پھر اس کو نحر

کرتے تھے، عَقَر کا لفظ اصل کونچیں کاٹنے ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے، مگر کبھی کبھی بمعنی نحرو ذبح بھی مستعمل ہوتا ہے، دمدم صیغہ واحد مذکر غائب ماضی، اس نے الٹ مارا، اس نے تباہی لا ڈالی۔ اس نے ہلاکت ڈالدی، اس نے غصہ کیا، یہ دَمْدَمَة سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہلاکت وغصہ کے ہیں، دَمَّ دَمًّا (ن) ہموار کرنا، ہلاک کرنا، پاٹ دینا، پوری طرح عذاب دینا، دَمَامَةً (ن ض س) حقیر وبدصورت ہونا عُقْبیٰ عاقبت، بدلہ، انجام العُقْبیٰ خاتمة الشئ وما یجئ من الامور علی عقبه (ابو حیان) کام کی جزاء (مظہری) کیونکہ جزاء کام کی انجام دہی کے بعد ملتی ہے عُقُبٌ، عُقْبیٰ، عَاقِبَةٌ کا استعمال نیکی کے ثواب اور جزاء کے ساتھ مخصوص ہے، عُقُوْبَةٌ، مُعَاقَبَةٌ، اور عِقَابٌ کا استعمال عذاب اور برائی کی سخت سزا کے لئے خاص ہے، لیکن ایسا اکثر ہے، گاہے عُقبیٰ کا استعمال عذاب وثواب دونوں میں ہوتا ہے، کما قال اللّٰه تعالی ﴿تِلْکَ عُقْبَی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَعُقْبَی الْکٰفِرِیْنَ النَّارُ﴾. عُقْبٰی مصدر بھی ہوسکتا ہے، جیسے شُوْریٰ، قُرْبیٰ، رُجْعیٰ، اس قسم کے مصادر کبھی فَعْلیٰ کے وزن پر بھی آتے ہیں، جیسے نَجْویٰ، دَعْویٰ اور فِعْلیٰ کے وزن پر بھی، جیسے ذِکْریٰ، ضِیْزیٰ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اسم ہو عَقَبَ عَقْبًا (ن ض) ایڑی مارنا، پیچھے آنا، جانشین ہونا (س) ایڑی میں درد ہونا۔

ترکیب

وَالشَّمْسِ جار مجرور متعلق اُقْسِمُ محذوف کے وَضُحٰهَا مرکب اضافی معطوف عند خلیل وسیبویہ وکذا ما بعده وعند البعض هو قسم ثان مستقل والقول الثانی ضعیف وقد حققنا من قبل. وَالْقَمَرِ مطوف اور اِذَا تَلٰهَا اُقْسِمُ کا ظرف ہے۔ اسی طرح اس سے اگلے دونوں جملے ہیں، وَالسَّمَاءِ بھی وَالْقَمَرِ کی طرح معطوف ہے۔ اور مَا موصولہ اپنے صلہ بَنٰهَا سے مل کر بھی معطوف ہے، اسی طرح اس سے آگے کے دونوں جملے ہیں، اور ما یہاں تینوں موقعوں پر بمعنی مَنْ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ان تینوں افعال پر ما مصدریہ ہے، فَاَلْهَمَهَا فعل ضمیر فاعل هَا مفعول بہ اول فُجُوْرَهَا مرکب اضافی اپنے معطوف وَتَقْوٰهَا، سے مل کر مفعول بہ ثانی، جملہ سَوّٰهَا پر معطوف وقَدْ للتحقیق، اَفْلَحَ فعل مَنْ موصولہ یا موصوفہ زَکّٰهَا فعل فاعل (ضمیر غائب) مفعول بہ سے مل کر جملہ فعلیہ صلہ یا صفت موصول وصلہ یا موصوف وصفت مل کر فاعل، اَفْلَحَ اپنے فاعل (ضمیر غائب) مل کر جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا مثلہ، معطوف معطوفین جواب قسم۔ کَذَّبَتْ فعل ثَمُوْدُ فاعل بِطَغْوٰهَا متعلق (والباء فیه للسببیة) جملہ فعلیہ استینافیہ۔ وَقَدْ خَابَ کے مضمون کی تقریر وتائید کے لئے ہے اِذِ مضاف اِنْبَعَثَ فعل اَشْقٰهَا فاعل، جملہ فعلیہ مضاف الیہ ظرف ہوا کَذَّبَتْ کا یا طَغْویٰ کا، فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فعل، متعلق اور فاعل علی الترتیب نَاقَةَ اللّٰهِ معطوف علیہ وَسُقْیٰهَا معطوف، معطوفین مفعول بہ، جملہ فعلیہ، والفاء فیه للتفریع والمراد برسول الله صالح علیه السلام واضافة الناقة الی الله للتشریف کما فی بیت الله فَکَذَّبُوْهُ جملہ فعلیہ، والفاء فیه للتعقیب والضمیر (ه) راجع الی رسول الله. فَعَقَرُوْهَا مثل سابق والضمیر ها راجع الی الناقة. فَدَمْدَمَ فعل عَلَيْهِمْ متعلق رَبُّهُمْ فاعل بِذَنْبِهِمْ متعلق، جملہ فعلیہ، ماقبل پر عطف اور اسی پر مرتب ہے فَسَوّٰهَا فعل، فاعل مفعول بہ جملہ فعلیہ دَمْدَمَ پر عطف هَا دَمْدَمَة کی طرف راجع ہے، جس پر لفظ دَمْدَمَ دلالت کررہا ہے، دوا اور احتمال یہ ہے کہ ثمود کی طرف راجع ہو باعتبار جماعت، اس لئے کہ ضمیر هم لانے میں رعایت فواصل نہ رہتی، وَلَا یَخَافُ عُقْبٰهَا جملہ رَبُّهُمْ سے حال ہے، یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور ضمیر ها مثل سابق عائد ہے دَمْدَمَة کی طرف یا ثمود کی طرف ہے۔

تفسیر:

اس سورت کے شروع میں سات چیزوں کی قسم آئی ہے، اور ساتوں چیزوں کے ساتھ ان کی حالت کمال کے مناسب ان کے اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی قسم ...... وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا یہاں اگر چہ ضحیٰ کو واوٴ عطف کے ساتھ ذکر کیا ہے، لیکن بقرینۂ سیاق یہ الشمس کا وصف ہے یعنی آفتاب کی قسم جب کہ وہ وقت ضحیٰ میں ہو، ضحیٰ اس وقت کو کہا جاتا ہے جب سورج طلوع ہو کر اتنا بلند ہو جائے کہ اس کی روشنی زمین پر خوب پھیل جائے، اس وقت سورج آدمی کو قریب معلوم ہوتا ہے، اور تمازت و تیزی زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کو پوری طرح دیکھا بھی جا سکتا ہے۔

دوسری قسم ...... وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا یعنی چاند کی قسم جبکہ وہ آفتاب کے پیچھے آئے، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب چاند سورج چھپنے کے بعد طلوع ہو، اور یہ مہینہ کے درمیان میں ہوتا ہے جبکہ چاند تقریباً مکمل ہوتا ہے، اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح ضحیٰ کے وقت آفتاب پورا دکھائی دیتا ہے اسی طرح جبکہ چاند کامل ہونے میں اس کے تابع ہو جائے۔

تیسری قسم ...... وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا جلّٰها کی ضمیر ارض یا دنیا کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے، گو یہاں پہلے اسکا ذکر نہیں آیا، مگر محاورات عرب میں وہ چند چیزیں جو عموماً انسان کے سامنے رہتی ہیں، بغیر ماسبق میں ذکر ہوئے ضمیر کا مرجع بن جاتی ہیں، قرآن کریم میں بھی مختلف مقامات پر اس کے نظائر موجود ہیں، اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوں گے، کہ قسم ہے دن کی اور دنیا یا زمین کی جبکہ اس کو دن نے روشن کر دیا ہو، اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ دن کی قسم بھی اس کی حالت کمال کے اعتبار سے ہے، لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ کہ ضمیر الشمس کی طرف ہے اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ قسم ہے دن کی جبکہ وہ آفتاب کو روشن کر دے، اور یہ اسناد مجازی ہے، مطلب یہ ہوگا کہ دن پھیل جانے کے سبب سے آفتاب خوب روشن نظر آنے لگے۔

چوتھی قسم ...... وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا یعنی قسم ہے رات کی جبکہ وہ آفتاب پر چھا جائے، یعنی آفتاب کی روشنی کو مستور کرلے، یعنی خوب تاریک ہو جائے، اور یہ رات کی حالت کمال ہے۔

پانچویں قسم ...... وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا یعنی قسم ہے آسمان کی اور اس کے بنانے کی جبکہ ما کو مصدریہ مانا جائے اور سباق کے اعتبار سے یہی معنی زیادہ واضح ہیں، جیسے بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ میں مَا مصدریہ ہے۔ کشاف، بیضاوی، قرطبی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، اور ما کو یہاں اور اس کے بعد دونوں جگہ مصدریہ مانا ہے، بعض دوسرے مفسرین نے مَا کو بمعنی مَنْ مان کر اس سے حق تعالیٰ کی ذات مراد لی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ قسم ہے آسمان اور اس کے بنانے والے کی۔

چھٹی قسم ...... وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ، یعنی قسم ہے زمین اور اس کے بچھانے (اور پھیلانے) کی یا قسم ہے زمین اور اس کے پھیلانے والے کی، ما کے اندر مذکورہ دونوں احتمالوں کی بنا پر یہ دونوں ترجمے ہوں گے۔

فائدہ ...... پانچویں اور چھٹی قسم میں آسمانوں کے ساتھ اس کے بنانے اور زمین کے ساتھ اس کے پھیلانے کا ذکر بھی اسی حالت کمال کو بتانے کے لئے ہے، یعنی قسم ہے آسمان کی اس حالت میں کہ اسکی تخلیق مکمل ہوگئی، اور زمین کی جبکہ اس کو پھیلا کر اس کی تخلیق مکمل کر دی گئی۔

ساتویں قسم...... وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ما کو مصدر یہ مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ قسم ہے انسانی جان کی اور اس کے درست کرنے کی، اور اگر مَا کو بمعنی مَنْ لیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی، تسویۃ (برابر، ہموار اور درست کرنے) کا مفہوم سورۂ انفطار میں تفصیل سے آچکا ہے۔ (فائدہ) ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ یہاں جتنی قسمیں مذکور ہیں، وہ سب مخلوقات کی قسمیں ہیں، درمیان میں ذات حق کی قسم آجانا نسق وترتیب کے خلاف معلوم ہوتا ہے، اور بعض مخلوقات کی قسم کی ذات باری پر تقدیم بھی لازم آتی ہے، اس لئے ان تینوں مقامات پر ''ما'' کو اگر مصدر یہ مانا جائے تو یہ دونوں اشکالات بھی پیش نہ آئیں گے، اور ان کے جوابات کے لئے تکلف بھی نہ کرنا پڑیگا، فافہم۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا یہ جملہ بھی ساتویں قسم (وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا) کے ساتھ مربوط ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو بنایا، پھر اس کے دل میں فجور وتقویٰ دونوں کا الہام کردیا، یعنی نفس انسانی میں گناہ وطاعت دونوں کی استعدادیں ودیعت فرمادیں، پھر انسان کو ایک خاص قسم کا اختیار دیا کہ گناہ یا اطاعت وہ اپنے قصد واختیار سے کر کے ثواب، یا عذاب کا مستحق بن سکے، اس سے یہ شبہ رفع ہوجاتا ہے کہ جب تخلیق انسانی میں خالق نے فجور وتقویٰ دونوں کی استعداد رکھ دی ہے، تو وہ ان کے ارتکاب پر مجبور ہے اور کسی عذاب وثواب کا مستحق نہیں۔

یہ تفسیر ایک حدیث مرفوع سے مستفاد ہے جو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ تقدیر کے متعلق سوال کیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہی آیت تلاوت فرمائی تھی اس آیت سے مسئلہ تقدیر پر شبہ کا جواب اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ الہام فجور وتقویٰ سے یہ مراد ہو کہ حق تعالیٰ نے نفس انسانی میں فجور اور تقویٰ دونوں کے مادے اور استعدادیں رکھ دی ہیں، اور اختیار دیدیا ہے کہ وہ دونوں میں سے جس کو چاہے اپنالے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وحضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت تلاوت فرماتے تو بلند آواز سے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِيْ تَقْوٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا وَزَكِّهَا وَاَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا (اے اللہ میرے نفس کو تقویٰ کی توفیق عطاء فرمائیے آپ میرے نفس کے مالک ومربی ہیں اور میرے نفس کو پاک فرمادیجئے آپ بہتر پاک فرمانے والے ہیں)

جواب قسم...... قسموں کے بعد ان ساتوں قسموں کا جواب ہے، یعنی وہ شخص کامیاب وبامراد ہوا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا اور وہ محروم ونامراد ہوا جس نے اس کو گناہوں کی دلدل میں دھنسادیا، تزکیہ کے اصل معنی باطنی پاکی کے ہیں اور ''دس'' کے معنی زمین میں دفن کردینے کے ہیں، زَکّٰی اور دَسّٰی دونوں کی ضمیریں مَن کی طرف راجع ہیں، جس سے مراد انسان ہے، لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ دونوں فاعلی ضمیریں اللہ کی طرف لوٹ رہی ہیں، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ کامیاب ہوا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے پاک کردیا، اور نامراد ومحروم ہوا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں میں دھنسادیا۔ اس آیت نے سب انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کردیا، ایک کامیاب وبامراد دوسرا محروم ونامراد۔

چنانچہ آگے دوسرے گروہ کا ایک واقعہ بطور مثال ذکر کر کے نامرادوں کو ان کے انجام بد سے خبردار کیا گیا، اور ڈرایا گیا ہے، کہ نامرادوں کو آخرت میں تو سخت سزا ملنی ہی ہے، لیکن بعض اوقات دنیا ہی سے ان کی سزا کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جیسے کہ قوم ثمود پر دنیا میں بھی عذاب آیا۔

قسمیں اور ان کی خصوصیات

اہل عرب کے نزدیک کسی بات کا یقین دلانے کے لئے سب سے آخری چیز قسم ہوتی تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ خلاف واقعہ قسم کھا کر کوئی سرسبز نہیں ہوسکتا۔ اس لئے قرآن پاک میں اگر توحید اور نبوت ورسالت وغیرہ مضامین کو دلائل سے ثابت کیا گیا، تو عرف عرب کے مطابق قسموں سے بھی ان مضامین کو ثابت کیا گیا ہے، اس سورت کے شروع میں سات قسمیں مذکور ہیں: (۱) جو مضمون مقصود (جواب قسم) پر دلائل بھی ہیں، اور (۲) قدرتِ خداوندی کے نمونے بھی (۳) ضرورت رسالت پر شواہد بھی ہیں (۴) اور سلسلۂ نبوت کا تعارف بھی، کفار ومشرکین کے لیے یہ وعیدیں بھی ہیں (۶) اور پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کے لئے ان میں سامان تسلی بھی ہے، اگر غور کیا جائے تو ان قسموں کی تفصیلات میں اتنی وسعتیں ہیں کہ ہماری اس مختصر کتاب کے دامن میں ان کی قطعاً گنجائش نہیں، ذیل صرف ایک پہلو کی مختصر توضیح ملاحظہ فرمائیں۔

پچھلی سورت (سورت البلد) میں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِي كَبَدٍ سے ایک حقیقت ثابتہ کو مدلل طریقہ پر بیان کیا گیا تھا اور وہ یہ کہ انسان کی فطرت میں محنت ومشقت رکھی گئی ہے، اس سورت (سورۃ الشمس) میں اس محنت کی وضاحت وتفصیل دی گئی ہے، دنیاوی کاروبار کو تو سب ہی لوگ جانتے اور کرتے ہیں، لیکن حضرت انسان کی پیدائش کا مقصد یہ محنت نہیں بلکہ وہ محنت ہے جو آخرت میں کام آئے، اور وہ محنت عبادت خداوندی کی محنت ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ نیز حدیث پاک میں دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا ہے: اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ. اور اس دنیوی کھیتی کیلئے اس عالم مادہ میں نفس انسانی کے علاوہ چیزوں کی ضرورت ہے، بغیر ان چھ چیزوں کے زراعت کا عمل ممکن نہیں۔

(۱) **آفتاب**: کہ اس کی حرارت سے قوت نامیہ زمین میں ابھرتی ہے، اور کھیتیاں اگتی ہیں، گویا سورج کھیتیوں کے حق میں ایسا ہے جیسے حیوانات کے لئے حرارت عزیزیہ، آفتاب کی گرمی سے پھل پھول آتے ہیں، اور کھیتیاں پک کر تیار ہوتی ہیں، اسی کی گردش سے موسم بدلتے ہیں۔ (۲) **مہتاب**: کہ اس کی رطوبت سے پھلوں پھولوں میں رس پڑتا ہے، سمندروں میں اسی سے مدو جزر کی کیفیات نمودار ہوتی ہیں، اور تاریکی میں آفتاب کی قائم مقامی بھی چاند ہی کرتا ہے۔ (۳) **دن**: کہ اس میں تمام کام کاج کئے جاتے ہیں۔ (۴) **رات**؛ کہ اس میں دن کے تھکے ماندے آرام کرتے ہیں، رات کی شبنم دن کی حرارت کا تدارک کرتی ہیں۔ (۵) **آسمان**؛ کہ بارش کا نزول وہیں سے ہوتا ہے، ہوا وہیں سے چلتی ہے، آفتاب ومہتاب اسی میں چمکتے ہیں۔ (۶) **زمین**: کہ بشرط قابلیت اسی میں کھیتی اور تخم ریزی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان جو دنیا میں آخرت کی کھیتی کرنے آیا ہے اس کو اپنی اخروی کھیتی میں بھی چھ چیزوں کی ضرورت ہے۔

(۱) **آفتاب نبوت**: کہ اسی کی روشنی وگرمی سے سب کام بنتے ہیں۔ (۲) **چاند**: یعنی آفتاب نبوت کے جانشین ونائبین کہ نور نبوت کے بعد ان کا نور ولایت چاند کے مثل ہے، جس طرح چاند کی روشنی آفتاب کا پرتو ہے اسی طرح نور ولایت بھی نور نبوت کا پرتو ہے۔ (۳) **دن**: یعنی عمر گرانمایہ کا وہ حصہ جس میں آخرت کے لئے کھیتی کرسکے۔ (۴) **رات**: یعنی انسان کے دنیوی کاروبار اور راحت کا وقت۔ چونکہ اس میں اللہ سے کسی نہ کسی درجہ میں غفلت ضرور ہوجاتی ہے۔ اس لئے اس کو رات سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ یہ وقت بھی نفس انسانی کے لئے ضروری ہے، کیونکہ اس میں انسان اپنے نفس واہل وعیال اور خلق خدا کے حقوق کی ادائیگی کرتا ہے، اگر اس کے لئے یہ رات نہ ہوتی تو وہ دنیا سے بیکار ومعطل ہوجاتا۔ اور

انسانیت کے مرتبہ سے نکل کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک عابد وزاہد صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا، سوؤ بھی اور نماز تہجد بھی پڑھو، اور یہ بھی فرمایا کہ تم پر تمہارے نفس کا بھی حق ہے، بیوی کا بھی حق ہے۔ اور پڑوسی کا بھی حق ہے، وغیرہ (مطلب یہ ہے کہ خالق ومخلوق سب کے حقوق ادا کرتے ہوئے زندگی گذارو)۔

صحیح روایت میں وارد ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو راستہ میں ملے اور کہنے لگے کہ حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کیوں؟ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اس لئے کہ جب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخرت اور دوزخ وجنت سب کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اور جب مجلس مقدس سے واپسی پر بال بچوں میں مشغول ہوتا ہوں تو وہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ حال تو میرا بھی ہے، چلو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کریں، چنانچہ دونوں نے جا کر ماجرا عرض کردیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم پر وہی حال طاری رہے جو میری مجلس میں رہتا ہے تو تم اپنی بیویوں سے لذت نہ اٹھا سکو بلکہ نعرے مارتے ہوئے جنگلوں کو نکل جاؤ، اور فرشتے راستوں میں تم سے مصافحے کرنے لگیں۔ لیکن یہ حالت ہمیشہ نہیں رہتی۔ کبھی یہ حالت ہوتی ہے اور کبھی وہ۔ (تا کہ حق کی طرف بھی توجہ ہو اور دوسرے وقت خلق کی طرف بھی۔ اور دونوں قسم کے حقوق یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی ممکن ہو سکے) اس سے معلوم ہوا کہ وقت راحت وغفلت بھی اللہ کی عظیم الشان نعمت ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جس طرح تہجد گذاری وشب بیداری میں ثواب کی توقع رکھتا ہوں رات کو سونے اور آرام کرنے میں بھی اجر وثواب کی امید رکھتا ہوں۔

تنبیہ: ...... البتہ جو غفلت خلاف شرع ہو، معین طاعت نہ ہو یا معاصی کی طرف مفضی ہو وہ شرعاً مذموم وحرام ہے۔

(۵) **آسمان شریعت:** جو آخرت کے کاشتکار کو ہر طرف سے محیط ہے۔ اور عقائد واعمال واحوال کی بارش بھی وہیں سے برستی ہے، وہیں سے شوق کی ہوائیں چلتی ہیں، جو شخص شریعت مطہرہ سے باہر نکل کر آخرت کی کھیتی کرنا چاہتا ہے، وہ گویا آسمان سے باہر نکلنا چاہتا ہے، جو ہرگز ممکن نہیں۔ (۶) **زمین:** اور اس سے مراد انسان کی وہ خداداد قابلیت واستعداد ہے جس میں عقائد واعمال اور احوال سرسبز ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں جس قدر اس میں فراخی، پاکی اور صفائی ہوگی۔ اور جس قدر اعلیٰ استعداد وصلاحیت کی یہ زمین ہوگی اسی قدر اس میں عقائد واعمال اور احوال کی بہاریں نشو ونما پائیں گی۔

مفسرین نے ان قسموں کی تعبیرات اپنے اپنے رجحانات کے موافق متعدد کی ہیں جن میں رطب ویابس شامل ہیں، ہم نے اختصار کو ملحوظ رکھ کر ایک تعبیر کی وضاحت کردی ہے، اور اس کے شروع میں ان فوائد کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے، جن کو مفسرین نے مستقل تعبیرات کی شکل دیکر طویل مباحث ذکر کی ہیں۔ فمن شاء فلیطالع فی المطولات.

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا یہاں سے سورت کے ختم تک خَابَ کی تاکید معنوی ہے، اور ضلالت وطغیان کے نتیجہ میں خیبت وخسران کی ایک نظیر ہے، كَذَّبَتْ کا مفعول بہ نُبُوَّةَ صَالِحٍ محذوف ہے۔ بِطَغْوٰهَا میں باء سببیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قوم ثمود چونکہ کفر کی آخری حد سے بڑھ چکی تھی اس سبب سے اس نے حضرت صالح علیہ السلام کے پیام توحید ونبوت کی تکذیب کی۔ حضرت صالحؑ نے قوم سے فرمایا اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ. مگر آپ کی قوم نے جواب دیا مَا اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ. یعنی معجزہ طلب کیا اور ایک معین پتھر سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی برآمد کرنے کی خواہش ظاہر کی، حضرت صالح علیہ السلام کی دعاء سے ایک گابھن اونٹنی اس پتھر سے

برآمد ہوئی، اور فوراً اس کے پیٹ سے اسی جیسا بچہ پیدا ہوگیا، یہ اونٹنی سب جانوروں کا پانی پی جاتی تھی۔ اس لئے پانی کی باری مقرر کردی گئی، کہ ایک دن کا پانی صرف اونٹنی پیا کرے گی اور دوسرے دن کا دوسرے جانور، کافروں کو یہ تقسیم ناگوار گذری، اس لئے انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا تاکہ یہ دقت ہی ختم ہوجائے۔ ایک فاحشہ عورت نے (جس کی ملک میں کافی جانور تھے، اور قدار بن سالف بدمعاش سے اس کی آشنائی بھی تھی اس) قدار بدکردار کو اونٹنی کے قتل پر آمادہ کرلیا، اس قدار نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اونٹنی کے قتل کا عزم کرلیا، جب حضرت صالح علیہ السلام کو ان لوگوں کی بدنیتی کا علم ہوا تو انہوں نے ان کو اس حرکت سے منع کیا، چنانچہ ارشاد ہے:

اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا فَقَالَ لَهُمۡ (قوم ثمود نے تکذیب اس وقت کی جبکہ ان میں سے سب سے بڑا بدبخت اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ تو اللہ کے رسول نے فرمایا: اللہ کی اونٹنی کو رہنے دو، اور اس کے قتل سے ڈرو، اور اونٹنی کے پانی پینے سے بھی تعرض نہ کرو) حضرت صالح علیہ السلام نے سمجھایا۔ عذاب سے ڈرایا، مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔

فَكَذَّبُوۡهُ فَعَقَرُوۡهَا (حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کو کونچیں کاٹ دیں) اونٹنی کو قتل کرنیوالا قدار اگرچہ بدکردار تھا، لیکن مشورہ میں سب شریک تھے، اس لئے قتل کی نسبت سب کی طرف کردی گئی، مقاتل نے کہا کہ قتل کرنے والے نو آدمی تھے، اور اسم تفضیل کا صیغہ اَشۡقٰى اگرچہ واحد ہے، مگر اسم تفضیل جب مضاف ہوتا ہے تو اس سے مراد واحد بھی ہوسکتا ہے اور جمع بھی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ تین دن تم اپنی زندگی سے بہرہ اندوز ہوسکتے ہو، اس کے بعد تم پر عذاب آئے گا، اور اس کی علامت یہ ہے کہ تین دن گذرنے کے بعد پہلے دن تمہارے چہرے زرد ہوجائیں گے، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ اور تین دن کے بعد تم سب ہلاک کردیے جاؤ گے۔ اونٹنی کو جب یہ بدنصیب مار چکے تو بچہ پہاڑوں میں جا چھپا، حضرت صالح علیہ السلام نے تب بھی قوم کو بچانے کی کوشش کی، فرمایا: جاؤ بچہ کو تلاش کرلو، اگر وہ مل گیا تو شاید تم عذاب سے بچ جاؤ لیکن جب بچہ نہ ملا تو آپ نے اس وقت عذاب کی خبر صاف صاف سنادی، کہ تین دن کی مہلت ہے اگر صدق دل سے توبہ کرلو تو ٹھیک ہے ورنہ عذاب میں پکڑ لئے جاؤ گے، تین دن گذرنے پر جب عذاب کے آثار شروع ہوئے اور سب کے چہرے زرد ہوگئے تو قُدار اور اس کے ساتھیوں نے یہ طے کرلیا کہ حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے اہل وعیال کو راتوں رات شہید کردو، چنانچہ رات کے وقت یہ نو بدمعاش حملہ کرنے کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کے مکان پر جا پہنچے، اللہ تعالیٰ نے وہیں ان بدمعاشوں کو ہلاک کردیا، یہ دیکھ کر قوم کو اور بھی جوش آیا، اور وہ آمادۂ جنگ ہوگئی، ادھر اہل ایمان (رئیس قوم جندع بن عمرو اور اس کے رفقاء جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے) بھی ان کا جواب دینے کے لئے تیار ہوگئے، مگر گفت وشنید پر یہ طے پایا کہ اہل ایمان شہر سے نکل جائیں، چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام مؤمنوں کو لیکر شہر سے باہر نکل گئے، یہ دوسرے دن کی بات ہے جبکہ سب کے چہرے سرخ ہوچکے تھے، اگلے دن سب کے چہرے سیاہ ہوگئے اور ان کو اپنی ہلاکت کا یقین ہوگیا، اس لئے وہ اپنے بنائے ہوئے مضبوط مکانات اور قلعوں میں محفوظ ہوگئے، ادھر سیاہ آندھی چلی، زلزلہ آیا، اور تین بار سخت کڑک کی ایسی ہیبتناک آوازیں آئیں کہ ان کی ناپاک روحیں ان کے منحوس جسموں سے جدا ہوگئیں، اور سب اپنے مکانات میں منہ کے بل مردہ پڑے رہ گئے۔ فَبُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ وَاحۡفَظۡنَا مِنۡ غَضَبِكَ وَعَذَابِكَ يَا اَرۡحَمَ الرّٰحِمِيۡنَ فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ یعنی تین دن کے بعد ان کے رب نے ایک ہمہ گیر عذاب سے

ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ بِذَنۡبِهِمۡ ان کے گناہ کے سبب سے، گناہ و نافرمانی سے مراد تکذیب صالح علیہ السلام وقتل ناقہ ہے۔ فَسَوّٰهَا (تباہی وہلاکت ایک سی کردی، کہ اس بدکردار قوم کا کوئی ایک فرد بھی زندہ باقی نہ رہا۔) وَلَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا لَا يَخَافُ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، یعنی اللہ کو اس دمدمہ (تباہی) یا ثمود کی بربادی کے انجام کا کوئی اندیشہ وفکر نہ تھا، کہ وہ کسی قدر ان میں سے کسی پر رحم فرما کر کسی کو زندہ چھوڑ دیتا۔ ضحاک، سدی اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ لَا يَخَافُ کی ضمیر اشقیٰ کی طرف راجع ہے، اور کلام میں کچھ تقدیم وتاخیر ہے، اصل کلام اس طرح تھا اِذِ انۡبَعَثَ اَشۡقٰهَا وَلَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا یعنی سب سے بڑا بدبخت اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے فوراً تیار ہوگیا، اور اسکے نتیجہ کی طرف سے اس کو کچھ خوف نہ ہوا۔ لیکن آیت کا صاف اور بے غبار مطلب یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے عذاب دینے اور کسی قوم کو تباہ کردینے کے معاملہ کو دنیا کے معاملات پر قیاس نہ کرو، کہ جب کوئی بڑے سے بڑا صاحب قوت وشوکت بادشاہ بھی کسی قوم کے ساتھ ایسا بربادی کا معاملہ کرتا ہے تو اس کو خود بھی خطرہ رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے باقی ماندہ یا حامی لوگ ہم سے ان کا انتقام لے لیں۔ یا رعایا بغاوت پر آمادہ ہوجائے، حاصل یہ ہے کہ دنیا میں دوسروں کو مارنے والا خود بھی کبھی بے خطر نہیں ہوتا، دوسروں پر حملہ کرنے والے کو لازمی طور دوسروں کے حملے کا خطرہ ہوتا ہے، لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کو کبھی کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

(فائدہ) قدار بروزن غلام، یہ پاجی، پستہ قد، چتکبرا، نیلی آنکھوں والا، سرخ رنگ، بڑا موٹا تازہ، شریر ومتکبر اور شہوت پرست شخص تھا، یہ ایسا منحوس تھا جس نے خود کو بھی ہلاک کیا، اور اپنی بدکرداری سے پوری قوم کو غارت کردیا، اس لئے عرب میں یہ مثل مشہور ہوگئی فُلَانٌ اَشۡاَمُ مِنۡ قُدَارٍ فلاں شخص قدار سے بھی زیادہ منحوس و بدبخت ہے۔

قدار کو اشقیٰ کیوں کہا گیا؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں سب سے بڑا بدبخت ناقۂ ثمود کی کونچیں کاٹنے والا اور آدم علیہ السلام کا وہ بیٹا تھا جس (قابیل) نے اپنے بھائی (ہابیل) کو قتل کیا تھا، اس نے سب سے پہلے قتل کا طریقہ نکالا، اس لئے دنیا میں جو بھی خون بہایا جائیگا اس (کے عذاب) کا ایک حصہ اس کو پہنچے گا۔ (سندہٗ صحیح مظہری) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بارہا ارشاد فرمایا کہ میں تم کو بتاؤں، سب سے بڑا اشقی کون ہے؟ عرض کیا فرمائیے، ارشاد فرمایا ایک تو وہ جس نے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کیا، اور اس سے بڑا بدبخت وہ ہے جو تمہارے سر پر تلوار مار کر تمہاری ڈاڑھی خون سے رنگین کردیگا، (رواہ احمد وغیرہ بسند صحیح) اب چند امور سمجھئے تاکہ ان کا اشقی ہونا سمجھ میں آجائے۔ (۱) ہر قسم کی شہوت وجہ خست اور موجب ذلت ہے، کیونکہ گرفتار شہوت میں تملق، چاپلوسی، خوشامد جیسی گھناؤنی خصلتیں اور انفعالی کیفیتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ (۲) شہوتوں میں فرج کی شہوت سب سے زیادہ بدترین ہے، کیونکہ وہ جگہ شرمناک بھی ہے، گندگیوں سے پر بھی ہے، اس کا ذکر بھی ناپسندیدہ ہے، گالی اسی کی دی جاتی ہے۔ وغیرہ۔ (۳) غضب سے جب حق تلفی ہونے لگے، تو وہ بھی بیحد معیوب شمار ہوتا ہے، اب سمجھئے کہ سب سے زیادہ بدبخت قدار نے نہایت گندی شہوت (شہوت فرج) کی خاطر اللہ کی اونٹنی کو مار کر اللہ کی حق تلفی کی، اپنی حق تلفی کی کہ خود ہلاکت وعذاب میں گرفتار ہوا، اپنی قوم کو برباد کرکے ان کی بھی حق تلفی کی۔ حاصل یہ کہ بدترین شہوت کی وجہ سے ہر قسم کی حق تلفی کا ارتکاب کرکے قدار بن سالف پہلی امتوں میں اشقی قرار پایا، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل نے بھی بالکل اسی قسم کے جرم کا ارتکاب کیا، تو وہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اشقی کہلایا، اس کی مزید تفصیل تفسیر فتح العزیز میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

تم تفسیر سورہ الشمس بکمالہ فالحمدللہ علیٰ نوالہ والصلوٰۃ والسلام علی النبی والہٖ بقدر حسنہٖ وجمالہٖ ومتبعی امرہٖ بامتثالہٖ

سُوۡرَۃُ الیَلِ

سُوۡرَۃُ الیَلِ مَکِّیَۃٌ وَھِیَ اِحۡدٰیۡ وَعِشۡرُوۡنَ آیَۃً

(رکوع:۱،آیات:۲۱) سورۂ لیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں اکیس آیات ہیں۔ (کلمات:۷۱،حروف:۳۱۰)

ربط ومناسبت:

سورۃ الشمس اور سورۃ الیل میں ربط ومناسبت کئی وجوہ سے ہے۔(۱) دونوں سورتوں کی ابتداء ایسی چیزوں کی قسموں سے ہوئی جو باہم نہایت مناسبت رکھتی ہیں۔(۲) سورۃ الشمس میں نفوس انسانیہ کا باہمی اختلاف مذکور تھا، کہ بعض کو الہام فجور اور بعض کو الہام تقویٰ ہوتا ہے، اس سورت میں بھی نفوس انسانیہ کا یہی تفاوت آیات اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی اور فَاَمَّا مَنۡ ...... میں مذکور ہے۔(۳) سابقہ سورت میں الہام فجور وتقویٰ کا ذکر تھا اس میں اس کا انجام واثر مذکور ہے۔(۴) وہاں اشقیٰ کا بیان تھا یہاں جماعت اشقیاء کا بیان ہے۔(۵) وہاں امت صالح علیہ السلام کے اشقیٰ (قدار بن سالف) کا بیان تھا یہاں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اشقیٰ (امیہ بن خلف) کا ذکر ہے، اس نے ناقۃ اللہ پر ظلم کیا تھا، اور امیہ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت وصحبت بابرکت سے ایک بڑا مقام حاصل کیا تھا، گویا وہ ناقۃ اللہ کے مشابہ تھے، کیونکہ وجود ناقہ معجزہ صالح علیہ السلام تھا، اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیگر اصحاب کی طرح معجزۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

سورۃ الیل کی اہمیت:

سنن بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رایت میں ہے، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر وعصر میں وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی جیسی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اوسط میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک بار نماز ظہر پڑھائی، اس میں کسی قدر آواز بلند ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ سورۂ الشمس اور سورۂ اللیل پڑھ رہے ہیں، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو اس نماز میں کسی خاص سورت کے پڑھنے کا حکم ہے؟ فرمایا نہیں! لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہارے لئے (اندازہ) وقت مقرر کردوں۔(حقانی)

تنبیہ: ...... فجر وظہر میں مقتدیوں کے حال کے مناسب طوال مفصل (سورۂ حجرات سے سورۂ بروج تک کی سورتوں) میں سے اور عصر وعشاء میں اوساط مفصل (سورۂ بروج سے سورۂ بینہ تک کی سورتوں) میں سے اور مغرب میں قصار مفصل (سورۂ بینہ سے سورۂ ناس تک کی سورتوں) میں سے پڑھنا مسنون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز ظہر میں مفصل کے بجائے سورۂ الشمس اور سورۂ الیل کو پڑھنے سے ان کی اہمیت مفہوم ہوتی ہے۔

شان نزول:

امیۃ بن خلف مکہ معظمہ کا بڑا مالدار اور مشہور دشمن اسلام تھا، اس کے پاس تجارت، کھیتیاں اور باغات مختلف ذرائع آمدنی تھے، اس نے اپنے بارہ غلاموں کو تربیت دیکر ایک ایک کام کی ذمہ داری ونگرانی ایک ایک غلام کے حوالہ کردی تھی،

بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی ذلیل وبخیل دشمن اسلام کے غلام تھے، ان کے حوالہ خزانے اور بت خانہ کا انتظام تھا، گو اس کے پاس ہر قسم کا مال وسروسامان تھا مگر اس کے باوجود اعلیٰ درجہ کا بخیل اور کنجوس تھا، راہ خدا میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا تھا، اگر کوئی غلام کچھ خرچ کر دیتا تو اس پر آفات کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے، اور کسی نے اگر اس کو غریبوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دیدی تو بہت ناراض ہوتا، اس سے کوئی کہتا کہ آخرت میں تیرے کام آئے گا کچھ خرچ کر دیا کر تو کہتا کہ آخرت ہے کہاں؟ اور اگر ہوئی بھی تو میرے پاس سب کچھ ہے، یہ میرے کام آئے گا، مجھے اس جنت اور ان نعمتوں کی ضرورت نہیں، جن کا لالچ دلا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) محتاجوں اور کنگالوں کو اپنا معتقد بنا تا ہے، اور بھائی اپنا حال تو یہ ہے

صبح جام سے گذرتی ہے شب دل آرام گذرتی ہے　　　عاقبت کی خبر کسے معلوم یاں تو آرام سے گذرتی ہے

اس کے غلاموں میں سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوشیدہ طور سے مشرف باسلام ہو گئے تھے، رفتہ رفتہ اس بد بخت امیہ کو خبر ہو گئی، تو ان کو خزانے اور بت خانہ کی نظامت سے معزول کر کے طرح طرح کی تکلیفیں ان کو دینے لگا۔ اور کوشش کرتا رہا کہ یہ دین اسلام کو چھوڑ دیں، غلاموں سے رات بھر کوڑے لگواتا بدن میں ببول کے کانٹے اور سوئیاں چبھواتا۔ گرم ریت پر لٹا کر سینہ پر پتھر رکھواتا، گرمی میں ان کے پاس آگ جلواتا، مگر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر تکلیف کے وقت اَحَد اَحَد کا نعرہ لگاتے، یعنی اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔

ایک دن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس کے مکان کی طرف گذر ہوا، آہ وزاری اور شور وفریاد کی آوازیں سن کر پوچھا کیا بات ہے؟ کسی نے پورا ماجرا سنا دیا کہ ایک حبشی غلام کو اسلام قبول کر لینے کے جرم میں ستایا جا رہا ہے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بہت رحم آیا اور آپ امیہ سے ملے اور فرمایا کہ تو خدا سے نہیں ڈرتا، اس بیکس غریب پر اتنا ظلم کرتا ہے، اس نے کہا کہ اگر تو خدا ترس اور اسلام کا حامی ہے تو اس کو خرید لے، آپ نے فرمایا: بتا کیا مانگتا ہے، اس نے کہا کہ اپنا رومی غلام نسطاس دیدے اور بلال کو لے لے، نسطاس رومی بڑا ہوشیار اور قابل غلام تھا، دو ہزار دینار بھی اس نے اپنی کمائی کے جمع کر رکھے تھے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بخوشی منظور فرما لیا، اور نسطاس رومی غلام بلکہ اس کے ساتھ چالیس اوقیہ چاندی امیہ کے حوالہ کر کے حضرت بلال کو اس کی قید سے چھڑا لائے، آپ ان کو چھڑا کر لا رہے تھے اور وہ بد بخت ہنس ہنس کر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عقل ودانائی کے باوجود کیسا دھوکہ کھایا ہے، کہ وہ ایک قیمتی غلام مجھے دے گئے اور نکما غلام اس کے بدلہ میں لے گئے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بلال کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا، اور سب ماجرا سنا کر عرض کیا کہ آپ گواہ رہئے کہ میں نے صرف حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے بلال کو آزاد کر دیا، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے، اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ فارغ البال اور مطمئن ہو کر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے رہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسے بہت سے مظلوم غلاموں اور باندیوں کو خرید کر آزاد فرمایا تھا، مثلاً (۱) عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ بنی جدعان کے غلام تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو ایک رطل سونے کے عوض میں خرید کر آزاد کیا تھا، یہ ہجرت کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، اور جنگ بیر معونہ میں شہید ہوئے۔ (۲) زبیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ باندی تھیں، ان کو خرید کر آزاد کیا، آزادی کے بعد ان کی بینائی جاتی رہی تھی، کفار کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو خوب طعنے دیئے اور کہا: دیکھا ہمارے لات اور عزیٰ کی کرامت کہ انہوں نے اس کو کیسا اندھا کیا؟

حضرت زبیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تمہارے ان بے جان معبودوں میں یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ کسی کا کچھ بنا بگاڑ سکیں، اللہ مالک وقادر ہے وہ جو چاہے کرے حق تعالیٰ کو ان کی یہ بات ایسی پسند آئی کہ ان کی آنکھیں فوراً روشن ہوگئیں۔ (۳و۴) مہدیہ اور بنت مہدیہ، یہ دونوں (ماں اور بیٹی) قبیلہ بنی عبدالدار کی ایک عورت کی باندیاں تھیں، وہ عورت بھی ان دونوں پر بڑا ظلم ڈھاتی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو بھی نصیحت کی کہ ان بیچاریوں کو تکلیف نہ دے، اور ان کی جتنی قیمت ہو مجھ سے لے لے، اس عورت نے ان دونوں کی قیمت بہت مانگی آپ نے بلا چون وچرا اتنی ہی قیمت ادا کر کے ان کو خرید لیا، یہ دونوں ماں اور بیٹی اس وقت اپنی مالکہ کا آٹا پیسنے میں مشغول تھیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا خوش ہو جاؤ میں نے تم کو خرید کر اللہ کی رضا جوئی کے لئے آزاد کر دیا، اب تم دونوں اٹھو اور میرے ساتھ آؤ، ان دونوں نے عرض کیا اے صدیق ایک مدت سے ہم دونوں اس گھر میں پرورش پا رہی ہیں، ان کا نمک کھایا ہے، اب ان کا کام ادھورا چھوڑنا مناسب نہیں ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے، ان کو شاباشی دی، اور وہ دونوں اس عورت کا کام مکمل کر کے اس سے رخصت ہوئیں۔ (۵) مملوکہ بنی مؤمل۔ بنی مؤمل قبیلۂ بنی عدی کا ایک خاندان تھا، اسی قبیلہ بنی عدی کے ایک فرد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے جو ابھی مشرف باسلام نہ ہوئے تھے، اس مملوکہ کو بھی سخت تعذیب کیجارہی تھی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو خرید کر لوجہ اللہ آزاد کیا۔ (۶) ام عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مظلومہ کو بھی آپ نے خرید کر آزاد فرمایا۔ اور کفار کے ظلم وستم سے نجات دلائی۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے غلاموں اور باندیوں کو آزاد فرمایا، اس کے باجود حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چالیس ہزار درہم بچ رہے، جو آپ نے پیغمبر اسلام اور مسلمانوں پر بے دریغ خرچ کئے، ہجرت کے وقت صرف چھ ہزار درہم باقی تھے، جن میں سے کچھ سفر ہجرت میں اور باقی مسجد نبوی کی زمین خریدنے میں خرچ کر ڈالے، غرض یہ کہ آپ نے تمام اپنا سرمایہ نیک کاموں میں صرف فرمادیا۔

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **ان من امنّ الناس علی فی صحبته وماله ابوبکر ولو کنت متخذا خلیلا لاتخذت ابابکر خلیلا ولکن اخوة الاسلام (متفق علیه)** یعنی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے جان ومال سے مجھ پر تمام لوگوں سے بڑھ کر احسان کیا ہے، اگر اللہ کے سوا میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بناتا لیکن اخوۃ سلامی کافی ہے) ایک جگہ ارشاد ہے **ما نفعنی مال احد قط مانفعنی مال ابی بکر** (مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں پہنچایا جتنا ابوبکر کے مال نے پہنچایا ہے) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا تمام مال اسلام کی شان وشوکت کو چار چاند لگانے میں صرف فرمادیا، اور خود مفلس ہو گئے، تو ایک دن کمبل لپیٹ کے اور کانٹوں کے اس میں ٹکے لگا کر حاضر خدمت ہوئے ادھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حال پوچھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہوں نے اپنا تمام سرمایہ مجھ پر اور اسلام ومسلمین پر خرچ کر دیا ہے، اب ان کے پاس کچھ نہیں رہا، اسلئے یہ حال ہے، حضرت جبرئیلؑ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سلام فرمایا ہے اور پوچھا ہے کہ وہ اس حالت فقر میں بھی مجھ سے راضی ہیں یا نہیں، یہ سن کر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور بار بار کہتے رہے **انا عن ربی راض انا عن ربی راض** (میں اپنے رب سے راضی ہوں، میں اپنے رب سے راضی ہوں) اس سورت میں امیہ بن خلف جیسے دشمن اسلام وبخیل اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے فدائے اسلام وسخی کے حالات کا نقشہ کھینچ کر ان کی سعادت وشقاوت اور بنی آدم کی مختلف کوششوں کے اچھے اور برے انجام کو بیان فرمایا گیا ہے، تا کہ نیک بخت لوگ اہل شقاوت کی راہ سے بچ کر اہل سعادت کا راستہ اختیار کریں۔ **(والاعتبار لعموم الالفاظ لالخصوص الاسباب)**

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (۱) وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى (۲) وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (۳) اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (۴)

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے، اور دن کی جب وہ روشن ہو جائے، اور اس کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا، بیشک تمہاری کوششیں مختلف ہیں،

وَ	الَّيْلِ	اِذَا	يَغْشٰى	وَ	النَّهَارِ	اِذَا	تَجَلّٰى	وَ	مَا	خَلَقَ	الذَّكَرَ	وَ	الْاُنْثٰى	اِنَّ	سَعْيَكُمْ	لَشَتّٰى
قسم	رات	جب	ڈھانک لے	اور	دن	جب	روشن ہو	اور	جس	پیدا کیا	مرد	اور	عورت	تحقیق	سعی تمہاری	مختلف

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۵) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (۶) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (۷) وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ

پھر جس نے دیا اور پرہیزگاری اختیار کی، اور اچھی بات کی تصدیق کی، تو ہم اس کے لئے راحت کی چیز آسان کردیں گے، اور جس نے کنجوسی کی

فَاَمَّا	مَنْ	اَعْطٰى	وَ	اتَّقٰى	وَ	صَدَّقَ	بِالْحُسْنٰى	فَسَنُيَسِّرُهٗ	لِلْيُسْرٰى	وَ	اَمَّا	مَنْ	بَخِلَ
پس اپیر	جس	دیا	اور	پرہیزگاری کی	اور	سچ مانا	کو اچھی بات	پس آسان کرینگے	واسطے آسانی	اور	اپیر	جس	بخیلی کی

وَاسْتَغْنٰى (۸) وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (۹) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (۱۰) وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا

اور بے پروائی اختیار کی، اور اچھی بات کو جھٹلا دیا، تو ہم اس کے لئے تکلیف کی چیز آسان کردیں گے، اور اسکا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئیگا جب

وَ	اسْتَغْنٰى	وَ	كَذَّبَ	بِالْحُسْنٰى	فَسَنُيَسِّرُهٗ	لِلْعُسْرٰى	وَ	مَا	يُغْنِيْ	عَنْهُ	مَالُهٗ	اِذَا
اور	بے پروائی کی	اور	جھٹلایا	کو اچھی بات	پس آسان کرینگے ہم	واسطے سختی	اور	نہ	کفایت کریگا	سے اس	مال اس	جب

تَرَدّٰى (۱۱) اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (۱۲) وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۱۳) فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (۱۴)

وہ برباد ہونے لگے گا، بیشک ہم پر تو راہ دکھا دینا ہے، اور ہمارے ہی قبضہ میں ہے آخرت اور دنیا پھر میں تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں

تَرَدّٰى	اِنَّ	عَلَيْنَا	لَلْهُدٰى	وَاِنَّ	لَنَا	لَلْاٰخِرَةَ	وَالْاُوْلٰى	فَاَنْذَرْتُكُمْ	نَارًا	تَلَظّٰى
نیچے گریگا وہ	بیشک	ہم پر	البتہ راہ دکھانا	اور بیشک	ہمارے لئے	آخرت	اور دنیا	پس میں تمہیں ڈراتا ہوں	آگ	بھڑکتی ہوئی

لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (۱۵) الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۱۶) وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى (۱۷) الَّذِيْ يُؤْتِيْ

اس میں وہی بدبخت گرے گا، جس نے جھٹلا دیا اور منہ موڑ لیا، اور اس آگ سے وہ پرہیزگار دور رہے گا جو اپنا مال اس غرض سے دیتا ہے کہ

لَا	يَصْلٰهَا	اِلَّا	الْاَشْقَى	الَّذِيْ	كَذَّبَ	وَ	تَوَلّٰى	وَ	سَيُجَنَّبُهَا	الْاَتْقَى	الَّذِيْ	يُؤْتِيْ
نہیں	داخل ہوگا اس	مگر	بڑا بدبخت	جس	جھٹلایا	اور	منہ پھیرا	اور	البتہ ایکطرف کیا جائیگا	بڑا پرہیزگار	وہ جو	دیتا ہے

مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۱۸) وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى (۱۹)

وہ پاک ہو جائے، اور اس پر کسی کا کوئی احسان بھی نہیں جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو۔

مَالَهٗ	يَتَزَكّٰى	وَ	مَا	لِاَحَدٍ	عِنْدَهٗ	مِنْ	نِعْمَةٍ	تُجْزٰى
مال اپنا	پاک ہوتا ہے	اور	نہیں	کسی کیلئے	اس پر	سے	احسان	بدلہ دیا جائے

اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی (۲۰) وَلَسَوْفَ يَرْضٰی (۲۱)

وہ صرف اپنے عالیشان رب کی رضاجوئی کے لئے دیتا ہے، اور وہ عنقریب خوش ہوجائے گا۔

اِلَّا	ابْتِغَاءَ	وَجْهِ	رَبِّهِ	الْاَعْلٰی	وَلَسَوْفَ	يَرْضٰی
مگر	چاہنا	رضا	اپنا رب	بلند و برتر	اور عنقریب	راضی ہوگا

لغات:

شَتّٰی طرح طرح، جدا جدا، مختلف، متفرق، پراگندہ، بعض کے نزدیک یہ لفظ مفرد ہے، اور بعض نے اس کو شَتِيْت کی جمع کہا ہے، شَتَّ شَتًّا، شَتَاتًا شَتِيْتًا (ض) متفرق ہونا اَعْطٰی اِعْطَاء سے دینا، عَطَاء عَطْوًا (ن) لینا، بلند کرنا، اَلْحُسْنٰی اچھی، عمدہ، اچھا کام، اچھا انجام، بروزن فُعْلٰی۔ حَسُنَ (ک) سے اسم تفضیل کا صیغہ واحد مؤنث، یہاں اس سے مراد یا تو کلمۂ طیبہ ہے یا جنت یا وعدۂ خداوندی۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ باب تفعیل سے آسان کرنا، مجرد میں (ض) سے آسان ہونا۔ اَلْيُسْرٰی سہولت، راحت، عمل جنت، شریعت، یہ اَيْسَر اسم تفضیل کے صیغہ کی مؤنث ہے، بَخِلَ (س) کنجوسی کرنا، یعنی خرچ کرنے کے مواقع پر خرچ نہ کرنا، اس کے مقابل جود ہے، بخل کی دوقسمیں (۱) خود مناسب جگہ پر خرچ نہ کرنا (۲) دوسروں کو خرچ کرنے سے روکنا۔ اَلْعُسْرٰی دشواری، مصیبت، دوزخ یا وہ عمل جو دوزخ میں لیجائے۔ یہ اَعْسَر صیغہ اس تفضیل کا مؤنث ہے۔ (س ک) دشوار ہونا۔ تَرَدّٰی واحد مذکر غائب ماضی تفعل سے نیچے گرا، گڑھے میں گرا رَدٰی رَدْيًا (ض) دھکا دینا، توڑنا رَدِی (س) ہلاک ہونا، گرنا۔ تَلَظّٰی مضارع کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہے، اصل میں تَتَلَظّٰی تھا ایک تاء حذف ہوگئی، بھڑکنا، مجرد میں (س) سے اسی معنی میں۔

ترکیب:

اول کی تینوں آیات کی ترکیب مثل ترکیب وَالشَّمْسِ ہے، مَا خَلَقَ میں مَا موصوفہ یا موصولہ بمعنی مَنْ ہے اِنَّ اپنے اسم سَعْيَكُمْ اور خبر لَشَتّٰی سے مل کر جواب قسم ہے (والسعی مصدر بمعنی الجمع لاضافته الیٰ ضمیر الجمع ولهذا اخبر عنه بالجمع) فَاَمَّا مَنْ الی الْعُسْرٰی مر مثله غير مرة. وَمَا نافية ويجوز ان تكون للاستفهام الانكاری منصوبة بما بعدها، يُغْنِیْ فعل عَنْهُ متعلق ضمیر عائد الی من مَالُهٗ فاعل۔ مَا نافیہ ماننے کی صورت میں مفعول بہ عَذَابًا محذوف ہوگا۔ اور استفہامیہ کی صورت میں خود مَا مفعول بہ ہے، جو صدارت کلام کی وجہ سے مقدم کردیا گیا، اِذَا تَرَدّٰی جملہ فعلیہ اِذَا ظرفیہ کا مضاف الیہ ہوکر يُغْنِیْ کا ظرف ہوا۔ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰی ، خبر مقدم اسم مؤخر مر مثله والجملة استینافية مقررة لما قبلها. وَاِنَّ لَنَا ...... معطوف ہے ماسبق پر۔ فاء تفریعیہ اَنْذَرْتُ فعل با فاعل كُمْ مفعول بہ اول نَارًا موصوف تَلَظّٰی فعل ضمیر فاعل، جملہ فعلیہ صفت اول لَا يَصْلٰهَا فعل ومفعول بہ اِلَّا حرف استثناء لغو الْاَشْقٰی موصوف الَّذِیْ اسم موصول كَذَّبَ فعل فاعل جملہ معطوف علیہ وَتَوَلّٰی جملہ فعلیہ معطوف معطوفین صلہ۔ موصول وصلہ مل کر صفت الْاَشْقٰی اپنی صفت سے مل کر فاعل، جملہ فعلیہ صفت ثانی، نَارًا کی مرکب توصیفی مفعول بہ ثانی، جملہ فعلیہ ہوکر معطوف علیہ وَ عاطفہ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقٰی فعل مفعول بہ فاعل علی الترتیب اور الَّذِیْ اسم موصول اپنے صلہ يُؤْتِیْ سے مل کر الْاَتْقٰی کی صفت ہے، اور يَتَزَكّٰی يُؤْتِیْ سے بدل ہے، یا اس کی ضمیر سے حال ہے، جملہ فعلیہ معطوف۔ وَ عاطفہ مَا حرف مشابہ بلیس لاحد خبر مقدم عِنْدَهٗ ظرف ہے خبر کا یعنی لِاَحَدٍ

متعلق کا مِنْ نِعْمَةٍ اسم مَا ہے اور مِنْ زائد ہے تحسین کلام کے لئے تُجْزٰی فعل مضارع مجہول ضمیر نائب فاعل۔ جملہ نِعْمَةٍ کی صفت ہے، اِلَّا حرف استثناء لغو اِبْتِغَاءَ مضاف وَجْهِ مضاف الیہ مضاف رَبِّهٖ مرکب اضافی موصوف الْاَعْلٰی صفت، موصوف صفت مل کر مضاف الیہ، مرکب اضافی مفعول مطلق فعل محذوف کا ای الا لمن یبتغی بھٰذا العمل ابتغاء یا مفعول لہٗ ہے فعل محذوف کا ای لکن لطلب رضاء ربہ الاعلیٰ، عندہٗ کی ضمیر مفعول مطلق ہونے کی صورت میں اللہ کی طرف عائد ہوگی، اور دوسری (مفعول لہٗ ہونے کی) صورت میں الْاَتْقٰی کی طرف راجع ہوگی جس کا مصداق صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، اور استثناء منقطع ہوگا۔ وَلَسَوْفَ پر لام ابتدائیہ ہے جو جملہ اسمیہ کے مضمون کی تاکید کے لئے آتا ہے، اور مبتداء محذوف ہے ای وَلَهُوَ سَوْفَ يَرْضٰی، اس طرح یہ جملہ اسمیہ ہو جائیگا، اور یہ لام قسم نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ لام قسم (لام تاکید) فعل مضارع پر نون تاکید ہی کے ساتھ داخل ہوتا ہے، لہٰذا اس لام کا لام ابتداء ہونا متعین ہے، اور وہ مضمون جملہ اسمیہ کی تاکید کے لئے مبتداء ہی پر داخل ہوتا ہے، اس لئے مبتداء (هو) کا محذوف ماننا ضروری ہوا۔ اور يُرْضٰی کی ضمیر فاعل میں دو احتمال ہیں، اس کا مرجع رب ہوگا یا الْاَتْقٰی ہوگا، اور ضمیر مفعول محذوف ہے رعایت فاصلہ کی وجہ سے ای یرضاہ، یہ جملہ فعلیہ مبتداء محذوف هو کی خبر ہے، اور جملہ اسمیہ کا ماسبق پر عطف ہے۔

(فائدہ) صاحب کشاف نے اس لام کو لام قسم ہی مانا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ مقسم علیہ پر داخل ہے اور اس کے ساتھ نون تاکید اس وقت ضروری ہے جبکہ لام قسم و لام ابتداء میں التباس کا اندیشہ ہو، اور یہاں پر لفظ سوف اس کا قرینہ موجود ہے کہ یہ لام قسم ہے، کیونکہ لام ابتداء سوف پر داخل نہیں ہوتا، بعض دوسرے حضرات نے کہا کہ یہ لام لام قسم ہی ہے، اور لام قسم و نون تاکید میں فعل مضارع کے اندر تلازم ضروری ہے، مگر اس سے دو صورتیں مستثنیٰ ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ لام قسم اور فعل مضارع کے درمیان حرف تنفیس (سین یا سوف) آجائے، سوف کی مثال یہی زیر بحث آیت ہے، اور سین کی مثال وَاللّٰهِ سَاُعْطِيْكَ دِرْهَمًا ہے۔ (۲) لام قسم و فعل مضارع کے درمیان معمول فعل فاصل بن جائے جیسے لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ۔ ابوعلی فارسی کہتے ہیں کہ اس آیت (وَلَسَوْفَ يَرْضٰی) میں لام اِنَّ زَيْدًا لَقَائِمٌ جیسا نہیں ہے بلکہ لَاَقُوْمَنَّ جیسا ہے اور اس مذکورہ آیت میں سَوْفَ نون تاکید کے قائم مقام ہے، گویا کہ یہ لَيَرْضَيَنَّ تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تفسیر:

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰی ...... قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے یا نور آفتاب کو چھپا کر دنیا کو تاریک کردے۔ رات قصیر و طویل، سرد و گرم ہونے کے اعتبار سے بھی حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی ہے، اور موت و قیامت کا بھی نمونہ ہے جس طرح یکے بعد دیگرے سب پر نیند ہو جاتی ہے اسی طرح اس دنیا میں یکے بعد دیگرے سب پر موت طاری ہو جائیگی، آخر کار قیامت آجائیگی، رات دنیا میں ایک انقلاب عظیم بھی ہے، نیز انسان کی ظلمانی حالت کی تصویر ہے، کہ جب ظلمت نور قلب پر محیط ہو جاتی ہے تو اس سے اعمال بد سرزد ہوتے ہیں، جیسے رات کی تاریکی میں چوروں، ڈکیتوں، زناکاروں، جادوگروں اور بدکرداروں کو بدکرداریوں کا موقع ملتا ہے، اسی طرح نفس امارہ کو حالت ظلمت میں اپنی کارروائی کرنے کا موقع میسر ہوتا ہے۔

وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی اور دن کی قسم کھاتا ہوں جب وہ روشن ہو جائے۔ یہ اللہ کی قدرت کاملہ کا دوسرا نمونہ ہے، اس میں بعث و حشر کا منظر بھی ہے، اور اس میں انسان کی نورانی حالت کی طرف بھی اشارہ ہے، دن میں چور بدمعاش چھپ

جاتے اور لوگ اچھے اور جائز کاموں میں جہد وکوشش کرتے ہیں۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ...... اور قسم ہے نر و مادہ کو پیدا کرنے کی (اگر ما کو مصدر یہ مانا جائے) یا قسم ہے اس ذات کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا (جبکہ ما کو موصولہ بمعنی من مانا جائے) اور نر و مادہ سے کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا آدم علیہ السلام وحواء علیہا السلام مراد ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ہر ایک نر و مادہ مراد ہے خواہ وہ انسانی ہو یا حیوانی، یا اور کسی مخلوق کے نر و مادہ ہوں۔ یہ بھی اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ پر بڑی دلیل ہے کہ مادہ اور تخم ایک ہے مگر اس سے دو صنفیں (نر و مادہ) بن جاتی ہیں۔ پھر ہر ایک کے اعضاء کی تخلیق اور ان میں کمال تناسب، آپس میں مقناطیسی کشش، یہ سب امور اللہ کی قدرت وکاریگری کے کھلے کرشمے ہیں، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جس طرح ایک مادہ میں دو صنفوں کی قابلیت ہے اسی طرح نر و مادہ میں خیر وشر، کمال ونقصان کی صلاحیت بھی موجود ہے، جس طرح نر و مادہ کے میل سے اولاد وجود میں آتی ہے، اسی طرح انسانی قویٰ کے باہمی اختلاط سے عجائب وغرائب رونما ہوتے ہیں، اور اس سے مختلف اعمال سرزد ہوتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے: اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (بیشک تمہاری کوشش مختلف ہے) مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کسی نہ کسی مقصد کے پیش نظر سعی وعمل اور جدوجہد کرنے کا خوگر ہے (جیسا کہ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ کے تحت معلوم ہو چکا ہے۔) پھر بعض لوگ اپنی محنت وکوشش سے دائمی راحت کا سامان کر لیتے ہیں اور بعض دائمی مصیبت وعذاب کا۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ہر انسان جب صبح کو نکلتا ہے اور اپنے نفس کو بیچتا ہے، تو کچھ لوگ اپنے لئے سامان نجات مہیا کر لیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں۔

قسم وجواب قسم میں مناسبت:

رات دن اور نر و مادہ کی تین قسموں کا جواب اِنَّ سَعْيَكُمْ ہے۔ قسموں اور ان کے جواب میں بہت سے مناسبتیں ہیں، مثلاً: (۱) نر و مادہ کی مختلف کوششیں لیل ونہار ہی میں ہوتی ہیں۔ (۲) لیل ونہار دو مختلف وممتاز چیزیں ہیں، اسی طرح مؤمن وکافر کے اعمال ایک دوسرے سے ممتاز ہیں، کافر کے اعمال ومساعی رات کی طرح ظلمانی وتاریک اور مؤمن کے اعمال دن کی طرح نورانی وروشن ہوتے ہیں۔ (۳) رات اور دن موسموں کے اعتبار سے درازی وکوتاہی، سردی وگرمی اور اعتدال وغیرہ میں مختلف ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح انسانوں کے اچھے برے اعمال مختلف احوال وکیفیات کے اعتبار سے مختلف ہوتے رہتے ہیں، مؤمن سے نیکیاں ہوتی ہیں، اور کبھی کبھی غفلت وظلمت نفس سے وہ گناہوں کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے، مگر آفتاب ایمان ومہتاب عرفان کی جلوہ گری سے وہ تمام ظلمتیں دور ہو جاتی ہیں، اسی طرح کافر سے بھی بعض حالات میں نیکیاں (مثلاً صدقات، انصاف، ہمدردی وغیرہ) سرزد ہوتی ہیں۔ مگر ظلمت شب کفر میں وہ چھپ کر کالعدم اور نسیا منسیا ہو جاتی ہیں۔

(۴) اِنَّ سَعْيَكُمْ ...... میں اس طرف اشارہ ہے کہ مردوں اور عورتوں میں سے ہر ایک کے لئے الگ میدان عمل مقرر ہے۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے اور ہر اک ایک دائرہ میں گھومتا ہے) تو جس طرح رات دن اور آفتاب ومہتاب کے لئے دائرۂ عمل مقرر ہے، اسی طرح نر اور مادہ کے لئے فطری طور پر دائرۂ عمل ہے، سیاست، امامت، خلافت، طلب معاش وغیرہ مردوں کا دائرۂ عمل ہے۔ اور فراش بننا، تربیت اولاد کرنا، اور گھر کا نظم ونسق، یہ عورتوں کے فطری

فرائض ہیں، ان فطری حدود کو توڑ کر عورتوں کو مردوں کے دائرۂ عمل میں لانا ظلم ہے مساوات نہیں، اور جو اس کو مساوات سمجھتے ہیں ان کو عورتوں کے خاص کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہئے، مثلاً دو چار بچے وہ بھی جن لیں تو مساوات ہو سکتی ہے۔

مختلف کوششیں:

انسانوں کی مختلف مساعی کو احاطہ بیان میں نہیں لایا جا سکتا، نر و مادہ کی مساعی جدا جدا، اور کافر و مومن، مصلح و مفسد، متقی و فاسق کی کوششیں الگ الگ ہیں، پھر ہر انسان کی محنتیں مختلف اوقات کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ہیں، مگر ان بیشمار مساعی مختلفہ کو تین قسموں میں سمویا جا سکتا ہے۔ (۱) خالص خیر جس میں شر کا شائبہ نہ ہو (۲) شر محض جس میں خیر کی بو بھی نہ ہو (۳) خیر و شر دونوں سے مرکب لیکن یہ تیسری قسم حکماً دوسری ہی میں داخل ہے، کیونکہ نتیجہ ارذل کے تابع ہوتا ہے، البتہ صفات رذیلہ و صفات حمیدہ کے حاملین میں ایمان ہے۔ تو قاعدۂ شرعیہ کی رو سے آ کر ایسے لوگوں کو نجات ضرور میسر آ جائیگی۔ قسم اول کے لئے تین شرطیں ہیں۔ (۱) اعتقاد صحیح و یقین کامل ہونا (۲) صورت وظاہر عمل شریعت کے موافق ہونا (۳) اخلاص نیت کا تحقق اور قسم ثانی میں ان تینوں شرطوں کا فقدان شرط ہے، یا یہ کہو کہ اس میں فساد اعتقاد و ناموافقت شریعت اور فساد نیت کا تحقق شرط ہے۔

اور تیسری قسم میں کئی صورتیں نکل سکتی ہیں (۱) صورت و نیت دونوں درست ہوں لیکن اعتقاد فاسد ہو، جیسے کفار کے نیک اعمال۔ (۲) اعتقاد و صورت دونوں درست ہوں، نیت خالص نہ ہو، جیسے ریاکاری کی نماز یا اور کوئی نیک عمل (۳) نیت و اعتقاد درست ہوں مگر صورت شریعت کے خلا ہو، جیسے شہداء کربلا کا ماتم اور مجلس سماع شوق و ذوق حق کی ترقی کے لئے (۴) اعتقاد درست ہو، صورت و نیت غیر صحیح ہوں جیسے محرم داری بہ نیت ریاکاری (۵) صورت درست ہو، اعتقاد نیت فاسد ہوں، جیسے کافر کا نماز وغیرہ کسی مصلحت دنیوی کے لئے ادا کر لینا (۶) نیت درست ہو اور اعتقاد و صورت غلط ہوں جیسے مبتدعین کا ارتکاب بدعات۔ یہ ان بیشمار اقسام و انواع کا خلاصہ ہے، جن کی تفصیل میں بڑی تطویل ہے، اعمال و اشغال کا یہی اختلاف مذکور جزا و سزا کے اختلاف کا سبب ہے۔

سعی و عمل میں دو گروہ:

آگے قرآن حکیم نے سعی و عمل کے اعتبار سے انسانوں کو دو گروہ میں تقسیم فرمایا ہے، اور دونوں کے تین تین اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ پہلا گروہ کامیاب لوگوں کا ہے، ان کے تین اوصاف یہ ہیں۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی یعنی راہ خدا میں مال خرچ کرنا۔ اللہ سے ڈر کر زندگی کے ہر شعبہ میں احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی سے بچتے رہنا اور اچھی بات کی تصدیق کرنا۔ دوسرا گروہ پہلے گروہ کے بالمقابل ناکام لوگوں کا ہے، ان کے بھی تین ہی اوصاف و اعمال بیان فرمائے گئے ہیں۔ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی، وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ایک وصف بخل ہے، یعنی راہ خدا میں مال خرچ کرنے اور زکوٰۃ و صدقات واجبہ ادا کرنے سے گریز کرنا، دوسرا وصف استغناء یعنی اللہ سے ڈر کر اس کی اطاعت کرنے کے بجائے بے نیازی و بے رخی اختیار کرنا اور تیسرا وصف اچھی بات کو جھٹلانا ہے۔

فریقین کے نتائج:

مذکورہ دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کا نتیجہ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ؕ بیان فرمایا ہے یعنی ہم اس کو سہولت

دیدیں گے یا توفیق دیدیں گے یسریٰ کی، یسریٰ کے لفظی معنی آسانی اور آرام وراحت کے ہیں۔ مراد اس سے (۱) ایسے خصائل ہیں جو اس کو راحت تک پہنچا دیں (۲) یا اللہ کی خوشنودی وجنت تک پہنچا دیں (۳) یا اس سے شریعت مراد ہے جو رضاء الٰہی وجنت تک رسائی کا ذریعہ ہے، اس کے مقابل دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہے فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى یعنی ہم ان اعمال بد کے مرتکب کے لئے عسریٰ کو آسان کردیں گے۔ عسریٰ کے لفظی معنی مشکل اور تکلیف دہ چیز کے ہیں، مراد اس سے (۱) وہ خصائل جو مصیبت میں ڈالنے والے ہوں (۲) اور اللہ کی ناراضگی وجہنم تک پہنچانیوالے ہوں (۳) یا وہ اعمال جو خلاف شرع ہوں۔

فوائد:

فائدہ:......۱۔ اَلْحُسْنٰى سے مراد کلمۂ توحید ﴿لا الٰہ الّا اللّٰہ﴾ ہے، **قالہ ضحاکؒ وابو عبد الرحمن سلمیؒ وابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما،** یا جنت مراد ہے۔ بدلیل **للذین احسنوا الحسنیٰ (ای الجنۃ) قالہ مجاھدؒ وعکرمۃ عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وقتادۃؒ** یا وعدۂ خداوندی مراد ہے۔ **قالہ مقاتلؒ وکلبیؒ۔ فائدہ:......۲۔** اول الذکر گروہ کے تین اوصاف میں سے اول دو اوصاف وہ ذکر کئے گئے ہیں جن کا تعلق عمل سے ہے۔ یعنی مال کا حکم خداوندی کے مطابق خرچ کرنا، اور گناہوں سے پرہیز کرکے عذاب سے بچنا، تیسرے نمبر پر وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى میں ایمان کو بیان فرمایا گیا ہے، حالانکہ ایمان بنیادی چیز ہے، اعمال کی روح اور سب سے مقدم ہے، اس کو یہاں مؤخر بیان کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں سعی اور جدوجہد کا ذکر ہے، اور وہ اعمال ہی ہیں۔ ایمان تو ایک قلبی چیز ہے۔ اس کو اعمال کی فہرست میں شمار نہیں کیا جاتا۔ ہاں کوئی عمل بغیر ایمان مقبول ومعتبر نہیں ہوتا۔ **فافهم۔**

فائدہ:......۳) یہاں یہ فرمایا گیا فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (ہم اس کو آسان کردیں گے جنت یا راحت یا شریعت کے لئے) اور فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (ہم اسکو آسان کردیں گے مصیبت، دوزخ یا معصیت کے لئے) حالانکہ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ فرمایا جاتا **فسنیسر لہ الیسریٰ** ہم اسکے لئے یسریٰ کو آسان کردیں گے فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (ہم اس کے لئے عسریٰ کو آسان کردیں گے) کیونکہ آسان یا دشوار ہونا اعمال کی صفت ہوسکتا ہے نہ کہ اشخاص وذوات کی، مگر قرآن کریم نے تعبیر اس طرح فرمائی کہ ہم ان کی ذات کو آسان فرمادیں گے یسریٰ یا عسریٰ کے لئے، اس انداز تعبیر میں شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم ان کی طبیعتوں اور مزاجوں کو ایسا بنادیں گے کہ پہلے گروہ کے لئے شریعت واعمال جنت ان کی طبیعت ثانیہ بن جائیں گے، اور اسکے خلاف کرنے میں وہ تکلیف محسوس کرنے لگیں گے، اسی طرح دوسرے گروہ کا مزاج ایسا ہوجائے گا کہ اعمال جہنم سے ہٹنا اس کو انتہائی گراں ہوگا۔ دونوں گروہوں کو اپنی اپنی لائن میں ملکہ حاصل ہوجائے گا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ اس لئے مذکورہ آیات میں ان کیفیاتِ نفسانیہ راسخہ کے لئے خود ان کو آسان کردینے سے تعبیر فرمادیا گیا ہے، ایک حدیث مرفوع سے اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا جنت اور دوزخ کا ٹھکانہ لکھ نہ دیا گیا ہو، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ تو پھر کیا اس نوشتۂ تقدیر پر اعتماد کرکے ہم عمل نہ چھوڑ دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **اعملوا فکل میسر لما خلق لہ اما من کان من اھل السعادۃ فسییسر لعمل السعادۃ واما من کان من اھل الشقاوۃ فسییسر لعمل اھل الشقاوۃ** (تم عمل کرتے رہو کیونکہ ہر شخص کے لئے وہی کام آسان کردیا گیا جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے،

جو اہل سعادت ہیں تو اہل سعادت کے اعمال ہی ان کے طبعی رغبت بن جاتے ہیں، اور جو بدنصیب ہیں تو اہل شقاوت کے اعمال ہی ان کا مزاج بن جاتے ہیں) پھر آپ نے بطور استشہاد آیات تلاوت فرمائیں۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی (متفق علیہ)

مگر یہ دونوں چیزیں باختیار خود خداداد صلاحیت کے استعمال کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔ جس کی بناء پر عذاب وثواب کا ترتب بے محل نہ ہوگا۔ آگے بدنصیب گروہ اہل جہنم کو تنبیہ ہے کہ راہ خدا میں خرچ نہ کرنا تمہارے لئے باعث خسران ونقصان ہے، ارشاد ہے وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰی اس آیت میں ما نافیہ ہے، یا استفہام انکاری کے لئے ہے، تَرَدّٰی کے معنی ہلاک ہونا اور ہلاکت سے مراد استحقاق عذاب ہے، یا اس کے معنی گرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد قبر میں اور پھر قیامت کے دن جب وہ جہنم میں گرے گا تو اس کا مال اس کو کوئی نفع نہ دیگا۔ عموماً بخیل، بخل اسی لئے کرتا ہے کہ یہ مال وقت پر کام آئے گا۔ اس لئے فرمادیا گیا کہ مال کنجوسی کی شدید حاجت کے وقت کوئی کام نہ دے گا۔ بلکہ اس کے لئے وبال جان بن جائے گا۔

شبہات کا حل:

اوپر یہ معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نیکوں کے لئے راحت کا راستہ اور بدوں کے لئے مصیبت کا راستہ آسان فرمادیتے ہیں۔ اس سے چند شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) جب سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے تو سب کے لئے راہ نجات وراحت کیوں نہیں آسان فرمادیتے۔ (۲) جب سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو پیغمبروں کے بھیجنے اور کتابوں کے نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ (۳) جب اسی کی توفیق یا خذلان سے نیکی وبدی ہے۔ تو پھر ثواب وعذاب کا استحقاق کیوں ہے؟ ان شبہات کو اگلی دو آیتوں سے دفع فرمادیا گیا ہے۔

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی (بیشک رہنمائی ہمارے ذمہ ہے) دراصل حق تعالیٰ شانہ پر کوئی چیز لازم وواجب نہیں۔ لیکن چونکہ اس نے ازل میں فیصلہ فرمادیا ہے، اور رہنمائی کا وعدہ فرمالیا ہے، نیز اس کی حکمت اور رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے، اس لئے وہ رہنمائی کا خود ذمہ دار بن گیا ہے، یہاں لفظ علیٰ کو تاکید کے لئے لایا گیا ہے، (زجاجؒ وقتادہؒ) فراءؒ اس علیٰ کو بمعنی الیٰ قرار دیکر آیت کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ جو شخص ہدایت پر چلتا ہے اس کا راستہ ہم ہی تک پہنچتا ہے، جیسا کہ دوسری آیت وَعَلَی اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ کے معنی یہی ہیں، کہ اللہ ہی تک سیدھا راستہ پہنچتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو راہ ہدایت پر چلتا ہے وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے، تو اس آیت میں بھی علی بمعنی الیٰ ہے۔

رہنمائی کس طرح ہوئی:

حق تعالیٰ نے ہدایت کے لئے اس عالم میں بہت سے اسباب قائم فرمادیئے ہیں (۱) انسان کو حواس ظاہری (قوت سامعہ، قوت باصرہ، قوت لامسہ، قوت شامہ، قوت ذائقہ) اور حواس باطنی (حس مشترک، خیال، وہم، حافظہ، اور قوت متصرفہ) عنایت فرمائے ہیں (۲) عقل وادراک سے نوازا جس کے ذریعہ معرفت حق ہوسکتی ہے، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ اگر حق جل مجدہٗ رسولوں کو نہ بھیجتا تب بھی انسان قوت عقلیہ کی وجہ سے معرفت وتوحید کا مکلف تھا (۳) پیغمبر بھیجے اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں، شرائع واحکام دیئے (۴) انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے جانشین علماء، صلحاء، اولیاء کے ذریعہ رہنمائی فرمائی (۵) بیشمار دلائل عقلیہ ونقلیہ، نفسیہ وآفاقیہ قائم فرما کر ان میں تفکر وتدبر اور اعتبار

واختیار کا حکم دیا۔ لیکن با ایں ہمہ کسی فرد کو مجبور و بے اختیار نہیں کیا گیا، اگر قدرت کی طرف سے زبردستی کی جاتی تو حکمت تکلیف باطل ہو جاتی۔ اور ثواب وعقاب کا مسئلہ ختم ہو جاتا، بلکہ ممتاز تخلیق انسانی کا منشاء ہی معطل اور فوت ہو جاتا، اس آیت شریفہ سے فرقۂ باطلہ جبریہ کا رد ہو گیا، جو یہ کہتا ہے کہ ہم شجر وحجر کی طرح مجبور محض ہیں۔

وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (اور بیشک آخرت ودنیا ہماری ہی ملکیت وتصرف میں ہے، ہماری ہی مخلوقات ہیں) (۱) کیونکہ دنیا وآخرت کے خالق و مالک و بادشاہ ہم ہیں، تو ہم ہی کو ان میں تصرفات اور اپنی مخلوق کو احکامات صادر فرمانے کا حق ہے (۲) کیونکہ دنیا وآخرت کے ہم مالک ومتصرف ہیں، اس لئے دنیا کی نعمتیں، آخرت کی راحتیں یا دونوں جہاں کی دولتیں ہم سے ہی مانگی جاسکتی ہیں، کسی دوسرے کو ہمارے ملک اور ہماری ملک میں کوئی اختیار نہیں (۳) ہم چونکہ بالا دست ہیں، ہم پر نہ کوئی چیز واجب ولازم ہے، ہماری شان ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ اور ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ﴾ ہے (۴) چونکہ کونین کے مختار ہم ہی ہیں، اس لئے ہم اپنے اختیار سے جس کو جو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں (۵) دونوں جہان آباد کرنے کے لئے ہم نے اپنی حکمت واختیار سے لوگوں کے رجحانات مختلف کردئے ہیں ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند میل اورا در دلش انداختند

اس آیت مبارکہ سے قدریہ کی تردید ہوتی ہے، جن کا خیال ہے کہ افعال کے خالق ومختار ہم خود ہیں، الحاصل ان دونوں آیات سے جبر وقدر کا ابطال ہو گیا، اور اہل سنت کا درمیانی صاف اور سیدھا راستہ نکھر گیا۔ فللّٰہ الحمد۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (اس لئے میں تم کو بھڑکتی آگ سے ڈراتا ہوں) یہ عسریٰ کی تفسیر وتفصیل بھی ہے اور اِنَّ عَلَيْنَا اور وَاِنَّ لَنَا کی تکمیل بھی یعنی چونکہ ہدایت ہمارے ذمہ ہے، اور ہم مالک دارین وخالق کونین ہیں، اس لئے ہم نے تم کو شعلہ مانے والی آگ سے ڈرایا ہے۔ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (اس میں بدنصیب ہی داخل ہوگا) آگے اشقیٰ کی تفسیر خود ہی فرمادی۔ اَلَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (اشقیٰ وہ ہے کہ جس نے رسول یا حق کی تکذیب کی اور ایمان سے روگردانی کی)۔

شقاوت کے اقسام:

شقاوت، بدبختی ومحرومی اور ناکامی کو کہتے ہیں، شقاوت کی دو قسمیں ہیں دنیوی اور اخروی۔ شقاوت دنیوی، بیماری، تنگدستی، مرگ انبہ، شکست وناکامی، ذلت وبدنامی وغیرہ ہیں، اور شقاوت اخروی کی چند قسمیں ہیں (۱) عبادت میں کوتاہی وکاہلی اور صغائر کا ارتکاب (۲) فسق ونافرمانی اور ارتکاب کبائر کے ساتھ توفیق توبہ کا میسر نہ آنا (۳) کفر وشرک کا ارتکاب۔ دنیوی شقاوت عارضی اور چندروزہ محرومی ہے جو چنداں قابل اعتناء نہیں۔ اخروی شقاوت بہت اہم ہے، اس کی بھی پہلی قسم ادنیٰ درجہ کی ہے، جو تکالیف ومصائب عبادات وغیرہ سے زائل ہو جائیگی، دوسری قسم بھی ابدی نہیں۔ عذاب قبر، مصائب، حشر یا شفاعت ہے یا اللہ کے فضل وکرم سے دور ہو جائیگی، زائد سے زائد دوزخ میں ایک عرصہ رہ کر زائل ہو جائے گی، البتہ شقاوت اخروی کی تیسری قسم ابدی ہے جو کسی طرح کبھی زائل نہ ہوگی۔ اسی تیسری قسم والوں کو قرآن نے لفظ اشقیٰ سے تعبیر فرما کر اس کی وضاحت اَلَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى سے فرمائی ہے۔

ایک اشکال اور اس کے جوابات:

اَلْاَشْقَى کی صفت الذی کذب وتولیٰ اور حصر بالا سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ گنہگار مؤمن جو تکذیب

وتولی کا مجرم نہیں دوزخ میں نہ جائے گا، حالانکہ بیشمار نصوص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار مؤمن نے اگر توبہ نہ کی یا کسی کی شفاعت سے یا خاص رحمت سے اس کو معاف نہ کردیا گیا تو وہ (مؤمن فاسق) بھی جہنم میں جائے گا، اور اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر ایمان کی برکت سے آخر کار جنت میں داخل ہوجائے گا، اہل سنت اسی کے قائل ہیں، لیکن آیت کے ظاہری الفاظ چونکہ اس کے خلاف ہیں اس لئے ضروری ہے کہ آیت شریفہ کا مطلب ایسا ہو جو دوسری آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ کے خلاف نہ ہو۔ مفسرین نے اس آیت کی بہت سی توجیہات کے ذریعہ اس شبہ کو حل فرمایا ہے۔

(۱) اَشْقٰی (صیغۂ اسم تفضیل) بمعنی شقی (صیغہ صفت مشبہ) ہے، اور کَذَّبَ وَتَوَلّٰی کی قید احترازی نہیں بلکہ قید واقعی ہے کیونکہ عموماً ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ مؤمن شقی نہیں ہوتا۔ ایمان پرہیزگاری وسعادت ہی کو چاہتا ہے، شقی وگنہگار عموماً کافر ہی ہوتا ہے، مؤمن سے اگر گناہ سرزد بھی ہوجاتا ہے تو جب تک وہ رو دھو کر اس کو معاف نہ کرالے اس کو چین نہیں ہوتا۔ (۲) اَشْقٰی بمعنی شقی ہے۔ اور تکذیب وتولی عام ہے، اعتقاداً یا لساناً ہوں یا صرف عملاً، قلبی ولسانی تکذیب وتولی کفر اور نفاق ہے، اور عملی فسق ہے کہ فاسق حرمت کا اعتقاد واقرار کرنے کے باوجود ممنوعات کا ارتکاب کرتا ہے، لہٰذا یہ لفظ کافر، منافق اور فاسق سب کو مشتمل ہے۔ (۳) اَشْقٰی اپنے تفضیلی معنی پر ہے، اور اس سے مراد کافر ہی ہے، مگر یہاں دخول جہنم سے مراد وہ دخول ہے جو ہمیشہ کے لئے ہوگا۔ اور ایسا دخول صرف کافر کے ساتھ مخصوص ہے، مؤمن بالآخر کسی نہ کسی وقت اپنے گناہوں کی سزا پوری کرنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ (۴) لَا يَصْلٰهَا کی ہائے ضمیر اس نار کی طرف لوٹ رہی ہے جس کی صفت تَلَظّٰى مذکور ہے، صرف نار کی طرف راجع نہیں، مطلب یہ ہے کہ بھڑکتی ہوئی نار شدید میں صرف کافر ہی داخل ہوگا۔ مؤمن فاسق نار شدید میں داخل نہ ہوگا۔ بلکہ جہنم کے بالائی طبقہ میں داخل ہوگا جہاں کم درجہ کی آگ ہوگی، اس توجیہ پر بھی لفظ اشقٰی اپنے تفضیلی معنی پر ہوگا۔ (۵) حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک الْاَشْقٰی کا مصداق کافر ہی ہے، اور لفظ نار بھی اپنے عموم پر ہے، کیونکہ جب دنیا کی آگ بھی شعلہ زن ہوتی، اور بھڑکتی ہے تو جہنم کی آگ تو اس دنیوی آگ سے بدرجہا تیز ہے، خواہ وہ کسی بھی طبقہ کی ہو، وہ ضرور شعلہ زن ہوگی، مگر اس آیت شریفہ میں حصر حقیقی نہیں جس کا مطلب یہ ہو کہ کافر ہی جہنم میں جائیں گے بدکار مؤمن نہ جائیں گے، بلکہ حصر اضافی ہے، جس کے پیش نظر مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو مؤمن موجود تھے وہ جہنم میں نہیں جائیں گے، اس طرح اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی صحابی جہنم میں نہ جائے گا، چنانچہ اہل السنۃ والجماعت کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم عادل اور جنتی تھے، کوئی ان میں فاسق نہ تھا، آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ اس پر شاہد ہیں جن کا انکار کفر ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سب جہنم سے محفوظ ہیں:

وجہ یہ ہے کہ اول تو ان حضرات میں سے کسی سے گناہ کا صدور بہت ہی شاذ ونادر ہوا ہے۔ اور اگر اتفاقاً کسی سے کوئی گناہ سرزد بھی ہوا تو اس نے توبہ کرلی ہے، ان کے خوف وخشیت اور اتقاء وامتثال کے حالات اس پر شاہد ہیں، دوسرے ان کی حسنات اتنی زیادہ ہیں کہ گاہے کسی سیئہ کا صدور یقیناً معاف ہوگا۔ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (نیک اعمال برے اعمال کا کفارہ بن جاتے ہیں) اور صحبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا عمل ہے جو تمام اعمال حسنہ پر غالب ہے،

صلحائے امت کے بارے میں بخاری ومسلم کی حدیث ہے،**ھم قوم لایشقیٰ جلیسھم ولا یخاب انیسھم** (یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا شقی ومحروم نہیں ہوسکتا اور جوان سے مانوس ہو وہ محروم نہیں رہ سکتا) تو جو تاجدار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا جلیس وانیس ہوگا وہ کیسے شقی ومحروم ہوسکتا ہے، بہت سی احادیث صحیحہ میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب ہی عذاب جہنم سے بری ہیں۔مثلاً (۱)**عن جابر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه عن النبی صلی اللہ علیه وسلم لا تمس النار مسلما رأنی او رأی من رأنی. رواہ الترمذی. (مشکوٰۃ ص ۵۵۴)** (حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس مسلمان کو دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی جس نے مجھ کو دیکھا یا اس کو دیکھا جس نے مجھ کو دیکھا۔)

(۲)**قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم رواہ رزین (مشکوٰۃ ص ۵۵۴)** (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ستاروں کی طرح ہیں تم ان میں سے جس کی اقتدا بھی کرلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔)اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جس کو دیکھو کہ میرے صحابہ کو برا بھلا کہتا ہے اس پر لعنت بھیج دو۔ **اذا رأیتم الذین یسبون اصحابی فقولوا لعنة اللہ علی شرکم. (مشکوٰۃ ص ۵۵۴)**

قرآن کریم میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ارشاد ہے﴿وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی﴾ یعنی ان میں سے ہر ایک کے لئے اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔دوسری جگہ ہے﴿اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی اُولٰٓئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾ یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ مقدر ہوچکی ہے وہ دوزخ سے دور رہیں گے،ان میں سے پہلی آیت میں سب صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے جنتی ہونے کا بیان ہے،اور دوسری میں سب کے جہنم سے بری ہونے کا۔علاوہ ازیں قرآن مقدس کی ہزاروں آیات مدح صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں موجود ہیں،کہیں ان کی صفات مذکور ہیں کہیں جنت ورضوان اور مغفرت کا وعدہ ہے،کہیں ان کے ایمان کو معیار قرار دیا گیا ہے،تو کہیں ان کے اعمال کو،اسی وجہ سے متقدمین نے ان روافض کے کافر ہونے پر اجماع واتفاق کیا ہے جو حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو برا کہتے اور ان پر تبرا کرتے ہیں،کیونکہ وہ قرآن واحادیث صحیحہ کے منکر ہیں اور ایسی ہی وجوہات کی بناء پر ہم مودودی صاحب کو گمراہ سمجھتے ہیں۔

آیت شریفہ سے فرق باطلہ کا استدلال:

مرجئہ ایک فرقۂ باطلہ تھا جس کا یہ خیال تھا کہ آدمی تصدیق قلبی حاصل ہوجانے سے مؤمن ہوجاتا ہے،پھر اس کو کوئی گناہ ضرر نہیں دیتا۔اگر وہ کوئی بھی نیکی نہ کرے اور گناہ کرتا رہے تب بھی وہ سیدھا جنت میں جائے گا،اور دوزخ میں بالکل نہ جائے گا۔ترک فرائض وارتکاب محرمات سے صرف درجات عالیہ سے محرومی ہوجائیگی،رافضیوں کا بھی یہی خیال ہے۔(کذا فی المظہری)

ایک فرقۂ باطلہ کرامیہ ہے،وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی قلب فارغ کے ساتھ شہادتین کا اقرار کرلے تو وہ مؤمن ہے، قلب فارغ کا مطلب یہ ہے کہ قلب میں تصدیق ہو نہ تکذیب۔(کذا قال البیضاوی) یہ فرقے اس آیت مذکورہ سے

استدلال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جہنم میں داخلہ کافروں کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ آیت میں داخلہ جہنم کا حصر صرف ایسے اشقیٰ کے لئے ہے جس میں تکذیب اور تولی کی صفت موجود ہو۔

معتزلہ وخوارج کہتے ہیں کہ کبیرہ کا مرتکب مخلد فی النار ہوگا۔ اور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں، اس لئے کہ مرجئہ وغیرہ چند فرقوں کے علاوہ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ارتکاب کبائر موجب جہنم ہے، اگر مرتکب کبیرہ کو مؤمن کہیں گے تو وہ اشقیٰ نہ ہوگا۔ اور اشقیٰ نہ ہوگا تو جہنم میں کیسے جائے گا۔ جبکہ آیت میں ہے کہ جہنم میں اشقیٰ ہی جائے گا۔ ان سب کے جوابات آیت کی توجیہات میں وضاحت سے آچکے ہیں۔ اور ان توجیہات کی ضرورت مختلف نصوص میں ظاہری تعارض دور کرنے کے لئے پیش آئی تھی، پھر تمام علمائے سلف وخلف کا اجماع اور قرآن مقدس کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک معاف نہ فرمائے گا۔ اور شرک کے سوا صغائر وکبائر جس کے چاہے گا معاف فرمادے گا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ اور ﴿قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ﴾ الآیۃ (پ۲۴ ع۴) (کہہ دیجئے اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر (گناہ کا ارتکاب کرکے) زیادتی کی ہے ناامید نہ ہوں، اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دے گا۔ بلاشبہ وہی غفور رحیم ہے) اور ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ (زلزال) جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کے سامنے آجائے گی اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ بھی اس کے سامنے آجائیگی)۔ اس قسم کی آیات قرآن پاک میں ہزاروں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار معذب بھی ہوسکتا ہے اور مخلد فی النار بھی نہ ہوگا۔ اختصار کے پیش نظر اشارات پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى (اور دوزخ سے اتقی ضرور بچ جائے گا) اس میں سین تحقیق کے لئے ہے، اتقیٰ سب سے بڑا متقی، یہ مقام اس شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جو شرک جلی وخفی اور جسمانی وقلبی اور نفسانی تمام گناہوں سے پرہیز کا خوگر اور صاحب نفس مزکی ومطمئنہ ہوجائے۔

الَّذِیْ يُؤْتِیْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (وہ مصارف خیر میں اس غرض سے مال خرچ کرتا ہے کہ پاک ہوجائے) ریاء کاری، شہرت طلبی وغیرہ اغراض فاسدہ اس کے پیش نظر نہیں ہوتیں۔ بلکہ طہارت و پاکیزگی اور اپنے درجات کی پیاپے ترقی اس کا مقصود ہوتا ہے۔ يَتَزَكّٰى زکوٰۃ سے ماخوذ ہے، زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی کے آتے ہیں اور افزائش کے بھی، یہاں دونوں معنی صادق آتے ہیں۔

ایک شبہ کا حل:

چونکہ ہمارے (احناف) کے نزدیک نصوص میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں۔ اس لئے آیت سے یہ نہ سمجھا جائے گا کہ جو اتقیٰ نہ ہو یعنی متقی ہو وہ جہنم میں جائے گا، نیز قاعدہ ہے کہ ذکر شی نفی ماعدا کو مستلزم نہیں۔ علاوہ ازیں یہاں آیت میں تجنب اتقیٰ کو بطور حصر بھی بیان نہیں کیا گیا ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ گو مفہوم مخالف کا اعتبار فرماتے ہیں، مگر ان کے نزدیک بھی یہاں تقی کے داخل جہنم ہونے کا مفہوم غیر معتبر ہے کیونکہ بعض جگہ قید یا وصف کو صرف کسی خاص خوبی وغیرہ بیان کرنے کے لئے لایا جاتا ہے، احترازی معنی مقصود نہیں ہوتے۔ اس کی نظیر قرآن پاک میں ﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ

تَحَصُّنًا﴾ ہے کہ یہاں تحصن کی شرط صرف پاکدامنی کی خوبی اور اظہار واقعہ کے طور پر مذکور ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر باندیاں پاکدامنی کا قصد نہ کریں تو ان کو زنا پر مجبور کیا جائے (یہ آیت ابن ابی منافق کے بارے میں اتری ہے کہ وہ اپنی باندیوں سے زنا کراتا اور ان کی کمائی کھاتا تھا) اسی طرح یہاں اتقیٰ کی خوبی بیان کرنا مقصود ہے، اور جس ذات گرامی (صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی وہ واقعۃً اتقیٰ تھے، اس لئے اس سے اظہار واقعہ بھی مقصود ہے۔ لیکن اگر کسی کو مفہوم مخالف مان لینے پر اصرار ہے تب بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ کبائر وصغائر سے بھی انسان قابل مواخذہ ہوتا ہے جس کی سزا نار جہنم بھی ہوسکتی ہے گو اس میں داخلہ ہمیشہ کے لئے نہ ہو، یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یا توبہ سے یا نیکیوں سے یا مصائب وغیرہ سے اس کو بالکل معاف فرمادیں۔

اشقیٰ اور اتقیٰ کی تعیین:

آیات کے الفاظ میں عموم ہے، جو شخص بھی بخیل، بے پرواہ، منکر اور بے رخی کرنیوالا ہوگا وہ اشقیٰ کا مصداق ہوگا۔ اور جو شخص صاحب ایمان، راہ خدا میں اس کی رضا جوئی کے جذبہ سے خرچ کرنے والا اعلیٰ درجہ کا پرہیزگار ہوگا وہ اتقیٰ کا مصداق قرار پائے گا، سبب نزول اگر خاص بھی ہوتا ہے تو آیات کے عموم پر خصوص سبب اثر انداز نہیں ہوتا۔ کلام الٰہی کے نزول سے مقصود ہدایت وتزکیہ کا عام نفع ہوتا ہے ہاں کسی خاص واقعہ سے اس نوع کے واقعات کی وضاحت مقصود ہوتی ہے، مثلاً یہاں کسی خاص اشقیٰ اور مخصوص اتقیٰ کے حال ومآل کو ذکر فرما کر عام اہل سعادت واہل شقاوت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، قرآن مقدس کے عام مفاہیم کو کسی شخصیت یا اشخاص کے ساتھ مخصوص کردینا یا خود تراشیدہ خیالات کے سانچہ میں ڈال دینا سخت غلطی ہے، مثلاً شیعہ حضرات اہل سعادت کے احوال ونتائج کو اہل بیت کے ساتھ اور اہل شقاوت کے حالات وانجام کو ان لوگوں کے ساتھ جن کو انہوں نے اہل بیت کا مخالف قرار دیدیا ہے چسپاں کردیتے ہیں۔ یا اہل بدعت نصوص کو کھینچ تان کر اور تاویلات رکیکہ کے ذریعہ اپنی بدعات کا مستدل بناتے ہیں، یا متصوفین تمام آیات کو توحید وجودی، نفس وروح، قرب واحوال ومقامات وغیرہ پر چسپاں کرتے ہیں، حالانکہ نزول قرآن کے وقت ان مسائل کا وجود بھی نہ تھا، میرا مقصد یہ نہیں کہ قرآن میں علماء، صلحاء، اولیاء صحابہ واہل بیت کے کارناموں کی مدح نہیں، یا اس میں روح ونفس، مقامات واحوال، مواجید واشواق کی طرف ایماء نہیں، ضرور ہے۔

مقصد یہ ہے کہ تمام آیات قرآنیہ کو اسباب نزول پر منحصر کردینا یا اپنے ذہنی رخ پر موڑ دینا کلام اللہ پر یقیناً زیادتی اور نزول کلام الٰہی کے مقصد کے خلاف ہے ان آیات میں بھی نزول قرآن کے وقت کے اشقیٰ واتقیٰ کی طرف اشارہ ضرور ہے، چنانچہ اتقیٰ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ آیات مکی ہیں، اور اس وقت مسلمانوں میں یؤتی مالہ کا مصداق اگر کوئی بھی فرض کیا جائے تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر اور کوئی نہ نکلے گا، اول تو اس وقت مسلمانوں میں ان کے سوا کوئی مالدار ہی نہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ اور کوئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کا مال اس وقت راہ خدا میں بے دریغ صرف ہوتا۔ پریشان حال مسلمان غلاموں کو آزاد کرنا، پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر مال صرف کرنا اسی جاں نثار ویار غار کا کام تھا، اسی لئے تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ اتقیٰ کے مصداق اول صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، اور یہ آیات

انہیں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، گوان صفات مذکورہ کا حامل جو بھی ہوگا وہ مصداق آیت قرار پائے گا۔ اور اشقیٰ کا مصداق اول امیہ بن خلف ہے، گواس جیسے تمام اشخاص اس کے مفہوم میں آجاتے ہیں، ہم اس سورت کی تفسیر کے شروع میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وامیہ کے واقعات کو عنوان شان نزول کے تحت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امت میں سب سے افضل ہیں:

اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ہیں، بیشمار دلائل میں سے یہ آیت ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾ بھی افضلیت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک دلیل ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اتقیٰ فرمایا ہے۔ اور سورۂ حجرات میں ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ بیشک سب سے بڑا بزرگ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے بڑا پرہیزگار ہے)۔ آیا ہے، ان دونوں آیات کی روشنی میں ثابت ہوا کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ کے نزدیک امت میں سب سے افضل واکرم ہیں۔

فرقۂ تفضیلیہ (جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل کہتا ہے) نے یہاں اتقیٰ کو متقی کے معنی میں لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اتقیٰ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ پیغمبر کے علاوہ پر اس لفظ کو متقی کے معنی میں لیا جائے گا۔ اور جب یہ لفظ اتقیٰ اپنے تفضیلی معنی پر نہیں تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا امت میں سب سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوگا۔ اہل سنت فرماتے ہیں کہ اتقیٰ کو متقی کے معنی میں لینا لغت کے خلاف، محاورے کے خلاف اور عرف شرع کے خلاف ہے، کسی لفظ کو اس کے معنی مجازی پر جب محمول کریں گے کہ اس کے حقیقی معنی درست نہ ہوں اور مجاز پر کوئی قرینۂ صارفہ موجود ہو، یہاں ایسی کوئی مجبوری ہے اور نہ قرینۂ صارفہ۔

درحقیقت قواعد شرعیہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انبیاء علیہم السلام مخلوق میں سب سے افضل ہیں، ان کی افضلیت قطعاً مسلم ہے، اس لئے اگر دوسرے لوگوں کی نسبت افضلیت ومفضولیت بیان ہوگی تو وہ امتیوں ہی کی ہوگی، یہ تخصیص عرفی ہے جو تخصیص ذکری سے قوی تر ہوتی ہے، مثلاً کوئی شخص کہتا ہے کہ گیہوں کی روٹی دوسری روٹیوں سے اچھی ہوتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ گیہوں کی روٹی بادام کی روٹی سے بھی بہتر ہوتی ہے، بلکہ عرفاً مطلب یہ ہوتا ہے کہ غلوں سے بنی ہوئی روٹیوں میں سب سے بہتر گیہوں کی روٹی ہوتی ہے، اسی طرح دیگر تمام مؤمنین سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتقیٰ واکرم اور افضل ہیں، امتوں کا مقابلہ پیغمبروں سے اور پیغمبروں کا امتوں سے نہیں کیا جاسکتا۔

بعض نے کہا کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مطلقاً سب سے افضل ہیں، لیکن اس کا مصداق اخیر عمر کا وقت ہے جب آپ منتہائے کمال کو پہنچ چکے تھے یعنی اپنے زمانہ خلافت میں آپ ان سب سے اتقیٰ واکرم اور افضل ہوئے جو دنیا میں موجود تھے، گویا آیت میں مایؤول کے اعتبار سے بطور پیشینگوئی آپ کو اتقیٰ فرمایا گیا، لہٰذا اس توجیہ کے اعتبار سے کوئی اشکال ہی نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ کے اخیر دور میں نہ کوئی نبی دنیا میں موجود تھا اور نہ کوئی آپ سے افضل تھا، لیکن یہ توجیہ اشکالات سے خالی نہیں۔

چند احادیث افضلیت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر اپنی صحبت وہم نشینی اور اپنے مال میں سب سے زیادہ احسان کرنیوالے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اور اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کو خلیل بناتا۔لیکن ہمارے درمیان اخوت ومحبت اسلام ہے، مسجد کی طرف کسی کی کھڑکی کھلی نہ رہے ابو بکر کی کھڑکی کے سوا (خلیل اس دوست کو کہتے ہیں جس کی محبت دل کی گہرائی میں اتر گئی ہو)۔

(۲) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر کو بناتا لیکن وہ میرے بھائی اور صحابی ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمہارے صاحب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنا خلیل بنالیا ہے۔(۳) عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب غزوۂ ذات السلاسل میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تو فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ سب سے زائد محبوب آپ کے نزدیک کون ہے؟ فرمایا عائشہ! میں نے عرض کیا مردوں میں سے؟ فرمایا ان کے والد، میں نے پوچھا ان کے بعد؟ فرمایا عمر۔ پھر چند مردوں کو شمار کیا تو میں اس اندیشہ سے خاموش ہو گیا کہ مجھے سب کے اخیر میں نہ کر دیں۔

(۴) محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں نے اپنے والد (حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے پوچھا: لوگوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر کون ہے؟ فرمایا ابو بکر رضی اللہ عنہ، میں نے کہا پھر فرمایا عمر رضی اللہ عنہ۔ میں نے اندیشہ کیا کہ اب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ فرمادیں۔اس لئے میں نے کہا کہ پھر آپ ہیں؟ تو فرمایا میں تو مسلمانوں میں سے ایک شخص ہوں۔(۵) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم (صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کسی کو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر نہیں سمجھتے تھے پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر، ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر کسی کو نہ جانتے تھے، پھر ان کے بعد آپس میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ایک دوسرے پر فوقیت وفضیلت نہ دیتے تھے، ابوداؤد کی روایت میں یہ ہے کہ ہم (صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اس وقت جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما تھے کہتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سب سے افضل ابو بکر ہیں پھر عمر پھر عثمان رضی اللہ عنہم۔(۶) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے آقا اور ہم سب میں افضل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔(۷) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک چاندنی رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک میری گود میں تھا، تو میں نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ! کسی کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کے برابر ہوں گی؟ آپ نے فرمایا ہاں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نیکیاں اتنی ہیں، میں نے عرض کیا کہ پھر ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتنی ہوں گی؟ فرمایا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک نیکی ہی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تمام نیکیوں کے برابر ہے۔(۸) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو دیئے، اور فرمایا کہ مجھے یہ پسند ہے کہ میری تمام نیکیاں ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک دن یا ایک رات ہی کے عمل کے برابر ہو جائیں۔رات سے مراد غار ثور والی رات ہے۔اور دن سے مراد وفات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دن۔(مختصرا)(۹) حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔اور کسی معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دوبارہ حاضر ہونے کا حکم دیا، عورت نے عرض کیا کہ اگر میں حاضر ہوں اور آپ کو نہ پاؤں، مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تو مجھے نہ پائے تو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آجانا۔

(۱۰) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ نے مجھ سے اپنے مرض الوفات میں فرمایا کہ ابو بکر رضی

اللہ تعالیٰ عنہ اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰن) کو بلالو تا کہ میں ان کے لئے ایک دستاویز لکھوادوں، مجھے اندیشہ ہے کہ تمنا کرنے والے (خلافت کی) تمنا کریں گے، اور کہنے والا کہے گا کہ میں مستحق (خلافت) ہوں۔ اور وہ مستحق خلافت نہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا (کے استحقاق کو) تسلیم نہ کریں گے۔

(۱۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ہم پر جس نے بھی احسان کیا ہم نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے مگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احسانات کا بدلہ تو حق تعالیٰ شانہٗ قیامت کے دن ہی چکائیں گے، جتنا ابوبکر کے مال نے مجھ کو نفع پہنچایا کسی کے مال نے نہیں پہنچایا۔ اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو اپنا خلیل بناتا۔ لیکن یاد رکھو کہ تمہارے صاحب (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ نے اپنا خلیل بنالیا ہے۔ (۱۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ارشاد فرمایا: کہ آپ میرے ساتھی غار میں بھی رہے ہیں آپ میرے ساتھی ہوں گے حوض کوثر پر بھی۔ (۱۳) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جس قوم میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود ہوں اس کے لئے مناسب نہیں کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا اور کوئی اس کی امامت کرے۔ (۱۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ میرے پاس جبرئیل آئے، میرا ہاتھ پکڑا، اور مجھ کو جنت کا وہ دروازہ دکھلایا جس سے میری امت داخل ہوگی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوتا اور باب جنت کو دیکھتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سنئے یقیناً میری امت میں سب سے پہلے آپ ہی جنت میں جائیں گے۔ (مشکوٰۃ شریف باب المناقب) (۱۵) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ کے پاس بہت سے انصار و مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم جمع تھے، آپس میں لوگوں کی فضیلتیں بیان کرنے لگے، آوازیں بلند ہوگئیں، تو حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم دولت کدہ سے باہر تشریف لائے، اور پوچھا کیا بات ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ بعض حضرات کے مرتبوں کا ذکر ہو رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خبردار! ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلہ میں کسی کو فضیلت نہ دینا، کیونکہ وہ دنیا و آخرت میں تم سب سے افضل ہیں۔

(۱۶) دار قطنی میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بسند صحیح مروی ہے، ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آگے آگے چل رہا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راستہ میں مل گئے تو ارشاد فرمایا: تم اس کے آگے آگے چل رہے ہو جو دنیا و آخرت میں تم سے بہتر ہے، خدا کی قسم انبیاء و مرسلین کے سوا کسی پر سورج نے طلوع و غروب نہیں کیا جو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل ہو۔ ابن السمان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کتاب الموافقۃ میں یہی روایت نقل کی ہے، کہ پیغمبروں کے سوا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر و افضل پر سورج نے طلوع و غروب نہیں کیا۔ (۱۷) خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس وقت ایک شخص ایسا آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بعد اس سے بہتر کسی کو پیدا نہیں کیا۔ اور قیامت کے دن اس کی شفاعت پیغمبروں کے مثل ہوگی، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ تھوڑی ہی دیر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے آں حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے، ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور خوب بغل گیر ہو کر ملے۔

تنبیہ:....... اس مقام پر چند احادیث کا ترجمہ افضلیت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اس لئے لکھ دیا گیا ہے کہ اس پرفتن دور حاضر میں شیعوں کی تقلید میں بہت سے لوگ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی توہین وتنقیص کے درپے ہیں، مودودی صاحب نے ہندو پاک میں اخوانیوں نے مصر وممالک عربیہ میں اور دوسری جماعتوں اور افراد نے امت مسلمہ کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بدظن کر کے دین ومذہب کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے کی نامبارک کوششیں کی ہیں، ہمارے اکابر واسلاف نے قرآن وسنت کی روشنی میں عظمت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم واہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اولیا اللہ رحمۃ اللہ علیہم کی وقعت ومحبت ہمیشہ امت کے دلوں میں پلانے اور پیوست کرنے کی کوشش کی ہے۔

انتہائی افسوس ہے اسی طبقۂ دیوبند سے تعلق رکھنے والے بعض حضرات بھی اس سلسلہ میں شیعوں اور مودودیوں کی تقلید میں صرف ان کا اتباع ہی نہیں بلکہ ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، مثلاً قریب ہی میں مفتی حبیب الرحمٰن خیر آبادی نے اپنی نام نہاد وبدنام کتاب ''محرم'' میں دیگر خرافات (قرآن وسنت میں تحریف، اکابر کی تکفیر وغیرہ) کے ساتھ حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین، حارثہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم کی توہین کی، اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے افضل امت ہونے کا بھی انکار کیا ہے، حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی توہین کفر ہے، اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت کے انکار سے بھی اندیشۂ کفر ہے، ہم نے ''محرم'' کا کافی وشافی جواب بنام ''محرم پر ماتم'' لکھ کر الحمد للہ ''محرم'' کی گمراہ تحریرات کا پردہ چاک کر دیا ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر ہم نے یہاں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت پر قدرے کلام کیا اور چند احادیث بھی لکھ دی ہیں، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار پروانوں کے ذکر سے اگر کتاب طویل ہو جائے تو ہمیں پرواہ نہیں ہمارا مقصود تقریر وتحریر نہیں بلکہ مراد زندگی ہی یہ ہے ؎

خدا کرے کہ یہ محنت قبول ہو جائے رضا و رحمت حق کا حصول ہو جائے

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰىٓ (اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہ تھا کہ اس کا بدلہ دیا جاتا) مستدرک حاکم میں حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ عادت بھی تھی کہ جس مسلمان کو کفار کے ہاتھ میں قیدی دیکھتے اس کو خرید کر آزاد کر دیتے تھے، اور یہ لوگ عموماً کمزور غلام تھے، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد حضرت ابو قحافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے فرمایا: کہ جب تم غلاموں کو آزاد ہی کرتے ہو تو اتنا کام کرلو کہ ایسے غلاموں کو آزاد کیا کرو جو قوی و بہادر ہوں تاکہ وہ کل تمہارے دشمنوں کا مقابلہ اور تمہاری حفاظت کر سکیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ میرا مقصد ان آزاد کردہ غلاموں سے کوئی فائدہ اٹھانا نہیں بلکہ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ان کو آزاد کرتا ہوں، باری تعالیٰ نے اس صدق نیت وخلوص کامل کی تصدیق فرمائی اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى یعنی ان کا مقصد عالیشان پروردگار کی رضا کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(فائدہ) گو احسان وسلوک کے بدلہ میں مال دینا بھی نیک کام ہے، آیت شریفہ میں رضائے رب کے سوا ہر غرض کی نفی فرما دی گئی نام کے لئے تو کیا غلاموں کو آزاد کرتے اور اپنا مال صرف کرتے وہ تو کسی کے احسان کا بدلہ چکانے کی نیت سے بھی نہیں دیتے، ان پر ان لوگوں میں سے کسی کا احسان ہے بھی نہیں جن کی آزادی پر وہ اپنا مال صرف کر رہے ہیں، اور نہ ان پر احسان رکھنا ہی مقصود ہے، صرف رضائے مولیٰ ان کے پیش نظر ہے اور بس! اس آیت سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے کمال مرتبہ کا پتہ چلتا ہے، کہ اس سے بڑھکر کمال اور کیا ہوسکتا ہے؟ ﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ ان آیات کے بعد بھی اگر کوئی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رتبہ کو نہ پہچانے تو بقول حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے قلب پر آفتاب ایمان کا پرتو بھی نہیں پڑا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمۂ آفتاب کارا چہ گناہ

وَلَسَوْفَ یَرْضٰی یَرْضٰی کی ضمیر اگر رب کی طرف راجع ہے تو معنی یہ ہیں کہ ان کا پروردگار ان سے ضرور راضی ہوگا۔ اور اگر ضمیر یَرْضٰی، اَلْاَتْقٰی کی طرف راجع ہے تو مطلب یہ ہے کہ جب اس اتقی (صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو حق تعالیٰ کی طرف سے عطاء و جزاء اور عزت آخرت کی دولتیں ملیں گی تو وہ خوش ہو جائیں گے۔ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق اسی طرح ہے جس طرح سورۃ الضحیٰ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا: گیا ﴿وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی﴾ یہاں دونوں مطلب درست ہیں۔ اور دونوں کا مآل ایک ہی ہے

بخت گر مدد کند دامنش آورم بکف　　　گر بکشم زہے طرب ور بکشد زہے شرف

یعنی اگر قسمت کی مدد سے محبوب کا دامن ہاتھ میں آجائے پھر میں اس کو کھینچ لوں تو زہے نصیب اور اگر وہ کھینچ لے تو زہے شرف اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کمال اخلاص اور ان کے مصارف کی عنداللہ مقبولیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

تم تفسیر سورۃ الیل بفضل اللہ سبحانہ وتعالیٰ فالحمد للہ ربنا الاعلیٰ والصلوٰۃ والسلام علی سید الوریٰ وامام الانبیاء وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہ نجوم الدجیٰ اولی الدرجات العلیٰ وآئمۃ الھدیٰ

سُوْرَۃُ الضُّحٰی

سُوْرَۃُ الضُّحٰی مَکِّیَّۃٌ وَھِیَ اِحْدٰی عَشَرَۃَ اٰیَۃً

(رکوع: ۱، آیات: ۱۱)　　سورۂ ضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں گیارہ آیات ہیں۔　　(کلمات: ۴۰، حروف: ۱۷۲)

ربط و مناسبت

اس سورت کی مناسبت سورۂ لیل سے بہت ہی ظاہر ہے۔ اس سورت کو شب و روز کی قسم سے شروع کیا گیا تھا تو اس سورت کو بھی روز و شب کی قسم سے شروع کیا گیا۔ وہاں اشقیٰ کی مذمت اور اس کے لئے وعید تھی یہاں بھی اشقیاء کی تردید و مذمت ہے، وہاں شان صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان تھا یہاں شان نبی صلی اللہ علیہ وسلم اطہر کا بیان۔ وہاں وَلَسَوْفَ یَرْضٰی میں رضاء صدیق عظیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر تھا تو یہاں وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی میں خوشنودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے، وہاں مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰی میں اشارۃً شکر نعمت کا حکم تھا تو یہاں بھی وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ میں صراحۃً شکر نعمت کا حکم ہے، وغیرہ۔

شانِ نزول:

اس سورت مبارکہ کے سبب نزول کے سلسلہ میں مختلف روایات وارد ہوئی ہیں۔(۱) حضرت جندب بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انگلی زخمی ہوگئی، اس سے خون جاری ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتِ

ترجمہ: تو ایک انگلی ہی تو ہے جو خون آلود ہوگئی اور جو کچھ تجھے تکلیف پہنچی وہ راہِ خدا میں ہے

حضرت جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ اس کے بعد چند روز جبرئیل امین کوئی وحی لیکر نہیں آئے تو مشرکین مکہ نے یہ طعنہ دینا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے خدا نے چھوڑ دیا، اور وہ ان سے ناراض ہوگیا ہے، اس پر سورۂ ضحیٰ نازل ہوئی۔ (بخاری ومسلم وترمذی)

(۲) حضرت جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طبیعت کے ناساز ہو جانے کی وجہ سے ایک دو راتوں میں (نماز کے لئے) اٹھ نہ سکے، یہ دیکھ کر ایک عورت کہنے لگی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا شیطان تم کو چھوڑ گیا ہے، اس پر یہ سورت اتری، بغویؒ نے بیان کیا کہ جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عورت کا نام بتلایا کہ وہ ابولہب کی بیوی ام جمیل تھی۔ (بخاری ومسلم) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ چند روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی نہیں ہوئی۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے کہا ایسا لگتا ہے کہ تیرے ساتھی نے تجھے چھوڑ دیا اور وہ تجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اس پر سورۂ والضحیٰ نازل ہوئی۔ (۳) ابن جریر نے شداد بن عبد اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا خیال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے صبری دیکھ کر آپ کا رب آپ سے ناراض ہوگیا ہے اس پر یہ صورت نازل ہوئی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ام جمیل وحضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں نے یہ بات کہی تھی، مگر ام جمیل نے خوش ہوکر (بطور استہزاء) اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اظہار دردمندی وخیر خواہی کے جذبہ سے یہ بات کہی تھی۔ (۴) ابن ابی شیبہ اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہما نے ایک ایسی سند سے جس میں ایک راوی مجہول ہے حفص بن میسرہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے وہ اپنی ماں سے اور ان کی ماں اپنی ماں (حفص کی نانی) سے نقل کرتی ہیں، اور یہ حفص کی نانی (خولہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ تھیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ کتے کا ایک پلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوٹھری میں گھسا اور تخت کے نیچے چھپ کر وہیں مرگیا۔ اس وجہ سے چار روز تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل نہیں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خولہ! دیکھ تو میری کوٹھری میں کیا نئی بات ہوگئی کہ جبرئیل نہیں آتے، میں نے سوچا صفائی کرنی چاہئے، چنانچہ میں جھاڑو لیکر تخت کے نیچے جھکی اور اس مرے ہوئے پلے کو نکالا، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اس وقت آپ کی ریش مبارک پر لرزہ تھا۔ اور جب نزول وحی ہوتا تو ایسی ہی کیفیت ہوتی تھی۔ تو وَالضُّحٰى سے تَرْضٰى تک وحی اتری۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پلے کی وجہ سے جبرئیل علیہ السلام کی آمد میں تاخیر کی روایت تو مشہور ہے،

مگر اس قصہ کا والضحیٰ کے نزول کا سبب ہونا غریب بلکہ شاذ ہے، جو قابل قبول نہیں۔ (۵) جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں دعوت اسلام شروع کی تو مکہ والوں نے یہود مدینہ کے پاس ایک وفد بھیجا کہ ہم میں سے ایک شخص ایسا پیدا ہوا ہے جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، آپ لوگ پڑھے لکھے ہیں اس لئے کوئی ایسی بات بتلایئے کہ ہم ان کی صداقت کا امتحان کرلیں۔ علمائے یہود نے کہا کہ ان سے تین باتیں معلوم کرو اگر وہ بتا دیں تو وہ اللہ کے نبی ہیں ان کی اطاعت کرلینا ورنہ جو تمہارا جی چاہے کرنا۔

(۱) ذوالقرنین کون تھے؟ (۲) روح کی حقیقت کیا ہے؟ (۳) اصحاب کہف کون تھے؟ اور ان کا قصہ بڑا عجیب ہے۔ چنانچہ مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان تینوں باتوں کی معلومات کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ کل جواب دوں گا اور انشاء اللہ نہ فرمایا۔ تو ایک عرصہ تک وحی نازل نہیں ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بہت غم ہوا۔ ادھر دشمن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنے دینے لگے، ابولہب نے کہا اِنَّ مُحَمَّدًا وَدَّعَهُ رَبُّهُ وَقَلٰی (محمد کو ان کے رب نے چھوڑ دیا اور ان سے ناراض ہو گیا) اس کی بیوی ام جمیل نے کہا مَا اَرٰی شَیْطَانَکَ اِلَّا تَرَکَ (معلوم ہوتا ہے کہ تیرا شیطان تجھ کو چھوڑ گیا) ان دلخراش باتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت صدمہ ہوا، آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی ان باتوں کا تذکرہ فرمایا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد وحی آئی۔ جس میں سورۂ کہف اور سورۂ والضحیٰ کا نزول ہوا۔ اور روح کے متعلق یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ آیات کا نزول ہوا۔

مختلف روایات کا حاصل:

یہ ضروری نہیں کہ یہ سب واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آئے ہوں، اور سب اس سورت کے نزول کے اسباب ہوں۔ تاخیر وحی کے واقعات متعدد مرتبہ پیش آئے ہیں، ایک واقعہ تاخیر وحی کا شروع نزول قرآن کے وقت پیش آیا، جس کو زمانہ فترت وحی کہتے ہیں، اس میں ایک طویل عرصہ تک وحی موقوف رہی، بظاہر حقیقت روح وغیرہ کے سوال کے جواب میں تاخیر کا واقعہ سورۂ ضحیٰ کے سبب نزول کے علاوہ ہے۔ گو علامہ محلی و شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے اسی کو اس سورت کا سبب نزول قرار دیا ہے، باقی اوپر کے واقعات میں کوئی تعارض نہیں۔ یاد رکھئے کہ کسی سورت یا آیت کے اسباب نزول متعدد بھی ہوسکتے ہیں اور متعدد آیات کا سبب نزول ایک بھی ہوسکتا ہے۔

انقطاعِ وحی کی مدت:

وحی کس واقعہ میں کتنے دنوں موقوف رہی۔ اس کا فیصلہ بھی مشکل ہے، صاحب مظہری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انقطاع وحی کی مدت کے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے بارہ دن اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس دن کی تعیین کی ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے دس، پندرہ اور اس سے زائد چالیس دن تک کے اقوال لکھے ہیں۔ واللہ اعلم۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

وَالضُّحٰی (۱) وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی (۲) مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی (۳) وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّكَ مِنَ

قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جب چھا جائے، آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے بیزار ہوا۔ اور آپ کیلئے آخرت دنیا سے

قسم	الضحٰی	وَ	الّیل	اِذَا	سجٰی	مَا	وَدَّعَکَ	رَبُّکَ	وَ	مَا	قَلٰی	وَ	لَلۡاٰخِرَۃُ	خَیۡرٌ لَّکَ مِن
	دن چڑھے	اور	رات	جب	ڈھانک لے	نہیں	چھوڑ دیا تجھ	رب تیرے	اور	نہ	نا خوش رہا	اور	البتہ پچھلی حالت	بہتر ترے واسطے

الۡاُوۡلٰی (٤) وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰی (٥) اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی (٦) وَوَجَدَكَ ضَآلًّا

بہت بہتر ہے، اور آپکا رب آپ کو اتنا دیگا کہ آپ خوش ہو جائینگے۔ کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو ٹھکانہ دیا، اور اس نے آپ کو ناواقف پایا

الۡاُوۡلٰی	وَ	لَسَوۡفَ	یُعۡطِیۡکَ	رَبُّکَ	فَتَرۡضٰی	اَلَمۡ	یَجِدۡکَ	یَتِیۡمًا	فَاٰوٰی	وَ	وَجَدَکَ	ضَآلًّا
پہلی حالت	اور	عنقریب	دیگا تجھ	رب تیرا	پس راضی ہوگا تو	کیا نہیں	پایا تجھ	یتیم	پس جگہ دی	اور	پایا تجھ	ناواقف

فَهَدٰی (۷) وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی (۸) فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ (۹) وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ (۱۰)

تو آپ کی رہنمائی کی، اور آپ کو نادار پایا تو غنی کردیا، تو آپ یتیم پر سختی نہ کیجئے، اور سائل کو نہ جھڑکئے۔

فَهَدٰی	وَ	وَجَدَکَ	عَآئِلًا	فَاَغۡنٰی	فَاَمَّا	الۡیَتِیۡمَ	فَلَا	تَقۡهَرۡ	وَ	اَمَّا	السَّآئِلَ	فَلَا	تَنۡهَرۡ
پس راہ دکھائی	اور	پایا تجھ	فقیر	پس غنی کیا	پس جو	یتیم	پس مت	قہر کر	اور	جو	مانگنے والا	پس مت	ڈانٹ

وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ (۱۱)

اور اپنے رب کے احسان کا ذکر کیا کیجئے۔

وَ	اَمَّا	بِنِعۡمَةِ	رَبِّکَ	فَحَدِّثۡ
اور	جو	نعمت	پروردگار تیرے	پس بیان کر

لغات:

سَجٰی سَجۡوًا سُجُوًّا (ن) سنسان ہونا، ہمیشہ رہنا، چھا جانا، سیاہ ہونا، وَدَّعَ باب تفعیل سے چھوڑ دینا رخصت کرنا، وَدَعَ وَدۡعًا (ف) چھوڑنا، امانت رکھنا قَلٰی قَلۡوًا (ن ض) بغض رکھنا، بھوننا، نفرت کرنا، اٰوٰی افعال سے ٹھکانا دینا، رحم کھانا مرَّ فی النّٰزِعٰت۔ ضَآلًّا ناواقف، حیران، بےخبر، ضلال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، عَآئِلًا عِیۡلَةٌ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، تنگ دست، فقیر، مفلس، نادار، عیالدار، (ض) عیالدار ہونا محتاج ہونا، (ف) بے انصافی کرنا، لَاتَقۡهَرۡ (ف) غالب ہونا، دبانا، سختی کرنا، لَاتَنۡهَرۡ (ف) ڈانٹنا، جھڑکنا، زور سے بہنا، حَدِّثۡ تفعیل سے بیان کرنا، روایت کرنا، خبر دینا، حَدَثَ حُدُوۡثًا (ن) نو پید ہونا، واقع ہونا۔

ترکیب:

وَالضُّحٰی الیٰ سَجٰی۔ مَرَّ مثلُهٗ فِیۡمَا تَقَدَّمَ۔ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ فعل مفعول بہ فاعل علی الترتیب جملہ

فعلیہ ـ معطوف علیہ ـ وَمَا قَلٰی فعل ضمیر فاعل ، مفعول (ک) محذوف لرعایة الفاصلة ـ جملہ فعلیہ معطوف ـ معطوفین جواب قسم وَلَلْاٰخِرَۃُ مبتدا خَیْرٌ اپنے دونوں متعلقوں لَکَ اور مِنَ الْاُوْلٰی سے مل کر خبر ـ یا تو یہ مقسم علیہ میں داخل ، ما قبل پر عطف ہے یا جملہ مستانفہ ہے ، اور واؤ عاطفہ نہیں بلکہ مستانفہ ہے ، وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فعل ، مفعول بہ اور فاعل جملہ فعلیہ یُعْطِیْ کا مفعول ثانی مثلاً مَقَامَ الشَّفَاعَةِ محذوف ہے ، ف تفریعیہ ہے ، جملہ ماقبل پر متفرع اور اسی سے مربوط و معطوف ہے ، آگے تینوں جملوں کی ترکیب اسی طرح ہے ـ فَاَمَّا ف تفریعیہ اَمَّا تفصیلیہ متضمن بمعنی الشرط اَلْیَتِیْمَ اپنے بعد والے فعل کا مفعول بہ ہے ، تقدیم مفعول حصر کے لئے نہیں ـ بلکہ اہل عرب فاء کے اتصال کو حرف شرط کے ساتھ پسند نہیں کرتے ـ اس لئے اَمَّا حرف شرط اور فاء میں فصل کرنے کے لئے مفعول بہ کو مقدم کر دیا گیا ، یہ جملہ انشائیہ ہے ، اسی طرح اگلے دونوں جملے ہیں ـ

تفسیر:

وَالضُّحٰی (قسم وقت چاشت کی یا دن کی) قتادہ و مقاتل رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ اس سے سورج چڑھنے کا وقت یعنی وقت چاشت مراد ہے ، اور خصوصیت اس کی یہ ہے کہ ہر موسم میں اس وقت اعتدالی کیفیت رہتی ہے ، ہر چیز روشن ہو جاتی ہے ، اور کمال نہار کا ظہور ہونے لگتا ہے ، بعض کہتے ہیں کہ ضحیٰ سے لیل کے مقابلہ میں نہار ہی مراد ہے ، جیسا کہ ﴿اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًی﴾ میں ضحیٰ سے نہار مراد ہے ـ

وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی (اور رات کی قسم جب وہ چھا جائے) یعنی تاریکی کامل ہو جائے ـ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سجی کا ترجمہ اَقْبَلَ بِظَلَامٍ (تاریکی کے ساتھ آتی رات کی قسم) کیا ہے ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بھی یہی قول ہے ، بعض نے اس کا ترجمہ ذَهَبَ (جاتی رات کی قسم) سے کیا ہے ، عطاء و ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے اس کا ترجمہ ڈھانپ لینا کیا ہے ، مجاہد نے ٹھیک ہو جانا ، قتادہ و ابن سکن رحمۃ اللہ علیہم نے کہا جب اس کی تاریکی ٹھہر جائے ، کہ اس کے بعد اندھیرے میں زیادتی نہ ہو ، یعنی رات اپنے کمال کو پہنچ جائے ، یا یہ معنی ہیں کہ رات کی قسم جب لوگ اس میں سکون پذیر اور خاموش ہو جائیں ، لَیْلٌ سَاجٍ وہ رات جس میں سکون پیدا ہو جائے ـ بَحْرٌ سَاجٍ ساکن سمندر ـ

ضحیٰ اور لیل کی دو قسمیں:

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں ، ایک یہ کہ قسمیں کیوں کھائی گئیں ، دوسرے قسموں کے ساتھ ضحیٰ اور لیل کو کیوں خاص کیا گیا ؟ **پہلی بات**...... پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر کفار نے یہ بہتان باندھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب ناراض ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے چھوڑ دیا تو وہ لوگ مدعی ہوئے ، مدعی کے ذمہ ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کو گواہوں سے ثابت کرے ، ورنہ مدعیٰ علیہ کی قسم پر مقدمہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے ، البینة علی المدعی والیمین علی من انکر اس مقدمہ میں کفار اپنے دعویٰ کو دلیل و شاہد سے ثابت نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ نے (جو یہاں مدعیٰ علیہ ہے) قسم کھائی ، گو دعوے کے رد کے لئے ایک قسم بھی کافی ہوتی ہے ، مگر دو قسموں میں تاکید و تقویت اور تردید میں شدت پیدا ہو گئی ، نیز کفار نے دو باتوں کا دعویٰ کیا تھا ـ (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے چھوڑ دیا آپ کا رب ناراض ہو گیا ـ تو دونوں دعووں کو دو ہی قسموں سے رد کر دیا گیا ـ

دوسری بات...... قسم کے لئے انتخاب ضحی و لیل کی متعدد وجوہ ہیں ـ (۱) جس طرح اللہ تعالیٰ ظاہر میں

اپنی قدرت وحکمت کی مختلف نشانیاں ظاہر کرتا ہے، کبھی دن کی تابانی اور کبھی رات کی تاریکی اور دونوں کو ایک دوسرے کے بعد لاتا رہتا ہے، اسی طرح کیفیت باطنی کو سمجھنا چاہئے۔ اگر سورج کی دھوپ اور روشنی کے بعد رات کی تاریکی کا آنا حق تعالیٰ کی خفگی وناراضگی کی دلیل وثبوت نہیں۔ تو چند روز وحی کی بندش بھی اس کی علامت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؑ سے خفا اور ناراض ہوگیا ہے بلکہ جس طرح رات کے بعد روشن دن کا آنا ضروری ہے۔ اسی طرح وحی کی چندروزہ بندش کے بعد وحی کا آنا ضروری ہے، کفار کا یہ دعویٰ خدائے تعالیٰ کے علم محیط وحکمت بالغہ پر اعتراض ہے، گویا حق تعالیٰ کو اس کی خبر نہ تھی کہ جس کو میں رسول منتخب کررہا ہوں وہ آئندہ وحی ورسالت کا اہل نہ رہے گا۔ (نعوذ باللہ منہ) (۲) اس میں آپ کو بشارت بھی دی گئی ہے کہ جس طرح روز وشب کی آمد مسلسل ہے۔ اسی طرح آپ پر وحی کا تسلسل رہے گا۔ (۳) اس میں خبر ہے کہ جس طرح رات کے بعد دن کا آنا ضروری ہے اسی طرح انقطاع وحی کی وحشت کے بعد وحی ولقائے جبرئیل علیہ السلام کا انس میسر آئے گا۔ (۴) اس میں آپ کو تسلی بھی دی گئی ہے، کہ جس طرح روز وشب گھٹتے بڑھتے اور مختلف کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں اسی طرح آپ کو بھی غم وسرور، خوشی وحزن وملال اور زبان خلق سے مدح وطعن وتشنیع کی مختلف کیفیات وحالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔

فائدہ...... دن میں سے وقت ضحیٰ کی اور ساری رات کی قسم میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دنیا کے غم اس کی خوشیوں سے زائد ہیں۔ واللہ اعلم۔

ضحیٰ اور لیل سے کیا مراد ہے؟

اس سلسلہ میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں جن میں سے چند ذیل میں مذکور ہیں۔ (۱) وہی معروف معنی مراد ہیں جو مذکور ہوئے، یعنی ضحیٰ سے وقت چاشت یا دن اور لیل سے رات مراد ہے۔ (۲) ضحیٰ سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کا دن اور لیل سے لیلۃ المعراج مراد ہے۔ (۳) ضحی سے مراد آپ کا رخ انور اور لیل سے گیسوئے مبارک مراد ہے (۴) ضحیٰ سے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا دن اور لیل سے مراد عفو وبخشش کا خلق ہے، کیونکہ وفات کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر عالم غیب کے اسرار منکشف ہوئے اور عفو میں ستر عیوب ہے۔ (۵) ضحیٰ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال ظاہری اور لیل سے احوال باطنی مراد ہیں۔ (۶) ضحیٰ سے اسلام کی ترقی کا زمانہ مراد ہے۔ اور لیل سے اسلام کے تنزل کا زمانہ مراد ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: الاسلام بدء غریبا وسیعود کما بدأ. (۷) ضحیٰ سے مراد وقت حیات اور لیل سے مراد قبر والی زندگی ہے۔ (۸) ضحیٰ سے جنت کی روشنی اور لیل سے جہنم کی تاریکی مراد ہے۔ (۹) ضحیٰ سے قلوب عارفین کا نور اور لیل سے قلوب کافرین کی ظلمت مراد ہے۔ چونکہ الفاظ قرآنیہ میں بڑی وسعت ہے، اس لئے ہر ایک احتمال کی گنجائش ہے، یہ بھی قرآن پاک کے اعجاز کا ایک پہلو ہے کہ اس کے الفاظ وسیع المعنی اور بہت سے عمدہ احتمالات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

لیل اور ضحیٰ کی تقدیم وتاخیر:

اس سورت میں ضحیٰ (دن) کو لیل (رات) سے پہلے لایا گیا۔ اور اس سے پہلی سورت (سورۃ اللیل) میں لیل کو نہار پر مقدم کیا گیا تھا۔ اس کی بھی علماء کرام نے بہت سی وجوہ ذکر کی ہیں۔ (۱) پہلی سورت میں لیل کو نہار پر اسلئے قدم کیا کہ واقعۃً رات پہلے آتی ہے، اور دن بعد میں (لیل کو تقدم طبعی حاصل ہے اس لئے ذکراً بھی اس کو مقدم لایا گیا) اور یہاں ضحیٰ کو

لیل پر مقدم کیا گیا۔ کیونکہ دن کو رات پر فضیلت ہے۔ (مظہری) (۲) سورۂ لیل میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل تھے، چنانچہ اس کو سورۂ ابی بکر بھی کہتے ہیں۔ اور اس سورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل مذکور ہیں، اسی لئے اس کو سورۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی کہتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کمالات وانوار آفتاب نبوت کے عکس اور پرتو تھے۔ آفتاب نبوت کے جلووں ہی سے آئینہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جگمگایا تھا۔ آفتاب نبوت کی جلوہ گری سے پہلے آئینۂ صدیق بے نور رات کے مانند تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام پیدائشی باکمال تھے۔ ان کے قلوب آغاز خلقت ہی سے مجلیٰ وتجلیات ربانی کی آماجگاہ ہوتے ہیں، کفر یا فسق کی تاریکیوں سے ان کے قلوب مبراء ہوتے ہیں، اسی لئے سورۂ ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (سورۃ اللیل) میں قسم میں رات کو مقدم کیا، اور سورۃ النبی (والضحیٰ) میں دن کو مقدم کیا، تاکہ معلوم ہو کہ نورِ صدیقی تاریکی کے بعد آیا ہے، اور نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ابتدا ہی سے نور ہے۔ اوّل ما خلق الله نوری. (۳) سورۂ سابقہ میں رات کا پہلے ذکر کرنا اور اس سورت میں دن کا پہلے ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صدیقیت کے اوپر محمدیت (نبوت) کا مرتبہ ہے، اور محمدیت کے بعد دنیا میں صدیقیت باقی رہ جاتی ہے۔

چونکہ گل رفت وگلستاں شد خراب بوئے گل را از کہ جوئیم جز گلاب

اور یہ ان دونوں حضرات میں کمال اتحاد کی دلیل ہے جس کا نتیجہ دنیا، برزخ اور آخرت میں رفاقتِ ابدی ہے، نیز یہاں سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بلافصل کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ (۴) بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اعتبارات سے رات کو فضیلت دی ہے کہ وہ راحت وآرام سکون وپردہ پوشی کا وقت ہے، اور بعض اعتبارات سے دن کو فضیلت بخشی ہے، کہ وہ معیشت اور کاروبار وغیرہ کا وقت ہے، تو ایک سورت میں رات کو مقدم کیا تو دوسری میں دن کو تاکہ دونوں کی فضیلت واہمیت عیاں ہو جائے، اور بندے دونوں کی حکمت پر نظر کر کے عبرت ومعرفت حق حاصل کریں۔ (۵) اصل تو یہی ہے کہ لیل مقدم ہو جیسا کہ سورۂ سابقہ میں ہے، کیونکہ رات کو تقدم طبعی بھی حاصل ہے، اور آفتاب نبوت ﷺ کے طلوع سے قبل اندھیرا تھا، بعد میں اجالا ہوا۔ مگر اس سورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے، تو ابتدا ہی سے تسلی کا مضمون مذکور ہے، وہ اس طرح کہ ضحیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا دور اور لیل سے وفات کے بعد قیامت تک کا زمانہ مراد ہے، شاید اسی لئے بجائے نہار کے لفظ ضحیٰ لایا گیا، تاکہ قلیل زمانہ مفہوم ہو۔ اور لیل ذکر کر کے طویل زمانہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا، گویا ظاہری حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے روز روشن کے بعد شب تاریک بھی صدق صدیقی، عدل فاروقی، حیائے عثمانی، ولایت علوی کے انوار سے تاباں رہے گی اور (تا قیامت) اس رات میں ہزاروں علمائے حقانی ومشائخ ربانی کے چراغ روشن رہیں گے۔ نَهَارُهَا وَلَيْلُهَا سَوَاءٌ اسی حقیقت کو وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى سے بیان فرمایا گیا ہے۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (آپ کے رب نے نہ آپ کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی آپ سے نفرت کی ہے) مَا قَلٰى مَا قَلَاكَ تھا۔ ک مفعول بہ کو ماقبل (مَا وَدَّعَكَ) کے قرینہ سے نیز رعایت فاصلہ کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ یہ جواب قسم اور مشرکین کے دعویٰ کی تردید ہے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (اور پچھلی گھڑی آپ کے لئے اگلی گھڑی سے بہت بہتر ہے) یہاں آخرت کو اس کے مشہور معنیٰ میں اور اولیٰ کو اس کے مقابلہ میں دنیا کے معنی میں لیا جائے تو تفسیر یہ ہوگی کہ کفار ومشرکین جو آپ

کو طعنے دے رہے ہیں وہ دنیا میں تو اس کا مشاہدہ کر ہی لیں گے کہ وہ سراسر غلطی پر تھے اور ان کی یہ بیجا طعن و تشنیع لغو کذب تھی۔ اس سے آگے ہم اخروی انعامات ابدی کا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کرتے ہیں، کہ وہ دنیوی انعامات سے بہت زیادہ اور بہت بہتر ہوں گے۔ اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ آخرۃ اور اولی کے لغوی معنی مراد لے لئے جائیں، کہ ہر پچھلی گھڑی ہر پہلی گھڑی سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعد کی ہر حالت پہلی حالت سے بہتر ہی ہوتی چلی جائے گی، اور مسلسل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری و باطنی ترقیات میں ہر آن اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اس تفسیر کے اعتبار سے آیت کے مفہوم میں بے حد عموم ہو جاتا ہے، جس میں ظاہری و باطنی، دنیوی و اخروی جملہ انعامات آجاتے ہیں۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (اور آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے)

صاحب مظہری نے بیہقی طبرانی اور حاکم رحمۃ اللہ علیہم سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ امت کی آئندہ فتوحات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (بحالت کشف) پیش کی گئیں تو آپ ﷺ کو بہت خوشی ہوئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں آپ ﷺ سے بیحد انعامات وعطیات دنیوی و اخروی کا وعدہ فرمایا گیا ہے، مثلاً دشمنوں پر فتح، اقتدار کامل، کثرت امت، اسلام کی اشاعت، آخرت میں شفاعت، کثرت ثواب، درجات قرب وغیرہ ایسے بیشمار عطیے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی عموم کے فائدہ کے لئے یُعْطِي کا مفعول ثانی حذف کر دیا گیا۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ يُعْطِيكَ رَبُّكَ کے معنی یہ ہیں کے حق تعالیٰ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شفاعت (کی اجازت) عطاء فرمائیں گے اور آپ کی امت کو بخش دیں گے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو جائیں گے، حضرت علی و حضرت حسن رضی اللہ عنہما سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

رضائے حبیبِ خدا:

حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِذًا لَا اَرْضٰى وَوَاحِدٌ مِنْ اُمَّتِیْ فِی النَّارِ یعنی جب یہ بات ہے تو میں اس وقت تک راضی نہ ہوگا جب تک کہ میری امت میں سے ایک آدمی بھی جہنم میں رہے گا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری امت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے، یہاں تک کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا رَضِيْتَ يَا مُحَمَّدُ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب آپ راضی ہیں) تو میں عرض کروں گا یَا رَبِّ رَضِيْتُ (اے میرے رب میں راضی ہو گیا)

مسلم شریف میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آیت تلاوت کی جس میں ابراہیم علیہ السلام کا قول مذکور ہے ﴿فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ پھر دوسری آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ﴾ پھر آپ نے دعاء کے لئے دونوں ہاتھ اٹھا کر گریہ وزاری شروع کر دی۔ اور بار بار یہ فرمایا ﴿اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ﴾ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امینؑ کو بھیجا کہ وہ آپ سے پوچھیں کہ آپ کیوں روتے ہیں؟ (اور یہ بھی فرمایا اگرچہ ہم کو سب کچھ معلوم ہے) جبرئیل امین نے آکر رونے کا سبب دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ میں اپنی امت کی مغفرت چاہتا ہوں۔ حق تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو دوبارہ بھیجا اور فرمایا کہ جا کر یہ کہدو کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ہم آپ کو امت کے بارے میں راضی کر دیں گے، رنجیدہ نہ کریں گے۔

حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اے گروہ عراق! تم کہتے ہو کہ قرآن میں سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت: ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ ہے۔ اور ہم اہل بیت کہتے ہیں کہ کتاب اللہ میں سب سے زیادہ امید آفرین آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ہے۔

انعاماتِ سابقہ:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنے دنیوی واخروی انعامات دینے کا وعدہ کیا گیا ہے، کہ آپ خوش ہو جائیں۔ اس وعدہ کی تائید وتصدیق اور مزید اطمینان قلبی نیز استحقاق انعامات کی دلیل کے طور پر چند گذشتہ انعامات کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے، چونکہ پہلے سے عنایات ربانی کا مسلسل فیضان آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات عالی پر ہوتا رہا ہے تو آئندہ بھی اس رب کریم کی طرف سے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ گذشتہ انعامات میں سے صرف ان تین مخصوص نعمتوں کا آئندہ ذکر ہوا ہے۔ جن کا فیضان زندگی کے تین اہم ترین اور نازک ترین اوقات میں ہوا۔

پہلی نعمت...... اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم پایا تو ٹھکانا دیا) حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دنیا میں تشریف نہ لائے تھے کہ آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اپنی بیوہ اور ہونے والے فرزند کے لئے کوئی جائیداد چھوڑی نہ سرمایہ اور مال ومتاع۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں تشریف لائے تو یتیمی وبیکسی کے ساتھ۔ حق تعالیٰ نے مہربان ماں کی آغوش شفقت اور دادا عبدالمطلب کی ایسی مہر وعنایت کے سایہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش فرمائی کہ خواجہ عبدالمطلب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی اولاد کو بھی بھلا دیا۔ چند سال کے بعد شفقت مادری کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، تو شفیق دادا نے اپنی تمام تر توجہات اپنے ہونہار پوتے پر مرکوز کر دیں۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے سر سے مہربان دادا کا سایۂ عاطفت بھی جاتا رہا ہے تو حق تعالیٰ نے آپ کے چچا کے قلب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی محبت ڈال دی کہ وہ اپنی حقیقی اولاد سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ اور دل وجان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ومہربان ہو گئے۔ یہ بہت بڑی نعمت حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو بچپن ہی میں یتیمی وبیکسی کی حالت میں عطا فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین پرورش فرمائی۔

دوسری نعمت...... وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (اور اللہ جل شانہٗ نے آپ کو ناواقف پایا تو رہنمائی فرمائی) دور یتیمی کے بعد شعور وشباب کا زمانہ آیا۔ شباب کے ولولوں اور جوانی کی امنگوں کا دور بھی بڑا عجیب دور ہوتا ہے، مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مادر زاد نبی، معصوم اور بچپن ہی سے رئیس الموحدین تھے، خدا پرستی ومکارم اخلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت، اور نیکی ونیک خوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی، مگر ہنوز محبت ومراتب قرب کی سنگلاخ گھاٹیوں اور وحی وشریعت اسلام کی ان حقیقتوں سے واقف نہ تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد میں عطاء فرمائی گئی۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کرتے تھے مگر تفصیلات سے بے خبر تھے، آتش عشق ومحبت الٰہی قلب میں شعلہ زن تھی، مگر اس کی ترقی کے آداب وقوانین معلوم نہ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم طالب وحیران تھے جو لفظ ضَآلًّا سے تعبیر فرمایا گیا، تو حق تعالیٰ شانہٗ نے وحی کے ذریعہ آپ کی دستگیری ورہنمائی فرمائی، جو لفظ هَدٰى سے بیان فرمایا گیا ہے۔

آیت شریفہ کی دیگر تفاسیر:

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکپن میں بڑے بوڑھوں سے سنا تھا کہ ہمارا اصل دین دین ابراہیمی ہے، ادھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کفر و بت پرستی اور جاہلی رسوم سے نہایت بیزار و متنفر تھے ہی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کوشش کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہو جائے کہ دین ابراہیمی کی تفصیلات کیا ہیں؟ تا کہ اس طریقہ پر میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں۔ لیکن دین ابراہیمی کو لوگ فراموش کر چکے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ میں بہت بے قرار تھے کہ صحیح طریقۂ حیات کا سراغ لگ جائے۔ آخر کار طہارت، غسل جنابت، مناسک حج، عبادت و تسبیح و تہلیل اور اعتکاف و خلوت گزینی وغیرہ جس قدر امور آپ کو معلوم ہو سکے ان پر عمل درآمد فرماتے رہے، یہاں تک کہ سلسلۂ وحی شروع ہوا۔ اور دین اسلام کے اصول و فروع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرما دیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیقراری کو ضلال اور آگاہی کو ہدایت سے تعبیر فرمایا گیا، یہ قول تفسیر اول کے قریب ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ ضلال سے راستہ بھولنا اور ظاہری بھٹکنا مراد ہے، اور اس نوع کے کئی واقعات آپ کو لڑکپن میں پیش آئے ایک بار ملک شام کے سفر میں راستہ بھول گئے تھے، حضرت سعید بن میسب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے غلام میسرہ کے قافلہ میں ابو طالب کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے، تاریک رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار جا رہے تھے، کہ ابلیس نے اونٹنی کی مہار پکڑ کر راستہ سے رخ موڑ دیا۔ فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر ابلیس پر پھونک ماری تو وہ حبش میں جا گرا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قافلہ کی طرف لوٹا دیا۔

ایک مرتبہ حضرت حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواجہ عبد المطلب کے پاس پہنچانے آئیں تو مکہ معظمہ کے قریب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گم ہو گئے، وہ بیقرار ہو کر مکہ کے بڑے بت ہبل کے سامنے رونے اور فریاد کرنے لگیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک نام اس کے سامنے لیا فوراً سارے بت منہ کے بل گر پڑے۔ اور ان میں سے آواز آئی کہ اے حلیمہ جن کا نام تم لے رہی ہو انھیں کے ہاتھوں ہم برباد ہوں گے۔ ادھر جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا جان کے پاس پہنچا دیا۔ بی بی حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مایوس ہو کر خواجہ عبد المطلب کو اطلاع کرنے گئیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پاس تشریف فرما دیکھ کر مطمئن ہو گئیں۔

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے کسی پہاڑ میں گم ہو گئے۔ اتفاق سے ابو جہل اونٹنی پر سوار ادھر سے آنکلا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سوار کر کے آپ کے دادا کے پاس لے آیا، اور کہا کہ آپ کے اس بیٹے سے نہ معلوم ہم کو کیا کچھ پہنچے گا۔ عبد المطلب نے پوچھا کیوں؟ ابو جہل نے کہا کہ یہ بچہ فلاں درے میں راستہ بھول گیا تھا میں نے اس کو اٹھا کر اپنے پیچھے بٹھا لیا تو اونٹنی وہیں بیٹھ گئی، بہت کوشش کی نہیں چلی، پھر میں نے اس بچہ کو اپنے آگے بٹھلایا تو اونٹنی اٹھ کر چلنے لگی (گویا جس طرح فرعون سے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرائی گئی اسی طرح اس امت کے فرعون (ابو جہل) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دادا تک پہنچانے کی خدمت لی گئی)۔

(۳) بعض کہتے ہیں کہ ضلال سے مراد ہجرت کا رخ معلوم نہ ہونا ہے اور ہدایت سے مراد اس کی تعیین ہے۔ (۴) سمت قبلہ کے سلسلہ میں بے قراری مراد ہے۔ (۵) اول وہلہ میں جبرئیل امین علیہ السلام کو نہ پہچاننا ضلال ہے،

پھر تعارف ہدایت ہے۔(۶) دنیوی کاروبار سے ناواقفیت کو ضلال سے تعبیر فرمایا گیا۔(۷) یا آسمانی راہوں سے ناواقفیت کو ضلال اور شب معراج میں ان کی رہنمائی کو ہدایت سے تعبیر فرمایا گیا۔(۸) بعض کہتے ہیں کہ ضلال کے معنی ملنے کے آتے ہیں ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّبَنِ دودھ میں پانی مل گیا، مطلب یہ ہوا کہ وحی سے قبل آپ ﷺ (باوجود موحد و معصوم ہونے کے) اہل مکہ میں ملے جلے رہتے، لیکن نزول وحی نے فرق وامتیاز پیدا کردیا۔ تو پہلی حالت کو ضلال اور دوسری حالت کو ہدایت فرمایا گیا۔(۹) بعض نے کہا کہ کمال عشق ومحبت کو بھی ضلال کہتے ہیں، چنانچہ اولادِ یعقوب علیہ السلام نے کمال عشق یوسف کو ضلال سے تعبیر کیا۔﴿تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلَالِكَ الْقَدِيْمِ﴾. اور ﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾. خواتین مصر نے زلیخا کے بارے میں کہا تھا۔﴿اِنَّا لَنَرٰهَا فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ.﴾ حاصل یہ ہے کہ عشق ومحبت جب قلب پر مستولی ہوجاتے ہیں، اور جذب کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے تو اس کو ضلال سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اطلاق المسبب علی السبب کے قبیل سے ہے، جیسا کہ ﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا﴾ میں رزق مسبب بول کر سبب یعنی (بارش) مراد لی گئی ہے، تو یہاں ضلال سے مراد پروردگار عالم کا کمال عشق ہے، اور ہدایت سے محبوب حقیقی کے وصل کی رہنمائی مراد ہے۔ حضرات مفسرین نے اس قسم کی بہت سی باتیں کہی ہیں، والاول اصح واظهر. والله اعلم.

فائدہ......جمہور اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام ابتداء ہی سے کفر وشرک وکبائر اور ہر قسم کی ظاہری وباطنی گندگیوں اور تمام عیوب سے مبرا اور پاک ہوتے ہیں، ان میں کوئی بات قابل نفرت نہیں ہوتی۔ ان کو اعلیٰ اخلاق، اعلیٰ خاندان، اعلیٰ صورت وسیرت پر پیدا کیا جاتا ہے، اور قبل النبوت وبعد النبوت ان کی حفاظت کیجاتی ہے، کیونکہ ان کو مخلوق کا ہادی ورہبر بننا ہوتا ہے، اس لئے ان میں کوئی چیز قابل نفرت ہونا عقل ومقصود خداوندی کے خلاف ہے، لہٰذا جن لوگوں نے لفظ ضالا سے استدلال کرتے ہوئے، (نعوذ باللہ) گمراہ کہنے کی جرأت کی ہے، اگر نادانستہ طور پر ان سے یہ حرکت ہوئی ہو تو وہ جانیں، لیکن اگر متعصب عیسائیوں، معاند ہندوؤں اور بدخواہ دشمنوں کی طرح آفتاب پر غبار ڈالنا مقصود ہے تو انتہائی کمینہ پن اور دارین کی روسیاہی ہے، وَمَنْ اَهَانَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ.

تیسری نعمت......وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى (اور اللہ نے آپ کو تنگدست وعیالدار پایا تو غنی کردیا) تیسری حالت عمر شریف کا وہ حصہ ہے، جس میں آپ عیالدار تھے، اور ظاہری اسباب میں آپ کے پاس زراعت، تجارت اور صنعت وغیرہ کوئی چیز نہ تھی، مگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے آپ کو غنی کردیا، غناء قلبی آپ کو اس درجہ عطاء ہوا کہ آپ سید الاغنیاء ہیں، انما الغنى غنى النفس۔ اور غنائے ظاہری اس طرح عطاء فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ شانہٗ نے بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عطاء فرمائیں جو مکہ کی رئیسہ تھیں، اور سرداران قریش ان سے نکاح کرنا چاہتے تھے، مگر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کو پسند کیا، اور دل وجان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر اپنا سارا مال نثار کردیا، ان سے پہلے خواجہ عبدالمطلب وخواجہ ابوطالب (آپ کے دادا چچا) کا مال آپ کی پرورش پر خرچ ہوتا رہا، اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے چالیس ہزار درہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کردیئے، اور انصار ومہاجرین نے اپنا اپنا سرمایہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا، وخوشنودی پر صرف کیا۔ پھر فتوحات سے غنائم کے دروازے کھلے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوروں کو بیشمار اموال تقسیم فرمائے۔

چند نکات:

اہل حکمت نے اس مقام پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ تینوں احوال سے بہت سے نکات اخذ کئے ہیں۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) حق تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم کیوں کیا؟ (الف) تاکہ آپ ﷺ اپنی یتیمی کو یاد رکھتے ہوئے یتیموں کی قدر اور ان پر رحم کریں۔ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی بھی آپ کی پیروی میں یتیموں پر رحم کریں۔ (ب) آپ کی امت اپنے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یتیمی کو یاد کر کے یتیموں کی خدمت کرے۔ ان کو ذلیل وحقیر نہ جانے۔ آپ ﷺ تمام جن وانس کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، آپ کے ماننے والے ساری دنیا میں قیامت تک یتیموں اور بیکسوں کی خدمت کرنا باعث فخر خیال کریں۔ (ج) آپ کو متوکلین کا امام بنانا تھا، شروع ہی سے اسباب توڑ کر آپ ﷺ کو توکل کا اعلیٰ ترین مرتبہ عطاء کیا گیا۔ اس طرح شروع ہی سے آپ کا اعتماد اور بھروسہ مسبب الاسباب کی ذات عالی پر پختہ ہو گیا تھا۔ (د) آپ کے بلند اخلاق کسی کی تربیت کے مرہون منت نہ رہے، بلکہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اخلاق وعادات اور آداب خود ہی سنوارے تھے۔ اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبِیْ (ھ) آپ کے اخلاق معلٰی اور آداب مجلسی بھی ایک زبردست معجزہ اور دلیل نبوت قرار پائے۔ کیونکہ عموماً یتیم بچے مربی کے نہ ہونے کے سبب بے ادب وبد اخلاق ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ ﷺ یتیم ہونے کے باجود ابتدائے عمر ہی سے بلند اخلاق تھے۔ آپ دنیا میں تشریف لائے تو ناواقف وبے خبر تھے، پروان چڑھے اور اپنے محبوب حقیقی کی طلب میں سرگرداں رہے، حق تعالیٰ نے آپ کو ایسا باخبر فرمایا کہ اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ کا مقام یعنی سب سے زائد علم عطا فرما کر امام الاولین والآخرین، ہادیٔ اعظم اور اپنا محبوب بنا لیا، حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ وہ نعمت ہے جو اپنے حبیب کے سوا اس نے کسی کو عطا نہیں فرمائی ؎

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا　　عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرَ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناداری اور فقر ومسکینی میں دادا، چچا، اہلیۂ محترمہ، یار غار اور انصار جاں نثار کے اموال سے مستغنی کیا گیا۔ اور خود آپ کو مالدار نہیں بنایا گیا، وجہ یہ ہے کہ (۱) مالداروں میں عموماً غرور وخود بینی اور خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ نشست وبرخاست بھی غرباء ومساکین کے ساتھ پسند نہیں کرتے، اور یہ باتیں شان نبوت ومقصد رسالت کے خلاف تھیں، اس لئے ظاہری مالداری سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی گئی (۲) اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ظاہری دولت وثروت ہوتی تو لوگ غریب اہل ایمان پر بدگمانی کرتے۔ اور یہ تہمت لگاتے کہ مال کے لالچ میں یہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہو گئے ہیں، لیکن جب مؤمنین خود اپنے جان ومال کو آپ پر نثار کرتے تھے تو یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسکینی کی زندگی محبوب تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کی اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔ کیونکہ اس میں شان عبدیت، تواضع کی رفعت، توکل کی خصلت، مناجات کی لذت اور تمام بکھیڑوں سے فرصت ہے، صرف محبوب حقیقی کے لئے فراغت ہو جاتی ہے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی　　اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

(۴) امت کو یہ معلوم ہو جائے کہ دین کی محنت ودعوت اور اشاعت ظاہری اسباب دولت وثروت اور شوکت وسطوت کی محتاج نہیں (۵) ہر انسان خواہ وہ غنی ہو یا فقیر، تنگدست وتہیدست پیدا ہوتا ہے، پھر یا تو وہ تحصیل مال میں سرگرداں

پھرتا ہے، تو دوسروں کی نگاہوں میں اس کی وقعت وعزت نہیں ہوتی۔ یا وہ کمال اخلاق وعقلمندی ودانائی سے دوسروں کو اپنا گرویدہ وتابعدار بنا کر ان کے مال سے فائدہ اٹھاتا ہے، تو یہ باعث عزت وشوکت ہوتا ہے، چنانچہ بادشاہ رعیت کے مال سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور صاحب عزت وشوکت ہوتا ہے، اور فقیر مال جمع کرتا ہے اور لوگوں کو مسخر کئے بغیر مال طلب کرتا ہے، تو وہ ذلیل وخوار ہوتا ہے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مال کا ہونا عزت کا سبب ہو اور نہ ہونا ذلت کا سبب ہو، یہ ضروری نہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جو مال طمع ولالچ سے آتا ہے ذلت وخواری لاتا ہے، اور جو غنائے قلب وقناعت کے ساتھ آتا ہے وہ عزت وشوکت لاتا ہے، فافہم۔

فائدہ...... آیت میں اصل فَاَغنیٰ سے غنائے نفس ودولت قناعت مراد ہے، مقاتل وفراء رحمۃ اللہ علیہما نے اسی کو پسند کیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کامیاب ہوگیا وہ شخص جس کو دولت اسلام مل گئی۔ اور بقدر ضرورت رزق نصیب ہوا۔ اور دولت قناعت میسر آ گئی۔ (مسلم) آگے اخیر سورت تک تین آیات میں مذکورہ تین انعامات کا شکریہ ادا کرنے کے سلسلہ میں تین احکام دیے گئے ہیں۔

پہلا حکم...... پہلا حکم یتیموں پر رحم وکرم اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا ہے، چنانچہ ارشاد ہے فَاَمَّا الْیَتِیْمَ الخ (پھر آپ یتیم کو نہ دبایئے) زمانۂ جاہلیت میں عرب میں بھی سنگدلی وبدکاری اور ظلم وستم کی کوئی حد نہ تھی۔ یتیموں، ضعیفوں، بیواؤں، کمزوروں اور بے کسوں پر زیادتیاں کرنا اپنے تھوڑے سے نفع کی خاطر دوسروں کا نقصان کر دینا کوئی بات ہی نہ تھی، اس لئے یہاں خطاب تو بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، مگر مقصود نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہدایت کرنا ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحیم وکریم اور معصوم ذات گرامی سے تو اندیشہ بھی ممکن نہیں کہ آپ کسی پر زیادتی کریں گے۔ لَا تَقْهَرْ کا لفظ بہت عام ہے، اس میں ہر قسم کی بدسلوکی وزیادتی سے منع کیا گیا ہے۔

نکتہ...... یہاں یہ فرمایا، قہر نہ کرنا، یہ نہیں فرمایا کہ ''رحم کرنا'' کیونکہ اس میں دفع مضرت ہے جو جلب منفعت سے مقدم ہے، اور جب قہر نہیں تو رحم ہی رحم ہوگا۔ علاوہ ازیں یتیم پر رحم وحسن سلوک کا حکم دوسری بے شمار نصوص میں بھی وارد ہے، اس لئے یہاں قہر سے ممانعت ہے جس کا اس وقت رواج تھا، اور دوسری نصوص میں رحم وکرم کی ترغیب ہے۔

یتیم کے ساتھ اچھا سلوک:

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تو رحمۃ للعالمین ہے، آپ تو سارے عالم کے لئے سراپا رحمت وشفقت ہیں ہی، خصوصا بیکسوں، ضعیفوں، کمزوروں، اور بے سہارا یتیموں کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سہارا اور مربی ووالی بنے، اور دوسروں کو بھی ان کے ساتھ حسن سلوک ورعایت کی بار بار تاکید فرمائی، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (۱) ہر مؤمن کیساتھ مجھ کو اس کی جان سے بھی زیادہ تعلق ہے، اس لئے جو شخص قرض یا عیال چھوڑے وہ ہمارے ذمہ ہیں۔ اور جو مال چھوڑے وہ اس کے وارثوں کا ہے، میں اس کا مولیٰ ہوں جس کا کوئی مولیٰ نہیں۔ (۲) مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو، اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو، اور مسلمانوں کا بدترین مکان وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔ (۳) جو کسی یتیم کے سر پر (شفقت سے) ہاتھ پھیر دے۔ اس کا ہاتھ جتنے بالوں پر گذرے گا اتنی ہی نیکیاں اس کے لئے لکھ دی جائیں گی، اور جو کسی ایسی یتیم لڑکی یا لڑکے کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا جس کی وہ پرورش کرتا

ہے تو میں اور وہ جنت میں ان دونوں انگلیوں کی طرح (قریب قریب) ہوں گے۔ اور آپ نے اپنی دوانگلیاں ملا کر اشارہ فرمایا۔ (۴) جو شخص کسی یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شامل کرلے تو حق تعالیٰ اس کے لئے یقیناً جنت واجب فرمادیتے ہیں، بشرطیکہ وہ کوئی ایسا گناہ نہ کرے جو معاف نہ ہوسکے، یعنی کفروشرک نہ کرے۔ (۵) ایک شخص نے دل کی سختی کی شکایت کی، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیردے۔ یا کسی مسکین کو کھانا کھلادے۔ سلف صالحین میں سے کسی بزرگ کا قول ہے کہ یتیم روتا ہے تو عرش الٰہی ہلنے لگتا ہے، پھر جو اس کو بہلا کر خاموش کردیتا ہے، تو گویا عرش الٰہی کو وہ ہلنے سے روک دیتا ہے۔

دوسرا حکم...... وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (اور آپ سائل کو نہ جھڑکئے) اس میں وہ سائل بھی داخل ہے جو روپیہ، پیسہ، روٹی کپڑا کسی دنیوی حاجت کا سوال کرتا ہے، اور وہ بھی جو کسی مسئلہ اور علمی تحقیق کا سوال کرتا ہے، دونوں کو جھڑکنے اور ڈانٹنے سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے منع فرمایا گیا، اور اس سے امت کو ہدایت دینی مقصود ہے، کیونکہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے مستبعد تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سائل کو جھڑک دیں، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ سائل کو کچھ دیکر رخصت کیا جائے، اور نہیں دے سکتا ہو تو عذر کرکے نرمی سے اس کو واپس کردیا جائے، اسی طرح کسی مسئلہ کا سوال کرنے والے کے جواب میں بھی سختی وبدخوئی ممنوع ہے، نرمی، شفقت اور خوش اخلاقی سے جواب دینا چاہئے، اگر مطلوب مسئلہ کی تحقیق نہ ہو تو سائل سے نرمی کے ساتھ عذر کردیا جائے۔ مفتیان عظام واساتذہ کرام کو اس بات کا خصوصیت سے دھیان رکھنا چاہئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس عالم سے کوئی علم کی بات پوچھی جائے (اور سائل کو اس کی احتیاج بھی ہے) اور عالم اس کو چھپالے (نہ بتائے) تو قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم) ہاں اگر سائل بلاضرورت سوال کرتا ہے، کسی عذرومعذرت اور نرمی سے نہیں مانتا تو زجر بھی جائز ہے۔

جودوکرم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سید الاسخیاء، اجود بنی آدم تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہنا جانتے ہی نہ تھے، جو میسر آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطاء فرمادیا، نہ ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ فرمالیا، بخاری شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی سائل نے جو کچھ بھی سوال کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کے جواب میں لا نہیں فرمایا۔ فرزدق شاعر نے اسی مضمون کو نظم میں اس طرح کہا ہے

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِيْ تَشَهُّدِہٖ لَوْلَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَاؤُهٗ نَعَمْ

ترجمہ:...... نہ فرمایا کبھی لا آپ نے لیکن تشہد میں نہ ہوتا گر تشہد تو وہ لا ان کا نعم ہوتا

ایک مرتبہ بحرین سے نوے ہزار درہم آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب ہی تقسیم فرمادیئے، اتفاق سے ایک ضرورت مند سائل آنکلا آپ نے فرمایا جو کچھ میرے پاس تھا وہ سب تقسیم ہوچکا، اب تم بازار جاکر اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کر میرے ذمہ لکھوادو میں ادا کردوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: حضور حق تعالیٰ نے وسعت سے زائد کا مکلف نہیں بنایا، پھر آپ قرض کا بارگراں کیوں اپنے سر لیتے ہیں۔ اس سے آپ کے رخ انور پر ناگواری ظاہر ہوئی، تو ایک

انصاری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا اَنْفِقْ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا (یارسول اللہ خرچ کیجئے اور مالک عرش سے کمی کا اندیشہ نہ فرمائیے) اس سے آپ مسرور ہوئے، علاوہ ازیں آپ کے جود وکرم کے ہزارہا واقعات حدیث وسیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

تنبیہ:...... آیت میں سائل سے مراد وہی محتاج سائل ہے جس کے لئے شرعاً سوال جائز ہو، پیشہ ور گداگری کرنیوالے اس سے مراد نہیں، گداگری کو پیشہ بنالینا شرعاً حرام ہے، اوران کو بھیک دینا حرام کام پر ان کی اعانت ہے، شرعاً حرام کام پر اعانت بھی حرام ہے، وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان۔

تیسرا حکم...... وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (اوراپنے رب کی نعمت کو بیان کیجئے) مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا لوگوں کے سامنے ذکر کیا کریں، یہ بھی شکرگذاری کا ایک طریقہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والا صبر کرنے والے روزہ دار کے مثل ہے، اگر کوئی آدمی کسی پر احسان کرے تو اس کا بھی شکریہ ادا کرنا حکم ہے، حدیث میں ہے کہ سب سے زیادہ شکرگذار وہ ہے جو لوگوں کا بہت شکر ادا کرنیوالا ہو، ایک روایت میں ہے کہ جس نے انسانوں کا شکر ادا نہیں کیا اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا، احسان کا بدلہ دینا بھی شکر کا ایک طریقہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، تو اس کو اس احسان کا بدلہ دو، اگر بدلہ دینے کی استطاعت نہیں تو کم از کم لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو، کیونکہ جس نے (اپنے محسن کی) لوگوں کے سامنے تعریف کردی اس نے احسان کا شکر ادا کردیا۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر ارشاد فرمارہے تھے جس نے تھوڑے کا شکریہ ادا نہیں کیا، اس نے زیادہ کا بھی شکر ادا نہیں کیا، اور جس نے لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا اس نے اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کیا۔ اللہ کی نعمت کو یاد کرنا بھی شکر ہے اور نہ یاد کرنا ناشکری ہے، جماعت اللہ کی رحمت ہے، اور تفرقہ اللہ کا عذاب ہے، ان احادیث کا تقاضا ہے کہ مشائخ اوراساتذہ کا بھی شکر ادا کیا جائے، ان کے احسانات کی تعریف اوران کا بھلائی سے ذکر کیا جائے۔

نعمت سے کیا مراد ہے؟

نعمت کا لفظ عام ہے کوئی بھی نعمت ہو دنیوی ہو یا دینی، ظاہری ہو یا باطنی، مقاتلؒ نے کہا کہ تحدیث نعمت سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو آپ کو ٹھکانا دیا، ہدایت دی اور غناء سے نوازا، ان سب کا شکر ادا کیجئے، مجاہدؒ وزجاج رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے کہ نعمت سے مراد نبوت ہے، اور تحدیث سے مراد تبلیغ وپیغام رسانی ہے، لیث وکلبی کا قول اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہم کی ایک روایت یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن مقدس ہے، اور تحدیث کا مطلب قرآن کی تلاوت وتبلیغ ہے، لیکن نعمت کو عام رکھنا یا مقاتلؒ کے قول کے مطابق مذکورہ بالا تینوں نعمتوں کو مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر ۱...... ہر نعمت کا شکر واجب ہے، اور شکر نعمت کا مطلب یہ ہے کہ اس نعمت کو منعم کے منشا کے مطابق صرف کیا جائے، لہٰذا نعمت مالیہ کا شکر اخلاص کے ساتھ شریعت کے مطابق راہ خدا میں خرچ کرنا ہوگا۔ اور نعمت بدنیہ کا شکر بدن کو عبادات واوامر میں استعمال کرنا اور منہیات ومعاصی سے اس کو بچانا ہوگا، اور علم وعرفان کی نعمت کا شکر دوسروں کو سکھانا اور خلق خدا کو ان سے سیراب وفیضیاب کرنا ہوگا۔

مسئلہ نمبر ۲...... چونکہ نعمت کا ذکر کرنا بھی اس کا شکر ہے، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا سَیِّدُ

وُلْدِ اٰدَمَ وَلَا فَخْرَ وغیرہ امتی بھی حق تعالیٰ کے انعامات کو بیان کرسکتا ہے، بشرطیکہ تعلّی و استکبار اور ریا کاری نہ ہو، بلکہ دوسروں کو حق تعالیٰ کی عطاء وجود کی طرف رغبت دلانا مقصود ہو، یا شکر کو رواج دینا مقصود ہو، یا اس لئے ذکر کرنا ہو کہ لوگ میری اس نیکی میں پیروی کریں گے وغیرہ، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی شب بیداری و عبادت کا حال لوگوں کے سامنے بیان کردیتے تھے، بعض بیوقوفوں نے ان پر اعتراض کیا کہ اس میں ریاء کا شائبہ ہے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ پڑھی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سب سے بڑی نعمت، توفیق عبادت عطاء فرمائی ہے، میں اس کا اظہار کیوں نہ کروں، اور اللہ تعالیٰ کی شکرگذاری سے کیوں محروم رہوں، بہت سے اہل اللہ سے بھی اس قسم کی باتیں منقول ہیں، کہ وہ اپنے کمالات یا عبادات کا اظہار کردیا کرتے تھے، مثلاً شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی فرماتے ہیں۔

وَكُلُّ وَلِيٍّ لَهُ قَدَمٌ وَاِنِّيْ عَلٰى قَدَمِ النَّبِيِّ بَدْرِ الْكَمَالِ

ترجمہ...... ہر ولی کا ایک قدم ہے (جس پر وہ چلتا ہے) اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پر چلتا ہوں، جو بدر کمال تھے، یعنی مجھ کو مکمل اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاصل ہے۔

اہل اللہ کے یہ تذکرے بطور تحدیث نعمت ہوتے ہیں، اگر کوئی اس قسم کے اقوال کو خلاف شرع قرار دیتا ہے تو وہ اس آیت کریمہ کا منکر ہے، ہاں اس طرح سے تحدیث نعمت کے لئے شرط یہ ہی ہے کہ آلائش نفس پاک ہو چکا ہو، ورنہ ایسی جرأت جائز نہیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ ابلیس کی طرح اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ کہہ کر تباہ نہ ہو جائے۔ (العیاذ باللہ۔ مظہری)

مسئلہ نمبر ۳...... سورۂ والضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے، اور اس تکبیر کے الفاظ شیخ صالح مصری رحمۃ اللہ علیہ نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ بتلائے ہیں۔ (مظہری) لیکن اگر صرف الله اکبر کہہ لے تب بھی سنت ادا ہو جائیگی، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ہر سورت کے ختم پر اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے۔ دونوں میں سے جس کو بھی اختیار کرلیا جائے، بہر دو صورت سنت ادا ہو جائیگی۔

خاصیت:

اس سورت کی مجرب خاصیت یہ ہے کہ گمشدہ چیز کے لئے سات بار اس کی تلاوت کرے اور شہادت کی انگلی اپنے سر کے چاروں طرف گھماتا رہے، پھر **اصبحتُ فی امانِ اللّٰہِ وَاَمسیتُ فی جوارِ اللّٰہ، اَمسیتُ فی امانِ اللّٰہِ واصبحتُ فی جوارِ اللّٰہ** سات مرتبہ پڑھ کر دستک دے تو گمشدہ چیز انشاء اللہ مل جائیگی۔

فائدہ...... سورہ ضحیٰ سے اخیر قرآن کریم تک اکثر سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کے انعامات اور آپ کے خصوصی فضائل کا ذکر ہے، اور چند سورتوں میں احوال قیامت بیان ہوئے ہیں، قرآن حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور نا قابل شبہ وشک ہونے سے کیا گیا، اور ختم قرآن اس ذات کی عظمت پر کیا گیا ہے جس پر قرآن پاک نازل ہوا۔

تمّ سورة الضحیٰ فالحمدللہ رب الارض والسموات العلیٰ والصلوٰة والسلام علی سید الوریٰ محمد المصطفیٰ وآلہٖ المجتبیٰ وصحبہٖ نجوم الهدیٰ ومن تبعهم من اهل التقیٰ

سُوْرَۃُ الْاِنْشِرَاحِ

سُوْرَۃُ الانشراح مَکِّیَّۃٌ وَهِیَ ثَمانُ ایاتٍ

(رکوع:۱، آیات:۸)　　سورۂ انشراح مکہ میں نازل ہوئی اوراس میں آٹھ آیات ہیں۔　　(کلمات:۲۷، حروف:۱۰۳)

ربط ومناسبت

یہ سورت بالاتفاق مکہ میں نازل ہوئی، سورہ سابقہ سے اسکی مناسبت بہت واضح ہے، پہلی سورت میں ان انعامات کو بیان فرمایا گیا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے، اس سورت میں بھی ان افضال کا ذکر ہے، جو آپ کی ذات گرامی پر فائض ہوئے، گویا اس سورت کے مضامین سورۂ سابقہ کا بقیہ ہیں، پھر دونوں سورتوں کی عبارت کا طرز بھی ملتا جلتا ہے، اسی شدّتِ ربط ومناسبت کاملہ کی وجہ سے فرقۂ روافض نے دونوں سورتوں کو ایک ہی سورت قرار دیا ہے، اور وہ دونوں سورتوں کو ایک رکعت میں اس طرح پڑھتے ہیں کہ درمیان سے بسم اللہ شریف کو بھی حذف کردیتے ہیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو دونوں سورتوں میں لفظاً اور معنیً دونوں طرح سے فرق وامتیاز ہے جس کی بنا پر دونوں کو ایک سورت قرار دینا غلط ہے، لفظی فرق تو یہ ہے کہ سورۂ ضحیٰ میں استفہام غائب کے صیغوں کے ساتھ ہے۔ اَلَمْ یَجِدْکَ اور اس سورت میں متکلم کے صیغوں کے ساتھ اَلَمْ نَشْرَحْ اور معنوی فرق یہ ہے کہ (۱) حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں دو قسم کے کمالات ودیعت رکھے ہیں، ایک تو وہ جن کا تعلق مخلوق سے ہے، دوسرے وہ کمالات جن کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خاص سے ہے، اول قسم کے کمالات کو سورۂ ضحیٰ میں اَلَمْ یَجِدْکَ سے فَاَغْنٰی تک بیان فرمایا، اور دوسری قسم کے کمالات کو اس سورت میں بیان کیا گیا (اور وہ ہیں شرحِ صدر ووضعِ وزر اور رفعِ ذکر) یا یہ کہئے کہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جن ظاہری کمالات وانعامات سے نوازا تھا ان کا ذکر سورۂ سابقہ میں ہے، اور جو باطنی کمالات وانعامات عطاء کئے گئے تھے ان کا بیان اس سورت میں ہے، اب رہی یہ بات کہ دونوں سورتوں میں جب انعامات کا ذکر ہے تو شدتِ اتصال اور کمال مناسبت کی وجہ سے دونوں کو ایک قرار دیا جائے اور بسم اللہ کو درمیان سے حذف کردیا جائے، تو اولاً اس میں اجتہاد وقیاس کو دخل نہیں، تمام سورتیں توقیفی ہیں، دوسرے پورے قرآن کی تمام سورتوں میں نہایت ربط ہے، اور اکثر سورتوں میں اسی قسم کی شدید مناسبت موجود ہے، تو سارے قرآن کی سب سورتوں کو ایک کردیا جائے اور بسم اللہ کو ہر جگہ سے حذف کردیا جائے۔

گر ہمیں مکتب وہمیں مُلّا　　کار طفلاں تمام خواہد شد

شانِ نزول:

مفسرین نے اس سورت کا سبب نزول یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا، بار الٰہی! آپ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلعتِ خُلّت عنایت فرمائی، موسیٰ علیہ السلام کو رتبۂ کلیمی بخشا، داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے اور پہاڑوں کو مسخر فرمایا، اور سلیمان علیہ السلام کو جن وانس اور ہوا پر سلطنت عطاء کی، مجھ کو آپ ﷺ نے خصوصی امتیاز کیا عنایت فرمایا، اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی، جس میں ان مخصوص انعامات (شرحِ صدر وضعِ وزر اور رفعِ ذکر) کا بیان فرمایا گیا جو آپ کے سوا کسی کو میسر نہیں آئے، بظاہر یہ سوال معراج سے پہلے کا ہوسکتا ہے، کیونکہ معراج

میں اوراس کے بعد حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مخصوص وعظیم نعمتیں مرحمت فرمائیں کہ انبیاء سابقین میں سے کسی کو ان کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہ ہوسکا۔

وجہ تسمیہ:

لفظی اعتبار سے ظاہر ہے کہ اس کے شروع میں اَلَمْ نَشْرَحْ موجود ہے، اور معنوی اعتبار سے اس سورت کا مضمون کمالاتِ محمدیہ (علیہ التسلیم والتحیۃ) کھولتا ہے، اس میں شرح صدر کا ذکر ہے، کہ آپ کے صدرِ معنوی کو وسعت وکشادگی عطاء کی گئی، اوراس کو انوارِالٰہی وتجلیاتِ لامتناہی سے پُر کردیا گیا۔ اور کمالات محمدیہ کی اصل حقیقت یہی ہے

فَقَدْ اُعْطِيْتَ مَالَمْ يُعْطَ خَلْقٌ عَلَيْكَ صَلٰوةُ رَبِّكَ بِالسَّلَامِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (١) وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (٢) الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (٣) وَرَفَعْنَا لَكَ

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ نہیں کھول دیا، اور کیا ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ نہیں اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی،

اَلَمْ	نَشْرَحْ	لَكَ	صَدْرَكَ	وَ	وَضَعْنَا	عَنْكَ	وِزْرَكَ	الَّذِیْ	اَنْقَضَ	ظَهْرَكَ	وَ	رَفَعْنَا	لَكَ
کیا نہ	کھول دیا ہم نے	تیرا	سینہ تیرا	اور	اتار رکھا ہم	سے تجھ	بوجھ تیرا	جس	توڑی تھی	پیٹھ تیری	اور	بلند کیا ہم	تیرے واسطے

ذِكْرَكَ (٤) فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (٥) اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (٦) فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (٧)

اور کیا ہم نے آپ کیلئے آپکا ذکر بلند نہیں کردیا، پھر یقیناً ہر مشکل کیساتھ آسانی ہے، بیشک ہر مشکل کیساتھ آسانی ہے۔ پھر جب آپ فارغ ہوجایا کریں تو محنت کیا کیجئے۔

ذِكْرَكَ	فَاِنَّ	مَعَ	الْعُسْرِ	يُسْرًا	اِنَّ	مَعَ	الْعُسْرِ	يُسْرًا	فَاِذَا	فَرَغْتَ	فَانْصَبْ
ذکر تیرا	پس تحقیق	ساتھ	سختی	آسانی	تحقیق	ساتھ	سختی	آسانی	پس جب	فارغ ہوتو	پس محنت کر

وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (٨)

اور اپنے رب ہی سے لو لگایئے۔

وَاِلٰى	رَبِّكَ	فَارْغَبْ
اور طرف	اپنا رب	رغبت کریں

لغات:

اَلَمْ نَشْرَحْ جمع متکلم مضارع منفی بلم شَرْحٌ مصدر (ف) کھولنا، پھیلانا، معانی کا اظہار، مبہم کی توضیح اور مجمل کی تفصیل کرنا، وَضَعْنَا عَنْكَ جمع متکلم وَضْعًا وَمَوْضِعًا وَمَوْضُوْعًا (ف) رکھنا، جننا، ذلیل کرنا، ب صلہ مِنْ گرانا، گھٹانا، بصلہ عَنْ چھوڑ دینا، ہٹانا۔ (س) نقصان اٹھانا، (ك) لئیم ہونا، دنی وخسیس ہونا، وِزْرٌ گناہ، گرانی، بھاری بوجھ، پہاڑ۔ جمع اوزار۔ اَنْقَضَ صیغہ واحد مذکر غائب افعال سے توڑنا، نقض نقضا (ن) توڑنا، ڈھانا، کھولنا، خراب کرنا، رَفَعْنَا لَكَ (ف) اٹھانا، بلند کرنا، فَرَغْتَ صیغہ ماضی (ف ن س) فارغ ہونا، خالی ہونا، پورا کرنا، تمام کرنا۔ اِلَيْهِ قصد کرنا۔

(ک) رنجیدہ ہونا، گھبرانا۔ فَانْصَبْ صیغہ امر حاضر (س) تھکنا، فَارْغَبْ ایضًا (س) بصلہ فِیْ خواہش کرنا، بصلہ عَنْ اعراض کرنا بصلہ اِلٰی خواری وعاجزی ظاہر کرنا، (ك) فراخ وکشادہ ہونا، بہت کھاؤ ہونا۔

ترکیب:

اَلَمْ نَشْرَحْ فعل بافاعل لَکَ متعلق صَدْرَکَ مفعول بہ جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَعاطفہ وَضَعْنَا فعل با فاعل عَنْکَ متعلق وِزْرَکَ مفعول بہ اور اَلَّذِیْ اسم موصول اپنے صلہ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ (فعل ضمیر فاعل ومفعول بہ) جملہ فعلیہ سے مل کر صفت ہے مفعول بہ وِزْرَکَ کی۔ جملہ فعلیہ معطوف اول وَ عاطفہ رَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ جملہ فعلیہ مثل سابق معطوف ثانی فَ تعلیلیہ اِنَّ اپنی خبر مقدم مَعَ الْعُسْرِ اور اسم مؤخر یُسْرًا سے مل کر جملہ اسمیہ مؤکد اور جملہ ثانیہ تاکید۔ فَ تفریعیہ اِذَا ظرفیہ برائے شرط فَرَغْتَ (فعل بافاعل) جملہ فعلیہ شرط فَ جزائیہ اِنْصَبْ فعل فاعل جملہ انشائیہ معطوف علیہ اِلٰی رَبِّکَ فعل اِرْغَبْ کے متعلق، جملہ انشائیہ معطوف، معطوفین مل کر جزاء، یا یہ فَارْغَبْ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ تھا یعنی مَا اُضْمِرَ عَامِلُهٗ کے قبیل سے ہے، فاء عاطفہ ہے، اور یہ عطف تفسیری ہے۔

تفسیر:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا) سینہ کو کھولدینا اس کو علوم ومعارف اور اخلاق حسنہ کے لئے وسیع کردینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، ایک دوسری آیت میں ہے فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (جس کو حق تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جو باطنی کمالات اور روحانی انعامات عطاء فرمائے ہیں اس سورت میں ان میں سے تین عظیم الشان کمالات کا ذکر ہے، ان میں سے پہلا کمال شرح صدر ہے جس کو اس آیت میں بیان فرمایا گیا۔

پہلا کمال شرح صدر اور اس کی تشریح:

شرح صدر ہدایت کا آخری مرتبہ ہے، اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ نہیں، یہ مرتبہ اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے شایان شان ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مرتبہ کی درخواست کی تھی ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ﴾ لیکن شرح صدر کا درجۂ کمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا طلب ملا

بن مانگے موتی ملے مانگے ملے نہ بھیک

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ کبریٰ کے لئے یہ مرتبۂ کمال ضروری بھی تھا، اس شرح صدر کا مفہوم بڑا وسیع ہے جس میں تمام رذائل ومعائب سے پاکیزگی کے بعد جملہ خصائل حمیدہ سے قلب کا مزین ہونا، اعلیٰ درجہ کے تحمل وبردباری ایمان وحکمت اور علم سے دل کا پُر ہوجانا بھی داخل ہے، اس مرتبہ میں ملک وملکوت اور لاہوت وجبروت کے حقائق منکشف ہوجاتے ہیں، قلب، علم وعرفان، اسرار وحکم کا خزانہ اور زبان اسرار غیبیہ کی ترجمان بن جاتی ہے، عالم غیب کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے، پھر خلق کی طرف توجہ خالق کی طرف توجہ میں مخل نہیں ہوتی۔ اصطلاح صوفیہ میں کمال عروج وکمال نزول کا آخری مرتبہ بھی یہی ہے، بعض حضرات نے شرح صدر کو حوصلہ کی فراخی سے تعبیر کیا ہے، اور حوصلہ کی فراخی ہر شخص کی استعداد اور کمال

و مرتبہ کے مطابق ہوتی ہے۔اور کمال حوصلہ کو اہل کمال ہی پہچان سکتے ہیں، چنانچہ بادشاہوں کے حوصلے تک عوام الناس کی رسائی نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ ان کے کمال حوصلہ کو پہچان سکتے ہیں، اسی لئے مشہور ہے، ولی را ولی می شناسد، اور شرح صدرِ محمدیؐ و حوصلۂ مصطفویؐ بھی ان کے کمال مرتبہ کے مطابق ہے، کسی اور کی رسائی وہاں تک ممکن نہیں، کیونکہ آپ کا کمال مرتبہ ختم نبوت ہے، جو کسی اور کو حاصل نہیں، اور نہ کماحقہٗ کوئی آپ کے کمال مرتبہ کو دریافت کر سکتا ہے

يَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَيَا سَيِّدَ الْبَشَرِ　　　بِوَجْهِكَ الْمُنِيْرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمَرُ
لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ　　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اسی شرح صدر، کمال حوصلہ اور مرتبہ ختم نبوت کی وجہ سے آپ مرجع خلائق، امام الاولین والآخرین، سید البشر اور حبیب اکبر ہیں، شاہ و گدا، اہل سیاست و حکومت، ارباب عدالت و عبادت، اصحاب علم و معرفت سب ہی آپ ﷺ کے محتاج ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے رہبر اعظم و ہادئ عالم ہیں:۔

صَلَاةُ اللّٰهِ مِنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ　　　عَلَيْهِ لَا تَحُوْلُ وَلَا تَزُوْلُ

شرح صدر ظاہری اور اس کی شرح:

شرح صدر کا جو پہلو بیان ہوا وہ باطنی شرح صدر کہلاتا ہے جس کا اصل تحقق عالم غیب میں ہے، اور اصل وہی ہے، عالَم ظاہر یا عالَم محسوس اس کے مقابلہ میں فرع اور عکس ہے، اسی لئے مشہور ہے کہ جو کچھ عالم ارواح و عالم غیب میں ہے وہ اصل اور مصدر ہے، اور جو کچھ عالم اجسام و عالم ظاہر میں ہے، وہ اس کا مظہر و فرع ہے، لہٰذا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر باطنی و غیبی حاصل ہوا جو عبارت ہے اس کمال ختم نبوت سے جس تک کسی مخلوق کی رسائی اور اس کے عرفان کی پہنچ نہیں ہو سکتی، اسی طرح آپ کا شرح صدر ظاہری و حسی بھی ہوا۔ اسی ظاہری شرح صدر کو شق صدر کا معجزہ بھی کہا جاتا ہے، اور یہ ظاہری و حسی شرح صدر چار بار ہوا ہے۔

پہلی بار...... جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پرورش میں تھے، اس وقت جبرئیلؑ و میکائیلؑ نے آکر آپ ﷺ کا سینہ چاک کیا اور قلب مبارک نکالا، اس نے خون کی پھٹکی نکال کر پھینک دی اور دل کو دھو کر اس میں سکینہ بھر دی، اور قلب و صدر کی سلائی کر دی، اس شرح صدر سے مقصود یہ تھا کہ بچکانہ لہو و لعب کی عادت اور نازیبا حرکات کے میلان سے آپ کے قلب اطہر کو پاک کر دیا جائے، اور زمانۂ طفولیت ہی سے تمکین و وقار اور عمدہ و پاکیزہ جذبات سے اس کو مزین کر دیا جائے۔

دوسری بار...... جب آپ ﷺ کی عمر شریف دس برس کی تھی انہیں دونوں فرشتوں نے سینہ چاک کیا، اور قلب مقدس کو ایک سونے کے طشت میں آب قدس سے دھویا اور شکم مبارک کو بھی دھویا، اور کوئی نورانی چیز دل میں ڈال دی اور اوپر سے بھی چھڑک دی، فرشتوں نے کہا کہ کینہ و بدخواہی کے جذبات سے دل کو پاک کر کے اس میں ہم نے شفقت و مہربانی بھر دی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت سے میں اپنے قلب میں ہر چھوٹے بڑے پر شفقت و مہربانی پاتا ہوں، اس عمر شریف میں چونکہ آپ جوانی کے قریب تھے اس لئے اس شق صدر سے جوانی کے غلط رجحانات، جذبات شہوت و غضب وغیرہ سے قلب مبارک کو پاک رکھنا مقصود تھا۔

تیسری بار...... زمانۂ بعثت کے قریب جب آپ ﷺ غارِ حراء میں معتکف اور یکسوئی سے عبادت خداوندی میں مشغول تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی خدمت اقدس میں حاضر تھیں۔ اس وقت تیسری مرتبہ انھیں دونوں فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا، اور قلب مقدس کو سونے کے طشت میں آبِ زمزم سے دھویا اور سلائی کردی، نیز پشت پر مہر نبوت ثبت کردی۔ اس شرح صدر کا مقصود بارِ نبوت کے تحمل اور وحی الٰہی کے اٹھانے کی صلاحیت کو بیدار و مستعد کرنا تھا۔

چوتھی بار...... چوتھی مرتبہ شرح صدر شبِ معراج میں ہوا۔ اس واقعہ میں ایمان و حکمت سے دل کو پر کرنا بھی مذکور ہے، سفرِ معراج پر جانے سے قبل اس لئے شق صدر ہوا کہ آپ کو عالم ملکوت کی سیر اور عالم بالا کی تجلیات برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوجائے۔ یہ چار بار آپ کا شق صدر معنوی شرح صدر کا نمونہ ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ شق صدر صرف دو بار ہوا ہے، ایک بار بچپن میں دوسری بار شبِ معراج میں۔ واللہ اعلم۔

فائدہ...... اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ میں لفظ لَكَ سے یہ بتلانا ہے کہ مرتبۂ شرح صدر آپ کی خصوصیت ہے، اور شرح صدر میں آپ ہی کا نفع ہے، کہ اس سے آپ کو وہ اعلیٰ کمالات حاصل ہوئے جو آپ ﷺ ہی کے شایانِ شان تھے، دوسرے لفظ قَلْبَكَ کی بجائے لفظ صَدْرَكَ فرمایا، کیونکہ قلب (دل) صدر (سینہ) کے اندر ایک محفوظ مقام پر ہے، جب سینہ محفوظ و منور ہوگیا تو قلب بدرجۂ اولیٰ محفوظ و منور ہوگا، مثلاً اگر پورے شہر کی حفاظت ہوجائے تو گھر ضرور محفوظ ہوجائے گا، اور پورے شہر کو جگمگ کردینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ہر گوشہ پرنور ہوگیا۔ لاعکسہ۔ فافہم۔

دوسرا کمال:

وَوَضَعْنَا عَنكَ (اور ہم نے آپ کے اوپر سے آپ کے اس بوجھ کو اتار دیا جس نے آپ کی پیٹھ توڑ ڈالی تھی)

اس جملہ کا عطف جملۂ اَلَمْ نَشْرَحْ پر ہے، کیونکہ اس کا ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے جو فعل منفی پر داخل ہے، اور نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے، تو اَلَمْ نَشْرَحْ شَرَحْنَا کے معنی میں ہوا، لہٰذا معطوف علیہ و معطوف میں پوری مناسبت ہوگئی۔ اور خبر و انشاء کا فرق بھی نہ رہا، ان دونوں آیتوں (۲،۳) میں آپ کے دوسرے کمال کا ذکر فرمایا گیا ہے، اور وہ ہے وضع وزر، وزر کے لفظی معنی بوجھ کے ہیں، اور نقض ظہر کے لفظی معنی کمر توڑ دینے یعنی کمر جھکا دینے کے ہیں، جب انسان پر کوئی بڑا بوجھ لاد دیا جائے تو اس کی کمر جھک جاتی ہے، ان دونوں آیتوں میں اشارہ یہ ہے کہ وہ بوجھ جس نے آپ کی کمر جھکا دی تھی ہم نے اس کو آپ سے ہٹا دیا۔

وضعِ وزر کی تفسیر:

مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے اس کی مختلف تفسیریں کی ہیں (۱) وہ جائز و مباح کام ہیں جن کو بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحت سمجھ کر اختیار فرمالیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مصلحت و منشاء خداوندی کے موافق نہ تھا، یا وہ خلافِ اولیٰ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی علوِ شان اور تقربِ الٰہی میں خاص مقام حاصل ہونے کی بناء پر ایسی چیزوں پر بھی ایسا سخت رنج و ملال اور صدمہ ہوتا تھا جس طرح کسی گناہ کے سرزد ہونے پر کوئی مردِ مؤمن مغموم ہوسکتا ہے، حالانکہ یہ امور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ معصومیت کے خلاف بھی نہ تھے، مگر ''نزدیکاں رابیش بود حیرانی'' کے اصول سے ذات اقدس پر ان امور کا بار گراں تھا، لہٰذا اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت ہے کہ ایسے امور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤاخذہ نہ

ہوگا۔اس تفسیر کی بناء پر یہ بشارت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو بار ہوئی، اول مکہ میں اس سورت کے ذریعہ، دوسری بار سورۂ فتح میں صلح حدیبیہ سے واپسی پر لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ الآیۃ سے۔(بیان القرآن)

(۲) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ابتدائے نبوت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا اثر بھی سخت ہوتا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ساری دنیا میں کلمۂ حق پہنچانے، اسلام پھیلانے اور کفر و شرک مٹا کر خلق خدا کو توحید کی دعوت دینے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی، اور ذمہ داری پر فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ سے ایسی استقامت کا حکم تھا جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ اس کا بار عظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محسوس فرماتے تھے، اور بعض احادیث میں وارد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ڈاڑھی کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آیت فَاسْتَقِمْ نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے ان امور کی انجام دہی کے اسباب مہیا فرما کر اس ذمہ داری کے بار کو ہلکا کر دینے کی بشارت اس آیت میں دے دی، اور اسی کی وضاحت اگلی دو آیتوں میں اس طرح کر دی گئی کہ ہر مشکل کے بعد آسانی آنے والی ہے، نیز حق تعالیٰ نے شرح صدر کے ذریعہ آپ کا حوصلہ اتنا بلند فرما دیا کہ آپ کو سب مشکلات آسان نظر آنے لگیں۔ اور وہ بوجھ بوجھ نہ رہا، مکہ معظمہ میں ہجرت سے پہلے گو اسباب ظاہری کا فقدان تھا لیکن اس میں ان کے مہیا ہو جانے کی بشارت اور قوی وعدہ ہے، اور اس وعدہ کے یقینی ہونے کی وجہ سے محاورہ کے مطابق اس کو ماضی کے صیغہ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔

(۳) وِزر سے مراد تکلیفات شرعیہ (اوامر و نواہی) کی تبلیغ اور ان پر عمل ہے، کیونکہ تکالیف شرعیہ کی پابندی بڑی دشوار ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ الآیۃ (ہم نے امانت یعنی تکالیف شرعیہ آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیں تو انہوں نے ان کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ان سے ڈر گئے۔ اور انسان ظلوم وجہول نے ان کی ذمہ داری قبول کر لی) نماز کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (بیشک نماز بہت بھاری ہے مگر ان لوگوں پر آسان ہے جو اہل خشوع ہیں) ان آیات سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ کی پابندی بہت دشوار ہے، اللہ جل شانہٗ نے شرح صدر فرما کر آپ کا حوصلہ بلند فرما دیا۔ اور تکالیف شرعیہ آپ کے لئے محبوب و مرغوب اور فطری مقتضیات بن گئیں کہ ان کی ادائیگی میں دشواری کے بجائے لذت و حلاوت اور فرحت و راحت محسوس ہونے لگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرة عيني في الصلوة (میری آنکھ کی ٹھنڈک یعنی دل کا چین نماز میں ہے) اسی مرتبہ کو اللہ تعالیٰ نے وضع وزر (ازالۂ بار) سے تعبیر فرمایا۔ صوفیہ کے نزدیک ایمان حقیقی اور نسبت کاملہ سے اسی کیفیت کو تعبیر کرتے ہیں، کہ تکالیف شرعیہ مرغوبات طبعیہ اور طبیعت ثانیہ بن جائیں، صوفیہ کے اس قول کہ "تکالیف شرعیہ صوفیہ سے ساقط ہو جاتی ہیں" کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ تکالیف شرعیہ تکالیف نہیں رہتیں۔ بلکہ مرغوب و محبوب اور باعث راحت و سراپا حلاوت بن جاتی ہیں، شرح صدر کا یہ مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہراً و باطناً علی الاعلان بدرجۂ کمال حاصل ہوا تھا، مگر اولیاء امت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ اور آپ کی اتباع کی برکت سے باطنی طور پر اس رتبہ کی نسبت حاصل ہوتی ہے، اور یہ کیفیت اس وقت عطا ہوتی ہے جب صوفی مقام فناء پر پہنچ جائے۔ (مظہری)

جو مشت خاک تھا وہ بن گیا امین حیات　　بلند ہو گئی افلاک سے زمین حیات

(۴) بعض صوفیہ کا قول ہے کہ وہ نبوت اور اس کے لوازمات کا بوجھ تھا کیونکہ شرح صدر کے بعد تجلیات الٰہیہ اور آفتاب ذات حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح پر جلوہ گر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقام شہود میں خالق کے سوا

کوئی دکھائی نہ دیتا تھا، وجود مخلوق کالعدم ہو چکا تھا، افعال خلق اور خیر وشر کا تو ذکر ہی کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس کو کس چیز سے منع فرماتے اور کس کو کس چیز کا حکم دیتے۔

بسا میری نظروں میں تو خوبرو ہے   جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

اس عالم شہود سے مخلوق کی طرف توجہ اور اس اعلیٰ مقام سے نزول بڑا بھاری تھا، تو اس بوجھ کو اس طرح اتارا کہ مقام بقاء میں حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسی ثابت قدمی عطاء فرمادی، کہ کثرت وحدت کا حجاب نہ بن سکے، اور عین توجہ الی الخلق کے وقت تجلیات ربانی کا بھی مشاہدہ قائم رہے، اور کمال عروج، وقت نزول بھی بحال رہے، یہ کمال عروج وکمال نزول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے عطاء فرمایا تھا، یہی مرتبہ شرح صدر ہے، جو سبب بنا وضع وزر کا۔ (۵) بعض کہتے ہیں کہ وہ بوجھ ہیولانیت وامکان کا بوجھ تھا، جو عالم قدس سے لحوق میں مانع ہوتا ہے، حق تعالیٰ نے وجوب وتقدس کی تجلیات سے اس کو خفیف کردیا۔ اور باطناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم قدس کے مقربین میں داخل ہوگئے، بلکہ تقرب میں سب سے ارفع واعلیٰ ہوگئے۔ (۶) بعض نے کہا وزر کافروں کی شرارت اور ان کے ظلم وستم کا غم تھا، حق تعالیٰ نے اپنی تائید ونصرت سے اسلام کو غلبہ دیا۔ اس طرح وہ غم کا بوجھ آپ سے اتر گیا۔ (۷) بعض نے کہا کہ دین وشریعت کے احکام کے نہ پانے کا غم تھا، اللہ تعالیٰ نے احکام شرعیہ نازل فرما کر غم کے اس بوجھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کردیا۔ (۸) بعض نے کہا کہ وہ امت کا غم تھا، مقام شفاعت عطا فرما کر اس بوجھ کو آپ سے دور فرمادیا۔ (۹) بعض نے کہا کہ مکہ معظمہ سے نکلنے کے غم کا بوجھ تھا، مدینہ پہنچا کر اس بوجھ کو اتار دیا گیا۔ (۱۰) بعض نے کہا کہ اسی غم کا بوجھ مراد ہے جو سورۂ والضحیٰ کے سبب نزول میں گذرا۔ حق تعالیٰ نے سورۂ والضحیٰ اور سورۂ انشراح نازل فرما کر کفار کے بیہودہ اقوال کی تردید کردی، اور انقطاع وحی وفراق کو دور فرما کر سلسلہ وحی، مسلسل فرمادیا گیا۔ (۱۱) بعض لوگوں نے کہا کہ وزر سے مراد وہ لغزشیں اور خطائیں ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل النبوۃ سرزد ہوئیں۔ اس آیت میں ان کی معافی سے اس بوجھ کو اتار دینے کی اطلاع ہے، لیکن یہ قول بالکل غلط ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم وپاکیزہ ذات گرامی خطاؤں سے مبرّا وپاک ہے، اس کے علاوہ باقی مذکورہ اقسام میں مقام ومرتبہ شرح صدر ہی کے سمندر کے قطرات ہیں۔ واللہ اعلم

تیسرا کمال:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (اور ہم نے آپ کے لئے آپ کا ذکر بلند کیا) بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اس آیت کے معنی پوچھے تو انہوں نے کہا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ذکر کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی کیا جائے گا۔

جس دل میں ہے اللہ وہیں رہتے ہیں محمد بھی   اللہ جو کہتا ہے وہی کہتے ہیں محمد بھی

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت وحدیث کا تقاضا یہ ہے کہ مَلَاءِ اَعْلٰی (آسمانی فرشتے) جب اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ

دِیْنُہُ الْاِسْلَامُ وَمُحَمَّدٌ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ (ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا دین، اسلام ہے، محمد اس کے بندے اور رسول ہیں) جو اللہ پر ایمان رکھے گا، اللہ کے وعدہ کی تصدیق کرے گا اور اس کے پیغمبروں کا اتباع کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں (رفع ذکر سے مراد) اذان، اقامت، تشہد اور خطبہ منبر (میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر) ہے، اگر کوئی شخص اللہ کی عبادت اور اس کی تصدیق کرے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (رسالت کی) شہادت نہ دے تو یہ اس کے لئے بے سود ہے، وہ کافر ہی رہے گا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں

اَغَرُّ عَلَیْہِ بِالنُّبُوَّۃِ خَاتَمٌ ۔۔۔ مِنَ اللّٰہِ مَشْھُوْدٌ یَّلُوْحُ وَیُشْھَدُ

وَضَمَّ الْاِلٰہُ اسْمَ النَّبِیِّ بِاِسْمِہٖ ۔۔۔ اِذَا قَالَ فِی الْخَمْسِ الْمُؤَذِّنُ اَشْھَدُ

وَشَقَّ لَہٗ مِنِ اسْمِہٖ لِیُجِلَّہٗ ۔۔۔ فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَذَاکَ مُحَمَّدٌ

ترجمہ......۱- آپ ﷺ کی ذات گرامی وہ ہے کہ مہر نبوت اس پر چمک رہی ہے اللہ کی طرف سے یہ شہادت ہے جو چمکتی ہے اور دیکھی جاتی ہے۲- اور اللہ نے اپنے نام کے ساتھ نبی کا نام ملایا ہے، جبکہ اذان پنجگانہ میں مؤذن اشہد کہتا ہے۳- اور ان کی عزت افزائی کے لئے اپنے ہی نام میں سے ان کا نام نکالا ہے۔ پس مالک عرش تو محمود ہے اور وہ محمد ہیں۔ بعض علماء نے کہا کہ رفعت ذکر نبی یہ ہے کہ اللہ نے آپ ﷺ کے لئے (ازل میں) تمام انبیاء علیہم السلام سے میثاق لیا تھا اور آپ ﷺ پر ایمان لانے کو لازم کیا تھا۔ نیز آپ کی فضیلت کا اقرار کرایا تھا۔

رفعِ ذکر:

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کمالات عطا فرمائے جو مخلوق کے لئے ممکن ہو سکتے ہیں، انبیاء علیہم السلام اگر نجوم ہدایت ہیں تو آپ ﷺ آفتاب رسالت ہیں، نبوت و رسالت کا مبتداء و منتہا آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے، آپ ﷺ صفات ربانی کا مظہر اور ظل رحمانی ہیں، اس لئے جہاں حق تبارک وتعالیٰ کا ذکر ہوگا وہاں آپ ﷺ کا ذکر بھی ہوگا۔ کلمہ طیبہ میں اللہ کے ذکر کے ساتھ آپ ﷺ کا ذکر ہے، اذان وتکبیر و درود وتشہد اور خطبوں میں ذکر خداوندی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے، امر اطاعت میں و نہی معصیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ ﷺ مذکور ہیں۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ. وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ • عالم بالا کے فرشتے اللہ کے ذکر کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہیں، قبر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے کہ ربوبیت و دین کے ساتھ آپ ﷺ کے بارے میں بھی سوال ہوتا ہے، حشر میں آپ ﷺ کا ذکر ہوگا۔ خلقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے استفادہ کرے گی۔ تمام کتب آسمانی وصحف ربانی میں آپ ﷺ کا ذکر ہے، سب سے اول آپ ﷺ کا نور پیدا ہوا۔ خلق میں اول آپ ﷺ ہی لائق ذکر ہوئے، قلم کی زبان پر آپ ﷺ ہی کا اسم گرامی پہلے آیا۔ لوح محفوظ کی پیشانی، سر عرش بریں اور جنت کے کنگروں پر آپ ﷺ کا مبارک نام لکھا گیا۔ الغرض تمام ازمان واکوان میں ہر لحہ آپ ﷺ مذکور ہیں، کوئی لحہ ایسا نہیں گذرتا کہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ مؤذنوں کی زبانوں سے فضاؤں میں نہ گونجتا رہتا ہو۔ ہر جگہ ہر وقت اللہ کا نام ہے اور اس کے ساتھ اللہ کے

رسول کا نام بھی ہے، مگر تین مقام پر صرف اللہ کا نام ہے۔(۱) اذان کے اخیر میں لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہ ہے۔(۲) چھینکنے کے بعد الحمد للہ (۳) اور ذبح کے وقت بسم اللہ اکبر

رُوْحِی الْفِدَاءُ لِمَنْ اَخْلَا قُہٗ شَھِدَ ت بِـاَنَّـہٗ خَیْرُ مَـوْلُوْدٍ مِّنَ الْبَشَرِ

عَـمَّـتْ فَضَـائِلُـہٗ کُلَّ الْعِبَادِ کَمَا عَمَّ الْبَرِیَّۃَ ضَوْءُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ

ترجمہ......۱-میری جان ان پر قربان جن کے اخلاق مشاہد ہیں کہ وہ بنی نوع انسان میں سب سے افضل ہیں ۲-ان کے فضائل تمام بندوں پر عام ہیں جس طرح سورج اور چاند ساری دنیا میں چھائے ہوئے ہیں۔

فائدہ: ...... یہاں تین انعامات وکمالات کا ذکر ہوا ہے، (شرحِ صدر، وضعِ وزر، رفعِ ذکر) ان تینوں کو تین جملوں میں ذکر فرمایا ہے۔ اور سب میں فعل ومفعول کے درمیان حرف لَکَ یا عَـنْـکَ لایا گیا ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور خاص فضیلت وعظمت کی طرف اشارہ ہے، کما مر۔

فَـاِنَّ مَـعَ الْعُسْـرِ یُسْـرًا، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (پھر یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے) یعنی یہ کمالات وانعامات آپ کو مصیبتوں اور سختیوں پر صبر کرنے کی برکت سے عطا ہوئے ہیں، کیونکہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عادت یہ ہے کہ وہ ہر مشکل ومصیبت کے ساتھ ایسی سہولت وآسانی بھی عطا فرماتے ہیں جس سے وہ مصیبت آسان ہو جاتی ہے، اگر مصیبت کے گذر جانے کے بعد اس کو یاد کریں یا آنے سے پہلے اس کا تصور کریں تو اپنے اندر اس کے برداشت کرنے کی طاقت نہ پائیں گے۔ اس قسم کی آسانیاں آپ کو شرح صدر وفراخیٔ حوصلہ کے سبب حاصل ہوئیں کہ کمالات کے حاصل کرنے میں موانع پیش آنے کے باوجود تنگدلی، مایوسی یا تردد سے آپ محفوظ رہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ ایک اسم کو دوبارہ معرفہ لایا جاتا ہے تو اس سے عین اول مراد ہوتا ہے۔ خواہ پہلی بار وہ نکرہ آیا ہو یا معرفہ۔ اول کی مثال کَـمَـا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا. فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ اس آیت میں رَسُوْلًا اور الرَّسُوْلَ دونوں کا مصداق ایک (موسیٰ علیہ السلام) ہی ہے، ثانی کی مثال یہی آیات زیر بحث ہیں کہ ان میں اَلْعُسْر پہلی بار بھی معرفہ ہے اور دوسری بار بھی۔ اور اگر دوبارہ نکرہ لایا جائے تو دونوں کے مصداق الگ الگ ہوتے ہیں۔ اول بار خواہ وہ اسم معرفہ لایا گیا ہو یا نکرہ، اول کی مثال جاء نی الرجل وجاء نی رجل. اس میں ثانی رجل غیر اول ہے۔ ثانی کی مثال ان آیات زیر بحث میں لفظ یُسْرًا ہے کہ پہلی اور دوسری بار نکرہ ہی آیا ہے، تو ثانی یُسـر غیر اوّل ہوگا۔ حاصل یہ ہوا کہ ان دونوں آیتوں میں ایک عسر (دشواری) پر دو یسر (آسانیوں) کا وعدہ ہے، اور دو سے مراد بھی دو کا عدد نہیں۔ بلکہ متعدد ہونا مراد ہے، مطلب یہ ہوا کہ ایک تنگی اور مشکل جو آپ ﷺ کو پیش آئی یا آئے گی اس کے ساتھ آپ ﷺ کو بہت سی آسانیاں میسر ہوں گی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مرسلاً مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس آیت سے بشارت دیتے ہوئے فرمایا لَنْ یَّغْلِبَ عُسْرٌ یُّسْرَیْنِ یعنی ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی۔ چنانچہ تاریخ وسیرت کی سب کتابیں جو اپنوں نے اور غیروں نے لکھی ہیں اس پر شاہد ہیں کہ مشکل سے مشکل کام بلکہ لوگوں کی نظروں میں جو کام ناممکن نظر آتے تھے آپ ﷺ کے لئے وہ سب آسان ہوتے چلے گئے۔ مذکورہ روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں العسر کا الف لام عہد کے لئے ہے۔ اور مراد آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا عسر ہے، یعنی یہ وعدہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہی کے لئے ہے، جس کو حق تعالیٰ نے ایسا پورا فرمایا کہ دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب اگر دنیا میں کسی شخص کو عسر کے بعد یسر نصیب نہ ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ البتہ عادۃ اللہ اب بھی یہی جاری ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے، سچے دل سے اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھے، یکسو ہو کر اسی سے لو لگائے، اور اسی کے فضل کا امیدوار وطلب گار رہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں آسانی فرمادے گا۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس میں تمام مؤمنوں سے بھی وعدہ ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عسر کے بعد ایک یسر دنیا میں اور ایک یسر آخرت میں حاصل ہوگا۔ اور مومنوں کو عسر دنیوی کے بعد یسر اخروی ملے گا۔ لیکن اگر آیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اہل ایمان کے لیے عام رکھا جائے کہ ایک مشکل پر دو آسانیاں میسر ہوں گی۔ خواہ دنیا میں ہوں خواہ دنیا و آخرت دونوں میں ہوں تو اطلاق نظم قرآن کے زیادہ مناسب ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر دشواری کسی سوراخ کے اندر بھی ہوگی تو آسانی اس کی تلاش میں سوراخ کے اندر بھی جا گھسے گی۔ اور ایک دشواری دو آسانیوں پر کبھی غالب نہ ہوگی۔ اسی کو کسی شاعر نے کہا ہے

اذا اشتدت بک البلویٰ ففکر فی الم نشرح

فعسر بین یسرین اذا فکرتہ فافرح

ترجمہ..... جب تجھ پر مصیبت سخت ہو جائے تو الم نشرح میں غور کر، کہ اس میں ایک تنگی دو آسانیوں کے درمیان ہے، جب تو یہ بات سوچ لے تو خوش ہو جا۔

عسر و یسر سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ العُسر سے مراد ناداری اور وہ مصیبت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکوں کے ہاتھوں پہنچی تھی، اور آپ ﷺ نے اس کا شکوہ اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔ اور یسر سے مراد غناء اور اس مصیبت کا ازالہ ہے، بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ العسر کا مصداق سینہ کی تنگی، کمر توڑ بوجھ، قوم کی گمراہی اور ان کی ایذا رسانی ہے، اور اول یسر سے مراد شرح صدر، وضع وزر، قوم کا ہدایت کی توفیق پانا اور طاعت کرنا ہے، اور ثانی یسر سے سب کے نزدیک ثواب آخرت مراد ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ مع العسر کا مطلب بعد العسر ہے، لفظ بعد کے بجائے لفظ مع کا استعمال یہ بتانے کے لئے ہے کہ عسر کے بعد یسر کا حصول اتنا متصل و متیقن ہے کہ گویا دونوں ساتھ ہی ساتھ ہیں۔

صاحب مظہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک مقام نزول میں خالق کی طرف رخ ہونا مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ رنجیدہ نہ ہوں کہ تجلیات ربانی سے نزول کر کے توجہ الی الخلق موجب ملال ہوگی۔ اسی کے ساتھ یسر اور توجہ الی الخالق بھی ہے کہ آخرت میں آپ ﷺ کے اور خالق کے درمیان کوئی حجاب اور مانع نہ رہے گا۔ (مظہری)

لیکن یہ توجیہ تمام اس طرح ہو سکتی ہے کہ پہلے یسر سے مراد مقام بقاء میں استقامت ہے جس میں توجہ الی الخلق توجہ الی الحق سے مانع نہیں ہوتی۔ اور دوسرے یُسر سے اخروی بشارت مراد ہے، اس توجیہ پر آیتوں کی بشارت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ماننا پڑے گا۔ واللہ اعلم۔

تنبیہ...... بغوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پہلے العُسر میں الف لام عہدی اور دوسرے میں جنسی ہے، یعنی اول آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، اور دوسری آیت کا وعدہ عام ہے، جس میں دوسرے اہل ایمان بھی شریک ہیں، لیکن دوسری تفسیر کی بناء پر دونوں جگہ الف لام جنسی ہوگا۔ اور بشارت سب کو عام ہوگی، نیز یُسرًا پر دونوں جگہ تنوین تنکیر برائے تعظیم ہے یعنی مشقت و دشواری خواہ چھوٹی ہو یا بڑی اس کے مقابلہ میں بڑی سہولت و آسانی کا وعدہ ہے۔

ایک اور تفسیر:

مذکورہ تفاسیر میں اِنَّ مَعَ العُسْرِ یُسْرًا کو جملہ مستانفہ مانا گیا ہے، لیکن احتمال یہ بھی ہے کہ یہ ماقبل کی تاکید ہو۔ جیسے اِنَّ مَعَ الْفَارِسِ سَیْفًا اِنَّ مَعَ الْفَارِسِ سَیْفًا میں دونوں جگہ الفارس سے ایک ہی سوار اور دونوں جگہ، سیفا سے ایک ہی تلوار مراد ہے، لغوی اعتبار سے اگرچہ یہ (تاکیدی) احتمال بھی درست ہے، لیکن حدیث لَنْ یَّغْلِبَ عُسْرٌ یُسْرَیْنِ کی وجہ سے استیناف والی مذکورہ بالا تفسیری ہی راجح بلکہ متعین ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ (پھر جب آپ فارغ ہو جائیں تو محنت کیجئے، اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھئے) یعنی جب آپ ﷺ امور رسالت (تبلیغ، وعظ و پند وغیرہ) سے فارغ ہو جایا کریں تو اپنے رب کی عبادت کے لئے کھڑے ہو جایا کریں۔ اور اپنے رب سے پوری توجہ کے ساتھ لو لگائے رہئے۔ تاکہ مذکورہ انعامات اور موعودہ انعامات کا شکر ادا ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ جب ایک نوع کی عبادت (تبلیغ و فصل قضاء وغیرہ) سے فارغ ہو جائیں۔ تو دوسری نوع کی عبادت میں پوری توجہ سے محنت کیجئے۔ اس طرح آپ ﷺ کی حیات کا ہر لمحہ عبادت میں گذر جائے گا۔ کیونکہ جو لمحات زندگی بے کار گذر جائیں گے ان پر آخرت میں حسرت ہوگی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اہل جنت کو بس اس وقت کا افسوس ہوگا جو دنیا میں یاد خدا کے بغیر گذرا ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، قتادہ، ضحاک، مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ اجمعین نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوں تو دعاء میں محنت کریں، اور رب سے مانگنے کی طرف رغبت کریں (تشہد کے بعد سلام سے پہلے یا سلام پھیرنے کے بعد) شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تشہد سے فارغ ہو کر اپنی دنیا و آخرت کے لئے دعا کریں، حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس میں فرائض سے فارغ ہونے کے بعد تہجد میں مشغول ہونے کا حکم ہے، حسن و زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہم نے کہا: مطلب یہ ہے کہ جہاد سے فارغ ہو کر عبادت میں محنت کریں۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ اس میں جہاد اکبر سے مراد عبادت ہے، (مگر یہ قول درست نہیں کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور حکم جہاد مدنی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ امورِ دنیا سے فارغ ہو کر رب کی عبادت میں لگیں (یہ قول بھی درست نہیں ۱۲ ان) کلبی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ تبلیغ رسالت سے فارغ ہو کر اپنے لیے اور اہل ایمان کے لیے استغفار کریں۔ یہ تمام صورتیں انعامات کے شکریہ کی ہیں۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ دعوت خلق مرتبہ نزول ہے، جب اس سے فارغ ہوں تو صرف مشاہدۂ حق کی طرف متوجہ ہو جائیں جو مرتبۂ عروج ہے، اس توجیہ پر اِنْصَبْ بمعنی انتصب و ارتفع ہوگا۔ اور اس کا مضمون بھی ایک مستقل تسلی ہوگا جیسے فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ تھا۔ واللہ اعلم۔

فائدہ...... فَارْغَبْ...... ما اضمر عامله کے قبیل سے ہے ای فَارْغَبْ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ جس میں

تکرار و تاکید ہے، پہلی رغبت انعامات وصفات ربانی کی طرف اور دوسری رغبت حق تعالیٰ کی ذات مجردہ کی طرف جو تمام کیفیات واعتبارات سے مُنزّہ ہے۔

تعلیم وتبلیغ والوں کی خلوت وذکر کی ضرورت:

مذکورہ تفسیروں میں سب سے اچھی تفسیر یہ ہے کہ یہاں تبلیغ واصلاح کے کاموں سے فراغت پر نماز، ذکر، استغفار اور دعا میں مشغول ہونے کا حکم ہے، تبلیغ وتعلیم اور اصلاح خلق اگرچہ بہت بڑی عبادت ہے، مگر بواسطۂ خلق ہے، کیونکہ اس میں مخلوق اوران کی اصلاح ی مدابیر کی طرف توجہ ہوتی ہے جس سے کیفیت قلب میں کچھ نہ کچھ تغیر آجانا ضروری ہے، اس کے بعد ایسی عبادت کا جس میں خالق کے علاوہ کسی کی طرف توجہ نہ ہو حکم ہے، کیونکہ انسان کا اصلا مقصد حیات یہی ہے، توجہ الی الخلق ایک ضرورت کے لئے ہے، اور توجہ الی الحق مقصود حیات ہے، جب اس ضرورت سے فارغ ہوں تو مقصود کی طرف رجوع ضروری ہوجاتا ہے، اوراس سے مؤمن کو فراغت ممکن نہیں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ علماء جو تعلیم وتبلیغ اور اصلاح خلق کا کام کرتے ہیں اس سے ان کو غفلت نہ ہونی چاہیے کہ ان کا کچھ وقت خلوت، ذکر، توجہ الی اللہ اور استغفار ودعاء کے لئے مخصوص ہو جیسا کہ علمائے سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں، اس کے بغیر تعلیم وتبلیغ انوار وبرکات سے خالی اور غیر مؤثر ہوتی ہیں۔

فائدہ نمبر۱...... فَانْصَبْ کے لفظ سے یہ معلوم ہوا کہ عبادت وذکر کو اتنی مقدار میں کیا جائے کہ تھکن اور مشقت محسوس ہونے لگے۔ صرف نفس کی راحت وخوشی پر اس کا مدار نہ رہے، اور معمولات کی پابندی خواہ وہ مختصر ہی کیوں نہ ہوں بجائے خود تعب ومشقت کا باعث ہے۔

فائدہ نمبر۲...... سورۂ انشراح کے خواص میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ جو شخص اس سورت کو سوتے وقت سترہ بار پڑھ کر اپنے سینہ پر دم کرلیا کرے تو اس کی خطرات ووساوس شیطانی سے حفاظت رہتی ہے اور بھول چوک کی عادت جاتی رہتی ہے، ہر نماز کے بعد سات بار سینہ پر دم کرنا بھی یہی تاثیر رکھتا ہے۔

تم تفسیر سورة الانشراح بفضل العزیز الوهاب الذی انزل علیٰ عبده الکتاب تبصرة لاولی الالباب وصلی الله علی رسوله المبعوث من اکرم الشعوب واشرف الشعاب وعلیٰ اله وصحبه الانجاب وسلم علیهم دائما الی یوم المآب

سُوْرَۃُ التِّیْنِ

سُوْرَۃُ التِّیْنِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانُ ایَاتٍ

(رکوع:۱،آیات:۸) سورۂ تین مکہ میں نازل ہوئی اوراس میں آٹھ آیات ہیں۔ (کلمات:۳۴،حروف:۱۰۵)

ربط ومناسبت

اس سورت کا نام سورۃ التین ہونا ظاہر ہے کہ اس کے شروع میں التین کا ذکر ہے،اس سورت میں مبداء اور معاد کے مضامین بیان فرمائے گئے ہیں۔اورآغاز چارقسموں سے ہوا ہے،دو درختوں (تین وزیتون) کی،ایک پہاڑ (طور) اور ایک شہر(مکہ) کی،اور یہ چاروں چیزیں کثیر البرکۃ اور کثیر المنافع ہیں،جہاں مذکورہ دونوں درخت پیدا ہوتے ہیں وہ جگہ، انبیاء علیہم السلام کا معدن ہے،ابراہیم علیہ السلام جو پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ ولم کے جد امجد ہیں اسی ملک میں مقیم رہے،اسی طرح ان قسموں میں وہ تمام مقامات مقدسہ آگئے ہیں،جہاں مخصوص انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے،طور حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کے حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا مقام ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد وہ پہاڑ ہے جہاں انجیر اور زیتون کے درخت بکثرت ہیں،مکہ مکرمہ خاتم الانبیاء علیہ السلام کا مولد ومسکن ہے۔اس تقریر سے سابقہ سورت کے ساتھ اس سورت کا ربط عیاں ہوجاتا ہے،کہ سورۂ انشراح میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس کا بیان تھا،اس میں آپ کے ساتھ مجملا دوسرے اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے،وہاں بھی آپ ﷺ کی رفعت کا بیان تھا،یہاں بھی آپ ﷺ کی رفعت کا بیان اس طرح ہے کہ آپ ﷺ اس اشرف المخلوقات کے سرتاج ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ خوبصورت بنایا ہے، آپ ﷺ اس شہر میں پیدا ہوئے،اور حیات ظاہری کا بیشتر حصہ اس میں گذرا جو اشرف البلاد اور اصل البلاد (ام القریٰ) ہے،نیز پہلی صورت میں آپ ﷺ کو بشارت وخوشخبری دی گئی تھی،اس میں ان مؤمنوں کو بشارت ہے جو آپ ﷺ کی پیروی کرکے ایمان وعمل صالح سے مزین ہوجائیں،مزید فکر سے بہت سی لطیف مناسبات معلوم ہوں گی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ (۱) وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ (۲) وَھٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ (۳) لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ

قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔ اور طور سینا کی اور اس امن والے شہر کی۔ بیشک ہم نے انسان کو

	اَلتِّیۡنِ	وَ	اَلزَّیۡتُوۡنِ	وَ	طُوۡرِ	سِیۡنِیۡنَ	وَ	ھٰذَا	اَلۡبَلَدِ	اَلۡاَمِیۡنِ	لَقَدۡ	خَلَقۡنَا	اَلۡاِنۡسَانَ	فِیۡ
قسم	انجیر	اور	زیتون	اور	طور	سینین	اور	اس	شہر	امن والا	البتہ تحقیق	پیدا کیا ہم	آدمی	میں

اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ (۴) ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سَافِلِیۡنَ (۵) اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمۡ

بہت خوبصورت سانچہ میں ڈھالا ہے پھر ہم نے اس کو پستی والوں سے بھی زیادہ پست کردیا۔مگر جولوگ ایمان لائے اورانہوں نے اچھے کام کئے

اَحۡسَنِ	تَقۡوِیۡمٍ	ثُمَّ	رَدَدۡنٰہُ	اَسۡفَلَ	سَافِلِیۡنَ	اِلَّا	اَلَّذِیۡنَ	اٰمَنُوۡا	وَ	عَمِلُوا	اَلصّٰلِحٰتِ	فَلَھُمۡ
اچھی	ترکیب	پھر	پھیر دیا ہم اس	نیچے	سب نیچوں	مگر	جولوگ	ایمان لائے	اور	عمل کئے	اچھے	پس واسطے ان

اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (٦) فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ (٧) اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (٨)

تو ان کو نہ ختم ہونے والا ثواب ملے گا۔ تو اے انسان پھر کیا چیز تجھ کو بدلہ کا منکر بنا رہی ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ سارے حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟

اَجْرٌ	غَيْرُ	مَمْنُوْن	فَمَا	يُكَذِّبُكَ	بَعْدُ	بِالدِّيْنِ	اَلَيْسَ	اللّٰهُ	بِاَحْكَمِ	الْحٰكِمِيْنَ
ثواب	نہ	کاٹا گیا	پس کیا چیز	جھٹلاتی ہے تجھ	پیچھے	میں جزا	کیا نہیں	اللہ	خوب حکم کرنیوا	سب حکم کرنیوالوں

لغات:

اَلتِّيْنِ انجیر جو ایک عمدہ اور کثیر النفع میوہ ہے، اَلزَّيْتُوْنِ ایک مشہور درخت کا نام ہے، اس کے پھل کو بھی زیتون کہتے ہیں، اور اس کے تیل کو زیت کہتے ہیں، نیز زیت کا اطلاق مطلقاً تیل پر بھی آتا ہے۔ خواہ وہ کسی بھی چیز کا ہو۔ طُوْرِ سِيْنِيْنَ اور طُوْرِ سِيْنَاء ایک مخصوص پہاڑ یا جگہ کا نام ہے۔ **والطور فی کلام العرب الجبل وقال بعض اهل اللغة لایسمی طورا حتی یکون ذا شجر ولا یقال للاجرد طور** (معجم البلدان ص ۶۷ ج ۲) یعنی ہرے بھرے پہاڑ کو طور کہتے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سریانی زبان میں طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ (بخاری کتاب التفسیر) ابن ابی حاتم وضحاک رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ طور بمعنی پہاڑ نبطی زبان کا لفظ ہے، معلوم ہوا کہ طور عربی، سریانی اور نبطی تینوں زبانوں میں یکساں طور پر پہاڑ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن اہل عرب سرسبز پہاڑ ہی کو طور کہتے ہیں۔ **قال ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما: طور ما انبت من الجبال ومالم ینبت فلیس بطور. وفی البحر انه لم یختلف فی انه جبل بالشام وتعقبه الشهاب بانه خلاف المشهور فان المعروف الیوم بطور سیناء ما هو بقرب التیه بین مصر وعقبة.**

علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سِيْنَاء جمہور کے نزدیک نبطی یا حبشی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی اچھے یا مبارک کے ہیں، اور اس کو عربی میں سناء بالمد بمعنی رفعت یا سنا بالقصر بمعنی نور سے ماخوذ مانتے ہیں۔
اَلْبَلَدُ الْاَمِيْنِ مکہ مکرمہ۔ کیونکہ وہ مامون ہے مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ اور اپنے باشندوں کا امانت دار ومحافظ بھی ہے، اس لئے اس شہر کو بلد امین کہا جاتا ہے، تقویم مصدر تفعیل ہے بمعنی درست کرنا۔ ٹھیک کرنا، مجرد میں (ن) سے کھڑا ہونا۔ رَدَدْنَا (ن) واپس کرنا، لوٹا دینا، اَسْفَلَ ضد اعلیٰ۔ سب سے نیچا۔ (ن۔س۔ك) پست ہونا۔ حقیر ہونا۔

ترکیب:

وَالتِّيْنِ سے اَلْبَلَدِ الْاَمِيْنِ تک چار قسمیں ہیں، لَقَدْ سے تَقْوِيْمٍ تک جملہ فعلیہ جواب قسم ہے ثُمَّ رَدَدْنٰهُ فعل بافاعل ومفعول بہ اَسْفَلَ منصوب بنزع الخافض ای فِیْ اَسْفَلَ متعلق یا مکان محذوف کی صفت ہو کر رَدَدْنَا کا مفعول ثانی یا مفعول اول سے حال ہوگا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ پورا جملہ رَدَدْنٰهُ کے مفعول سے استثنائے متصل ہے اگر اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ سے طبقۂ نار وغیرہ مراد ہو۔ اور اگر ارذل عمر مراد ہو تو استثنائے منقطع ہوگا۔ **او لیس المقصود اخراج المؤمنین من الحکم بارذل العمر وان کان المستثنی من جنس المستثنی منه ۔ فافهم۔** فَلَهُمْ خبر مقدم اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ مرکب توصیفی مبتدائے مؤخر، جملہ اسمیہ خبر ہوا موصول کی۔ اور فاء اس میں جزائیہ ہے، کیونکہ اسم

موصول مبتدا متضمن لمعنی الشرط ہے و دخولہ ھنا دون فی سورۃ الانشقاق للاشارۃ بان دخولہ وعدمہ جائزان ۔ ف تفریعیہ ما استفہامیہ بمعنی ای شئ یا بمعنی مَنْ مبتدا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ جملہ فعلیہ خبر، اور اس میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے یا انسان مکذب کو ۔ برائے استفہام انکاری ۔ لَیْسَ فعل ناقص اپنے اسم اللّٰہُ اور خبر بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ سے مل کر جملہ فعلیہ ۔

تفسیر:

حق تعالیٰ نے اس سورت کی ابتداء چار عظیم البرکۃ وکثیر النفع چیزوں کی قسموں سے فرمائی ہے ۔ پھر خلقت انسانی کا کمال بیان فرما کر سعادت وشقاوت کے اعتبار سے اس کا انجام و مآل بیان فرمایا ہے ۔

چار مخصوص چیزوں کی قسمیں:

اس سورت میں شروع کی تین آیات میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، جن میں سے دو درخت ہیں تین اور زیتون، ایک پہاڑ ہے (کوہ طور) اور ایک شہر ہے، یعنی مکہ مکرمہ ۔ ان چار چیزوں کی وجہ تخصیص یہ ہوسکتی ہے کہ یہ دونوں درخت کثیر النفع اور کثیر البرکۃ ہیں جس طرح کوہ طور و مکہ مکرمہ کثیر البرکۃ ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تین و زیتون کے ذکر سے وہ جگہ مراد ہو جہاں یہ درخت بکثرت پیدا ہوتے ہیں ۔ اور وہ ملک شام ہے جو معدن و مرکز انبیاء علیہم السلام ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے وطن سے ہجرت فرما کر وہیں مقیم ہوئے، اور ملک شام اکثر انبیاء علیہم السلام کا وطن و مسکن رہا ہے، کوہ طور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا مقام ہے، اور سینین یا سینا اس مقام کا نام ہے جہاں پر کوہ طور واقع ہے، بلد امین مکہ مکرمہ ہے، اس طرح ان قسموں میں وہ سب مقامات مقدسہ آگئے جہاں خاص خاص بلکہ اکثر انبیاء علیہم السلام پیدا اور مبعوث ہوئے ۔

دوسرے یہ چاروں چیزیں اہل کمال کے ساتھ کثیر المنافع وکثیر البرکۃ ہونے میں انتہائی مناسبت بھی رکھتی ہیں، تیسرے یہ اشیاء قدرت خداوندی اور بعثت انبیاء پر دلائل بھی ہیں، جس خالق اکبر نے اپنی قدرت سے یہ اشیاء پیدا کیں جن میں بے شمار منافع و برکات ہیں اسی ذات برحق وقادر مطلق نے اپنے بندوں کی نفع رسانی اور برکات جسمانی و روحانی کے لئے انبیاء ورسل علیہم السلام مبعوث فرمائے ۔ چوتھے بعض مفسرین نے فرمایا کہ ان قسموں میں جن مقامات کا ذکر ہوا ہے ان مکانات سے مراد ان کے مکین ہیں ۔ یعنی اس پہاڑ سے جس کو انجیر اور زیتون کے درختوں نے چھپا رکھا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں ۔ کیونکہ اسی مقام پر وہ پیدا ہوئے تھے ۔ اور کوہِ طور سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں ۔ کیونکہ وہ اس جگہ رب تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے تھے ۔ اور بلد امین سے مراد رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پیدا ہوئے ۔ اور حیاتِ ظاہری کا اکثر حصہ وہیں گذرا ۔ اور یہ ہستیاں تقویم کے نمونے ہیں ۔ یا یہ کہیے کہ اس دعویٰ پر کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ۔ یہ دلائل اور ثبوتِ دعویٰ کے لئے گواہ ہیں ۔

انجیر کے منافع اور خصوصیات:

انجیر میں بہت سی خصوصیات ہیں ۔ کچھ ظاہری ہیں اور کچھ باطنی، چند ظاہری خصوصیات یہ ہیں کہ وہ غذا بھی ہے

اور ایک عمدہ میوہ بھی۔ بہت لطیف اور ہلکا پھلکا ہے، سریع الہضم ہے، طبیعت کو نرم کرتا ہے۔ فاسد مواد کو پسینہ کے ذریعہ بدن سے خارج کرتا ہے۔ اس لئے باوجود گرم ہونے کے بخار میں بھی مفید ہے۔ بلغم کو تحلیل کرتا ہے۔ گردہ اور مثانہ سے سنگریزوں کو صاف کر دیتا ہے بدن کو موٹا کرتا ہے۔ مسامات کھول دیتا ہے، جگر اور تلی کے سُدے کھولنے میں بے نظیر ہے۔ بواسیر کا قاطع ہے۔ درد نقرس کو نافع ہے۔ حضرت علی موسیٰ رضا رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ہمیشہ انجیر کھانا گندہ دہنی کو دفع کرتا ہے۔ سر کے بالوں کو بڑھاتا ہے۔ فالج سے امن دیتا ہے۔ اس کے عجائبات میں سے یہ بات ہے کہ اس میں نہ چھلکا ہے نہ گٹھلی۔ نہ کوئی اور پھینکنے کی چیز ہے۔ پورے کا پورا کھانے میں آتا ہے۔ قرآن مقدس کی طرح بالکل مغز ہی مغز ہے۔ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک طباق بھرا ہوا انجیروں کا ہدیہ پیش کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تناول فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو بھی ارشاد فرمایا کہ اس میوہ کو کھاؤ اس میں گٹھلی نہیں ہے۔ یہ جنت کے پھلوں کے مثل ہے۔ یہ پھل بواسیر کے مادہ کو دفع کرتا ہے۔ اور درد نقرس میں مفید ہے۔ اسمیں ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ ایک لقمہ کی برابر ہوتا ہے۔ نہ چھوٹا نہ بڑا۔ تا کہ کھانے والے کو کسی قسم کی زحمت ومشقت نہ ہو۔

انجیر کی باطنی خصوصیات:

اس پھل میں ظاہری خوبیوں کے علاوہ بہت سی باطنی خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ بچند وجوہ اہل کمال کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے (۱) اہل اللہ کی طرح اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے۔ کیونکہ گٹھلی چھلکا اور فضلہ اس میں نہیں ہوتا۔ اور دوسرے پھلوں میں ظاہر و باطن کا فرق ہوتا ہے۔ (۲) اس کا درخت بھی عجیب ہوتا ہے کہ دعوے سے پہلے اس کا کمال ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے پھلتا ہے پھر پھولتا ہے۔ اور دوسرے درختوں پر پہلے پھول آتے ہیں بعد میں پھل آتے ہیں۔ گویا اس درخت میں اہل کمال کی طرح صفت ایثار بھی ہے۔ کہ وہ پہلے دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے، اپنی آراستگی ونفع اندوزی بعد میں کرتا ہے۔ اور دوسرے درخت معاملہ داری کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اول اپنا بھلا کر لیتے ہیں پھر دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اول خویش بعد ازاں درویش (۳) اس کا فیض اور پھلدار درختوں سے زائد ہے۔ کیونکہ یہ ایک سال میں کئی بار پھلتا ہے اور دوسرے درخت عموماً ایک بار پھلتے ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کو درختوں کی بہ نسبت انسان سے اس لئے بھی زیادہ مناسبت ہے کہ جنت میں جب حضرت آدم علیہ السلام کا لباس چھن گیا تھا تو انہوں نے انجیر کے پتوں ہی سے اپنا بدن چھپایا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو انسان کی جامعیت واحسنیت پر دلیل بنایا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ (۴) اس میں کانٹا بھی نہیں ہوتا۔ نہ وہ زیادہ بلند ہوتا ہے۔ گویا سہل الحصول ہے۔ اور اس سے ایذاء کا اندیشہ بھی نہیں۔ اہل اللہ کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ بداخلاق نہیں ہوتے۔ اور طالبوں کے قریب ہوتے ہیں۔ تا کہ افاضہ واستفاضہ بسہولت ہو سکے۔

سوال...... بعض کسان کہتے ہیں کہ کامل درخت وہ ہے جس میں ۱۰ چیزیں موجود ہوں۔ جڑ، ڈالیاں، پتے پھول، پھل، گٹھلی، گوند، چھال، چھلکا، اور شیرہ۔ مثلاً کھجور کا درخت ان دس چیزوں کو جامع ہے۔ اور جس میں یہ دس چیزیں نہ ہوں وہ ناقص ہے۔ اور انجیر میں گٹھلی چھلکا اور کانٹے وغیرہ نہیں ہوتے تو یہ ناقص ہوا۔ **جواب**...... یہ نقص بھی اس کا کمال ہے۔ کیونکہ اس میں فضول اور تکلیف دہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ جیسے انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ مگر کامل واکمل وہی انسان ہے جس میں خیر ہو اور شر سے وہ محفوظ و معصوم ہو۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام، اس پہلو سے بھی یہ پھل کاملین کے مشابہ ہوا۔

زیتون کے فوائد و برکات:

زیتون کے ظاہری و باطنی فوائد و منافع بھی انجیر کی طرح بہت ہیں۔ بلکہ جو فوائد انجیر میں ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ اور ان کے علاوہ بھی بہت سے فائدے ہیں۔ گویا زیتون انجیر سے بھی زائد جامع اور خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کے چند فوائد یہ ہیں (۱) اس کے پھل کو سرکہ میں اچار بنا کر استعمال کرنا تقویت معدہ کے لئے بے نظیر ہے اور بھوک بڑھاتا ہے۔ (۲) زیتون کا پختہ پھل سیر ہو کر کھا سکتے ہیں۔ (۳) وہ بدن کو موٹا کرتا ہے (۴) قوتِ باہ کے لئے اکثیر ہے۔ (۵) مغز تخم زیتون چربی اور آٹے میں ملا کر بدن پر ملیں تو یہ کوڑھ کا تیر بہدف علاج ہے۔ (۶) اگر شیرۂ زیتون کا عورت فرزجہ لیوے تو سیلان الرحم کے لئے بہت مجرب ہے۔ (۷) نمک پانی میں زیتون کا پھل ڈالکر کلی کریں تو دانتوں کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ (۸) زیتون کے فوائد انجیر کے بہ نسبت بہت پائیدار ہیں۔ (۹) یہ غذا بھی ہے اور دوا بھی اور عمدہ میوہ بھی (۱۰) اس کے کچے پھلوں کا تیل زیت الانفاق کہلاتا ہے۔ چراغ وغیرہ میں جلانے کے کام آتا ہے، روشنی اس کی بہت صاف شفاف ہوتی ہے۔ (۱۱) پکے زیتون کا تیل زیت الطیب کہلاتا ہے جو نہایت خوشبودار فائدوں میں بے نظیر ہوتا ہے۔ زیت الطیب دفع قولنج کے لئے، سدوں کے لئے، اسہال کے لئے ارنڈی کے تیل کے مثل ہے۔ اور مالش کرنے اور لیپ کرنے میں روغن گل کی مانند ہے۔ اور شیری، جمرہ، قوبا، صداع، بالوں کی سیاہی، دردِ نقرس، وجع مفاصل، سبل اور پلکوں کی رطوبت غلیظ کے لئے بہت مفید ہے، بچھو کے کاٹے پر لگانا بھی بہت مفید ہے۔ (۱۲) اس کا پھل کھانے، تیل لگانے اور جلانے وغیرہ کے کام آتا ہے۔ (۱۳) اس کی لکڑی جلانے کے کام آتی ہے۔ اور اس کی راکھ صابن کا کام دیتی ہے۔

زیتون کی باطنی خصوصیات:

(۱) اس کے تیل میں چمک ہوتی ہے۔ اور اس کو جب جلاتے ہیں تو اعلیٰ درجہ کی روشنی پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی روشنی دھوئیں سے پاک ہوتی ہے۔ اہل کمال کی نورانیت بھی سیاہی اور کدورتوں سے پاک ہوتی ہے۔ (۲) اس کو علماء کے فکر واستدلال سے بھی کمال مناسبت ہے کہ معلومات کے احوال میں فکر کی قوت سے ایسی روشنی پیدا ہوتی ہے کہ مجہولات کے حقائق روشن ہو جاتے ہیں (۳) اس کو قرآنی الفاظ سے بھی نہایت مناسبت ہے کہ اس کے معانی کو اگر لفظوں کی آمیزش سے جدا کر دیں تو حقائق وانوارِ الٰہیہ کی صاف شفاف روشنی نمایاں ہو جاتی ہے (۴) اس درخت کی عمر تمام درختوں سے زائد ہوتی ہے چنانچہ یونانیوں کے لگائے ہوئے درخت آج تک ملک شام میں موجود ہیں۔ جن پر تقریباً ڈھائی ہزار سال گزر چکے ہیں۔ ایسے ہی اہل کمال کے اعمال کے کمال کے درخت دنیا میں مدتوں پھلتے پھولتے رہتے ہیں (۵) معدنِ انبیاء ومصدرِ اولیاء اس درخت کا وطن ہے۔ اہل وطن کو اپنے اہل وطن سے خاص مناسبت ہوتی ہے۔ (۶) ابراہیم علیہ السلام اور دیگر ۷۰ انبیاء علیہم السلام نے اس کے لئے برکت کی دُعاء فرمائی ہے۔ جس طرح وہ دوسرے اہل اللہ مومنین ومومنات کے لئے دعا کرتے ہیں۔ (۷) قرآن پاک میں اس کو شجرۂ مبارکہ فرمایا گیا ہے شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ اس کے تیل کی روشنی سے نورِ خداوندی کو تشبیہ دی گئی ہے (۹) اس کو خواب میں دیکھنے کی تعبیر ہدایت کاملہ اور عروۃ الوثقیٰ کا نصیب ہونا ہے۔ (۱۰) ایک مریض نے ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے اپنا خواب بیان کیا کہ مجھے خواب میں یہ بتایا گیا ہے کہ تیرا علاج دو لا کے

درمیان ہے۔ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جاؤ زیتون تمہارے لئے دوا ہے۔کیونکہ باری تعالیٰ نے اسی کے ذکر میں لَاشَرْقِیَّۃٍ وَّلَاغَرْبِیَّۃٍ فرمایا ہے۔حدیث شریف میں وارد ہے کلوا من الزیت وادھنوا بہ فانہ من شجرۃٍ مبارکۃٍ (زیتون کا تیل کھاؤ اور اس کی مالش کرو کیونکہ وہ برکت والے درخت کا تیل ہے) حاصل یہ ہے کہ زیتون کو اہل کمال سے انجیر سے بھی زائد مناسبت ہے۔

وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ اوپر معلوم ہو چکا کہ طور سرسبز اور ہرے بھرے پہاڑ کو کہتے ہیں۔ظاہر بات ہے کہ بے آب وگیاہ خشک پہاڑ کی بہ نسبت وہ پہاڑ کامل ہے جو درختوں سے ڈھکا ہوا ہو۔پھر ان درختوں میں بہت سے کارآمد اور پھلدار ہوتے ہیں۔بہت سے دواؤں،غذاؤں وغیرہ کے کام آتے ہیں۔ہزاروں قسم کی جڑی بوٹیاں ان میں ہوتی ہیں۔بہت سے حیوانات شکاری وغیر شکاری ہوتے ہیں۔اوران تمام اشیاء میں انسان کے لئے بیشمار منافع وفوائد ہیں۔پھر ہرے بھرے پہاڑوں میں بھی وہ پہاڑ سب سے زیادہ کامل ونافع اور عظیم البرکۃ ہے جو تجلی گاہِ ربانی ہو۔اور پیغمبر خدا نے بھی عبادت وریاضت اور انوارِ نبوی سے اسکو مالا مال کیا ہو۔وہ اکمل ترین پہاڑ جسمیں ظاہری منافع وفوائد کے ساتھ ساتھ باطنی برکات وتجلیات بھی حاصل ہیں وہ کوہِ طور ہے جس کو طُوْرِ سِیْنِیْنَ اور طورِ سینا کہتے ہیں۔

اور بعض مفسرین نے وَالتِّیْنِ سے اصحابِ کہف کی مسجد مراد لی ہے۔اور زَیْتُوْن سے کوہِ زیتا مراد لیا ہے۔جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد ہے اور بیت المقدس سے جانبِ مشرق میں واقع ہے۔جب ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیت المقدس تشریف لے گئیں تو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھ کر کوہِ زیتا پر تشریف فرما ہوئیں۔اور ارشاد فرمایا کہ اسی مقام سے قیامت کے دن لوگ دوگروہ ہو جائیں گے۔ایک گروہ جنت میں دوسرا گروہ دوزخ میں چلا جائیگا،اس مقام کی نصاریٰ بہت تعظیم کرتے چلے آئے ہیں۔اور اس کو مصعدِ عیسیٰ علیہ السلام بھی کہتے ہیں جہاں ایک فرنگی عورت ہیلانہ نے ایک قبہ تعمیر کرایا تھا۔جو مدتوں نصاریٰ کا گرجا رہا ہے۔ظاہر ہے کہ مسجدِ اصحاب کہف انوارِ ولایت سے تاباں ہے۔تو کوہِ زیتا انوارِ نبوت سے پُر نور وباعظمت ہے۔

وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ۔امین کے معنی امانتدار کے ہیں۔شہر مکہ اپنے باشندوں کا امانتدار محافظ بھی ہے۔اور امین کے معنی مامون ومحفوظ کے بھی ہیں۔چنانچہ یہ صفت بھی اس میں ظاہر اور منصوص ہے وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔اس اعتبار سے شہر مکہ سب شہروں کی بہ نسبت عظیم البرکۃ وکثیر النفع اور جامع ترین شہر ہے۔وہاں وہ سب کچھ ہے جو اور شہروں میں ہوتا ہے انسان،تعمیرات،حیوانات،وغیرہ۔اوران سے زائد اس میں وہ صفت ہے جو لفظ امین نے بیان کی۔اس کے علاوہ وہ نبی آخر الزمان کا مولد ومسکن،وطن اور مہبطِ وحی،ہے اور کعبہ وقبلہ (بیت اللہ) کو اپنے اندر رکھتا ہے۔اور اس سرزمین پر ہمہ وقت تجلیات ربانی کا نزول ہوتا ہے۔یہاں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ گنا بڑھ جاتا ہے۔ **حسنات الحرم کل حسنۃ بمائۃ الف حسنۃ.** نیز حدیث میں ہے: **من مات بمکۃ بعثہ اللہ تعالیٰ فی الآمنین یوم القیٰمۃ** اور **من مات بمکۃ فکانما مات فی السَّمآء الدُّنیا.**

تنبیہ......ان مذکورہ اشیاء کے متعلق مزید تفصیلات وتحقیقات تفسیر عزیزی پ ۳۰ لغات القرآن از ۹۹ ص تا ۱۰۶ ص و ص ۲۶۰ تا ۲۶۲ علاوہ ازیں حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن وتفسیر حقانی وغیرہ میں ملاحظ فرمائی جائیں۔اس مختصر میں ان سب کی گنجائش نہیں۔

انسان جامع ترین مخلوق ہے:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ (بیشک ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے) یہ مذکورہ قسموں کا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو جبلت وفطرت، شکل وہیئت ہر اعتبار سے تمام مخلوق سے بہتر پیدا فرمایا ہے۔ اس سے بہتر، حسین، کامل اور جامع دوسری کوئی مخلوق نہیں۔ انسان میں عالم روح کے نازک حقائق، عالم خلق کے عناصر، اور عالمِ عناصر کی پیداوار، نفسِ ناطقہ جیسی اشیاء موجود ہیں۔ اس میں ملکی صفات، درندوں کے اوصاف، چوپاؤں کی کیفیات اور شیطانی خبائث بھی پائے جاتے ہیں۔ اس میں حیات، ارادہ، قدرت، سماع، بصر، کلام، محبت وغیرہ جیسی صفاتِ کمالیہ، صفتِ الوہیت کا پرتو ہیں۔ یہ نورِ عقل وبصیرت قلبی اور حواسِ ظاہری وباطنی سے آراستہ ہے۔ جو کمالات کے ابواب ہیں۔ اسی لئے اس کو خلعتِ خلافت سے نوازا گیا۔ اِنِّيۡ جَاعِلٌ فِي الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ۔ درحقیقت ذاتِ انسان آئینہ ذات وصفاتِ ربانی ہے۔ اسکی ظاہری ساخت اور مزین صورت ہی کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہ قادر مطلق کی کاریگری کا ایک عجیب تماشہ ہے۔ یہ چھوٹے سے جسم وجُثہ والا انسان عالم اصغر ہے۔ جسمیں عالم اکبر (ارض وسماء) کے تمام نظارے اور نظائر موجود ہیں۔ اس کی پیشانی پر آفتاب ومہتاب جلوہ گر ہیں۔ تو اس میں حواسِ ظاہری وباطنی کے روشن ستارے بھی موجود ہیں۔ انہار واشجار اور گلزار بھی موجود ہیں۔ زمین وآسمان، پہاڑ وغیرہ کے نمونے اور جملہ معدنیات کی مثالیں بھی اس میں موجود ہیں۔ عالم لاہوت، عالم ملکوت، عالم جبروت وغیرہ جملہ عوالم کے پرتو اسکی ذات میں جلوہ گر ہیں۔ عالمِ شہوات، عالم غضب، عالم وہم اور عالم خیال۔ سفلی عالموں کے نمونے بھی اس کی ذات میں پائے جاتے ہیں۔ الغرض مخلوقات میں جامع ترین مخلوق حضرت انسان ہے۔ اسی جامعیت کو احسن تقویم سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

انسان تمام مخلوقات میں سے زیادہ حسین ہے:

انسانی فطرت ہے کہ وہ ہر اس چیز کی تمنا کرتا ہے جو اپنے پاس والی چیز سے بہتر ہو۔ مثلاً ایک جھونپڑی والا مکان کی، مکان والا کوٹھی کی تمنا کرتا ہے۔ ایک سائیکل والا موٹر سائیکل کی اور موٹر سائیکل والا کار کی اور وہ ہیلی کاپٹر کی۔ ایک پولیس والا تھانہ داری اور وہ اس سے اوپر والے عہدہ کی۔ انہیں مثالوں سے مقصد واضح ہوگیا کہ کوئی بھی انسان تنزل کی تمنا نہیں کرتا۔ اس نفسیاتی اصول اور انسانی افتادِ طبع کی روشنی میں سوچیں کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں سے کتنا ہی بدصورت، کانا، لنگڑا، اندھا، بھینگا کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ ہرگز اس بات کی تمنا نہیں کرتا کہ میری صورت خوبصورت گدھے کے بچے یا کتے کے پلے یا اور کسی جانور یا اور کسی مخلوق جیسی ہو جائے۔ یہ اس بات کی عقلی دلیل بلکہ مشاہدہ ہے کہ انسان سے زیادہ خوبصورت کوئی دوسری مخلوق ہے ہی نہیں۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مخلوق میں انسان سے بڑھ کر کوئی حسین نہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے اس کو حیات کے ساتھ عالم، قادر، متکلم، مدبر اور حکیم بنایا ہے۔ اور یہ صفاتِ باری تعالیٰ کی تجلیات کا مرکز اور حق تعالیٰ کا خلیفہ قرار پایا ہے۔

ایک عجیب واقعہ:

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جگہ ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی جو خلیفہ ابوجعفر کے خاص خاص

مصاحبین میں سے تھا۔ اپنی بیوی سے حد درجہ محبت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ چاندنی رات میں اپنی بیوی سے کہا انت طالق ثلثاً ان لم تکونی احسن من القمر (یعنی تجھ کو تین طلاقیں ہیں اگر تو چاند سے زیادہ حسین نہ ہو) یہ سنتے ہی بیوی یہ کہہ کر اٹھی اور پردہ میں چلی گئی۔ کہ آپ نے مجھ کو طلاق دے دی ہے۔ بات ہنسی دل لگی کی تھی مگر صریح طلاق کا حکم یہی ہے کہ وہ غصہ، مذاق اور ہنسی، دل لگی، ہر صورت میں پڑ جاتی ہے۔ اور صریح الفاظ میں نیت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے رات بڑی بے چینی سے کاٹی صبح کو خلیفہ ابو جعفر منصور کے پاس حاضر ہو کر اپنا قصہ سنایا۔ اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ منصور نے شہر کے فقہاء و مفتیان کرام کو جمع کر کے مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ سب نے ایک ہی جواب دیا کہ طلاق مغلظ ہو گئی۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی انسان چاند سے زیادہ حسین ہو سکے۔ مگر ایک عالم جو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے خاموش بیٹھے تھے۔ منصور نے کہا کہ آپ کیوں خاموش ہیں۔ آپ بھی فرمادیجئے، انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۃ والتین کی تلاوت کی اور فرمایا کہ اے امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم (سب سے بہتر صورت) میں پیدا فرمایا ہے۔ کوئی شئے اس سے زیادہ حسین نہیں، یہ سن کر سب علماء فقہاء حیران رہ گئے۔ اور سب نے متفقہ طور پر کہا کہ واقعی اس عورت کو طلاق نہیں ہوئی۔ اور علماء کی اس متفقہ رائے کے موافق خلیفہ ابو جعفر منصور نے طلاق نہ ہونے کا فیصلہ کر دیا۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ الیٰ قولہ تعالیٰ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۔ پہلی آیت میں انسان کو ساری کائنات سے احسن بنانے کا بیان تھا اس جملہ میں اسکے بالمقابل یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح وہ اپنی ابتداء اور شباب میں ساری مخلوقات سے زائد حسین، معتدل و متوازن اور متناسب الاعضاء تھا۔ اخیر میں اس پر ایسا دور بھی آتا ہے کہ وہ بد سے بدتر شکل اور بُرے سے بُرا ہو جاتا ہے۔ مشہور ہے، بڑھاپا بُرا آیا ظاہر یہی ہے کہ بدتری اور برائی اسکی ظاہری جسمانی حالت کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے کہ شباب ڈھلنے کے بعد اس کی شکل و صورت بدلنے لگتی ہے۔ بڑھاپا اس کا رنگ و روپ بدل ڈالتا ہے۔ وہ بدشکل، معذور، بیکار اور دوسروں پر بار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور دوسرے حیوانات اخیر تک اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، انسان اُن سے دُودھ، سواری، بار برداری اور دوسرے سینکڑوں قسم کے کام لیتے ہیں۔ وہ ذبح کر دیئے جائیں یا مر جائیں، تو بھی انکی کھال، بال، ہڈی، بلکہ جسم کا ریزہ ریزہ انسانوں کے کام میں آتا ہے۔ مگر انسان بیماری و ضعف پیری میں عاجز و درماندہ ہو جاتا ہے۔ تو دنیا داری کے اعتبار سے وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ مرنے کے بعد بھی اسکے کسی جز سے کسی انسان یا جانور کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ اسفل السافلین میں پہنچ جانے سے مادی و جسمانی کیفیت مُراد ہے۔ یہ تفسیر ضحاک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ائمہ تفسیر سے منقول ہے۔ اس تفسیر کی بنا پر اِلَّا الَّذِیْنَ سے مؤمنین صالحین کے استثناء کا مطلب یہ نہ ہوگا، کہ ان پر بڑھاپے کے حالات نہیں آتے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس جسمانی کمزوری، دنیاوی بیکاری اور مادی خرابی کا نقصان ان کو نہیں پہنچتا۔ یہ نقصان صرف ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اپنی ساری فکر اور پوری توانائی اس مادی دنیا کی تحصیل پر صرف کی تھی۔ اب وہ ختم ہو گئی، آگے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ بخلاف مؤمنین صالحین کے کہ ان کا اجر و ثواب کبھی ختم نہ ہوگا۔ بڑھاپے کی ناتوانی اور حالات کی پریشانی بھی عارضی ہے۔ آگے ان کے لئے جنت کے درجاتِ عالیہ اور راحت و آرام کے اسباب نیز اعلیٰ زندگی اور پائیدار توانائی کے انعامات موجود ہیں۔

(۲) دنیا دار عالمِ شباب و زمانہ قوت میں جو منافع حاصل کرتا تھا وہ ضعف پیری میں ان کے حاصل کرنے سے

عاجز ہوجاتا ہے۔اور مؤمنین صالحین کے لئے ضعف وعجز کے زمانہ میں عمل کم ہوجانے کے باوجود تمام منافع اور اجور جاری رہتے ہیں اوران کے اعمال ناموں میں درج ہوتے رہتے ہیں ان میں کمی نہیں آتی۔حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان کسی بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال لکھنے والے فرشتوں کو حکم دے دیتے ہیں کہ جو عمل خیر یہ اپنی زندگی میں کیا کرتا تھا وہ سب اس کے اعمال نامہ میں لکھتے رہو۔دوسری حدیث میں بوڑھے،مریض اور مسافر تیمیوں کے بارے میں یہی مضمون وارد ہوا ہے۔

(۳) دنیا دار مرنے کے بعد اپنی کمائی ہوئی دولت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے لیکن مؤمنین صالحین اپنے صدقات جاریہ،علوم نافعہ،اور اعمال خیر سے مرنے کے بعد بھی فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔اور مسلسل ان کے اعمال ناموں میں ثواب کی دولتیں درج ہوتی رہتی ہیں۔(۴) مؤمنین صالحین سے بڑھاپے میں بندگانِ خدا کو زیادہ فوائد پہنچتے ہیں،معذوری وضعف کے باوجود ان کے مخلص رفقاء معتقدین باصفا بلکہ خلق خدا ان کی حیات کے آخری لمحات تک ظاہری و باطنی خصوصاً روحانی فوائد سے فیضیاب ہوتی رہتی ہے۔اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کی کتب،ان کے جاری کردہ طُرقِ خیر سے خلقِ خدا مستفیض ہوتی رہتی ہے۔(۵) ناتوانی کے وقت حق تعالیٰ مؤمنین صالحین کو ایسے خُدام باصفا عطاء فرماتے ہیں جو ان کو پوری پوری راحت پہنچاتے ہیں۔اور ان کی خدمت ان پر بار نہیں ہوتی بلکہ باعثِ فخر ہوتی ہے۔یہ بات دنیاداروں کو حاصل نہیں ہوتی۔غالباً انہیں وجوہات کی بنا پر مؤمنین صالحین کی جزاء جنت اور اسکی نعمتوں کو بیان کرنے کے بجائے لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ فرمایا ہے۔یعنی ان کے ایمان و عمل صالح کا اجر ہمیشہ رہتا ہے۔کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ایمان و عمل کے منافع وفوائد اس عالم دنیا سے شروع ہوجاتے ہیں۔(جن کو برکات،ایمان واعمال سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور ابدالآباد ان کے لئے یہ فائدے جاری رہتے ہیں۔

دوسری تفسیر:

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ عام انسانوں کے لئے نہیں۔بلکہ کفار وفجار کے لئے ہے۔ جنہوں نے خود کو خدا داد احسن تقویم،فطری صلاحیت،انسانی شرافت وکمالات اور عقل وشعور کو مادی لذتوں،اور ناپائیدار راحتوں کے پیچھے برباد کردیا۔تو اس ناشکری کی سزا میں ان کو اسفل السافلین (جہنم کے نچلے) طبقہ میں پہنچادیا جائیگا۔اس تفسیر کی بنا پر اِلَّا الَّذِيْنَ کا استثناء اپنے ظاہری مفہوم پر رہے گا کہ اسفل سافلین میں پہونچنے سے وہ لوگ مستثنٰی ومحفوظ ہیں جو اصحابِ ایمان و عمل صالح ہیں۔کیونکہ ان کا اجر ہمیشہ جاری رہیگا۔(یعنی اس صورت میں استثناء متصل ہوگا) دونوں تفسیروں کی بنا پر اسفل سافلین میں گرجانے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ انسان سب سے بلند تھا۔اور جتنی بلندی سے کوئی گرتا ہے اسی کے اعتبار سے تباہی آتی ہے۔ریل کی قوت کو دیکھئے کہ ہزاروں ٹن بوجھ اور ہزار ہا انسان کو منزلِ مقصود تک لیجاتی ہے۔لیکن جب لائن سے اسکا پہیہ ہٹ جائے تو تباہی بھی ایسی ہی آتی ہے۔حضرت انسان کو رفعت وقوت سب سے زائد ملی ہے اگر یہ اپنے مقام سے گرے گا تو تباہ وبرباد بھی سب سے زائد ہوگا۔انس وجن کے علاوہ کسی مخلوق کو دخول جنت اور تحصیل درجات اُخروی کی استعداد وصلاحیت عطاء نہیں ہوئی تو انس وجن کے علاوہ دوسری مخلوق اگر جنت میں بھی نہ جائیگی تو جہنم میں بھی تو نہ جائیگی۔لیکن حضرت انسان اگر جنت وآخرت کی نعمت وراحت کو حاصل نہ کرسکا تو یقیناً دوزخ میں جائیگا۔ظاہر ہے کہ یہ ال سب سے اسفل وبدتر ہے۔ اعاذنا اللہ منہ بفضلہ۔

سوال...... سافلین جمع سالم کا صیغہ ہے جو ذوی العقول پر بولا جاتا ہے۔اور سابقہ تفسیر سے مفہوم ہوا کہ اس کا اطلاق حیوانات وغیرہ (غیر ذوی العقول) پر ہوا ہے۔ جو بظاہر قاعدہ کے خلاف ہے۔

جواب...... سافلین سے مراد شیاطین وحیوانات وغیرہ سب ہی ہیں۔اور شیاطین و جنات ذوی العقول ہیں۔ ان کو دیگر مخلوقات (حیوانات وغیرہ) پر غلبہ دے کر (تغلیباً) سب پر ذوی العقول والا (جمع سالم کا) صیغہ استعمال کیا گیا۔اور اس نوع کے اطلاقات عربی میں مشہور ومطرد ہیں۔

سوال...... بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اگر مخاطب خالی الذھن ہے تو کلام تاکید سے خالی لایا جائے گا۔اور مخاطب منکر ہو تو اس کے انکار کے بقدر تاکیدی کلام کیا جائے گا۔ مذکورہ مضمون میں انسان کا بہترین صورت میں پیدا ہونا پھر کسی کسی کا ناکارہ عمر کو پہنچنا وغیرہ کھلی ہوئی باتیں ہیں۔کوئی ان چیزوں کا منکر نہیں۔ پھر اس کلام کو چار قسموں، لام تاکید اور لفظ قد کے ساتھ کیوں مؤکد کیا گیا۔

جواب...... اگر کسی چیز کی دلیل واضح ہو اور مدلول کا انکار کیا جائے۔ یا کسی چیز کا علم ومشاہدہ ہو اور اسکے مقتضیٰ کے خلاف عمل کیا جائے تو یہ اس دلیل اور علم ومشاہدہ کا انکار ہی شمار ہوتا ہے۔اب سمجھئے کہ احوالِ انسانی انقلاباتِ اُخروی زندگی کی جزاوسزا پر واضح دلیل ہے۔انسان کا احسنِ تقویم میں ہونا اس کے سب سے اعلیٰ مقصود پر دلیل ہے لیکن جب انسان اس دلیل کے مقتضیٰ سے روگردانی کر رہے ہیں۔اور اپنے دلائل نفسی سے بھی آنکھیں بند کر کے اپنے مقصد عظیم سے بے رخی کر رہے ہیں۔(من عرف نفسہ عرف ربہ) تو گویا وہ ان تغیرات وانقلابات کے منکر ہیں۔اور منکر کے ساتھ تاکیدی کلام سے خطاب کیا جاتا ہے اور چونکہ منکرین کو اپنے انکار پر اصرار ہے اس لئے کئی تاکیدوں کیساتھ کلام لاکر مخاطبین منکرین کے انکار کو رد کر دیا گیا ہے فتامل فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ پچھلی آیات میں تخلیق انسانی کے کمال اور اس پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعام کا، پھر بڑھاپے کے حالات کے انقلابات کا ذکر فرما کر اس آیت میں منکرین قیامت کو تنبیہ ہے کہ قدرتِ الہیہ کے ایسے مناظر وانقلابات دیکھنے کے بعد بھی کیا اس بات کی گنجائش ہے کہ تم آخرت وقیامت کی تکذیب کرو۔کیا تم حق تعالیٰ کو سب سے بڑا حاکم تسلیم نہیں کرتے ہو؟ حالانکہ اس کی قدرت وحاکمیت کے کرشمے اور نظارے تم کھلی آنکھوں دیکھتے ہو۔ یہ تفسیر جب ہے کہ يُكَذِّبُكَ میں خطاب منکر انسان کو ہو۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو۔اس صورت میں مانفی کے لئے ہوگا یا استفہام انکاری کے لئے ہے۔نفی کے لئے ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ کوئی چیز آپ کو جھٹلانے والی نہیں ہے۔آپ کی صداقت دلائل سے پختہ ہو چکی ہے۔اور اگر ما استفہامیہ ہے اور یہ ما اپنے ہی معنی میں مستعمل ہے تو معنی یہ ہونگے کہ کیا کوئی چیز آپ کی دروغ گوئی پر دلالت کر رہی ہے؟ یعنی آپ کی سچائی پر کھلی دلیلیں موجود ہیں۔تو کونسی چیز آپ کو قیامت کے بارے میں جھوٹا قرار دے سکتی ہے۔اور اگر ما مَن کے معنی میں ہے تو مطلب یہ ہے کہ واضح دلائل آپ کی صداقت پر موجود ہیں تو کون آپ کو جھوٹا قرار دے سکتا ہے۔کیونکہ جو آپ کے کاذب ہونے کا دعویٰ کرے گا اس کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں۔قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۔میں ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ آپ کفار کی تکذیب وعناد پر کبیدہ خاطر کیوں ہیں؟ کیا اللہ جل شانہ احکم الحاکمین نہیں؟ ضرور ہیں۔لہٰذا وہ ضرور جزا وسزا کا فیصلہ فرمائیں گے۔ اور کفار کے لئے وعید بھی ہے جس میں عذاب کی دھمکی ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ گذشتہ جملہ کی علت ہو۔یعنی اے انسان!

تجھے تکذیب نہ کرنی چاہیے کیونکہ اللہ احکم الحاکمین ہے وہ تجھ کو عذاب دے گا۔

مسئلہ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سورۂ والتین پڑھے۔اور آیت اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ پر پہنچے تو وہ (اسکے بعد) بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ پڑھے۔فقہاء رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سورت کے ختم پر اس کلمہ کا پڑھنا مستحب ہے۔احناف رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک یہ کلمہ نماز میں زبان سے نہ پڑھے۔ہاں نماز کے باہر اگر اس سورت کو تلاوت کرتا ہے تو ختم پر یہ کلمہ بھی پڑھے گا۔ دوسرے آئمہ کے نزدیک نماز اور خارج نماز بہر دو صورت یہ کلمہ پڑھا جائیگا۔

تم تفسیر سورۃ والتین فالحمدُ اللہ رب العالمین وھو احکم الحاکمین وانا علیٰ ذالک من الشّٰھدین والصلوۃ والسلام علی سیدالمرسلین وخاتم النبیین ورحمۃ للعٰلمین وعلیٰ الہٖ وصحبہ الھادین المھتدین وعلیٰ من تبعھم الی یوم الدین

سُوْرَۃُ الْعَلَقِ

سُوْرَۃُ الْعَلَقِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعَ عَشَرَۃَ اٰیَۃً

(رکوع:۱،آیات:۱۹) سورۂ علق مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں انیس (۱۹) آیات ہیں۔ (کلمات:۹۲،حروف:۱۸۰)

ربط ومناسبت:

(۱) سورۂ والتین میں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے تحت انسان کا بہترین ساخت میں پیدا کرنا اور اسکا جامع الکمالات ہونا بیان فرمایا گیا تھا۔اس سورت میں خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ میں اس کی پیدائش کا ایک حقیر چیز یعنی خون کی پھٹکی سے ہونا بیان کیا گیا ہے۔گویا سابق میں انسان کی علت صوری کا ذکر ہے۔اور یہاں علت مادی کا اظہار ہے۔(۲) سابقہ سورت میں انسان کا جامع الکمالات ہونا مذکور ہے تو اس سورت میں اس حقیقت کو عیاں فرمایا گیا کہ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے ایسا حقیر ہے کہ اسکا مادہ خون کی پھٹکی ہے لیکن علوم ومعارف الٰہیہ نے اس کو جامع کمالات بنادیا۔اور اشرف وافضل امانت کا حامل ہونے کی وجہ سے اس کو احسنِ تقویم میں پیدا کیا گیا ہے۔کیونکہ مکان مکین کے مناسب ہوتا ہے (۳) اسی طرح سورۂ والتین میں مکذبین اور ان کی تکذیب کے بے اثر ہوجانے کو اجمالاً بیان فرمایا گیا تو یہاں اشارۃً ایک مکذب کی زبردست کوشش کے نصرتِ خداوندی سے ناکام ہوجانے کا واقعہ بھی ذکر فرمایا گیا۔انکے علاوہ دیگر لفظی ومعنوی مناسبات غور وفکر سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

سب سے پہلی وحی:

سورۂ علق جس کو سورہ اقرأ بھی کہتے ہیں بالاتفاق مکیہ ہے۔اس سورت کی شروع کی پانچ آیات اِقْرَاْ سے مَالَمْ یَعْلَمْ تک سب سے پہلے نازل ہوئیں۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا انہی پانچ آیات سے ہوئی ہے۔جیسا کہ بخاری

ومسلم اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں سے ثابت ہے، جمہور سلف وخلف کا اس پر اتفاق اور اکثر مفسرین کی تحقیق یہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ چنانچہ بعض علماء اسی کے قائل ہیں، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے اوّل نازل ہونے والی سورت سورۂ مدثر ہے۔ اور بعض حضرات اسی کے قائل ہیں۔ جمہور نے ان مختلف روایات میں توجیہات کی ہیں جن سے یہ ظاہری اختلاف دور ہو جاتا ہے۔

(۱) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جمہور سلف وخلف کے نزدیک ثابت وصحیح یہی ہے کہ سب سے پہلے سورہ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیات کا نزول ہوا۔ اور جن روایات سے سورۂ مدثر کا نزول اوّل معلوم ہوتا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ فرقت وحی کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیات نازل ہوئیں، پھر وحی کا نزول مسلسل ہو گیا۔ اور سورہ فاتحہ کا سب سے پہلے نزول جن روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ پوری سورت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی۔ اس سے پہلے چند سورتوں کی متفرق آیات گو نازل ہو چکی تھیں مگر پوری سورت کوئی بھی نازل نہیں ہوئی تھی۔ (۲) سب سے اوّل سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیات ہی اتریں، مگر تعلیم سوال اور نماز میں پڑھنے کے لئے سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ اور ایک مدت وحی بند رہنے کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر اتری۔ اس طرح تینوں کو تین اعتبارات سے **اوّل مانزل من القرآن** کہہ سکتے ہیں۔ (۳) وحی کے ابتدائی دور میں سورۂ اقرأ کی اولین آیات، سورۂ فاتحہ اور آیات سورۂ مدثر کا نزول ہوا۔ اس لئے سب کو بطور اولیت عرفی **اول مانزل من القرآن** کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اوّلیت حقیقیہ سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات ہی کو حاصل ہے۔ (۴) طریقہ تعلیم سکھانے کے لئے سب سے اوّل سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات اتریں۔ اور نماز میں پڑھنے کے لئے سب سے پہلے سورۂ فاتحہ اور دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیات نازل ہوئیں۔ مگر ابتداء حقیقی سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات ہی کو حاصل ہے۔

شانِ نزول:

بخاری ومسلم کی ایک طویل حدیث میں نبوت ووحی کی ابتداء کا واقعہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس طرح منقول ہے کہ سلسلۂ وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ واقعہ بن کر روز روشن کی طرح ظہور میں آ جاتا۔ اسکے بعد مخلوق سے یکسو ہو کر گوشہ نشینی وعبادت کا تقاضا قلبِ اطہر میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلوت وعبادت کے لئے غارِ حراء کو منتخب فرمایا۔

تصدُّق اُن کی تنہائی پہ ہنگامۂ دو عالم　　　حراء کے غار کی قسمت کھلی عزلت گزیں آئے

(غارِ حراء مکہ مکرمہ کے قبرستان **جنۃ المعلی** سے کچھ آگے ایک پہاڑ پر ہے۔ اس پہاڑ کو **جبل النور** کہتے ہیں۔ اسکی بلند چوٹی دور سے نظر آتی ہے۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ غار میں جا کر راتوں عبادت میں مشغول رہتے، جب تک اہل وعیال کی خبر گیری کی ضرورت پیش نہ آتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں مقیم رہتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہ ضروری توشہ لے جاتے اور توشہ ختم ہونے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لاتے، پھر مزید کچھ دنوں کے لئے توشہ لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ اسی غارِ حراء میں تھے کہ اچانک آپ کے پاس حق آ گیا یعنی وحی پہنچی (غارِ حراء میں خلوت گزینی کی مدت میں علماء کا اختلاف ہے صحیحین کی روایت ہے کہ آپ نے ایک

ماہ یعنی پورے ماہِ رمضان اس میں قیام فرمایا۔ ابن اسحق رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت میں اور زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مواہب میں فرمایا کہ اس سے زائد مدت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس غار میں رہنے کی مدت اکثر ماہ سے کم ہوتی تھی اور کبھی مکمل ایک ماہ بھی آپ ﷺ اس غار میں مقیم رہے ہیں۔ نزولِ وحی سے قبل آپ ﷺ کی عبادت اس غار میں کس طرح ہوتی تھی۔ بعض کہتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق آپ ﷺ عبادت کرتے تھے مگر نہ کسی روایت سے اس کا ثبوت ہے اور نہ آپ ﷺ کے امی ہونے کی وجہ سے یہ احتمال صحیح ہے۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عبادت مخلوق سے یکسو ہو کر اللہ کی طرف خاص توجہ اور تفکر یا تسبیح، وتہلیل وغیرہ تھی) ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتی ہیں کہ وحی آنے کی صورت یہ ہوئی کہ جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس (انسانی شکل میں) آئے (چہرہ آفتاب کی طرح نورانی اور سر پر نورانی تاج تھا، سبز لہلہاتی ہوئی پوشاک تھی۔ اور آپ ﷺ سے کہا اِقْرَأْ یعنی پڑھئے آپ ﷺ نے فرمایا مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ یعنی میں پڑھنے والا نہیں ہوں کیونکہ آپ ﷺ امی تھے) بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے پاس ایک سبز ریشمی کپڑا بھی تھا۔ جس میں کچھ لکھا ہوا تھا وہ آپ ﷺ کو دکھلا کر کہا پڑھئے۔ آپ ﷺ پر حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مطلب اس وقت واضح نہ تھا۔ کہ آپ علیہ السلام کوئی تحریر پڑھوانا چاہتے ہیں یا اور کچھ (اس لئے آپ ﷺ نے مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ فرما کر اپنے امی ہونے کا عذر فرما دیا) حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس جواب پر جبرئیل علیہ السلام نے مجھے آغوش میں لے کر اتنا دبایا کہ مجھے اس کی تکلیف محسوس ہونے لگی۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَأْ میں نے پھر وہی جواب دیا مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ پھر انھوں نے دوبارہ مجھے آغوش میں لے کر اتنا دبایا کہ مجھے تکلیف محسوس ہونے لگی۔ پھر چھوڑ دیا اور تیسری بار پھر کہا اِقْرَءْ میں نے پھر وہی جواب دیا مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ تو تیسری مرتبہ پھر آغوش میں لے کر دبایا اور چھوڑ کر کہا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (یہ پانچوں آیات آپ ﷺ کو خوب یاد ہو گئیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے زمین پر پیر مارا تو ایک چشمہ اُبل پڑا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو، غسل اور استنجاء کرنے کا طریقہ سکھایا پھر دو رکعت نماز پڑھوائی۔ اور سورۂ فاتحہ بھی سکھائی کہ اس کو نماز میں پڑھا کریں) آپ قرآن کی یہ (سب سے پہلی پانچوں) آیات لے کر دولت کدہ پر تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کانپ رہا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آ کر فرمایا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ، مجھے ڈھانپو! کپڑا اڑھاؤ! حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کپڑے ڈالے) یہاں تک کہ یہ (لرزہ اور) ہیبت کی کیفیت رفع ہو گئی (یہ کپکپی اور ہیبت کی کیفیت حضرت جبرئیل علیہ السلام کے خوف سے نہ تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی اس سے بلند و بالا ہے۔ بلکہ اس وحی کے ذریعہ جو نبوت و رسالت کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپی گئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارِ گراں کا احساس فرمارہے تھے۔ پھر فرشتہ کو اس کی اصلی ہیبت میں دیکھنے سے اگر ایسا ہوا ہو تو طبعاً ہیبت کا طاری ہو جانا مستبعد نہیں۔

کپکپی جسم میں دِل منزلِ اجلالِ خدا   لے کے یوں کوہِ حراء سے کوئی نامہ آیا

حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کیفیت سے افاقہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو غارِ حراء کا پورا ماجرا سُنایا۔ اور فرمایا کہ اس سے مجھ کو ایسی کیفیت لاحق ہوئی کہ مجھ کو اپنی جان

کا اندیشہ ہو گیا۔ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا ہر گز ایسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر گز ناکام نہ ہونے دیں گے۔ کیونکہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، بوجھ میں دبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں بے روزگاروں کو روزگار دلاتے ہیں۔ مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اور مصیبت زدوں کی امداد کرتے ہیں (حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ ان کو شاید کتب سابقہ سے یا ان کے جاننے والوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہوگی کہ جس شخص کے اخلاق و عادات ایسے کریمانہ و رحیمانہ ہوں وہ محروم نہیں ہوتا۔ اس لئے اس طریقہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی) اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لے گئیں۔ یہ زمانہ جاہلیت ہی میں بت پرستی سے تائب ہو کر نصرانی ہو گئے تھے اور اس وقت دین حق یہی تھا) ورقہ بن نوفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھے لکھے آدمی تھے عبرانی زبان بھی جانتے تھے اور عربی تو تھی ہی ان کی مادری زبان) وہ عبرانی زبان میں لکھتے تھے، اور انجیل کو عربی زبان میں لکھتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ بہت بوڑھے تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان سے کہا۔ اے میرے چچازاد بھائی ذرا اپنے بھتیجے کی بات سنیئے۔ ورقہ بن نوفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال دریافت کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حراء کا پورا واقعہ بیان فرما دیا۔ ورقہ بن نوفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنتے ہی کہا کہ یہ وہی ناموس اکبر یعنی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی اُتارا تھا۔ کاش میں آپ ﷺ کی نبوت کے زمانہ میں قوی ہوتا۔ اور کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب کہ آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کو (وطن سے) نکالے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (تعجب سے) پوچھا۔ کیا میری قوم مجھ کو نکال دے گی؟ ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا بلاشبہ ضرور نکالے گی۔ کیونکہ جب بھی کوئی آدمی وہ پیغام حق اور دین برحق لے کر آیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں تو اُس کی قوم نے اس کو ستایا ہے اور اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو میں آپ ﷺ کی پر زور مدد و حمایت کروں گا۔ مگر ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے چند روز بعد ہی انتقال کر گئے۔ اور اس واقعہ کے بعد (ایک عرصہ کے لئے) وحی قرآن کا سلسلہ رک گیا (بخاری و مسلم) فترتِ وحی کی مدت سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق ڈھائی سال تھی۔ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سال تھی۔ واللہ اعلم۔

فوائد:

(۱) کمالات ترقی بتدریج بنی آدم کی فطرت ہے۔ اسی فطری قاعدہ کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اول سچے خوابوں کے ذریعہ علوم غیبیہ کا القاء ہوتا رہا۔ اور عالم غیب سے مناسبت پیدا کی گئی تاکہ اسرارِ غیبیہ و حقائقِ کبریٰ کے تحمل کی رفتہ رفتہ عادت ہو جائے۔ اس کے بعد ترقی کا دوسرا مرتبہ شروع ہوا وہ یہ کہ حالتِ بیداری میں، خلوت و فراغ میں عالم ملکوت کا مشاہدہ ہونے لگا۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت و گوشہ نشینی کا شوق ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حراء میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی۔ اور الواثِ بشریہ و کدورات بہیمیہ سے آئینہ باطن پاک صاف ہو گیا۔ تو عیاناً عالمِ ملکوت کے بادشاہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ یہ ترقی کا تیسرا مرتبہ تھا۔ (۲) اس تقریر سے یہ شبہ بھی حل ہو گیا کہ آپ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو کس طرح پہچان لیا۔ حل کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ کو عالمِ ملکوت سے مناسبت تامہ بلکہ مشاہدۂ کاملہ ہو چکا تھا۔ (۳) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے تین بار اقــــرأ کہا مگر آپ ﷺ عذر فرماتے رہے۔ اور ہر مرتبہ آپ کو دبوچا، آپ ﷺ کا عذر فرمانا تو اس لئے تھا کہ آپ ﷺ کو

اقرأ کے معنی متعین طور پر معلوم نہ ہوئے تھے۔ کہ مجھ سے کیا پڑھوانا مطلوب ہے۔ اور یہ امر کوئی خلاف شان نہیں تھا یا تعیین مراد کے باوجود اس لئے عذر فرمایا کہ قرأت کا استعمال عموماً لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے حروف شناس نہ ہونے کے سبب عذر فرمایا۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دبانا شاید اس لئے ہوگا کہ آپ ﷺ کے اندر بارِ وحی کے تحمل کی استعداد کامل پیدا ہو جائے۔ یہ ایک خاص قسم کی توجہ تھی۔ اس کو صوفیہ کی اصطلاح میں توجہ اتحادی کہتے ہیں۔ اس توجہ سے آپ ﷺ پر وحی کا بارِ گراں آسان ہو گیا۔ اور جو وحی نازل ہوئی آپ ﷺ نے اس کو ضبط فرما لیا۔ (۴) حضراتِ صوفیہ کے نزدیک تاثیر کے اعتبار سے توجہ کی چار قسمیں ہیں۔ ان کو نسب اربع بھی کہتے ہیں۔

(۱) نسبت انعکاسی

اس میں مرید کے اندر شیخ کا عکس آ جاتا ہے جب تک مرید شیخ کے سامنے رہتا ہے اسی وقت تک یہ اثر بھی رہتا ہے۔ جیسے آئینہ میں صورت اسی وقت تک نظر آتی ہے جب تک آئینہ سامنے ہو۔ یا جیسے کوئی شخص عطر لگا کر مجلس میں آیا تو اہل مجلس کے دماغ اس سے معطر ہو گئے۔ وہ شخص مجلس سے چلا گیا تو خوشبو بھی چلی گئی۔

(۲) نسبتِ القائی

اس میں تاثیر تھوڑی دیر پا ہوتی ہے جو غفلت یا گناہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی اپنے چراغ میں تیل بتی وغیرہ درست کر کے لائے اور روشن کر کے لیجائے۔ تو جب تک اس میں تیل اور بتی ختم نہ ہوں گے وہ روشن رہیگا۔ ہاں ہوا، بارش وغیرہ کوئی مانع پیش آ جائیگا تو وہ چراغ بجھ جائیگا۔ بعض شیوخ اس نسبت کے حصول پر اجازت وخلافت بامید حفاظت عطا کر دیتے ہیں۔

(۳) نسبتِ اصلاحی۔

شیخ اپنی روحانی طاقت وتصرف سے مرید کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اور اس کے لطائف جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ پہلی دونوں نسبتوں سے قوی تر ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کاریگر کسی پانی کے خزانہ سے نالی ملا دے۔ یا فوارہ جاری کر دے۔ یہ نالی اور فوارہ اسی وقت تک جاری رہ سکتے ہیں جب تک پانی کی نالیوں میں اور فوارہ کے پائپ میں کوڑا کرکٹ جمع ہو کر بند نہ ہو جائیں۔ یا پانی کا خزانہ ختم نہ ہو جائے۔ عموماً مشائخ اس نسبت پر خرقۂ خلافت دیدیتے ہیں۔

(۴) نسبتِ اتحادی

اس اعلیٰ درجہ کی تاثیر کا نام ہے جس میں مرشدِ کامل اور مرید باصفا کی روح ایک ہو جاتی ہے۔ جو کمالات شیخ کی روح میں ہوتے ہیں وہ سب مرید کی روح میں آ جاتے ہیں۔ اس میں پھر بار بار استفادہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر یہ نسبت کم یاب ہے۔

من تو شدم تو من شدی　　من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں　　من دیگرم تو دیگری

یہی توجہ اتحادی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر کی تھی۔ اس توجہ میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہمیشہ اتحادِ ظاہری وباطنی باقی رہے۔ چنانچہ یہ ملکیت کبریٰ آپ ﷺ کا ابتدائی حال تھا۔ پھر ترقی کا وہ مقام حاصل

ہوا کہ وہاں وہم جبرئیل علیہ السلام بھی نہ پہنچا۔ (۵) آپکا آغازِ وحی میں گھبرا جانا اور ورقہ سے بیان کرنا شبہ کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ خوف وہیبت وحی سے حال اضطراری تھا، یا وحی نبوت کی ذمہ داری کی بنا پر تھا یا خالق سے ہٹ کر تبلیغ کے لئے توجہ الی الخلق کے تصور سے تھا۔ اور ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کرنا مزید اطمینان وزیادتِ ایقان کے لئے تھا نہ کہ عدم ایقان کے سبب نیز حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لیجانا انتہائی محبت کے جوش میں تھا۔ جو ایک اچھی بیوی کو اپنے شوہر سے ہوسکتی ہے۔ (۶) پھر چند روز بعد ہی آپ ﷺ کو تسلی دینے اور نصرت وتائید کا وعدہ کرنے والا شخص ورقہ بن نوفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس عالم سے اٹھالیا گیا۔ اس میں حکمت تھی کہ کسی کو اس شبہ کی گنجائش نہ رہے کہ ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ﷺ کو یہ باتیں بتلاتے ہیں۔ اور گزشتہ واقعات سکھاتے ہیں۔ نیز حق تعالیٰ کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ کسی سابق دین والے یا کسی اہل کتاب کی نصرت وتائید کا مرہون منت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنائیں۔ بلکہ جو کچھ ہو وہ آپ ﷺ ہی کی ذات عالی سے ہو جیسا کہ ابتداء ہی سے ظاہری اسباب سے بچا کر آپ ﷺ کی تربیت کی گئی تھی۔ (۷) مردوں میں سب سے پہلے ورقہ بن نوفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے۔ اور آپ ﷺ کی تصدیق کی۔ (ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خواب میں سفید لباس پہنے ہوئے دیکھا اور اس کی تعبیر بیان فرمائی کہ وہ جنتی ہیں۔ (۸) بظاہر امی کو اقرء کا حکم دینا تکلیف مالایطاق ہے۔ جیسے نابینا کو دیکھنے کا حکم دینا یا شل کو چلنے کا حکم دینا۔ اور تکلیف مالایطاق لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کی رو سے ممنوع ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم تکلیفی نہیں تلقینی تھا جیسے معلم بچے کو تعلیم شروع کراتے وقت کہتا ہے پڑھ۔ حالانکہ بچہ اس وقت پڑھنا نہیں جانتا۔ استاد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسے میں پڑھ کر بتاؤں اس طرح پڑھ، یہی مطلب حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بھی تھا کہ جس طرح آپ ﷺ کو پڑھ کر بتاؤں آپ ﷺ اسی طرح پڑھیں۔ (۹) ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ روایت میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام ومیکائیل علیہ السلام نے آپکا سینہ چاک کیا اور دھویا تھا پھر دونوں نے کہا تھا اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّکَ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِيْ عَلَّمَ

اپنے رب کے نام سے پڑھئے جس نے سب کچھ بنایا۔ آدمی کو خون سے پیدا کیا۔ پڑھئے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے لکھنا

اِقْرَاْ	بِاسْمِ	رَبِّكَ	الَّذِيْ	خَلَقَ	خَلَقَ	الْاِنْسَانَ	مِنْ	عَلَقٍ	اِقْرَاْ	وَ	رَبُّكَ	الْاَكْرَمُ	الَّذِيْ	عَلَّمَ
پڑھ	ساتھ نام	پروردگار اپنے	جس	پیدا کیا	پیدا کیا	آدمی	سے	جما ہوا لہو	پڑھ	اور	رب تیرا	بہت کرم والا	جس	سکھایا

بِالْقَلَمِ (۴) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (۵) كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ (۶) اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (۷)

سکھایا۔ انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ جانتا نہ تھا۔ یقیناً بلاشبہ آدمی حد سے گزر جاتا ہے۔ اس لئے کہ خود کو مستغنی سمجھتا ہے

بِالْقَلَمِ	عَلَّمَ	الْاِنْسَانَ	مَالَمْ	يَعْلَمْ	كَلَّا	اِنَّ	الْاِنْسَانَ	لَيَطْغٰى	اَنْ رَّاٰهُ	اسْتَغْنٰى
قلم سے	سکھایا	انسان	جو نہ	وہ جانتا تھا	ہرگز نہیں	بیشک	انسان	سرکشی کرتا ہے	اگر اپنے تئیں دیکھے	بے پرواہ

إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ (۸) أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ (۹) عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ (۱۰) أَرَءَيْتَ إِنْ كَانَ

بیشک اپنے رب کے پاس تجھے واپس جانا ہے ۔آپ نے دیکھا اسے جو بندہ کو روکتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے، بتایئے اگر وہ

إِنَّ	إِلَىٰ	رَبِّكَ	الرُّجْعَىٰ	أَرَءَيْتَ	الَّذِي	يَنْهَىٰ	عَبْدًا	إِذَا	صَلَّىٰ	أَرَءَيْتَ	إِنْ	كَانَ
تحقیق	طرف	پروردگار تر ے	پھر جانا	کیا دیکھا تو	اس شخص	منع کرتا ہے	بندہ	جب	نماز پڑھتا ہے	کیا دیکھا تو	اگر	ہو وہ

عَلَى الْهُدَىٰ (۱۱) أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ (۱۲) أَرَءَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (۱۳) أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ

ہدایت پر ہو۔ یا پرہیزگاری کا حکم دے رہا ہو۔ بھلا بتایئے اگر وہ جھٹلادے اور منہ موڑلے ۔ تو کیا اس کو معلوم نہیں کہ خدا

عَلَى	الْهُدَىٰ	أَوْ	أَمَرَ	بِالتَّقْوَىٰ	أَرَءَيْتَ	إِنْ	كَذَّبَ	وَ	تَوَلَّىٰ	أَلَمْ	يَعْلَمْ	بِأَنَّ	اللَّهَ
اوپر	ہدایت	یا	حکم کرے	ساتھ پرہیزگاری	کیا دیکھا تو	یہ کہ	جھٹلایا	اور	منہ پھیرا	کیا نہ	جانا اس نے	یہ کہ	اللہ

يَرَىٰ (۱۴) كَلَّا لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (۱۵) نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۱۶) فَلْيَدْعُ

دیکھ رہا ہے۔خبردار! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اسکی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ جو جھوٹی اور گنہگار پیشانی ہے۔ پھر وہ اپنی مجلس والوں کو بلالے

يَرَىٰ	كَلَّا	لَئِنْ	لَمْ	يَنْتَهِ	لَنَسْفَعًا	بِالنَّاصِيَةِ	نَاصِيَةٍ	كَاذِبَةٍ	خَاطِئَةٍ	فَلْيَدْعُ
دیکھتا ہے	ہرگز نہیں	اگر	نہ	باز رہیگا	البتہ گھسیٹیں گے ہم	ساتھ پیشانی	پیشانی	جھوٹی	خطاکار	پس چاہئے بلائے

نَادِيَهُ (۱۷) سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (۱۸) كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۱۹)

ہم بھی جہنم کے کارندے بلائے لیتے ہیں۔ ہرگز آپ اسکا کہنا نہ مانیے اور نماز پڑھتے رہئے اور اللہ کا قرب حاصل کرتے رہئے

نَادِيَهُ	سَنَدْعُ	الزَّبَانِيَةَ	كَلَّا	لَا	تُطِعْهُ	وَ	اسْجُدْ	وَ	اقْتَرِبْ
مجلس اپنی	عنقریب ہم بلائینگے	فرشتوں دوزخکے	ہرگز نہیں	مت	کہا مان اس	اور	سجدہ کر	اور	نزدیک ہو

لغات:

عَلَقٍ جما ہوا خون جو خشک نہ ہوا ہو (راغب) قاموس میں ہے کہ علق بمعنی عام خون یا وہ خون جو بہت زیادہ سُرخ ہو۔ یا جما ہوا خون عَلَق عَلَقَة کی جمع ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ عَلَقَة جمے ہوئے اور بہتے ہوئے خون کو مسفوح کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ اپنی متعلقہ رطوبت کے ساتھ معلق ہوتا ہے چنانچہ جب وہ رطوبت خشک ہو جائے تو پھر وہ علقہ نہیں کہلاتا عَلْقاً عُلُوقاً (ن) اوپر اوپر سے چرنا، گالی دینا، چوسنا عُلُوقاً (س) حاملہ ہونا، پھنس جانا چمٹ جانا، محبت کرنا وغیرہ۔ الرُّجْعَى (ض) لوٹنا، واپس ہونا۔ لَنَسْفَعًا صیغہ جمع متکلم مضارع معروف لام تاکید با نونِ تاکید خفیفہ۔ لَنَسْفَعَنْ تھا نون کو کتابت میں الف سے بدل دیا گیا حالتِ وقف کا اعتبار کرتے ہوئے۔ کیونکہ حالتِ وقف میں نون تاکید خفیفہ کو الف سے بدل دیتے ہیں۔ سَفَعَ سَفْعاً (ف) طمانچہ مارنا، زور سے کھینچنا، جھلس کر رنگ بدل دینا۔ سَفَعاً (س) سرخی مائل سیاہ ہونا۔ نَاصِيَة پیشانی کے بال جبکہ لمبے ہوں ج نَوَاصٍ وَنَصَا نَصُواً (ن) پیشانی کے بال پکڑنا۔ پیشانی کے بالوں میں کنگھا کرنا۔ نَادِی مجلس جب تک لوگ اسمیں موجود ہوں ج اَنْدِيَة و نَوَادٍ جج اَنْدِيَات۔ مؤنث نَادِيَة ج نَوَادٍ و نَادِيَاتٍ. نَدَا نَدْواً (ن) جمع ہونا، مجلس میں حاضر ہونا، جمع کرنا، الزَّبَانِيَة الزِّبْنِيَة کی جمع ہے جیسے عَفْرِيَة اور عِفْرِيتٌ ہے بمعنی سخت جن وانس میں سے سرکش سپاہی، ان فرشتوں کو بھی کہتے ہیں جو گنہگاروں کو کھینچ کر دوزخ

میں لیجائیں گے۔ یہاں یہی مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایسی جمع ہے جسکا کوئی مفرد نہیں۔ زَبن سے ماخوذ ہے۔ زَبن زَبناً (ض) دفع کرنا ٹکر لگانا، علیحدہ کرنا۔

ترکیب:

اِقرأ فعل بافاعل مفعول بہ مایُوحیٰ اِلَیکَ محذوف ہے، یا اپنے مجرور سے ملکر اقرأ کے متعلق ہوگا۔ یا ملصقا یا مستعیناً کے متعلق ہوکر ضمیر فاعل سے حال ہوگا۔ اَلّذی خلَقَ موصول وصلہ مبدل منہ یا مبین خلَقَ الاِنسان مِنْ عَلَقٍ فعل ضمیر غائب فاعل مفعول بہ اور متعلق سے ملکر جملہ فعلیہ بدل یا بیان۔ مبدل منہ بدل سے یا مبین بیان سے مل کر صفت رَبّ ہوئی۔ جملہ فعلیہ انشائیہ مؤکد۔ اقرأ فعل بافاعل مفعول بہ محذوف جملہ فعلیہ انشائیہ۔ اول جملہ اقرء الخ کی تاکید ہے و مستانفہ وربّک مبتدا الاَکرَمُ اپنی صفت سے مل کر خبر جملہ اسمیہ خبریہ، دوسرا احتمال یہ ہے کہ واؤ حالیہ ہو اور جملہ اقرأ کی ضمیر فاعل سے حال واقع ہوجائے۔ الذی اسم موصول۔ علّم فعل ضمیر فاعل دونوں مفعول محذوف ہیں ای عَلَّمَ الاِنسانَ مَالَمْ یَعْلَمْ بِالْقَلَمِ متعلق جملہ فعلیہ خبریہ صلہ۔ موصول وصلہ ملکر مبدل منہ عَلَّمَ الاِنسانَ مَالَمْ یَعلَمْ جملہ بدل اشتمال مبدل منہ بدل سے ملکر صفت ہوئی اَلاَکرَم کی (وفی حذف المفعولین اولاً وذکر هما ثانیاً والثانی منهما منكر، الدلالة علیٰ كمال قدرته وكرمه والایذان بانه تعالیٰ یعلمه علیه السلام من العلوم مالا یحیط به العقول وانما اظهر تعالیٰ ماانعم علی الانسان ترقیاً من الادنیٰ الی الاعلیٰ من المراتب تقریرا لربوبیته وتحقیقاً لاكرمیته فافهم، كلّا للردّ ع عن الحذوف اوبمعنی حقاً. اِنّ حرف تحقیق الاِنسانَ اسم لَیَطغیٰ فعل ضمیر فاعل اللام فیه للتاكید. اَنْ مخففه اس میں ضمیر شان محذوف ای انّهٗ رَاٰی فعل بمعنی عَلِمَ ضمیر فاعل ہٗ مفعول اول اِستَغنیٰ فعل ضمیر فاعل جملہ فعلیہ مفعول ثانی (رای بمعنی العلم فلذلک جاز ان یكون فاعله ومفعولهٗ ضمیرین راجعین الی الواحد ولو كان بمعنی ابصر لامتنع الجمع بین الضمیرین وذهب جماعة الیٰ انهٗ بمعنی ابصر یعطی لهٗ حكم العَلَمیة) یہ جملہ بتاویل مفرد یَطغیٰ کا مفعول لہ ہوگا۔ اور وہ جملہ فعلیہ اِنَّ کی خبر ہوگا۔ اِنَّ اپنی خبر مقدم اِلیٰ رَبّکَ اور اسم مؤخر الرُّجعیٰ سے مل کر جملہ وتقدیم الخبر للحصر وفی هذه الجملة التفات من الغیبة الی الخطاب۔ اَرَءَیتَ فعل بافاعل اَلّذی اسم موصول یَنهیٰ فعل ضمیر فاعل عَبداً مفعول بہ اِذَا صَلّیٰ ظرف جملہ فعلیہ موصول وصلہ ملکر اَرَءَیتَ کا مفعول بہ۔ یہاں رؤیت سے رؤیت بصریہ مراد ہے۔ اَرَءَیتَ بمعنی اَخبِرنی فعل بافاعل ضمیر محذوف ہ مفعول اول ای اخبرنیه۔ ان حرف شرط کَانَ فعل ناقص ضمیر اسم ثبت عَلَی الْهُدیٰ معطوف علیہ اَوْ اَمَرَ بالتَّقویٰ جملہ معطوف۔ معطوفین خبر کَانَ جملہ شرط ہے اور جزاء محذوف ہے جس پر اَلَمْ یَعْلَمْ دال ہے ای اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ الله یطلع علی احوالهم فیجازیه، یہ جب ہے کہ کَانَ کی ضمیر ناہی کی طرف راجع ہو اور اگر عَبدٌ کی طرف راجع ہو تو جزاء فما تعجب منه یا مخاطب ہوگی اور جملہ شرطیہ جزائیہ اَرَءَیتَ کے دومفعولوں کے قائم مقام ہوگا۔ اَرَءَیتَ اِنْ کَذَّبَ وتولیٰ کی ترکیب مثل سابق (فرق یہ ہے کہ کَذَّبَ اور تولیٰ کی ضمیر نَاهِی کی طرف لوٹیں گی۔ منہی یعنی عبد کی طرف نہ لوٹیں گی) اَلَمْ یَعْلَمْ پورا جملہ جزا ہوگا اگر اول اَرَءَیتَ سے بھی رؤیت قلبی ہی مراد لیجائے تو مفعول اول موصول مع صلہ ہوگا اور مفعول ثانی اَرَءَیتَ

ثانی کے مفعول کی طرح جملہ شرطیہ محذوف ہوگا۔ جس کی جزا بھی محذوف ہوگی (ان تینوں جملوں کی ترکیب جن کے شروع میں اَرَءَیْتَ ہے پوری تفصیل سے روح المعانی میں دیکھئے) کَلَّا برائے ردع لَئِن (اللام فیہ لام الابتداء المفیدۃ للتاکید عند الجمہور وعندالکوفیین لام القسم لان لام الابتداء عندھم لیس بموجود) اِن حرف شرط، لم ینتہ فعل ضمیر فاعل جملہ فعلیہ شرط، لَنَسۡفَعاً فعل بافاعل بِالنَّاصِیَۃِ متعلق و اللام فیہ عوض عن المضاف الیہ ای بناصیتہ۔ ناصیہ اپنی دونوں صفتوں کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ سے ملکر النَّاصِیَۃ کا بدل یا بیان ہے۔ فَ تعقیبیہ لِیَدۡعُ فعل امر۔ ضمیر غائب فاعل نَادِیَہٗ مفعول بہ ای اھل نَادِیۃٍ جملہ فعلیہ انشائیہ سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَۃَ جملہ فعلیہ متانفہ کَلَّا حرف ردع۔ اگلے تینوں جملے انشائیہ ہیں۔

تفسیر:

اِقۡـرَأۡ بِـاسۡـمِ رَبِّکَ (پڑھئے آپ اپنے رب کے نام سے) یعنی جو قرآن پاک آپ ﷺ پر نازل ہونے والا ہے جس میں یہ اولین نازل شدہ پانچ آیات بھی داخل ہیں۔ جب آپ اس کی تلاوت کریں تو اپنے رب کے نام سے یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر تلاوت شروع کیا کریں۔ یہ ایسا ہی حکم ہے جیسا دوسری آیت اِذَا قَرَءۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللہِ الخ میں اَعُوۡذُ بِاللہِ پڑھنے کا حکم ہے۔ اور بسمِ اللہ وَاَعُوۡذُ بِاللہ کے حکم سے اصل مقصود توکل واستعانت ہے جو واجب ہے۔ اور زبان سے کلمات تعوذ وتسمیہ کو آغازِ تلاوت میں پڑھنا مسنون ومندوب ہے۔ گو اس آیت کے نزول کے وقت بسم اللہ کا آپ کو معلوم ہونا ضروری نہیں۔ بعض حکم اوّل اجمالاً آتا ہے اور تفصیل بعد میں ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو تسمیہ اولاً سکھا دی گئی ہو۔ چنانچہ واحدی نے عکرمہ وحسن رحمۃ اللہ علیہم سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے بِسۡمِ اللہِ الرحمن الرحیم کا نزول ہوا۔ پھر سورۂ اقرأ کا ہوا۔ اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ سب سے پہلے جبرئیل امین جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لیکر آئے تو کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اعوذ باللہ پڑھیے۔ پھر کہیئے بسم اللہ الرحمن الرحیم (روح المعانی) علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی سورت نازل ہوتی تو پہلے بسم اللہ نازل ہوتی تھی (تو جب سورہ اقرأ کا نزول شروع ہوا تو پہلے بسم اللہ بھی ضرور نازل ہوئی ہوگی (اتقان ۲۴۔ ج ۱) تفسیر مذکورہ پر باسم ربک میں باء زائد ہے۔ یا استبراک کے لئے ہے۔ یا الصاق یا استعانت کے لئے ہے۔

شبہ...... آغازِ کلام میں اِقۡرَءۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ ہے جس کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے رب کے نام سے بسم اللہ پڑھ کر قرآن پڑھیئے تو یہ الفاظ قرآن میں داخل نہ ہونے چاہیں۔ کیونکہ ان میں تو قرأت قرآن کا امر ہے۔ اور امر بالشئی شئی سے خارج ہوتا ہے۔

جواب...... کلام ربانی محاوراتِ انسانی میں نازل ہوا ہے۔ تو یہ اسم الٰہی سے قرأت کلام الٰہی شروع کرنے کا حکم ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے: اِسۡمَعۡ مَا اَقُوۡلُ لَکَ جو کچھ میں کہوں اس کو سن، تو اس جملہ کے بعد والے کلام کا سنانا جس طرح مقصود ہے، خود اس جملہ کا سنانا بھی مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا حاصل یہ ہوگا کہ خواہ ان آیتوں کو پڑھو (جن میں حکم قرأت باسمِ رب ہے) یا ان آیات کو پڑھو جو بعد میں نازل ہوں گی۔ سب کی قراءت باسمِ رب ہونا چاہیے۔ یہی شبہ وہاں

پیش آئے گا جہاں لفظ قُل آیا ہے مثلاً قُلْ اُوْحِیَ. قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ. قُلْ هُوَ اللّٰهُ. قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ. قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ وغیرہ اور یہی جواب مذکورہ وہاں بھی ہوگا کہ جس طرح اوراوامر قرآنیہ ہیں اسی طرح قُلْ اور اِقْرَاْ بھی ہیں۔ اور تمام اوامر جو قرآن میں ہیں قرآن میں داخل ہیں۔ خطوط، کلام اور محاورات میں، جاننا چاہیے، توجہ فرمایئے، سوچئے سنئے جیسے الفاظ اور دوسری زبانوں میں ان کے مفاہیم جاری ہوتے ہیں اور وہ خطوط و گفتگو کے اجزاء ہوتے ہیں فافہم۔

اسمِ رب کی خصوصیت:

آیت میں بِاسْمِ رَبِّکَ فرمایا باسم اللہ نہیں فرمایا کیونکہ لفظ اللہ ذاتِ واجب الوجود کا عَلَم ہے۔ اور معرفتِ ذات کا طریقہ صرف آثار وصفات میں غور وفکر ہے۔ اور صفات باری میں سب سے زیادہ واضح اور نمایاں تعلق ہم سے صفتِ ربوبیت وتخلیق کا ہے۔ تخلیق وربوبیت کی صفات اس بات پر دلیل ہیں کہ تمام ممکنات متغیر وزوال پزیر اور فانی ہیں۔ جو ان کے حادث ہونے کی علامت ہے۔ اور ہر حادث کے لئے ایسے خالق کی یقیناً ضرورت ہے جو ازلی، ابدی ہو۔ اور جو حدوث ونقصان، فناؤ زوال اور تغیر احوال سے مبراء ہو۔ اسلئے معرفتِ ذات کے لئے معرفتِ ربوبیت اولین شرط ہے۔ لہٰذا بِاسْمِ رَبِّکَ نہایت مناسب وبرمحل ہے۔

سوال: حضراتِ صوفیہ اسمائے صفات سے قطع نظر کر کے اسم ذات کو ذکر کے لئے کیوں اختیار کرتے ہیں؟ جواب: کیونکہ سفر طریقت ذات واجب تعالیٰ پر ایمان کے بعد اسی کی طرف شروع ہوتا ہے۔ اس کے لئے صوفی کے حق میں اسم ذات ہی اولیٰ ہے۔ پھر اسم ذات میں تمام صفات اجمالاً آ جاتی ہیں۔ کیونکہ اسمِ ذات مستجمع وحاوی ہوتا ہے تمام صفات پر، اسلئے اسم ذات ہی ذات سے زیادہ قرب رکھتا ہے۔ اور صوفی کا مقصود اعلیٰ واصلی ذات ہی ہے۔ (ف) لفظ رب سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم آپ کی مکمل تربیت کریں گے۔ اور نبوت ورسالت کے اعلیٰ درجات پر پہنچائیں گے۔

دوسری تفسیر:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِقْـرَاْ میں مطلق قراءت کا حکم ہے۔ قرآن وغیرہ کسی چیز کی تخصیص نہیں۔ نفسِ فعل عدم تعیین مفعول میں الف لام جنسی کی طرح قلیل وکثیر کو حاوی اور عام ہوتا ہے۔ اس صورت میں باء استعانت کی ہوگی۔ اور یہ جملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مَـا اَنَـا بِقَارِی کا جواب ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ آپ پڑھئے۔ اپنی قوت وعلم کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے رب کی مدد سے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح پر بِـاسْمِ رَبِّکَ میں لفظ اسم زائد ہوگا جیسے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ میں اسم زائد ہے۔

فائدہ...... پہلی ہی وحی میں اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جس کتاب کی یہ پہلی وحی ہے وہ پڑھی جانے اور لکھی جانے والی کتاب ہے۔ دیگر کتب کی طرح نہیں کہ ٹونوں، ٹوٹکوں کی طرح چھپائی جائے۔ نیز جس ذات گرامی پر یہ کلام اتر رہا ہے۔ اس نبی امی کا خصوصی معجزہ اور ان کی امت کا امتیازی نشان علم ہوگا۔ چنانچہ قرآن مقدس جتنا لکھا پڑھا گیا دنیا میں کوئی کتاب اس کی مقابل نہیں اور نبی امی کا سب سے عظیم معجزہ بھی کتاب علم (قرآن مقدس) ہی ہے۔ اور آپ کی شان اقدس اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ کی صفت سے مزین ہے۔ اور آپ کی امت کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں

کی برکت سے جس قدر علم ملا ہے ساری دنیا کو ان کے پاسنگ بھی نہیں ملا۔ کیونکہ جس طرح ذاتِ نبی صفات ربّانی کا آئینہ ہوتی ہے اسی طرح امت بھی اپنے نبی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ یہ لفظ رب کی صفت کاشفہ ہے۔ تخلیق تقاضۂ ربوبیت ہے۔ کیونکہ ربوبیت کے معنی ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود اور نقص سے کمال کی جانب بتدریج و بکمال شفقت لیجانا۔ خَلَقَ کا مفعول بہ مذکور نہیں جس کا فائدہ عموم ہے۔ کوئی خاص مفعول ذکر کیا جاتا تو تخصیص کا وہم ہوسکتا تھا۔ اب مطلب یہ ہوا کہ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ یا یہ کہئے کہ خَلَقَ فعل متعدی کو فعل لازم کی جگہ میں استعمال کیا گیا۔ کیونکہ مقصود اس سے رب کی صفتِ تخلیق وتکوین کی خصوصیت کا بیان کرنا ہے۔ نیز حق تعالیٰ کی نعمتوں میں اولاً ظہور اسی نعمت کا ہوتا ہے۔ اس لئے مقام تذکیر میں رب کے بعد اسی صفتِ تخلیق کو لایا جانا مناسب ہوا۔ رب کی اضافت کاف خطاب کی طرف کر کے بتایا گیا کہ حق تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کی طرف متوجہ ہیں۔ اس لئے تربیت میں آپ تمام مخلوقات سے ممتاز ومنتخب ہیں۔
اب یہ خیال کہ کلام قدیم کو کس طرح پڑھایا جائیگا جبکہ بندہ حادث ہے۔ تو اللہ کی صفتِ خلق کو یاد کیجئے جس نے اپنی صفت قدیمہ خالقیت کا مظاہرہ فرما کر کائنات کو پیدا کیا۔ وہ ربِ کائنات وخالقِ مخلوقات اپنے کلام قدیم کو محاوراتِ انسانی کے قالب میں ڈھال کر اپنے بندوں کی زبان پر جاری فرمادے تو یہ اس قادر مطلق وخالقِ برحق کی قدرت میں ہے۔ اب رہا یہ خیال کہ انسان ذلیل وکلام عزیز میں کوئی مناسبت نہیں۔ تو جس حق تعالیٰ نے انسان کو ایک خون جیسی چیز سے پیدا فرما کر عزّت وکرامت کا تاج اس کے سر پر رکھا۔ اس کو اشرف المخلوقات بنایا اور احسنِ تقویم میں پیدا فرما کر ایسی روح سے نواز دیا کہ وہ اسرارِ الٰہیہ کی حامل ہے۔ تو وہ اس کو اپنے کلام کا حامل بھی بنا سکتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ پوری کائنات کی تخلیق کے بعد اس آیت میں حضرت انسان کی تخلیق کا بیان ہے۔ کیونکہ تمام کائنات کا خلاصہ انسان ہے۔ اس عالمِ اصغر میں عالمِ اکبر کے تمام نمونے اور نظائر موجود ہیں۔ نبوت ورسالت اور قرآن واحکام کے نازل کرنیکا مقصد احکامِ الٰہیہ کی تعمیل وتنفیذ ہے۔ وہ انسان ہی کیساتھ مخصوص ہے۔ نیز ربوبیت خداوندی کا مظہر اتم انسان ہی ہے۔ اسی طرح معرفتِ حق کا فردِ اکمل بھی انسان ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے
کنت کنزاً مخفیاًفاحببت ان اعرف فخلقت الخلق.

فائدہ......۱: علق کے معنی مطلق خون یا منجمد خون کے ہیں۔ انسان کی تخلیق پر مختلف دور گزرتے ہیں۔ اسکی ابتداء مٹی اور عناصر اربعہ ہیں۔ پھر نطفہ اسکے بعد علقہ یعنی منجمد خون پھر مضغہ یعنی گوشت پھر ہڈیاں وغیرہ۔ علقہ ان تمام ادوار میں ایک درمیانی حالت ہے اس کو ذکر کرنے سے اس کی دونوں طرفوں (اول وآخر) کی طرف اشارہ ہوگیا۔ دوسرے خون انسان کی خلقت و پیدائش اور بقاء سب کے لئے ضروری ہے۔ بخلاف مٹی اور منی وغیرہ کے کہ وہ ابتداء میں ضروری ہیں اور بقا میں نہیں۔ اس لئے انسان کے ایسے مادہ کا ذکر کیا جو اول سے اخیر تک ہمہ وقت انسان کے ساتھ موجود رہتا ہے۔
پھر اسی خون سے جو ذلیل بھی ہے اور ناپاک بھی اعضائے جسمانی بھی وجود میں آتے اور قائم رہتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ پاکیزہ روح بھی یگانگت واتحاد پیدا کرلیتی ہے۔ جملہ ظاہری وباطنی قویٰ کا تعلق اسی سے ہوتا ہے۔ ان متضاد اشیاء کا اتحاد بتاتا ہے کہ حضرت انسان وحی واسرارِ الٰہیہ کا حامل بھی بن سکتا ہے۔ یہ اللہ جل شانہٗ کی قدرت کا عجیب کرشمہ اور معرفتِ الٰہیہ کے لئے ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔

فائدہ......۲: اول خَلَقَ کا مفعول بہ عام مانا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ کافِ خطاب مفعول بہ محذوف ہوا ی

الَّذِی خَلَقَکَ سوال پیدا ہوا کہ کس چیز سے پیدا کیا؟ تو بطورِ استیناف خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ جنسِ انسان کی تخلیق بیان کر کے مخاطب کی تخلیق پر اشارہ ابلغ طریقہ پر فرما دیا۔ کیونکہ کنایہ تصریح سے ابلغ ہوتا ہے۔ اس میں آپکا زبر دست احترام بھی ہے۔ اور کلام بلکہ ہر کمال کی عطا کی خوشخبری بھی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ فعل اول کا مفعول بہ محذوف اَلْاِنْسَانَ ہو اور ثانی خَلَقَ الْاِنْسَانَ اس کی تاکید اور توضیح ابہام کے لئے ہو۔ اور اس سے عظمت انسانی کا اظہار بھی مقصود ہو۔ اور تخلیق انسانی کے متعلق کلام کو مخاطب کے لئے دل نشین بنانا بھی منظور ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اَلْاِنْسَانَ سے بھی ذاتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہو اور خصوصیت ذکر آپ کے شرف کی وجہ ہو۔ واللہ اعلم۔

اِقْرَأْ یہ تکرار مبالغہ وتاکید کے لئے ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ پہلے اِقْرَأْ میں آپ کو خود اپنے لئے تلاوت قرآن پاک کا حکم ہے اور دوسرے اِقْرَأْ میں تبلیغ امت کے لئے پڑھنے کا حکم ہے، کیونکہ اوروں کی طرح آپ بھی احکام کے مکلف ہیں اور تبلیغ تعلیم پر بھی مامور ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اول اقرأ میں نماز میں قرأت کا حکم ہے اور دوسرے میں خارج نماز۔ بعض کہتے ہیں پہلا حکم خود حضرت جبرئیل علیہ السلام سے سیکھنے کے لئے ہے اور دوسرا دوسروں کو سکھانے کے لئے ہے۔ واللہ تعالیٰ۔

وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ صفتِ اکرم میں اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیق عالم وتخلیق انسان میں اللہ تعالیٰ کی نہ اپنی کوئی غرض ہے نہ اپنا کوئی نفع بلکہ یہ سب کچھ اس کی جود وکرم کا تقاضا ہے۔ کہ بن مانگے کائنات کو وجود کی نعمت عظمیٰ عطا فرما کر اس پر دیگر دوسری بیشمار نعمتوں کی بارش فرما دی۔ اکرم: اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ یعنی وہ ان کریموں میں سب سے بڑا کریم ہے جن کا وجود واقعی یا فرضی مانا جائے یا بمعنی کریم صفتِ مشبہ ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ صفاتِ خداوندی میں اَفْعَل وفَعِیل کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی کریم ہے اس کی ذات وصفات میں چونکہ کوئی شریک نہیں اس لئے اللہ کی صفتِ کرم ورحمت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ دوسرے جو کرم ورحمت خداوندی کے آئینے ہیں ان کو مجازاً کریم ورحیم کہہ دیا جاتا ہے۔ اس جملہ میں اس عذر کو بھی رفع فرمایا گیا جو آپ نے جبرئیل امینؑ کے سامنے مَا اَنَا بِقَارِیٍ فرما کر کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ گو امی ہیں۔ مگر آپ کا رب تو بہت بڑا کریم ہے۔ وہ ایک امی کو اگر کائنات کے داناؤں کا امام وتاجدار بنا دے تو اس کے کرم سے کیا بعید ہے۔

اَلَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ بعض علماء کہتے ہیں کہ عَلَّمَ کا مفعول بہ محذوف ہے۔ اور بِالْقَلَمِ کا تعلق اسی سے ہے ای عَلَّمَ الخطَ بِالْقَلَمِ یعنی اس رب اکرم نے قلم سے لکھنے کا طریقہ سکھایا۔ تاکہ علوم اور کتابیں مفید ہوں اور باقی رہ سکیں۔ اور دُور دراز علوم کی اشاعت ہو سکے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ بِالْقَلَمِ کا تعلق عَلَّمَ سے ہے۔ یعنی قلم کے ذریعہ سے اللہ نے علوم سکھائے۔ پھر اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ (مرکب توصیفی) کی خبر ہے۔ یا یہ دوسری خبر ہے۔ اور پہلی اَلْاَکْرَم ہے۔ یا اَلْاَکْرَم صفتِ اول ہے اور یہ دوسری صفت کاشفہ ہے جس سے رب تعالیٰ کی اکرمیت کی وضاحت ہوتی ہے۔ کیونکہ علوم کا سکھانا اور افادۂ علوم کے اسباب کا پیدا کرنا اللہ کا بڑا اکرم ہے۔ اور قلم جیسی بے جان چیز سے علوم کے سمندر بہا دینا اس کی عجیب قدرت اور شان اکرمیت کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔

تعلیم کا اول اور اہم ذریعہ قلم ہے:

سب سے پہلے تعلیم تحریر کا ذکر، تحریر کی عظمت کو ظاہر کر رہا ہے۔ کیونکہ علوم کا تحفظ اکثر تحریر سے ہوتا ہے۔ اور سیکھنے

سے مقصد تحفظِ علوم ہی ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لما خلق اللہ الخلق کتب فی کتابہ فھو عندہ فوق العرش ان رحمتی غلبت علیٰ غضبی** یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوق کو پیدا فرمایا تو اپنی کتاب میں جو عرش پر اللہ کے پاس ہے یہ لکھدیا تھا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ ایک حدیث میں یہ بھی ہے **اول ماخلق اللہ القلم فقال لہٗ اکتب فکتب مایکون الیٰ یوم القیٰمۃ فھو عندہٗ فوق عرشہ** یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس کو لکھنے کا حکم دیا۔ اس نے وہ تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھیں لکھدیں۔ یہ کتاب اللہ کے پاس عرش پر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ نے قلم کو پہلے پیدا فرمایا۔ لکھوانے کا اہتمام فرمایا۔ یہاں بھی اقرأ کے بعد تعلیم انسان سے پہلے تعلیم بالقلم کا ذکر فرمایا۔ جس سے تحریر کی اہمیت واضح ہوتی ہے **القلم صیّاد العلوم ولولا القلم لَماقام الدین ولاصلح العیش**۔ تمام امور دنیویہ ودمیہ کا نظام وتحفظ قلم ہی کے ذریعہ ہے۔ **والتفصیل فی تفسیر عزیزی**۔ علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ تعلیم وتعلم میں کتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے جس پر ان کی تصانیف آج بھی شاہد ہیں۔ مگر دورِ حاضر میں اس سے بہت غفلت ہے۔

کتابت اللہ کی بڑی نعمت ہے

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دین قائم نہ رہتا نہ دنیا کا نظام۔ کمامرآنفاً۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہ جانتے تھے۔ اور ان کو جہالت کی تاریکی سے نورِ علم کی طرف نکالا۔ اور علم کتابت کی ترغیب دی اس میں بیشمار منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ تمام علوم وحکم کی تدوین اولین وآخرین کی تاریخ، ان کے حالات ومقالات، اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں ہیں سب علم ہی کے ذریعہ لکھی گئیں۔ اور دنیا میں باقی رہیں۔ اگر قلم نہ ہوتو دین ودنیا کے تمام کام معطل ومختل ہوجائیں۔

قلم کی تین قسمیں:

پہلا قلم وہ ہے جس کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے فرما کر اس سے تقدیر کائنات لکھوائی۔ دوسرا فرشتوں کا قلم ہے جس سے وہ اقعات ومقادیر واعمال لکھتے ہیں۔ تیسرا انسانوں کا قلم ہے۔ تفصیل ہم سورۂ قلم میں لکھ چکے ہیں۔ امام تفسیر حضرت مجاہد نے ابوعمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دستِ قدرت سے بنائی ہیں۔ ان کے سوا باقی مخلوقات امرِ کُن سے پیدا کیں۔ وہ چار چیزیں قلم، عرش، جنت عدن اور آدم علیہ السلام ہیں۔

علم کتابت دُنیا میں سب سے پہلے کس کو دیا گیا؟

بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے فنِ کتابت ابوالبشر آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا۔ (کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ) بعض نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے۔ اور سب سے پہلے کاتب دنیا میں وہی تھے (ضحاک رحمۃ اللہ علیہ) بعض کہتے ہیں کہ جو بھی کتابت کرتا ہے وہ تعلیم منجانب اللہ ہے۔

کتابت ووحی میں کمالِ مُناسبت ہے:

تعلیم قلم کا سلسلہ اس طرح ہے کہ اول معنی ذہن میں متعین ہوتے ہیں۔ پھر قوتِ خیالیہ ان کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہے۔ اس کے بعد قلم کے ذریعہ وہ نقوشِ خطیہ کی صورت میں کاغذ پر ظہور کرتے ہیں۔ پھر پڑھنے والا ان کو معلوم کرتا اور سمجھتا ہے۔ سلسلہ وحی بھی اسی طرح سے ہے۔ کہ اول کلامِ نفسی اشکال والفاظ سے مبرا تھا۔ پھر لوحِ محفوظ میں الفاظ کی صورت اختیار کی۔ پھر بواسطہ جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صفحۂ خیال میں منقش ہوا۔ پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ فیض ترجمان سے ہر خاص وعام کو پہنچا، اور انہوں نے اس کو سمجھا۔ لہٰذا نعمت قلم کو امکان وحی ربانی کے اثبات میں دلیل بنایا جاسکتا ہے۔ شاید تعلیم بالقلم کو اس موقع پر ذکر کرنے میں یہ حکمت بھی مضمر ہو۔ واللہ اعلم۔

نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم کتابت کیوں نہ دی گئی؟

حق جل مجدہٗ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس کو لوگوں کے فکر وقیاس سے بالاتر بنانے کے لئے اول سے اخیر تک آپ کے ایسے حالات بنائے تھے کہ جن میں کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش ومحنت سے کوئی کمال حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ جائے پیدائش کے لئے صحرائے عرب تجویز ہوا۔ جو متمدن دنیا اور علم وحکمت کے گہواروں سے بالکل کٹا ہوا تھا۔ اور راستے اور مواصلات اتنے دشوار گزار تھے کہ شام، عراق اور مصر وغیرہ کے متمدن شہروں سے یہاں کے لوگوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ اس لئے اہل عرب سب کے سب امیین کہلاتے تھے۔ ایسے ملک اور ایسے قبائل میں آپ پیدا ہوئے۔ اور پھر حق تعالیٰ نے ایسے سامان واسباب فراہم کئے کہ عرب کے لوگوں میں جو خال خال علم وخط وکتابت سیکھ لیتا تھا۔ آپ کو اس کے سیکھنے کا بھی موقع نہ دیا گیا۔ ان حالات میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والے انسان سے علم وحکمت اور اخلاقِ فاضلہ عالیہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کو اسی ماحول میں رکھ کر حق تعالیٰ نے اخلاق معلّٰی پر تربیت دی۔ اور خلعتِ نبوت ورسالت سے سرفراز فرما کر علم وحکمت وتربیت کا ایک غیر منقطع سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے جاری فرمادیا۔ آپ نے وہ کلامِ بلاغت نظام پیش فرمایا کہ اس کی فصاحت وبلاغت کے سامنے عرب کے بڑے بڑے فصحاء، بلغاء، شعراء، اور زبان آوردم بخود اور عاجز وسرنگوں ہوگئے۔ یہ ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ تھا کہ کوئی ادنیٰ عقل والا انسان بھی یہ یقین کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے کمالات کسی سعی وعمل کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ غیبی عطیات ہیں جس ذاتِ گرامی نے کسی معلم وادیب، شاعر وکاتب کے سامنے ایک مرتبہ بھی زانوئے ادب تہہ نہ کئے ہوں، چالیس سالہ پاکیزہ زندگی میں علم، شعر وکتابت کا جس ذات میں کوئی تصور بھی نہ ہوسکتا ہو وہ ایک بیک ایسا علم وحکمت، فصاحت وبلاغت سے لبریز کلام قوم کے سامنے پیش کردے یہ ایک نبوی معجزہ کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ آپ کی علم کتابت نہ سکھانے میں یہ عظیم حکمت پوشیدہ تھی۔

یَاخَاتَمَ الرُّسُلِ الْمُبَارَکِ صِنْوَۃً. صَلّٰی عَلَیْکَ مُنَزِّلُ الْقُرْاٰن

تعلیم کے اور بھی بہت سے ذریعے ہیں:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ اس سے پہلی آیت میں تعلیم کے ایک خاص ذریعہ کا ذکر تھا۔ جو عام طور پر تعلیم کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی قلم کے ذریعہ تعلیم، اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اصل تعلیم دینے والا تو حق سبحانہٗ وتعالیٰ ہے۔ وہی مؤثر بالذات ہے۔ اگر وہ تعلیم نہ دینا چاہے تو قلم بھی اس کے حق میں بے سود ہے۔ اور وہ تعلیم دینا چاہے تو تعلیم دینے

میں اس مسبب الاسباب ومعلم حقیقی کو قلم کی حاجت نہیں۔ وہ بغیر کسی سبب ظاہری کے بھی تعلیم سے سکتا ہے۔ اور قلم کے علاوہ دوسرے اسباب اور ذریعوں سے بھی دے سکتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ ناواقف تھا۔ آیت میں قلم یا کسی دوسرے ذریعہ تعلیم کا ذکر نہ فرمانے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی یہ تعلیم انسان کی ابتدائے آفرنیش سے جاری ہے۔ اول اس میں عقل پیدا کی۔ جو سب سے بڑا ذریعہ علم ہے۔ انسان اپنی عقل سے خود بغیر کسی تعلیم کے بہت سی چیزیں سمجھتا ہے پھر اس کے پس وپیش میں اپنی قدرت کاملہ کے ایسے مناظر ودلائل قدرت نے رکھ دیئے ہیں کہ جن کا مشاہدہ کر کے وہ اپنی عقل کے ذریعہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان سکتا ہے۔ پھر وحی والہام کے ذریعہ بہت سی چیزوں کا علم انسان کو دیا۔ اور کتنی چیزوں کا علم انسان کے ذہن میں بلا کسی واسطہ کے خود بخود پیدا فرما دیا۔ ایک بے شعور بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد اپنے مرکز غذا یعنی ماں کی چھاتیوں کو پہچان لیتا ہے۔ پھر ان سے دُودھ حاصل کرنیکا طریقہ بھی خود ہی جان لیتا ہے۔ یہ اس کو کون سکھا سکتا تھا۔ کہ چھاتیوں کو دبا کر اس ترکیب سے دُودھ چوس کر دبا کر اس ترکیب سے دُودھ چوس کر نگل لے۔ یہ معلم حقیقی کی قدرتی تعلیم ہی کا کرشمہ ہے پھر رونے کا ہنر اس کو قدرت نے ولادت کے ساتھ ہی سکھا دیا۔ بچہ کا یہ رونا اس کی تمام ضروریات کے پورا ہونیکا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کو روتا ہوا دیکھ کر ماں باپ اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اس کو کیا تکلیف یا کیا ضرورت ہے۔ اس کی بھوک، پیاس، سردی، گرمی وغیرہ کی تمام ضروریات اس رونے ہی سے پوری ہوتی ہیں۔ یہ رونے کی تعلیم قدرت کے سوا بچہ کو کون دے سکتا تھا۔ اور کس طرح دے سکتا تھا۔ اس قسم کے تمام علوم وہی ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار خصوصاً حضرتِ انسان کے ذہن میں بغیر کسی ذریعہ کے اپنی قدرت سے پیدا فرما دیئے ہیں۔ اس کے بعد پھر زبانی تعلیم، قلبی تعلیم وغیرہ کے ذریعہ ان علوم وہبیہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى.

یہاں مَا لَمْ يَعْلَمْ (جس کو وہ جانتا تھا) کی قید کی بہ ظاہر ضرورت نہ تھی کیونکہ تعلیم تو اسی چیز کی ہوتی ہے جس کو انسان نہیں جانتا۔ یہ قید اس وجہ سے بڑھائی کہ خُداداد علم وہنر کو انسان اپنا ذاتی کمال نہ سمجھ بیٹھے۔ مَا لَمْ يَعْلَمْ سے تنبیہ کر دی کہ ہر انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے جب وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا (اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے) معلوم ہوا کہ انسان کو جو بھی علم وہنر ملا ہے وہ اس کا اپنا ذاتی کمال نہیں۔ سب خالق ومالک ہی کا عطیہ ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو تعلیم دی گئی۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کی ذاتِ گرامی میں تمام انبیائے سابقین کے علوم اور لوح وقلم کے علوم موجود ہیں ۔

فان من جودِک الدنیا وما فیها ومن علومک علم اللوح والقلم

یعنی دنیا وما فیہا آپ کی سخاوت کا ایک جزء ہے۔ اور لوح وقلم کا علم آپ کے علم کا ایک حصہ ہے

انسان کا علم لوحِ محفوظ سے بھی زائد ہے:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ کو بالقلم کی قید سے مقید نہیں فرمایا اور مفعول بہ اَلْاِنْسَانَ کو ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلے جملہ میں مفعول بہ کو ذکر نہیں کیا۔ اور بِالْقَلَمِ کی قید کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے اشارۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا علم اور

کائنات سے زائد ہے کیونکہ پہلے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور دوسری مخلوق (ملائکہ وغیرہ) سب کو قلم کے ذریعہ سے علم دیا ہے۔ اور قلم سے دیا ہوا علم تمام کا مام لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ کوئی چھوٹی بڑی، خشک وتر چیز ایسی نہیں جو لوحِ محفوظ میں درج نہ ہو۔ لیکن انسان کو دیا ہوا علم مکتوب لوح محفوظ کے علاوہ بھی ہے حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ اگر علم آدم صرف وہی تھا جو لوحِ محفوظ میں مکتوب ہے تو فرشتے جواب کیوں نہ دے سکے۔ اور ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا﴾ کے ساتھ معذرت کیوں کی؟ پھر اللہ تعالیٰ کا علم حضوری قدیم ہے۔ حصولی نہیں، کہ لوحِ محفوظ اس کو محیط ہو سکے۔ اور قلم اس کو لکھ سکے۔ (مظہری) یہاں تک سورۂ اقرأ کی وہ پانچ آیات تھیں جو سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آیات کافی عرصہ کے بعد نازل ہوئیں ہیں۔ کیونکہ باقی آیات اخیر سورۃ تک ابوجہل کے ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں۔ اور ابتدائے وحی ونبوت کے وقت مکہ میں کوئی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف نہ تھا۔ اہل مکہ آپ کو صادق اور امین جیسے القاب سے پکارتے اور آپ سے محبت وتعظیم کا برتاؤ کرتے تھے۔ ابوجہل کی مخالفت دشمنی خصوصاً نماز سے روکنے کا واقعہ جو آگے آنے والی آیات میں مذکور ہے ظاہر ہے کہ اس وقت کا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت ودعوت کا اعلان فرمادیا تھا۔ اور شب معراج میں آپ کو نماز کا حکم ہو چکا تھا۔

انسان کی سرکشی:

ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت بیان کی کہ ابوجہل نے لوگوں سے کہا کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری موجودگی میں خاک پر چہرہ رگڑتا (سجدہ کرتا) ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں ابوجہل بولا لات وعزیٰ کی قسم اگر میں نے اس کو ایسا کرتے دیکھ لیا تو پاؤں سے اس کی گردن رونڈ ڈالوں گا۔ اور اس کے منہ کو مٹی میں رگڑ دوں گا۔ اس پر كَلَّا سے اخیر تک آیات نازل ہوئیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوجہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے سے روکا اور کہا کہ آئندہ اگر نماز پڑھیں گے تو ایسا ایسا کردوں گا یعنی اوپر ذکر کی ہوئی دھمکی دی تھی۔

كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اس آیت کا روئے سخن اگرچہ خاص شخص یعنی ابوجہل کی طرف ہے۔ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کی تھی۔ مگر عنوان عام ہے۔ جس میں عام انسانوں کی ایک کمزوری بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ انسان جب تک دوسروں کا محتاج رہتا ہے تو وہ سیدھا چلتا ہے۔ اور جب اس کو یہ گمان ہو جائے کہ میں کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ اور میں سب سے بے نیاز ہوں تو اس میں سرکشی اور ظلم وجور کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ عموماً اہل دولت، ارباب حکوم اور اصحاب شوکت وکثرت میں اس کا بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے تمول واقتدار اور جتھے کی طاقت میں مست ہو کر کسی کو نظر میں نہیں لاتے۔ چونکہ ابوجہل کا بھی یہی حال تھا کہ وہ مکہ کے خوشحال لوگوں میں سے تھا۔ اور اکثر لوگ اس کی تعظیم کرتے۔ اور اس کی بات مانتے تھے وہ بھی اسی پندار میں مبتلا ہوا۔ یہاں تک کہ سید الانبیاء اشرف الخلائق صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی میں گستاخی کر بیٹھا۔ اگلی آیات میں ایسے سرکشوں کے انجام بد پر تنبیہ ہے۔

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى اس کے معنی یہ ہیں کہ سب کو اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور اپنے اچھے بُرے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس وقت سرکش اپنی سرکشی کا مزہ چکھ لیگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ طاغی اور سرکش انسان کو خطاب کیا گیا ہو۔ اور کلام میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات ہو۔ اور الرجعی میں الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہو۔ ای

رجعاک مطلب یہ ہے کہ او سرکش ظالم تجھ کو اپنے رب کے پاس جا کر اس کی بارگاہ میں حساب دینا پڑیگا یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ میں مغرور انسان کے غرور کا علاج بتایا گیا ہو۔ کہ اے احمق تو خود کو مستغنی و خود مختار سمجھتا ہے۔ اگر تو غور کرے تو تو اپنی ہر حالت اور ہر حرکت وسکون میں اپنے رب تعالیٰ کا محتاج ہے۔ اگر اس نے تجھے بظاہر کسی انسان کا محتاج نہیں بنایا تو کم از کم اس پر تو غور کرلے کہ اپنے مالک کا تو تو ہر وقت ہر چیز میں محتاج ہے، اور انسانوں کی محتاجی سے بھی خود کو بے نیاز سمجھنا ایک مغالطہ ہی ہے۔ کیونکہ ہر انسان مدنی الطبع اور ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ وہ اکیلا اپنی کسی ایک ضرورت کو بھی پورا نہیں کرسکتا۔ اگر انسان اپنے ایک لقمہ ہی میں غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ وہ ہزاروں انسانوں، حیوانوں اور دوسری مخلوقات کے عمل اور مدت دراز تک کام میں لگے رہنے کا نتیجہ ہے جس وہ نہایت بے فکری کے ساتھ حلق سے اتار لیتا ہے۔ اور ہزار ہا انسانوں کو اپنی خدمت میں لگالینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہی حال اس کے لباس اور دوسری تمام ضروریات کا ہے کہ ان کے مہیا کرنے میں ہزاروں لاکھوں انسانوں اور جانوروں کی محنت کا دخل ہے۔ جو نہ کسی انسان کے غلام ہیں اور نہ نوکر، مگر ایک نظام قدرت ہے کہ ہر انسان وحیوان اس قدرتی نظام کی لڑی میں منسلک ہے ان باتوں میں غور وفکر سے انسان پر یہ راز کھلتا ہے کی میری تمام ضروریات مہیا کرنے کے لئے خالق کائنات نے ایک عجیب وغریب نظام اپنی قدرت کاملہ وحکمتِ بالغہ سے بنایا اور چلایا ہے۔ کسی کو کاشت میں لگایا، کسی کو کاشت کے آلات تیار کرنے کے لئے نجار وآہنگر بنایا۔ کسی کو محنت ومزدوری پر راضی کردیا۔ کسی کو صنعت وتجارت پر راغب کردیا وغیرہ، نہ کوئی حکومت قانون کے ذریعہ اس کا نظم کرسکتی ہے۔ نہ کوئی جماعت یا فرد۔ اس لئے اس غور وفکر کا لازمی نتیجہ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی ہے۔ یعنی انجام کار سب چیزوں کا حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے تابع ہونا مشاہدہ میں آجاتا ہے۔ غرور وخود فریبی کی جڑیں کٹ کر قلب میں حق تعالیٰ کی عظمت ومعرفت جاگزیں ہوجاتی ہے۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی سے سرکش انسان کی سرکشی کی مثال ہے۔ ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوجہل نے نماز سے روکا تھا۔ اس سلسلہ میں یہاں سے خاطِئَۃ تک آیات کا نزول ہوا تھا۔ اور دوسرے مفسرین کی تحقیق اوپر مذکور ہوئی۔ اَرَءَیْتَ میں ہمزہ استفہام تقریری کے لئے (قد کے معنی میں) ہے۔ اور مقصود اقرارِ مخاطب ہے۔ اور خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ یا استفہام برائے تعجب ہے۔ بمعنی اَخْبِرْنِی۔ اور رویت سے مراد رویتِ قلبی ہے۔ ایک مفعول اَلَّذِی سے صلّٰی تک ہے اور دوسرا محذوف ہے ای کَیفَ یَطغٰی۔ ینھٰی سے مراد ابوجہل ہے۔ اور عبداً سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اَرَءَیْتَ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے عَبْدًا اِذَا صَلّٰی بصورتِ غائب ہے۔ یعنی خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے۔ اس طرح تعبیر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپ کی کمالِ عبودیت کی صراحت ہے۔ آپ کا برحق ہونا اور کمالِ عبودیت سے متصف ہونا اور روکنے والے کا طغیان یہ امور اس سے واضح ہو رہے ہیں۔

عبادت سے منع کرنا ظلم وسرکشی:

اس سے واضح ہوا کہ عبادت سے روکنا جرم عظیم ہے، کیونکہ بندہ پر حق ہے کہ وہ اپنے قلب وقالب، زبان اور دھیان سے حق تعالیٰ کی عبادت کرے۔ اور ایسی جامع عبادت جو انسان کے ظاہر وباطن پر حاوی ہو نماز ہے۔ اور اللہ جل

شانہٗ کا حق ہے کہ وہ بہر حال معبود رہے۔ اور بندوں پر نظر کرم فرمائے۔ لہٰذا جو شخص نماز سے روکتا ہے وہ عبد و معبود دونوں کی حق تلفی کرتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر سرکشی و ظلم اور کیا ہوگا؟ یہ آیت گو ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ لیکن جو بھی ایسا کریگا وہ بھی ظالم و سرکش اور ابوجہل کی طرح مجرم قرار پائیگا۔

بعض اوقات نماز سے منع کیا جائیگا:

بعض موقعوں پر شریعت ہی نے نماز سے منع کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً اوقاتِ مکروہہ میں نماز سے روکنا ضروری ہے۔ اوقاتِ مکروہہ پانچ ہیں۔ صبح صادق سے لیکر شمس تک۔ (۲) عصر کے فرض پڑھ لینے کے بعد مغرب تک۔ ان دونوں وقتوں میں نوافل ممنوع ہیں۔ (۳) طلوع آفتاب کے وقت (۴) استواء کے وقت (۵) غروب کے وقت۔ ان تینوں اوقات میں فرائض نوافل اور صلوٰۃ جنازہ و سجدۂ تلاوت ممنوع ہیں۔ البتہ اس دن کی نماز عصر میں اگر دیر ہوگئی ہے تو غروب کے وقت بھی ادا کر لینی چاہیے۔ اسی طرح مغصوبہ زمین میں نماز سے منع کیا جائیگا۔

غلام یا باندی کو آقا نوافل اور تہجد سے منع کرسکتا ہے۔ تا کہ وہ خدمت میں کوتاہی نہ کریں۔ شوہر بیوی کو اپنی خدمت کی وجہ سے نوافل و اعتکاف، اسی طرح نفلی روزوں سے منع کرسکتا ہے۔ یہ منع درحقیقت نماز سے منع کرنے میں داخل نہیں۔ کیونکہ یہ ایک عبادت سے روک کر دوسری عبادت میں لگا دینا، بلکہ نوافل سے روک کر فرائض کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ یا شریعتِ مطہرہ کے حکم کی وجہ سے روکنا ہے نہ کہ سرکشی کی وجہ سے۔ اور اصل قابل مذمت منع وہی ہے جس کا منشأ سرکشی ہے۔

جائز منع میں بھی ادب ملحوظ رہے:

ممنوع اوقات اور مکروہ مواقع پر بھی نماز کو منع کیا جائے تو ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً یہ نہ کہے کہ نماز نہ پڑھو۔ بلکہ حکم بیان کر دیا جائے کہ اس وقت نماز ممنوع ہے۔ یا یہ وقت نماز کا نہیں وغیرہ۔ ایسے الفاظ مذکور ہوں کہ صراحۃً نماز سے نہی نہ ہو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار نمازِ عید سے قبل لوگوں کو نوافل میں مشغول پایا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں سے یہ کہدو کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازِ عید سے پہلے عیدگاہ میں کبھی نوافل پڑھتے نہیں دیکھا۔ لوگوں نے یہ بات نہ سُنی اور نوافل پڑھتے رہے۔ عرض کیا گیا اے امیر المؤمنین حکم فرمائیں تو ان کو زبردستی روک دیا جائے۔ فرمایا میں اس آیت اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی کے مضمون سے ڈرتا ہوں۔ اور نماز سے منع کرنے میں سختی مناسب نہیں سمجھتا ہوں۔ لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کا تقاضا یہ ہے کہ ادب ملحوظ رکھتے ہوئے لوگوں کو ممنوعات سے حتی المقدور روکا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادب ملحوظ رکھا، اور اس وقت نوافل کی صراحۃً نہی وارد نہ ہونے کی وجہ سے منع میں سختی بھی نہ فرمائی۔

اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگر وہ بندہ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے میں ہدایت پر ہو۔ یا پرہیزگاری کی دعوت دینے میں حق پر ہو تو ان خیر کے کاموں سے روکنے والے کا انجام کیا ہوگا۔ یقیناً وہ تباہ و برباد ہو جائیگا۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوجہل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اور دعوت دونوں چیزوں سے روکا تھا۔ لیکن اس سے پہلی آیت میں صرف نماز سے روکنے کا ذکر ہے۔ کیونکہ آیات کا

نزول نماز سے روکنے ہی کے واقعہ پر ہوا۔ یوں تو ابوجہل اور دوسرے کفار دعوت توحید سے بھی روکتے ہی تھے۔ اسی لئے اس دوسری آیت میں امر بالتقویٰ کا تذکرہ بھی کردیا گیا۔ پھر نھی العبد سے مُراد عام ہے۔ یعنی ہر خیر سے روکنا اس میں داخل ہے لیکن اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی حالات انہیں دونوں چیزوں (نماز دعوت) پر منحصر تھے۔ تکمیلِ نفس کے لئے نماز اور دوسروں کی تکمیل کے لئے دعوت وتبلیغ، اسلئے یہاں انہیں دونوں چیزوں کا ذکر فرمایا گیا۔

آیت کی دوسری تفسیر:

تفسیر سابق تو اس پر مبنی ہے کہ کان کا اسم عبد کی ضمیر کو مانا جائے۔ لیکن اگرناہی یعنی ابوجہل کو کان کی ضمیر کا مرجع مانا جائے تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر یہ سرکش اپنی سرکشی کا علاج کرلیتا، ہدایت پرآ جاتا۔ اور دوسروں کو بھی نصیحت کرکے تقویٰ وپرہیزگاری کی دعوت دیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ بہر دوصورت لفظ او منع خلو کے لئے ہے۔ انفصالِ حقیقی یا منع جمع کے لئے نہیں ہے۔ جیسے جَالِسِ الْحَسَنَ اَوِابْنَ سِیْرِیْنَ میں ہے اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی اس جملہ میں ان مخففہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور اسم ضمیر شان ہوگی۔ ای اِنَّهٗ اور ان شرطیہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور جزاء جملہ اَلَمْ یَعْلَمْ ہوگا۔ یا جزا محذوف ہوگی مطلب یہ ہے کہ اگر اس بدنصیب سرکش نے تصدیق کے بجائے آپ کو جھٹلا دیا۔ اور حق سے منہ موڑلیا۔ تو کیا اس کو معلوم نہیں کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اس کو اس کی سزا دیگا۔ یا وہ عذابِ خداوندی سے کس طرح بچیگا۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ہمزہ اس میں استفہام انکاری کے لئے ہے۔ اور یَعْلَمْ کی ضمیر کا مرجع اَلَّذِیْ یَنْهٰی ہے یعنی اس روکنے والے کو معلوم ہے کہ اللہ اس کی شرارتوں کو دیکھ رہا ہے۔ اور اس کو سزا کا بھی یقین ہے۔ اول تو اس لئے کہ اللہ کی قدرت اور اسکے سمیع وبصیر ہونے پر دلائل آفاقی ونفسی بیشمار قائم ہیں۔ دوسرے ابوجہل بھی تنہائیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا کہتا اور کہتا وَاللّٰهِ اِنَّ مُحمداً لَّصَادِق محض ضد وعناد کی وجہ سے تکذیب کرتا تھا۔ پہلے جملہ شرطیہ کی جزا محذوف ہے اور یہ جملہ اَلَمْ یَعْلَمْ الخ دوسرے جملہ شرطیہ کی جزا ہے۔ اور تیسرے کی محذوف ہے۔ یا یہ تیسرے شرطیہ کی جزا ہے۔ اور دوسرے کی جزا یہی جملہ محذوف ہے، یا اس کے برعکس ہے۔ مفسرین نے اس میں مختلف احتمالات بیان کئے ہیں۔

اسی طرح لفظ اَرَءَیْتَ یہاں تین جگہ آیا ہے۔ تینوں میں مخاطب عام ہے۔ یعنی جو شخص بھی یہ کلام سنے۔ یا تینوں میں مخاطب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یا اول وثالث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں اور ثانی میں ابوجہل۔ ہر احتمال کے مناسب آیات کے معانی ہوں گے۔ اور ان خطابات میں التفات حاکمانہ انداز کے ہیں۔ کہ حاکم کسی معاملہ میں کبھی کسی کو مخاطب بناتا ہے کبھی کسی کو۔ اور اَرَءَیْتَ کو تین بار لانا انتہائی تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔ اور حق تعالیٰ تعجب سے بری ہیں۔ تعجب صرف مخاطب کے اعتبار سے ہے۔ واللہ اعلم۔

کلا یعنی وہ ہرگز نماز سے نہ روکے۔ یا ہرگز ایسا نہیں کہ اس سرکش کو یونہی چھوڑ دیا جائیگا۔ اور انکے دنیوی مرتبہ وعزت کے لحاظ سے اس کو سزا نہ دی جائیگی۔ لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ اگر وہ اپنی دھمکی اور شرارت وسرکشی اور تکذیب وبے رُخی سے باز نہ آیا لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِیَةِ تو ہم اسکی چٹیا (پیشانی کے بال) پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ نَاصِیَةٍ کَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ایسی پیشانی جو جھوٹی اور خطاکار پیشانی ہے سفع کے معنی جس طرح گھسیٹنے کے ہیں۔ سیاہی کے بھی آتے ہیں۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم اس کو سیاہ کردیں گے۔

پیشانی پکڑ کر گھسیٹنے کا مطلب:

پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹنے کو اس لئے خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ (۱) جس کی پیشانی (سر) کے بال قبضہ میں آ جاتے ہیں وہ مجبور و مقہور ہو جاتا ہے۔ (۲) پیشانی اشرا الاعضاء ہے، اس کو پکڑ کر گھسیٹنے میں انتہائی توہین و حقارت ہے (۳) غرور و کبر کا مصدر و مرکز سر ہی ہے۔ کیونکہ غرور و ہم وخیال اور حواسِ خمسہ ظاہرہ (باصرہ، سامعہ، لامسہ، ذائقہ اور شامہ) سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سب قوتیں سر میں موجود ہیں۔ تو منشائے کبر و غرور جب سر ہوا تو سزا بھی اسی مقام کو دی گئی۔ جیسے چور ہاتھ سے چوری کرتا ہے تو اس کی سزا بھی ہاتھ کاٹنا ہی ہے (۴) بننے سنور نے کا تعلق بھی بیشتر سر اور اس کے قریبی اعضاء سے ہے۔ مثلاً سر میں تیل لگانا، کنگھی کرنا، عمامہ باندھنا، آنکھوں میں سُرمہ لگانا، چہرہ کو صاف اور مزین کرنا وغیرہ، تو پیشانی کے بال پکڑ کر اس کو خاک میں آلودہ کرنا۔ اس کے مناسب سزا اور گویا علاج بالضد کے قبیل سے ہے۔

خاطی اور مخطی میں فرق:

خاطی وہ شخص ہے جو قصداً ضد و عناد کے جذبہ سے گناہ کرتا ہے۔ اس کا گناہ ناقابل معافی ہوتا ہے۔ اور مخطی وہ ہے کہ اس سے نادانستہ طور پر یا معمولی غفلت کی وجہ سے غلطی ہوگئی۔ خاطی کے لئے قرآن پاک میں سخت عذاب کی وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً مِنْ غِسْلِيْنٍ لَا يَأْكُلُهُ اِلَّا الْخَاطِئُوْن یعنی غسلین، خاطئین ہی کھائیں گے۔ اور مخطی کے لے معافی کا وعدہ مذکور ہے۔ مثلاً رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا جب یہ آیت نازل ہوئیں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھ کر لوگوں کو سُنائیں۔ تو رفتہ رفتہ ابوجہل تک بھی ان کی خبر پہنچی۔ وہ ملعون نہایت غضبناک ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ اے نادان تجھے معلوم ہے کو تو کس کو ڈراتا ہے؟ اگر میں چاہوں تو ابھی سواروں اور پا پیادوں سے اس میدان کو بھر دوں۔ لیکن اس کی مجھے ضرورت ہی نہیں۔ تجھ کو اور تیری قوم کو تو وہی لوگ کافی ہیں جو میری مجلس میں حاضر رہتے ہیں۔ اگر میں ان کو ابھی بُلا لوں تو حقیقت معلوم ہو جائیگی۔

امام ترمذی وابن جریر رحمۃ اللہ علیہما نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت نقل کی۔ اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل آ گیا اور کہنے لگا کہ میں نے تجھے اس کام سے منع نہیں کر دیا تھا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جھڑک دیا۔ تو وہ بولا تجھے خوب معلوم ہے کہ مکہ میں میری جو پال سے بڑی کسی کی چوپال نہیں ہے۔ (یعنی میں بہت بڑے جتھے والا ہوں) تو مجھے جھڑکتا ہے۔ خدا کی قسم تیرے مقابلہ میں، میں اس وادی کو شہسواروں اور پا پیادوں سے بھر دونگا۔ اس پر مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (وہ اپنی مجلس والوں اور اپنے جتھے کو بلا لے) ہم بھی اپنی دوزخ والی پولیس کو بلا لیتے ہیں) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے کنبے قبیلے والوں کو بلا لیتا تو جہنم کے کارندے علی الاعلان آنکھوں دیکھتے اس کو پکڑ لیتے۔ علامہ محلیؒ نے اس قول کو حدیث مرفوع کہا ہے۔ مسلم ونسائی اور مسند احمد کی روایت ہے کہ پھر ایک بار حسبِ دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبۃ اللہ کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے تو ابوجہل لعین نے دیکھا اور حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ جب قریب آیا تو کسی چیز کو ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا جلدی سے پچھلے پیروں لوٹا۔

لوگوں نے دیکھ کر پوچھا۔ کیا بات ہے کیا آفت ہے؟ پچھلے پیروں کیوں بھاگے۔ تو اس نے کہا کہ میرے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان آگ کی ایک خندق حائل ہوگئی۔ جس میں پروں کی حرکت محسوس ہو رہی ہے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ ابوجہل نے یہ بھی کہا کہ ایک بڑا اژدھا میری طرف لپکا۔ اس سے مجھے بہت دہشت معلوم ہوئی اگر میں ذرا ٹھہر جاتا تو آگ میں جل جاتا۔ یا اژدھا مجھے نگل جاتا۔ لوگوں نے کہا یہ کیا بات؟ اس نے کہا کہ یہ شخص بڑا جادوگر ہے۔ یہ سُن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم اگر وہ آگے بڑھتا تو فرشتے اس کو اُچک لیتے اور تم سب کے سامنے اس کے ٹکڑے کر ڈالتے۔ آخرکار قرآن پاک اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پورا ہوا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب ابوجہل سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنی ء جمعیت کو لیکر نکلا تو اس پر قہر الٰہی نازل ہوا۔ اور اس کا جتھا اور اہل مجلس اس کے کچھ کام نہ آئے کچھ تو مارے گئے کچھ شکست خوردہ ذلیل ہو کر بھاگے اور کچھ گرفتار ہوئے۔ اور یہ نانجار دو بچوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر زمین پر گرا۔ اس کی پرغرور پیشانی خاک آلود ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی گردن کاٹی۔ اور اس کے کان میں سوراخ کر کے رسی باندھی۔ اور گھسیٹتے ہوئے اس ناپاک کنویں کے پاس لائے جس میں کفار کی لاشیں لاکر ڈالی جارہی تھیں۔ اس کی ناپاک، جھوٹی اور خطا کار پیشانی کے بال پکڑ کر اس کو بھی اس کنویں میں ڈالدیا گیا۔ **فلعنۃ اللہ علی اعداء رسول اللہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ.**

زبانیہ کون ہیں؟

زبانیہ بظاہر وہی انیس ۱۹ فرشتے ہیں جن کا ذکر سورۂ مدثر میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد کی لمبائی زمین سے آسمان تک ہے۔ اور ایک کاندھے سے دوسرے کاندھے تک کا فاصلہ ایک سال کی مسافت ہے۔ ان کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکتی ہیں۔ اور دانت بارہ سینگھے کے سینگوں کی طرح مڑے ہوئے ہیں۔ ان کے بال اتنے لمبے ہیں کہ زمین پر گھسٹتے ہیں۔ اور ان کے منہ سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ ان کی ہتھیلیاں اتنی وسیع ہیں کہ ایک ہتھیلی پر ستر ہزار انسان سما سکتے ہیں۔ انکا سردار مالک (داروغہ جہنم) ہے۔ اور باقی اٹھارہ مالک کے تابع ہیں۔ (عزیزی)

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن کو زجر و توبیخ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی و تسکین کے بعد اس بات کی ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اس معاند کی بات نہ مانیں۔ نماز و سجدہ میں مشغول رہیں۔ اور اس طرح حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے رہیں۔ اس آیت میں لفظ کَلَّا بمعنی حقا ہے۔ تو معنی یہ ہیں کہ یقیناً ایسا ہوگا کہ اگر وہ اپنے جتھے کو بلا کر لائے گا تو ہم دوزخ کے جلادوں کو بلالیں گے اور اگر زجر و ردع کے لئے ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ وہ اپنے جتھے کو بلا لائے۔ (سجدہ سے مراد نماز ہے نہ صرف کہ سجدہ۔ یہ تسمیۃ الکل باسم الجزء کے قبیل سے ہے)

سجدے میں دعا کی قبولیت:

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **اقرب مایکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا الدعاء** (بندہ اپنے رب سے قریب ترین سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ لہٰذا سجدہ کی حالت میں خوب دعاء کیا کرو) **فانہٗ قَمِنٌ ان یستجاب لکم** (کیونکہ سجدہ کی حالت دعا قبول ہونے کے لائق ہے)

مسئلہ:......انوافل کے سجدہ میں دعاء کرنا ثابت ہے بعض روایات میں دعاء کے خاص الفاظ بھی آئے وہ ماثورہ الفاظ پڑھے جائیں تو بہتر ہے۔فرائض میں سجدہ کی حالت میں دعاء ثابت نہیں کیونکہ فرائض میں اختصار مطلوب ہے اگر سجدہ میں دعاء کرنی ہوتو نفل نماز پڑھے۔اور سجدہ کی حالت میں ماثورہ دعاء یا بزبان عربی اور کوئی دعاء کرسکتا ہے۔مسئلہ۲:...... اگر سجدہ میں دعاء کرنی ہوتو نفل نماز پڑھے۔اور سجدہ کی حالت میں ماثورہ دعاء یا بزبانَ عربی اور کوئی دعاء کرسکتا ہے۔عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں دُعاء نہ کرے نیز صرف سجدہ کر کے اس میں دعا مانگنا احناف کے نزدیک مکروہ ہے۔

مسئلہ۳:......اس آیت کو پڑھنے اور سُننے والے پر سجدہ تلاوت واجب ہے۔صحیح مسلم میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت پر سجدہٴ تلاوت کرنا ثابت ہے۔

(۱) جس آیت میں لفظ کلاّ آیا ہے وہ یقیناً مکیہ ہے مدنی آیات میں کہیں کلا نہیں آیا، کیونکہ یہ لفظ غضب پر دلالت کرتا ہے، جس کے مستحق کفارِ مکہ تھے نہ کہ مومنین مدینہ۔(۲) لفظ کلا قرآن پاک کے نصفِ اول میں نہیں ہے۔ نصفِ آخر میں خصوصاً اخیر کے چند پاروں میں بہت آیا ہے۔وجہ یہ ہے کہ اول نرمی سے سمجھایا جاتا ہے، اور جب سمجھانے سے سمجھ میں نہ آئے تو جھڑ کنا اور دھمکانا پڑتا ہے۔قرآن کا انداز بھی یہی ہے۔نصف اول میں ہر طرح سمجھایا گیا۔اور اخیر میں کلاّ کے ذریعہ دھمکایا بھی گیا۔

وما نزلت كلّا به بيثرب فاعلمن ولا جاء فی القران فی نصفه الاعلیٰ

(۳) اس سورت کے شروع میں علم کی فضیلت اس کے بعد مال کی مذمت مذکور ہے۔معلوم ہوا کہ علم پسندیدہ اور مال ناپسندیدہ

رضينا قسمة الجبار فينا لنا علمٌ وللجهال مالٌ

فانَّ المال يفنى عن قريب وانّ العلم باق لايزال

(۴) سورہٴ انفطار میں انسان کے اعتدالِ جسمانی اور تسویہٴ اعضائے انسانی کو بیان کرتے ہوئے لف کریم ذکر کیا۔اور یہاں تعلیم کی اہمیت وعلم کی فضیلت کے موقع پر لفظ اکرم مذکور ہوا۔اس سے معلوم ہوا کہ علم نعمت صحت وحسن وجمال سے بڑھ کر ہے۔(۵) ابوجہل کے متعلق استمرار پر دلالت کرنے والا مضارع کا صیغہ جس کے شروع میں لام تاکید بھی ہے (لَيَطْغٰى) لایا گیا۔اور فرعون کے حق میں لفظ طغٰی صیغہ ماضی لایا گیا۔اس فرق وتغییر اسلوب میں اشارہ ہے کہ ابوجہل سرکشی وکبر میں فرعون سے بڑھ کر تھا۔کیونکہ (۱) فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو صرف زبانی اذیت پہنچائی اور اس خبیث نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زبان اور ہاتھ وغیرہ سے ہر طرح ایذائیں پہنچائیں (۳) فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ابتداء میں اچھا سلوک کیا۔پالا پوسا اور اخیر میں ڈوبتے وقت اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآئِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اس کی زبان سے نکلا تھا۔یعنی اس کا تکبر کم ازکم موت کے وقت تو ٹوٹ گیا تھا۔گو بے وقت ٹوٹا۔اور ابوجہل شروع سے آپ سے حسد رکھتا تھا اور مرتے وقت بھی اس کا تکبر کم نہ ہوا۔زخمی ہوکر گرا تو کہا کاش کسان کے لڑکوں کے علاوہ کوئی بہادر مجھے قتل کردیتا۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے سینہ پر سر کاٹنے کے لئے چڑھے تو کہا۔ او بکریوں کے چرواہے!تو بلند مقام پر بیٹھا ہے۔پھر کہا کہ کیا تم لوگوں نے مجھ سے زیادہ بلند مرتبہ آدمی کو قتل کیا ہے؟غرض اس کا غرور مرتے دم تک کم نہ ہوا۔فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ . اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ

تم تفسیر سورة العلق فالحمدُللّٰہ رب الفلق الذی خلق الانسان من علق وعلمه مالم یعلم وشرفه وکرمه وصلی اللّٰہ علیه وسلم ربناالاکرم علیٰ حبیبه سید ولدادمَ محمد النبی الاعظم وعلیٰ اٰله واصحابه وسلَّمَ عَدَدَ مایُحب ذوالعرش واللوح والقلم

سُوْرَۃُالْقَدْرِ

سُوْرَۃُالْقَدْرِمَکِّیَّۃٌوَّھِیَ خَمْسُ اٰیَاتٍ

(حروف۱۱۲۔کلمات۳۰) سورۃالقدر مکہ میں نازل ہوئی اوراس میں پانچ آیات ہیں۔ (آیات:۵،رکوع:۱)

اس میں علماء کااختلاف ہے کہ یہ سورت مکیہ ہے یامدنیہ۔امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اکثر علماء کے نزدیک یہ سورت مکیہ ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما،حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی یہی منقول ہے۔علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اتقان میں لکھا ہے کہ اس سورت کے بارے میں دو قول ہیں۔لیکن اکثر علماء اس پر متفق ہیں کہ یہ سورت مکیہ ہے امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ اور واقدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ سورت مدنیہ ہے۔اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی تھی۔شانِ نزول کی روایت میں بنی اسرائیل اور منبر کا ذکر آتا ہے جو اس کے مدنیہ ہونے کے قرینے ہیں۔اسی لیے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

ربط مناسبت

سابقہ سورت سے اس کا ربط یہ ہے کہ (۱) اس میں قرأت قرآن کا امر تھا۔اوراس سورت میں اس کی علت اور وجہ کو بیان کیا گیا ہے گویا کہ یہ فرمایا گیا **اِقرا القرا ٰن لان قدرهٗ عظیمٌ وشانهٗ فخیمٌ.** چنانچہ خطابی نے اِنَّآاَنۡزَلۡنٰهُ کی ضمیر (ہٗ) کا مرجع اِقرأ کے مفعول بہ محذوف (القرآن) کو قرار دیا ہے۔جو سابقہ سورت میں گزر چکا۔اوراسی لئے سورۂ قدر کو سورہ علق کے بعد رکھا گیا ہے۔اور قاضی ابوبکر بن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے خطابی کی اس توجیہ کو پسند فرماتے ہوئے یہ کہا **ھٰذابدیع جداً** (یہ بات بہت عجیب اور عمدہ ہے) **ولکنه خلاف الظاهر فافهم** (۲) سورۂ علق میں پہلی وحی مذکور ہے۔اور مخالفین وحی پر سرزنش اور وعید وعتاب ہے۔اس سورت میں پورے قرآن کے نازل کرنیکا ذکر اور موافقین پر عنایات اور اُن کے ثواب کا بیان ہے (۳) اس میں عالم دنیا کی طرف نزولِ قرآن کا ذکر ہے۔تو اس میں لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا (بیت العزۃ) کی طرف نزولِ قرآن کا ذکر ہے۔(۴) سورۂ اقرأ میں انسان پر عنایات اور اسکے لئے ترقیات کا پھر اس کی سرکشی اور سرکشی کی سزا کا ذکر ہے اس سورت میں اطاعت شعاروں کے لئے مزید عنایات وترقیات کا بیان ہے۔اول یہ کہ انسان کی تہذیب وسعادتِ ابدی کے لئے قرآن نازل کیا گیا۔دوسرے لیلۃ القدر مرحمت فرمائی۔کہ سال بھر میں ایک بار وفاداروں کو شاہانہ عنایات اور خسروانہ انعامات سے نوازا جائے۔اور **امت محمدیه علیٰ رسولها الصلوة والسلام** کو اس ایک ہی رات میں وہ لازوال دولتیں میسّر آجائیں کہ ہزار مہینوں کی کوششوں سے بھی کسی کو نہ حاصل ہوسکیں۔

شانِ نزول:

ترمذی، حاکم، اور ابن جریر نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ بنی امیہ کے ظالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر بندروں کی طرح کود رہے ہیں۔ آپ کو اس خواب سے صدمہ ہوتو آپ کی تشفی کے لئے سورۂ کوثر اور سورۃ القدر نازل ہوئی۔ روایت کی روشنی میں مطلب یہ ہوا کہ بنی امیہ کی ہزار ماہ حکومت سے ایک شب قدر بہتر ہے۔ قاسم بن الفضل ہمدانی نے کہا کہ ہم نے بنی امیہ کی حکومت کا زمانہ شمار کیا تو پورے ہزار مہینے ہوئے۔ لیکن امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو غریب اور امام مزنی وحافظ ابن کثیر نے اس کو بہت منکر قرار دیا ہے۔ (۲) ابن ابی حاتم نے مجاہد سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک مجاہد کا ذکر فرمایا جو مسلسل ایک ہزار ماہ تک جہاد میں مشغول رہا۔ اور کبھی ہتھیار نہیں اُتارے۔ مسلمانوں کو یہ بات سنکر تعجب ہوا۔ اس پر سورۃ قدر نازل ہوئی جس میں امت کے لئے صرف ایک رات کی عبادت کو اس مجاہد بنی اسرائیل کی عمر بھر یعنی ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر قرار دیا ہے۔

(۳) ابن جریر نے مجاہد سے ایک دوسرا واقعہ یہ ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا کہ وہ ساری رات عبادت میں مشغول رہتا۔ اور صبح سے شام تک جہاد کرتا۔ اس نے ایک ہزار مہینہ تک مسلسل یہ عمل کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ القدر نازل فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جو افسوس اور غم اس کا ہوا تھا کہ ہماری عمریں اتنی کہاں ہیں جو ہم اتنی عبادت کرسکیں۔ تو اس سورت کے ذریعہ ان کو تسلی وتشفی بھی دیدی گئی۔ اور امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بھی تمام امتوں پر ثابت فرمادی گئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شبِ قدر امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

(۴) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں لکھا ہے کہ میں نے ایک معتبر عالم سے یہ بات سُنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی عمریں چونکہ تھوڑی ہیں اس لئے اس کے اعمال دوسری امتوں کے اعمال کے برابر تو نہیں ہوسکتے تھے۔ کیونکہ ان کی عمریں زیادہ تھیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ قدر عطا ہوئی۔ جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دن اُن کی امت کی عمریں دکھلائی گئیں کہ ساٹھ ستر برس کی ہیں۔ آپ کو صدمہ ہوا کہ میری امت کی عمریں پہلی امتوں کے مقابلہ میں تھوڑی ہیں۔ پہلی امتیں اعمال اور ثواب میں بڑھ جائیں گی۔ اور میری امت شرمندہ ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے یہ سورۂ قدر نازل فرمائی۔

(۵) ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے چار حضرات حضرت ایوب، حضرت زکریا، حضرت حزقیل، حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ کہ یہ حضرات ۸۰۔۸۰ سال تک عبادت میں مشغول رہے۔ اور پل جھپکنے کی مقدار بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی اس پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حیرت ہوئی۔ تو حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضرِ خدمت ہوئے اور سورۃ القدر سُنائی۔ اس سورت کے سبب نزول میں اس قسم کی مختلف روایات ہیں۔ اختلاف روایات کی اکثر وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی زمانہ میں مختلف واقعات کے بعد جب کوئی آیت! سورت نازل ہوتی ہے تو اس کی ہر واقعہ کی طرف نسبت کردی جاتی ہے۔ بہر حال سببِ نزول کچھ بھی ہوا ہو۔ لیکن امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ اللہ جل شانہٗ کا بہت ہی بڑا انعام ہے۔

فضیلت سورۃ القدر:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سورۃ القدر ایک چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ یعنی اسکے پڑھنے سے چوتھائی قرآن پاک پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔ (روح المعانی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

اِنَّـآ اَنزَلنٰهُ فِی لَیلَةِ القَدرِ (۱) وَمَآ اَدرٰكَ مَا لَیلَةُ القَدرِ (۲) لَیلَةُ القَدرِ خَیرٌ مِّنْ اَلفِ شَهرٍ (۳)

بیشک ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کیسی ہے شب قدر؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے

اِنَّآ	اَنزَلنٰهُ	فِی	لَیلَةِ	القَدرِ	وَ	مَآ	اَدرٰكَ	مَا	لَیلَةُ	القَدرِ	لَیلَةُ	القَدرِ	خَیرٌ	مِنْ	اَلف	شَهرٍ
تحقیق	نازل کیا ہم نے اس قرآن	میں	رات	قدر	اور	کیا	جانے تو	کیا ہے	رات	قدر	رات	قدر	بہتر	سے	ہزار	مہینے

تَنَزَّلُ المَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِیهَا بِاِذنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ اَمرٍ (۴) سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی مَطلَعِ الفَجرِ (۵)

اس میں فرشتے اور روح اُترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے ہر امر لیکر۔ وہ سراپا سلام ہے۔ وہ صبح روشن ہونے تک رہتی ہے۔

تَنَزَّلُ	المَلٰٓئِكَةُ	وَ	الرُّوحُ	فِیهَا	بِاِذنِ	رَبِّهِم	مِن	كُل	اَمرِ	سَلٰم	هِیَ	حَتّٰی	مَطلَعِ	الفَجر
اترتے ہیں	فرشتے	اور	روح	میں اسکے	ساتھ حکم	پروردگار اپنے	واسطے	ہر	کام	سلامتی	وہ	یہاں تک کہ	طلوع ہو	فجر

لغات:

شَهرٌ مہینہ ج اَشهُرٌ و شُهُورٌ۔ مہینہ کو شہر اسلئے کہتے ہیں کہ اس کے شروع ہونے اور گزر جانے کی شہرت ہوتی ہے شَهَرَ شَهرًا (ف) مشہور کرنا۔ بلند کرنا۔ مَطلَع مصدر میمی یا اسمِ ظرف طَلَعَ طُلُوعًا و مَطلَعًا (ن) نکلنا، متوجہ ہونا۔ بصلہ مِن غائب ہونا۔ دُور ہونا۔ (ف ن س) چڑھنا، جاننا، قصد کرنا۔

ترکیب:

اِنَّآ اصلہٗ اِنَّنَا فحذفت نونہٗ تخفیفاً حرف مشبہ بہ فعل مع اسم اَنزَلنٰهُ فِی لَیلَةِ القَدرِ فعل با فاعل، مفعول بہ اور متعلق جملہ فعلیہ خبر اِنّ جملہ اسمیہ۔ وَمَآ اَدرٰكَ الخ ترکیبہٗ فیما سبق۔ لَیلَةُ القَدرِ مرکب اضافی مبتدا۔ خَیرٌ صیغہ اسم تفضیل اپنے متعلق مِنْ اَلفِ شَهرٍ سے ملکر خبر۔ جملہ اسمیہ خبریہ بیان ماقبل تَنَزَّلُ فعل المَلٰٓئِكَةُ والرُّوح معطوفین فاعل فِیهَا متعلق اول بِاِذنِ رَبِّهِم متعلق ثانی یا متعلق محذوف ہوکر فاعل سے حال۔ مِن اپنے مجرور كُلِّ اَمرٍ سے ملکر متعلق ثالث اگر وقف امر پر ہو۔ اور اگر سَلٰمٌ پر وقف ہو تو اسی کے متعلق ہوگا۔ اور جملہ تَنَزَّلُ مستانفہ بیانِ فضیلت کے لئے ہے۔ سَلٰمٌ خبر مقدم ہے اور هِیَ مبتدا مؤخر ہے۔ حَتّٰی حرف جر مطلع اسم ظرف ہے۔ اور یا مصدر میمی ہے تو مضاف محذوف ہے۔ وَقتَ الفَجرِ مضاف الیہ مرکب اضافی مجرور۔ جار مجرور متعلق سَلٰم کا ہوگا۔

تفسیر:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا) اس جملہ میں قرآن مقدس کی عظمت کا اظہار کئی طرح سے کیا گیا ہے۔(۱) فعل کی عظمت فاعل کے اعتبار سے ہوتی ہے یعنی فاعل کی عظمت فعل کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں قرآن پاک کے نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ نے اپنی جانب فرمائی ہے۔(۲) مسندالیہ (اِنَّآ) کو خبر فعلی (اَنْزَلْنَا) سے پہلے ذکر کیا گیا۔ اس سے حکم میں تاکید وقوت اور حصر وخصوصیت فاعل مفہوم ہوتی ہے(۳) پھر بغیر ذکر مرجع کے ضمیر (ہٗ) کو لاکر اس کا ادعاء ہے کہ قرآن حکیم کے علاوہ ذہن اور کسی چیز کی طرف منتقل ہی نہیں ہوسکتا۔ اسی عظمت کے اظہار کے لئے آگے فرمایا۔ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ یعنی اس کا وقتِ نزول بھی بڑا عظیم الشان ہے۔ کیونکہ لیلۃ القدر اتنی عظمت والی رات ہے کہ ہزار مہینوں کی عبادت سے اس ایک رات کی عبادت فوقیت وفضیلت میں بدرجہا بڑھ جاتی ہے۔

لَیْلَةُ الْقَدْر کے معنی:

قدر کے معنی عظمت وشرف کے ہیں۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات علماء نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں۔ اور اس رات کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ اس رات کی عظمت وشرافت بتائی ہے۔ ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس رات کو لیلۃ القدر اس وجہ سے کہا گیا کہ جس آدمی کی اس سے پہلے اپنی بے عملی کے سبب کوئی قدر وقیمت نہ تھی۔ اس رات میں توبہ واستغفار اور عبادت کے ذریعہ وہ صاحب قدر وشرف بن جاتا ہے۔ قدر کے دوسرے معنی تقدیر وحکم کے بھی آتے ہیں اس معنی کے اعتبار سے لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ تمام مخلوقات کے لئے جو تقدیر ازلی میں لکھا تھا اس کا جو حصہ اس سال میں رمضان سے آئندہ رمضان تک پیش آنے والا ہے وہ اس رات میں ان فرشتوں کے حوالہ کردیا جاتا ہے جو تدبیر کائنات وتنفیذ امور پر مامور ہیں۔ اس میں ہر انسان کی موت وحیات اور بارش ورزق وغیرہ کی مقررہ مقداریں فرشتوں کو لکھوادی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ جس شخص کو اس سال حج نصیب ہوگا وہ بھی لکھدیا جاتا ہے۔ اور جن فرشتوں کے یہ جملہ امور حوالہ کئے جاتے ہیں وہ بقول ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ چار ہیں۔ اسرافیل، میکائیل، جبرئیل، عزرائیل علیہم السلام۔

لیلۃ القدر اور لیلۃ مبارکہ دونوں ایک ہیں:

سورۂ دخان کی آیت اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ ۔ میں بھی لیلۃ مبارکہ سے جمہور مفسرین وعلمائے محققین کے نزدیک شب قدر ہی مراد ہے کیونکہ اس شب میں حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر بیشمار برکات کا نزول ہوتا ہے۔ ملائکہ وروح اترتے ہیں۔ شام سے صبح تک تجلی ربانی بندوں کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ صلحاء وعباد کے مراتب بلند ہوتے ہیں وغیرہ نزولِ قرآن کا بھی آیتِ مذکورہ میں ذکر ہے کہ اسی شب میں اُترا ہے۔

اسی طرح دوسرے پارہ کی آیت ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ سے معلوم ہوا کہ قرآن ماہِ رمضان میں نازل ہوا۔ تینوں آیات سے یہ بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے کہ قرآن مقدس لیلۃ القدر میں نازل ہوا۔ اور اسی شب کو لیلہ مبارکہ بھی فرمایا گیا ہے۔ اور یہ رات لیلۃ القدر یا لیلہ مبارکہ رمضان میں تھی جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ چونکہ بعض روایات حدیث میں شعبان کی پندرھویں شب (شب براءت) کے متعلق آیا ہے کہ اس رات میں آجال وارزاق کے فیصلے لکھے جاتے ہیں۔ اور سورۂ دخان کی مذکورہ آیت (جس میں لیلۂ مبارکہ میں قرآن نازل کرنیکا ذکر ہے) کے بعد

فرمایا گیا ہے۔ ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ. أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا﴾ (یعنی اس رات میں ہر حکمت والے معاملہ کا فیصلہ ہماری طرف سے کیا جاتا ہے) اس لئے بعض مفسرین عکرمہؒ وغیرہ نے ان روایات کو سورۂ دخان کی آیات سے جوڑ کر لیلہ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البراۃ سے کردی ہے۔ جس کی وجہ سے سورۃ القدر وسورۂ دخان کی آیات میں سخت تعارض ہوجاتا ہے۔ مگر لیلۃ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البراءۃ سے کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ لیلہ مبارکہ میں نزولِ قرآن کا ذکر ہے اور آیت ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ سے قرآن کا نزول ماہِ رمضان میں متعین اور متفق علیہ ہے اب رہی یہ بات کہ روایات سے ارزاق وغیرہ کے فیصلے شب براءت میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت سورۂ دخان سے لیلۃ مبارکہ میں فیصلوں کا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تو حافظ ابن کثیرؒ نے اس روایت کو (جس میں شب براءت میں فیصلے ہونا مذکور ہے) مرسل قرار دیا ہے۔ اور ایسی روایت نصوصِ صریحہ کے مقابلہ میں قابلِ اعتماد ولائق قبول نہیں ہوسکتی۔

قاضی ابوبکر بن عربیؒ نے فرمایا کہ شب براءت کے بارے میں کوئی روایت قابل اعتماد ایسی ثابت نہیں ہے۔ جس سے اس رات میں رزق وموت وحیات وغیرہ کے فیصلے ہونا معلوم ہوتا ہو۔ بلکہ انہوں نے فرمایا کہ شبِ براءت کی فضیلت میں کوئی قابل اعتماد روایت ہی موجود نہیں۔ لیکن روح المعانی میں ایک بلا سند روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس مضمون کی منقول ہے۔ کہ رزق وموت وحیات وغیرہ کے فیصلے نصف شعبان کی رات میں لکھے جاتے ہیں۔ اور شب قدر میں وہ فرشتوں کے حوالہ کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو اس طرح دونوں قولوں میں تطبیق بھی ہوسکتی ہے۔ ورنہ اصل بات جو تصریح قرآنی اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے یہی ہے کہ سورۂ دخان کی آیت میں لیلۃ مبارکۃ اور فیھا یفرق وغیرہ کے سب الفاظ شبِ قدر ہی کے متعلق ہیں۔ رہا شبِ براءت کی فضیلت کا معاملہ سو وہ ایک مستقل علیحدہ چیز ہے۔ اور اس کی فضیلت کی روایات اکثر ضعیف ہیں۔ اسی لئے قاضی ابوبکر بن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے شبِ براءت کی فضیلت کے ثبوت کا انکار کیا ہے۔ لیکن شبِ برأت کی فضیلت والی روایات گو باعتبار سند ضعیف ہیں لیکن تعددِ طرق سے ان کو ایک گونہ قوت حاصل ہوگئی ہے۔ اس لئے بہت سے مشائخ نے ان کو اس لئے قبول کرلیا ہے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف روایات پر عمل کر لینے کی گنجائش ہے۔

اور بعض حضرات نے لیلۃ مبارکہ سے شبِ برأت مراد لیکر فِيهَا يُفْرَقُ ...... کا تعلق اسی سے جوڑا ہے۔ اور اس طرح تطبیق دی ہے کہ ابتدائی فیصلے امور تقدیر کے اجمالی طور پر شب برأت میں ہوجاتے ہیں۔ پھر ان کی تفصیلات شبِ قدر میں لکھ کر فرشتوں کے حوالہ کردی جاتی ہیں۔ اس کی تائید ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مذکورہ روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جس کو بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ابوالضحیٰ نقل کیا ہے۔ مہدوی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس شب میں امور تقدیر کے فیصلے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو امور تقدیر الٰہی سے پہلے (ازل ہی میں) طے شدہ تھے وہ اس رات میں متعلقہ فرشتوں کے سپرد کردیئے جاتے ہیں کیونکہ قرآن وسنت کی دوسری نصوص اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلے انسان کی پیدائش سے بھی پہلے ازل ہی میں لکھدیئے تھے تو اس رات میں طے کرنے اور لکھنے کا حاصل یہی ہوسکتا ہے کہ سال بھر کا نظام ملائکہ مدبرین کے حوالہ کردیا جاتا ہے۔ کما قالہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

فضائل لیلۃ القدر:

شب قدر کے فضائل میں بہت سی احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں۔ہم اختصاراً ان میں سے چند احادیث کا مفہوم بطور نمونہ لکھتے ہیں۔(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کے لئے) کھڑا ہو اس کے پچھلے گناہ تمام معاف کر دیئے جاتے ہیں۔(۲) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے اوپر ایک مہینہ ایسا آیا ہے کہ جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا تو گویا ساری ہی خیر سے محروم رہ گیا۔اس کی خیر سے تو صرف بدنصیب ہی محروم رہتا ہے۔(۳) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شب قدر میں جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ آتے ہیں اور اس شخص کے لئے جو کھڑا ہو کر یا بیٹھ کر اللہ کا ذکر کر رہا ہو۔دعاء رحمت کرتے ہیں۔الحدیث۔(۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ایک طویل روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب شبِ قدر ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک بڑی جماعت کو لیکر زمین پر اُترتے ہیں۔ان کے ساتھ ایک سبز جھنڈا ہوتا ہے۔جس کو وہ کعبۃ اللہ پر قائم فرما دیتے ہیں۔اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سو ۱۰۰ بازو ہیں جن میں سے دو بازو صرف اسی رات میں کھولتے ہیں جن کو مشرق سے مغرب تک پھیلا دیتے ہیں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کو تقاضا فرماتے ہیں کہ جو مسلمان آج کی رات میں کھڑا ہو یا بیٹھا ہو نماز پڑھ رہا ہو یا ذکر کر رہا ہو اس کو سلام کریں اس سے مصافحہ کریں اور ان کی دعاؤں پر آمین کہیں۔صبح تک یہی حالت رہتی ہے جب صبح ہو جاتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام آواز دیتے ہیں۔اے فرشتوں کی جماعت اب چلو۔فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مؤمنوں کی حاجتوں اور ضرورتوں میں کیا معاملہ فرمایا۔وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر توجہ فرمائی۔اور چار شخصوں کے علاوہ سب کو معاف فرما دیا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ چار شخص کون ہیں۔آپ نے ارشاد فرمایا ایک شراب کا عادی دوسرا والدین کا نافرمان۔تیسرا رشتہ ناطہ توڑنے والا۔چوتھا دل میں کینہ رکھنے والا۔الحدیث۔(۵) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شب قدر میں وہ تمام فرشتے جن کا مقام سدرۃ المنتہیٰ پر ہے جبرئیل امین علیہ السلام کے ساتھ دنیا میں اترتے ہیں۔اور کوئی مؤمن (مرد یا عورت) ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اس کو سلام نہ کرتے ہوں بجز اس شخص کے جو شراب پیتا ہو یا سور کا گوشت کھاتا ہو۔

شبِ قدر کی سب سے بڑی فضیلت:

لیلۃ القدر کی سب سے بڑی فضیلت وہی ہے جو اس سورت میں بیان ہوئی۔(۱) اس میں کلام الٰہی کا نازل ہونا (۲) اس رات کی عبادت کا ہزار مہینوں یعنی تراسی ۸۳ سال کی عبادت سے بھی بہتر ہونا۔بعض علماء نے اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ ہم نے شبِ قدر کی فضیلت میں قرآن نازل کیا۔یعنی قرآن کی آیت میں شبِ قدر کی فضیلت بیان کی کہ شبِ قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ۔

فائدہ......رمضان بارہ مہینوں میں سب سے افضل ہے اور رمضان کی راتوں میں شب قدر سب سے افضل ہے۔ اسی طرح تمام انسانوں میں انبیاء علیہم السلام افضل اور سارے نبیوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں۔ نیز تمام کتابوں میں آسمانی کتب افضل ہیں۔ اور آسمانی کتب میں قرآن مقدس سب سے افضل ہے۔ تو حق تعالیٰ نے افضل الرسل کو دی جانے والی افضل الکتب کو افضل اوقات میں نازل فرمایا۔ اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کتبِ آسمانی ماہِ رمضان المبارک ہی میں نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ پورا قرآن مقدس اسی ماہ میں شبِ قدر میں (۲۴ رمضان کو) لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا (بیت العزۃ) میں یک بارگی نازل ہوا۔ پھر تھوڑا تھوڑا دنیا میں تئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے یکم رمضان کو عطا ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور ۱۸ یا ۱۲ رمضان کو اُتری۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت ۶ رمضان کو ملی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل ۱۲ یا ۱۳ رمضان کو عطا ہوئی۔

لیلۃ القدر کی تعیین:

شب قدر کون سی تاریخ میں ہوتی ہے؟ اس کی تعیین میں احادیث وآثار میں بہت اختلاف ہے۔ اسی لئے اس کے بارے میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں۔ صاحب مظہری رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں علماء کے تقریباً چالیس ۴۰ اقوال بتائے ہیں۔ اور حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً ۵۰ اقوال بتائے ہیں۔ لیکن علمائے محققین کے نزدیک اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ کیونکہ یہ رات کسی خاص تاریخ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ کسی سال کسی تاریخ میں ہوتی ہے اور کسی سال کسی اور تاریخ میں ہوتی ہے۔ بلکہ روایات وآثار کے مختلف ہونے کی وجہ بھی یہی ہے

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ وہ تمام سال میں دائر رہتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے اور درمنثور کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص تمام سال کی راتوں میں جاگے وہ شبِ قدر کو پا سکتا ہے۔ یعنی وہ تمام سال میں دائر رہتی ہے۔ دوسرا قول حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ہے کہ تمام رمضان میں دائر رہتی ہے۔ جیسا کہ بہت سی احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ صاحبین رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ شبِ قدر تمام رمضان میں کوئی ایک متعین رات ہے جو معلوم نہیں ہے۔ شافعیہ کا راجح قول یہ ہے کہ اکیسویں شب کا شبِ قدر ہونا اقرب ہے۔ امام مالک و امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے کہ وہ رمضان کے اخیر عشرہ کی طاق راتوں میں دائر رہتی ہے۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ رمضان کی ستائیسویں رات میں زیادہ امید ہے، شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ان لوگوں کا قول زیادہ صحیح ہے جو کہتے ہیں کہ شبِ قدر تمام سال میں دائر رہتی ہے اس لئے کہ میں نے دو مرتبہ اس کو شعبان میں دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ پندرہ کو اور ایک مرتبہ انیس ۱۹ کو اور دو مرتبہ رمضان کے درمیانی عشرہ میں ۱۳ اور ۱۸ کو۔ اس کے علاوہ رمضان کے اخیر عشرہ کی ہر طاق رات میں دیکھا ہے۔ اس لئے مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ سال بھر کی راتوں میں پھرتی رہتی ہے لیکن رمضان المبارک میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شبِ قدر سال بھر میں دو بار ہوتی ہے۔ ایک وہ رات ہے جس میں احکام خداوندی نازل ہوتے ہیں اور اسی رات میں قرآن شریف بھی لوحِ محفوظ سے اُترا تھا۔ یہ رات رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام سال میں دائر رہتی ہے۔ لیکن جس سال قرآن نازل ہوا اس سال رمضان

میں تھی اور اکثر رمضان ہی میں ہوتی ہے اور دوسری شب قدر وہ ہے جس میں روحانیت کا ایک خاص انتشار ہوتا ہے اور اس میں ملائکہ بکثرت زمین پر اُترتے ہیں شیاطین بندر ہتے ہیں۔ دعائیں اور عبادتیں قبول ہوتی ہیں یہ رات رمضان کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہر رمضان میں خصوصاً اس کے اخیر عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔ اور بدلتی رہتی ہے۔ حضرت شیخ کے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ نے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔ (از فضائل رمضان) تفسیر مظہری میں ہے کہ ان سب (۴۰ چالیس) اقوال میں صحیح یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے۔ مگر اخیر عشرہ کی کوئی تاریخ متعین نہیں۔ وہ اس میں کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے بلکہ ہر رمضان میں بدلتی رہتی ہے۔ احادیث کے تعارض کو دور کرنیکا یہی ایک طریقہ ہے۔ پھر اخیر عشرہ میں بھی احادیث صحیحہ کی رو سے طاق راتوں یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ کا زیادہ احتمال ہے اگر شب قدر کو ان مذکورہ راتوں میں دائر اور ہر رمضان میں منتقل ہونے والی قرار دیا جائے تو وہ تمام احادیث جمع اور اپنی اپنی جگہ بلا تاویل وتکلف درست ہوجاتی ہیں۔ جو تعیین شب قدر کے متعلق مذکورہ تاریخوں میں سے کسی تاریخ کے متعلق آئی ہیں۔ اکثر فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے، ابوقلابہ، امام مالک، امام احمد، سفیان ثوری، اسحٰق بن راہویہ، ابوثور، مزنی، ابن خزیمہ وغیرہ نے یہی فرمایا ہے۔ اور ایک روایت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی کے موافق منقول ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **تحروا لیلة القدر فی العشر الاواخر من رمضان** یعنی شب قدر کو رمضان کے اخیر عشرہ میں تلاش کرو۔ اور مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ **فاطلبوھا فی الوتر منھا** یعنی شب قدر کو رمضان کے عشرۂ اخیر کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ (مظہری) اور یہ بات جو مشہور ہے کہ شب قدر ستائیسویں شب ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ وہ اکثر اسی شب میں واقع ہوتی ہے۔ اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ لفظ لیلۃ القدر میں نو حروف ہیں۔ اور یہ لفظ اس سورت میں تین بار مذکور ہے۔ اور نو کو تین سے ضرب دینے سے ستائیس بنتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ستائیسویں شب شب قدر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سورت میں تیس کلمات ہیں۔ اور ستائیسواں کلمہ ہی ہے۔ جس کا مرجع لیلۃ القدر ہے۔ اس سے ستائیسویں شب قدر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بھی اندازے ہی ہیں۔ **و اللہ تعالی اعلم**.

لیلۃ القدر مخفی کیوں ہے؟

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے باہر تشریف لائے کہ ہمیں شب قدر کی اطلاع دیں مگر دو مسلمانوں میں جھگڑا ہو رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں شب قدر کی خبر دینے آیا تھا مگر فلاں فلاں میں جھگڑا ہو رہا تھا اس وجہ سے اس کی تعیین اٹھالی گئی۔ ممکن ہے کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہو۔ لہٰذا اب اس رات کو نویں، ساتویں اور پانچویں رات میں تلاش کرو۔ (بخاری شریف) اس روایت سے ایک تو آپس میں جھگڑا کرنے کی نحوست معلوم ہوئی کہ نزاع محرومی کا باعث ہے۔ شب قدر کی تعیین اس کی وجہ سے بھلادی گئی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ شب قدر کی تعیین اٹھالینا ہی شاید امت کے حق میں بہتر ہو۔ علماء نے اس کے اخفاء میں چند مصالح بیان فرمائی ہیں۔

(۱) عدم تعیین کی صورت میں بہت سی راتوں میں جاگ کر عبادت کرنے کی توفیق میسر آجائیگی۔ ورنہ تو بہت سے

لوگ صرف شبِ قدر میں عبادت کرلیا کرتے (۲) بہت سے لوگ گناہ کے ایسے عادی ہوتے ہیں کہ وہ بغیر گناہ کیے رہ نہیں سکتے تھے۔ اگر شب قدر معلوم ہوتے ہوئے گناہ کرتے تو یہ نہایت خطرناک تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سوتے ہوئے دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: ان کو جگادو تاکہ وضو کرلیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ تو خیر کی طرف بہت سبقت فرماتے ہیں آپ نے خود کیوں نہ جگادیا۔ اس میں کیا مصلحت ہے؟ فرمایا اگر میرے کہنے پر وہ انکار کربیٹھتا تو کافر ہوجاتا۔ اور تمہارے قول کا انکار کفر نہ ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت نے گوارا نہ کیا کہ اس عظمت والی رات کے معلوم ہوتے ہوئے کوئی گناہ کی جرأت کرکے تباہ ہوجائے۔ (۳) تعیین کی صورت میں اگر کسی سے وہ رات اتفاقاً چھوٹ جاتی تو مایوسی وافسردگی کی وجہ سے پھر کسی رات میں جاگنا نصیب نہ ہوتا اور یہ محرومی پر محرومی ہوجاتی۔ (۴) جتنی راتیں شبِ قدر کی تلاش وجستجو میں صرف ہوتی ہیں اس کی وجہ سے مستقل ثواب کا استحقاق ہوتا ہے (۵) رمضان کی عبادت پر حق تعالیٰ فرشتوں کے سامنے فخر فرماتے ہیں۔ جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔ اس صورت میں تفاخر کا موقع زائد ہے کہ بندے صرف شبِ قدر کے احتمال وخیال پر راتوں جاگتے اور عبادت کے مشقت برداشت کرتے ہیں۔ اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ یہی شبِ قدر ہے تو پھر ان کی کوشش کا حال کیا ہوتا؟ غالباً اسی قسم کی مصلحتوں کی وجہ سے اللہ کی عادت جاری ہے کہ ایسی اہم چیزوں کو مخفی فرمادیتے ہیں۔ جیسے اسمِ اعظم۔ ساعتِ جمعہ، صلوٰۃِ وسطیٰ، موت کا وقت، قیامت کا دن اور اولیاء اللہ وغیرہ تاکہ ان چیزوں کی جستجو کی جائے۔ اور اس لائن کی سب چیزوں کی قدر ہو۔ واللہ اعلم

ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی۔ تیسری بات حدیث میں نویں، ساتویں، پانچویں تاریخیں ہیں۔ دوسری احادیث کی بنا پر تو یہ طے شدہ امر ہے کہ یہ راتیں اخیر عشرہ کی ہیں۔ پھر یہ عشرہ اول سے شمار کریں تو حدیث کا محمل ۲۹، ۲۷، ۲۵، کی راتیں ہیں۔ اور اخیر سے شمار کیا جائے تو پھر ۲۹ کے چاند کی صورت میں ۲۱، ۲۳، ۲۵، اور تیس ۳۰ کے چاند کی صورت میں ۲۲، ۲۴، ۲۶ ہوں گی۔ واللہ اعلم۔

اخیر عشرہ کی ابتداء:

جمہور کے نزدیک اخیر عشرہ کی ابتداء ۲۱ ویں شب سے ہوتی ہے مہینہ خواہ ۲۹ کا ہو یا تیس ۳۰ کا اس حساب سے طاق راتیں ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ ہوں گی۔ مگر ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ عشرہ کے معنی دس دن کے ہیں۔ لہٰذا اگر تیس (۳۰) کا چاند ہوگا تو ۲۱ ویں شب سے شروع ہوگا۔ اور انتیس (۲۹) کا ہوگا تو اخیر عشرہ بیس ۲۰ سے شروع ہوگا۔ اس صورت میں طاق راتیں ۲۰، ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۸ ہوں گی۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اخیر عشرہ کا اعتکاف بالاتفاق اکیسویں شب سے شروع ہوتا تھا۔ اس لئے جمہور کا قول صحیح اور راجح ہے۔

علاماتِ شبِ قدر:

(۱) وہ رات کھلی ہوئی روشن، چمکدار، صاف شفاف ہوتی ہے (۲) معتدل ہوتی ہے نہ زیادہ سرد نہ زیادہ گرم۔ (۳) کثرتِ انوار کی وجہ سے چاند کھلا ہوا ہوتا ہے۔ (۴) اس رات میں صبح تک ستارے شیاطین کے نہیں مارے جاتے۔ (۵) اس رات کی صبح کو آفتاب ہموار ٹکیہ کی طرح بغیر شعاعوں کے طلوع ہوتا ہے۔ (جیسا کہ چودھویں کا چاند ہوتا ہے (۶)

اس کی صبح کو طلوع آفتاب کے وقت شیطان کو اس کے ساتھ نکلنے سے روک دیا جاتا ہے۔(۷) عبدۃ بن ابی لبابہ کہتے ہیں کہ میں نے رمضان کی ستائیسویں شب کو سمندر کا پانی چکھا تو بالکل میٹھا تھا۔ ایوب بن خالد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے نہانے کی ضرورت ہوگئی۔ میں نے سمندر کے پانی سے غسل کیا تو وہ بالکل میٹھا تھا۔ یہ تیئسویں شب کا قصہ ہے۔ عثمان بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک غلام تھا کہ اس نے سالہا سال کشتیوں کی ملاحی کی تھی۔ ایک دن کہنے لگا کہ دریائی عجائبات میں سے ایک چیز میرے تجربہ میں ایسی آئی ہے کہ عقل حیران ہے اور وہ یہ ہے کہ دریائے شور کا پانی ایک رات میں میٹھا ہو جاتا ہے۔ عثمان بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے کہا کہ جب وہ رات آئے تو مجھے بتلانا اس غلام نے رمضان کی ستائیسویں شب کو ان سے کہا کہ وہ آج کی رات ہے۔(۸) مشائخ نے لکھا ہے کہ شب قدر میں ہر چیز سجدہ کرتی ہے۔ حتی کہ درخت بھی زمین پر گر جاتے ہیں اور پھر اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔(لیکن ایسے امور کا تعلق کشف سے ہے)

شبِ قدر کی دُعاء:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں شبِ قدر کو پاؤں تو کیا دعاء کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ دعاء کرو، اَللّٰھم اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ (اے اللہ آپ بہت معاف فرمانے والے ہیں اور معافی کو پسند فرماتے ہیں، میری خطائیں معاف فرما دیجئے) (فائدہ) یہ دعاء نہایت ہی جامع ہے۔ اگر حق تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے آخرت کا مطالبہ معاف فرما دیں۔ تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔

من نگویم کہ طاعتم بپزیر　　قلمِ عفو بر گناہم کش

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس رات میں دعاء میں مشغول ہونا دوسری عبادات سے زیادہ بہتر ہے۔ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مختلف عبادات (تلاوت نماز، ذکر اور مراقبہ وغیرہ) کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس رات میں مختلف عبادات منقول ہیں۔ اور یہی قول زیادہ بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

کیا شبِ قدر اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے؟

شانِ نزول کی روایات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر صرف اسی امت کے لئے مخصوص ہے۔ سابقہ امتوں میں سے کسی امت کو یہ شب نہیں ملی۔ ابن حبیب مالکی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ صاحب العدہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو جمہور علماء کا قول قرار دیا ہے۔ لیکن جو حضرت ابوذر غفار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نسائی شریف میں ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا شب قدر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب وہ وفات پا جاتے ہیں تو اٹھالی جاتی ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: بلکہ وہ باقی رہنے والی ہے۔ اس حدیث کی بنا پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ شبِ قدر گزشتہ امتوں کے لئے بھی تھی۔ اور جن روایات سے اس امت کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ ان میں انہوں نے تاویل کی ہے۔ لیکن شانِ نزول کی تمام روایات خصوصاً حضرت جعفر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت بلکہ سورۃ القدر بھی اس پر کھلی دلالت ہے کہ یہ شب قدر امت محمدیہ کی خصوصیت ہے۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں الفاظ بل ھی باقیۃ قابل تاویل ہیں۔ مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ شب قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی باقی رہے گی

۔ یہ صرف ایک دو سال کے لئے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک ہی باقی رہنے والی نہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب کہا گیا کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شب قدر اٹھالی گئی تو فرمایا کہ جس نے یہ بات کہی غلط کہی۔ راوی نے کہا کہ کیا میں آئندہ ہر رمضان میں اس کو پا سکتا ہوں؟ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہاں۔ (مظہری)

لیلۃُ القدر کی عظمت:

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۔ اس میں دونوں ما استفہام انکاری کے لئے ہیں جن سے لیلۃ القدر کی عظمت واہمیت کا اظہار مقصود ہے۔ یعنی آپ کو کسی چیز نے شب قدر کی اہمیت وعظمت نہیں بتائی۔ اس کی فضیلت وعظمت عقل کی رسائی سے بھی بالاتر ہے۔ اس کے بعد اس کے چند فضائل کا ذکر ہے۔ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ ۔ یعنی ہزار ماہ (تراسی سال) عبادت کرنے کا جس قدر ثواب ہوسکتا ہے شب قدر میں عبادت کرنے کا اس سے کہیں زائد ثواب ہے۔ کتنا زیادہ ثواب ہے اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ ۔ اس آیت میں شب قدر کی دوسری فضیلت کا بیان ہے۔ کہ اس میں فرشتے اور روح آسمان سے زمین پر آتے ہیں۔ اور علوی کمالات وسفلی کمالات کے انوار میں تعاکس وتداخل سے عبادات میں عجیب کیفیات اور نوری تجلیات پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس جماعتِ عظمیٰ کا ہر فرد ایک دوسرے سے اکتساب فیض کر کے ناقص خود کو کامل بناتا ہے۔ اور اہل کمال اپنے کمالات میں چار چاند لگا لیتے ہیں۔ اس بیان سے نماز با جماعت کی حکمت بھی معلوم ہوگئی۔ کہ یہ بھی اہل ایمان کے اکتساب فیض کا ایک عجیب وغریب سلسلہ ہے۔ پھر جتنی بڑی جماعت ہوگی اتنے ہی انوار کا انعکاس واکتساب ہوگا۔ اسی لئے کثیر جماعت قلیل جماعت سے بہتر ہے۔ کما ورد فی الحدیث۔ یہ جملہ سابقہ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ کی علت بھی ہوسکتا ہے کہ اس شب میں خیریت وفضیلت کی وجہ اجتماع اہل کمال وتعاکس انوار ہے۔ واللہ اعلم۔

ہزار مہینوں کی خصوصیت:

ہزار مہینوں کی خصوصیت یہ ہے کہ عرب میں انتہائی عدد یہی ہے۔ ہزار سے آگے گنتی نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ حساب کا جو آخری عدد ہے اس کی فضیلت اس سے بھی زیادہ ہے۔ جس کا علم صرف حق تعالیٰ شانہٗ کو ہے۔ پھر سال کا ذکر نہ فرمایا کہ اس میں رات اور دن سب ہی آجاتے۔ کیونکہ عرب کے نزدیک ماہ کا حساب چاند سے ہوتا ہے جس کا محل رات ہے اور رات کی خصوصیت کی جانب اس سے اشارہ ہوتا ہے شمسی سال دنوں کے ساتھ مخصوص ہے پھر شمسی حسابِ قمری کی بہ نسبت پوشیدہ ہے۔ ہر شخص اُس کے حساب سے واقف نہیں۔ اور قمری سے سب واقف ہیں۔ کیونکہ وہ مشاہد ہے۔ پھر جس طرح چاند کی تجلی ظلمت شب میں ظہور کر کے اس کو روشن کرتی ہے۔ اسی طرح شب قدر میں تجلی ربانی وانوارِ ملائکہ نورانی سے یہ ظلمت کدۂ عالم جگمگا جاتا ہے۔ اور عابدین کے قلوب منور ہوجاتے ہیں۔ اس لئے چاند کے حساب کو ملحوظ رکھ کر اَلْفَ شَھْرٍ فرمایا گیا۔ واللہ اعلم۔

رُوح سے کیا مراد ہے؟

روح کے معنی میں مفسرین کے چند اقوال ہیں (۱) روح سے مراد روح القدس یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ زیادہ صحیح یہی قول ہے۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی افضلیت کی بنا پر ملائکہ کے ذکر کے بعد خاص طور سے ان کا ذکر فرمایا گیا (یعنی یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے) (۲) بعض کا قول ہے کہ روح سے مراد ایک بہت بڑا فرشتہ ہے۔ کہ تمام آسمان وزمین اس کے سامنے ایک لقمہ کے بقدر ہیں۔ اس سے مراد فرشتوں کی ایک مخصوص جماعت ہے جو اور فرشتوں کو بھی صرف لیلۃ القدر ہی میں نظر آتے ہیں (۴) اللہ کی ایک مخصوص مخلوق ہے جو کھاتی پیتی ہے۔ وہ نہ فرشتے ہیں نہ انسان۔ (۵) روح سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جو امتِ محمدیہ کے کارنامے دیکھنے کے لئے ملائکہ کے ساتھ اُترتے ہیں (۶) یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے رات میں اترتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی رحمت خاصہ کا بھی نزول ہوتا ہے (۷) رواح ایک خاص فرشتہ ہے کہ اس کا نام روح القدس ہے۔ انسانی کمالات روحانیہ میں اس کو خاص دخل ہے۔ گویا وہ معلم روحانی ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر صرف ایک بار نازل ہوا تھا۔ جس کی برکت سے وہ مختلف زبانیں بولنے لگے تھے مگر امت محمدیہ کے صلحاء کے پاس وہ ہر برس تشریف لاتے ہیں۔ وہ جس کے پاس آتے ہیں اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (۸) روح سے مراد مؤمنوں کی روحیں ہیں جو ابدان سے جدا ہو کر ملائکہ سے جا ملی ہیں۔ وہ بھی اپنے بھائیوں سے ملنے اور ان کے احوال کا مشاہدہ کرنے کے لئے اس عالمِ سفلی کی سیر کرنے آتی ہیں۔ نیکیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے اور دعاء کرتے ہیں۔ اور برائیوں میں مبتلا لوگوں سے خفا ہوتے اور دل میں فرشتوں سے شرماتے ہیں۔ لیکن اس قول سے نصرانیت کو بو آ رہی ہے۔ یہ انہیں کا عقیدہ ہے کہ ارواحِ مؤمنین ملائکہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور دوسرے اقوال بھی ہیں۔ مگر مشہور قول پہلا (جمہور علماء) ہی کا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ شب قدر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے ایک گروہ کے ساتھ اترتے ہیں اور جس کو ذکر وغیرہ میں مشغول پاتے ہیں اس کے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں۔ کمامر۔

کیا سب فرشتوں کا نزول ہوتا ہے؟

بعض علماء کہتے ہیں کہ سب فرشتے یکے بعد دیگرے مؤمنوں سے ملنے اور ان کی عبادت وغیرہ کے حالات دیکھنے آتے ہیں، جن فرشتوں نے ابتداء میں جناب باری میں عرض کیا تھا کہ اَتَجْعَلُ فِيهَا کیا آپ ایسی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے جو فساد وخونریزی کریگی۔ ان کو حق تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اسی مخلوق کی عبادت اور مجاہدوں کو دیکھو، یہ انسان ایک وقت منی کا قطرہ خون کا لوتھڑا تھا۔ جس سے ماں باپ کو بھی گھن آتی تھی۔ اس کی جب بہترین صورت بنادی اور ماں کے پیٹ سے باہر آیا تو والدین بھی اس کو پیار کرنے لگے۔ اور کمالات روحانیہ کی جب ترقی نصیب ہوئی تو عالم بالا کے معصوم ملائک بھی بصد شوق اس سے ملاقات کے لئے آتے ہیں۔ سبحان اللہ (۲) بعض علماء کہتے ہیں کہ سب فرشتے نہیں آتے، بلکہ فرشتوں کا ایک خاص گروہ آتا ہے۔ جن سے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو خاص تعلق ہے۔ پھر وہ واپس جا کر عالمِ بالا کے دوسرے فرشتوں سے اہل ایمان کے نام بنام احوال بیان کرتے ہیں۔ اور وہ بھی ان کے لئے دعا واستغفار کرتے ہیں۔

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ میں ان لوگوں کے خیال فاسد کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ملائکہ وارواح غیبیہ کو اپنے عمل کے زور سے جب

چاہیں حاضر کر سکتے ہیں۔معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں آ سکتے۔اور انسانوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ ملائکہ بھی ہمارے بندے ہیں جو ہمارے حکم کے پابند ہیں اور تم بھی ہمارے بندے ہو۔تم کو بھی پابند حکم ہونا چاہیے۔

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ میں حرف مِنْ بمعنی باء ہے جیسے یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللهِ میں بھی من بمعنی باء ہے۔معنی یہ ہیں کہ لیلۃ القدر میں فرشتے تمام سال کے اندر پیش آنے والے تقدیری واقعات لیکر زمین پر اُترتے ہیں، یہ جب ہے کہ اس کا تعلق فعلِ مذکور تَنَزَّلُ سے مانا جائے۔مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ بعض مفسرین نے اس کا تعلق سَلٰمٌ سے مانا ہے۔اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ وہ رات سلامتی (والی) ہے یعنی وہ ہر آفت و بُرائی سے محفوظ ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ ملائکہ اور روح سے اس کا تعلق ہو۔یعنی یہ صفت ہو اور مِن بیانیہ ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ آج کی رات ایک شاہانہ جشن ہوتا ہے۔ملائکہ کی اپنی اپنی متعلقہ ڈیوٹیوں سے چھٹی ہو جاتی ہے اور سب اس میں شرکت کرنے کے لئے اللہ کے حکم سے اترتے ہیں۔اور اگر اسی صورت میں مِنْ اجلیۃ مانیں تو معنی ہوں گے کہ وہ ملائکہ ہر اس کام کی جو سال بھر میں ہونے والا ہے تدبیر کے لئے اترتے ہیں۔واللہ اعلم۔

سَلٰمٌ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ای هُوَ سَلٰمٌ یعنی وہ امر سلامتی والا ہوتا ہے۔یعنی ہر مصیبت سے محفوظ رہنے کا موجب ہوتا ہے۔یا هِيَ سَلٰمٌ یعنی وہ رات سراپا سلام ہے۔تمام رات فرشتوں کی طرف سے مؤمنوں پر سلام ہوتا رہتا ہے ایک جماعت جاتی ہے۔دوسری آتی ہے۔جیسا کہ بعض روایات میں اس کی تصریح بھی ہے یا یہ مطلب ہے کہ وہ رات سلام وسلامتی اور سراپا خیر ہی خیر ہے۔اس میں شر کا نام ونشان نہیں۔

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ وہ شب قدر طلوع فجر تک رہتی ہے۔یوں تو ہر رات طلوع فجر تک رہتی ہے۔شب قدر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اوصاف (انوار وتجلیات، عنایات وبرکات، نزولِ ملائکہ وغیرہ) کے ساتھ صبح تک قائم رہتی ہے۔صبح کو یہ روحانی میلہ ختم ہوتا ہے۔یہ مطلب اس صورت میں ہے کہ هِيَ مبتدا اور حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ خبر ہو۔یہ بھی احتمال ہے کہ سَلٰمٌ خبر مقدم اور هِيَ مبتدا مؤخر ہو۔تو یہ تقدیم مفید حصر ہوگی۔ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس رات میں کوئی شر حق تعالیٰ مقدر نہیں فرماتے، صرف سلامتی کے احکام جاری فرماتے ہیں۔مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شرِ شیطان اور حوادث سے یہ رات پاک ہوتی ہے۔

فوائد:

فائدہ......۱: مظاہر حق میں لکھا ہے کہ اسی رات میں فرشتوں کی پیدائش ہوئی ۔اسی رات میں آدم علیہ السلام کا مادہ جمع ہونا شروع ہوا۔اور اسی رات میں جنت میں درخت لگائے گئے۔اور درمنثور میں ہے کہ اسی رات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے۔اور اسی رات میں بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہوئی۔اور دعاء وغیرہ کی مقبولیت میں تو بکثرت روایات وارد ہیں۔

فائدہ......۲: اس سورت میں لیلۃ القدر کو ایک ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔اور ظاہر ہے کہ ان ایک ہزار مہینوں میں بھی تو ہر سال شب قدر آئیگی تو حساب کس طرح بنے گا۔ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہاں ایک ہزار مہینوں سے وہ مہینے مراد ہیں جن میں شب قدر شامل نہ ہو۔اس لئے کوئی اشکال نہ ہوگا۔

فائدہ......۳: اختلاف مطالع کی وجہ سے اگر مختلف ملکوں اور شہروں میں شب قدر بھی مختلف تاریخوں میں ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں۔کیونکہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو شب قدر ہوگی اس جگہ اس رات میں شب قدر کی برکات حاصل ہونگی۔

فائدہ......۴: جس شخص نے شب قدر میں عشاء اور صبح کی نماز باجماعت پڑھ لی اس نے بھی اس رات کا ثواب پالیا۔ اور جو جتنا کرے گا اسی کے اعتبار سے کم یا زیادہ ثواب پائے گا۔ مسلم شریف میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے عشاء کی نماز باجماعت سے پڑھ لی تو اس نے آدھی رات کے قیام کا ثواب پالیا۔ اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کرلی تو اس نے پوری رات جاگ کر عبادت کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

فائدہ......۵: انوار و تجلیات اور عنایات و برکات کے لئے رات کا وقت کیوں مقرر فرمایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دن میں ہر چیز ظاہر ہوتی ہے اس لئے وہ عالم شہادت سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور رات میں اخفاء و پوشیدگی ہے وہ عالم غیب کے مشابہ ہے۔ اس لئے رات عالم غیب کے اسرار و انوار کے لئے نہایت مناسب ہوئی۔ دوسرے یہ شب شب وصال ہے وصل رات ہی کو مناسب ہوتا ہے، تجلیات ربانی و ملائکہ نورانی سے بندوں کا وصال ہوتا ہے۔ تیسرے رات میں اغیار سے علیحدگی و خلوت ہو جاتی ہے۔ اور اخیار پر خاص طور سے عنایات کی بارش ہوتی ہے۔

فائدہ......۶: اس رات میں قصداً (ایماناً و احتساباً) عبادت کرنا تو اعلیٰ درجہ کی بات ہے ہی۔ لیکن اگر شب قدر کا خیال بھی نہیں اور عبادت و ذکر وغیرہ میں مصروف ہے تب بھی شب قدر کی برکات حاصل ہوں گی۔ جیسا کہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

تم تفسیر سورۃ القدر فالحمد لمن انزل القراٰن فی لیلۃ القدر والصلوٰۃ والسلام علیٰ من کان وجھہٗ فی الظلمات کالبدر و نور الفجر و علیٰ اٰلہ و صحبہ الذین تلألأت انوارھم فی البر والبحر لیلۃ واحدۃ لاحدھم کالف شھر و علیٰ من تبعھم بالاحسان الیٰ یوم الحشر

سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃِ

سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃِ مَدَنِیَّۃٌ وَھِیَ ثَمَانُ اٰیَاتٍ

(حروف ۷۹۴۔کلمات ۹۸) سورۃ بینۃ مدینہ میں نازل ہوئی اوراس میں آٹھ آیات ہیں (آیات:۸،رکوع:۱)

اس سورت کے کئی نام ہیں: **(۱) سورۃ القیامۃ (۲) سورۃ البلد (۳) سورۃ المنفکین (۴) سورۃ البریۃ (۵) سورۃ لم یکن**، لیکن مشہورنام سورۃ البینۃ ہے،اس کے مکیہ ومدینہ ہونے میں بھی اختلاف ہے،صاحب بحر لکھتے ہیں کہ جمہور کے قول کے مطابق یہ سورت مکیہ ہے،ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے،اور یحییٰ بن سلامؒ نے بھی اسی کواختیار کیا ہے،ابن الفرس رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مشہور یہی ہے کہ مکیہ ہے،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہی مروی ہے۔اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما،عطا بن یسار،ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ یہ مدنیہ ہے، کتاب التحریر میں ہے کہ یہ سورت مدنیہ ہے،اور یہی جمہور رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے،حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ یہ مدنیہ ہے اور ابوخیثمہ بدری رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اور ابن قانع رحمۃ اللہ علیہ نے معجم الصحابہ میں اور طبرانی وابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہما نے بیان کیا ہے کہ جب لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلیٰ اخرھا نازل ہوئی تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا یارسول اللہ! آپ کے رب نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ یہ سورت ابی کو پڑھائیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھ کو یہ حکم دیا ہے کہ میں یہ سورت تم کو پڑھاؤں،تو ابی رضی اللہ عنہ نے کہا کیا میرا ذکر بارگاہ خداوندی میں ہوا ہے یارسول اللہ! ارشاد فرمایا ہاں! تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رودیئے (ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مدنی صحابی ہیں،ظاہر ہے کہ یہ واقعہ قرینہ ہے کہ یہ سورت مدنیہ ہے)۔صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کا مدنیہ ہونا ہی صحیح ہے، (روح المعانی) صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے سامنے قرآن پڑھوں۔ایک روایت میں ہے کہ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْ پڑھوں۔حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے کہا،آپ سے اللہ نے میرا نام لیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں! حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔میرا ذکر رب العلمین کے پاس ہوا ہے،فرمایا ہاں، یہ سنکر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

فضیلت ومناسبت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کی قرأت کوسن کر ارشاد فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے خوش ہوجا،اپنی عزت کی قسم میں تجھ سے دنیا وآخرت کے احوال میں سے کسی حال پر سوال نہ کروں گا۔اور تجھ کو جنت میں وہ مقام عطا فرماؤں گا کہ تو راضی ہوجائے گا،اور سورۃ القدر سے اس سورت کی مناسبت یہ ہے کہ سورۃ القدر میں انزال قرآن کا ذکر تھا جو بمنزلہ دعویٰ تھا۔اور سورۃ بینہ گویا اس کی دلیل ہے **کانہ قیل انا انزلنا القرآن لانہ لم یکن الذین کفروا منفکین عن کفرھم حتیٰ یاتیھم رسول یتلو صحفا مطھرۃ وھی ذلک المنزل فلا تغفل**

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے۔

لَمۡ يَكُنِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ مُنۡفَكِّيۡنَ حَتّٰى تَاۡتِيَهُمُ الۡبَيِّنَةُ (۱) رَسُوۡل

کفار اہل کتاب ومشرکین باز آنے والے نہ تھے ۔جب تک ان کے پاس واضح دلیل نہ آجائے ۔ یعنی اللہ کا رسول

لَمۡ	يَكُن	الَّذِيۡنَ	كَفَرُوۡا	مِنۡ	اَهۡلِ	الۡكِتٰبِ	وَ	الۡمُشۡرِكِيۡنَ	مُنۡفَكِّيۡنَ	حَتّٰى	تَاۡتِيَهُم	الۡبَيِّنَة	رَسُوۡلٌ
نہ	تھے	وہ لوگ کہ	کافر ہوئے	سے	اہل	کتاب	اور	مشرک	باز رہنے والے	یہاں تک کہ	آوے ان	دلیل روشن	پیغمبر

مِّنَ اللّٰهِ يَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۲) فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۳) وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ

جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں درست مضامین ہوں۔ اور اہل کتاب

مِّنَ	اللّٰه	يَتۡلُو	صُحُفًا	مُّطَهَّرَةً	فِيۡهَا	كُتُبٌ	قَيِّمَةٌ	وَ	مَا	تَفَرَّقَ	الَّذِيۡنَ	اُوۡتُوا	الۡكِتٰبَ
سے	خدا	پڑھتا ہو	صحیفے	پاکیزہ	بیچ اس	کتابیں	ثابت رکھنے والی	اور	نہ	متفرق ہوئے	وہ لوک کہ	دیئے گئے تھے	کتاب

اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ (۴) وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ

نے واضح دلیل آجانے کے بعد ہی اختلاف کیاہے۔ حالانکہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں

اِلَّا	مِنۡ بَعۡدِ	مَا	جَآءَتۡهُمُ	الۡبَيِّنَةُ	وَ	مَا	اُمِرُوۡا	اِلَّا	لِيَعۡبُدُوۡا	اللّٰه
مگر	پیچھے	اسکے کہ	آئی ان	دلیل ظاہر	اور	نہ	حکم کیے گئے	مگر	یہ کہ عبادت کریں	اللہ

مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ (۵) حُنَفَآءَ وَيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ

کہ عبادت کو خالص اسی کے لئے رکھیں یکسو ہوکر اور نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیا کریں۔

مُخۡلِصِيۡنَ	لَهُ	الدِّيۡنَ	حُنَفَآءَ	وَ	يُقِيۡمُوا	الصَّلٰوةَ	وَ	يُؤۡتُوا	الزَّكٰوةَ
خالص کرنے والے	واسطے اس	دین	حنیف (شرک سے یکسو)	اور	قائم رکھیں	نماز	اور	دیں	زکوۃ

وَذٰلِكَ دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ (۵) اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ

اور یہی مستحکم دین ہے۔ بیشک جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب

وَ	ذٰلِكَ	دِيۡنُ	الۡقَيِّمَةِ	اِنَّ	الَّذِيۡنَ	كَفَرُوۡا	مِنۡ	اَهۡلِ	الۡكِتٰبِ
اور	یہ	دین	لوگوں قائم رہنے والوں	تحقیق	جو لوگ	کافر ہوئے	سے	اہل	کتاب

وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِيَّةِ (۶)

اور مشرکین، وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہی بدترین خلق ہیں۔

وَ	الۡمُشۡرِكِيۡنَ	فِىۡ	نَارِ	جَهَنَّمَ	خٰلِدِيۡنَ	فِيۡهَا	اُولٰٓئِكَ	هُمۡ	شَرُّ	الۡبَرِيَّةِ
اور	مشرک	بیچ	آگ	دوزخ	ہمیشہ رہنے والے	بیچ اس	یہ لوگ	وہ	بدتر	خلق

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (۷)

بیشک جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے وہی بہترین خلق ہیں۔

اِنَّ	الَّذِيْنَ	اٰمَنُوْا	وَ	عَمِلُوْا	الصّٰلِحٰتِ	اُولٰٓئِكَ	هُمْ	خَيْرُ	الْبَرِيَّةِ
تحقیق	جولوگ	ایمان لائے	اور	کام کیے	اچھے	یہ لوگ	وہ	بہتر	خلق

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہمیشہ رہنے والی بہشتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں

جَزَآؤُ	هُمْ	عِنْدَ	رَبِّهِمْ	جَنّٰتُ	عَدْنٍ	تَجْرِيْ	مِنْ	تَحْتِهَا	الْاَنْهٰرُ
بدلہ	ان	نزدیک	پروردگاران	بہشتیں	ہمیشہ رہنے والی	چلتی ہیں	سے	نیچے ان	نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ

ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی رہے گا اور وہ اللہ سے راضی رہیں گے۔ یہ

خٰلِدِيْنَ	فِيْهَا	اَبَدًا	رَضِيَ	اللّٰهُ	عَنْهُمْ	وَ	رَضُوْا	عَنْهُ	ذٰلِكَ
ہمیشہ رہنے والی	بیچ ان	ہمیشہ	راضی ہوا	اللہ	سے ان	اور	راضی ہوئے وہ	سے ان	یہ

لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (۸)

اس کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہو۔

لِمَنْ	خَشِيَ	رَبَّهٗ
واسطے اس کے کہ	ڈرتا ہے	پروردگار اپنے

لغات

اَهْلِ الْكِتٰبِ کتاب والے۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں اہل کتاب کے مصداق صرف یہود ونصاریٰ ہوتے ہیں۔ مُنْفَكِّيْنَ: صیغہ اسم فاعل اِنْفِكَاك سے جس کے معنی جدا ہونا۔ باز رہنا۔ چھوٹنا۔ فَكَّ فَكًّا فِكَاكًا (ن) چھوڑانا، کھولنا، مرفی سورة البلد. البينة: واضح دلیل، گواہ، اَلْبَيِّن مذکر اَلْبَيِّنَات جمع، بَانَ بَيَانًا، تِبْيَانًا (ض) ظاہر ہونا، واضح دلیل ہونا۔ يَتْلُوْ تِلَاوَةً (ن) تلاوت کرنا، پڑھنا تَلْوٌ (ن) پیچھے چلنا۔ قَيِّمَة: صیغہ صفت۔ سچی ٹھیک، معاش ومعاد کو ٹھیک کرنے والی، مستقیمہ، عادلہ۔ صالحہ۔ قَامَ قَوْمًا قِيَامًا (ن) کھڑا ہونا وغیرہ۔ تَفَرَّقَ جدا ہونا۔ فَرَقَ، فَرْقًا، فُرْقَانًا، (ن ض) جدا کرنا، پھاڑنا، مانگ نکالنا۔ حُنَفَآءَ حَنِيْف کی جمع، ادیانِ باطلہ کو چھوڑ کر دین حق کو اختیار کرنے والا۔ حَنَفَ حَنَفًا (ض) جھکنا، ٹیڑھا کرنا۔ اَلْبَرِيَّةُ مخلوق بروزن فعلیہ بمعنی مفعولہ جمع بَرَايَا، بَرَءَ، بَرْءًا بُرُوْءًا (ف) نیست سے ہست کرنا۔ پیدا کرنا۔ عَدْن یہ مصدر ہے (ن ض) رہنا بسنا، مقیم ہونا، عدن کو بعض علماء علم قرار دیتے ہیں اور بعض صفت، جو علم قرار دیتے ہیں وہ لوگ جنت کے ایک خاص مقام، درجہ کا نام بتاتے ہیں۔ دلیل میں آیت شریفہ ﴿جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ﴾ کو پیش کرتے ہیں کہ معرفہ کو اس کی صفت لایا گیا ہے۔ امام دار قطنیؒ نے (المختلف والمؤتلف) میں اور ابن مردویہؒ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عدن حق تعالیٰ

کا (بنایا ہوا) گھر ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال گذرا۔ اس میں انبیاء صدیقین اور شہداء کے علاوہ کوئی نہ رہے گا۔ اور حق تعالیٰ فرمائیں گے طُوْبٰی لِمَنْ دَخَلَکَ (اے عدن جو تجھ میں داخل ہوا سکے لئے خوبی ہے)۔ اور جو لوگ علم نہیں بلکہ جنت کی صفت قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کے اصل معنی استقامت و اثبات کے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے سب جنتیں جنات عدن ہیں۔ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ جنتیں سات ہیں (۱) دار الخلد (۲) دار الجلال (۳) دار السلام (۴) جنت عدن (۵) جنت الماویٰ (۶) جنت نعیم (۷) جنت الفردوس۔

ترکیب

لَمْ یَکُنْ فعل ناقص اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ موصول وصلہ ملکر اسم اور مِنْ بیانیہ ہے مُنْفَکِّیْنَ اپنے متعلق سے ملکر خبر۔ جملہ فعلیہ خبریہ۔ اَلْبَیِّنَۃُ مبدل منه یامبین، رَسُوْلٌ موصوف کَائِنٌ مِّنَ اللّٰہِ صفت، مرکب توصیفی مبتدا۔ یَتْلُوْ فعل ضمیر فاعل صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً موصوف وصفت ملکر مفعول بہ۔ فِیْھَا کائنۃ سے ملکر خبر مقدم۔ کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ مرکب توصیفی مبتدا مؤخر۔ جملہ اسمیہ صُحُفًا کی صفت ثانیہ یا مُطَھَّرَۃ کی ضمیر سے حال جملہ یَتْلُوْ الخ مِنَ اللّٰہِ کے متعلق کی ضمیر سے حال یا رَسُوْلٌ کی صفت ثانیہ اور رَسُوْلٌ اپنی صفت یا دونوں صفتوں سے ملکر بدل یا عطف بیان۔ اَلْبَیِّنَۃُ اپنے بدل یا بیان سے ملکر تَـاْتِی فعل کا فاعل۔ فعل فاعل ومفعول بہ سے ملکر بتاویل مفرد مجرور حَتّٰی متعلق ماقبل۔ اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ موصول وصلہ ملکر فاعل وَمَاتَفَرَّقَ فعل کا اِلَّا حرف استثناء لغو مَاجَآءَ تْھُمُ الْبَیِّنَۃُ موصول وصلہ ملکر مضاف الیہ بَعْدِ کا مرکب اضافی مجرور مِنْ کا اور یہ متعلق ہوا فعل مذکور مَـاتَـفَرَّقَ کا اور یہ جملہ فعلیہ معطوف ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے، ای فحین شاھدو النبی الموعود تفرقوا ۔ اور وَمَاتَفَرَّقُوْا کے بجائے فاعل کا اظہار بیان شناعت کے لئے ہے۔ یعنی وہ اہل کتاب تھے۔ انہوں نے جان بوجھ کر مخالفت کی ہے۔ وَمَـآ اُمِـرُوْا فعل ضمیر فاعل اِلَّا حرف استثناء لغو مُخْلِصِیْنَ اپنے متعلق لَہُ اور مفعول بہ اَلدِّیْنَ سے ملکر لِیَعْبُدُوْا کی ضمیر فاعل سے حال حُنَفَآءَ دوسرا حال یا مخلصین کی ضمیر سے حال لِیَعْبُدُوْا حسب سابق وَمَآ اُمِرُوْا کے متعلق اس جملہ فعلیہ کا وَمَا تَفَرَّقَ پر عطف ہے۔ اور وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ دونوں جملوں کا عطف جملہ سابقہ یَعْبُدُوْا پر ہے وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ مبتدا وخبر جملہ اسمیہ ماسبق پر عطف ہے۔ اِنَّ حرف مشبہ بہ فعل اَلَّذِیْنَ اپنے صلہ سے ملکر اسم فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ جار مجرور متعلق۔ یثبتون محذوف کے خَـالِدِیْنَ فِیْھَا فعل محذوف کی ضمیر سے حال ہے۔ جملہ فعلیہ خبر اِنَّ ہوا۔ جملہ اسمیہ۔ اُولٰٓئِکَ مبتدا ھُمْ ضمیر فصل یا مبتدائے ثانی شَرُّ الْبَرِیَّۃِ خبر انّ الذین الیٰ خَیْرُ الْبَـرِیَّۃِ حسب سابق جَزَآءُ ھُمْ مبتدا عِنْدَ رَبِّھِمْ ظرف جَزَاءُ کا جَنّٰتُ عَدْنٍ مرکب اضافی خبر اول۔ تجری فعل اپنے متعلق وفاعل سے ملکر جملہ فعلیہ خبر ثانی خٰلِدِیْنَ فِیْھَا خلوداً اَبَداً (صفت کا صیغہ اپنے متعلق ومفعول مطلق سے ملکر) جَزَآءُ ھُمْ کی ضمیر سے حال ہے لانه بمعنی المفعول للجزاء ۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ فعل۔ فاعل، متعلق، جملہ فعلیہ خبر ثالث۔ یا جملہ مستانفہ فی جواب ھَلْ جُوْزُوْا وَرَآءَ ذٰلِکَ. وَرَضُوْا عَنْہُ مثلہٗ۔ ذٰلِکَ مبتدا خَشِیَ فعل ضمیر فاعل رَبَّہٗ مفعول بہ۔ جملہ صلہ مَنْ موصول وصلہ ملکر مجرور متعلق کائن کے ہوکر خبر ای لک الرضاء کائن لمن خاف ربّه.

تفسیر

لَمْ یَکُنْ ...... اس سورت کے شروع میں بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کفر وشرک کے غلبہ کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ دنیا میں کفر وشرک اور جہالت کی عالمگیر ظلمت چھائی ہوئی تھی۔حق تعالیٰ کی حکمت ورحمت کا تقاضا ہوا کہ اس کو دور کرنے کے لئے ایسی عالمگیر تابناک ہستی کو مبعوث فرمایا جائے جس سے پورے عالم کی تاریکیاں دور ہوسکیں۔اس کفر وشرک اور جہالت کے شدید ومہلک مرض کے علاج کے لئے جس حکیم ماہر وطبیب حاذق کو بھیجا گیا۔اس کو ان آیات میں بینۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔اور وہ ذاتِ گرامی ہے سراج وہاج صاحب معراج رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی، جو قرآنِ عظیم کی حجت واضحہ لیکر تشریف لائے۔اسلئے اس سورت میں اولاً رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور اوصافِ قرآن کو بیان فرمایا گیا ہے۔پہلی آیت کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) ایامِ جاہلیت میں مشرکین عرب اور اہل کتاب اپنی رواجی برائیوں کو ترک نہ کرتے تھے۔اور اپنی اصلاح کو بینہ (رسول منتظر) کے آنے پر محول کرتے تھے۔پہلی آیت میں انہیں کا قول بطور تعریض نقل کیا گیا ہے۔کہ اہل کتاب ومشرکین بقول خود اپنے مذہب باطل اور جہالت وبطالت سے بینہ آنے تک ٹلنے والے نہ تھے۔اب تو بینہ یعنی اللہ کا رسول بھی ان کے پاس آ گیا۔اب اپنی بداطواری سے وہ کیوں باز نہیں آتے جیسے کوئی شخص کہے کہ جب تک سواری نہ آ جائے میں چلنے والا نہیں ہوں۔لیکن سواری آنے پر جب وہ حیلے بہانے کرنے لگے تو تعریض کی جائے کہ آپ تو بغیر سواری چلنے والے نہ تھے۔اب تو سواری آ گئی اب کیوں نہیں چلتے اسی طرح اس آیت میں بھی تعریض ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر یہ اشکال پیش نہ آئیگا کہ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب ومشرکین اپنی گمراہی سے اس وقت تک نہ ٹلیں گے جب تک بینہ نہ آ جائے۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ بینہ آنے کے بعد سب کو ہدایت پر آ جانا چاہیے۔حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔جواب...... ظاہر ہے کہ اس کلام میں کفار اہل کتاب ومشرکین کو تعریض کی گئی ہے۔کہ اب تو بینہ آ جانے پر اپنے قول کے مطابق تم کو راہِ ضلالت سے ہٹ جانا چاہیے۔(۲) بعض کہتے ہیں کہ یہ تعریض نہیں بلکہ باری تعالیٰ کا خود ارشاد ہے کہ کفار اہل کتاب ومشرکین اتنے ضدی ہیں کہ وہ باز نہیں آئے، حتی کہ کھلی ہوئی دلیل بھی ان کے سامنے آ گئی پھر بھی یہ باطل ہی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔(۳) بعض کہتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ کفار دنیا سے جدا ہونے والے نہیں جب تک ان کے پاس بینہ اور حجت واضحہ نہ آ جائے۔یعنی موت سے پہلے ان پر حق واضح ہو جاتا ہے۔اور ان کا عذر لنگ ختم کر دیا جاتا ہے۔اور محبت واضحہ خواہ عقل ہو یا کوئی نبی وہادی، پھر آگے اس خاص بینہ کا بیان ہے۔جس کو بھیج کر تمام اہل کتاب ومشرکین پر حجت تمام کر دی گئی۔اور وہ ہے: رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ...... (۴) بعض کہتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم ﴿فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ کے مثل ہے یعنی اہل کتاب ومشرکین عرب نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے منتظر تھے جب بینۃ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو منکر ہو گئے اور بینۃ آنے کے بعد اپنی بات سے ہٹ گئے، نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر بلکہ آپ کی صفات وغیرہ توریت وانجیل میں مذکور تھیں۔جنکی وجہ سے اہل کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے اور آپ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔مشرکین عرب میں بھی چرچا تھا کہ ایک ایسی ہستی جلوہ گر ہونے والی ہے۔جو عرب کی ابدی شوکت وعزت کا باعث ہوگی۔اور عرب کے گلہ بان بھی

حکومت کریں گے۔ یہ بات عرب میں ایسی مشہور تھی کہ مشرکین بھی آپ کے منتظر تھے۔لیکن جب آپ کی تشریف آوری ہوئی تو اکثر اہل کتاب ومشرکین آپ کے دشمن ہو گئے۔

(۵)ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اہل کتاب ومشرکین اپنی سرداری اور ریاست سے ٹلنے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس بینہ آ جائے۔اور جب بینہ آ گیا اور اس پر ایمان نہ لائے تو ان کی ریاست جاتی رہی۔اس سورت میں تورات کی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہو جائے گا کہ یہود کی حکومت اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ان کے پاس شیلا نہ آ جائے۔اور شیلا سے مراد بینہ ہے۔گویا اس آیت میں بطور پیشگوئی اہل کتاب ومشرکین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ بینہ آ چکا ہے۔ اب سرکشی چھوڑ کر صحیح راہ پر آ جاؤ ورنہ تمہاری خیریت نہیں۔چنانچہ ایران وشام سے قیصر وکسریٰ کی حکومتیں (جن کے فرمانروا نصرانی تھے) یہود کی خیبر وغیرہ مقامات کی ریاستیں اور مشرکین کی قبائلی سرداری وحکمرانی پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت وتکذیب کے باعث تہہ وبالا اور فنا ہو گئیں۔(۶) بغویؒ نے لکھا ہے کہ بعض ائمہ لغت نے منفکین کا ترجمہ **ھالکین** کیا ہے۔اور ہلاکت وبربادی دنیوی واخروی دونوں کو عام ہے۔

يَتْلُوْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً یہ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ کی صفت ہے۔یتلو تلاوت سے مشتق ہے جسکے معنی پڑھنے کے ہیں۔مگر پڑھنے کو تلاوت نہیں کہا جاتا۔ بلکہ جو پڑھنا تلقین کرنے والے کے بالکل مطابق ہو اس کو تلاوت کہتے ہیں۔اسی لئے عرف میں عموماً لفظ تلاوت قرآن پڑھنے کے لئے بولا جاتا ہے۔یعنی وہ رسول امی ہونے کے باوجود صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے۔اور وہ صحیفے باطل کی آمیزش وشیاطین کے تصرف کذب، غیر مہذب باتوں اور تحریف وتبدیل سے پاک ہیں۔ان صحیفوں میں عمدہ و مستحکم احکام ہیں۔اس میں تعریض ہے کہ یہود ونصاریٰ کی کتب تحریف وتبدیل کے عیوب سے خالی نہیں۔اور نہ ان میں نہ منسوخ ہونے والے مستحکم احکام ہیں۔

(س) صُحُف اور کُتُب دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔کیونکہ صحیفہ لکھے ہوئے مضمون کو کہتے ہیں اور کتاب بھی تو فیہا کُتُبٌ کے معنی ہوئے کہ صحف میں کتب ہیں۔یعنی لکھے ہوئے مضامین میں لکھے ہوئے مضامین ہیں۔اور یہ کلام درست نہیں۔(ج) کتب سے مراد صحیفے (لکھے ہوئے مضامین نہیں) بلکہ مطالب واحکام ہیں۔جیسا کہ قرآن پاک میں دوسری جگہ ﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ میں لفظ کتاب سے حکم ہی مراد ہے اسی طرح یہاں بھی لفظ کُتُبٌ بمعنی احکام ہے۔قَيِّمَةٌ کے معنی معتدل، منصفانہ، مضبوط و مستحکم، غیر منسوخ ہیں۔اور یہاں سب معنی درست ہو سکتے ہیں۔(س) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی صحیفہ سے قرآن نہ سُناتے تھے بلکہ اپنی یاد سے پڑھ کر سناتے تھے۔پھر يَتْلُوْ صُحُفًا کہنا کیسے درست ہے؟ (ج) اس میں قرآن پاک کو جو حافظہ میں موجود تھا مایول کے اعتبار سے صحفاً سے تعبیر کیا گیا ہے۔آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایسے مضامین قرآنیہ کی تلاوت کرتے اور لوگوں کو سُناتے ہیں جو تمام عیوب سے پاک ہیں۔اور ان میں معتدل، مستحکم اور دائمی (نہ منسوخ ہونے والے) احکام ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ ......تفرق سے مراد یہاں اختلاف وتکذیب اور انکار ہے، کیونکہ تورات وانجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وبعثت اور خاص خاص صفات کا ذکر تھا۔نیز قرآن پاک کے نازل ہونے کی بھی وضاحت سے تذکرہ تھا۔ اس لئے یہود ونصاریٰ سب اس بات پر متفق تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے، وہ آخری رسول ہوں گے، ان پر قرآن مقدس نازل ہوگا۔اور آپ ہی کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔دوسری جگہ اس اتفاق کا ذکر اس طرح ہے ﴿

﴿وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ یعنی اہل کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منتظر تھے۔ اور جب کبھی مشرکین سے مقابلہ ہوتا تو وہ آنے والے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اپنی فتح مانگتے تھے۔ یعنی دعا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں کی برکت سے ہمیں فتح نصیب فرما۔ نیز مشرکین سے کہتے تھے کہ تم ہم سے مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے ہو۔ مگر عنقریب ایک ایسے رسول آنے والے ہیں جو تم کو زیر کردیں گے۔ اور ہم چونکہ ان کے ساتھ ہوں گے تو وہ ہماری فتح ہوگی۔

حاصل یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تو تمام اہل کتاب آپ کی نبوت ورسالت پر متفق تھے مگر تشریف آوری پر منکر ہوگئے ﴿فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ مذکورہ آیت میں بھی یہی مضمون ہے۔ کہ یہ عجیب بات ہے کہ پہلے سب متفق تھے تشریف آوری کے بعد افتراق پیدا ہوگیا۔ کہ کچھ لوگ آپ پر ایمان لائے کچھ نہیں لائے۔ حالانکہ واضح دلیل آجانے کے بعد تو نہ ماننے والوں کو بھی مان لینا ضروری تھا۔ یہ معاملہ کیونکہ اہل کتاب کے ساتھ مخصوص تھا اس لیے آیت میں صرف اہل کتاب کو ذکر کیا مشرکین کو شامل نہیں کیا گیا اور پہلا معاملہ اہل کتاب ومشرکین دونوں کو عام تھا۔ اس لئے سورت کی پہلی آیت میں دونوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قبل بعثت تصدیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف اہل کتاب متفق تھے۔ مشرکین متفق نہ تھے، بلکہ اہل کتاب سے سن کر ان کو معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ دعا کرتے تھے **اللّٰهم افتح علينا وانصرنا بالنبی المبعوث فی اٰخر الزّمان** اور اپنے مشرک دشمنوں سے کہتے تھے کہ نبی مبعوث کا زمانہ قریب ہے۔ ہم ان کے ساتھ ملکر تم کو (قوم) عاد وارم کی طرح قتل کردیں گے۔ ممکن ہے کہ بعض اہل کتاب نے ان کو آپ کی صفات وطن ومولد ومسکن وغیرہ پر بھی مطلع کردیا ہو، جس کی وجہ سے مشرکین کو اس کا یقین ہوگیا ہو۔ چنانچہ بہت سے مشرکین نے اپنے لڑکوں کا نام اسی لالچ میں محمد رکھا کہ شاید یہی نبی مبعوث ہوجائے، لیکن تصدیق پر اہل کتاب کی طرح سب متفق نہ تھے۔ اسلئے یہاں صرف اہل کتاب کا ذکر کیا گیا۔

بعض کہتے ہیں پہلی آیت میں ان اہل کتاب ومشرکین کا ذکر ہے جو بینہ پر ایمان لے آئے۔ اور **وَمَا تَفَرَّقَ** میں ان اہل کتاب کا ذکر ہے جو کفر پر قائم رہے۔ کیونکہ وہ زیادہ سرزنش کے مستحق تھے۔ یہاں مشرکین کا ذکر ضمناً خود بخود سمجھ میں آگیا۔ ان دونوں آیات میں اور بھی بہت سے اقوال ہیں جن کو صاحب روح المعانی نے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

ایک اہم شبہ کا جواب:

یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیشمار معجزات بھی دیئے گئے آپکے اخلاق وعادات، سیرت وکردار وغیرہ ہر شے آپ کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے۔ آپ کی ذات گرامی نورانی وتابناک اور بینہ کی مصداق ہے۔ مگر انہوں نے تو سابقہ تمام شریعتوں کو منسوخ کردیا۔ اور تمام پیغمبروں کی تعلیمات کو ناقابل عمل قرار دیا ہے تو ہم ایسے ایک انسان کی بات آخر کیسے مان لیں؟

اگلی آیات **وَمَآ اُمِرُوْٓا** ...... میں اس شبہ کا مکمل جواب ہے کہ سابقہ شریعتوں اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نہ وہ تکذیب کرتے ہیں نہ ان کو باطل وغلط قرار دیتے ہیں۔ بلکہ ان کی تائید وتصدیق اور تکمیل فرماتے ہیں۔ اور شرائع سابقہ کے منسوخ ہونیکا مطلب صرف یہ ہے کہ اب ایک مکمل نظام حیات آگیا ہے۔ اس کے سامنے دوسری شریعتوں کی حاجت

نہیں، مثلاً دنیا میں جب طلوع آفتاب ہوگیا تو ٹمٹماتے چراغ کا اب کام نہیں ۔ بلکہ چاند ستاروں کا نور بھی آفتاب کی جلوہ گری میں کام نہ دیگا پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب رسالت ہیں ۔ اب رات نہیں ہے کہ ستاروں کے انوار چمکیں ، اور رات کی روشنیاں کار آمد ہوں ۔ پھر تمام انبیاء علیہم السلام نے جو عقائد دنیا کو سکھائے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سکھائے ہیں ۔ جن میں سے بنیادی عقیدہ لاالٰہ الااللہ یعنی توحید کا عقیدہ ہے ۔ اور اعمال میں جس طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام نے عبادت بدنی وعبادت مالی کی تعلیم اپنی امتوں کو دی ہے اسی طرح نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عبادات بدنیہ ومالیہ کا ایک کامل ومکمل نظام پورے عالم کے سامنے پیش کیا ہے جس میں سرفہرست اقامتِ صلوٰۃ وایتاء زکوٰۃ ہیں ، کیونکہ یہ شریعت تمام ادیان واحکام سابقہ جملہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیماتِ عالیہ کو جامع ہے ۔ اس لئے یہ دین مستحکم ومضبوط اور کامل ومکمل ہے ۔ اور ادیان میں وہ کمال نہیں کہ وہ حرف آخر بن سکیں ۔

بَـیِّـنَـة کی تشریح:

اَلْبَیِّنَه صفت بمعنی اسم فاعل ہے ۔ المبین للحق یا وہ دلیل جو دعویٰ کو ثابت کردے ۔ اس مقام پر اس سے ایسی کھلی ہوئی حقیقت اور ایسی روشن دلیل وبُرہان ظاہر مراد ہے جو حق وباطل میں امتیاز پیدا کردے ۔ اور وہ ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ، کیونکہ یہاں خود رَسُوْلٌ مِّنَ اللهِ سے اس کا بیان موجود ہے ، معنی اول کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اس لئے اس کا مصداق ہے کہ آپ نے تشریف لاکر حق وباطل کو جُدا جُدا فرمادیا ، حق بشکلِ حق واضح ہوگیا اور باطل بصورتِ باطل عیاں ہوگیا ۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (سِرَاجاً مُّنِیْراً روشن چراغ) فرمایا گیا ہے ، دوسرے معنی کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی اس لئے مصداق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ، عادات اور علامات سے اہل کتاب ایسے واقف تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی بلاتردد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی آخر الزمان ہیں ﴿ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ ﴾ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وصفات ، صورت وسیرت بلکہ ہر شئے ایک معجزہ تھی ، جس کو دیکھ کر ہر شخص آپ کے نبی برحق ہونیکا یقین کرنے پر مجبور تھا بشرطیکہ اس کا قلب بصیرت سے قطعاً محروم نہ ہوگیا ہو ۔

کفاک بالعلم فی الامی معجزة	فی الجاهلیة والتادیب فی الیتم

پھر آپ کی تاثیر صحبت اور تعلیم وہدایت ، افادۂ خلق ایسے کھلے ہوئے معجزات ہیں کہ آپ کے رسول ونبی برحق ہونے پر ایک دلیل کافی ہے ۔

جو سویا تھا احساس اس کو جگایا	جو فتنہ تھا بیدار اس کو سُلایا
کچھ ایسا اخوت کا چشمہ بہایا	کہ دم میں تعصب کا شعلہ بجھایا
محبت سکھادی عداوت بھلادی	لگادی یہ آگ ، اور وہ آتش بجھادی
فقد أعطیتَ مالم یُعطَ خلقٌ	علیکَ صلوٰةربک بالسَّلام

اکثر مفسرین وجمہور علماء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ بینــہ سے مراد یہاں پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔ لیکن قتادہؒ وابن زیدؒ وغیرہ بعض حضرات نے بینہ کا مصداق قرآن عزیز کو بتایا ہے کیونکہ وہ بھی حق کو واضح کرنے والا ہے ۔ اور معجزہ

ودلیل ہے دعویٰ نبوت پر۔ اس صورت میں رَسُـــوْلٌ مِّـــنَ اللهِ بدلِ اشتمال یا بدلِ کل ہوگا یا وحی، معجزہ، کتاب، بینہ وغیرہ مضاف محذوف ماننا پڑیگا۔

دِیْنُ الْقَیِّمَة کے معنی:

نضر بن شمیلؒ نے خلیل بن احمدؒ سے اس کے معنی پوچھے تو انہوں نے فرمایا: **وذلک دین الجماعة القیمة** (یہی ان تمام لوگوں کا دین رہا ہے جو توحید پر قائم تھے) **قیمة**، قیم اور قائم تینوں الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ **وذلک دین کتب القیمة** (ان تمام صحیح کتابوں میں جن میں تحریف وتبدیل نہیں ہوئی یہی دین مندرج ہے) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کتب سے مراد فِيْهَـا كُتُبٌ قَيِّمَة ہوں یعنی قرآنی مضامین۔ بعض علماء نے کہا کہ اس کے معنی ہیں کہ یہی ملت حق وشریعت مستقیمہ ہے **ذلک الملة القیمة او الشریعة القیمة** بغویؒ کہتے ہیں کہ دین اور القیمة دونوں جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس لئے دین کی **القیمة** کی طرف اضافت کردی گئی۔ اور کیونکہ **الملة** اس کا موصوف محذوف ہے اسلئے لقیمة پرتائے تانیث لائی گئی ہے۔ ای **ذلک الملة القیمة. والتغایر الاعتباری بین الدین والملة یصحح الاضافة. وقیل الحجج القیمة** بعض نے موصوف مقدر نہیں مانا بلکہ دین کو بمعنی **الملة** مانا ہے۔ اور بعض نے قیمة کی تاء کو مبالغہ کے لئے مانا ہے نہ کہ تانیث کے لئے۔

(س) جب اہل کتاب ومشرکین کے پاس بینہ اور دین قیم آگئے تو انھوں نے آخر ان کو تسلیم کیوں نہیں کیا۔ یہ تعجب کی بات ہے؟ (ج) بینہ ودین قیم اور قرآن عزیز روح کے لئے اچھی غذا کی طرح ہیں۔ اچھی غذا بدن کو قوت پہنچاتی ہیں بشرطیکہ اس میں امراض نہ ہوں۔ اگر امراض ہوں گے تو امراض کو قوت مل جاتی ہے اور امراض بڑھ جاتے ہیں۔ اہل کتاب ومشرکین کی ارواح میں حسد وعناد ضد وفساد، جہل وتعصب جیسے خبیث امراض تھے۔ جب ان کے لئے حق تعالیٰ نے عمدہ غذا ظاہر کی تو ان کے امراض اور بڑھ گئے۔ ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ میں حق تعالیٰ نے اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... اس آیت میں ان اہل کتاب ومشرکین کا انجام بیان فرمایا گیا ہے جنہوں نے بینہ کو نہیں مانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ومخالفت کی اور تعظیم رب (توحید ونماز) اور خلق خدا پر ترحم (زکوٰۃ) سے منہ موڑلیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے دوزخی ہیں اور مخلوق میں سب سے زائد بدترین ہیں۔ سورۂ فرقان میں اسی حقیقت کی اس طرح واضح فرمایا ہے ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا﴾۔ اور سورۂ والتین میں ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... کفار کے مقابلہ میں اس آیت میں اہل ایمان کا انجام بیان فرمایا ہے۔ کہ جولوگ ایمان وعمل صالح سے مالامال ہیں وہ مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔ ان کو ایمان وعمل کا صلہ حق تعالیٰ کا قرب اور عدن کے باغات ہمیشہ کے لئے نصیب ہوں گے۔ اور ان کی اپنے رب سے رضا وخوشنودی کا بدلہ اور خوف وخشیت کی جزا حق تعالیٰ کی ابدی رضا وخوشنودی ہوگی۔

شَرُّ الْبَرِيَّة کی تحقیق:

جملہ اُولٰٓئِکَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّة کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اعمال کے اعتبار سے سارے انسانوں بلکہ تمام مخلوق سے بدترین ہیں۔ اگر یہ معنی ہیں تو یہ خلود فی نار جهنم کی علت ہوگی۔ اور اگر یہ معنی ہوں کہ وہ لوگ مقام اور ٹھکانے کے اعتبار سے بدترین خلق ہوں گے تو ماقبل کی تاکید ہوگی۔ اول معنی کو علماء نے ترجیح دی ہے۔

(س) لیکن دونوں صورتوں میں ایک اشکال یہ پیش آئیگا کہ اہل کتاب ومشرکین کو سب سے بدترین کہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔ جبکہ ان سے بدترین لوگ خدا کی مخلوق میں ہیں، مثلاً ابلیس اور دیگر شیاطین ان سے بدتر ہیں اعمال کے اعتبار سے بھی، اور مقام کے اعتبار سے بھی۔ اسی طرح منافقین بھی ان سے بدتر ہیں کیونکہ وہ مشرک وکافر بھی ہیں۔ اور نفاق کا جرم ان کا مستقل الگ ہے اسی طرح وہ عمل میں اہل کتاب ومشرکین سے بدتر ہیں۔ اور جہنم میں مقام کے اعتبار سے بھی بدترین ہیں۔ قرآن پاک میں ہے ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں رہیں گے۔ اس کے علاوہ پچھلی امتوں کے بعض اور لوگ بھی ان سے بدتر ہیں۔ مثلاً جن لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا، اور فرعون، نمرود، وغیرہ جنہوں نے کفر وشرک کے ساتھ خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ نیز قدار ابن سالف اور اس کے ساتھی جنہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی ناقہ کو قتل کیا تھا۔ قرآن نے قدار کو اشقیٰ (سب سے زیادہ بدبخت) فرمایا ہے۔

(ج) بعض حضرات نے جواب دیا ہے کہ بَرِيَّة سے مراد اہل کتاب ومشرکین کے ہمعصر دوسرے لوگ ہیں۔ لیکن یہ جواب ناقص ہے کیونکہ ابلیس وشیاطین بھی تو ان کے زمانہ میں موجود رہے ہیں جو ان سے بھی بدتر ہیں۔ بعض دوسرے حضرات نے جواب دیا کہ جملہ سے جو حصر سمجھ میں آتا ہے وہ حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ کیونکہ اہل کتاب ومشرکین، اہل ایمان کو بدترین لوگ خیال کرتے تھے۔ تو حق تعالیٰ نے اس کی تردید میں اہل ایمان کو بہترین خلق اور اہل کتاب ومشرکین کو بدترین خلق فرمایا ہے۔ اور شر میں تفضیلی معنی کا اعتبار نہیں ہے۔ ورنہ فی الجملہ شر کا ثبوت مؤمنین میں بھی مفہوم ہوگا۔ لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو کفار اہل کتاب ومشرکین انسانوں میں سب سے زیادہ مجرم ہیں کیونکہ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت کو سچا جان کر تکذیب کرتے تھے۔ اور دوسروں کو حق سے روکتے اور گمراہ کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشمار معجزات اور صدق ودیانت کا بار بار مشاہدہ اور تجربہ کر چکے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کی بار بار کوششیں بھی کر چکے تھے۔ ان جرائم کے علاوہ بہت سے دوسرے جرموں کے وہ مرتکب تھے۔ ان تمام میں اہل کتاب ومشرکین مشترک ہیں۔ اور اہل کتاب کلام الٰہی کی تحریف وتبدیل، کتمان حق وغیرہ کے بھی مرتکب تھے۔ پھر یہ دونوں فریق افضل الرُّسل کے مخالف ان کے مقابلہ میں ہر وقت جنگ کرنے کو آمادہ ہی نہیں بلکہ بارہا مقاتلہ کے مرتکب ہوئے۔ تمام جرائم کے ساتھ یہ لوگ یقیناً تمام انسانوں سے زائد مجرم اور بدترین ہیں۔ رہے منافقین تو وہ بھی انہیں میں شامل ہیں۔ وہ ان سے الگ نہیں تھے۔

خَيْرُ الْبَرِيَّةِ کی تحقیق:

(۱) اُولٰٓئِکَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ سے علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ بشر ملک سے افضل ہے۔ کیونکہ آیت میں آمَنُوا کا مصداق بشر ہی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ تم ملائکہ کے بلند مرتبہ سے تعجب کرتے ہو۔قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! بندۂ مومن کا مرتبہ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن ملک کے مرتبہ سے بھی اعظم ہوگا۔اگر تم (اسکی دلیل) چاہتے ہو تو اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ پڑھ لو۔نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوق میں سب سے زیادہ بزرگ کون ہے؟ ارشاد فرمایا اے عائشہ کیا تم نے اِنَّ الَّذِیْنَ آیت کو نہیں پڑھا (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندۂ مومن سب سے اکرم وافضل ہے) لیکن یہاں چند باتوں کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔(۱) آیت میں اہل ایمان سے مراد انسان ہیں (۲) بریہ سے مراد تمام مخلوق ہے تاکہ استدلال افضلیت اہل ایمان بشر پر ہو سکے (۳) آیت کے عموم میں انبیاء علیہم السلام بھی داخل ہیں۔ورنہ تو ان اہل ایمان کی افضلیت جن میں انبیاء علیہم السلام داخل نہ ہوں تمام ملائکہ پر کسی کے نزدیک بھی مسلم نہیں ہے۔بلکہ جو اس کا قائل ہو کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ تمام اہل ایمان سب فرشتوں سے افضل ہیں اس کو اہل سنت والجماعت مؤمن نہیں مانتے۔اہل السنۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام سب فرشتوں سے افضل ہیں ان کے علاوہ خواص ملائکہ خواص مؤمنین سے افضل ہیں۔اور خواص اہل ایمان عام فرشتوں سے افضل ہیں۔اور عام فرشتے عام مسلمانوں سے افضل ہیں۔اور سب اہل ایمان جن میں انبیاء ورسل بھی شامل ہیں تمام خواص وعوام فرشتوں سے افضل ہیں۔لیکن عام مؤمنین جنت میں داخل ہو کر عام ملائکہ سے افضل ہو جائیں گے۔

(۲) بعض علماء نے فرمایا کہ آیت سے جو حصر مفہوم ہوتا ہے وہ حصر اضافی ہے۔اور اس میں اہل کتاب ومشرکین کے زعم کا رد ہے مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان بشر، کفار بشر کے مقابلہ میں بہترین ہیں۔یعنی بریہ سے مراد بھی انسان ہیں۔جیسا کہ یہی حصر اضافی شر البریہ میں ہے جس کی تفصیل گزر چکی۔اور جس طرح وہاں شر میں تفضیلی معنی ملحوظ نہ تھے خیر میں بھی نہیں ہیں۔جس سے کفار میں خیریت کا شبہ ہو سکے۔اب رہی مذکورہ روایات تو ان کی صحت میں محدثین کو کلام ہے۔(۳) شیعہ کہتے ہیں کہ آیت کا مصداق حضرت علی رضی اللہ عنہ وشیعانِ علی ہیں۔اور اس سلسلہ میں وہ کچھ روایات بھی پیش کرتے ہیں۔وہ سب روایات ناقابلِ اعتبار اور موضوع ہیں۔لیکن اگر ان روایات کو بالفرض صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ وشیعان علی کا انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بہتر وافضل ہونا لازم آتا ہے جس کے وہ خود بھی قائل نہیں ہیں۔شیعوں کا فرقہ امامیہ اگرچہ اسکا قائل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام انبیاء علیہم السلام اُولوالعزم رسولوں اور مقرب فرشتوں سے افضل ہیں لیکن وہ لوگ بھی حضرت علی کو محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل نہیں مانتے۔بہر حال آیت تمام مؤمنین کو عام ہے اس میں کسی مؤمن یا کسی ایک طبقہ کی خصوصیت نہیں۔اور نہ خصوصیت پر کوئی دلیل صحیح موجود ہے۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ اس آیت میں اہل جنت کی سب سے بڑی نعمت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اس کی ناراضگی کا کبھی کوئی خطرہ نہیں۔ ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے خطاب فرمائیں گے یَآاَھْلَ الْجَنَّۃِ تو اہل جنت جواب دیں گے لَبَّیْکَ رَبَّنَا وَسَعْدَیْکَ وَالْخَیْرُ کُلُّہٗ فِیْ یَدَیْکَ (اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں اطاعت کے لئے تیار ہیں، اور ہر بھلائی آپ کے قبضہ میں ہے) پھر ارشاد ہوگا ھَلْ رَضِیْتُمْ یعنی کیا تم لوگ راضی ہو؟ اہل جنت عرض کریں گے اے ہمارے رب! اب بھی ہم کیوں راضی نہ ہوں گے آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرمایا جو اور کسی مخلوق کو نہیں ملا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کیا میں تم کو اس سے بھی افضل اور بہتر نعمت نہ دیدوں؟ جنتی عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار! اس سے

بڑھ کراور کیا نعمت ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں تم پر اپنی رضا نازل کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی تم سے ناراض نہ ہوؤں گا۔ (بخاری و مسلم) حدیث بالا میں مذکور ہے کہ اہل جنت سے حق تعالیٰ پوچھیں گے اَرَضِیتُم یعنی کیا تم راضی ہو؟ اوراس آیت میں خبر دیدی گئی کہ اہل جنت اللہ سے راضی ہوں گے۔ ﴿وَرَضُوا عَنْهُ﴾ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ہر حکم اور ہر فعل پر راضی ہونا بندہ کا فریضہ اور عبدیت کا لازمہ ہے۔ اس کے بغیر تو کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔ پھر آیت میں اہل جنت کی رضا کے ذکر کرنیکا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ رضا کے عام مفہوم کے اعتبار سے تو یہ بات صحیح ہے۔ کہ رضا بالقدر والقضا واجبات ولوازم عبدیت میں داخل ہے۔ لیکن رضا کا ایک خاص درجہ اور بھی ہے جو اس سے آگے ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کی ہر آرزو اور مراد کو پورا فرمادیں اور اس کی کوئی تمنا باقی نہ رہے۔ اس جگہ رضا سے یہی مخصوص درجہ مراد ہے اور سورۃ ضحیٰ میں آیت ﴿وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيكَ رَبُّكَ فَتَرۡضَىٰٓ﴾ میں بھی غایت تمنا کا پورا کردینا ہی مراد ہے۔ اسی لئے اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ پھر تو میں اپنے رب سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک میری امت کا ایک شخص بھی دوزخ میں باقی رہیگا۔

رضا کی قسمیں:

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لفظ رضا کبھی باء کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے (رضی بہ) جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ سے مدبر کائنات ہونے پر راضی ہے۔ اور کبھی بصلہ عَنۡ آتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں بندہ کا قضا وقدر الٰہی پر خوش ہونا۔ صاحب مظہریؒ کہتے ہیں کہ رضا بالقضا کی بھی تین قسمیں ہیں: (۱) اول یہ ہے کہ قضائے الٰہی پر اعتراض نہ کرے، اور یہ یقین رکھے کہ اللہ نے جو کچھ کیا بہتر کیا، گو ہم کو اس کی خوبی اور حکمت کا علم نہیں۔ رضا کی یہ قسم تمام بندوں پر لازم ہے پسند ہو یا ناپسند، اللہ کے ہر فیصلہ پر راضی رہے۔ لیکن گناہ یا کفر کا صدور گو اللہ تعالیٰ کے ارادہ وتخلیق سے ہوتا ہے مگر بندہ کے کسب کو اس میں دخل ہوتا ہے۔ اس لئے بحیثیت کسب وعمل بندہ کو اس پر راضی ہونا جائز نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کو بندہ کے کفر وعصیان پسند نہیں، بلکہ رضا بالعصیان معصیت اور رضا بالکفر کفر ہے۔ رضا بالقضا کی اس پہلی قسم کا لزوم عقل ونقل سے ثابت ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ مالک ومتصرف ہیں۔ اور حاکم وحکیم ہیں، مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا پورا پورا حق ہوتا ہے۔ کسی کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔ اور فیصلہ بھی حاکم کا حق ہے۔ نیز حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ جب تو اللہ سے راضی نہیں تو وہ تجھ سے کس طرح راضی ہوسکتا ہے۔ (۲) رضا بالقضا کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ کی ہر مشیت بندہ کو محبوب ومرغوب ہوجائے۔ خواہ اس کی خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات اللہ کی محبت اور اس کے عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ محبوب کا فعل اور اس کی مراد عاشق کے نزدیک اپنی ذاتی خواہش ومراد سے زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

اُرِيۡدُ وِصَالَهٗ وَيُرِيۡدُ هَجۡرِيۡ ۔۔۔ فَاَتۡرُكُ مَا اُرِيۡدُ لِمَا يُرِيۡدُ

میری خواہش وصال یار ہے اور اس کی خواہش فراق۔ تو میں اپنی خواہش کو اس کی خواہش پر قربان کرتا ہوں

راضی ہوں میں اسی میں جسمیں ہوں آپ راضی ۔۔۔ میری خوشی وہی ہے جو آپ کی خوشی ہے

(۳) رضا کی تیسری قسم یہ ہے کہ بندہ اپنی غایت تمنا پر کامیاب ہوجائے۔ اور اس کی ہر آرزو پوری ہوجائے

آیت میں یہی مراد ہے جس کی تفصیل اوپر بیان کردی گئی۔

ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ اس آخری آیت میں وہ چیز بتادی جس پر تمام دنیوی واُخروی کمالات کا مدار ہے اور وہ ہے خشیۃ اللہ۔ خشیت اس خوف کو نہیں کہا جاتا جو دشمن یا درندے یا کسی موذی چیز سے طبعاً ہوتا ہے۔ بلکہ خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی انتہائی عظمت ومحبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کی رضا جوئی کی ہمہ وقت فکر ہو۔ اور اس کی ناراضگی کے اندیشہ سے بھی بچتا رہے یہی خشیت بندہ کو کامل ومقبول بارگاہِ خداوندی بنادیتی ہے۔ اللّٰھم انی اسئلک خشیتک التی تحول بینی وبین معاصیک۔

تم تفسیر سورة البینة فالحمد لله رب البرية والصلوٰة والسلام علیٰ رسوله الذی يتلو صحفاً مطهرة فيها كتب قيمة وعلیٰ اله وصحبه الذين رضی الله عنهم ورضوا عنه وفازوا بالجنة السنية.

سُوْرَۃُ الزِّلْزَال

سُوْرَۃُ الزِّلْزَال مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانُ آیَاتٍ

رکوع ۱. ایات ۸ سورۂ زلزال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں آٹھ آیات ہیں کلمات ۲۵. حروف ۱۴۹

اس سورت کو سورۃ الزلزال بھی کہتے ہیں، اور سورۃ الزلزلہ بھی کہتے ہیں۔ قتادہؒ ومقاتلؒ کہتے ہیں کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ اور ابن عباسؓ ومجاہدؒ اور عطاءؒ فرماتے ہیں کہ یہ مدنیہ ہے۔ جمہور کا قول بھی یہی ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے قولِ ثانی کی دلیل میں ابن ابی حاتمؒ کی روایت کردہ ایک حدیث پیش کی ہے۔ جو حضرت ابو سعید خدریؓ سے منقول ہے کہ جب اس سورت کی آخری۔ آیت فَمَنْ یَّعْمَلْ...... نازل ہوئی تو (حضرت ابوسعید فرماتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنا (ہر اک) عمل دیکھوں گا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کیا بڑے بڑے بھی؟ فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کیا چھوٹے بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ میں نے کہا ہائے میری ماں مجھ کو گم کردے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا خوش ہوجاؤ اے بوسعید کیونکہ ہر نیک عمل دس گنا (بڑا) ہوتا ہے۔ الحدیث۔ اس روایت سے استدلال اس طرح سے کیا گیا ہے کہ حضرت بوسعیدؓ مدنی صحابی ہیں۔ اور غزوۂ احد کے بعد ہی وہ سن بلوغ کو پہنچے ہیں۔ کیونکہ ان کی وفات ۷۴ھ میں چوراسی سال کی عمر میں ہوئی ہے۔ تو حدیث مذکور کے واقعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس سورت کی وجہ تسمیہ بالکل ظاہر ہے کہ اس میں زلزلہ کا ذکر ہے۔

ربط مناسبت: سورۂ بینہ میں کافروں اور مؤمنوں کی سزا وجزا کا بیان تھا جس سے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس سزا وجزا کا وقت کب آئیگا تو اس سورت میں اسی کا جواب ہے۔

فضائلِ سورت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ اِذَا زُلْزِلَتِ نصف قرآن کے برابر ہے۔ ایک اور حدیث میں اس کو چوتھائی قرآن کے برابر قرار دیا ہے۔ ایک ضعیف الاسناد حدیث میں حضرت علیؓ سے منقول ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے چار بار اِذَا زُلْزِلَتُ پڑھ لی تو وہ (ثواب میں) اس شخص کی طرح

ہے جس نے پورا قرآن پڑھ لیا۔ پہلی حدیث کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک دو قسم کے احکام (احکام دنیا و احکامِ آخرت) پر مشتمل ہے۔ اور یہ سورت احکامِ آخرت پر مشتمل ہے۔ اور دوسری حدیث کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں موجود ہے کہ آدمی مؤمن اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک چار چیزوں پر ایمان نہ لے آئے۔ (۱) لا الہ الا اللہ کی شہادت اور اس بات کی کہ میں اللہ کا رسول ہوں اللہ نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت پر ایمان لائے (۳) بعث بعد الموت پر ایمان لائے (۴) تقدیر پر ایمان لائے۔ (ترمذی) ظاہر ہے کہ اس سورت میں ان چاروں میں سے ایک مسئلہ (بعث بعد الموت) کو بیان فرمایا گیا ہے۔

علامہ جزریؒ نے فرمایا کہ چوتھائی قرآن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک میں چار چیزوں کا بیان ہے۔ (۱) زندگی (۲) موت (۳) حشر (۴) حساب، اس سورت میں ان میں سے حساب کا ذکر ہے۔ اور نصف قرآن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں احوالِ دنیا و احوالِ آخرت کا بیان ہے۔ ان دونوں میں سے مؤخر الذکر کا اس سورت میں بیان ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ مجھے کچھ پڑھا دیجئے، آپ نے فرمایا کہ "آلر" والی تین سورتیں پڑھ لو۔ اس نے کہا میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرا دل سخت ہو گیا اور زبان موٹی ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ "حٰمٓ" والی تین سورتیں پڑھ لو۔ اس نے پھر وہی جواب دیا۔ اور عرض کیا یارسول اللہ مجھے تو کوئی جامع سورت سکھا دیجئے۔ تو آپ نے اس کو اذا زُلزِلت پڑھا دی۔ پڑھ کر اس نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا میں کبھی اس میں زیادتی نہ کروں گا۔ اور پشت پھیر کر چلا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا کہ با مردوا کامیاب ہو گیا۔ مظہری۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے

اِذَازُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا(۱) وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا(۲) وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ

جب زمین کو سخت بھونچال سے ہلایا جائے گا۔ اور زمین اپنے دفینے نکال پھینکے گی۔ اور انسان کہے گا

اِذَا	زُلۡزِلَت	الۡاَرۡضُ	زِلۡزَالَهَا	وَ	اَخۡرَجَتِ	الۡاَرۡضُ	اَثۡقَالَهَا	وَ	قَالَ	الۡاِنۡسَانُ
جس وقت	ہلائی جاوے گی	زمین	بھونچال اپنے	و	نکال ڈالے گی	زمین	بوجھ اپنے	اور	کہے گا	آدمی

مَالَهَا(۳) يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا(۴) بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا(۵) يَوۡمَئِذٍ

کہ اسے کیا ہوگیا؟ اس دن وہ اپنی خبریں بتائے گی اس وجہ سے کہ آپ کا رب اس کو یہی حکم دے گا اُس دن

مَا	لَهَا	يَوۡمَئِذ	تُحَدِّث	اَخۡبَارَ	هَا	بِاَنَّ	رَبَّك	اَوۡحٰى	لَهَا	يَوۡمَئِذٍ
کیا ہوا	اس کو	اس دن	کہے گی (زمین)	باتیں	اپنی	بسبب اسکے کہ	پروردگار تیرے	حکم بھیجا	اس کو	اس دن

يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ(۶) فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا

لوگ مختلف گروہ بن کر واپس ہوں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں سو جو ذرہ برابر نیکی کرے گا

يَّصۡدُر	النَّاس	اَشۡتَاتًا	لِّيُرَوۡ	اَعۡمَالَهُم	فَمَنۡ	يَّعۡمَل	مِثۡقَال	ذَرَّةٍ	خَيۡرًا
پھر آویں	لوگ	متفرق	تو کہ دکھلائے جاویں	عمل ان	پس جو کوئی	کرے گا	برابر	بھنگہ	بھلائی

یَّرَہٗ(۷) وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ(۸)

وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جو ذرّہ برابر برائی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

یَّرَہٗ	وَ	مَنْ	یَّعْمَلْ	مِثْقَالَ	ذَرَّۃٍ	شَرًّا	یَّرَہٗ
دیکھے گا اس	اور	جو کوئی	کرے گا	برابر	بھنگا	برائی	دیکھے گا اس

لغات:

زُلْزِلَتْ صیغہ واحد مؤنث غائب ماضی مجہول۔ دہلائی گئی۔ اس کو لرزایا گیا۔ اس کو زلزلہ میں ڈالا گیا۔ یہ زَلْزَلَۃٌ اور زِلْزَالٌ سے ماخوذ ہے بمعنی بھونچال۔ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ اس میں تکرارِ حروف تکرارِ معنی کے لئے ہے۔ یعنی بار بار جھڑجھڑانا اور ہلا دینا زَلْزَلَ زَلْزَلًا (س) بے قرار ہونا۔ الزَّلْزَل سامان خانہ۔ اَثْقَال جمع ثِقْلٌ کی، بوجھ ثَقُلَ ثِقَلًا و ثَقَالَۃً (ك) بھاری ہونا ثَقُلًا (ك) سخت بیمار ہونا۔ ثَقْلًا (ن) وزن معلوم کرنے کے لئے ہاتھ میں اٹھانا۔ اَخْبَار جمع خَبَرٌ کی، خَبَرَ خُبْرًا اور خِبْرَۃً (ن) آزمانا، جوتنا، خِبْرًا و خِبْرَۃً و مَخْبُرَۃً (ك) حقیقتِ حال سے واقف ہونا۔ مُخَابَرَۃ بٹائی پر کھیت جوتنا، بحث کرنا۔ اَوْحیٰ اِفعال سے واحد مذکر غائب اِیْحَاءٌ: اشارہ کرنا، چھپا کر بات کرنا، اُبھارنا، لکھنا، وحی بھیجنا وغیرہ۔ وَحیٰ وَحْیًا (ض) مذکورہ معانی میں مرفی سورت نوح یَصْدُرُ واحد مذکر غائب مضارع۔ (ن ض) واپس ہونا، لوٹنا، واپس کرنا۔ اگر صلہ عَنْ آئے، اور بصلہ اِلیٰ متوجہ ہونا، صُدُوْرًا پیدا ہونا، ظاہر ہونا۔ اَشْتَاتًا: شَتٌّ اور شَتَاتٌ کی جمع ہے جسکے معنی متفرق و پراگندہ کے ہیں۔ شَتَّ شَتًّا وَشَتَاتًا وَشَتِیْتًا (ض) متفرق ہونا مِثْقَال برابر۔ مَثَاقِیْل، مثقال ایک خاص باٹ بھی ہوتا ہے، جس کا وزن ۳/۷-۱ درہم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اول معنی مراد ہیں۔ ذَرَّۃ چھوٹی چیونٹی، جمع ذَرَّات۔ وقیل مایری فی شعاع الشمس من الھباء (غبار) قالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما والمراد القلۃ.

ترکیب:

زُلْزِلَتْ اپنے نائب فاعل اَلْاَرْضُ اور مفعول مطلق زِلْزَالَھَا سے ملکر جملہ فعلیہ معطوف علیہ۔ وَاَخْرَجَتْ اپنے فاعل اَلْاَرْضُ (واظھار الارض موضع الاضمار للایماء الیٰ تبدل الارض غیر الارض فی ھذا الوقت) اور مفعول بہ اَثْقَالَھَا سے ملکر جملہ فعلیہ معطوف اول وَقَالَ اپنے فاعل اَلْاِنْسَانُ اور مَالَھَا (مآ استفہامیہ بمعنی ای شیء مبتدا۔ لَھَا کائنٌ کے متعلق ہو کر خبر جملہ اسمیہ) مقولہ مفعول بہ سے ملکر جملہ فعلیہ معطوف ثانی۔ معطوفات مضاف الیہ اِذَا کا، یا تو تُحَدِّثُ مذکور کا ظرف مقدم ہے۔ (وقد للاھتمام بہ) یا تُحَدِّثُ محذوف کا ظرف ہے۔ یا جملہ شرطیہ اور آئندہ جزا ہے۔ یَوْمَئِذٍ: ای یوم اِذ کان کذا، ترکیب اول پر اِذَا سے بدل ہے۔ باقی ترکیبوں پر تُحَدِّثُ کا ظرف مقدم ہے۔ (قدم للتشویق الی المؤخر) تُحَدِّثُ فعل فاعل ضمیر عائد الی الارض۔ اَخْبَارَھَا مرکب اضافی مفعول بہ ثانی۔ اور اول محذوف ہے ای الخلق۔ اَنَّ اپنے اسم رَبَّکَ (مرکب اضافی) اور خبر اَوْحیٰ لَھَا (جملہ فعلیہ) سے ملکر بتاویل مفرد مجرور متعلق فعل مذکور ہوا۔ اور اگر اَخْبَارَھَا کو منصوب بنزع الخافض مانا جائے۔

ای بِاَخْبَارِ هَا توبانٌّ......اس سے بدل ہوگا۔اور بدل ومبدل منہ ملکر متعلق تحدث کے ہونگے (والـلام فی لهاعلی الوجهین بمعنی الیٰ) یَوْمَئِذٍ ظرف ہے۔یَصْدُرُ کا، قدّ مهٔ لمامرَّ. اَلنَّاسُ ذوالحال اَشْتَاتًا حال۔ذوالحال وحال ملکر فاعل یَصْدُرُ کا، یُرَوْا فعل مضارع مجهول منصوب بِاَنْ مقدرة،ضمیر جمع غائب(راجع الی الخلق المقدر اوالی النَّاس المذکور) مفعول مالم یسیم فاعلهٔ اَعْمَالَهُم مفعول بہ ثانی۔جملہ فعلیہ بتاویل مفرد مجرور بِلام،جار مجرور متعلق یَصْدُرُ یا متعلق اَشْتَاتًا جملهٔ مثل ماقبل. فَ تعقیبیه برائے تفصیل مضمون جملہ سابقہ۔مَنْ شرطیه یَعْمَلْ فعل اپنے فاعل ضمیر غائب اور مفعول بہ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ سے مل کر جملہ معطوف علیہ،اگلا جملہ بالکل اسی طرح معطوف۔خَيْرًا اور شَرًّا مِثْقَالَ ذَرَّةٍ کی تمیز یا اس سے بدل ہے۔معطوفین ملکر لِيُرَوْا......کی تفصیل۔

تفسیر:

اِذَازُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا جب زمین کو ہلایا جائیگا اس کی عظمت یا اللہ کی حکمت کے مطابق یا جسقدر اس کو ہلانا ممکن ہوگا۔ان وجوہ پر اضافت عہدی ہوگی کہ ایسا زلزلہ مراد ہوگا کہ ایسا اس کے بعد نہ ہوگا یا اسکے سوا ممکن نہ ہوگا۔یا اضافت استغراق کے لئے مانی جائے۔یعنی پوری زمین کو حرکت دیجائیگی۔

لطیفہ: عرب کے کسی بڑے فصیح و بلیغ آدمی نے ایک فقرہ کہا اِذَازُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالًا اور اس پر اس کو بڑا ناز تھا۔لیکن جب اس آیت کا نزول ہوا اور اس میں ''زِلْزَالَهَا'' بالاضافۃ آیا تو یہ فقرہ انتہائی جاندار ہوگیا۔اس عرب نے جب سُنا تو وجد میں آگیا اور کہنے لگا کہ میں اس کلام کی فصاحت پر ایمان لے آیا۔اور میرا فقرہ اس آیت کے سامنے پھیکا پڑ گیا۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

یہ زلزلہ کب واقع ہوگا؟

اس میں اختلاف ہے کہ اس زلزلہ کا وقت کب ہے۔(۱) مجاہدؒ وابن عربیؒ اور عطیہؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ زلزلہ نفخہ اولیٰ سے پہلے ہوگا۔اور یہ زلزلہ علامات قیامت میں سے ایک علامت ہے،(۲) نفخۂ ثانیہ کے بعد ہوگا جب مردے زمین سے اٹھیں گے۔حلیمیؒ وغیرہ بہت سے مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے اور اگلی آیات کو قرینہ میں پیش کیا ہے۔(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ زلزلے متعدد ہوں۔ایک نفخہ اولیٰ سے پہلے دوسرا نفخہ ثانیہ کے بعد۔بظاہر دوسرا قول راجح ہے۔شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے قولِ اول کو اپنایا ہے۔اور قاضی ثناء اللہؒ نے قولِ ثانی کو ترجیح دی ہے۔اور ہر ایک کے پاس قرائن ودلائل ہیں۔واللہ اعلم۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (اور زمین اپنے بوجھوں کو باہر نکال پھینکے گی) اس میں اخراج کی نسبت زمین کی طرف مجازی ہے۔درحقیقت یہ اخراج قدرتِ خداوندی سے ہوگا۔

اثقال سے کیا مراد ہے؟

(۱) جو لوگ کہتے ہیں کہ زلزلہ سے نفخہ اولیٰ کے وقت کا زلزلہ مراد ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اثقال سے مراد دفینے ہیں زمین اپنے دفائن کو نکال دے گی۔چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین اپنے جگر کے ٹکڑے چاندی سونے کی بڑی چٹانوں کی شکل میں اُگل دیگی،اس وقت قاتل دیکھ کر کہے گا ہائے میں نے اس کے

لئے قتل کیا تھا۔ قطع رحمی کرنے والا کہے گا ہائے میں نے اسکی وجہ سے عزیزوں کو چھوڑا تھا۔ اور چور دیکھ کر کہے گا افسوس اس کے لئے میرا ہاتھ کاٹا گیا تھا۔ پھر کوئی بھی اس سونے کی طرف توجہ نہ کریگا۔ (رواہ مسلم والترمذی) صحیحین میں حدیث مرفوع ہے کہ عنقریب فرات سے بہت سا سونا برآمد ہوگا۔ اگر کوئی شخص (اس زمانہ میں وہاں) موجود ہو تو اس میں سے کچھ نہ لے، مسلم کی روایت میں ہے کہ قیامت بپا نہ ہوگی جب تک نہر فرات سونے کا پہاڑ برآمد نہ کردیگی۔ اور اس سونے پر لوگ ایک دوسرے کو قتل کریں گے (یہاں تک کہ) سو ۱۰۰ میں سے ننانوے مارے جائیں گے (ایک بچے گا وہ) ایک کہے گا کہ شاید میں ہی ایک بچ گیا ہوں (بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اس سونے پر قتال وغیرہ ہوا اور اخیر میں سب کو اس سے نفرت ہو جائیگی۔ اور کوئی بھی اس کو نہ لیگا۔ واللہ اعلم۔

(۲) اور جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ زلزلہ نفخہ ثانیہ کے بعد ہوگا وہ اثقال سے مراد مُردے لیتے ہیں۔ یعنی زمین مُردوں کو قبروں سے باہر نکال دیگی۔ (۳) بعض کہتے ہیں اثقال سے مراد وہ خزانے جو دجال کے دور میں نکلیں گے۔ (۴) بعض کہتے ہیں کہ خروج دجال کے وقت اور نفخہ اولیٰ وثانیہ کے وقت دفائن وخزائن زمین سے برآمد ہوں گے۔ (۵) بعض اثقال سے مراد آسرا لیتے ہیں۔ (۶) بعض نے خیر وشر کی شہادت مراد لی ہے۔ حدیث میں ہے کہ زمین پر جو عمل بھی اچھا برا ہوا ہے وہ قیامت کے دن اس کی گواہی دیگی۔ لیکن اگر لفظ اثقال کو دفائن، خزائن، موتی اور اسرار وشہادات سبھی کے لئے عام رکھا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ جب قرآن پاک نے تخصیص نہیں فرمائی تو اس میں تخصیص کی کیا ضرورت ہے۔ واللہ اعلم

وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَالَهَا...... انسان تعجب سے کہے گا کہ زمین کو کیا ہوگیا کہ ایسا سخت زلزلہ آیا اور وہ اپنے اندر کی چیزیں باہر پھینکنے لگی۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ انسان سے مُراد کافر ہے۔ اس کو تعجب اس لئے ہوگا کہ اس کو جن چیزوں کا یقین نہ تھا وہ یکایک اس کے سامنے آگئیں۔ اور مؤمن کو پہلے سے یقین تھا اس لئے اس کو تعجب نہ ہوگا بلکہ وہ کہے گا ﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ بعض دوسرے علماء کہتے ہیں الانسان سے مراد عام ہے وہ کافر ہو یا مؤمن کافر تو **مَالَهَا** بطور تعجب کہے گا اور مؤمن بطور استعظام کہے گا۔ اور اظہر یہی ہے۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بغویؒ کہتے ہیں کہ عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے۔ اصل کلام اس طرح ہے **يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا** یعنی اس دن زمین وہ سب کچھ بیان کردی گی جو اس پر اچھا یا برا عمل کیا گیا تھا تو انسان یہ کہے گا کہ اس زمین کو کیا ہوگیا کہ اس نے سب ہی کچھ بیان کردیا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا تمکو معلوم ہے کہ زمین کی خبریں کیا ہوں گی صحابہؓ نے عرض کیا **اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ** تو آپ نے فرمایا کہ اس کی خبریں یہ ہوں گی کہ جس بندے اور بندی نے اس پر جو کچھ بھی کیا ہوگا زمین اس کی شہادت دیگی (رواہ احمد ونسائی وابن حبان والترمذی وغیرھم) حضرت ربیعہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم زمین سے احتیاط رکھو یہ تمہاری ماں ہے جس نے اس پر جو بھی اچھا یا برا کام کیا ہوگا وہ اس کی خبر ضرور دیگی۔ (طبرانی) مجاہد کا قول بھی یہی ہے۔ یہ تحدیث اخبار زبان قال سے ہوگا۔ جیسا کہ روایات مذکورہ سے مفہوم ہوتا ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی یہی بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ زمین کو ادراک اور زبان عطا فرمائیں گے۔ اور وہ اپنے اندر کے سب حالات واسرار بیان کردی گی بعض لوگ کہتے ہیں کہ زبان حال سے بیان کردیگی۔ مگر صحیح بات اول ہی ہے بعض **تحدث** کا فاعل محذوف **الخلق** کو قرار دیا ہے یعنی خلقت اپنے حالات خود بیان کریگی۔ مگر یہ بھی اس آیت کی تفسیر نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ اور عودِ ضمیر کے قاعدہ کے بھی خلاف ہے۔

ایک شبہ کا جواب:

یہاں پر سطحی عقل والوں کو یہ شبہ پیش آتا ہے کہ زمین تو ایک جسم بے عقل و بے زبان ہے۔ وہ کس طرح گواہی دے سکتی ہے؟ اور باتیں کر سکتی ہے؟ اس کا جواب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہو گیا کہ وہ قادر مطلق اس کو زبان و عقل عطا فرما دیگا۔ علاوہ ازیں حق تعالیٰ نے ہر چیز کو ایک روح عطا فرمائی ہے۔ اگر چہ ہر شے کی ارواح میں فرق ہے حیوانات کی روح بدن کی تدبیر و تصرف حس وادراک اور اختیار وارادہ کا شرف رکھتی ہے۔ دیگر اجسام کی ارواح کو یہ شرف حاصل نہیں۔ مگر گاہے بطور خرق عادت ان اجسام کی ارواح میں بھی ان چیزوں کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ پتھروں اور درختوں کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنا، بتوں کا کلمہ پڑھنا اور اپنے پجاریوں کو پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی تلقین کرنا، استن حنانہ کا آہ وبکا کرنا، ایک پہاڑ کا دوسرے پہاڑ سے معلوم کرنا: **هَلْ مَرَّ بِكَ اَحَدٌ يَذْكُرُ الله**۔ یہ تمام باتیں احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہیں۔

اور قرآنی آیات سے بھی اس کا ثبوت ہے: مثلاً ﴿**فَسُبْحٰنَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَىْءٍ**﴾ ﴿**وَاِنْ مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ**﴾ ﴿**كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ**﴾ وغیرہ۔ اسی طرح مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ درختوں میں الفت بھی ہے اور نفرت بھی۔ مثلاً کھجور کا ایک درخت دوسرے درخت پر جھکا ہوا ہے۔ اگر نیچے کا کاٹ دیں تو اوپر والا خود بخود خشک ہو جاتا ہے۔ چھوئی موئی کے پتوں کی طرف ہاتھ بڑھاؤ تو وہ سکڑ اور سمٹ جاتے ہیں۔ اس زمانہ کی نئی تحقیقات نے تو یہ سب کچھ ثابت کر دیا ہے۔ بہر حال زمین بھی نیکیوں بدیوں کی گواہی دیگی۔ اور تمام اسرار جو آج اسمیں ٹیپ ہو رہے ہیں کل قیامت کے دن حکمِ خداوندی سے سب آشکار ہو جائیں گے۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا اوپر حدیث سے معلوم ہو چکا کہ زمین ماں ہے ظاہر ہے کہ ماں کو اپنے بچوں سے عداوت نہیں ہو سکتی۔ اور زمین نفسانیت سے بھی پاک ہے اس لئے یہ اسرار کو صرف حکم خداوندی ہی سے ظاہر کریگی۔ اس صورت میں باء سببیہ اور لام بمعنی الی ہے۔ **ای تحدیثها بسبب ایحاء ربک الیها وامره سبحانهٗ ایاها بالتحدیث**. یہ بھی ممکن ہے کہ یہ **وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا** کا جواب ہو۔ یعنی جب انسان یہ کہے گا کہ اس زمین کو کیا ہوا کہ اتنی شدید حرکت کرتی ہے۔ اور تمام اسرار و اثقال کو اگل رہی ہے۔ تو وہ بیان کریگی کہ دنیا ختم ہو چکی۔ اور قیامت آ گئی ہے۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں حرکت کروں اور اثقال و اسرار باہر پھینک دوں۔ کذا قال عبداللہ بن مسعودؓ۔

زمین کی طرف وحی کیسے ہوگی:

ممکن ہے کہ وحی الہام ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو القاء فرما دیں۔ یا وحی ارسال ہو کہ کسی فرشتے کے ذریعہ اس کو حکم دیا جائے۔ یا اس میں حیات وتکلم اور تعقل کے پیدا کرنے کو وحی سے تعبیر فرما دیا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔ جب زمین کی شہادت، کشف حقیقت اور حساب و کتاب سے فراغت پر اپنے اعمال کے اعتبار سے لوگ مختلف و متفاوت ہوں گے تو اپنے اپنے اعمال کی جزا کے لئے لوگ مختلف طبقات، مختلف گروہوں اور مختلف راستوں سے لوٹیں گے **يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ** اس دن لوگ متفرق طور پر لوٹیں گے۔ کچھ دائیں سمت کو جنت کی طرف جائیں گے، کچھ بائیں سمت

جہنم کی طرف جائیں گے ﴿یَوْمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوْنَ﴾ تاکہ اپنے اپنے اعمال کی جزاء کا مشاہدہ کریں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہمانے فرمایا لِیُرَوْا جَزَآءَ اَعْمَالِھِمْ.

فَمَنْ یَّعْمَلْ ......الآیتین ان دونوں آیتوں میں اعمال دیکھنے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی اور چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی انسان کے سامنے آجائیگی۔اور وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا خواہ وہ نیکی و بدی مجسم ہو کر سامنے آجائیں یا ان کی جزاوسزا!، واللہ اعلم۔

ایک اہم شبہہ کا حل:

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کو اس کی نیکیوں کا ثواب ملے گا۔حالانکہ کفار کے نیک اعمال ملیا میٹ ہوجاتے ہیں۔وہ اپنی بڑی نیکیاں بھی آخرت میں دیکھ نہ پائیں گے ذرہ برابر کا تو ذکر ہی کیا ہے شرح مقاصد میں ہے کہ اس پر علمائے امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔نیز بہت سی نصوصِ قطعیہ و احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں۔مثلاً ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ﴾ وغیرہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے اعمالِ خیر کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہو جائیگی۔کیونکہ ﴿فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾ ﴿زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ﴾ جیسی نصوص میں تصریح ہے کہ کفار کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مؤمن خواہ کبائر سے بچتا ہو لیکن صغائر پر اس کو سزا ہوگی۔حالانکہ ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ﴾ جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کبائر سے اجتناب صغائر کا مکفر ہے۔ان دونوں شبہات کے پیش نظر علماء نے مذکورہ دونوں آیات کی مختلف تفسیریں فرمائی ہیں جن سے ان شبہات کا حل ہو جاتا ہے۔

(۱) اجمال میں یَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا کا مطلب یہ تھا کہ لوگ میدانِ حشر سے اپنے اپنے مختلف ٹھکانوں پر واپس ہوں گے ﴿فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ﴾ اسی کے مطابق تفصیل بھی ہے کہ پہلے مَن سے مراد سُعداء کی جماعت ہے۔وہ اپنی ذرہ برابر نیکی بھی دیکھ لیں گے۔اور دوسرے مَنْ سے جماعتِ اشقیاءَ مراد ہے کہ وہ اپنی ذرہ برابر بدی بھی دیکھ لیں گے۔اس طرح ہر فقرہ کا تعلق ایک فرقہ کے ساتھ ہو گیا۔اور تفصیل اجمال کے موافق بھی ہوگئی۔اور اشکال بھی رفع ہو گیا۔

(۲) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دونوں میں سے ہر ایک مَنْ مؤمن و کافر سب کو عام ہے۔لیکن کلام میں ایک قید ملحوظ ہے۔جو دوسری آیات میں مذکور ہے۔اور اسکے ظہور کی وجہ سے یہاں ترک کر دی گئی۔اور اصل کلام اس طرح ہوگا فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ اِنْ لم یحبط وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ان لم یکفر.

(۳) بعض علماء نے فرمایا کہ مَن میں بیشک عموم ہی ملحوظ ہے۔اس کے ساتھ رؤیت میں بھی عموم کا لحاظ رکھا جائے کہ رؤیت دنیا میں ہو یا آخرت میں چنانچہ کافر اپنے اعمالِ خیر کی جزاء دنیا میں دیکھ لیتا ہے۔اور اعمالِ شر کی سزا آخرت میں دیکھے گا۔اور مؤمن اپنے اعمال شر کو دنیا میں بھگت لیتا ہے۔اور اعمالِ خیر کی جزا اس کو آخرت میں مل جائے گی۔اس طرح

مؤمن وکافر سب اپنے اپنے اعمالِ خیر وشر کو خواہ وہ ذرہ برابر ہی کیوں نہ ہوں دنیا یا آخرت میں دیکھ لیں گے۔ بغویؒ، ابن جریرؒ وابن منذرؒ وغیرہ نے محمد بن کعب قرظیؒ سے ان آیتوں کی یہی تفسیر نقل کی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہما) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ یہ دونوں آیتیں فَمَنْ يَّعْمَلْ ...... اسی حالت میں نازل ہوئیں۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے سُنیں تو کھانے سے رُک گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے جو ذرہ برابر بُرائی کی ہوگی اس کو بھی دیکھ لونگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر اب دنیا میں جو ناگواریاں اور مصائب دیکھتے ہو یہ ذرات شر ہی کی وجہ سے ہیں۔ اور ذرات خیر کے مثاقیل آپ کے لئے ذخیرہ ہو رہے ہیں۔ ان کا حق تعالیٰ آخرت میں آپ کو پورا پورا بدلہ عطا فرمائیں گے۔ ایک روایت میں حضرت ابوایوبؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ان سے یہ فرمایا کہ تم میں سے جو عملِ خیر کرے گا تو اسکی جزا آخرت میں ملے گی۔ اور جو عملِ شر کریگا اس کا بدلہ دنیا ہی میں مصائب وامراض کی شکل میں مل جاتا ہے۔ اور جس میں ایک ذرہ بھی خیر کا ہوگا وہ جنت میں جائیگا۔

(۴) بعض نے کہا کہ یہاں صرف خیر وشر کی رؤیت کا ذکر ہے جزا وعدم جزا سے بحث نہیں۔ جزا وسزا تو اصول کے مطابق ہوگی۔ البتہ اپنے اعمالِ خیر وشر کا ہر ایک مشاہدہ کر لے گا خواہ وہ کافر ہو یا مؤمن! چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جس مؤمن اور کافر نے دنیا میں کوئی اچھا یا برا عمل کیا ہے اللہ تعالیٰ اس کو وہ عمل ضرور دکھا دیں گے مؤمن کو اس کے اچھے برے سب اعمال دکھلا کر برے اعمال معاف کر دیئے جائیں گے اور نیک اعمال پر ثواب دیا جائیگا۔ اور کافر کو اس کے اچھے برے اعمال دکھلا کر اس کے اچھے اعمال رد کر دیئے جائیں گے۔ اور بد اعمالیوں پر اس کو سزا دی جائے گی۔ طیبیؒ نے اسی کو پسند فرمایا ہے اور کہا ہے کہ یہی مطلب نظم ومعنی اور اسلوب کے موافق ہے۔ نظم کے موافق تو اسلئے کہ یہ ماقبل کی آیت کی تفصیل ہے اور اس میں اَعْمَالَهُمْ کی اضافت شمول واستغراق کا فائدہ دے رہی ہے۔ اور اَشْتَاتًا سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ وجنت میں جانیکے لئے لوگوں کی مختلف راہیں اور متفاوت منازل ان کے اعمالِ مختلفہ کے اعتبار سے ہوں گی۔ اسی لئے جنت کے بھی بہت سے درجات ہیں۔ اور جہنم کے بھی بہت سے درجات ہیں۔ جن کا تقاضا ہے کہ تمام ہی اعمال کا مشاہدہ ہوگا پھر انہیں کے اعتبار سے درجہ ومنزل کی تعیین ہوگی۔ معنوی اعتبار سے اسلئے مناسب ہے کہ دوسری نصوص سے جمیع اعمال خیر وشر کا سامنے لایا جانا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾ اور قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ کی تفسیر کرتا ہے۔ اور اسلوب کے اعتبار سے اس لئے کہ اس آیت کو حدیث میں بڑی جامع اور یکتا قرار دیا گیا ہے۔ کہ یہ دین کے بہت سے فوائد کو حاوی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گدھوں کی زکوٰۃ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اسکے بارے میں مجھ پر اس سے جامع اور یکتا آیت کے سوا کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ پھر آپ نے فَمَنْ يَّعْمَلْ ...... تلاوت فرمائی۔ (بخاری ومسلم) صعصعہ بن معاویہؓ (فرزدق شاعر کے چچا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے ان کو یہ آیت سُنائی صعصعہ نے کہا مجھے یہی آیت کافی ہے مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے بعد قرآن میں سے کوئی حصہ اس کے علاوہ نہ سنوں۔

(۵) علامہ سید آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مَنْ کو بھی اس کے عام معنی پر رکھا جائے اور رؤیت سے جزائے اعمال کا مشاہدہ مراد لیا جائے یہی زیادہ ظاہر ہے۔ اور اس میں کوئی اشکال بھی نہیں، کیونکہ پہلے فقرہ میں وعدہ ہے اور دوسرے

میں وعید۔ اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ اللہ کا وعدہ لازم لوقوع ہوتا ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے فضل وکرم سے یہ طے فرمالیا ہے کہ وعدہ پورا ہو کر رہیگا۔ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَایُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ اور وعید کا تحقق ضروری نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ خیر کے اعمال بھی سب کے سامنے آجائیں گے۔ اس میں مومن کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اس کو جزا ملے گی۔ رہا کافر کا معاملہ تو احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے عذاب میں تخفیف ہوجائیگی۔ چنانچہ حاتم کے عذاب میں اسکی سخاوت کی وجہ سے، ابولہب کے عذاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خوشی اور اپنی ثوبیہ باندی کو ولادت کی بشارت دینے پر آزاد کردینے کی وجہ سے۔ اور ابوطالب کے عذاب میں تخفیف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی وجہ سے روایات صحیحہ سے ثابت ہے۔ اور آیت لَایُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ سے مراد عذاب کفر ہے کہ اس میں تخفیف نہ ہوگی۔ اور جو تخفیف زیر بحث ہے اس کا اعمال کفر کے عذاب سے تعلق ہے۔ اور کفار کے نیک اعمال کے حبط ہوجانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کے اعمال ان کو دائمی عذاب سے نجات نہ دلا سکیں گے۔

اور شرح مقاصد کا مذکورہ دعویٰ اجماع غیر مسلم ہے حالانکہ بالاتفاق کفار معاملات وجنایات کے مکلف ہیں۔ اور مکلف ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان اعمال کے کرنے پر ثواب، نہ کرنے پر عذاب ہو۔ اور ثواب کا ادنیٰ درجہ تخفیف عذاب ہے۔ اب رہے اعمالِ شر تو کفر معاف نہیں ہوگا اور جو مؤمن کبائر سے بچتا ہے اس کے صغائر معاف ہیں۔ اور مؤمن کے کبائر اور ایسے مؤمن کے صغائر جو کبائر سے نہ بچتا ہو وہ تحت المشیٔت ہیں۔ ﴿وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ اور مذکورہ احادیث (انسؓ، ابوایوبؓ) میں اگر غور کیا جائے تو اس مذکورہ بیان کے خلاف نہیں ہیں۔ علامہ شہاب الدین خفاجیؒ نے بھی اسی تفسیر کو پسند فرمایا ہے۔ (روح المعانی) اور راقم الحروف کے نزدیک بھی یہی تفسیر راجح ہے۔

شانِ نزول:

حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ جب آیت ﴿وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ اتری تو مسلمان یہ سمجھے کہ تھوڑی چیز دینے میں (جس کی دل میں خاص قدر واہمیت نہ ہو) ثواب نہیں ملے گا۔ اسلئے جب ان کے دروازوں پر کوئی مسکین آتا اور کچھ اہم چیز موجود نہ ہوتی تو ایک آدھ چھوارہ یا کھجور نہ دیتے بلکہ اس کو واپس کردیتے اور کہتے کہ ہم کو تو ایسی چیز کے دینے پر اجر ملے گا جس سے ہم محبت کریں اور ایسی اہم چیز ہمارے پاس موجود نہیں۔ اور کچھ لوگ یہ خیال کرتے کہ معمولی گناہوں (صغائر) پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کبائر پر عذاب نار کی وعید فرمائی ہے تو اس آیت کے نزول نے بتادیا کہ چھوٹی نیکی کو حقیر اور چھوٹے گناہ کو معمولی نہ سمجھو۔ اچھائی اور برائی کا ایک ایک ذرہ سامنے آجائیگا۔ اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام قلیل وکثیر جس طرح بھی ممکن ہوا صدقہ کرنے اور چھوٹی سی چھوٹی نیکی کی بڑی قدر کرنے لگے اسی طرح معمولی سے معمولی گناہ کو بہت اہم خیال کرنے لگے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس جب ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ نے اسی ہزار درہم بھیجے تو فوراً سب تقسیم فرمادیئے اور افطار کے لئے بھی ایک درہم نہ چھوڑا۔ باندی کے توجہ دلانے پر فرمایا۔ پہلے سے کہتی تو ایک آدھ درہم افطار کے لئے بھی رکھ لیتے۔ اور بعض مرتبہ سائل کو انگور کا ایک دانہ بھی دیدیا۔ اور جب عرض کیا گیا کہ اتنی ذراسی مقدار دے رہی ہیں تو فرمایا یہ بہت سے ذرات سے زیادہ وزنی ہے اور اسی آیت کی تلاوت فرمادی۔ اسی قسم کی روایات حضرت عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت سعد بن مالکؓ وغیرہ سے بھی منقول ہیں۔ غالباً ان حضرات کا مقصد دوسرے لوگوں کو اس کی تعلیم

دینا ہوگا کہ تھوڑے صدقہ اور معمولی نیکی کی لوگ قدر کریں۔اسی قسم کی روایات خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہیں۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک سائل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔آپ نے اس کو ایک چھوارہ دیدیا۔سائل نے کہا کہ ایک نبی بھی ایک چھوارہ دے رہا ہے۔ارشاد فرمایا یہ بہت سے ذرات کے برابر ہے۔آپ نے اسی کا حکم بھی دیا اتقوا النار ولو بشق تمرۃٍ (دوزخ سے بچو خواہ چھوارہ کا ایک ٹکڑا صدقہ ہی کرو) پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تھوڑی بھلائی کو بھی حقیر نہ سمجھو،خواہ اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی ہو۔

صغائر بھی خطرناک ہیں:

جس طرح معمولی نیکی کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے اسی طرح چھوٹے گناہ کو بھی معمولی نہ سمجھنا چاہیے آگ کا ذرا سا پتنگا بھی ساری دنیا کو جلانے کے لئے کافی ہے۔مقاتل فرماتے ہیں کہ چھوٹا گناہ بھی قیامت کے دن گنہگار کی نظر میں پہاڑ سے بھی بڑا معلوم ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:اے عائشہ حقیر گناہوں سے بھی بچو!اللہ کی طرف سے ان کی باز پرس کرنے والا بھی ہوگا۔ابن حبانؒ نے اس حدیث کو صحیح فرمایا ہے حضرت انس فرماتے ہیں کہ تم لوگ کچھ ایسے عمل کرتے ہو جن کو بال سے زیادہ باریک (اور حقیر) سمجھتے ہو۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم انہیں کو ہلاکت خیز شمار کرتے تھے۔(بخاری)

معتزلہ اور مُرجئہ کی تردید:

معتزلہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ مؤمن نہیں رہتا اور نہ کافر ہوتا ہے۔خوارج کہتے ہیں کافر ہوجاتا ہے۔اور یہ دونوں فرقے کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ دوزخ میں رہیگا۔اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ کفر وشرک تو معاف نہ ہوگا۔لیکن کبائر کا مرتکب فاسق ہے کافر نہیں ہوتا۔اور کبیرہ گناہ توبہ سے بھی معاف ہوجاتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو بغیر توبہ کے بھی معاف فرمادیں گے۔یا دوزخ میں سزا دیدیں گے اور پھر جنت میں داخل فرمادیں گے۔بلکہ حق تعالیٰ چاہیں تو صغیرہ پر مواخذہ فرمالیں اور چاہیں تو کبیرہ کو درگزر فرمادیں ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَادُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ﴾ بہر حال مرتکب کبیرہ ہمیشہ دوزخ میں نہ رہیگا۔ایک فرقہ مرجئہ ہے وہ کہتا ہے کہ ایمان کے بعد کوئی گناہ مضر نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ مؤمن کو خواہ وہ کبیرہ کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو عذاب نہ دیں گے۔یہ دونوں آیات اہل سنت کا مستدل ہیں۔پہلی آیت سے معتزلہ اور خوارج کی تردید ہوتی ہے کہ جس شخص کے دل میں ایک ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ آخر کار دوزخ سے نکال لیا جائیگا۔کیونکہ اس کو آیت کے وعدہ کے مطابق اپنی نیکی کا پھل ملنا ضرور ہے۔اگر مؤمن کے پاس کوئی بھی نیکی نہ ہو تو ایمان خود بہت بڑی نیکی ہے۔اس لئے کوئی مؤمن جہنم میں نہ رہیگا۔اور کیونکہ ہر نیکی مقبول ومعتبر ہونے کے لئے ایمان شرط ہے اور کافر اس سے محروم ہے اس لئے اس کی کوئی نیکی معتبر نہیں ہوگی۔

اہل سنت کے اس عقیدہ پر اتنی آیات واحادیث مستدل ہیں کہ انکا احاطہ دشوار ہے۔علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ اس مضمون کی احادیث تواتر سے بھی زائد ہیں۔دوسری آیت سے فرقہ مرجئہ کی تردید ہوئی۔کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گناہ کی سزا سامنے آئیگی۔بشرطیکہ اس کو معاف نہ کردیا گیا ہو۔پھر کسی مؤمن سے گناہ کی معافی کا قطعی وعدہ نہیں۔اور سزا کے سامنے آجائیگی صراحت ان گنت آیات واحادیث میں موجود ہے اگر حق تعالیٰ چھوٹے گناہوں پر بھی سزا دیدیں تو

یہ ان کا عدل ہے۔ اور بڑے گناہوں کو بھی معاف فرمادیں تو ان کا فضل ہے۔

آخری دو آیتوں کی اہمیت:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ قرآن کی سب سے زیادہ مستحکم اور جامع آیتیں فَمَنْ يَّعْمَلْ حضرت انسؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو الفاذۃ الجامعۃ یعنی منفرد، یکتا اور جامع فرمایا ہے۔ ربیع بن خثیمہؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص یہ سورت پڑھتا ہوا حضرت حسن بصریؒ کے پاس کو گذرا۔ جب وہ اسکے آخری حصہ پر پہنچا تو حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ میرے لئے کافی ہے تو نے نصیحت کا حق ادا کردیا (مظہری) ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے قرآن سکھا دیجئے۔ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ اس کو قرآن سکھاؤ۔ حضرت علیؓ نے اس کو اِذاز... سکھائی جب فَمَنْ يَّعْمَلْ پر پہنچے تو اس شخص نے کہا حسبی حسبی لاابالی ان لااسمع غیرھا (بس بس مجھے کافی ہے اس کے علاوہ مجھے سننے کی ضرورت نہ رہی) حضرت علیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قصہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ رہنے دو وہ آدمی بہت سمجھدار ہے۔

تم تفسیر سورۃ الزلزال فالحمدُ للہ الکبیر المتعال والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدالوریٰ امام اھل الفضل والکمال وعلیٰ آلہ وصحابته وتابعیھم بالایمان والاعمال بعددکُل ذرۃ الف الف مرۃ فی کل آن الیٰ یوم لایُغنی فیه اِلّ ولاآل.

سُورۃُ الْعٰدِیٰتِ

سُورۃُ الْعٰدِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اِحْدٰی عَشَرَۃَ آیَۃً

رکوع: ۱، آیات: ۱۱ سورۂ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں گیارہ آیات ہیں کلمات: ۴۰، حروف ۱۶۳

سورۂ عادیات حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت جابرؓ، حسن بصریؒ، عکرمہؒ اور عطاءؒ کے نزدیک مکی ہے۔ اور حضرت انسؓ، قتادہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک مدنی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت ایسی ہی ہے۔ سورت کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

ربط و مناسبت:

(۱) سورۂ زلزال میں نیکی و بدی کا انجام ایسی خوبی کیساتھ بیان کیا گیا کہ ایک سلیم الطبع آدمی کو سننے کے بعد قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں رہ سکتا، مگر کج طبع، ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کے لئے دلائل و نصائح ناکافی ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے''، اسلئے اس سورت میں جہاد اور میدانِ جہاد میں دوڑنے والے گھوڑوں کے چند اوصاف بیان فرما کر فہمائش کے بجائے تخویف کا طرز اختیار کیا گیا۔ اسی لئے انسان کی ناشکری، احسان فراموشی اور دنیوی حرص کو بیان فرما کر اس کو دھمکایا گیا ہے۔ (۲) پہلی سورت میں بدکردار کفار کو آخرت کے نقصان اور خسارہ پر آگاہ کیا گیا تھا، لیکن آخرت کا جب یقین نہیں تو ان بے ایمانوں پر اس کا اثر بھی کیا ہوسکتا ہے؟ اس لئے سورۂ عادیات میں دنیا کے نقصان و خسارہ اور اسکے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ جو ان پر جلد آنے والا ہے۔ (۳) سورۂ سابقہ میں جزائے

خیر وشر کو بیان فرما کر اس سورۃ میں اس شخص کو سرزنش کی گئی ہے جو دنیا کے پیچھے پڑ کر آخرت کو نظر انداز و برباد کرتا ہے۔ (۴) پچھلی سورت میں ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾ تھا اور اس میں ﴿اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ﴾ ہے اور دونوں میں مناسبت ظاہر ہے۔

فضیلتِ سورت:

حسن بصریؒ سے مرسلاً مروی ہے کہ سورۂ عادیات نصفِ قرآن کے برابر ہے۔ یہی حضرت ابن عباسؓ سے بھی مرفوعاً منقول ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ لم اقف علیٰ سرہ لیکن نصف قرآن ہونے کی وجہ ہمارے نزدیک واضح ہے۔ وضو کو حدیث میں نصف ایمان قرار دیا گیا ہے (الوضوء شطر الایمان) اس وجہ سے کہ وہ نماز کی مفتاح ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں جس دین کامل کو بیان فرمایا گیا ہے جہاد بھی اس کی مفتاح ہے۔ جہاد کے ذریعہ ہی وہ طاقت وجود میں آتی ہے، جس سے قرآنی احکام دنیا میں نافذ ہوتے ہیں۔ فافھم۔

شانِ نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا، اور ایک ماہ تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلا تو یہ سورت نازل ہوئی۔ (روح المعانی) شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منذر بن عمر انصاری کی امارت میں بنی کنانہ کے ایک قبیلہ پر ایک لشکر بھیجا۔ اور اس کا پورا انتظام طے فرمادیا کہ فلاں دن علی الصباح ان پر حملہ آور ہو کر انکا قلع قمع کر دینا اور فلاں دن یہاں واپس آجانا ہے۔ راستہ میں ایک ندی پڑتی تھی۔ اتفاق سے اُس دن وہ ندی چڑھی ہوئی تھی۔ لشکر اس سے پار نہ ہو سکا اس لئے اس روز وہیں ٹھہر گئے۔ اگلے دن پانی کم ہونے پر لشکر وہاں سے گذرا۔ اور حکم کے موافق بوقت صبح حملہ کیا۔ اور انکا قلع قمع کر کے صحیح وسالم واپس ہوئے لیکن راستہ میں ٹھہرنے کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ ادھر منافقین نے یہ افواہ اڑادی کہ وہ لشکر تو تباہ ہو گیا اور ایک آدمی بھی اس میں سے ایسا باقی نہ رہا جو آکر خبر دیتا۔ اس سے مسلمانوں کو بہت ہی صدمہ ہوا۔ تو حق تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ اس سورت میں جو گھوڑوں کے اوصاف بیان فرمائے ہیں اس سے ان کا حملہ آور ہونا، دشمنوں کی جماعت میں گھس جانا مذکور ہے۔ جس سے مجاہدین کا غلبہ مفہوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو اس سورت کے نزول سے تسلی ہوگئی۔ مگر اس میں خدشہ یہ ہے کہ اگر سورت مکی ہے تو یہ مذکور واقعہ اس سورت کا شانِ نزول کیسے بن سکتا ہے۔ کیونکہ ہجرت سے پہلے جہاد ہی نہیں تھا کہ لشکر وغیرہ بھیجنے کا قصہ پیش آتا۔ حکمِ جہاد تو مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے۔ اسی وجہ سے بعض حضرات نے اس سورت کو مدنیہ مانا ہے جیسا کہ مذکور ہوا۔ اور جو لوگ اس کو مکیہ کہتے ہیں وہ اس سورت کو پیشین گوئی قرار دیتے ہیں، کہ مسلمانوں کو جہاد کی قوت نصیب ہوگی، گھوڑے اور لشکر کشی اور فتح وظفر کی نعمتیں میسر آئیں گی۔ دشمنوں سے انتقام لیا جائیگا، ملک ومال اہلِ ایمان کے تصرف میں آئیں گے۔ واللہ اعلم۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

وَالۡعٰدِيٰتِ ضَبۡحًا(۱)فَالۡمُوۡرِيٰتِ قَدۡحًا(۲)فَالۡمُغِيۡرٰتِ صُبۡحًا(۳)فَاَثَرۡنَ بِهٖ

ان گھوڑوں کی قسم جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر ٹاپ مارکر چنگاریاں اڑاتے ہیں پھر صبح کے وقت حملہ کرتے ہیں پھر اسوقت

وَ	الۡعٰدِيٰتِ	ضَبۡحًا	فَالۡمُوۡرِيٰتِ	قَدۡحًا	فَالۡمُغِيۡرٰتِ	صُبۡحًا	فَاَثَرۡنَ	بِهٖ
قسم	دوڑنے والوں	ہانپنا	پھر آگ نکالنے والوں	پتھر جھاڑنا	پس گاؤں مارنے والوں	صبح کے وقت	پس اٹھاتی ہیں	ساتھ اس

نَقۡعًا(۴)فَوَسَطۡنَ بِهٖ جَمۡعًا(۵)اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ(۶)وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ

غبار اڑاتے ہیں اور انبوہ میں جا گھستے ہیں۔ واقعی انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔ اور وہ اس کی خود

نَقۡعًا	فَوَسَطۡنَ	بِهٖ	جَمۡعًا	اِنَّ	الۡاِنۡسَانَ	لِرَبِّهٖ	لَكَنُوۡدٌ	وَ	اِنَّهٗ	عَلٰى	ذٰلِكَ
غبار	پس بیٹھ جاتی ہیں	اسوقت	جماعت میں	تحقیق	آدمی	واسطے رب اپنے	البتہ ناشکرا	اور	تحقیق وہ	اوپر	اس

لَشَهِيۡدٌ(۷)وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَيۡرِ لَشَدِيۡدٌ(۸)اَفَلَا يَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِى

خبر رکھتا ہے۔ اور یقیناً وہ مال کی محبت میں بہت مضبوط ہے، کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں سے مُردے اٹھائے

لَشَهِيۡدٌ	وَ	اِنَّهٗ	لِحُبِّ	الۡخَيۡرِ	لَشَدِيۡدٌ	اَفَلَا	يَعۡلَمُ	اِذَا	بُعۡثِرَ	مَا	فِى
البتہ شاہد	اور	تحقیق وہ	واسطے محبت	مال	البتہ سخت	کیا پس نہیں	جانتا	جب	اٹھایا جاوے گا	جو کچھ	بیچ

الۡقُبُوۡرِ(۹)وَحُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوۡرِ(۱۰)اِنَّ رَبَّهُمۡ بِهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّخَبِيۡرٌ(۱۱)

جائیں گے۔ اور جو دلوں میں چھپا ہے ظاہر کر دیا جائیگا۔ بیشک ان کا رب ان سے اُس دن پورے طور پر خبردار ہوگا۔

الۡقُبُوۡرِ	وَ	حُصِّلَ	مَا	فِى	الصُّدُوۡرِ	اِنَّ	رَبَّهُمۡ	بِهِمۡ	يَوۡمَئِذٍ	لَّخَبِيۡرٌ
قبروں	اور	حاصل کیا جائے گا	جو کچھ	بیچ	سینوں	تحقیق	پروردگار ان	ساتھ ان	اس دن	البتہ خبردار

لغات:

الۡعٰدِيٰتِ: الۡعَادِيَةُ کی جمع ہے جسکے معنی ہیں تیز دوڑنے والی۔ عَدَا اعۡدُوا،وَعَدَوَانًا وَعُدُوًّا (ن) دوڑنا۔ بصلہ عن چھوڑنا۔ تجاوز کرنا، روکنا، بصلہ علیٰ حملہ کرنا، ظلم کرنا۔ یہاں الۡعٰدِيٰتِ سے مراد جمہور کے نزدیک تیز رو گھوڑے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اونٹ مراد ہیں۔ ضَبۡحًا (ف) ہانپنا، دوڑنے کی حالت میں گھوڑے کا جوف سے آواز نکالنا۔ الۡمُوۡرِيٰتِ: واحد الۡمُوۡرِيَة، مصدر اِيۡرَاء (افعال) آگ روشن کرنا۔ اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو پتھریلی زمین پر چلتے ہیں تو ان کے سُموں کی رگڑ سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ وَرٰى وَرِيًا (ض) جل جانا۔ آگ نکالنا۔ (س ، ح) جمع ہونا، بھر جانا، لکڑی وغیرہ رگڑ کر آگ نکالنا۔ قَدۡحًا (ف) چقماق سے آگ نکالنا، بصلہ فی نکتہ چینی کرنا۔ عیب لگانا۔ یہاں مراد گھوڑوں کا نعل دار ٹاپوں کو پتھریلی زمین پر مارنا۔ الۡمُغِيۡرٰتِ: واحد الۡمُغِيۡرَة، الۡاِغَارَة (افعال) چھاپہ مارنا، لوٹنا، برانگیختہ کرنا، غیرت میں ڈالنا۔ (س) غیرت کھانا (ض) نفع دینا وغیرہ۔ یہاں مراد مجاہدین کی و

فوجیں ہیں جو صبح کو دشمن پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اونٹوں کی وہ جماعتیں مراد ہیں جو اپنے سواروں کو لیکر قربانی کے دن صبح ہی صبح منیٰ کو تیز تیز جاتی ہیں۔ اَثَرْنَ: جمع مؤنث غائب ماضی اِثَارَۃ (افعال) سے اٹھانا، اُبھارنا، مجرد میں ثَارَ ثَوْرًا، وثُوْرَانًا (ن) بھڑکنا، بلند ہونا، کود پڑنا، حملہ کرنا۔ نَقْعًا: غبار، خاک، شترمرغ کی آواز، پانی جمع ہونے کی تنگ جگہ، کنویں میں جمع شدہ پانی، جمع نِقَاعٌ وَنُقُوْعٌ، نَقَعَ نَقْعًا (ف) آواز بلند کرنا، پھاڑنا قتل کرنا مصدر نُقُوْعٌ بھی آتا ہے، پانی میں بھگونا، سیراب کرنا وغیرہ بہت سے معانی آتے ہیں۔ وَسَطْنَ: جمع مؤنث غائب ماضی وَسَطَ وَسْطًا (ض) بیچ میں بیٹھنا، متوسط ہونا، وسُطَ وَسَاطَةً (ك) شریف ہونا۔ کَنُوْدٌ: صفت مشبہ ناشکرا مرد یا ناشکری عورت، ناقابل روئیدگی زمین، کافر، اللہ کو بُرا کہنے والا، بخیل، اس جگہ اول معنی مراد ہیں، کَنَدَ کُنُوْدًا (ن) ناشکری کرنا کَنْدًا: کاٹنا۔ اَلْخَيْرِ: مال۔ بُعْثِرَ: اٹھایا گیا، کریدا گیا، الٹ پلٹ کیا گیا۔ جن علماء کی رائے یہ ہے کہ رُباعی اور خُماسی دو ثلاثی سے ملکر بنتی ہے ان کے خیال میں بُعْثِرَ بُعِثَ اور اُثِيْرَ سے ملکر بنا ہے۔ اور یہ کچھ بعید بھی نہیں، کیونکہ بُعْثِرَ میں دونوں کے معنی موجود ہیں جیسے بَسْمَلَ (اس نے بسم اللہ پڑھی) بِسْمِ اور اللہ کے لام سے مرکب ہے۔ اسی طرح یہ بھی بعث اور اثارۃ کی راء سے مرکب ہوسکتا ہے۔ بَعَثَ بَعْثًا (ف) بھیجنا، اٹھانا، اَلْقُبُوْر: القبر کی جمع ہے۔ (ن، ض) دفن کرنا۔ اصل معنی یہی ہیں۔ اس کے دو معنی اور بھی آتے ہیں: (۱) پوشیدہ رہنا (۲) قعر جہالت وضلالت میں پڑا رہنا۔ یہاں تینوں معانی ممکن ہیں۔ حُصِّلَ: حاصل کیا گیا، ظاہر کیا گیا۔ تحصیل سے ہے جسکے معنی ہیں چھلکے میں سے گودا نکالنا۔ حَصَلَ حُصُوْلًا وَّمَحْصُوْلًا (ن) حاصل ہونا، ثابت ہونا، باقی رہنا۔ بصلہ علیٰ جمع کرنا، مالک ہونا، ثابت ہونا، واجب ہونا۔

ترکیب:

وَالْعٰدِيٰتِ: مثل وَالنّٰزِعٰتِ ہے اور ضَبْحًا: فعل محذوف تَضْبَحُ یا يَضْبَحْنَ کا مفعول مطلق ہے۔ یہ جملہ فعلیہ الْعٰدِيٰتِ کی ضمیر سے حال ہوجائیگا۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ الْعٰدِيٰتِ سے مفعول مطلق من غیر لفظ مانا جائے، کیونکہ یہ لفظ بالالتزام الضّٰبِحَات پر دلالت کرتا ہے۔ فکأنه قيل والضابحات ضبحاً. اس صورت میں فعل محذوف ماننے کی ضرورت نہ ہوگی۔ تیسری ترکیب یہ ہے کہ اس کو الْعٰدِيٰتِ کی ضمیر سے حال مانا جائے اور مصدر بمعنی اسم فاعل ہوگا۔ ای ضَابِحَات ف عاطفہ الْمُوْرِيٰتِ: الْعٰدِيٰتِ کے مثل ہے اور قَدْحًا: مثل ضَبْحًا کے ہے (فی الوجوه الثلثة المذکورة) اس میں چوتھی وجہ یہ بھی جائز ہے کہ اس کو تمیز محول عن الفاعل مان لیا جائے ای فالموری قد حها.
فَالْمُغِيْرٰتِ: فَالْمُوْرِيٰتِ کی طرح ہے۔ اس میں اسناد مجازی ہے۔ اصل میں تھافا لمغیر اصحابها. صُبْحًا کا نصب ظرفیت کی بنا پر ہے ای فی وقت الصبح واللام فی کل ماسبق للعهد الذهنی والاشارة الی خیل الغزاة فَ تعقیبیہ برائے عطف اَثَرْنَ: فعل ضمیر جمع مؤنث راجع خیل معہود کی طرف فاعل بہ متعلق اور اس کی ضمیر وقت کی طرف راجع ہے جو صُبْحًا کا مدلول ہے نَقْعًا مفعول بہ والجملة عطف علی الفعل الذی وضع اسم الفاعل موضعهٗ ای واللائی عدون فاورين فاغرن فاثرن ولاشذ وذفی مثله لان الفعل تابع فلايلزم دخول ال عليه والحكمةفی مجیء هٰذا فعلاً بعد اسم فاعل علیٰ ماقال ابن المنير تصويرهٰذه الافعال فی النفس فان التصويريحصل بايراد الفعل بعد الاسم لمابينهما من التخالف فافهم. فَوَسَطْنَ مثل فَاَثَرْنَ، بہ متعلق

وَسَطْنَ کا یامتلبساً کے متعلق ہوکر حال وَسَطْنَ کی ضمیر سے۔اول ترکیب پر ضمیر مثل سابق وقت کی طرف لوٹے گی۔اور دوسری ترکیب پر نقعا کی طرف راجع ہوگی۔اور جَمْعًا مفعول فیہ ہے۔اِنَّ اپنے اسم الْاِنْسَانَ اور لَكَنُوْدٌ، لربہ متعلق مقدم سے ملکر خبر۔جملہ معطوف علیہ ہوا۔پھر اگلے دو جملے اسی ترکیب سے معطوفات۔تینوں معطوفات ملکر جواب قسم۔برائے استفہام انکاری فَ، عاطفہ معطوف علیہ محذوف (ای الفعل مایفعل من القبائح فلایعلم او الایلاحظ فلایعلم الأن ماله اِذَاالخ) لَايَعْلَمُ فعل ضمیر راجع لِلْاِنْسَان کی طرف فاعل مفعول محذوف جیسا کہ ابھی بیان کیا۔اور وہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اِذَا ظرفیہ مضاف بُعْثِرَ فعل ضمیر نائب فاعل۔ مَافِي الْقُبُوْرِ :ای من ثبت فی القبور جملہ فعلیہ صلہ موصول وصلہ مل کر فاعل۔ بُعْثِرَ اپنے فاعل سے ملکر جملہ فعلیہ مضاف الیہ۔مضاف ومضاف الیہ ملکر ظرف لَايَعْلَمُ کا یا اَفَلَايَعْلَمُ کا، فاعل ضمیر هُوَ ہے جو راجع ہے اللہ کی طرف۔اور عبارت یوں ہے افلا یعلم الله عاملین بما عملوا اذابعثر والعلم كناية عن المجازاة ای افلا یجازیهم اذالخ .وحُصِّلَ فعل مَافِي الصُّدُوْرِ ای ماجمع فی القلوب جملہ فعلیہ معطوف جملہ بُعْثِرَ...... پر،اِنَّ حرف مشبہ بفعل رَبَّهُمْ اسم لَخَبِيْرٌ اپنے متعلق مقدم بِهِمْ اور ظرف مقدم يَوْمَئِذٍ سے ملکر جملہ اسمیہ تعلیل ماقبل ای لِاَنَّ الخ یا اِذَاالخ شرط اور اِنَّ رَبَّهُمْ الخ جزا۔ وهٰذا اظهر.

تفسیر:

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں گھوڑوں کی چند صفات بیان فرمائیں۔اور ان کی قسم کھا کر فرمایا کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کے لئے کسی مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں۔کسی مخلوق کی قسم کھانا حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے۔چنانچہ باری تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں مختلف چیزوں کی قسمیں کھا کر خاص واقعات واحکام بیان فرمائے ہیں۔ان قسموں کے ذریعہ بات کو محقق ویقینی بتانا ہوتا ہے۔پھر جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے وہ چیز دعویٰ کی دلیل اور مضمون کے ثبوت میں خاص طور پر دخیل بھی ہوتی ہے۔ نیز مخاطبین اولین پر ان کے عرف کے اعتبار سے حجت قائم کرکے ان پر تکذیب وانکار کی فرد جرم کا ثبوت فراہم کرنا ہوتا ہے، کیونکہ اہل عرب کے عرف میں کسی چیز کو ثابت کرنے یا کسی بات کو منوانے اور کسی دعوے کو واقعی اور یقینی بنانے کے لئے آخری حجت قسم ہوتی تھی۔ وہ لوگ عقیدہ رکھتے تھے کہ جھوٹی قسم کھانے والا برباد ورسوا ہو جاتا ہے۔اسی لئے قسم کے بعد اس بات کا یقین نہ کرنا یا اس کو تسلیم نہ کرنا جرم ہوتا تھا۔اسی لئے باری تعالیٰ نے ان مضامین پر قسمیں کھا کر جن کو وہ نہ مانتے تھے کفار کو خود ان کی اپنی نگاہ میں مجرم قرار دیدیا ہے۔

انسان کے لئے درسِ عبرت:

یہاں انسان کے ناشکرگزار ہونے کو بیان فرمایا گیا تو اس کے اوپر شہادت کے طور پر اپنے ایک عظیم انعام کو ذکر فرما کر اس کی ایسی چار صفات باندازِ قسم بیان فرمائیں کہ ان سے شکرگزاری وجاں نثاری کا مشاہدہ ہوتا ہے۔اور یہ احوال انسان کے لئے ایسی کھلی ہوئی عبرت ہے جو اس کو شکرگزاری پر آمادہ کرسکتی ہے، بشرطیکہ اس میں عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت باقی ہو۔تشریح اسکی یہ ہے کہ گھوڑوں کے حالات خصوصاً جن کی گھوڑوں کے اوصاف پر نظر ڈالئے کہ وہ میدانِ جنگ میں اپنے محسن انسان کے اشارہ پر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر کیسی کیسی سخت خدمات انجام دیتے ہیں، حالانکہ انسان

گھوڑوں کا خالق اور حقیقی مالک نہیں ہے، وہ ان کو جو گھاس دانہ دیتا ہے وہ بھی اس کا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ خدا کے پیدا کئے ہوئے رزق کو ان تک پہنچا دیتا ہے، لیکن گھوڑا انسان کے اتنے سے احسان کو کیسا پہچانتا اور مانتا ہے کہ اسکے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جانِ عزیز کو خطرات کے حوالہ کر دیتا اور مصائب ومشکلات کو خوشدلی سے برداشت کر لیتا ہے۔ اسکے بالمقابل حضرت انسان کو دیکھئے جس کو حق تعالیٰ نے ایک ناپاک قطرۂ منی سے پیدا فرما کر کمالات سے نوازا، عقل وشعور دیئے، انعامات والطاف کی بارشیں اس پر برسائیں اپنی ساری مخلوق سے اشرف بنا کر کائنات کو اس کے لئے خدمت گزار قرار دیدیا، مگر ان تمام عظیم احسانات اور اعلیٰ انعامات کا مقابلہ وہ ناشکری ونافرمانی سے کرتا ہے۔ اب ذیل میں غازیوں کے گھوڑوں کی پانچ صفات دیکھئے جو اس سورت میں مذکور ہیں۔

(۱) وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا (ہم کو قسم ہے غازیوں کے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں) گھوڑے جب تیز دوڑتے ہیں تو انکے سینے سے اُخ اُخ کی آواز نکلتی ہے جس کو ضبح کہتے ہیں۔ ہانپنا اسی کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

(۲) فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا (پھر ان گھوڑوں کی جو اپنے ٹاپ پتھریلی زمین پر مار کر آگ نکالتے ہیں) قدح کے معنی ٹاپ مارنے کے ہیں۔ گھوڑے جب پتھریلی زمین پر تیزی سے دوڑتے ہیں تو ان کے نعل دار ٹاپوں کی ٹکر سے آگ کی چنگاریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ غازیوں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی یہ آگ قہر الٰہی کی آگ ہے۔ جو بدکاروں کے خرمنِ عیش کو بھسم کر دینے کے لئے کافی ہے۔

(۳) فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا (پھر ان گھوڑوں کی قسم جو صبح کے وقت دشمنوں پر دھاوا بولتے ہیں) یہ غازیوں کے گھوڑوں کا تیسرا وصف ہے کہ وہ راتوں دوڑتے ہیں۔ اور صبح ہوتے ہی جبکہ اعدائے دین خوابِ غفلت میں سرشار ہوتے ہیں اُن پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

(۴) فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (پھر ان گھوڑوں کی قسم کہ جو صبح کے وقت گرد وغبار اڑاتے ہیں) یہ غازیوں کے گھوڑوں کا چوتھا وصف ہے۔ صبح کے وقت گرد وغبار کا اڑانا قوت وشدّت پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ صبح کے وقت زمین شبنم سے تر ہوتی ہے۔ گرد وغبار دبا ہوا ہوتا ہے۔ بخلاف شام کے کہ اسوقت خشکی ہوتی ہے۔ ذرا سی حرکت سے گرد اڑنے لگتی ہے۔ اس چوتھی صفت میں اسم فاعل کی بجائے فعل اسلئے لایا گیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ گرد وغبار کا اٹھانا تھوڑی دیر کا فعل ہوتا ہے۔ بخلاف جہاد کی تیاری وکوشش کے کہ اس میں دوام ہے۔ وهكذا الكلام فی وَسَطْنَ.

(۵) فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (پھر وہ اس وقت میں دشمنوں کے انبوہ میں گھس جاتے ہیں) یہ پانچواں وصف ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ پانچوں اوصاف جنگی گھوڑوں کے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ اوصاف حج کو جانے والے اونٹوں کے قرار دیئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے۔

فائدہ:۱...... حضراتِ صوفیہ فرماتے ہیں کہ میدانِ ریاضت ومجاہدہ میں نفوسِ انسانیہ کے دوڑنے کو ہانپ کر دوڑنے والے گھوڑوں سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہی اپنی ریاضت کے نعلوں سے آگ چمکاتے ہیں۔ جس سے اشتیاق وعشق کے شرارے مراد ہیں۔ اور یہی وقت تجلی ربانی کا ہے (صبح کے مشابہ ہے) پھر وہ میدان قرب میں دھاوا کر کے جسمانی خواہشات کی گرد اُڑاتے اور مقامِ وصل وقرب میں جا گھستے ہیں۔ یہ تفسیر قرآنی نہیں بلکہ اشارات ہیں جو متصوفین نے سمجھے ہیں۔

فائدہ:۲...... مجرموں کی طرف قہر الٰہی کا متوجہ ہونا کمال مشابہت رکھتا ہے ان گھوڑوں کے ساتھ جو ہانپتے ہوئے

دوڑتے ہیں اور آتش دوزخ کے شعلے ان کے ٹاپوں کی زد سے اڑنے والی چنگاریوں کے مشابہ ہیں۔ اور عذاب دینے والے فرشتوں اور سانپ بچھوؤں کے کاٹنے کا نمونہ صبح کے وقت حملہ آور غازیوں میں موجود ہے۔ اور غبار اٹھانا کفار کی آنکھوں پر پردہ ڈالدینے اور ان کو نابینا اٹھانے کے مثل ہے۔ اور دشمنوں کے ازدحام میں گھس جانا غضبِ خداوندی کی آگ کے قلب وجگر میں گھس جانے کے مانند ہے۔ تو گویا یہاں قہرِ الٰہی کے چند نمونے پیش کر کے ناشکروں کو ان کے انجام پر متنبہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (بیشک انسان اپنے پروردگار کا ناشکرا اور احسان فراموش ہے) یہ جواب قسم ہے الْاِنْسَانَ میں اظہر یہ ہے کہ الف لام جنسی ہے۔ مگر یہاں اکثر افراد ملحوظ ہیں۔ اور بعض افراد انسان اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ ارشاد باری ہے ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ (میرے بندوں میں شکر گزار کم ہیں) حضرت ابن عباسؓ ومقاتلؒ سے مروی ہے کہ کنود بنی کندہ وحضر موت کے محاورہ میں بمعنی نافرمان ہے۔ ربیعہ ومضر کی زبان میں بمعنی ناشکرا ہے۔ اور بنی کنانہ کے عرف میں بمعنی بخیل وقلیل الخیر ہے لیکن اسکی راجح تفسیر کفور (ناشکرا) ہے یہی حضرت حسنؒ سے بھی منقول ہے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں بھی یہی ہے۔ اور جمہور علماء نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ علاوہ ازیں بخل وعصیان وغیرہ بھی ناشکری میں داخل ہیں۔ کیونکہ ناشکری مختلف طریقوں سے ہوتی ہے: (۱) خدائے تعالیٰ کی عطا فرمودہ نعمتوں کو اپنی کوششوں اور باطل معبودوں یا اسباب ظاہری کی طرف منسوب کر دینا (۲) انعامات کے حقوق ادا نہ کرنا (۳) انعاماتِ ربانی کو بے موقع صرف کرنا (۴) اپنے محسن ومربی کی طرف نہ جھکنا۔ اس کی معرفت، عبادت اور اطاعت سے گریز کرنا۔ (۵) لذات وشہوات میں مستغرق رہنا وغیرہ۔ اسلئے جمہور کی اختیار کردہ تفسیر عام اور ہمہ گیر ہے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (اور بیشک وہ اس پر خود گواہ ہے) ابن کیسانؒ کہتے ہیں کہ اِنَّهٗ کی ضمیر انسان کی طرف راجع ہے۔ اور ذٰلِكَ کا مشار الیہ کنودیت (ناشکری) ہے جس پر لفظ کنود دال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ناشکری کا خود اقرار کرتا ہے۔ یہ شہادت واقرار اس دنیا میں تو اس طرح سے واقع ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا۔ حالانکہ خود اس کا اپنا حال بھی ایسا ہی ہے۔ اس طرح اس کی بات اپنی ہی طرف لوٹتی ہے۔ اسی طرح قدرے غور وفکر سے انسان پر اسکے کفران وعصیان اور بخل کی حقیقتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ اور بہت سے لوگ اس کا اقرار واعتراف بھی کر لیتے ہیں۔ بازبانِ حال سے اس کیفیت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اور عالمِ آخرت میں تو ناشکرے ناشکری پر اپنی زبانوں سے شہادت دیں گے۔ اور تمام ہی گناہوں کا اقرار کر لیں گے۔ جیسے سورۂ مدثر میں ان کے اس اقرار کو بیان کیا گیا ہے: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ﴾ لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک اِنَّهٗ کی ضمیر رب کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ بیشک پروردگار ناشکرے انسان سے یا اس کی ناشکری سے خوب واقف ہے۔ اس مطلب پر یہ آیت ناشکرے کے لئے وعید ہوگی۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (اور انسان مال کی محبت کے لئے بڑا سخت اور قوی ہے) اس میں اِنَّهٗ کی ضمیر الْاِنْسَان کی طرف راجع ہے۔ اور خیر کے معنی بھلائی کے ہیں۔ خواہ وہ کوئی بھی بھلائی ہو لیکن یہاں اس سے مراد مال ہے عرب والے مال کو خیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا مال بھلائی ہی بھلائی اور فائدہ ہی فائدہ ہے۔ حالانکہ بعض مال انسان کو بہت سی مصیبتوں میں بھی مبتلا کر دیتا ہے۔ آخرت میں تو ہر مالِ حرام کا یہی انجام ہے، لیکن کبھی کبھی دنیا میں بھی وہ وبال بن جاتا ہے

۔مگر محاورۂ عرب کے مطابق اس آیت میں مال کو لفظ خیر سے تعبیر فرمادیا گیا ہے۔جیسا کہ ایک اور آیت میں ﴿اِنْ تَرَکَ خَیْرًا﴾ فرمایا۔اور خَیْرًا سے مال کو تعبیر فرمایا ہے۔مطلب یہ ہوا کہ ناشکرا انسان مال کی محبت میں بڑا شدید ہے۔محسن کی راہ میں مال خرچ نہیں کرتا۔کنود کے معنی اگر بخیل کے لئے جائیں تو لام تعلیلیہ ہوگا۔یعنی انسان محبت مال کی وجہ سے بڑا کنجوس ہے.

ناشکری اور حبِّ مال:

آیاتِ مذکورہ میں گھوڑوں کے اوصاف کی قسمیں کھا کر انسان کا ناشکر گزار وا احسان فراموش ہونا بیان کیا گیا۔اور تعریض کی گئی کہ ناشکرا انسان حیوانات سے بھی بدتر اور گیا گذرا ہے۔کہ حیوانات معمولی احسان سے مطیع وفرمانبردار ہوجاتے ہیں، مالک کی اطاعت کرتے ہیں مگر انسان عظیم احسانات کو بھول جاتا ہے اور اپنے منعم حقیقی کی نافرمانی کرتا ہے۔ان آیات میں اس طرف بھی اشارہ کردیا گیا کہ ایسے ناسپاس انسان دُنیا میں بھی سزا کے مستحق ہیں کہ ان سے جہاد کیا جائے، گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا جائے۔اور ان نعمتوں کو ان سے چھین لیا جائے، جن کی وہ ناقدری وناشکری کررہے ہیں۔اس کے بعد مال سے شدید محبت کرنے پر انسان کی مذمت کی گئی، درحقیقت ناشکری وحب مال دونوں خصلتیں شرعاً وعقلاً مذموم ہیں۔ناشکری کا مذموم ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔مال کی محبت کو جو مذموم قرار دیا گیا ہے تو نفسِ محبت مال کو نہیں بلکہ اسکے وصفِ شدت کے اعتبار سے حب مال کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔جسکا مطلب یہ ہے کہ انسان مال کی محبت میں اتنا مغلوب ہوجائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے بھی غافل ہوجائے۔اور اس کو حلال وحرام کی پرواہ بھی نہ رہے۔یہاں ایسی ہی اندھا دُھند محبت کی مذمت کی گئی ہے۔ایسی محبت جس سے آدمی احکامِ خداوندی سے غافل نہ ہو قابل مذمت نہیں، بلکہ وہ ایک فطری چیز ہے، کیونکہ انسانی ضروریات کا پورا ہونا اس عالم اسباب میں مال ہی پر موقوف ہے۔اسی لئے شریعت نے اس کے کسب واکتساب کو حلال ہی نہیں، بلکہ بقدرِ ضرورت فرض قرار دیا ہے۔یا یوں کہیے کہ مال کا بقدرِ ضرورت حاصل کرنا تو مذموم نہیں بلکہ محمود اور فرض ہے۔ہاں اس کی محبت مذموم ہے محبت کا تعلق دل سے ہے جیسے انسان پیشاب پاخانہ کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔اس کا اہتمام بھی کرتا ہے۔اور یہ ایک فریضہ بھی ہے۔مگر انسان کے دل میں پیشاب پاخانہ کی محبت نہیں ہوتی بیماری میں دوا پیتا ہے، آپریشن کراتا ہے، مگر دل میں ان چیزوں کی محبت نہیں ہوتی۔بلکہ یہ کام مجبوری میں کرتا ہے۔اسی طرح اللہ کے نزدیک بندۂ مومن کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ بقدرِ ضرورت مال کو حاصل بھی کرے، اسکی حفاظت بھی کرے، اور ضرورت کے موقعوں پر اس سے کام بھی لے، مگر دل اس کے ساتھ مشغول نہ ہو، بلکہ دست بکار دل بیار۔ہو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

آب اندر زیرِ کشتی پشتی است　　　آب در کشتی ہلاک کشتی است

یعنی کشتی پانی ہی میں چلتی ہے۔مگر جب تک پانی کشتی کے نیچے رہے۔تو وہ کشتی کا مددگار ہوگا۔اور یہی پانی کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔اسی طرح یہ مال جب تک دل کی کشتی کے اردگرد رہتا ہے تو مفید ومددگار رہوتا ہے۔اور جب دل کے اندر گھس جائے تو یہی ہلاکت وتباہی کا باعث بن جاتا ہے۔آگے ان دونوں مذموم خصلتوں پر وعید سنائی گئی۔اور جو یہ دعویٰ کرے کہ میں ناشکرا نہیں ہوں، یا مجھ کو مال سے حب شدید نہیں، اس کو بھی تنبیہ کی گئی ہے۔ارشاد ہے:

اَفَلَا یَعْلَمُ ...... کیا اس دنیادار ناشکرے غافل انسان کو معلوم نہیں کہ قیامت کے روز جبکہ مردے زندہ کرکے

قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ اور دلوں کی پوشیدہ باتیں کھل کر سامنے آجائیں گی۔ اور پروردگارِ عالم اُس دن ان سب کے جملہ حالات سے باخبر ہوگا۔ اور رب العٰلمین تو ہر وقت باخبر ہے۔ اس روز باخبر ہونے کی خصوصیت اس لئے ظاہر کی گئی کہ وہ سزا و جزا کا دن ہوگا۔ تو حق تعالیٰ کا خبیر ہونا اُس دن ایسا عیاں ہو جائیگا کہ کسی کو انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ زجاجؒ کہتے ہیں کہ خبیر کا مطلب ہے بدلہ دینے والا کیونکہ بدلہ دینے والے کا خبیر ہونا لازم ہے۔ پس لازم بولکر ملزوم مُراد لیا گیا ہے۔ والکنایة ابلغ من الصّراحة. اور جب رب العالمین تمام اعمال واحوال سے باخبر ہوگا تو وہ اعمال کے مطابق جزا و سزا بھی دیگا۔ لہٰذا عاقل کا کام یہ ہے کہ ناشکری اور مال کی بیجا محبت سے توبہ کر کے اپنی آخرت کو درست کر لے۔

فائدہ ۱: ..... مَافِی الْقُبُوْرِ میں مَا موصولہ ہے (جو غیر ذوی العقول کے لئے وضع کیا گیا ہے) بمعنی مَن ہے (جو ذوی العقول کے لئے آتا ہے) کیونکہ یہاں اس سے مردہ انسان مراد ہیں۔ اور یہاں ما کو من کی جگہ لانے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ مردے جمادات کی طرح بے عقل ہوتے ہیں اسلئے ان کے مناسب لفظ ما ہی تھا۔ یا مَافِی الصُّدُوْرِ میں مَا آیا ہے اس کی لفظی مناسبت سے مَافِی الْقُبُوْرِ میں بھی مَا کو لایا گیا۔ اور مَا و مَن ایک دوسرے کی جگہ بکثرت مستعمل ہوتے ہیں۔

فائدہ ۲: اس سورت میں مطلق انسان کی دو مذموم خصلتیں (ناشکری وحب مال کی شدت) بیان کی گئی ہیں۔ حالانکہ افرادِ انسان میں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ بھی ہیں۔ جو شکر گذار اور حب مال سے بری ہوتے ہین۔ وجہ یہ ہے کہ اکثر انسان چونکہ ان بُری خصلتوں میں ملوث ہیں اسلئے اکثر کے اعتبار سے مطلق انسان کی طرف ان خصلتوں کو منسوب کر دیا گیا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام افرادِ انسان میں یہ دونوں چیزیں پائی جائیں اس لیے بعض حضرات نے یہاں الانسان میں الف لام عہدی مان کر اس سے انسانِ کافر مُراد لیا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ مذکورہ دونوں مذموم خصلتیں دراصل کافر کی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی مسلمان میں بھی پائی جائیں تو اس کو فکر کرنا چاہیے۔ کہ یہ خصلتیں اس کی شان کے خلاف اور اس کے دامن ایمان پر داغہائے نازیباں ہیں۔ واللہ اعلم۔

تم تفسیر سورة العٰدِیٰت فالحمدُللّٰہ رب الکائنات والصلوٰة والسلامُ علیٰ سیدِالموجوداتِ وعلیٰ اٰلہ وجمیع الصَّحابةِ والصحابیَاتِ وَعَلیٰ مَنْ تِبعهم من المسلمین المُسلمات.

سُـــوْرَةُ الْقَـــارِعَـــةِ

سُـــوْرَةُ الْقَـــارِعَـــةِ مكيـــةٌ وَّهِيَ اِحْـدىٰ عَشَـرَةَ ايَـــةً

رکوع:ا۔ایات:۱۱ سورۂ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اوراس میں گیارہ آیات ہیں کلمات:۳۶۔حروف:۱۵۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرحمن الرحیم

اَلْــقَــارِعَةُ(١)مَــاالْــقَــارِعَةُ(٢)وَمَــآاَدْرٰكَ مَــاالْــقَــارِعَةُ(٣)يَــوْمَ يَــكُــوْنُ الــنَّــاسُ۔

وہ کھڑ کھڑادینے والی کیاہے وہ کھڑ کھڑادینے والی؟اور آپکو کچھ معلوم ہے کیا چیز ہے وہ کھڑکھڑادینے والی اُس دن لوگ

اَلْقَارِعَةُ	مَا	اَلْقَارِعَةُ	وَ	مَا	اَدْرٰكَ	مَا	اَلْقَارِعَةُ	يَوْمَ	يَكُوْنُ	النَّاسُ
ٹھوکنےوالی	کیاہے	ٹھوکنےوالی	اور	کس چیز	معلوم کروایاتجھ	کیاہے	ٹھوکنےوالی	دن	ہوجائیں گے	آدمی

كَــالْــفَـرَاشِ الْــمَبْثُــوْثِ(٤) وَتَــكُــوْنُ الْــجِبَــالُ كَــالْــعِهْــنِ الْــمَــنْــفُــوْشِ(٥)

منتشر پروانوں کی طرح ہوجائیں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین روئی کی طرح ہوجائیں گے ۔

كَالْفَرَاشِ	الْمَبْثُوْثِ	وَ	تَكُوْنُ	الْجِبَالُ	كَالْعِهْنِ	الْمَنْفُوْشِ
مانندٹڈیوں	پراگندہ	اور	ہوجاویں گے	پہاڑ	مانندپشم	دھنی ہوئی

فَـــاَمَّـــامَـــنْ ثَـــقُــلَــتْ مَــوَازِيْــنُـــهٗ(٦) فَهُــوَفِــىْ عِيْشَةٍرَّاضِيَةٍ (٧)وَاَمَّــامَــنْ خَــفَّــتْ

پھر جس شخص کاپلہ بھاری ہوگا تو وہ مَن مانی عیش میں ہوگا۔ اور جس شخص کاپلہ ہلکاہوگا

فَاَمَّا	مَنْ	ثَقُلَتْ	مَوَازِيْنُهٗ	فَهُوَ	فِيْ	عِيْشَةٍ	رَّاضِيَةٍ	وَ	اَمَّا	مَنْ	خَفَّتْ
پس اپیر	جوکوئی	بھاری ہو	تول اس	پس وہ	بیچ	زندگانی	خوش	اور	اپیر	جوکوئی	ہلکی ہو

مَــوَازِيْـــنُـــهٗ(٨) فَـــاُمُّـــهٗ هَـــاوِيَةٌ(٩) وَمَـــآاَدْرٰكَ مَـــاهِيَـــهْ(١٠) نَـــارٌ حَـــامِيَةٌ(١١)

تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا۔ اور آپ کوکچھ خبرہے کہ وہ کیاچیزہے ۔ وہ دہکتی ہوئی آگ ہے ۔

مَوَازِيْنُهٗ	فَاُمُّهٗ	هَاوِيَةٌ	وَ	مَا	اَدْرٰكَ	مَاهِيَه	نَارٌ	حَامِيَةٌ
تول اس	پس جائے اس	ہاویہ	اور	کیا	جانےتو	کیاہےوہ	آگ	جلتی ہوئی

لغات:

اَلْقَارِعَةُ اس کی شرح سورۂ الحاقہ کے شروع میں گذرچکی۔ اَلْفَراش جمع فَراشة کی: پروانے، چست وسبک آدمی یہاں اول معنی مراد ہیں۔ اَلْـفَراشَ کو یہاں بطوراسم جنس لایا گیاہے۔اسی لئے اس کی صفت مفردمذکر الـمبْثُوث لائی گئی۔ اوراَلْمَبْثُوْثَة نہیں لائی گئی۔جیسے السَّحاب اگرچہ السَّحابة کی جمع ہے لیکن وہ اسم جنس بھی ہے اسی لئے سَحَابٌ مَّرکُوْمٌ کہاجاتاہے۔اَلْمَبْثُوث اسم مفعول: منتشر، پراگندہ،بَثٌّ (ن ض) پراگندہ کرنا،بکھیرنا،ابھارنا،اَلْعِهْن ایسی روئی جومختلف رنگوں میں رنگی ہوئی ہو،جمع عُھُوْن. مَوَازِیْن اسم آلہ یااسم مفعول جمع المیزان یااَلْمَوْزُوْنَ کی ہے(ترازوئیں یاوزن کئے

جانے والے اعمال) وَزَنَ وَزْناً وزِنَةً (ض) تولنا، وزن کرنا، خَفَّتْ واحد مؤنث غائب (ض) ہلکا ہونا، اُمّ: ماں، ٹھکانا، اصل سبب۔ خلیلؒ نے تصریح کی ہے کہ ام ہر وہ چیز ہے کہ جس کی طرف اس کی تمام متعلق چیزیں ملادی جائیں۔ یہاں ٹھکانے کے معنی ہیں۔ هَاوِيَة: دوزخ کے ایک درجہ کا نام ہے۔ (ض) منہ کھولنا، اتر آنا، گر پڑنا (س) خواہش کرنا، محبت کرنا، مائل ہونا، هوّة: گڑھا، نشیبی زمین، زمین وآسمان کا درمیانی خلاء، هَوِيَّة: گہرا کنواں۔ مَاهِيَه میں اخیر هاء ہائے سکتہ ہے۔ حَامِيَةٌ: صیغہ اسم فاعل حَمِيَ حُمْياً وحُمُوًّا (س) تیز گرم ہونا۔ غضبناک ہونا حَمْياً وحِمَايَةً (ض) روکنا۔ بچانا۔

ترکیب:

شروع کی تین آیات کی ترکیب سورۃ الحاقہ کی ابتدائی تین آیات کی ترکیب کے مثل ہے۔ يَوْمَ مضاف يَكُونُ فعل ناقص النَّاسُ اسم الْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ مرکب توصیفی مجرور کٙ متعلق کائنین کا ہوکر خبر، یاکٙ اسمی بمعنی مثل مضاف ومضاف الیہ ملکر خبر۔ جملہ معطوف علیہ۔ وَتَكُونُ...... اسی ترکیب سے جملہ معطوف معطوفین ملکر يَوْمَ کا مضاف الیہ ہوا۔ يَوْمَ اپنے مضاف الیہ سے ملکر مناسب مقدر تَقْرَعُ کا ظرف (دَلّ عَلَيْهِ مَاقَبْلَهُ) وقيل محذوف اى سيأتيكم القارعةيوم آ ه، وقيل منصوبٌ بإضمار اُذكر، اى اذكريوم يكون آ ه. وقيل محله الرفع علىٰ انه خبرُ مبتدأمحذوف، وحركة الفتح لإضافته الى الفعل، وان كان مضارعاً كماهورأى الكوفيين اى هي يوم يكون...... ف تعقیبیہ اَمَّا تفصیلیہ مَنْ موصولہ ثَقُلَتْ فعل اپنے فاعل مَوَازِيْنُهُ سے ملکر جملہ فعلیہ صلہ۔ موصول وصلہ ملکر مبتدا ف جزائیہ جواب امَّا، هُوَ مبتدا، فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ جار مجرور متعلق عَائِشٌ ہوکر خبر۔ مبتدا وخبر جملہ اسمیہ ہوکر مبتدا اول کی خبر جملہ معطوف علیہ۔ اگلا جملہ اسی ترکیب سے معطوف۔ فَأُمُّهُ مبتدا، هَاوِيَةٌ خبر۔ جملہ ماسبق پر معطوف۔ وَمَآ اَدْرٰكَ مَاهِيَه: مر مثلهٗ غير مرةٍ۔ نَارٌ مبتدا، حَامِيَةٌ خبر، جملہ اسمیہ بدل یا بیان مَاهِيَ کا ہوا۔ یا مبتدا محذوف کی خبر ہے ای هِيَ نارٌ حَامِيَةٌ ہم نے اسی ترکیب کے لحاظ سے ترجمہ کیا ہے۔

تفسیر:

الْقَارِعَةُ اس میں تائے تانیث ہے۔ اور موصوف محذوف ہے ای السَّاعَةُ الْقَارِعَةُ یا تائے مبالغہ ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ الحاقہ میں گزر چکی ہے۔ اس کے لغوی معنی کھٹا کھٹا دینے والی کے ہیں، کیونکہ قیامت دلوں کو ہلا ڈالیگی۔ اس لئے اس کو قارعہ کہتے ہیں۔ حوادث دہر کو بھی (جو عاقل کے دل کو ہلا دیتے ہیں) قوارع الدھر کہتے ہیں۔ اور قرآن پاک کی اس قسم کی آیات کو جو طبع بشری کو جنبش دینے والی ہیں قوارع القرآن کہتے ہیں۔ اس سورت میں بھی ان مضامین کا ذکر ہے جو خوابِ غفلت سے جگا دینے والے اور دلوں کو ہلا دینے والے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کو سورۃ القارعۃ کہتے ہیں۔ اور اس سورت کی پہلی سورت کے ساتھ مناسبت ظاہر ہے۔ اسلئے وضاحت نہیں کی گئی۔ عیاں راچہ بیاں۔

يَوْمَ يَكُوْنُ...... (جس دن آدمی بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوجائیں گے) میدان حشر میں بکھرے ہوئے سرگرداں وپریشان انسانوں کو منتشر پروانوں سے چار چیزوں میں تشبیہ دی گئی ہے: (۱) بدحواسی وبے قراری میں (۲) کثرت وضعف میں کہ وہ ملائکہ کے مقابلہ میں بھنگوں کی طرح کمزور ہوں گے۔ (۳) بکھرنے اور ہر سمت دوڑنے میں (۴) آگ

میں گرنے میں کہ جس طرح پروانے آگ میں گرتے ہیں اسی طرح کافرلوگ آتشِ دوزخ میں گریں گے۔

وَتَكُونُ الْجِبَالُ ...... (اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین روئی کی طرح ہوجائیں گے) رنگین دھنی ہوئی روئی سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ مختلف رنگوں کے پہاڑ جب چوراچورا ہوجائیں گے تو ایک ایسی رنگت پیدا ہوجائیگی کہ گویا وہ دھنی ہوئی رنگین روئی ہے۔

فائدہ:......اجسام میں حق تعالیٰ نے ثقل (بھاری پن) رکھا ہے۔اور یہی ثقل اجسام کوسکون وقرار پر مجبور کرتا اور انکوحیزِ طبعی کی طرف جھکاتا ہے۔ پھر ثقل کی دوقسمیں ہیں: ایک ثقل حسی دوسری ثقل معنوی۔ اول قسم تو تمام اجسام میں ظاہر ومشاہد ہے۔ دوسری قسم ادراک وحواس والے اجسام میں، خصوصاً حضرتِ انسان میں پائی جاتی ہے۔ اس کو وقار وحلم کہتے ہیں جس میں یہ صفت ہوتی ہے اس کو حلیم، باوقار، متحمل اور بھاری بھرکم انسان شمار کیا جاتا ہے۔ انسان میں اس صفت کا نہ ہونا معیوب ہے۔ کفارِ قریش اپنی اس صفت تحمل ووقار پر بڑے نازاں تھے۔ وہ اس کی اتنی مشق کرتے تھے کہ اگر ان کے جسم پر زخم بھی لگ جائے تو وہ جس وضع پر بیٹھے ہوں اس میں کچھ فرق نہ آئے۔ انسان کے اس ثقل (وقار وحلم) سے اخلاقِ حمیدہ وملکاتِ فاضلہ میں ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے۔ اور حسنات پر عمل اور معاصی سے اجتناب کی توفیق میسر آتی ہے۔ اور یہی انسان کا مقصودِ زندگی ہے۔ پھر یہ ثقل جس میں جتنا ہوگا اسی کی مقدار میزان میں اس کا وزن ہوگا۔ اور جس میں یہ ثقل نہ ہوگا میزان میں اس کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ ﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ ایسے لوگوں کا وزن بہمیت وجسمانیت ان کو اپنے حیز طبعی مقام اسفل (ھاویہ) کی طرف لیجائیگا۔ اول قسم کا ثقل جو اجسام میں ظاہر ومشاہد ہے پہاڑوں میں زائد نمایاں ہے۔ کہ ان کو قدرت نے جہاں بٹھلا دیا وہیں بیٹھے ہیں۔ قطعاً ہلتے ہی نہیں۔ اسی لئے ثابت قدمی ووقار کو پہاڑوں کے ساتھ تشبیہ دیکر کہتے ہیں کہ فلاں شخص کوہِ وقار ہے حاصل یہ ہے کہ قیامت کے حادثہ کی شدت سے دونوں ثقل زائل ہوجائیں گے۔ انسان جو علم ووقار کے پہاڑ ہیں پروانوں کی طرح بکھر جائیں گے۔ اور پہاڑ بھی ہواؤں پر اڑ کر دھنی ہوئی روئی کی طرح ہلکے پھلکے ہوکر ہواؤں میں اڑتے پھریں گے۔ پھر اس عالم روحانی کے مناسب ثقل ثابت ہوکر میزان کو بھاری کردیگا۔ اور دوسری قسم کا ثقل انسان کو عالمِ اسفل کی طرف کھینچ کر ھاویہ میں ڈالدیگا۔

فَاَمَّا مَنْ ...... يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ میں انسانوں کی حالت مجملاً بیان کی گئی تھی یہاں سے اس کی تفصیل ہے۔ مَوَازِيْنَ، مَوْزُوْن کی جمع ہے۔ تو اس سے مراد اعمالِ صالحہ ہیں۔ کیونکہ اعمال سے مقصود اعمال صالحہ ہیں۔ اور میزان کی جمع ہے تو اس سے مراد ترازو ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے میزان کے دوپلڑے آسمان وزمین کی برابر پیدا فرمائے ہیں۔

لفظ جمع کیوں لایا گیا؟

مِنْ ثَقُلَتْ میں لفظ مَنْ لفظاً مفرد ہے اسی لئے ضمیر مفرد اس کی طرف عائد کی گئی لیکن معنوی اعتبار سے یہ جمع ہے۔ اور جمع کے مقابل جب جمع لائی جاتی ہے تو قاعدہ کے مطابق اکائیوں کو اکائیوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کی میزان جداگانہ ہوگی۔ یا کثرت موزونات کے سبب سے جمع لائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ تعدد وزن کی وجہ سے صیغہ جمع استعمال کیا گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایمان وعقائد کا وزن کرنے کی میزان اور ہو۔ اور اعمال کی دوسری یا اجزاء میزان کے

اعتبار سے یا مافوق الواحد کے اعتبار سے لفظ جمع لایا گیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میزان کی عظمت کی وجہ سے جمع کا صیغہ لایا گیا ہو۔ سلیمان جملؒ نے لکھا ہے کہ صحیح بات یہی ہے کہ سب امتوں اور تمام اعمال کے لئے ترازو ایک ہی ہوگی۔ اور ترازو ایک جسم مخصوص ہے جسمیں دو پلڑے اور ایک ڈنڈی ہوگی۔ ایک پلڑہ بقدر مشرق تا بمغرب وسیع ہوگا۔ اور اس ترازو کے قائم ہونے کا مقام جنت و دوزخ کے درمیان ہے۔ (تفسیر کبیر میں حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ وہ جبرئیل علیہ السلام کے ہاتھ میں ہوگی) اس کا داہنا پلڑہ نیکیوں کے لئے عرش کی داہنی جانب اور بایاں برائیوں کے لئے عرش کی بائیں جانب ہوگا۔

وَاَمَّامَنْ خَفَّتْ ......اس آیت کے عموم میں کافر و منافق بھی داخل ہیں۔ ایمان نہ ہونے کے سبب جنکی کوئی نیکی معتبر نہ ہوگی۔ اور وہ فاسق بھی داخل ہے جس کے گناہوں کا پلڑہ نیکیوں کے پلڑہ سے بھاری ہوگا۔ اور مَنْ ثَقُلَتْ میں صرف وہ مؤمن داخل ہیں جو معصوم ہوں یا مغفور یا ان کی نیکیاں گناہوں پر بھاری ہوں۔ لیکن بظاہر مَنْ خَفَّت میں کافر ہی داخل ہیں۔ انہی کی سزا کا بیان اگلی آیات میں ہے، کیونکہ قرآن مقدس نے اکثر متقیوں کے مقابلہ میں کفار ہی کا ذکر فرمایا۔ اور گنہگار اہل ایمان کے ذکر سے خاموشی اختیار کی ہے۔ اس لئے ان آیات میں بھی ایسا ہی ہے کہ مَنْ ثَقُلَتْ کا مصداق متقین ہیں۔ اور مَنْ خَفَّتْ کا مصداق کافرین۔ گنہگار اہل ایمان سے سکوت کیا گیا ہے۔ ان کے انجام کی قرآن نے پردہ پوشی کی ہے۔ امید ہے کہ آخرت میں بھی ان کے ساتھ ستاری کا معاملہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

آخرت میں انسانوں کے تین گروہ:

قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ آخرت میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے: (۱) متقیوں کا وہ گروہ جن کے کبیرہ گناہ نہ ہوں گے (بالکل نہ ہوں گے یا معاف کردیئے گئے ہوں گے) انکی نیکیاں ایک نورانی پلڑہ میں رکھی جائیں گی۔ اور وہ پلڑہ اوپر کو نہ اٹھے گا۔ البتہ دوسرا (گناہوں کا پلڑہ) خالی پلڑہ کی طرح (گناہ بالکل نہ ہونے کے سبب یا قلیل ہونے کے سبب) اوپر اٹھ جائیگا۔ (۲) کافروں کا گروہ ہوگا۔ ان کے کفر اور گناہوں کا بوجھ ظلمانی پلڑہ میں رکھا جائیگا اگر کوئی نیکی ہوگی تو وہ دوسرے پلڑہ میں رکھدی جائیگی مگر یہ پلڑہ خالی پلڑہ کی طرح اُوپر اٹھ جائیگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بعض موٹے اور لمبے چوڑے آدمی آئیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا وزن مچھر کے پر کی برابر نہ ہوگا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت ﴿فَلَانُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيمَةِ وَزْنًا﴾ پڑھی۔ (۳) تیسرا فرقہ گنہگاروں کا ہوگا۔ ان کی نیکیاں نورانی پلڑہ میں اور بُرائیاں ظلمانی پلڑہ میں رکھی جائیں گی۔ اگر نیکیوں کا پلڑہ بھاری ہوگا تو وہ جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ اور گناہوں کا پلڑہ بھاری ہوگا تو ان کا معاملہ مشیتِ خداوندی پر موقوف ہوگا۔ وہ چاہیگا تو بخشدیگا چاہیگا تو سزا دیگا۔ اگر دونوں پلڑے برابر ہوں گے تو ایسے لوگ اصحاب اعراف ہوں گے۔ بشرطیکہ وہ گناہ حقوق اللہ میں سے ہوں۔ لیکن اگر وہ گناہ حقوق العباد میں سے ہوں گے تو ان کی نیکیوں سے حقوق العباد کی ادائیگی ہوگی۔ اگر اعمال صالحہ سے ادائیگی ہوگئی تو خیر ورنہ حقوق والوں کے گناہ ان پر ڈالدیئے جائیں گے۔ اور سزا دیجائیگی۔ احمد بن حارث نے کہا کہ قیامت کے دن لوگوں کے تین فرقے ہوں گے۔ ایک فرقہ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے غنی ہوگا۔ دوسرا فرقہ اعمال صالحہ کم ہونے کی وجہ سے محتاج ہوگا تیسرا فرقہ اعمال صالحہ کے وجہ شروع میں غنی اخیر میں دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے بعد محتاج ہوجائیگا (یہ تینوں گروہ اہل ایمان ہی کے ہوں گے) سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ کوئی حق تعالیٰ شانہٗ کے حضور میں ایسے ۷۰ گناہ لیکر جائے جو حقوق اللہ میں سے ہوں یہ اس سے آسان ہوگا کہ وہ حقوق

العباد میں سے ایک گناہ بھی لیکر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حساب ہوگا۔ جس کی ایک نیکی بھی گناہوں س زائد ہوگی وہ جنت میں جائیگا۔ اور جس کے گناہ نیکیوں سے زائد ہوں گے وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ ترازو ایک دانہ کے وزن سے ہلکی پھلکی بھاری ہو جائیگی۔ اور جس کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی وہ اصحاب اعراف میں سے ہوگا۔ ایسے لوگ پل صراط پر رُکے رہیں گے یہاں تک کہ جب ان کو کچھ گناہوں کی سزا دیدی جائیگی اور نیکیاں بھاری ہو جائیں گی تو ان کو جنت میں داخل کر دیا جائیگا۔ علامہ سیوطیؒ نے کہا کہ جس متقی کا کوئی گناہ نہ ہوگا اس کے اعمال بھی تولے جائیں گے تا کہ اس کا شرف لوگوں پر ظاہر کر دیا جائے اور کافر کے اعمال بھی اس کی ذلت کو ظاہر کرنے کے لئے تولے جائیں گے۔

ایک شبہہ اور اسکا جواب:

متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ میزان عدل میں سب سے بڑا وزن کلمہ طیبہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ" کا ہوگا۔ جس کے پلہ میں یہ کلمہ ہوگا وہ یقیناً بھاری ہوگا۔ مثلاً ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، ابن حبانؒ، بیہقیؒ، اور حاکمؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں میری امت کا ایک آدمی ساری مخلوق کے سامنے لایا جائیگا۔ اور اس کے ننا وے نامہ اعمال لائے جائیں گے اور ان میں ہر نامہ اعمال تا حدِ نظر طویل ہوگا۔ اور یہ سب اعمالنامے گناہوں سے لبریز ہوں گے اس سے پوچھا جائیگا کہ جو کچھ ان میں لکھا ہے۔ سب درست ہے یا لکھنے والوں نے تم پر زیادتی کی ہے۔ وہ اقرار کریگا کہ اے میرے رب یہ سب کچھ صحیح ہے، پھر وہ دل ہی دل میں گھبرائیگا کہ اب میری نجات کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس وقت ارشاد باری ہوگا کہ آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ ان تمام کے مقابلہ میں ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی کا پرچہ بھی موجود ہے جس میں "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد انّ محمداً عبدہٗ ورسولہٗ" لکھا ہوا ہے۔ وہ عرض کریگا اے پروردگار اتنے بڑے بڑے سیاہ اعمال ناموں کے مقابلہ میں یہ چھوٹا سا پرچہ کیا کام دیگا۔ ارشاد ہوگا کہ تم پر ظلم نہیں ہوگا۔ اور ان سیاہ اعمال ناموں کے مقابلہ میں اس پرچہ کو رکھدیا جائیگا۔ تو یہ کلمہ والا پلہ بھاری ہو جائیگا۔ اور گناہوں والا پلہ ہلکا ہو جائیگا، اس واقعہ کو بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہوسکتی۔ مسند بزارؒ و مستدرک حاکمؒ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو اپنے لڑکوں کو جمع کر کے فرمایا کہ میں تمہیں لا الٰہ الا اللہ کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اگر ساتوں آسمانوں وزمین کو ایک پلہ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کو دوسرے پلہ میں رکھدیا جائے تو اس کلمہ کا پلہ سب سے بھاری رہیگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تمام آسمان اور زمینیں اور وہ سب لوگ جو ان کے درمیان ہیں اور وہ سب چیزیں جو ان کے درمیان ہیں اور وہ سب چیزیں جو ان کے نیچے ہیں ایک پلڑے میں رکھدی جائیں اور لا الٰہ الا اللہ کا اقرار دوسرے پلڑے میں رکھدیا جائے تو کلمہ والا پلڑہ ہی تول میں جھک جائیگا۔ (رواہ الطبرانی ورجالہٗ ثقات) علاوہ ازیں حضرت ابوسعیدؓ و حضرت ابوالدرداءؓ وغیرہ بہت سے صحابہ کرامؓ سے معتبر سندوں کے ساتھ اسی مضمون کی احادیث صحیحہ کتب حدیث میں منقول ہیں۔ ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن کا پلہ ہمیشہ بھاری رہیگا خواہ وہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو۔

لیکن دوسری آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کی حسنات وسیٰات کا وزن ہوگا۔اور کسی کی حسنات کا اور کسی کی سیٰات کا پلہ بھاری ہوگا۔جس کی حسنات کا پلہ بھاری ہوگا وہ نجات پا جائیگا۔اور جسکی سیٰات کا پلہ بھاری ہوگا اس کو عذاب ہوگا۔اور جسکے دونوں پلے برابر ہوں گے وہ اصحابِ اعراف ہوں گے۔مثلاً قرآن پاک میں ہے:وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَ كَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾ ترجمہ:......ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازوئیں قائم کریں گے اس لئے کسی پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا جو برائی یا بھلائی ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کسی نے کی ہوگی اس کو ہم لے آئیں گے اور ہم حساب کے لئے کافی ہیں۔اور سورۂ زلزال میں ہے:﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ اور اسی سورۃ القارعۃ میں فَاَمَّا مَنْ......اور مذکورہ بعض روایات کے علاوہ بہت سی دیگر احادیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی مؤمن کا پلہ بھاری اور کسی کا ہلکا ہوگا۔اس طرح بظاہر نصوص وروایات میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

الجواب الکافی بتوفیق الباری:

(۱) اس تعارض کا جواب بعض علمائے تفسیر نے یہ دیا ہے کہ میدانِ حشر میں وزن دوبار ہوگا اول کفر وایمان کا وزن ہوگا۔جسکے ذریعہ کافر ومؤمن ایک دوسرے سے ممتاز ہوجائیں گے۔پھر دوسرا وزن نیک وبداعمال کا ہوگا۔اس میں کسی مسلمان کی نیکیاں کسی کی برائیاں بھاری ہوں گی۔اور اسی کے مطابق جزاوسزا کا استحقاق ہوگا۔اس طرح تمام آیات وروایات کے مضامین اپنی اپنی جگہ پر درست اور مربوط ہوجاتے ہیں اور کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔(۲) قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں مؤمنین صالحین کے ثواب کے مقابلہ میں کافروں کی سزا کا ذکر اکثر مقامات پر آیا ہے۔اور مؤمنین فاسقین کے ذکر سے خاموشی اختیار کی گئی ہے۔اس لئے ظاہر یہ ہے کہ یہاں مَنْ ثَقُلَتْ میں مؤمنین کاملین کا ذکر ہے۔اور مَنْ خَفَّتْ میں کافرین اور بےعمل مؤمنوں کا ذکر یہاں پر مذکور نہیں ہے۔واللہ اعلم۔

وزن اعمال کس طرح ہوگا؟

بیشمار آیات واحادیث میں وزنِ اعمال کا ذکر ہے۔اس لئے اس میں کسی شک وشبہہ کی قطعاً گنجائش نہیں کہ اعمال کا وزن ہوگا۔﴿اَلْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ﴾ اب رہی یہ بات کہ اعمال تو اعراض ہیں ان کا وزن کیسے ہوگا؟

اس شبہہ کا جواب علماء نے کئی طرح سے دیا ہے۔اور ہر ایک نے اپنے اپنے جوابات کی تائید میں آیاتِ قرآنیہ اور نصوصِ حدیثیہ پیش کی ہیں۔مختصراً یہ ہے کہ (۱) بعض علماء کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال دوسرے عالم میں اچھی یا بری شکلیں اختیار کرلیتے ہیں۔ان شکلوں کو میزان میں رکھ کر تولا جائیگا۔بہت سی احادیث میں اعمال کے اچھی یا بری صورتوں میں قبر وحشر میں ظاہر ہونے کا ذکر وارد ہے۔اور حضرت صوفیاء دنیا ہی میں اس کا مشاہدہ کرلیتے ہیں۔(۲) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نامہ اعمال تولے جائیں گے۔یہ لوگ حدیث بطاقہ وغیرہ سے استدلال کرتے ہیں۔جس میں ایک چھوٹے سے پرچے کا نناوے بڑے بڑے دفتروں سے زیادہ بوجھل ہونا معلوم ہوتا ہے۔کمامر۔(۳) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ خود صاحبِ عمل کو تولا جائیگا۔چنانچہ بخاری ومسلم میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن بعض موٹے آدمی آئیں گے جنکا وزن اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کی برابر بھی نہ ہوگا اور اسکی شہادت میں آپ نے قرآن کریم کی

آیت ﴿فَلَا نُقِیۡمُ لَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ وَزۡنًا﴾ پڑھی۔ نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مناقب میں یہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی ٹانگیں بظاہر کتنی دبلی پتلی ہیں لیکن قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ میں میری جان ہے کہ قیامت کی میزان میں ان کا وزن اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا وغیرہ۔ (۴) حافظ ابن کثیرؒ نے یہ تمام اقوال اور ان کی تائید میں نصوص ذکر فرما کر لکھا ہے کہ ان تمام روایاتِ حدیث سے وزنِ اعمال کی کیفیت مختلف معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ وزن مختلف صورتوں سے کئی بار کیا جائے اور یہ بات ظاہر ہے کہ پوری حقیقت ان چیزوں کی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ نیز عمل کرنے کے لئے اس حقیقت کا جاننا بھی ضروری نہیں ہے۔ صرف اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ ہمارے اعمال کا وزن ہوگا۔ نیک اعمال کا پلہ ہلکا رہا تو عذاب کے اور بھاری ہوا تو ثواب ونجات کے مستحق قرار پائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی ایمان والے کو اپنے فضل سے یا کسی بندۂ مقبول کی شفاعت سے معاف کردیں تو یہ اور بات ہے یعنی یہ عدل سے آگے فضل کی شان ہے جن روایات میں مذکور ہے کہ صرف کلمہ ایمان پر نجات ہو جائیگی اور اس کے مقابلہ میں سب گناہ معاف ہو جائیں گے وہ بھی اسی استثنائی صورت سے متعلق اور مخصوص فضل وکرم کا مظہر ہے۔ (۵) توحید ورسالت کو ماننے والوں کے لئے تو صرف اتنی بات ہی بہت کافی ہے کہ اللہ جل شانہٗ مالک الملک وقادرِ مطلق ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جس چیز کو ہم نہ تول سکیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ بھی نہ تول سکیں۔ اور جبکہ صریح آیاتِ قطعیہ وکثیر روایات صحیحہ میں اعمال کے تولے جانے کا ذکر ہے تو ہمارے لئے کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اور ایمان کا تقاضا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا اور اٰمَنَّا وَ صَدَّقۡنَا کے سوا اور کیا ہے؟ اسکے علاوہ قلب مؤمن کو مطمئن کرنے کے لئے نہ تو کوئی اور دلیل درکار ہے اور نہ اس کو اس راہ میں عقل گھوڑوں پر سواری کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مگر ماڈرن قسم کے ذہن والے جو عموماً اپنی زبانوں سے مسلمان ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ہر چیز کو وہ اپنی کوتاہ عقل کی ترازو میں تولنا چاہتے ہیں۔ بیچارے اپنی جدت پسند طبیعت سے مجبور ہیں۔ ان کی ریسرچی ذہنیت اللہ ورسول کے ارشادات پر قناعت نہیں کرتی۔ اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس کو کسی پر اعتماد ہوتا ہے تو اس کو اس کا اعتبار ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے مجبوراً چند سطریں سیاہ کرنی ہی پڑیں گی۔ متوجہ ہوکر آپ مشاہدات کے عالم پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اس عالمِ دنیا میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کے تولنے کی ترازویں موجود ہیں۔ بڑے بڑے لکڑ تولنے کی ترازویں، غلہ کی بوریاں تولنے کی ترازویں، تھوڑا غلہ تولنے کی چھوٹی ترازویں، معمولی سودا سلف تولنے کی ترازویں، سونا چاندی تولنے کی ترازویں، ان سے بڑھ کر ٹرک اور موٹریں تولنے کی ترازوئیں، ریل گاڑیاں اور جہازوں وغیرہ کے تولنے کی ترازویں ہیں۔ یہ تمام ترازویں انسانوں نے مجسم چیزوں کے تولنے کے لئے ایجاد کی ہیں۔ لیکن ان میں بھی اتنا بڑا فرق ہے کہ ایک چیز کی ترازو دوسری چیز میں استعمال نہیں ہوتی، مثلاً لکڑ تولنے کی ترازوؤں میں سونا نہ تلے گا، ورنہ وارے کے نیارے ہو جائیں گے۔ اسی طرح سونے چاندی اور غلہ کی ترازوؤں میں لکڑیاں نہ تلیں گی۔ اور لکڑیوں والی میں ریل گاڑیاں اور جہاز نہ تل سکیں گے، بڑی بڑی گاڑیاں اور جہاز تولنے کی ترازویں ان کے انجنوں میں فٹ ہوتی ہیں۔ ان میں ترازوؤں سے یہ چیزیں تولی جاتی ہیں۔ آگے اور بڑھئے تو آپ کو ہوا تولنے کے آلات، سردی وگرمی تولنے کی ترازویں ملیں گی۔ اب اُن عقل کے پُتلوں سے پوچھئے کہ اگر اعراض نہیں تل سکتے، صرف اجسام ہی تُل سکتے ہیں تو سردی وگرمی کیا جسم ہیں؟ جو تولی جاتی ہیں۔ سائنس کی ترقی کے اس دور میں بھی وزنِ اعمال کا یقین نہ کرنا حیرت وتعجب کی بات ہے۔ ان عقل کے بندوں کو یہ معلوم نہیں کہ عقل میں کسی چیز کا نہ آنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ چیز موجود نہ ہو یا وجود میں نہ آسکے بیشمار عقلاء

نے خود اپنے آپ کو نہ سمجھتے ہوئے بھی خود کو موجود مانا ہے۔ اب سے چند سال قبل لوگ ٹیلی ویژن جیسی ایجادات کا یقین نہیں کر سکتے تھے۔ اور آج آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ایک عرصہ پہلے لوگ اس بات کا یقین نہیں کر سکتے تھے کہ انسان ہوا پر اڑ سکے گا۔ مگر اب یہ بات حیرت انگیز نہیں رہی۔ بہر حال مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبر دی ہے وہ یقینی ہے۔ اور عقل میں نہ آنا رعقل کے کوتاہ ہونے کی دلیل ہے نہ کہ خبر کے غلط ہونے کی، اگر ہاتھی کسی کی جھونپڑی میں نہ آسکے اور وہ اس کو اس میں گھسانا چاہتا ہے تو یہ اس کی جھونپڑی کی کوتاہی اور اس جھونپڑی والے کی بے وقوفی ہے۔ جھونپڑی میں بغیر داخل کئے ہوئے اس کو اپنی جھونپڑی کی کوتاہی اور ہاتھی کی عظمت تسلیم کر لینی چاہیے۔ اس کے علاوہ لوگ تو اس دنیا میں بھی اعمال واعراض کا وزن کرتے ہیں۔ آپ نے یہ کہتے ہوئے بہت سوں کو سنا ہوگا کہ فلاں شخص بہت بھاری عالم ہے۔ فلاں شخص بڑے بزرگ ہیں تو کیا عالم صاحب کو تول کر یا بزرگ صاحب کو میٹر سے ناپ کر دیکھا گیا ہے۔ نہیں نہیں۔ بلکہ یہ ناپ تول عقل کی ترازو سے ہوتی ہے۔ جس میں نہ پلے ہیں، نہ ڈنڈی ہے، کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی بات وزنی ہے۔ فلاں شخص کا نام بہت بھاری ہے۔ فلاں صاحب بہت بھاری بھرکم ہیں۔ لیجئے یہ دنیا کے انسان بھی اعمال واقوال صفات واعراض کو تول رہے ہیں۔ ان پر کوئی بھی شک وشبہ نہیں کرتا، بلکہ سب ایسی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور اگر قرآن وحدیث اعمال کے وزن کی اطلاع دیں۔ اور نبیوں کا سچا اور معتبر گروہ خبر دے تو یہی تصدیق کرنے والے تکذیب کرنے اور کہنے لگتے ہیں کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ اعمال واعراض کا وزن ہو سکے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ (مرآۃ الانوار شرح مشکوٰۃ الآثار از ص ۱۳۶ تا ص ۱۳۹)

فائدہ:......علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ جو لوگ بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ ان کے اعمال کے وزن کے لئے میزان نہیں لگائی جائیگی۔ اسی طرح جو لوگ بے حساب دوزخ میں جائیں گے ان کے لئے بھی ترازو قائم نہ ہوگی مؤخر الذکر لوگوں کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔ ﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ﴾ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ستر ہزار افراد بے حساب جنت میں جائیں گے۔ نہ ان کے لئے میزان قائم ہوگی نہ وہ اپنے اعمال نامے تلیں گے۔ بلکہ ان کو صرف ایک براءت نامہ دیدیا جائیگا۔ اصبہانی نے بروایت حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ میزانیں قائم کی جائیں گی۔ نمازیوں کو لاکر وزن کیا جائیگا اور پورا پورا اجر دیدیا جائیگا۔ حج والوں کو لاکر تولا جائیگا اور پورا پورا ثواب دیدیا جائیگا۔ اور اہل مصیبت کو لایا جائیگا تو ان کے لئے ترازو قائم نہ کی جائیگی۔ نہ ان کا رجسٹر کھولا جائیگا۔ بلکہ ان پر بے حساب اجر وثواب وعنایات کی بارش ہوگی۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ جو دنیا میں عافیت سے رہے تھے یہ تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ان کے بدن قینچیوں سے کاٹے جاتے (اور وہ اس پر صبر کر کے بے حساب اجر حاصل کرتے) یہی مطلب ہے اس آیت ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ کا۔ یہ مضمون متعدد روایات میں آیا ہے۔ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر چیز کا اندازہ اور وزن ہے۔ مگر (عاشق حق کا) ایک آنسو، کہ اس کے ذریعہ آگ کے سمندر بجھا دیئے جائیں گے۔

تنبیہ: اس قسم کی تمام آیات میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال تولے جائیں گے، گنے نہیں جائیں گے اور اعمال کا وزن بقدر اخلاص اور بقدر موافقت سنت ہوتا ہے، جس کے عمل میں اخلاص بھی کامل ہو اور اتباع سنت بھی مکمل ہو وہ تعداد میں کم ہوں۔ یہ اعمال ان لوگوں کے اعمال سے زائد وزنی ہوں گے جن میں اخلاص واتباع سنت کی کمی ہوگی۔ دنیا میں مخلصین ومتبعین سنت (مومنین کاملین) کا حق تعالیٰ کے نزدیک اعتبار ہے کثرت تعداد کا نہیں۔ اسی

لئے اسلامی جمہوریت میں انتخابات کا مدار کثرت تعداد پر نہیں بلکہ علم وعقل وتدین کی بہتات اور وزن پر ہے۔اور کفری جمہوریتوں میں گنتی کا اعتبار ہوتا ہے۔ العَاقِلُ تَكْفِيْهِ الاشَارَةُ. فَتَفَكَّرُ.

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (اس کا مسکن دوزخ ہوگا) مسکن کو اُم (ماں) سے اسلئے تعبیر کیا کہ ماں مرجع ہوتی ہے۔اولاد گھوم پھر کر ماں کی آغوش میں آ کر ٹھہرتی ہے۔هَاوِيَة دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام ہے ھاویہ جہنم کا ایسا گہرا غار ہے۔جس کی گہرائی کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔قتادہؒ نے اس کا ترجمہ اس کی ماں گرنے والی کیا ہے دراصل عربی کا محاورہ ہے کہ جب کسی پر سخت مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں هَوَتْ اُمُّهٗ (اس کی ماں گرگئی) اسی محاورہ سے یہ ماخوذ ہے جس کا مطلب کافر کے سخت مصیبت میں گرفتار ہو جانے کا اظہار ہے بعض نے کہا اُم سے مراد سر ہے۔مطلب یہ ہے کہ کافر سر کے بل جہنم رسید ہوگا۔

وَمَآ اَدْرٰكَ یہ استفہام برائے تعظیم (اظہار ہولناکی کے لئے) ہے کمامر غیر مرۃ۔مَاهِيَه حمزہؒ نے حالتِ وصل میں هِيَ اور وقف کی حالت میں هِيَه ہائے سکتہ کے ساتھ پڑھا ہے۔باقی تمام قراء نے وصل ووقف بہر دو صورت ہائے سکتہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اور یہ ضمیر ہاویہ کی طرف راجع ہے۔نَارٌ حَامِيَة لفظ حامية سے نار کی تاکید کر کے بتادیا گیا کہ وہ دُنیوی آگ نہیں بلکہ اسکے مقابلہ میں انتہائی تیز ہے۔

تم تفسیر سورۃ القارعة، فالحمدُ لله علىٰ نعمائه الشاملة الكاملة، والصلوة على حبيبه صاحب الصفات العالية، وعلىٰ آله واصحابه الذين فازوا بالدّرجات العالية، ومتبعهيم فى الايّام الخالية والآتية

سُورَةُ التَّكَاثُر

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانُ آيَاتٍ

(رکوع ا۔ آیات ۸. سورۂ تکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں آٹھ آیات ہیں کلمات ۲۸. ۱۳۰.)

ربط ومناسبت:

(۱) پچھلی سورت میں قیامت اور اسکے بعض احوال کا ذکر تھا۔اس سورت میں آخرت میں کامیاب ہونے کے لئے غفلت سے بیدار کر کے انسان کو اچھے اعمال پر آمادہ کیا گیا ہے۔اور تنبیہ کی گئی ہے کہ ہماری نعمتوں میں پڑ کر غفلت کا شکار نہ ہونا چاہیے انکا حساب ہوگا. (۲) سورۂ القارعۃ میں وزنِ اعمال اور حساب کا ذکر تھا، اس سورت میں بھی نعمتوں کے حساب پر تنبیہ ہے. (۳) فضولیات میں پڑ کر انسان آخرت میں کام آنے والے اعمال سے بے بہرہ رہ جاتا ہے۔اور اس کا ٹھکانہ دوزخ قرار پاتا ہے۔جیسا کہ پچھلی سورت میں بتایا گیا ہے۔اس سورت میں اسبابِ غفلت مال کی کثرت، افراد کی کثرت وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔بہر حال دونوں سورتوں میں ربط ومناسبت بہت واضح ہے۔

شانِ نزول:

اس کا اصل شانِ نزول تو تکاثر وتفاخر اور اسباب غفلت کا وجود ہے، لیکن روایات میں بعض واقعات کو بھی خاص طور پر اس سورت کا شانِ نزول قرار دیا گیا ہے۔(۱) ابن ابی حاتم نے ابو بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ سورت انصار کے دو قبیلوں (بنی حارثہ و بنی حرث) نے آپس میں ایک دوسرے پر فخر کیا۔ایک قبیلہ نے کہا

کہ بتاؤ ہماری فلاں فلاں شخصیتوں جیسی تمہارے قبیلہ میں موجود ہیں؟ دوسرے قبیلہ والوں نے یہی بات ان سے کہی۔ زندوں پر فخر کرتے کرتے نوبت مردوں تک آن پہنچی۔ اور کہنے لگے کہ چلو قبرستان اور بتاؤ کہ ہمارے قبیلہ میں جو فلاں تھے اُن جیسے تمہارے قبیلہ میں تھے؟ دوسروں نے بھی قبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہی بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ نازل فرمائی۔ (۲) ترمذیؒ، ابن جریرؒ اور ابن منذرؒ وغیرہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم عذابِ قبر کے سلسلہ میں شک کرتے رہے یہاں تک کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ نازل ہوگئی۔ (۳) بخاریؒ وابن جریرؒ نے حضرت ابن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ہم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد): **لو ان لابن آدم وادیین من مال لتمنی وادیاً ثالثاً ولایملأ جوف ابن آدم الاالتراب ثم یتوب اللہ علیٰ من تاب.** کو قرآن کی آیات ہی سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کا نزول ہوا. (۴) کلبیؒ کہتے ہیں کہ اس سورت کا سببِ نزول یہ ہے کہ قریش کے دو قبیلے (عبد مناف و بنی سہم) کسی مجلس میں اپنے اپنے مفاخر ذکر کرنے لگے۔ ایک نے کہا کہ ہمارا قبیلہ بہت مالدار ہے۔ اور آدمی بھی اس میں زیادہ ہیں۔ لہٰذا سرداری کا حق ہمارا ہی ہے۔ دوسروں نے کہا کہ ہم زیادہ ہیں۔ ہمارے قبیلہ میں بہادر زیادہ ہیں۔ اسی لئے وہ جنگوں میں زیادہ مارے گئے

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں وہ طفل کیا لڑیں گے جو گھٹنوں کے بل چلیں

اسی پر بات بڑھ گئی آخر کار یہ قرار پایا کہ چلو قبریں گن ڈالیں چنانچہ قبرستان پہنچ کر قبریں گنیں۔

مکیہ ہے یا مدنیہ؟

یہ سورت جمہور مفسرین کے نزدیک مکیہ ہے۔ ابوحیانؒ نے اس کے مکیہ ہونے پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔ لیکن علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے کہا ہے کہ اس کا مکیہ ہونا زیادہ مشہور ہے۔ اور شانِ نزول کی روایت (۴) اس کی تائید کرتی ہے۔ مقاتلؒ و قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ سورت مدنیہ ہے یہود کے تفاخر و تکاثر کے بارے میں نازل ہوئی، جس میں انہوں نے اپنی زندگی کی بہاریں فنا کردیں۔ ان کے قابلِ افسوس حال سے مسلمانوں کو عبرت دی گئی ہے۔ روایت نمبر ایک اور دو سے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ صاحبِ روح المعانی نے اسی کو مختار قرار دیا اور فرمایا ہے کہ **وعذاب القبر لم یذکر الافی المدینة کما فی الصحیح فی قصه الیهودیة انتهی. ولقوة الادلة علی مدنیتها قال بعض الاجلة انه الحق.**

(فائدہ) اس سورت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سورۃ المقبرۃ بھی کہتے تھے۔ اور وجہ تسمیہ بہر دو صورت ظاہر ہے۔

فضائل سورت:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کسی میں یہ طاقت نہیں کہ روزانہ قرآن پاک کی ایک ہزار آیات تلاوت کرلیا کرے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ ایک ہزار آیت کون پڑھ سکتا ہے؟ ارشاد فرمایا کیا تم میں سے کسی میں اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ پڑھنے کی طاقت نہیں (کہ یہ ایک ہزار آیات کے برابر ہے) (رواہ الحاکم والبیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رات میں ایک ہزار آیات پڑھ

لیا کرے تو وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملاقات کریگا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ہنس رہا ہوگا۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ ایک ہزار آیات کون پڑھ سکتا ہے؟ تو آپ نے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ اخیر تک پڑھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ سورت ایک ہزار آیات کے برابر ہے۔

ہزار آیات کے برابر کیوں ہے؟

ناصر الدین بن ملقؒ نے کہا کہ اس راز کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن پاک چھ ہزار دوسو آیات سے کچھ زائد پر مشتمل ہے کسر کو حذف کردیں تو قرآن کا چھٹا حصہ ایک ہزار آیات ہوں گی۔ اور یہ سورت مقاصد قرآن کے چھٹے حصہ پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہ سورت ایک ہزار آیات کے برابر ہوئی۔ امام غزالی نے فرمایا کہ قرآن پاک میں چھ مقاصد مذکور ہیں۔ تین تو اہم ترین مقاصد ہیں اور تین سے ان کی تکمیل مقصود ہے۔ تین اہم مقاصد یہ ہیں: (۱) معرفت خداوندی (۲) تعریف صراط مستقیم (۳) تعریف الآخرۃ۔ اوران کے متممات تین یہ ہیں: (۱) اہل اطاعت کے حالات کا ذکر (۲) منکرین کے اقوال کا بیان (۳) طریق کے منازل کی تفصیل۔ ان چھ میں سے اس سورت میں معرفت آخرت کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۲) كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳) ثُمَّ كَلَّا

تم کو بہتات کی حرص نے غفلت میں ڈال دیا یہاں تک کہ تم قبرستان جاپہنچے ایسا ہرگز نہ چاہیے بہت جلد تم کو معلوم ہوجائے گا خبردار

اَلْهٰكُمْ	التَّكَاثُرُ	حَتّٰى	زُرْتُمُ	الْمَقَابِرَ	كَلَّا	سَوْفَ	تَعْلَمُوْنَ	ثُمَّ	كَلَّا
غافل کیا تم	چاہ بہتات کی	یہاں تک کہ	ملوتم	قبروں	ہرگز نہ یوں	البتہ	جانو گے تم	پھر	ہرگز نہ یوں

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۴) كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ (۵) لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (۶)

بہت جلد تم کو پتہ چل جائے گا نہیں نہیں اگر تم کو یقینی طور پر معلوم ہوجاتا (تو ایسا نہ کرتے) ضرور تم دوزخ کو دیکھو گے۔

سَوْفَ	تَعْلَمُوْنَ	كَلَّا	لَوْ	تَعْلَمُوْنَ	عِلْمَ	الْيَقِيْنِ	لَتَرَوُنَّ	الْجَحِيْمَ
شتاب	جانو گے تم	ہرگز نہ یوں	کاش کہ	جانو تم	جاننا	یقین	البتہ دیکھو گے تم	دوزخ

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (۷) ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۸)

پھر تم اس کو بالیقین دیکھو گے۔ پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائیگا۔

ثُمَّ	لَتَرَوُنَّهَا	عَيْنَ	الْيَقِيْنِ	ثُمَّ	لَتُسْئَلُنَّ	يَوْمَئِذٍ	عَنِ	النَّعِيْمِ
پھر	البتہ دیکھو گے تم اس	دیکھنا	یقین	پھر	البتہ پوچھے جاؤ گے تم	اس دن	سے	نعمتوں

لغات:

اَلْهٰى: باب افعال سے، زیادہ ضروری چیز سے غافل رکھنا، لَهَا لَهْوًا (ن) کھیلنا۔ بصلہ باء فریفتہ ہونا، بصلہ الیٰ

مانوس ہونا، بصلہ عَنْ غافل ہونا۔ لَهِیَ لَهْیاً (س) بکذا: محبت کرنا۔ عنہ تسلی پانا، غافل ہونا۔ ذکر چھوڑنا۔ التَّکَاثُرُ: کثیر ہونا، کثرت میں ایک دوسرے پر غلبہ کرنا، بہت سمجھنا، دولت وجاہ، عزت ومرتبہ، مال واولاد کی کثرت کے لئے باہم جھگڑنا۔ مجرد میں (باب کرُم) سے کثیر ہونا۔ زُرْتُمْ (ن) ملاقات کے لئے جانا۔ الْمَقَابِر: صیغہ منتہی الجموع، المقبرۃ واحد تثلیث الباء واسم ظرف قبرستان، قَبَرَ قَبْراً وَمقْبراً (ن ض) دفن کرنا۔ افعال سے قبر بنانا، دفن کرنا۔ الْیَقِیْن: اعتقادِ جازم، کسی بات کو قطعی طور پر جان کر فہم میں سکون واطمینان پیدا ہوجانا یقین کہلاتا ہے۔ معرفت ودرایت سے یقین کا مرتبہ اونچا ہے۔ اسی لئے یہ ہمیشہ علم کی صفت ہوتا ہے۔ معرفتِ یقین نہیں کہتے، علم یقین کہا جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ یقین ہمیشہ علم کسبی کی صفت ہوتا ہے یعنی ترتیب تصورات کے بعد جو قطعی واطمینان بخش علم حاصل ہوتا ہے وہ یقین کہلاتا ہے، اسلئے اللہ کا علم یقین کے ساتھ متصف نہیں ہوتا۔ علم الٰہی تو بعینہ مشاہدہ ہے تحصیل وکسبی نہیں۔ باب استفعال وافعال وتفعل سب سے اس کے معنی یقین کرنا، کسی چیز کو یقینی پانا ہیں۔ یقین اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا ہونا ضروری ہو۔ اسلئے عربی میں موت کو بھی یقین کہتے ہیں ﴿وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ﴾ میں یقین سے مراد موت ہی ہے۔ مجرد میں (ض) سے واضح ہونا، یقین کرنا۔

ترکیب:

اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ فعل مفعول بہ اور فاعل علی الترتیب حَتّٰی حرف جر اس کے بعد اَنْ مقدر ہے۔ زُرْتُمْ فعل بافاعل الْمَقَابِرَ مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ بتاویل مفرد مجرور۔ جار مجرور متعلق فعل سابق اَلْهَا کے، پھر وہ جملہ فعلیہ ہوا۔ کَلَّا حرفِ ردع سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ جملہ فعلیہ تعلیل ردع، اگلا جملہ اسی ترکیب سے معطوف برائے تاکید۔ وثم: لمجرد التدرج لا للترتیب او الاول عند الموت والثانی عند الحشور. کَلَّا لَوْ حرفِ شرط تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ جملہ فعلیہ شرط، جواب شرط محذوف: ای لترکتم التغافل عن الاٰخرۃ. لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ فعل بافاعل مفعول بہ جملہ فعلیہ معطوف اسی طرح اگلا جملہ معطوف اس سے اگلا جملہ بھی ماسبق پر معطوف اور ترکیب ظاہر ہے۔

تفسیر:

اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ ...... تکاثر کثرت سے مشتق ہے۔ اسکے معنی کثرت کے ساتھ مال ودولت جمع کرنا ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ وحسن بصریؒ نے اس لفظ کی یہی تفسیر کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الھٰکم التکاثر پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مال ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے۔ اور اس پر عائد ہونے والے حقوق وفرائض کو ادا نہ کیا جائے۔ قتادہؒ نے تکاثر کی تفسیر تفاخر کے ساتھ کی ہے۔

حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ...... یہاں قبرستان پہنچ جانے کا مطلب یہ ہے کہ تم تکثیر مال وجاہ اور قبیلہ ونسب پر تفاخر میں ایسے غافل ہوئے کہ مرکر قبروں میں مدفون ہوگئے۔ اور موت تک تم اس غفلت سے باز نہ آئے۔ حدیث مرفوع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر یہی منقول ہے حتی یاتیکم الموت (ابن کثیر) یہ خطاب ان تمام انسانوں کو عام ہے جو مال واولاد کی محبت اور دوسروں پر اپنے فخر وبرتری میں ایسے مست رہتے ہیں کہ ان کو اپنا انجام سوچنے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن شخیر فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُر کی تلاوت فرمارہے تھے۔اور یہ ارشادفرمارہے تھے کہ یَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِیْ! مَالِیْ! وَھَلْ لَّکَ مِنْ مَّالِکَ اِلَّامَآاَکَلْتَ فَاَفْنَیْتَ، اَوْلَبِسْتَ فَاَبْلَیْتَ ،اَوْتَصَدَّقْتَ فَاَمْضَیْتَ، وَفِیْ رِوَایَةِلِمُسْلِمٍ وَمَاسِوٰی ذٰلِکَ فَذَاھِبٌ وَتَارِکُہٗ لِلنَّاسِ. آدم کا بیٹا کہتا ہے میرا مال میرا مال حالانکہ اسمیں تیرا حصہ تو اتنا ہی ہے جو تو نے کھا کھپالیا یا پہن پھاڑا، یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا۔اور اسکے سوا جو کچھ ہے وہ ترے ہاتھ سے جانے والا ہے۔اور تو اس کو دوسروں کیلئے چھوڑنے والا ہے۔(رواہ مسلم والترمذی)

امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ لَوْکَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیًامِنْ ذَھَبٍ لَاَحَبَّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَادِیَانِ، وَلَنْ یَّمْلَأَ فَاہُ اِلَّاالتُّرَابُ وَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ تَابَ. اگر انسان کے لئے ایک وادی سونے سے بھری ہوئی ہو تو اس کی خواہش ہوگی کہ دو وادیاں ہو جائیں۔اور اسکے منہ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔اور اللہ تعالیٰ اسکی توبہ قبول فرمالیں گے جو توبہ کریگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ پڑھ کر مذکورہ الفاظ سے اس کی تفسیر وتشریح فرمائی۔اس سے بعض صحابہ کو شبہ ہو گیا کہ یہ بھی الفاظ قرآنی ہیں بعد میں جب پوری سورت سامنے آئی تو اس میں یہ الفاظ نہ تھے۔تو یہ شبہہ جاتا رہا۔چنانچہ حضرت ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ ہم حدیث کے مذکورہ الفاظ کو قرآن سمجھا کرتے تھے یہاں تک کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ نازل ہوئی کمامر۔

اشارات:

(۱) کہتے ہیں کہ عرب کے ایک بدو نے یہ سورت سنی تو کہا بُعِثَ الْقَوْمُ لِلْقِیَامَةِ وَرَبِّ الْکَعْبَةِ اِفَاِنَّ الزَّائِرَ مُنْصَرِفٌ لَامُقِیْمٌ (یعنی رب کعبہ کی قسم لوگ قیامت کے دن زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے کیونکہ زائر لوٹتا ہے مقیم نہیں رہتا) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں لَابُدَّ لِمَنْ زَارَ اَنْ یَّرْجِعَ اِلٰی جَنَّةٍ اَوْنَارٍ. (۲) لفظ زیارت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ قبروں میں رہنے کی مدت آخرت کی بہ نسبت قلیل ہے.(۳) لفظ ماضی زُرْتُمُ میں تحقق وقوع کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ مستقبل میں جس چیز کا وقوع یقینی ہوتا ہے اس کو لفظ ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں.(۴) اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ زیادہ مرچکے اور کم باقی رہ گئے۔ لِلاکثر حکم الکل کے اعتبار سے صیغہ ماضی لایا گیا.(۵) موت آباء بمنزلہ موت ابناء ہے، کیونکہ ابناء مثل آباء ہیں۔فافہم۔

دوسری تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ تفاخر و برتری میں حد سے گزر جانے پر توبیخ ہے۔جیسا کہ یہود اور کفار نے اپنی کثرت پر فخر کیا، اور قبرستان کے مردے تک شمار کر ڈالے .حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (۱) میرے پاس اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی ہے کہ تم لوگ تواضع کرو۔نہ کوئی کسی پر فخر کرے، نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے.(مسلم)(۲) لوگوں کو اپنے مردہ باپ دادوں پر فخر کرنے سے باز رہنا چاہیے۔وہ جہنم کا کوئلہ ہیں۔اگر باز نہ آئے تو وہ اللہ کے نزدیک گوبر کے اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے جو گندگی کو اپنی سونڈھ سے لڑکاتا ہے۔اللہ نے تم سے جاہلیت کی حمیت اور باپ دادا پر جاہلیت کے زمانہ کا فخر زائل کر دیا ہے۔اب آدمی یا تو پرہیزگار مؤمن ہے یا بدنصیب فاجر۔سب لوگ آدم کی اولاد ہیں۔اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے۔(ترمذی،ابوداؤد)

فائدہ......اس آیت گرامی سے معلوم ہوا کہ قبروں پر فخر ومباہات کے لئے اور غفلت ولہولعب کے ساتھ جانا مذموم ہے۔جیسا کہ اس دور میں اہل بدعت کا طریقہ ہے۔عرسوں کی تقریبات میں یہی سب چیزیں موجود ہیں، بلکہ یہ جراثیم ان رواجی مشائخ میں بھی سرایت کر چکے ہیں جو اپنے آپ کو اہل حق سے منسوب کرتے ہیں کہ وہ اپنی مشیخت چمکانے کے لئے قبروں پر مراقب رہتے ہیں۔اور کشف القبور وا کتساب فیوض کے جھوٹے دعوے کر کے لوگوں کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں،ان سے لوگوں میں گمراہی پھیل رہی ہے۔اور اہل بدعت کو تقویت مل رہی ہے۔ہاں آخرت کی یاد تازہ کرنے ،دنیا کی بے ثباتی کا مشاہدہ کرنے ،اور گذشتہ لوگوں سے عبرت حاصل کرنے کے لئے اگر قبروں کی زیارت کی جائے تو بہتر ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تَذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ. (ابوداؤد) میں نے تم کو زیارتِ قبور سے منع کر دیا تھا۔(اب اجازت ہے)تم قبروں کی زیارت کرو، کیونکہ اس سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

سعادت کی اقسام:

سعادت کی دو قسمیں ہیں(۱)سعادتِ دنیوی(۲)سعادتِ اُخروی۔سعادت دنیوی صحتِ بدن،اسباب آسائش وآرائش،عزت وسربلندی اور ذکرِ خیر کی بقاء کے اسباب میں منحصر ہے۔ان چیزوں کا حاصل کرنا مباح ومحمود ہے،لیکن ان میں اتنا انہماک واستغراق کہ سعادتِ اُخروی کے حاصل کرنے سے غافل ومحروم رہ جائے مذموم وممنوع ہے۔اس سورت میں اسی مذموم پہلو پر زجر وتوبیخ ہے۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ...... بتقاضائے سیاق **تَعْلَمُوْنَ** کا مفعول بہ محذوف ہے **اى عاقبة تفاخركم وتكاثركم اذاعاينتم العذاب**. اس جملہ کو دوبارلایا گیا ہے یا تو تاکید مقصود ہے **ولكونه أبلغ نزّل منزلة المغايرة فعطف والّا فالموكد لايعطف على الموكد لمابينهمامن شدة الاتصال. فافهم** . یادونوں میں دووعیدیں جداجدا ہیں۔اور لفظ ثُمَّ ترقی مرتبہ کے لئے ہے۔جسکا مطلب یہ ہے کہ دوسری وعید پہلی سے زیادہ سخت ہے۔بعض کہتے ہیں کہ پہلی وعید موت کے وقت یا قبر میں عذاب کی ہے۔اور دوسری وعید کا قبر سے اٹھنے کے بعد سے تعلق ہے۔ **وهكذاقال على رضى الله عنه الاول فى القبور والثانى فى النشور فلا تكرير.** حضرت ضحاکؒ کہتے ہیں کہ اول کا تعلق کافروں سے ہے اور ثانی کا مومنوں سے،**وهذا خلاف الظاهر .فافهم**

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ...... حرفِ لَوْ شرط کے لئے ہے اور اسکی جزا محذوف ہے **اى لما الهكم التكاثر** یعنی اگر تم کو قیامت کے حساب کتاب کا یقین ہوتا تو تم اس تکاثر وتغافل میں نہ پڑتے۔اس آیت میں علم مصدر مضاف ہے اور الیقین بمعنی المتیقن مضاف الیہ۔یا اضافۃ الموصوف الی الصفت ہے **اى العلم اليقين** اور توصیف کا فائدہ یہ ہے کہ علم عام ہے یقین وغیر یقین دونوں پر اس کا اطلاق آتا ہے. صاحب مظہری کہتے ہیں کہ علم الیقین سے مراد وہ ایمان بالغیب ہے جو استدلال سے حاصل ہوتا ہے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ...... یہ جملہ بظاہر شرطِ مذکور کا جواب نہیں بن سکتا، کیونکہ رؤیت جحیم تو یقینی الوقوع ہے۔شرط کے وجود پر موقوف نہیں، بلکہ یہ قسم محذوف کا جواب ہے اور اس سے وعید مذکور کی تشدید وتاکید اور توضیح بعد الابہام مقصود ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لَوْ مذکور کا اس کو جواب قرار دیا جائے اور مطلب یہ ہوگا کہ **لَوْ تعلمون الجزاءَ علمَ اليقين الاٰن**

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ (یعنی اگر تم کو جزاء کا یقین کامل حاصل ہو جائے تو دوزخ کا تصور تم کو ہمہ وقت رہیگا۔ تمہاری نظروں سے جحیم اوجھل نہ ہوگی۔ یعنی یہ توجیہ رکیک ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ صاحب مظہریؒ کہتے ہیں کہ لَــوْ شرطیہ کو اِذا ظرفیہ کے معنی میں قرار دیا جائے اور اس سے مراد وقت موت لیا جائے۔ یعنی جب موت کے وقت آخرت کا تم کو یقین ہو جائیگا تو جحیم کو خود دیکھ لوگے۔ مگر تلافی مافات کا وقت جا چکا ہوگا۔ اسوقت جاننا سودمند نہ ہوگا وَ الْاَوَّلُ اَصَحُّ وَ اَوْضَحُ.

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ. عین الیقین سے وہ یقین مراد ہے جو مُشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کی گمراہی و گوسالہ پرستی کی اطلاع کوہِ طور پر دیدی گئی تھی مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتنا اثر اس خبر سے نہیں ہوا جتنا کہ قوم کی گوسالہ پرستی کا مشاہدہ کر کے ہوا، قوم کے حال کا مشاہدہ کر کے توریت کی تختیاں ہاتھ سے چھوڑ دیں اور اپنے بھائی حضرت ہارون کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ (رواہ احمد والطبرانی بسند صحیح)

فائدہ...... لَتَرَوُنَّ کا تکرار تاکید کے لئے ہے اور ثُمَّ وعید ثانی کی ابلغیت پر دلالت کرتا ہے۔ اور رؤیت سے مراد دونوں جگہ رؤیت نظری یہ یعنی مشاہدہ ہے۔ دونوں میں تغایر اس اعتبار سے ہے کہ رؤیت اولیٰ سے مراد دُور سے مشاہدہ ہے۔ اور رؤیت ثانیہ سے قریب سے مشاہدہ ہے۔ یا اول سے دور کے وقت کا مشاہدہ مراد ہے۔ اور ثانی سے دخول کے وقت کا مشاہدہ مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ رؤیت اولی سے معرفت مراد ہے۔ اور رؤیت ثانیہ سے مشاہدہ و معاینہ۔ بعض کہتے ہیں کہ تکرار ذکر سے مراد خلود فی الجحیم ہے کہ ہمیشہ بار بار اس کا مشاہدہ کرتے رہوگے۔ واللہ اعلم۔

یقین کی تعریف:

یقین کے لغوی معنی العلم الذی لاشک فیه کے ہیں۔ اور اصطلاحی معنی میں چند اقوال ہیں: (۱) کسی چیز کے متعلق یہ اعتقاد کہ وہ اس طرح ہے اور اسکے خلاف ممکن نہیں، بشرطیکہ وہ اعتقاد واقع کے مطابق غیر ممکن الزوال ہو. (۲) امام راغبؒ کہتے ہیں کہ یقین علم کی ایسی صفت ہے جو معرفت و درایت وغیرہ سے بڑھ کر ہے۔ اس کو علم یقین کہہ سکتے ہیں اور معرفتِ یقین نہیں کہہ سکتے اور اس کی حقیقت سکون النفس مع ثبات النفس ہے۔

یقین کے مراتب:

پھر یقین کے تین مرتبے ہیں (۱) علم الیقین جو انسان کو دلائل سے حاصل ہوتا ہے. (۲) عین الیقین جو انسان کو مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے. (۳) حق الیقین مذکورہ دونوں قسموں سے بڑھ کر ایک یقین ہے۔ مثلاً ہر عاقل شخص کو موت کا یقین ہے یہ علم الیقین کہلائیگا اور جب ملائکۃ الموت کا مشاہدہ ہو جائے تو اس کا یقین عین الیقین کہلائیگا۔ اور جب موت کو چکھ لے گا تو اس وقت کا یقین حق الیقین کہلائیگا۔ دوسری مثال آگ جلاتی ہے سب کو معلوم ہے یہ درجہ علم الیقین کہلاتا ہے۔ اور جب آگ کے جلانے کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تو یہ عین الیقین ہے اور اس آگ میں اپنا ہاتھ رکھدیا تو حق الیقین ہو گیا۔ حق الیقین سے بڑھ کر یقین کا کوئی مرتبہ نہیں۔ فائدہ...... عین الیقین کو ترکیب میں مفعول مطلق من غیر لفظہٖ قرار دے سکتے ہیں، کیونکہ رؤیت کے معنی بھی مشاہدہ کے ہیں اور عین کے معنی بھی مشاہدہ کے ہیں۔ اور عین بمعنی نفس ہے ای الرؤية التی هی نفس الیقین. یا مصدر محذوف کی صفت ہے ای رؤية عين اليقين. واللہ اعلم

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ...... (پھر تم سے ضرور بالضرور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے متعلق باز پرس ہوگی۔
اس آیت میں خطاب کس کو ہے؟ اس میں تین اقوال ہیں (۱) حسن، مقاتل اور قرطبی رحمہم اللہ علیہم کہتے ہیں کہ یہ خطاب کفار کو ہے جیسے کہ اس سے پہلے خطابات کفار ہی کو تھے۔ اور نعیم میں بھی تعیم ہے **کل مایتلذ ذبہ من مطعم ومشرب ومفرش ومرکب وغیر ذلک** اور سوال سے مقصود توبیخ وزجر ہوگا۔ (۲) بعض کہتے ہیں کہ خطاب صرف ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کو دنیا نے دین سے غافل کر دیا ہے۔ خواہ وہ کفار ہوں یا فاسقین۔ اور شروع سورت کا خطاب اس کا قرینہ ہے۔ اسی طرح نعیم کا مصداق بھی وہ نعمتیں ہیں جن میں مشغول ہو کر انسان آخرت سے غافل ہوا۔ (۳) بعض کہتے ہیں کہ خطاب عام ہے کفار وفساق اور مؤمنین کو۔ اور نعیم کے مصداق میں بھی عموم ہے۔ وھذا اولیٰ.

نعیم کا مصداق:

اس میں بھی مختلف اقوال ہیں کہ نعیم سے مراد کونسی نعمتیں ہیں؟ (۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نعیم سے مراد امن وصحت ہیں. (۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ عافیت مراد ہے. (۳) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ گیہوں کی روٹی، سایہ کی نیند اور ٹھنڈا پانی اس کا مصداق ہے. (۴) ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نعمت کے بارے میں قیامت کے دن سوال ہوگا وہ روٹی کا ٹکڑا ہے جو کھایا اور وہ پانی ہے جس سے سیرابی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ کپڑا ہے جس سے بدن چھپاتے ہیں. (۵) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لذیذ کھانا پینا مراد ہے (۶) حسین بن الفضل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آسان احکام اور سہل قرآن مراد ہے. (۷) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن یہ سوال ہر لذت کے متعلق ہوگا خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا لباس ومکان سے یا بیوی واولاد وغیرہ یا حکومت وعزت وغیرہ سے۔ قرطبیؒ نے اس قول کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ بالکل درست ہے اس سوال میں کسی خاص نعمت کی تخصیص نہیں۔ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ اس عموم سے البتہ وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو بے حساب جنت میں جائیں گے۔ اور یہی بات ہمارے نزدیک بھی درست ہے۔ جتنی روایات وآیات میں کسی مخصوص نعمت کے بارے میں سوال مذکور ہے وہ بطور مثال یا کلی کی جزئیات کے مثل ہیں مثلاً: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بندہ سے جس چیز کا سوال سب سے پہلے ہوگا وہ تندرستی ہے اس سے کہا جائیگا کہ ہم نے تم کو تندرستی نہیں دی تھی؟ اور کیا ہم نے تم کو ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا؟ (ترمذی وغیرہ)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ سرک سکے گا جب تک اس سے پانچ سوالوں کے جوابات نہ لے لئے جائیں: (۱) اپنی عمر کو کن کاموں میں فنا کیا؟ (۲) اس نے اپنی جوانی کہاں گنوائی؟ (۳) مال کہاں سے حاصل کیا؟ (جائز طریقہ سے یا ناجائز طریقہ سے. (۴) مال کو کہاں خرچ کیا؟ جائز طریقوں میں یا ناجائز طریقوں میں؟ (۵) جو علم حاصل کیا تھا اس پر کیا عمل کیا؟ (بخاری ومسلم) اسی طرح مذکورہ روایت میں بھی جزئیات وامثلہ ہیں **قال العلامة الآلوسی والحق عموم الخطاب والنعیم بید ان المؤمن لایثرب علیه فی شیء ناله منه فی الدنیا وانما یثرب علی الکافر.**

چند مؤید روایات:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دولت کدہ سے باہر تشریف لائے تو باہر ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو پایا۔ فرمایا: تم اس وقت گھر سے کیسے نکلے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! بھوک سے مجبور ہو کر نکلے ہیں۔ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، مجھ کو بھی اسی چیز نے نکالا ہے جس نے تمکو تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ پھر فرمایا کھڑے ہو جاؤ چنانچہ کھڑے ہو گئے۔ اور تینوں حضرات چلے اور ایک انصاری صحابی کے گھر پہنچے، وہ صحابی گھر موجود نہ تھے، ان کی بیوی نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، بیحد خوش ہوئیں اور آپ کو خوش آمدید کہا۔ آپ نے ان انصاری صحابی کے بارے میں معلوم کیا کہ وہ کہاں ہیں؟ عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ! تشریف رکھئے وہ ٹھنڈا پانی لینے گئے ہیں۔ اتنے میں وہ بھی آ گئے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ اور کہنے لگے اَلْحَمْدُللہِ مَا اَحَدِ الْیَوْمَ اَکْرَمُ اَضْیَافاً مِنِّی (الحمد اللہ آج میرے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جس کے گھر میرے مہمانوں سے زیادہ بزرگ موجود ہوں

قدم حضور کے آئے میرا نصیب کھلا جواب قصر سلیماں غریب خانہ بنا

پھر وہ اپنے باغ میں گئے اور کھجوروں کا ایک گچھا کاٹ لائے، جس میں کچی پکی کھجوریں تھیں۔ اور تینوں حضرات کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا، تناول فرمایئے اور بکری ذبح کرنے کے لئے چھری اٹھائی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دُودھ والی بکری ذبح نہ کرنا۔ الحاصل تینوں حضرات نے بکری کا گوشت کھایا پانی پیا اور کھجوریں کھائیں۔ جب سیر ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ وعمرؓ سے ارشاد فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم سے اس نعمت کے بارے میں قیامت کے دن سوال ہوگا" (ان انصاری صحابی کا نام ابوالہیثم بتایا جاتا ہے) ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ یہ قصہ ابوایوب انصاری کا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ آپ نے ان سے یہ ارشاد فرمایا کہ پکی کھجوریں لاتے، تو حضرت ابوایوبؓ نے عرض کیا کہ میں نے یہ سوچا کہ چھوارے، تر کھجوریں اور گدّر کھجوریں (ہر قسم کی) حضرت والا حسبِ منشا تناول فرمائیں۔ پھر بکری ذبح کر کے آدھی بھون کر اور آدھی شوربے دار پکائی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش فرمائی تو آپ نے بکری کا تھوڑا گوشت روٹی پر رکھا اور فرمایا اے ابوایوب! یہ فاطمہ کو دے آؤ کیونکہ کئی دن سے ان کو بھی کھانا نہیں ملا۔ چنانچہ حضرت ابوایوبؓ نے حضرت فاطمہؓ کے پاس وہ کھانا پہنچا دیا۔ پھر جب یہ حضرات کھجوریں اور روٹی، گوشت وغیرہ کھا پی کر سیر ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ یہی وہ نعمت ہے جس کے بارے میں تم سے سوال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ پس یہ وہ نعمت ہے جس کے بارے میں قیامت کے دن تم سے پوچھا جائیگا آپ کے اصحاب پر یہ بات شاق گزری تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں جب تم کو ایسی کوئی نعمت میسر آئے تو بسم اللہ کہہ کر شروع کرو اور سیر ہونے کے بعد کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَشْبَعَنَا وَاَنْعَمَ عَلَیْنَا وَاَفْضَلَ تو یہ اس نعمت کا بدلہ (شکر ہے) **ولیس المراد فی ھٰذا الخبر حصر النعیم مطلقاً فیما ذکر، بل حصر النعیم بالنسبۃ الیٰ ذلک الوقت الذی کانوا فیہ جیاعاً. وکذا فیما یصح من الاخبار التی فیھا الاقتصار علیٰ شیٔ اوشیئین او اکثر فکل ذلک مِن باب التمثیل .فافھم**

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا باہم علمی خیر خواہی کرو۔ کوئی کسی سے علم نہ چھپائے علمی خیانت مالی خیانت سے زیادہ سخت ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے اس کی باز پرس کریگا۔ حضرت ابوالدرداء کی روایت میں ہے کہ سب سے پہلے بندہ سے یہ سوال ہوگا کہ تو نے اپنے علم پر کیا عمل کیا۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ بندہ سے جس طرح مال کے متعلق باز پرس ہوگی مرتبہ کے متعلق بھی ہوگی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ بندہ اگر ایک قدم بھی چلے گا تو اس سے پوچھا جائیگا کہ اس قدم سے تیرا مقصد کیا تھا۔ حضرت معاذ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن بندہ کی ہر کوشش کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ یہاں تک کہ آنکھوں میں سرمہ لگانے کی بھی۔ حضرت حسن بصریؒ کی مرفوع روایت ہے کہ بندہ جو خطبہ دے اللہ تعالیٰ اس کے متعلق باز پرس فرمائیں گے کہ کس مقصد سے ایسا کیا تھا۔ (مظہری)۔

سوال کب ہوگا؟

آیت میں لفظ ثم سے معلوم ہوتا ہے کہ سوالِ نعمت جحیم دیکھنے کے بعد ہوگا۔ لیکن احادیث صحیحہ و آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر سوال ہوگا۔ محشر میں جیسا کہ اوپر روایت میں آچکا کہ میدان حشر میں کسی کا قدم اپنی جگہ سے اس وقت تک نہیں ہٹ سکتا۔ جب تک وہ پانچ باتوں کا جواب نہ دیدے۔ اور آیت ﴿ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوالِ نعمت پل صراط پر ہوگا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بندہ کے قدم پل صراط سے نہیں ہٹیں گے جب تک اس سے چار باتوں کے متعلق باز پرس نہ کر لی جائیگی (۱) عمر کہاں کھپائی؟ (۲) جسم کو کس کام میں دُبلا کیا؟ (۳) علم کے مطابق کیا عمل کیا؟ (۴) مال کہاں سے پایا اور کہاں خرچ کیا؟ (مظہری) حاصل یہ ہے کہ محشر میں بھی سوال ہوگا۔ پل صراط پر بھی اور جحیم کی رؤیت کے بعد بھی اور سب سے سب مقامات پر ہو یہ ضروری نہیں۔ بلکہ بعض افراد سے کسی مقام پر بھی کوئی سوال یا حساب نہ ہوگا۔ کما مرّ۔ اللھم اجعلنا منھم بفضلک۔

تم تفسیر سورۃ التکاثر فالحمدُللہ الذی وَصَلَ الینا کِتابہ بالتواتُر والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ الذی نھیٰ امتہ عن المظالم والملاھی والتکاثر وعلیٰ آلہ وصحبہ الذین اجتنبوا عن المناھی والتفاخر وسعوا الی الطاعات والاوامر بالتبادر والتظاھُرِ

سُوْرَةُ العَصْر

سُوْرَةُ العَصرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُ آيَاتٍ

(رکوع ۱۔ آیات ۳۔ سُورۂ عصر مکہ میں نازل ہوئی۔ اور اس میں تین آیات ہیں۔ کلمات ۱۴۔ حروف ۶۸)

سورۂ عصر اور اسکا ربط: یہ سورت ابن عباسؓ و ابن زبیرؓ اور جمہور مفسرین کے نزدیک مکیہ ہے اور مجاہدؒ وقتادہؒ و مقاتلؒ کی تحقیق میں مدنیہ ہے۔ اس کی مناسبت سورۂ تکاثر سے ظاہر ہے۔ (۱) کہ اس میں اہل تکاثر کو زجر و توبیخ اور تکاثر و تفاخر سے باز نہ آنے پر وعید تھی۔ اس سورت میں ان لوگوں کا حال مذکور ہے جو تغافل و تکاثر کا شکار نہیں ہوتے بلکہ اپنے صحیح مقصد پر زندگی گزارتے ہیں۔ (۲) انسان مال و دولت، جاہ و مرتبہ وغیرہ کو مقصود اصلی بناتا اور اس میں اپنی عمر کھپاتا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں میں بے بہا زندگی کو صرف کر دینا خسارہ ہے۔ اسلئے سورۂ تکاثر میں عمرِ گرانمایہ برباد کرنے پر وعید فرمائی۔ جس سے

خود بخود معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد حیات ہے۔ سورۂ عصر میں اس مقصدِ حیات کو واضح فرمایا گیا۔ تو گویا یہ سورت سابقہ سورت کے مضمون کی تاکید و توضیح ہے۔

سورۂ عصر کی فضیلت و اہمیت: حضرت عبیداللہ بن حصن فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ آپس میں ملتے تھے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے تھے جب تک کہ ایک دوسرے کے سامنے سورۂ والعصر نہ پڑھ لیتے۔ (رواہ الطبرانی وروی البھیقی عن حذیفۃ رضی اللہ عنہ) حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر لوگ صرف اسی سورت میں غور و فکر کر لیتے تو یہی ان کے لئے کافی ہو جاتی (ابن کثیر) اور فرمایا کہ اگر اس سورت کے سوا کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو یہی سورت لوگوں کو کافی تھی کیونکہ یہ سورت تمام علومِ قرآنیہ پر مشتمل ہے۔ (روح المعانی)

شانِ نزول: کلدۃ بن اسید جس کو ابوالاسدین بھی کہتے تھے زمانہ جاہلیت میں صدیق اکبر کا دوست تھا۔ حضرت صدیقؓ کے مشرف باسلام ہونے کے بعد ایک دن اس نے آپ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور کہا کہ اے ابوبکر! آپ نہایت عقلمندی و ہوشیاری سے تجارتوں میں نفع کماتے رہے آپ کو کیا ہوا کہ ایک دم خسارہ میں پڑ گئے۔ باپ دادوں کا دین بھی چھوڑ دیا۔ لات و عزیٰ کی عبادت سے بھی محروم اور ان کی شفاعت سے مایوس ہو گئے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس نادان سے فرمایا: جو حق کو قبول اور نیکی کو اختیار کر لیتا ہے وہ ہرگز خسارہ میں نہیں رہ سکتا۔ حق تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرما کر حضرت صدیق اکبرؓ کی تائید فرمائی۔ (فتح العزیز)

بِسمِ اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۲) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

زمانہ کی قسم! یقیناً سب انسان خسارے میں ہیں۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے کام کئے۔

	الْعَصْرِ	اِنَّ	الْاِنْسَانَ	لَفِیْ	خُسْرٍ	اِلَّا	الَّذِیْنَ	اٰمَنُوْا	وَ	عَمِلُوا
قسم	عصر	تحقیق	آدمی	البتہ بیچ	زیان	مگر	جولوگ کہ	ایمان لائے	اور	کام کیے

الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳)

اچھے اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی تاکید کرتے رہے۔ اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔

الصّٰلِحٰتِ	وَ	تَوَاصَوْا	بِالْحَقِّ	وَ	تَوَاصَوْا	بِالصَّبْرِ
اچھے	اور	ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں	ساتھ حق	اور	ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں	ساتھ صبر

لغات:

الْعَصْرِ: عَصْرٌ زمانہ، وقت عصر، نماز عصر جمع اَعْصَار، عُصُورٌ۔ اُعْصُر، عُصُر۔ مذکورہ معانی کے علاوہ دن، رات، صبح، قبیلہ، گروہ، عطیہ، غبار، خوشبو کی بھڑک وغیرہ اس کے بہت سے معانی آتے ہیں۔ اَلْعَصْرَانِ: صبح و شام، دن رات، عَصَرَ عصراً (ض) نچوڑنا۔ خُسْرٍ: مرّ فی سورۃ نوح۔

ترکیب:

وَالْعَصْرِ جار مجرور متعلق محذوف اُقْسِمُ جملہ قسم۔ اِنَّ اپنے اسم الْاِنْسَانَ اور خبر لَفِیْ خُسْرٍ سے ملکر جوابِ قسم اِلَّا کے بعد چاروں جملے معطوفات۔ ملکر صلہ، موصول وصلہ مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ الْاِنْسَانَ ہے جس میں الف لام استغراق یا جنس کے لئے ہے۔

تفسیر:

اس سورت میں حق تعالیٰ نے عصر کی قسم کھا کر فرمایا کہ نوعِ انسان بڑے خسارے میں ہے۔ اور اس خسارے سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو چار چیزوں کے پابند ہوں۔ ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ دارین کے خسارے سے بچتے ہوئے عظیم منافع حاصل کرنیکا یہ قرآنی نسخہ چار اجزائے مذکورہ سے مرکب ہے جن میں سے پہلے دو جز (ایمان وعمل صالح) اپنی ذات کی اصلاح سے متعلق ہیں۔ اور دوسرے دو جز دوسرے ابنائے جنس کی اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں۔

العصر کا مصداق:

لفظ عصر کے مشہور معانی تین ہیں: (۱) زمانہ (۲) دن کا آخری حصہ (۳) نماز عصر، یہاں تینوں معنی درست ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے زمانہ کے معنی مراد لئے ہیں۔ حسن بصریؒ وقتادہؒ نے دن کا آخری حصہ مراد لیا ہے۔ حضرت حسنؒ نے زوال سے غروب تک اور قتادہؒ نے دن کی آخری گھڑی۔ مقاتلؒ نے کہا کہ اس سے مراد نمازِ عصر ہے اسی کو قرآن مقدس میں صلوٰۃ وسطیٰ کہا گیا ہے۔ ابن کیسانؒ نے شب وروز دونوں کا مصداق قرار دیا ہے۔ تعبیر کا فرق ہے۔ ورنہ یہ ابن عباسؓ کے قول کے موافق ہے۔ جمہور مفسرینؒ نے اس کے معنی زمانہ ہی کے لئے ہیں۔ پھر بعض حضرات کہتے ہیں کہ عصر سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات کا زمانہ ہے، کیونکہ وہ اشرف الاعصار ہے۔ بعض کہتے ہیں حیاتِ ظاہری اور اس کے بعد قیامت تک کا زمانہ مراد ہے۔ اور سارے زمانہ کی مقدار گزشتہ زمانہ کی نسبت وہی ہے جو وقتِ صلوٰۃ عصر کو پورے نہار کے ساتھ ہے، بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **انـمابقاء كم فيمن سَلَفَ قبلكم من الامم كمابين صَلٰوة العصرالىٰ غروب الشمس** اور یہ زمانہ بھی کیونکہ آپ کا اور آپ کی امت کا زمانہ ہے اسلئے خیر الاعصار ہوا۔ لیکن عام مفسرین نے مطلق زمانہ ہی مراد لیا ہے۔

قسم اور اسکے جواب میں مناسبت

جمہور مفسرین نے العصر سے مراد زمانہ لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جواب قسم کے مضمون کو زمانہ سے کیا مناسبت ہے؟ کیونکہ قسم اور اس کے جواب میں مناسبت ضرور ہوتی ہے۔ عام مفسرین نے فرمایا کہ انسان اور اسکے تمام حالات کا وجود زمانہ ہی میں ہوتا ہے۔ اور جن اعمال کی ہدایت اس سورت میں دی گئی ہے وہ بھی اسی زمانہ کے لیل ونہار میں ہوں گے اس مناسبت سے زمانہ کی قسم اختیار کی گئی۔

وضاحت اس کی یہ ہے کہ انسان کی عمر کا زمانہ اس کے سال وماہ اور شب وروز بلکہ ساعات ولمحات ہی انسانی سرمایہ حیات ہے۔ جس سے وہ دارین کے منافع وفوائد حاصل کرسکتا ہے۔ اور عمر گرانمایہ کے اوقاتِ عزیزہ کو ضائع کردینا یا غلط مصارف میں صرف کردینا ہی اس کے لئے باعثِ صد حسرت وافسوس اور سببِ نکال ووبال ہے۔

حَیَاتُکَ اَنْفَاسٌ تُعَدُّ فَکُلَّمَا مَضٰی نَفَسٌ مِنْهَا انْتَقَصَت بِهٖ جُزْءٌ ا

تیری زندگی چند گنے چنے سانسوں کا نام ہے۔ جب ان میں سے ایک سانس گزر جاتا ہے تو تیری عمر کا ایک حصہ کم ہو جاتا ہے

دم بدم دھیرے دھیرے چپکے چپکے کم برف مثل عمر ہے ہو رہی

حق تعالیٰ نے ہر انسان کو زندگی کے اوقات کا ایک بے بہا سرمایہ دیکر تجارت پر لگا دیا ہے۔ کہ وہ عقل و شعور سے کام لیکر اس سرمایہ کو نفع بخش متاع پر لگائے اور ابدی منافع حاصل کرے۔ نیز مضرت رساں اور ردی کاموں پر اس کو صرف کر کے ضائع نہ کر دے۔ یہ وہ عظیم خسارہ ہے جسکی تلافی ممکن نہیں۔ ع۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ ایک حدیث سے اسکی تائید ہوتی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کُلٌّ یَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْمُوْبِقُهَا. (مشکوٰۃ) یعنی ہر شخص صبح اٹھ کر اپنی حیات کا سرمایہ تجارت پر لگاتا ہے پھر کوئی تو اپنے اس سرمایہ کو خسارہ سے آزاد کر لیتا ہے اور کوئی اس کو برباد کر ڈالتا ہے۔ خود قرآن پاک نے بھی ایمان و عمل صالح کو انسان کی تجارت قرار دیا ہے۔ ﴿ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴾ اور جب اوقاتِ حیات انسان کا سرمایہ گرانمایہ قرار پایا تو عام حالات میں اس کے تاجر کا خسارہ میں رہنا اس لئے ظاہر ہے کہ اس مسکین کا سرمایہ کوئی منجمد چیز نہیں جس کو کچھ دنوں محفوظ رکھا جاسکے بلکہ ایسا سیّال سرمایہ ہے جو برف کی طرح ہر لحہ بہہ رہا ہے۔ تاجر کو بہت ہوشیار و مستعد رہنا چاہیے تا کہ اس بہتی ہوئی چیز سے نفع کما لے۔ ایک بزرگ کسی برف بیچنے والے کی دُوکان پر گئے تو فرمایا کہ اس کی تجارت کو دیکھ کر سورۃ العصر کی تفسیر سمجھ میں آ گئی۔ یہ اگر ذرا سی غفلت کرتا ہے تو اس کا سرمایہ پانی بن کر بہہ جائیگا۔ اور یہ سراسر خسارہ میں رہ جائیگا، اس لئے اس خسارہ سے بچنے کا نسخہ قرآن پاک نے تجویز فرمایا جو چار اجزا سے مرکب ہے۔ اپنی حیات کا ہر لحہ ان چار کاموں میں مشغول کر دینے سے اس خسارہ سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

زمانہ کی قسم کی ایک مناسبت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے اس کی حیثیت اس معاملہ پر جو جوابِ قسم ہے ایک شاہد کی ہوتی ہے۔ اور زمانہ ایسی چیز ہے کہ اگر اس کی تاریخ اور اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اچھے بُرے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو ضرور اس یقین تک رسائی ہو جائیگی کہ صرف یہ چار کام ہیں جن میں انسان کی فلاح و کامیابی مضمر و منحصر ہے۔ جس نے ان کو چھوڑا وہ ناکام نقصان و خسارہ میں پڑا۔ دنیا کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ عصر زمانہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی قسم اس لئے اختیار فرمائی کہ زمانہ بہت سے عجائب کو مشتمل ہے اسی لئے زمانہ کو ابوالعجب بھی کہتے ہیں۔ نیز زمانہ جملہ انعامات و حوادث و مصائب کو حاوی ہے۔ اس میں انسان کو تنبیہ کی گئی ہے۔ کہ خسران و نقصان بھی اس زمانہ ہی میں حاصل ہو سکتا ہے اور دولتِ سعادت بھی۔ اور اگر عصر سے مراد وقت شام یا صلوٰۃ عصر ہو تو اس میں بھی بہت سی خصوصیات ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن اسی ساعت میں پیدا فرمایا گیا تھا۔ اس لئے پیدائش کے وقت کی قسم کھا کر مقصدِ خلقت پر متوجہ کیا گیا ہے۔ اسطرح اس وقت میں صلوٰۃ عصر ہے۔ جو جمہورؒ کے نزدیک صلوٰۃ وسطیٰ (افضل ترین نماز) ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ فَاتَتْهُ صَلٰوةُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ (جس کی صلوٰۃ عصر فوت ہوگئی گویا اس کے اہل و عیال سب برباد ہوگئے) ترک صلوٰۃ عصر میں خسران عظیم اور اس کے اہتمام میں خسران سے حفاظت ہے۔ اسی طرح انسان کو اپنے اوقاتِ حیات کو مقصدِ حیات پر نہ لگانا خسران ہے۔ اور اوقاتِ عزیز کو ضائع ہونے سے بچانا خسران سے حفاظت ہے۔ اگر مزید غور کیا جائے تو دیگر بہت سی مناسبات خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔

اجزائے چہارگانہ:

ایمان و عمل صالح کا تعلق تو خود انسان کی اپنی ذات سے ہے۔ یہاں اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ البتہ تواصی بالحق و تواصی بالصبر کی وضاحت ضروری ہے۔ کہ ان سے کیا مراد ہے۔ لفظ تواصی وصیت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت اور نیک کام کی ہدایت کرنا۔ اسی وجہ سے مرنے والا جو کچھ بعد والوں کے لئے ہدایات دیتا ہے اس کو وصیت کہتے ہیں۔ یہ دو جز درحقیقت اسی وصت کے دو باب ہیں۔ ایک حق کی وصیت، دوسرے صبر کی وصیت، پھر ان دونوں لفظوں میں کئی احتمالات ہیں۔ (۱) حق سے عقائدِ صحیحہ و اعمالِ صالحہ کا مجموعہ مراد ہو۔ اور صبر سے تمام گناہوں اور برے کاموں سے بچنا مراد ہو۔ تو وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کا حاصل امر بالمعروف اور وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کا حاصل نہی عن المنکر ہوا۔ اور دنوں کے مجموعہ کا حاصل پھر وہی ایمان وعملِ صالح ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ جس کام کو خود اختیار کیا ہے اسی کی نصیحت و وصیت دوسروں کو کرنی چاہیے۔ (۲) حق سے مراد اعتقادات حقہ ہیں۔ اور صبر کے مفہوم میں تمام اعمالِ صالحہ کا کرنا اور تمام گناہوں سے بچنا داخل ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کو ایمان وعمل صالح سے روکنے والی عادۃً دو ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک شبہات یعنی ایمان وعملِ صالح میں کچھ نظری وفکری شبہات کا پیدا ہو جانا، شبہات سے عقائد مختل ہو جاتے ہیں۔ اور عقائد کے مختل ہو جانے سے اعمالِ صالحہ کا مختل ہو جانا ظاہر ہے۔ دوسری چیز شہوات یعنی خواہشات نفسانی ہیں جو انسان کو بسا اوقات عمل صالح سے روک دیتی ہیں۔ اور بعض اوقات گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اگر چہ وہ فکری و اعتقادی طور پر نیکی پر عمل اور برائی سے اجتناب کو ضروری سمجھتا ہو۔ مگر وہ خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو کر سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھتا ہے۔ تو آیت مذکورہ میں وصیتِ حق سے شبہات کو دور کرنا اور وصیتِ صبر سے شہوات کو چھوڑ کر اعمالِ صالحہ اختیار کرنے کی ہدایت وتاکید کرنا مراد ہے۔ اسکا خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کی علمی اصلاح اور عملی اصلاح کی کوشش بھی ضروری ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ ان چاروں امور میں سے اول دو کا تعلق تکمیل نفس سے ہے۔ اور دوسرے دو کا تعلق تکمیل خلق سے ہے۔ گو ان سے بھی انسان کو بیحد کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کا اپنا ایمان وعملِ صالح تو تھوڑی مدت کا ہے۔ اور وصیتِ حق و وصیتِ صبر کا نفع قرنوں اور مدتوں جاری رہتا ہے۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ امت میں سب سے افضل ہیں۔ کہ ان کے منافع واُجور کا سلسلہ تا قیامت ہے اسی طرح علماء کا مقام عوام سے بلند تر ہے۔ پھر فرمایا کہ ارشاد تکمیل روحانی ،طباعتِ جسمانی کے مثل ہے۔ اور طبیب دو کام کرتا ہے۔ اوّل دوا تجویز کرتا ہے۔ پھر پرہیز بتاتا ہے۔ وصیت حق میں دوا تجویزیں کی گئی کہ وہ عقائد صحیحہ واعمال صالحہ کا مجموعہ ہے۔ اور وصیتِ صبر میں پرہیز کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح دونوں چیزوں سے صحتِ روحانی حاصل ہو جائے گی۔

نجات کے لئے صرف اپنی اصلاح کافی نہیں:

اس سورت سے مسلمانوں کو ایک بڑی ہدایت یہ ملی کہ مسلمانوں کو اپنی ذات کو قرآن وسنت کا تابع بنالینا اور اپنے عقائد واعمال کی اصلاح کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی ایمان وعمل صالح کی طرف دعوت دینا اور اپنی مقدور بھر ان کی اصلاح کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے خصوصاً اپنے اہل وعیال و متعلقین سے اس معاملہ میں غفلت برتنا اپنے اوپر نجات کا راستہ دشوار کرنا ہے۔ اسی لئے قرآنِ مقدس واحادیث نبویہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو فرض قرار دیا گیا ہے۔

مسئلہ: بھلائی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا واجب ہے اس کو ترک کرنے والا خاسر ہے۔(مظہری) بہت سی آیات واحادیث میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تاکیدیں اور اسکے ترک پر وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

تم تفسیر سُورۃالعصر فالحمدُ للہ مقلب الدھر، والصلوٰۃ والسلام علیٰ من قال انا سید وُلد آدم ولافخر، وعلیٰ آلہ وصحبہ ومن تعبھم الیٰ یوم الحشر

سُورَۃُ الْھُمَزَۃِ

سُوْرَۃُالْھُمَزَۃِمَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعُ آیَاتٍ

(رکوع ۱۔آیات ۹۔ سورۂ ہمزہ مکہ میں نازل ہوئی اوراس میں نو آیات ہیں کلمات ۲۰۔حروف ۱۳۰۔)

ربط ومناسبت:

سورۃ عصر میں بیان تھا کہ ہر انسان خسارہ میں ہے ۔بجز ان لوگوں کے جن میں چار اوصاف مذکورہ موجود ہوں۔ اس سورت میں خسارہ میں پڑنے کے چند اسباب بیان کئے گئے ہیں۔گناہ کی دو قسمیں ہیں حقوق اللہ میں کوتاہی جیسے ترک صلوٰۃ وزنا وغیرہ۔ اورحقوق العباد میں کوتاہی ۔قسم ثانی میں بدترین حق تلفی ،ایذاء رسانی اور آبروریزی ہے۔خصوصاً خاصانِ خدا کی دل آزاری زیادہ سخت ہے۔ بندوں کی حق تلفی ایسا گناہ ہے کہ وہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا۔ جب تک کہ بندہ خود ہی معاف نہ کردے۔ان افعالِ قبیحہ سے دنیا میں بھی خسارہ ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً جماعت میں تفرقہ ،آپس کا فساد، تمدن میں خلل۔ اسی لئے غیبت کومردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی۔ اور اس کوزنا سے زائد سخت قرار دیا گیا۔طعن وتشنیع ونقالی بھی نہایت کمینہ اخلاق میں سے ہیں۔ ان سب کا خسران دُنیا میں بھی ظاہر ہوتا ہے، ان اخلاق کا مرتکب لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل وخوار اور بے وقعت ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ان کمینہ اخلاق پر تنبیہ فرما کر بتادیا گیا کہ یہ ہیں اسباب خسران، ان سے بہت بچنا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سورۂ عصر میں خسران کا ذکر تھا۔ اس سورت میں بعض خاسروں کے حالات کا بطورِ مثال ذکر ہے۔ مثال سے وضاحت ہوجاتی ہے تو گویا یہ سورت مضمونِ سورۃ العصر کو واضح کررہی ہے۔

شانِ نزول:

اصل شانِ نزول تو ان کمینہ اخلاق کا وجود ہی ہے جن پر اس سورت میں تنبیہ کی گئی ہے۔بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کفّار مکہ خصوصاً ولید بن مغیرہ، اُمیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی، جمیل بن عامر۔ اور اخنس بن شریق ثقفی ہمہ وقت پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی غیبت وبدگوئی کرتے اور ان پر طعن وتشنیع کرتے تھے۔ اخنس بن شریق تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی بے فائدہ تکرار وبحث، بیہودہ گفتگو اور گستاخانہ بکواس کرتا تھا۔ ان بدبختوں کے حق میں یہ سورت نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَةٍ لُّمَزَةِ (١) الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (٢) یَحْسَبُ اَنَّ

بربادی ہے ہر عیب جوئی کرنے اور طعنہ دینے والے کیلئے ۔ جس نے مال اکٹھا کیا اور اسکو گن گن رکھا، وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اُس کا

وَیْلٌ	لِّکُلِّ	ھُمَزَةٍ	لُّمَزَةِ	الَّذِیْ	جَمَعَ	مَالًا	وَّ	عَدَّدَهٗ	یَحْسَبُ	اَنَّ
وائے	واسطے ہر	عیب کرنے والا	غیبت کرنے والا	جس	اکٹھا کیا	مال	اور	گنا کیا اس	جانتا ہے	یہ کہ

مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ (٣) کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ (٤) وَمَآ اَدْرٰکَ مَا

مال اس کو ہمیشگی عطا کردیگا ہرگز ایسا نہ ہوگا، واللہ اس کو ٹکڑے اڑادینے والی آگ میں جھونک دیا جائیگا اور آپکو کیا معلوم کہ کیسی ہے

مَالَهٗ	اَخْلَدَهٗ	کَلَّا	لَیُنْبَذَنَّ	فِی	الْحُطَمَةِ	وَ	مَآ	اَدْرٰکَ	مَا
مال اس	ہمیش رکھے گا اس	ہرگز نہیں یوں	البتہ ڈالا جائے گا	بیچ	حُطمہ	اور	کیا	جانے تو	کیا ہے

الْحُطَمَةُ (٥) نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَةُ (٦) الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ (٧) اِنَّهَا

ٹکڑے اڑادینے والی آگ۔ وہ اللہ کی دہکائی ہوئی آگ ہے ۔ جو دلوں تک جاپہونچے گی۔ بیشک وہ آگ

الْحُطَمَةُ	نَارُ	اللّٰہِ	الْمُوْقَدَةُ	الَّتِیْ	تَطَّلِعُ	عَلَی	الْاَفْئِدَةِ	اِنَّهَا
حُطمہ	آگ	اللہ	سلگائی ہوئی	وہ جو	چڑھ آتی ہے	اوپر	دلوں	تحقیق وہ

عَلَیْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ (٨) فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (٩)

ان پر لمبے لمبے ستونوں میں بند کردی جائیگی ۔

عَلَیْهِمْ	مُّؤْصَدَةٌ	فِیْ	عَمَدٍ	مُّمَدَّدَةٍ
اوپر ان	دروازے بند کی ہوئی	بیچ	ستونوں	کھچے ہوؤں

لغات:

ھُمَزَةٍ صیغہ مبالغہ ہے بڑا عیب جو، کثیر الغیبۃ ، بہت طعنہ دینے والا (ن ،ض) مَرَّ فِی سورۃ القلم .
لُمَزَةٍ صیغہ مبالغہ بہت عیب جوئی کرنے والا۔ پس پشت برائی (غیبت) کرنے والا۔ (ن ض) عیب لگانا، آنکھ سے اشارہ کرنا، ہٹانا، مارنا۔ اَخْلَدَ افعال سے صیغہ واحد مذکر غائب ماضی۔ مصدر اِخْلَاد ہمیشہ رہنا، ہمیشہ ساتھ رہنا، اقامت کرنا، ہمیشہ کے لئے رکھنا۔ اِلَیْهِ مائل ہونا، جھکنا خَلَدَ خُلُوْداً (ن) ہمیشہ ہونا۔ لَیُنْبَذَنَّ واحد مذکر غائب مضارع مجہول بانون تاکید ثقیلہ نَبْذٌ (ن ،ض) پھینک دینا۔ اَلْحُطَمَةُ دوزخ کے ایک طبقہ کا نام ہے۔ حَطْمٌ سے مشتق ہے (ض) توڑنا، روندنا، (س) بڑی عمر والا ہونا۔ اَلْمُوْقَدَةُ باب افعال (ایقاد) سے اسم مفعول بھڑکائی ہوئی۔ دہکائی ہوئی وَقُوْد (ض) مرفی سورۃ البروج. تَطَّلِعُ صیغہ واحد مؤنث غائب باب افتعال سے جھانکنا، خبردار ہونا۔ طُلُوْعٌ (ن) نکلنا۔ مُؤْصَدَةٌ اِیْصاد (افعال) بند کرنا۔ وَصْدٌ (ض) پائیدار ہونا۔ برقرار ہونا۔

ترکیب:

وَيۡلٌ مبتدا۔ کمامر فی المرسلٰت والتطفیف ھُمَزَةٍ موصوف لُّمَزَةٍ صفت۔ مرکب توصیفی مضاف الیہ ہوا کُلِّ کا، مضاف و مضاف الیہ ملکر مبدل منہ الَّذِی اسم موصول اپنے جَمَعَ مَالاً جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَعَدَّدَهٗ جملہ فعلیہ معطوف۔ معطوفین صلہ سے ملکر بدل۔ مبدل منہ بدل سے ملکر مجرور، متعلق محذوف ہوکر خبر، یَحۡسَبُ فعل ضمیر عائد الی الموصول فاعل۔ اَنَّ اپنے اسم مَالَهٗ اور خبر اَخۡلَدَهٗ جملہ فعلیہ سے ملکر جملہ اسمیہ بتاویل مفرد مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ جَمَعَ یا عَدَّدَهٗ کی ضمیر فاعل سے حال ہوگا۔ (والضمیر فی اخلد عائد الیٰ مالاً) کَلَّا حرف ردع لَيُنۡبَذَنَّ فعل مجہول ضمیر عائد الیٰ ھُمَزَةٍ نائب فاعل فِی الۡحُطَمَةِ متعلق۔ جملہ فعلیہ قسم محذوف واللہ کا جواب ہوا۔ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَالۡحُطَمَةُ : مَرَّ مثله غیر مرةٍ. نَارُ اللّٰهِ: مرکب اضافی موصوف الۡمُوۡقَدَةُ صفت الَّتِی اسم موصول تَطَّلِعُ فعل ضمیر مؤنث عائد الی النار فاعل عَلَی الۡاَفۡئِدَةِ متعلق جملہ فعلیہ صلہ۔ موصول وصلہ ملکر صفت ثانی۔ موصوف وصفت مل کر خبر مبتدا محذوف ھِیَ کی یا الۡحُطَمَةِ کا بیان اِنَّ اپنے اسم ھَا، مُؤۡصَدَةٌ اپنے متعلق مقدم عَلَيۡهِمۡ اور متعلق مؤخر فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ سے ملکر خبر اِنَّ جملہ اسمیہ ہوا۔ مُمَدَّدَةٌ صفت ہے عَمَدٍ کی جو عُمُوۡد یا عِمَاد کی جمع ہے بمعنی ستون۔ فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ۔ عَلَيۡهِمۡ کی ضمیر سے حال بھی ہوسکتا ہے اور مُؤۡصَدَةٌ کی صفت بھی نیز مبتدا محذوف ھِیَ کی خبر بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ جملہ جملہ سابقہ پر معطوف۔ اور حرف عطف محذوف ہوگا۔ اس صورت میں عَلَيۡهِمۡ اِنَّ کی خبر ہوگی ای مُسَلَّطَةٌ عَلَيۡهِمۡ.

تفسیر:

اس سورت شریفہ میں تین بدترین گناہوں پر پہلے اجمالی طور پر وعید ہے۔ اسکے بعد وضاحت وتفصیل کے ساتھ دوزخ کے سخت ترین عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ وہ تین گناہ ہمز و لمز و جمع مال ہیں۔

ہمز و لمز کا مطلب:

ہمز و لمز کے لغوی معنی ذکر ہوچکے۔ یہاں کیا معنی مراد ہیں؟ اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ (۱) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی عیب جوئی کرنے والا۔ نکتہ چینی کرنے والا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کھاتے، دوستوں میں پھوٹ ڈالتے اور نیک لوگوں کی عیب جوئی کرتے رہتے ہیں۔ (۲) مقاتلؒ نے کہا کہ ہمزہ سامنے برائی کرنے والا اور لمزہ پس پشت برائی کرنے والا ہے۔ (۳) ابوالعالیہؒ وحسن بصریؒ کا قول اسکے برعکس ہے (۴) سعید بن جبیرؒ وقتادہؒ نے کہا ہمزہ غیبت کرنے والا، لوگوں کا گوشت کھانے والا اور لمزہ لوگوں پر طنز کرنے والا، نکتہ چینی کرنے والا ہے۔ (۵) ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ہمزہ وہ شخص ہے جو ہاتھ کے اشارہ سے لوگوں کو مطعون کرتا اور دکھ پہنچاتا ہے۔ اور لمزہ وہ شخص ہے جو زبان سے نکتہ چینی وعیب جوئی کرتا ہے۔ (۶) سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ہمزہ زبان سے عیوب بیان کرنے والا۔ اور لمزہ آنکھ کے اشارہ سے عیوب بیان کرنے والا ہے (۷) ابن کیسانؒ نے کہا کہ ہمزہ وہ شخص ہے جو اپنے ہمنشین کو اپنے الفاظ سے دکھ دیتا ہے۔ اور لمزہ وہ ہے جو آنکھ یا سر یا ابرو کے اشارہ سے عیوب ظاہر کرتا ہے (۸) صاحب مظہریؒ کہتے ہیں کہ دراصل لغت میں ہمز کے معنی توڑنے اور چبھونے کے ہیں۔ حدیث میں ہے اللھم انی اعوذبک من ھمزات الشیاطین (خدایا میں شیطانوں کے کچوکوں سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں) اور لمز کے معنی ہیں طعنہ زنی کے۔ پھر استعمال

میں دونوں کے معنی ہوگئے ایسا ذکر جس سے لوگوں کی آبروریزی وتوہین اوران پر طنز ہوتا ہو۔ (کما قال ابن عباسؓ)

همزه لمزه کا وزن (**فُعَلَۃ**) خوگر وعادی بن جانے پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے **ضُحَکَۃ** اور **لُعَنَۃ** اسی شخص کو کہیں گے جوان افعال (ضحک ولعن) کا عادی ہو۔ لیکن اکثر مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمز کے معنی غیبت یعنی کسی کا عیب اس کی پیٹھ پیچھے بیان کرنے کے ہیں۔ اور لمز کے معنی آمنے سامنے کسی کو طعنہ دینے اور اس کی برائی کرنے کے ہیں۔ یہ دونوں گناہ نہایت سخت ہیں۔ غیبت کی مذمت اور اس پر وعیدیں قرآن وحدیث میں زیادہ ہیں۔ اس کو زنا سے زیادہ سنگین اور ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس کی شدت کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس گناہ میں کوئی رکاوٹ سامنے نہیں ہوتی۔ اس کا مرتکب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے یہ گناہ زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور آمنے سامنے نکتہ چینی کرنے والے کا دفاع کرنے والا موجود ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں امتداد نہیں ہوتا علاوہ ازیں کسی کے پیچھے اس کے عیوب کا تذکرہ اس لئے بھی سنگین جُرم اور بڑا ظلم ہے کہ اس بیچارے مظلوم کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ مجھ پر کیا الزام لگایا جارہا ہے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرے۔ اسی لئے اس کو مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مُرادف قرار دیا گیا ہے۔ ﴿ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ﴾

اور ایک دوسری حیثیت سے لمز (روبروعیب جوئی) زیادہ شدید ہے۔ وہ یہ کہ کسی کے سامنے اس کو برا بھلا کہنا اسکی توہین وتذلیل بھی ہے اور ایذاءرسانی بھی۔ اور ہمز (غیبت) میں صرف پہلی بات پائی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: شِرَارُ عِبَادِ اللهِ تَعَالٰى الْمَشَّآءُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ الْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الْاَحِبَّةِ الْبَاغُوْنَ الْبُرَاءَ الْعَنَتَ. اللہ کے بندوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو چغلخوری کرتے پھرتے دوستوں کے درمیان فساد ڈالتے اور بے گناہ لوگوں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہیں۔

تیسری خصلت:

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ...... (جس نے مال جوڑا اور گن گن رکھا) یعنی جس کو مال کی بیجا محبت اور شدید حرص ہے جس کی وجہ سے وہ اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ اور اس کا حق واجب ادا نہیں کرتا۔ چونکہ دوسری آیات وروایات اس پر شاہد ہیں کہ حلال طریقہ پر مال کا جمع کرنا گناہ نہیں۔ اس لئے یہاں جمع مال سے مراد وہی جمع ہے جو حرام طریقہ پر ہو یا اس کے حقوقِ واجبہ ادا نہ کئے گئے ہوں یا اس سے تکاثر وتفاخر مقصود ہو۔ اور اسکی محبت میں منہمک ہوکر دین کی ضروریات کو نظر انداز کردیا ہو۔ غیبت وطعنہ زنی اور عیب جوئی وبدگوئی جو کرتا ہے وہ خود کو بہتر وبرتر سمجھتا ہے۔ اور اس کبر وتعلّی کے اسباب حسن وجمال، علم وکمال حسب ونسب اور ہنر وکسب وغیرہا ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب میں بڑا سبب مال ہوتا ہے۔ دولت کا نشہ آدمی کو اندھا کردیتا ہے اور افلاس میں تو سارے فخر وغرور خاک میں مل جاتے ہیں۔ اسی لئے آج تک مفلس نے خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ تو بُرائیوں کی اصل وبنیاد خصوصاً مذکورہ جرائم کا منشأ مال ہے۔ اسی لئے تیسرا جرم جمع مال قرار دیا گیا جو جرم بھی ہے اور جرائم کی اصل بنیاد بھی۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ...... (یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال سدا اسکے ساتھ رہے گا یا اس کو ہمیشگی دیگا) یعنی اس کا یہ گمان ہے کہ مالدار کو طویل زندگی ملے گی۔ نادار بھوک سے مرجائیگا اور مال اس کو باقی رکھے گا۔ اس کلام کا حقیقی مفہوم مراد ہے کیونکہ کسی بھی مالدار کا یہ خیال نہیں ہوتا کہ وہ کبھی نہ مرے گا۔ مرنے کا تو سب کو یقین ہے۔ بلکہ اس میں بایں انداز موت سے اسکی غفلت اور لمبی امیدوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یا یہ کلام تعریض ہے کہ حقیقت میں دوامی زندگی عطا کرنے والا مال نہیں بلکہ ایمان وعمل صالح ہے۔ یا اس کا انہماک تعمیرات کرنا۔ باغات لگانا اور لمبے چوڑے ٹھاٹ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے شاید اس کو

مرنا نہیں خواہ اس کا یقین ایسا نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مربع خط کھینچا اور اس کے درمیان ایک لکیر اس مربع سے نکلتی ہوئی کھینچی۔ اور اس درمیانی لکیر کے دونوں طرف بہت سی چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچیں اور فرمایا کہ یہ (درمیانی لکیر) انسان ہے۔ اور باہر کو نکلا ہوا سرا اسکی آرزوئیں ہیں۔ اور دونوں طرف کی لکیریں اس کو پیش آنے والے امراض وحوادث ہیں۔ وہ ایک سے بچ جاتا ہے دوسرا حادثہ اس کو پہنچتا ہے۔ اور اس سے بچتا ہے تو وہ پہنچ جاتا ہے۔ اور مربع خط موت ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے جس سے وہ بچ نہیں سکتا۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند خطوط کھینچ کر فرمایا کہ یہ آرزو ہے اور یہ انسان کی موت ہے۔ اور آدمی اسی حالت میں ہوتا ہے کہ اچانک قریب والا خط (خط موت) اس پر آ پہنچتا ہے۔ (بخاری)

كَلَّا امور شنیعہ مذکورہ سے زجر وردع کے لئے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بمعنی حَقًّا ہو۔ اور یہ جوابِ قسم کے بھی مناسب ہے نَارُ اللّٰهِ میں اضافت تعظیم کے لئے ہے۔ اس سے نار کی شدت وعظمت ظاہر ہو رہی ہے۔

الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـئِدَةِ ...... (وہ آگ دلوں پر پہنچے گی) یوں تو ہر آگ کا خاصہ یہی ہے کہ جو چیز اس میں ڈالی جائے وہ اسکے تمام اجزاء تک پہنچتی اور ان کو جلاتی ہے۔ انسان جب آگ میں ڈالا جائیگا تو اس کے تمام اعضاء کے ساتھ دل بھی جل جائیگا۔ یہاں دوزخ کی آگ کی یہ خصوصیت اس لئے بیان کی گئی کہ دنیا کی آگ جب انسان کے بدن کو لگتی ہے تو دل تک پہنچنے سے پہلے ہی انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور دوزخ میں کیونکہ انسان کو موت نہ آئیگی تو اس کی آگ دل تک بحالتِ حیات پہنچے گی۔ اور دل جلنے کی اذیت انسان اپنی حیات میں محسوس کریگا۔ حدیث میں ہے کہ آگ دوزخیوں کو کھالیگی۔ یہاں تک کہ جب دل تک پہنچے گی تو رک جائے گی پھر اس آدمی کو ویسا ہی کر دیا جائیگا۔ جیسا وہ پہلے تھا۔ پھر آگ اس کو لیگی اور دل تک پہنچے گی۔ ہمیشہ اس کی یہی حالت رہے گی۔ دوسری وجہ دل کو ذکر کرنیکی یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمام اعضاء بدن میں دل سب سے زائد لطیف وحساس ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ غلط عقائد واعمال بد کا سرچشمہ قلب ہی ہے۔ اسی لئے وہ نار اللہ کی آماجگاہ بنے گا۔ یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی آگ اگر کسی انسان کو پہنچتی ہے تو اول اعضائے ظاہری کو جلاتی ہے۔ پھر اندرونی اعضاء اور قلب کو پہنچتی ہے۔ لیکن آتشِ دوزخ اپنی لطافت کی وجہ سے براہِ راست قلب پر حملہ آور ہوگی۔ اور دنیا میں اس کی نظیر بجلی ہے تار پر انگلی رکھئے تو وہ فوراً دل پر حملہ آور ہوتی ہے۔

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ...... (وہ آگ ان پر بند کی جائیگی) تا کہ اس کی حرارت وتیزی میں کمی کا امکان نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دوخ میں جب دوامی دوزخی رہ جائیں گے تو ان کو لوہے کی صندوقوں میں بند کر دیا جائے گا اور صندوقوں میں لوہے کی کیلیں ٹھوک دی جائیں گی پھر ان صندوقوں کو دوسرے آہنی صندوقوں میں بند کر کے جحیم کی تہہ میں پھینک دیا جائیگا۔ اور کوئی شخص دوسرے کے عذاب کو نہ دیکھ سکے گا۔

فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ...... (وہ بڑے بڑے آتشیں ستونوں کیساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے) نہ ہل سکیں گے نہ ان کو اکھیڑ سکیں گے۔ بلکہ ہمیشہ وہیں جلتے گھٹتے رہیں گے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دوزخیوں کو ستونوں میں داخل کریگا پھر ستونوں کو ان پر تانا جائیگا۔ ان کی گردنوں میں زنجیریں پڑی ہوں گی۔ اور اوپر سے ایک ستون کے ذریعہ ان پر دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ عمد دوزخ کے کواڑوں کی وہ کیلیں ہیں کہ دوزخیوں کو اندر کر کے دوزخ کے کواڑوں کو بند کر دیا جائیگا اور وہ کیلیں ٹھوک دی جائیں گی۔ اللھم اجرنا من عذاب النار.

سزا جرم کے مناسب:

ہمز و لمز سے لوگوں کی آبرو ریزی و کسر شان ہوتی ہے۔ اس کی جزا حطمہ قرار دی گئی جو اس مجرم کی ایسی دھجیاں اڑا دیگی جس طرح اس نے ان کی آبرو کی دھجیاں بکھیری تھیں۔ اور عیب جو وطعنہ زن نے خود کو برتر سمجھا۔ اور دوسروں کو حقیر و بدتر سمجھا تھا تو اس کی سزا نبذ فی النار یعنی حقارت و ذلت کے ساتھ مردار کتے کی طرح جہنم میں پھینک دیا جانا قرار پائی۔ اور ان برائیوں کا منشا قلب پر حب مال کا غلبہ تھا تو اس کی سزا تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ ہے یعنی آگ براہِ راست قلب پر حملہ آور ہو کر اس کو جلائیگی۔ اور مال کو گن گن کر تجوریوں میں بھر بھر کر رکھنے کی سزا یہ ہے کہ اس کو بھی جہنم کے ستونوں میں جکڑ دیا جائیگا یا چن دیا جائیگا۔ اور اسکے طولِ امل و دراز آرزوؤں کی سزا آگ کے لمبے لمبے ستون ہوں گے۔

(ف) یہ آیات خواہ مخصوص لوگوں (جمیل بن عامر، امیہ بن خلف، اخنس بن شریق اور ولید بن مغیرہ) کے بارے میں اتری ہوں۔ لیکن اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے، خصوص سبب نزول کا نہیں۔ اس لئے مذکورہ وعیدیں ہر اس شخص کے لئے ہیں جس میں یہ جرائم پائے جاتے ہیں۔

تم تفسیر سُورةالهُمزة فالحمد لله الذی خلق الناس وجعل لهم السمع والابصار والافئدة والصلوٰة والسلام علی محمد الذی لانبیَّ بعدهٗ وعلیٰ اٰله وصحبه الذین فازوابالسعادة والجنة

سُوْرَةُالْفِيْلِ

سُوْرَةُالْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

(رکوع ۱۔ آیات ۵ سورۂ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پانچ آیات ہیں۔ کلمات ۲۰۔ حروف ۵۶)

ربط و مناسبت: (۱) کفار مکہ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت وطعنہ زنی اور عیب جوئی ایک کید تھا۔ جس کا اُخروی انجام پہلی سورت میں بیان کیا گیا۔ اس سورۂ فیل میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ دنیا میں بھی اس جُرم کا نتیجہ بربادی ہے۔ جس طرح اصحابِ فیل نے بیت اللہ کے ساتھ کید کیا تو وہ برباد ہوئے۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کید کر رہے ہو۔ جنکی عظمت واہمیت اللہ کے نزدیک بیت اللہ سے بدرجہا بڑھ کر ہے (۲) سورت سابقہ میں اخلاقِ رذیلہ کا انجام اُخروی بیان کیا گیا تھا، اس سورت میں دنیوی انجام کا ذکر ہے۔ (۳) سورتِ سابقہ میں اس بات کا دعویٰ تھا کہ مذکورہ جرائم پر آخرت میں عذاب شدید ہوگا۔ اس سورت میں اس کی دلیل ہے کہ نمونہ اس کا اصحابِ فیل کے قصہ میں دیکھ لو۔ اس سے حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بھی ثبوت ہوا کہ وہ گرفت کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ (۴) جرائم کا منشأ مال و دولت ہے۔ اس کے متعلق یہ خیال باطل ہے کہ وہ ہمیشہ ساتھ رہیگا۔ یا ساتھ دیگا، یا موت و ہلاکت کے پنجہ سے چھڑا لے گا۔ جیسا کہ سورتِ سابقہ میں اس پر تنبیہ کی گئی۔ اس سورت میں اس کا نمونہ پیش کیا گیا کہ ابرہہ کی دولت وشوکت نے نہ اس کا ساتھ دیا اور نہ تباہی و ہلاکت سے بچا کر اس کو ہمیشگی بخشی۔ (۵) پچھلی سورت میں اہل مکہ کو ڈرایا گیا تھا تا کہ اطاعت پر آمادگی ہو۔ اس سورت میں اپنا ایک مخصوص انعام یاد دلایا گیا کہ ابرہہ کے ظلم وستم سے تمہارے معبد (خانہ کعبہ) کو اور تمکو محفوظ رکھا کیونکہ انسان کو اطاعت پر جس طرح وعید آمادہ کرتی ہے اسی طرح احسان سے بھی آدمی جھکتا ہے۔

اصحابِ فیل کا واقعہ:

امام حدیث وتاریخ حافظ ابن کثیرؒ نے اس طرح نقل فرمایا ہے کہ یمن پر ملوک حمیر کا قبضہ تھا۔ یہ لوگ مشرک تھے انکا آخری بادشاہ ذونواس تھا۔ جس نے اس زمانہ کے اہل حق یعنی نصاریٰ پر شدید مظالم کیئے، اسی نے ایک طویل وعریض خندق کھدوا کر اس کو آگ سے بھرا۔ اور جتنے نصرانی بت پرستی کے خلاف ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے ان سب کو اس آگ کی خندق میں ڈال کر جلا دیا، جن کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔ یہی وہ خندق کا واقعہ ہے جس کا ذکر اصحابُ الاخدود کے نام سے سورۂ بروج میں گذرا۔ ان میں سے دو آدمی کسی طرح اس کی گرفت سے نکل بھاگے۔ اور انہوں نے قیصر ملک شام سے جا کر فریاد کی کہ ذونواس ملک حمیر نے نصاریٰ پر ایسا ظلم کیا ہے آپ ان کا انتقام لیں۔ قیصر ملک شام نے شاہِ حبشہ کو خط لکھا یہ بھی نصرانی تھا۔ اور یمن سے قریب تھا کہ آپ اس ظالم سے ظلم کا انتقام لیں۔ اس نے اپنا عظیم لشکر دو کمانڈروں (امیر ارباط اور ابرہہ) کی قیادت میں یمن کے بادشاہ کے مقابلہ پر بھیج دیا۔ لشکر اس کے ملک پر ٹوٹ پڑا۔ اور پورے یمن کو قوم حمیر کے قبضہ سے آزاد کرا لیا۔ ملک حمیر ذونواس بھاگ نکلا اور دریا میں غرق ہو کر مر گیا۔ اس طرح ارباط وابرہہ کے ذریعہ یمن پر شاہِ حبشہ کا قبضہ ہو گیا۔ پھر ارباط وابرہہ میں باہمی جنگ ہو کر ارباط مقتول ہو گیا اور ابرہہ غالب آ گیا۔ اور یہی ابرہہ شاہِ نجاشی کی طرف سے ملک یمن کا حاکم (گورنر) مقرر ہو گیا۔ اس نے یمن پر قابض ہو کر ارادہ کیا کہ یمن میں ایک ایسا شاندار کنیسہ بنائے جس کی نظیر دنیا میں نہ ہو۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یمن کے عرب لوگ جو حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ جاتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں وہ اس کنیسہ کی عظمت وشوکت سے مرعوب ہو کر کعبہ کی بجائے اس کنیسہ میں جانے لگیں۔ اس خیال پر اس نے بہت بڑا عالیشان کنیسہ اتنا اونچا تعمیر کیا کہ اس کی بلندی پر نیچے کھڑا ہوا آدمی نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔ اور اس کو سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع کیا تھا۔ اور پوری مملکت میں اعلان کرا دیا تھا کہ اب یمن سے کوئی کعبہ کے حج کے لئے نہ جائے۔ اس کنیسہ میں عبادت کرے۔

عرب میں اگرچہ بُت پرستی غالب آ گئی تھی مگر دینِ ابراہیمی وکعبہ کی عظمت ومحبت ان کے دلوں میں پیوست تھی۔ اس لئے عدنان اور قحطان وقریش کے قبائل میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے رات کے وقت کنیسہ میں داخل ہو کر اس کو گندگی سے آلودکیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے ایک مسافر قبیلہ نے کنیسہ کے قریب اپنی ضرورت کے لئے آگ جلائی اس کی آگ کنیسہ میں لگ گئی اور اس کو سخت نقصان پہنچ گیا، ابرہہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی اور بتایا گیا کہ کسی قریشی نے یہ کام کیا ہے تو اس نے قسم کھائی کہ میں ان کے کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہوں گا ابرہہ نے اس کی تیاری شروع کی اور شاہ نجاشی سے اجازت مانگی اس نے اپنا خاص ہاتھی جس کا نام محمود تھا ابرہہ کے لئے بھیج دیا کہ وہ اس پر سوار ہو کر کعبہ پر حملہ کرے، بعض روایات میں ہے کہ یہ سب سے بڑا عظیم الشان ہاتھی تھا جس کی نظیر نہیں پائی جاتی تھی اور اس کے ساتھ آٹھ ہاتھی دوسرے بھی اس لشکر کے لئے شاہ حبشہ نے بھیج دیئے تھے ہاتھیوں کی یہ تعداد بھیجنے کا منشا یہ تھا کہ بیت اللہ کعبہ کے ڈھانے میں ہاتھیوں سے کام لیا جائے تجویز یہ تھی کہ بیت اللہ کے ستونوں میں لوہے کی مضبوط وطویل زنجیریں باندھ کر ان زنجیروں کو ہاتھیوں کے گلے میں باندھیں اور ہنکا دیں تو سارا بیت اللہ (معاذ اللہ) زمین پر آ گرے گا۔

عرب میں جب اس کے حملہ کی خبر پھیلی تو سارا عرب مقابلہ کے لئے تیار ہو کر آ گیا، یمن کے عربوں میں ایک شخص

ذونفر نامی تھا اس نے عربوں کی قیادت اختیار کی اور عرب لوگ اس کے گرد جمع ہو کر مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے اور ابرہہ کے خلاف جنگ کی، مگر اللہ تعالیٰ کو تو یہ منظور تھا کہ ابرہہ کی شکست ورسوائی نمایاں ہو کر دنیا کے سامنے آئے اس لئے یہ عرب مقابلہ میں کامیاب نہ ہوئے ابرہہ نے اس کو شکست دیدی اور ذونفر کو قید کرلیا اور آگے روانہ ہو گئے اس کے بعد جب وہ قبیلہ خثعم کے مقام پر پہنچا تو اس قبیلے کے سردار نفیل بن حبیب نے پورے قبیلہ کے ساتھ ابرہہ کا مقابلہ کیا مگر ابرہہ کے لشکر نے ان کو بھی شکست دیدی نفیل بن حبیب کو بھی قید کرلیا اور ان کے قتل کا ارادہ کیا مگر پھر یہ سمجھ کر ان کو زندہ رکھا کہ ان سے ہم راستوں کا پتہ معلوم کرلیں گے اسکے بعد جب یہ لشکر طائف کے قریب پہنچا تو طائف کے باشندے (قبیلہ ثقیف) جو پچھلی جنگ اور ابرہہ کی فتح کے واقعات سن چکے تھے۔ انھوں نے اپنی خیر منانے کا فیصلہ کیا اور یہ کہ طائف میں جو ہم نے ایک عظیم الشان بت خانہ لات کے نام سے بنا رکھا ہے یہ اس کو نہ چھیڑے تو ہم اس کا مقابلہ نہ کریں گے انہوں نے ابرہہ سے ملکر یہ بھی طے کرلیا کہ ہم تمہاری امداد اور رہنمائی کے لئے اپنا ایک سردار ابورغال تمہارے ساتھ بھیج دیتے ہیں ابرہہ اس پر راضی ہو گیا۔ اور ابورغال کو ساتھ لیکر مکہ مکرمہ کے قریب ایک مقام مغمس پہنچ گیا۔ جہاں قریش مکہ کے اونٹ چر رہے تھے ابرہہ کے لشکر نے سب سے پہلے ان پر حملہ کر کے اونٹ گرفتار کر لئے جن میں سے دوسو ۲۰۰ اونٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب رئیس قریش کے بھی تھے۔ ابرہہ نے یہاں پہنچ کر اپنا ایک سفیر حناط حمیری کو شہر مکہ میں بھیجا کہ وہ سردارانِ قریش کو مطلع کردے کہ ہم تم سے جنگ کرنے نہیں آئے ہمارا مقصد صرف کعبہ کو ڈھانا ہے اگر تم نے اس میں رکاوٹ نہ ڈالی تو تم کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ حناط جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو سب نے اس کو عبدالمطلب کا پتا دیا کہ وہ سب سے بڑے سردار قریش ہیں، حناط نے عبدالمطلب سے گفتگو کی اور ابرہہ کا پیغام پہنچا دیا۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق عبدالمطلب نے یہ جواب دیا کہ ہم بھی ابرہہ سے جنگ کا کوئی ارادہ کوئی نہیں رکھتے نہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس کا مقابلہ کرسکیں، البتہ میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ اللہ کا گھر اور اس کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے، وہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے، اللہ سے جنگ کا ارادہ ہے تو جو چاہے کرے پھر دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرتا ہے۔ حناط نے عبدالمطلب سے یہ کہا کہ تو پھر آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو ابرہہ سے ملاتا ہوں ابرہہ نے جب عبدالمطلب کو دیکھا کہ بڑے وجیہہ آدمی ہیں تو ان کو دیکھ کر اپنے تخت سے نیچے اتر کر بیٹھ گیا اور عبدالمطلب کو اپنے برابر بٹھایا اور اپنے ترجمان سے کہا کہ عبدالمطلب سے پوچھو کہ وہ کس غرض سے آئے ہیں؟ عبدالمطلب نے کہا کہ میری ضرورت تو بس اتنی ہے کہ میرے اونٹ جو آپ کے لشکر نے گرفتار کر لئے ہیں وہ چھوڑ دیں، ابرہہ نے ترجمان کے ذریعہ عبدالمطلب سے کہا کہ جب میں نے آپ کو اول مرتبہ دیکھا تو میرے دل میں آپ کی بڑی وقعت وعظمت پیدا ہوئی مگر آپ کی گفتگو نے اس کو بالکل ختم کردیا کہ آپ مجھ سے صرف اپنے دوسو اونٹوں کی بات کر رہے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ میں آپ کا کعبہ جو آپ کا دین ہے اس کو ڈھانے کے لئے آیا ہوں، اس کے متعلق آپ نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ اونٹوں کا مالک تو میں ہوں مجھے ان کی فکر ہے۔ اور بیت اللہ کا میں مالک نہیں، بلکہ اس کا مالک ایک عظیم ہستی ہے وہ اپنے گھر کی خود حفاظت کرنا جانتا ہے۔ ابرہہ نے کہا کہ تمہارا خدا اس کو میرے ہاتھ سے نہ بچاسکے گا۔ عبدالمطلب نے کہا کہ پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ اور بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کے ساتھ اور بھی قریش کے چند سردار گئے تھے اور انھوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیشکش کی کہ اگر آپ بیت اللہ پر دست اندازی نہ کریں اور واپس ہو جائیں تو ہم پورے تہامہ کی ایک تہائی پیداوار آپ کو بطور خراج ادا کرتے رہیں گے۔

مگر ابرہہ نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا۔ عبدالمطلب کے اونٹ ابرہہ نے واپس کر دیئے وہ اپنے اونٹ لیکر واپس چلے آئے۔ اور بیت اللہ کے دروازے کا حلقہ پکڑ کر دعا میں مشغول ہو گئے۔ قریش کی ایک بڑی جماعت بھی ان کے ساتھ تھی سب نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں کہ ابرہہ کے عظیم لشکر کا مقابلہ ہمارے بس میں نہیں، آپ ہی اپنے گھر کی حفاظت کا انتظام فرمالیں۔ الحاح وزاری کے ساتھ دُعا کرنے کے بعد عبدالمطلب مکہ مکرمہ کے دوسرے لوگوں کو ساتھ لیکر مختلف پہاڑوں پر پھیل گئے۔ ان کو یہ یقین تھا کہ اس کے لشکر پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئیگا۔ اسی یقین کی بنا پر انہوں نے ابرہہ سے خود اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا تھا۔ بیت اللہ کے متعلق گفتگو کرنا اسلئے پسند نہ کیا کہ خود تو اس کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ اور دوسری طرف یہ بھی یقین رکھتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ دشمن کی قوت کے مقابلہ میں ان کی بے بسی پر رحم فرما کر خود اس کے عزائم کو خاک میں ملا دیں گے۔ صبح ہوئی تو ابرہہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تیاری کی اور اپنے ہاتھی محمود کو آگے چلنے کے لئے تیار کیا، نفیل بن حبیب جن کو راستے سے ابرہہ نے گرفتار کیا تھا، اس وقت وہ آگے بڑھے اور ہاتھی کا کان پکڑ کر کہنے لگے کہ تو جہاں سے آیا ہے وہیں صحیح وسالم واپس چلا جا کیونکہ تو اللہ کے محفوظ شہر میں ہے۔ یہ کہہ کر اس کا کان چھوڑ دیا۔ ہاتھی یہ سنتے ہی بیٹھ گیا ہاتھی بان نے اس کو اٹھا کر چلانا چاہا، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا اس کو بڑے بڑے آہنی تیروں سے مارا مگر اس نے پرواہ نہ کی اس کی ناک میں لوہے کا آنکڑا ڈالدیا گیا پھر بھی وہ کھڑا نہ ہوا تب ان لوگوں نے اس کو یمن کی طرف لوٹانا چاہا تو فوراً کھڑا ہو گیا۔ پھر شام کی طرف چلانا چاہا تو چلنے لگا پھر مشرق کی طرف چلایا تو چلنے لگا ان سب اطراف میں چلانے کے بعد اس کو مکہ مکرمہ کی طرف چلانا چاہا وہ پھر بیٹھ گیا قدرت خداوندی کا یہ کرشمہ تو یہاں ظاہر ہوا، دوسری طرف دریا کی طرف سے کچھ پرندوں کی قطاریں آتی دکھائی دیں جن میں سے ہر ایک کے ساتھ تین کنکریاں چنے، مسور کی برابر تھیں ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں، واقدی کی روایت میں ہے کہ یہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے، جثہ میں کبوتر سے چھوٹے تھے، ان کے پنجے سرخ تھے، ہر پنجہ میں ایک کنکر اور ایک چونچ میں لئے آتے دکھائی دیئے اور فوراً ہی ابرہہ کے لشکر پر چھا گئے، یہ کنکریاں جو ہر ایک کے ساتھ تھیں ابرہہ کے لشکر پر گرائیں، ایک ایک کنکر نے وہ کام کیا جو ریوالور کی گولی بھی نہیں کر سکتی کہ جس پر پڑتی اس کے بدن کو چھیدتی ہوئی زمین میں گھس جاتی تھی، یہ عذاب دیکھ کر ہاتھی سب بھاگ کھڑے ہوئے، صرف ایک ہاتھی رہ گیا تھا جو ایک کنکری سے ہلاک ہوا اور لشکر کے تمام آدمی اس موقع پر ہلاک نہیں ہوئے بلکہ مختلف اطراف میں بھاگے ان سب کا یہ حال ہوا کہ وہ راستہ میں مر مر کر گر گئے ابرہہ کو چونکہ سخت سزا دینی منظور تھی اس لئے وہ فوراً ہلاک نہیں ہوا، بلکہ اس کے جسم میں ایسا زہر سرایت کر گیا کہ اس کا ایک ایک جوڑ گل سڑ کر گرنے لگا، اسی حال میں اس کو یمن واپس لایا گیا، دارالسلطنت صنعاء پہنچ کر اس کا سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہہ گیا اور وہ مر گیا ابرہہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ دو ہاتھی بان یہیں مکہ مکرمہ میں رہ گئے، مگر اس طرح کہ وہ دونوں اندھے اور اپاہج ہو گئے تھے۔ محمد اسحٰق نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے انھوں نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ اندھے اور اپاہج تھے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن حضرت اسماءؓ نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں اندھوں اپاہجوں کو مکہ میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ واقعہ کب ہوا؟

یہ واقعہ بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ۲۲ محرم یکشنبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تقریباً ۵۰ دن پہلے پیش آیا۔ اکثر علماء کا یہی قول ہے اور یہی صحیح ہے۔ امام بخاریؒ کے استاذ ابراہیم بن المنذرؒ نے فرمایا کہ اس

میں علمائے اسلام میں سے کسی ایک کو بھی شک نہیں۔ اور اسی پر اجماع ہے۔ اور اس کے خلاف جس سے بھی منقول ہے وہ غلط ہے۔ مثلاً مقاتلؒ نے کہا کہ یہ واقعہ ولادتِ مبارکہ سے چالیس سال قبل پیش آیا۔ کسی نے کہا تیس سال پہلے پیش آیا کسی نے کہا ستر ۷۰ سال پہلے۔ کسی نے کہا دس سال پہلے، کسی نے کہا پندرہ سال پہلے۔ اور کلبیؒ نے کہا تیئیس سال پہلے پیش آیا۔ یہ سب اقوال غیر صحیح ہیں۔ قول اول ہی جمہور کا مختار ہے۔ کذافی تاریخ ابن حبان، وذهب السهيلي انه صلى الله عليه وسلم ولد بعد هابخمسين يوماً وكانت في المحرم والولادة في شهر ربيع الاول وقال الحافظ الدمياطي بخمسة وخمسين يوماً وقيل باربعين يوماً وقيل بشهر والمشهور ماذهب اليه السهيلي. والله اعلم. (مظهری روح المعانی).

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ (۱) اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ (۲)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپکے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کی تدبیر کو اس نے ملیا میٹ نہیں کر دیا۔

اَلَمۡ	تَرَ	كَيۡفَ،فَعَلَ	رَبُّكَ	بِاَصۡحٰبِ	الۡفِيۡلِ	اَلَمۡ	يَجۡعَلۡ	كَيۡدَ	هُمۡ	فِىۡ	تَضۡلِيۡلٍ
کیانہ	دیکھاتونے	کیونکر،کیا	پروردگار تیرے	ساتھ	ہاتھیوں والوں	کیانہ	کردیا	مکر	ان	میں	گمراہی

وَّاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ (۳) تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ (٤) فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ (۵)

اور ان پر غول کے غول پرندے بھیج دیئے۔ جو ان پر جھانوے کی کنکریاں پھینکتے تھے۔ پھر اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔

وَ	اَرۡسَلَ	عَلَيۡهِمۡ	طَيۡرًا	اَبَابِيۡلَ	تَرۡمِيۡهِمۡ	بِحِجَارَةٍ	مِنۡ	سِجِّيۡلٍ	فَجَعَلَهُمۡ	كَعَصۡفٍ	مَاۡكُوۡلٍ
اور	بھیجے	اوپر ان	پرندے	جماعت جماعت	پھینکتے تھے ان	پتھر	سے	کنکر	پس کر دیا ان	مانند بھس	کھایا ہوا

لغات:

الۡفِيۡلُ اسم جنس مذکر ومؤنث واحد وجمع۔ اگر اس کو واحد قرار دیا جائے تو اَفۡيَال فُيُوۡل اور فِيۡلَة جمع آتی ہے۔ طَيۡرًا یہ طائرؔ کی جمع ہے۔ جیسے صَاحِبٌ کی جمع صَحۡبٌ اور راکبٌ کی جمع رکبٌ آتی ہے۔ ابن الانباریؒ نے کہا کہ طَيۡر جمع ہی ہے اور اسکی تذکیر بہ نسبت تانیث کم مستعمل ہے۔ اور طَيۡر واحد کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ ابوعبیدہؒ وقطربؒ کہتے ہیں کہ لفظ طیر واحد وجمع دونوں کے لئے آتا ہے۔ ﴿فَيَكُوۡنُ طَيۡرًا بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ میں لفظ طَيۡر کا استعمال چونکہ واحد میں ہوا ہے اس لئے ابوعبیدہؒ وقطرب کا بیان صحیح ہے، طَارَ طَيۡرًا (ض) اڑنا۔ اَبَابِيۡل (جھنڈ کے جھنڈ، پرے کے پرے) ابوعبیدہؒ نے تصریح کی ہے کہ متفرق جماعت کو ابابیل کہتے ہیں۔ عرب بولتے ہیں جاءتِ الخيلُ اَبَابِيۡلَ من ههنا وههنا (ادھر ادھر سے سواروں کے پرے کے پرے آئے) اس کا واحد آتا ہے کہ نہیں۔ اس میں دو قول ہیں۔ اخفشؒ وفراءؒ کہتے ہیں کہ جس طرح شَمَاطِيط و عَبَادِيۡد کا واحد نہیں آتا۔ ایسے ہی اس کا بھی واحد نہیں آتا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا واحد آتا ہے۔ ابوجعفر رواسیؒ کہتے ہیں کہ اس کا واحد اِبَّالَة ہے۔ کسائی کہتے ہیں اُبُوۡلٌ ہے جیسے عَجَاجِيۡل کا واحد عُجُوۡل ہے، فراءؒ نے کہا کہ اِيۡبَالَة اس کا واحد ہوسکتا ہے۔ جیسے دَنَانِير کا واحد دِيۡنَار ہے بعض کہتے ہیں کہ اِبِيۡل مثل سِكِّيۡن ہے۔

بعض کہتے ہیں اِبَّال ہے۔ حِجَارَۃ: حَجَرٌ کی جمع ہے حَجَرَ حَجراً وحُجراناً. (ن) منع کرنا، روکنا۔ سِجّیل: یہ سنگِ گل کا معرب ہے کذا قال مجاھدٌ وفریابیؒ۔ (وہ مٹی جو پتھر جیسی بن جائے۔ جھانوہ) بعض کہتے ہیں کہ یہ سِجِلّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بڑا ڈول۔ بعض نے سِجِلّ مہرزدہ، رجسٹرڈ) سے مشتق مانا ہے۔ یعنی یہ عذاب مکتوب تھا یا ہر کنکر پر لکھا ہوا تھا کہ یہ فلاں کو پہونچے گی. سَجَلَ سَجْلاً (ن) اوپر سے پھینکنا، گرانا، لگاتار پڑنا۔ عَصْفٌ: کھیت کے پتے، گھاس کے تنکے۔ (ض) ہوا کا تیز چلنا۔ (ن) کھیتی تیاری سے پہلے کاٹنا۔ مرفی المُرسلٰت.

ترکیب:

اَلَمْ تَرَ فعل کَیْفَ مفعول بہ مقدم فَعَلَ کا یا رَبُّکَ سے حال ہے. فَعَلَ اپنے فاعل ومتعلق سے ملکر جملہ فعلیہ۔ اَلَمْ تَرَ کے دومفعولوں کے قائم مقام ہوا. اَلَمْ یَجْعَلْ فعل ضمیر فاعل کَیْدَ هُمْ مفعول بہ اول فِیْ تَضْلِیْل متعلق مقدر (ثَابِتاً) کے ہوکر مفعول ثانی جملہ فعلیہ معطوف علیہ۔ وَاَرْسَلَ اپنے فاعل ضمیر مستتر ومتعلق ومفعول بہ سے ملکر جملہ فعلیہ معطوف اَبَابِیْل: طَیْراً، کی صفت ہے۔ یا اس سے بدل ہے یا عطف بیان تَرْمِیْ فعل ضمیر عائد الی الطیر فاعل هم مفعول بہ بِحِجَارَۃٍ کائنۃ مِنْ سِجِّیْلٍ (مرکب توصیفی مجرور) متعلق جملہ فعلیہ تَرْمِیْ کی ضمیر عائد الی الطیر سے حال ہے۔ فَجَعَلَهُمْ فاء تفریعیہ فعل ضمیر عائد الی اللہ فاعل ومفعول بہ اول۔ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ .(مرکب توصیفی مجرور) متعلق مقدر ہوکر مفعول ثانی۔ جملہ فعلیہ۔

تفسیر:

اَلَمْ تَرَ اس کے معنی ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ تو آپ کی ولادت باسعادت سے پہلے کا ہے۔ تو آپ اس کو کس طرح دیکھتے؟ بظاہر یہ سوال بے موقع ہے۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ رویت سے مراد رویتِ قلبی یعنی علم ہے۔ اور اسکے معنی ہیں الم تعلم دوسرے اگر اس کو رویت بصریہ ہی کے معنی میں قرار دیا جائے تب بھی درست ہے۔ اس لئے کہ جو واقعہ یقینی ہو، اسکے ثبوت میں تردد نہ ہو اور عام طور پر لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہو یا تواتر کے ساتھ منقول ہو تو اس کے علم کو بھی لفظ رویت سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ اتنا یقینی ہے کہ گویا آنکھوں دیکھا ہے۔ اور ایک حد تک دیکھنا بھی ثابت ہے۔ کہ اسکے آثار ونشانات کو آپ نے ملاحظہ فرمایا تھا۔ اوپر گذرا ہے کہ حضرت عائشہؓ وحضرت اسماءؓ نے اندھے اپاہج ہاتھی بانوں کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اس میں آپ کی تعظیم بھی ہے اور آپ کو تسلی بھی، نیز کفار کو وعید ہے کہ جس طرح اس نے بیت اللہ پر حملہ آور اصحابِ فیل کو نیست ونابود کیا ہے۔ رسول اللہ پر حملہ آور دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائیگا۔ طَیْراً اَبَابِیْلَ ان دونوں لفظوں کی تحقیق عنوانِ لغات، میں آچکی، اس ابابیل سے مراد پرندوں کی ٹکڑیاں ہیں۔ اُردو میں جو ایک خاص چڑیا کو ابابیل کہتے ہیں اس سے چڑیا مراد نہیں۔ جیسا کہ اوپر روایت میں گذر چکا، کہ یہ پرندے کبوتر سے کسی قدر چھوٹے تھے۔ اور پرندوں کی کوئی ایسی قسم تھی جو پہلے نہ دیکھی گئی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان پرندوں کی چونچیں پرندوں کی طرح اور پنجے کتوں کے پنجوں کی طرح تھے۔ سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں وہ پرندے سبز تھے، اور ان کی چونچیں زرد تھیں۔ قتادہؒ نے کہا کہ وہ سیاہ تھے۔ جو جھنڈ کے جھنڈ سمندر

سے آئے تھے۔ عکرمہؓ سے منقول ہے کہ ان کے چہرے درندوں جیسے تھے۔ نہ وہ اس سے قبل دیکھے گئے اور نہ بعد دیکھے گئے۔

بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ یہ کنکر سنگِ گل (جھانوے) کی تھیں۔ ان میں خود کوئی طاقت نہ تھی۔ معمولی گارے سے بنی ہوئی تھیں۔ مگر حق تعالیٰ کی قدرت سے انہوں نے بموں کا کام دیا اور سب کو تہس نہس کر دیا۔ سِجُلٌ بمعنی ڈول سے ماخوذ مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے۔ اِنَّھَا مُتَتَابِعَۃٌ کَثِیْرَۃٌ کالْمَآءِ الَّذِی یُصَبُّ مِنَ الدَّ لْو وقیل مِنَ الْاَسْجَالِ بمعنی الارسال والمعنیٰ من مثل شیءٍ مُرْسَلٍ. وَمِنْ فی جمیع ذٰلک ابتدائیۃٌ . بعض نے اس کو سجل سے ماخوذ مانا ہے جس کے معنی لکھنے کے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ عذاب لکھا ہوا تھا۔ جیسا کہ دوسری قوموں کی سزائیں سب لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی تھیں۔ یا یہ کہ جس پر پہنچنا تھا وہ لکھا ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ہر پتھر پر ایک پرچہ اس شخص کے نام کا چسپاں تھا جس پر اس کو گرنا تھا۔ پتھر کتنے بڑے تھے؟ پرندوں کے الوان واحجام کیا تھے؟ اس پر بھی بحثیں کی گئی ہیں۔ لیکن قرآن نے ان دوراز کار چیزوں کو بیان نہیں کیا۔ اس لئے ہم نے بھی ان بحثوں کو چھوڑ دیا ہے۔

فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ ...... عصف بھوسہ کو کہتے ہیں۔ اول تو بھوسہ ہی منتشر تنکے ہوتے ہیں۔ پھر جبکہ اس کو کسی جانور نے چبالیا ہو اور باقی ماندہ روند دیا ہو تو وہ نہایت بے وقعت کوڑا کرکٹ ہو جاتا ہے۔ ابرہہ کے لشکر کا یہی حال ہو گیا تھا۔ جیسے روندا ہوا بھس اور پامال و بے وقعت کوڑا کرکٹ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا کہ جانور بھس کھا کر جو گوبر یا لید کر دیتے ہیں اس سے وہ مراد ہے یعنی ان کے اعضائے بدن اس طرح چکنا، چور ہو گئے تھے جیسے گوبر اور لید میں بھس کے اجزء ہو جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

تم تفسیر سورۃ الفیل فالحمدُ للہ الجلیل والصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہ اِمام الھُداۃِ بالدلیل وعلیٰ اٰلہ وصحبہ الَّذین اھتدوا وَھَدُوْا الیٰ سَوَآءِ السَّبِیْلِ

سُوْرَۃُ الْقُرَیْشِ

سُوْرَۃُ الْقُرَیْشِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اَرْبَعُ اٰیَاتٍ

رکوع:۱،آیات:۴۔ سورۃ القریش مکہ میں نازل ہوئی اور اسمیں چار آیات ہیں۔ کلمات:۱۷،حروف:۷۳۔

ربط ومناسبت:

اصحابِ فیل کے اس عجیب وغریب واقعہ نے (جس کا ذکر سورۂ فیل میں ہوا) تمام باشندگانِ عرب کے دلوں میں قریش کی عظمت بڑھادی تھی اور سب ماننے لگے تھے کہ یہ لوگ اللہ کے خاص بندے ہیں۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں (ابرہہ اوراس کے لشکر) کوخود ہلاک فرمادیا۔اس عظمت کا اثر تھا کہ قبیلہ قریش کے لوگ عرب کے مختلف ممالک کا سفر تجارت کی غرض سے کرتے۔راستہ میں ان کوکوئی نقصان نہ پہنچایا جاتا،اورکوئی خطرہ پیش نہ آتا،حالانکہ دوسروں کے لئے کوئی سفرنقصانات وخطرات سے خالی نہ ہوتا تھا۔قریش کے انہیں مامون سفروں کا ذکراس سورۂ قریش میں فرماکران کوشکرِنعمت کی دعوت دی گئی ہے۔اس سے دونوں سورتوں میں خاص مناسبت معلوم ہوتی ہے۔اس پرمفسرین کا اتفاق ہے کہ مضمون کے لحاظ سے یہ سورت سورۂ فیل سے بہت ہی مناسبت رکھتی ہے۔شاید اسی شدید مناسبت کی وجہ سے بعض مصاحف میں ان دونوں سورتوں کواس طرح ایک کر کے لکھا گیا ہے کہ ان کے درمیان میں بسم اللہ شریف بھی نہیں لکھی گئی۔چنانچہ ایک گروہ نے دونوں کوایک ہی سورت خیال کرلیااوراسی قسم کی چیزوں سے استدلال کیا۔مثلاً حضرت ابی بن کعبؓ کے مصحف میں ان دونوں میں بسم اللہ کافصل نہ تھا۔اورحضرت عمرؓ نے نمازِمغرب میں پہلی رکعت میں سورۂ والتین پڑھی۔اوردوسری میں اَلَمْ تَرَ ولِاِیْلٰفِ پڑھیں اوردونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں پڑھی۔علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہیں۔کیونکہ مصحفِ اُبَیّ رضی اللہ عنہ کی نقل میں اختلاف ہے۔بعض میں بسم اللہ ہے بعض میں نہیں، والمثبتُ مقدمٌ علی النافی. حضرت عمرؓ کی قراءت میں بھی احتمالات ہیں۔ممکن ہے کہ بسم اللہ راوی نے سنی نہ ہواورآپ نے پڑھی ہو۔یاآہستہ سے پڑھی ہووغیرہ **واذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال.** لیکن صحیح وثابت یہی ہے کہ سورۂ قریش ایک علیحدہ ومستقل سورۃ ہے۔کیونکہ حضرت عثمان غنیؓ نے جب اپنے زمانہ میں تمام مصاحفِ قرآن کویکجا جمع کر کے ایک نسخہ تیار کرایااورتمام صحابہ کرام کااس پراجماع ہوا۔(جمہورعلماءاسی مصحفِ عثمانی کو امام کہتے ہیں) تواس مصحفِ عثمانی میں دونوں کودومستقل سورتیں قراردیا گیااوربسم اللہ شریف بھی درمیان میں لکھی گئی،حضرت ام ہانی وحضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کوسات ایسی خصوصیات کے ذریعہ فضیلت عطاءفرمائی کہ وہ خصوصیات نہ ان سے پہلے کسی کوملیں نہ ان کے بعدکسی کوملیں گی۔(۱) میں اُن میں پیداہوا،نبوت ان میں ہوئی (۲) کعبہ کی دربانی ان کے لئے مخصوص رہی۔(۳) حاجیوں کوپانی پلانے کی خدمت ان کودی گئی۔(۴) اصحابِ فیل کے مقابلہ میں انکوکامیابی ہوئی۔(۵) سات اورایک روایت میں دس ۱۰برس تک قریش کے سواکسی نے اللہ کی عبادت نہیں کی (یعنی نبوت کے ابتدائی دس سال میں ان کے علاوہ اورکوئی مسلمان نہیں ہوا۔(**ومولی القوم منھم فلا اشکال**) (۶) قریش کے متعلق ایک سورت مستقل نازل کی گئی جس میں ان کے علاوہ کسی اورکاذکرنہیں کیا گیا۔اوروہ سورت لایلٰف قریش ہے۔(رواہ الحاکم والطبرانی والبخاری فی التاریخ وغیرھم) اس حدیث سے بھی اس سورت کااستدلال معلوم ہوا،علاوہ ازیں دونوں سورتوں کی آیات کا طرزالگ الگ ہے۔**وانت تعلمُ انَّ بعدَ ثبوتِ تواترِالفصلِ لایحتاجُ الیٰ شیٔ مماذکر.**

خاصیت:

ابوالحسن قزوینیؒ کہتے ہیں کہ جس شخص کو کسی دشمن یا کسی اور مصیبت کا خوف ہو اس کے لئے اس سورۂ مبارکہ کا پڑھنا امان ہے۔ اس کو امام جزریؒ نے نقل کر کے فرمایا کہ یہ عمل آزمودہ مجرب ہے۔ صاحب تفسیر مظہریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے شیخ (حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ) نے خوف وخطر کے وقت اس سورت کے پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہر بلا ومصیبت کو دفع کرنے کے لئے اس کا پڑھنا مجرب ہے۔ قاضی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا بارہا تجربہ کیا ہے میں کہتا ہوں کہ سفر میں اس کا پڑھنا آرام وراحت کا سبب ہے۔ ازدہام کے وقت گاڑیوں میں بیٹھنے کی جگہ بھی اس کے پڑھنے سے میسر آجاتی ہے، بارہا تجربہ ہوا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

لِاِيۡلٰفِ قُرَيۡشٍ (۱) اِلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ (۲) فَلۡيَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِ (۳)

چونکہ قریش خوگر ہو گئے ہیں۔ یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہو گئے ہیں۔ تو ان کو چاہیے کہ وہ اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کیا کریں

لِاِيۡلٰفِ	قُرَيۡشٍ	اِلٰفِهِمۡ	رِحۡلَةَ	الشِّتَآءِ	وَ	الصَّيۡفِ	فَلۡيَعۡبُدُوۡا	رَبَّ	هٰذَا	الۡبَيۡتِ
واسطے الفت دلانا	قریش	الفت دلانا ان	سفر	جاڑا	اور	گرمی	پس چاہئے کہ عبادت کریں	پروردگار	اس	گھر

الَّذِىۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ (۴)

جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا۔ اور ان کو خوف میں امن دیا۔

الَّذِىۡ	اَطۡعَمَهُمۡ	مِّنۡ	جُوۡعٍ	وَّاٰمَنَهُمۡ	مِّنۡ	خَوۡفٍ
جس	کھلایا ان	سے	بھوک	اور امن دیا ان	سے	ڈر

لغات:

اِیۡلاف مصدر افعال مانوس رکھنا، اُلفت کرنا، عہد، پروانۂ راہداری۔ اَلَفِ اُلفاً (س) مانوس ہونا، محبت کرنا قُرَیۡش: عرب کا مشہور قبیلہ، نسبت کے لئے قَرَشِی اور قُرَیۡشِیۡ آتا ہے قَرَشَ قَرۡشاً (ن ض) کاٹنا، کمائی کرنا، برانگیختہ کرنا، اکسانا، چغلخوری کرنا وغیرہ، رِحۡلَۃَ مصدر (ف) سفر کرنا، کوچ کرنا، کجاوہ کسنا، اس کے اصلی معنی اونٹ پر پالان کسنے کے ہیں لیکن چونکہ اس کا مقصد کوچ اور سفر کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ سفر کے معنی استعمال ہونے لگا۔ الشِّتَاءِ جاڑا، موسم سرما، جمع اشتیة، بعض علماء نے اسکو شتوة کی جمع بتایا ہے، شتا شتواً (ن) موسم سرما میں قیام کرنا، موسم سرما میں داخل ہونا، الصَّیۡفَ موسم گرما اَصۡیاف، صاف صیفاً (ض) موسم گرما میں قیام کرنا۔ جُوۡع: بھوک جَاعَ جوعاً وَمَجَاعَةً (ن) بھوکا ہونا۔

ترکیب:

اِیۡلَافِ قُرَیۡشٍ مرکب اضافی مبدل منہ۔ اِلٰفِ مضاف اپنے الیہ فاعل هِمۡ اور مفعول بہ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ

وَالصَّیْفِ (مرکب اضافی) سے ملکر بدل اشتمال۔ مبدل اپنے بدل سے ملکر لام کا مجرور، جار مجرور متعلق فعل محذوف، اصل عبارت یہ ہے اِنَّا اھلکنا اصحبَ الفیلِ لایلف...... یا فعل محذوف اِعْجَبُو ا ہے یا فعل مؤخر فَلْیَعْبُدُ وْ ا کے متعلق ہے اس صورت میں فَلْیَعْبُدُوا پر فاء اسلئے ہے کہ پہلے جملہ میں شرط کے معنی پائے جاتے ہیں ای فان لم یعبُدِ القریشُ رَبَّهُمْ لِسَائِرِ نُعَمَائِهٖ فَلْیَعْبُدُوْہ تعالیٰ لایْلا فِهِمْ رِحْلَةَ الشّتاءِ والصیف ففی ھذہ الصورة الفاءُ فصیحةٌ تفصح عن شرطٍ محذوفٍ. فافھم. بعض نے کہا کہ اس لام کا تعلق سورت سابقہ کی آخری آیت میں لفظ جَعَلَ سے ہے والقرانُ کلهٗ کالسُّوْرة الواحدة فلایضر الفصل بالبسملة اوھو کالتضمین فی الشعر. ای فجعل اصحبَ الفیلِ کعصفٍ مَّاکولٍ لِایلف قریش الخ یعنی ان ذلک الاِتلا فُ لھذہ الایلفِ فَلْیَعْبُدُوْا کے تعلق کے علاوہ تمام صورتوں میں فاء تفریعیہ ہوگی۔ فَلْیَعْبُدُوْا فعل ضمیر جمع مذکر (عائد الیٰ قریش) فاعل رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ مرکب اضافی موصوف اَلَّذِیْ اسم موصول۔ اگلے دونوں جملے معطوفین ملکر صلہ موصول وصلہ صفت۔ مرکب توصیفی مفعول بہ جملہ فعلیہ ہوا۔

تفسیر:

لاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ حرف لام کا تعلق اَهْلَكْنا محذوف سے مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے ہاتھی والوں کو جو قریش کے دشمن تھے اس لئے ہلاک کیا کہ قریش گرمی وسردی کے سفروں کے عادی تھے، تاکہ ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ اور سب کے دلوں میں ان کی عظمت پیدا ہوکر مزید سہولتوں اور آسانیوں کا سبب بنے۔ اور اِعْجَبُوْا کے متعلق مانیں تو مطلب یہ ہوگا کہ تعجب کرو قریش کے معاملہ سے کہ وہ کس طرح سردی گرمی کے سفر بے خطر آزادانہ کرتے ہیں۔ اور اگر اسکا تعلق فَلْیَعْبُدُوْا سے ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ قریش اگر دوسری بے شمار نعمتوں کی بنا پر اللہ کی عبادت نہیں کرتے تو اس نعمت کی شکرگزاری کے طور پر تو ان کو ضرور عبادت میں لگ جانا چاہیے کہ ان کو سردی وگرمی کے دوسفروں سے خاص لگاؤ پیدا کردیا ہے جس سے ان کے معاش کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اور ان کو مامون رکھا جبکہ سفر میں بہت خطرات ہیں۔ اور ان کے دشمن ہلاک کر کے خانہ کعبہ کو محفوظ رکھا۔ نیز ان کی عظمت لوگوں کے دلوں میں پیدا کردی جس کی وجہ سے ان کو مزید راحتیں میسر آگئیں۔

اور اگر سورۂ فیل کی آخری آیت سے تعلق مانا جائے تو مطلب وہی ہوگا جو اوّل احتمال پر ہوا۔ بہر حال اس سورت میں ارشاد ہے کہ قریش مکہ چونکہ دوسفروں کے عادی تھے۔ ایک سردی میں یمن کی طرف، دوسرا گرمی میں شام کی طرف۔ اور انہی دوسفروں پر ان کی تجارت اور کاروبار کا مدار تھا اور اسی تجارت کی وجہ سے وہ مالدار بنے ہوئے تھے۔ اور فارغ البال رہ کر بیت اللہ کی خدمت کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن اصحاب فیل کو عبرت ناک سزا سے ہلاک کیا تاکہ ان کی عظمت لوگوں کے قلوب میں اور بڑھ جائے۔ پھر یہ لوگ تمام ممالک میں جہاں جائیں ان کی تعظیم وتکریم کی جائے، ان خصوصی انعامات کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ اس منعم کا شکر ادا کریں۔ اور اسی کی عبادت کرتے رہیں۔

قبیلہ قریش:

قبیلہ کنانہ کی ایک شاخ عرب میں خاندانِ قریش کے ساتھ مشہور تھی۔ اسلام سے پہلے تمام قبائل عدنان پر اس

کو برتری حاصل تھی۔طلوع اسلام کے بعد تو پوری ملت اسلامیہ نے اس کی عظمت تسلیم کر لی۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کے مورث اعلیٰ تک تیرہ (۱۳) پشتیں ہیں۔اور اس سے اوپر عدنان تک سات پشتیں ہیں۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،عبداللہ،عبدالمطلب،ہاشم،عبدمناف،قصی،کلاب،مرہ،کعب،لوی،غالب،فہر،مالک،نضر۔قریش کا مورث اعلیٰ یہی نضر ہے۔اسی کو قریش کہا جاتا ہے۔اس سے اوپر کا سلسلہ کنانہ،خزیمہ،مدرکہ،الیاس،مضر،نزار،معد،عدنان ہے (لغات القرآن) وھو اصح الاقوال واثبتھا عند القرطبیؒ. قیل وعلیه الفقهاء لظاهر ماروی انه علیه السلام سئل عن قریش فقال من ولد النضر وقیل ولد فهر بن مالک بن النضر وحکی ذلک عن الاکثرین بل قال الزبیر بن بکار: اجمع النسابون علیٰ ان قریشاً انما تفرقت عن فهر واسمهٗ عند غیر واحد قریش، وفهر لقبهٗ، ویکنی بابی غالب...... (روح المعانی)

قبائل قریش کی تین شاخیں تھیں۔کچھ قبائل تو وادی کے اندر آباد تھے۔جن کو قریش اباطح یا قریش بطحاء کہا جاتا تھا۔ان میں مندرجہ ذیل قبائل شامل تھے۔بنی عبد مناف،بنی اسد بن عبدالعزیٰ،بنی زہرہ،بنی تمیم،بنی مخزوم،کچھ وادی کے باہر بالائی حصوں میں آباد تھے۔ان کو قریش ظواہر کہا جاتا تھا۔ان میں بنی ادرم بن غالب،بنی محارب،بنی فہر اور بنی مصیص شامل تھے۔تیسری شاخ نے مکہ کی سکونت ترک کر دی تھی۔بنی اسامہ بن لوی عمان میں جا کر بس گئے تھے۔اور بنی خثعم یمامہ میں۔

مکہ کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اس کو خود بخود مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔شمالی جانب شام وعراق اور ایران کو سڑک جاتی تھی۔اور جنوبی جانب یمن،حبش اور مصر کو،مکہ دونوں سڑکوں کے وسط میں واقع تھا۔مکہ کے چار حصے تھے۔ہر حصہ کا حکمران اس کا شیخ ہوتا تھا۔پوری بستی پر کسی ایک آدمی کی حکومت نہ تھی۔ام القریٰ کے اندر بنی کعب بن لوی رہتے تھے۔ان کے برابر بنی عامر بن لوی آباد تھے۔تجارتی غرض سے یہ لوگ ملک شام بھی جاتے۔وہاں رومن اور یونانی تمدن دیکھنے کا بھی موقع ملتا اور کسی قدر مغربی تہذیب سے بھی روشناس ہوتے تھے۔آس پاس والے محض بدوی وصحرائی تھے۔ادھر مدینہ والے صرف زراعت پیشہ تھے۔انہی وجوہ نے مکہ کو تجارتی مرکز بنا دیا تھا۔دوسری قوموں کو دیکھ کر انہوں نے کسی قدر نظام اجتماعیت بھی پیدا کر لیا تھا۔اگر چہ کوئی شخص یا شورائی حکومت اندرونی طور پر نہ تھی۔پھر بھی قریش کی ہر شاخ کی ایک ایسی اجتماعی ہیئت ضرور تھی جو دوسری شاخ کی اجتماعیت سے ٹکراتی نہ تھی۔ہاں بیرونی دفاع کے وقت سب مجتمع ہو جاتے تھے۔قریش کے ایلاف کا ایک مطلب یہ (اجتماعیت) بھی ہو سکتا ہے۔(لغات القرآن ص ۹۹،۱۰۰ ج ۵)

قریش کی وجہ تسمیہ:

حضرت معاویہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے قریش کی وجہ تسمیہ پوچھی تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قریش ایک بڑا دریائی جانور ہوتا ہے۔جس طرف اسکا گذر ہوتا ہے اگر کوئی موٹا،دبلا جانور اس کے سامنے آتا ہے تو وہ اس کو کھا لیتا ہے۔مگر اس کو کوئی نہیں کھا سکتا۔وہ سب پر غالب آتا ہے،اس پر کوئی غلبہ نہیں پاتا۔اس جانور کو قرش بھی کہتے ہیں اور قریش بھی (۲) قاموس میں ہے کہ یہ قَرَشَهٗ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کاٹنا اور جمع کرنا۔ضم کر دینا۔قریش بھی سب حرم میں مجتمع تھے۔یہ بھی وجہ تسمیہ ہو سکتی ہے کہ قریش تجارتی سامان جمع کرتے اور خریدتے تھے۔یا یہ وجہ ہے کہ نضر بن کنانہ اپنے کپڑے میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا تو لوگوں نے کہا تَقَرَّشَ۔یا یہ وجہ ہے کہ جب نضر بن کنانہ اپنی قوم کے پاس آیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ تو قریش ہے۔یعنی قوی اونٹ ہے۔(۳) فراء کہتے ہیں کہ یہ تَقَرَّشَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کمانے کے ہیں کیونکہ وہ لوگ

تجارت سے کمائی کرتے تھے۔اس لئے ان کوقریش کہا گیا۔(۴) بعض کہتے ہیں کہ یہ تقریش سے ہے جس کے معنی تفتیش کے ہیں۔کیونکہ ان کے جدامجد حاجتمندوں کوتلاش کرتے تھے تاکہ ان کی حاجت براری کریں۔اس لئے ان کوقریش کہتے ہیں۔

قریش کی فضیلت:

شروع (ربط کے ذیل) میں روایت گزرچکی ہے کہ قریش کوسات خصوصیات ایسی عطاء ہوئی ہیں کہ ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کونہیں ملیں۔اس سورت سے بھی مفہوم ہوتا ہے کہ تمام قبائلِ عرب میں قریش اللہ کے نزدیک سب سے زائد محبوب ومقبول ہیں،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اولادِ اسمٰعیل میں سے کنانہ کواور کنانہ میں سے قریش کواور قریش میں سے بنی ہاشم کواور بنی ہاشم میں سے مجھ کومنتخب فرمالیا ہے۔ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تمام آدمی قریش کے تابع ہیں خیر میں بھی اور شر میں بھی۔ان میں استعداد قریش کی طرف اشارہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ کفر میں بھی مقتدار ہے اور اسلام میں بھی پیشوا بنے۔اسی لئے بڑے بڑے صحابہ اور اکابر اولیاء اللہ بیشتر قریش میں ہوئے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قریش میں ہوئی۔تو سب سے اول ایمان واحکام کے مکلف قریش ہی ہوئے۔ باقی لوگ ان کے بعد مکلف قرار پائے کماقال تعالیٰ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَامِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّابِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ وفی اٰیۃٍ اُخریٰ ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ لہٰذا جوقریشی ایمان لائے اوراعمال صالحہ کیےان کواپنے ایمان واعمال کا بھی اجر ملے گااور بعد میں آنے والوں کے برابر اور ملے گا کیونکہ وہ رہنما ہوئے۔اسی لئے یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کے بعد مرتبہ میں بھی سب سے بڑھ کر ہیں۔اسی طرح جوایمان نہیں لائے وہ بھی اپنے کفراور بعدوالوں کے کفر کے برابر عذاب کے مستحق ہوں گے۔اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش میں جب تک دوآدمی بھی رہیں یہ امر (خلافت) ان ہی میں رہیگا۔بخاری شریف میں حدیث ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاجب تک قریش دین کو قائم رکھیں گے یہ امر (خلافت) ان میں رہیگا۔جوان سے دشمنی رکھے گا اللہ اس کو منہ کے بل گرادیگا۔حضرت سعدؓ کی روایت میں ہے کہ جوشخص قریش کوذلیل کرنا چاہیگا اللہ اس کوذلیل کریگا۔(ترمذی)

رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ...... مکہ مکرمہ ایسی جگہ آباد ہے جہاں نہ زراعت ہوتی نہ باغات ہیں کہ وہاں کے باشندوں کو ان سے غلہ اور پھل مل سکیں۔اسی لئے بیت اللہ کے بانی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے بچہ اور بیوی کواس مقام پر چھوڑتے وقت یہ دعافرمائی تھی ﴿رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَالِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ﴾ (اے مالک! میں نے اپنی نسل کو ایسی جگہ آباد کردیا ہے جہاں کھیتی باڑی نہیں یعنی آپ کے خانہ کعبہ کے پاس،اے ہمارے مالک نیت یہ ہے کہ یہ لوگ نماز قائم کریں ۔لہٰذا آپ لوگوں کے دلوں کوان کی طرف متوجہ فرمایئے اوران کوپھلوں سے رزق عطافرمایئے) دوسری جگہ ہے ﴿وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ﴾ یعنی یہاں کے باشندوں کوپھلوں سے روزی دیجئے،اس لئے اہل مکہ کے معاش کامداراس پرتھا کہ وہ تجارت کے لئے سفر کریں،اور باہر سے اپنی ضروریات مہیا کریں۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل مکہ بڑے افلاس اور تکلیف میں تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد ہاشم نے قریش کودوسرے ملکوں میں تجارت کے لئے آمادہ کیا،ملک شام ٹھنڈا ملک ہے اس لئے موسم گرما میں وہاں اور ملک یمن گرم ملک ہے اس لئے موسمِ سرما میں اس طرف تجارت کرکے منافع حاصل کرتے تھے۔

اور چونکہ یہ لوگ بیت اللہ کے خادم ہونے کی بنا پر تمام عرب میں مقدس ومحترم شمار ہوتے تھے۔ اس لئے راستوں کے خطرات سے بھی محفوظ رہتے تھے۔ اور ہاشم کیونکہ ان سب کے سردار تھے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ اس تجارت میں جو منافع ہوتے وہ قریش کے امیروں اور غریبوں سب ہی پر تقسیم کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کا غریب آدمی بھی مالداروں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ پھر حق تعالیٰ نے ان پر مزید یہ احسان فرمایا کہ ان کو ہر سال کے دو سفروں کی زحمت سے بھی اس طرح بچا دیا کہ مکہ مکرمہ سے ملے ہوئے علاقہ یمن، نبالہ وحرش کو اتنا سر سبز و زرخیز بنا دیا کہ وہاں کا غلہ وہاں کے باشندوں کی ضروریات سے اس قدر زائد ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس کو جدہ لاکر فروخت کرتے تھے۔ اس طرح اکثر ضروریات زندگی جدہ میں ملنے لگیں۔ مکہ والے طویل سفروں کی بجائے صرف دو منزلوں پر جا کر جدہ سے سب سامان لانے لگے، آیتِ مذکورہ میں اس انعام، واحسان کا ذکر فرمایا ہے کہ ان کو ان دو سفروں کا عادی بنا کر ان کے اسبابِ حیات کا نظم فرمایا گیا۔

فائدہ...... اس معبد (خانہ کعبہ) کے اردگرد کو نا قابل زراعت بنایا۔ تاکہ وہاں جانے والے باغات اور سرسبز پہاڑوں کی سیر وتفریح کی نیت سے وہاں نہ جائیں۔ پھر وہاں کے باشندوں کو دنیا کی نعمتوں سے محروم بھی نہیں رکھا، بلکہ دنیا بھر کی اقسام وانواع کی پیداوار کو وہاں پہنچانے کے اسباب مہیا فرما دیئے۔ اور وہاں کے باشندوں کو تجارت کا خوگر بنا دیا۔ خصوصاً سردی وگرمی کے دو سفروں کو بطور خرق عادت حق تعالیٰ نے قریش کے لئے اتنا خوش آئند و پر لطف بنا دیا کہ بجائے زحمت ان میں ان کے لئے لذت پیدا فرمادی۔ اور ان کا سردی وگرمی کے سفروں کا خوگر ہونا اسلام کی ترقی کا بچند وجوہ سبب بنا۔

(۱) جہاد وہجرت کے سفر ان پر شاق نہ ہوئے کہ مدینہ سے لیکر کابل، اندلس، قسطنطنیہ، مصر، شام، وغیرہ مختلف ممالک میں ان حضرات نے جہاد کے اسفار کئے۔ (۲) اسفار تجارت میں مختلف قوموں کی عادتوں کے تجربات ہوئے۔ جو اشاعت اسلام اور اُمور ریاست وسیاست میں ان کے کام آئے۔ حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو سفروں کا عادی بنا کر اشاعت اسلام کے اسباب پہلے سے مہیا فرما دیئے، کہ سب سے پہلے اس کو ایسی قوم عطا کی جن کو پہلے سے ہی حوصلہ، لیاقت وجفاکشی اور اولوالعزمی کے جوہر دے دیئے گئے تھے۔

فَلْيَعْبُدُوا...... انعامات کے ذکر کے بعد قریش کو خصوصی طور پر اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں اور ان انعامات کا شکر ادا کریں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رَبُّ الْبَيْتِ کی صفت کو خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا کہ یہ ہی بیت (خانہ کعبہ) ان تمام فضائل وبرکات کا سرچشمہ اور انعاماتِ ربانی کا مرکز وسبب ہے۔

الَّذِيْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ...... اس میں قریش مکہ کے لئے ان تمام عظیم نعمتوں کو جمع فرما دیا جو انسان کی راحت وعیش کے لئے ضروری ہیں۔

الَّذِيْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ میں کھانے پینے کی ضروریات داخل ہیں۔ اور **اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ** میں دشمنوں، ڈاکوؤں اور ناگہانی آفتوں نیز مزمن امراض وغیرہ کے خوف سے مامون ہونا بھی شامل ہے اور اُخروی عذاب سے بھی امن کا اشارہ ملتا ہے۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ حرم میں رہنے والوں کو جزام جیسا موذی مرض لاحق نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

فائدہ...... حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس آیت کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کریگا حق تعالیٰ اس کو دُنیا وآخرت کے خطرات سے محفوظ و مامون فرما دیں گے۔ اور جو اس سے انحراف کریگا تو حق تعالیٰ اس سے دونوں قسم کے امن سلب کر لیتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً﴾ (پ۱۴ ع۲۱)
یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک محفوظ و مامون بستی تھی، ہر جگہ سے اس میں رزق خوب فراوانی سے آتا تھا۔
پھر اس بستی والوں نے اللہ کے انعامات کی ناشکری کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بھوک اور خوف کی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اور یہ
سب ان کی کرتوتوں کی وجہ سے ہوا۔ حاصل یہ ہوا کہ مکہ دارالامن ضرور ہے مگر بشرطِ عبادت رب ورنہ الحرم لایعیذ
عاصیاً ولا فاراً بدمٍ۔ واللہ اعلم۔

تم تفسیر سورة قریش فالحمد للّٰہ رب العرشِ العظیم والصلوٰة والسلامُ علیٰ نبیه الکریم وعلیٰ اٰله وصحبه وائمة الدین القویم

سُوْرَةُ الْمَاعُوْن

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعُ اٰيَاتٍ

(رکوع ۱۔ ایات ۷۔ سورۂ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں سات آیات ہیں۔ کلمات ۲۵۔ حروف ۱۲۵)

ربط ومناسبت:

سورۂ قریش میں انعامات یاد دلا کر حق تعالیٰ نے اپنی عبادت کی رغبت دلائی تھی۔ اور عبادت ہی بندہ کو اپنے مولیٰ
سے ملانے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس سورت میں قریش کے وہ مہلک امراض روحانیہ بیان ہوئے ہیں جو گمراہ کُن اور خدا سے ملنے
میں سدِّ راہ ہیں۔ اسکے علاوہ جزوی مناسبات ظاہر ہیں۔ مثلاً وہاں اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ فرمایا تھا۔ یہاں طعام مسکین پر نہ
ابھارنے کی مذمت ہے۔ وہاں رب البیت کی عبادت کا حکم تھا اور یہاں سب سے بڑی عبادت نماز سے غفلت پر وعید ہے
وہاں قریش پر انعامات کا ذکر تھا اور ان میں سے اکثر بعث و جزا پر ایمان نہ رکھتے تھے۔ یہاں تکذیب پر تہدید ہے وغیرہ۔

سورۂ ماعون:

اس سورۃ کی اَرَءَيْتَ الَّذِيْ، سورۂ تکذیب اور سورۂ دین بھی کہتے ہیں، جمہورؒ کے قول کے مطابق یہ سورت مکیہ
ہے۔ درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ وحضرت زبیرؓ سے بھی یہی مروی ہے، ابن عباسؓ کی ایک روایت اور قتادہ وضحاک
کا مسلک یہ ہے کہ یہ سورت مدنیہ ہے، مفسر ضریر رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ اس سورت کا نصف اول مکی ہے جو عاص بن وائل کے
بارے میں نازل ہوا۔ اور نصف آخر مدنی ہے جو عبداللہ بن اُبی منافق کے بارے میں نازل ہوا۔ جمہور کا قول قوی تر ہے وجہ
تسمیہ ظاہر ہے کہ اس سورت میں ماعون کا لفظ مذکور ہے۔ اسی طرح دوسرے ناموں کے الفاظ بھی سورت میں موجود ہیں۔

شانِ نزول:

ابوجہل مردود کی عادت تھی کہ جب کوئی مالدار بیمار ہوتا تھا تو وہ اسکے پاس آ کر بیٹھتا اور کہتا کہ آپ اپنے یتیموں کو
میرے سپرد کر دیں۔ اور ان کے حصہ کا مال میرے پاس امانت رکھ دیں میں ان کی ایسی خبر گیری وخدمت گزاری کرونگا کہ
آپ کے ورثہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح ان کا مال اپنے قبضہ میں لے لیتا۔ اور یتیموں کو اپنے دروازہ سے دھتکار دیتا پھر وہ
دربدر ٹھوکریں کھاتے، اور گلی کوچوں میں بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن ایک پریشان حال یتیم آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے پاس آیا، اور اس ملعون کی شکایت کی آپ اس کے پاس تشریف لے گئے۔ فہمائش کی، آخرت کے حساب

وعذاب سے ڈرایا۔مگر اس ملعون نے ایک نہ سُنی ، بلکہ قیامت کو جھٹلا دیا اور آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا آپ اس کی بیہودگی سے رنجیدہ ہوکر دولت کدہ پر تشریف لائے تو یہ سورت نازل ہوئی (فتح العزیز) بعض نے عاص بن وائل کا اسی قسم کا واقعہ بیان کیا ہے۔دراصل ابوجہل، عاص بن وائل، امیہ بن خلف وغیرہ مشرکین عموماً یتیموں ،بیکسوں اور کمزروں پر ظلم کرنے کے عادی تھے۔واقعہ کسی کا بھی ہو۔اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے۔

اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ (١) فَذٰلِكَ الَّذِىۡ يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ (٢) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ

کیا آپ نے اس کو دیکھا جو جزا کا انکار کرتا ہے؟ سو وہ شخص وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔اور محتاج کو کھانا دینے کی ترغیب بھی نہیں دیتا۔

اَرَءَيۡتَ	الَّذِىۡ	يُكَذِّبُ	بِالدِّيۡنِ	فَذٰلِكَ	الَّذِىۡ	يَدُعُّ	الۡيَتِيۡمَ	وَ	لَا	يَحُضُّ	عَلٰى	طَعَامِ
کیا دیکھا تو	اس شخص	جھٹلاتا ہے	کو جزا	پس یہ	وہ شخص جو	دھکے دیتا ہے	یتیم	اور	نہیں	رغبت دلاتا	اوپر	کھانا دینے

الۡمِسۡكِيۡنِ (٣) فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ (٤) الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ (٥)

پھر ان نمازیوں کے لئے خرابی ہے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں۔

الۡمِسۡكِيۡنِ	فَوَيۡلٌ	لِّلۡمُصَلِّيۡنَ	الَّذِيۡنَ	هُمۡ	عَنۡ	صَلَاتِهِمۡ	سَاهُوۡنَ
مسکین	پس وائے	نماز پڑھنے والوں	جو کہ	وہ	سے	اپنی نماز	غافلین

الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ (٦) وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (٧)

جو لوگ دکھلاوا کرتے ہیں اور زکوۃ بالکل نہیں دیتے۔

الَّذِيۡنَ	هُمۡ	يُرَآءُوۡنَ	وَيَمۡنَعُوۡنَ	الۡمَاعُوۡنَ
جو کہ	وہ	دکھلاتے ہیں	اور منع کرتے ہیں	برتنے کی چیز

لغات:

سَاهُوۡنَ : صیغہ جمع مذکر اسم فاعل بھولنے والے، غافل۔بے خبر۔دراصل سَاهِيُوۡنَ بروزن فَاعِلُوۡنَ تھا ضمہ ی پر ثقیل تھا، ماقبل کو دیدیا۔اجتماع ساکنین کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔غفلت سے جو خطا سرزد ہوتی ہے وہ سہو ہے۔اگر غیر اختیاری سبب سے ہے تو قابلِ مؤاخذہ نہیں۔جیسے دیوانہ کا گالی گلوچ کرنا دیوانگی کے سبب۔اور جس کا سبب اختیاری ہے وہ سہو قابلِ ملامت ومؤاخذہ ہے۔جیسے شراب پی کر گالیاں بکنا اسی دوسری قسم کی مذمت قرآن پاک میں وارد ہے۔ **سَهَا سَهۡوًا وسُهُوًا(ن)** غافل ہونا، بھولنا، سہو ونسیان میں فرق یہ ہے کہ سہو میں بات ذہن سے نکل جاتی ہے۔قوتِ حافظہ سے نہیں جاتی۔ اور نسیان میں قوتِ حافظہ سے بھی نکل جاتی ہے۔اسی لئے سہو میں دوبارہ محنت کی ضرورت نہیں ہوتی نسیان میں ہوتی ہے۔
الۡمَاعُوۡنَ: بھلائی ،حسنِ سلوک، پانی، بارش، گھر کا سامان، فرمانبرداری، زکوۃ وغیرہ۔لغت میں لفظ ماعون کے مختلف معانی آتے ہیں۔جو چیز کسی مانگنے والے کے مدد کے لئے دیدی جائے وہ بھی ماعون کہلاتی ہے۔اور جو روک لی جائے وہ بھی ماعون

ہے۔اسی لئے بعض اہل لغت کا قول ہے کہ ماعون کی اصل مَعُوْنَۃ تھی۔الف تاء کے عوض بڑھایا گیا ہے۔یہ قول بلادلیل ہے مگراس لفظ کے مفہوم کے مناسب ہے کہ جودل نشین چیز دی جاتی ہے وہ دوسرے کے لئے سبب معونت بن جاتی ہے جونہیں دی جاتی وہ اپنے لئے باعث معونت ہوتی ہے۔اس لئے دونوں صورتوں میں اس کو ماعون کہا جاتا ہے۔ابوعبیدہؒ کہتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں ہر منفعت وعطیہ کو ماعون کہتے تھے۔اوراسلام میں طاعت،خیرات اور زکوٰۃ کا نام ماعون ہوگیا۔اسی لئے ماعون کے ترجمہ میں علماءومفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔جیسا کہ عنوانِ تفسیر میں مذکور ہے۔

ترکیب:

اَرَءَیْتَ فعل بافاعل اَلَّذِیْ اسم موصول اپنے صلہ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (جملہ فعلیہ) سے ملکر مفعول بہ جملہ فعلیہ ف جزائیہ ذٰلِکَ مبتدا اَلَّذِیْ اسم موصول یَدُعُّ الْیَتِیْمَ فعل فاعل مفعول بہ جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَلَا یَحُضُّ فعل ضمیر فاعل عَلٰی اپنے مجرور طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ سے ملکر متعلق جملہ فعلیہ معطوف۔معطوفین صلہ،موصول وصلہ ملکر خبر جملہ اسمیہ جزائے شرط محذوف ای اِنْ لَمْ تَعْرِفْهُ وَاَرَدْتَ اَنْ تَعْرِفَهُ فَذٰلِکَ الخ وَیْلٌ مبتدا اَلْمُصَلِّیْنَ موصوف اَلَّذِیْنَ اسم موصول هُمْ مبتدا سَاهُوْنَ اپنے متعلق مقدم عَنْ صَلَاتِهِمْ سے ملکر خبر۔مبتداوخبر جملہ اسمیہ صلہ،موصول وصلہ صفت اولیٰ۔ هُمْ مبتدا یُرَآءُوْنَ جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْن فعل فاعل مفعول بہ جملہ فعلیہ معطوف معطوفین ملکر خبر،جملہ اسمیہ صلہ۔موصول وصلہ ملکر صفت ثانیہ اَلْمُصَلِّیْنَ اپنی دونوں صفتوں سے ملکر مجرور لام۔جارومجرور متعلق محذوف ثابت خبر وَیْلٌ کی،جملہ اسمیہ جزائے شرطِ محذوف ای اذا کان ماذکر من عدم المبالاۃ بالیتیم والمسکین من دلائل التکذیب فویل ......واللہ اعلم۔

تفسیر:

اس سورت میں کفار ومنافقین کی چند بدکرداریوں اور بداعمالیوں کا ذکراوران پر جہنم کی وعید مذکور ہے۔یہ افعالِ قبیحہ اگر کسی مؤمن سے سرزد ہوں جو جزا کی تکذیب نہیں کرتا تب بھی شرعاً مذموم اور سخت گناہ ہیں مگروعید مذکوران پر لاگو نہیں ہوگی،اس لیےان افعال کے ذکر سے پہلے اس شخص کا ذکر کردیا گیا جواس وعید کا مستحق ہےاور وہ ہے منکر قیامت ومکذب جزا،اس میں اس طرف اشارہ ضرور ہے کہ یہ افعال ذمیمہ جن کا ذکراس سورت میں ہے کفار کے لائق ہیں اور مؤمن کی شان سے بعید تر ہیں۔یہ ایسے بدترین گناہ ہیں جن کا مرتکب کوئی کافر ومنکر ہی ہوسکتا ہے وہ برے اعمال جن کا اس سورت میں ذکر ہے یہ ہیں:(۱) یتیم کے ساتھ بدسلوکی اوراس کی توہین۔(۲) باوجود قدرت محتاجوں کوکھانا نہ دینا اور دوسروں کوترغیب نہ دینا۔(۳) نماز پڑھنے میں غفلت ولا پرواہی برتنا۔(۴) ریاکاری کرنا۔(۵) زکوٰۃ ادانہ کرنا۔ایسی کنجوسی کرنا کہ معمولی چیزوں سے دوسروں کونفع نہ پہنچانا۔یہ اعمالِ بداپنی ذات کے اعتبار سے بھی بہت مذموم اور سخت گناہ ہیں۔اور جب کفر وتکذیب کے نتیجہ میں سرزد ہوں توان کا وبال دائمی عذاب جہنم ہے۔

اَرَءَیْتَ...... اس میں استفہام برائے تعجب ہے یاتقریری ہے۔اوررؤیت سے مرادرؤیت بصری (دیکھنا) یاقلبی (جاننا،پہچاننا) ہے۔خطاب حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے یاہر مخاطب کو۔یہ آیت عاص بن وائل سہمی کے بارے میں نازل ہوئی،(مقاتلؒ) یاولید ابن مغیرہ کے حق میں (سدیؒ وابن کیسانؒ) یاعمرو بن عامر مخزومی کے متعلق (ضحاکؒ) یا

ابوجہل کے بارے میں، ان تمام اقوال کی بنا پر سورت کا ابتدائی حصہ یقیناً مکی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ اَرَءَ یْتَ الَّذِی ...... ایک منافق کے متعلق نازل ہوئی۔ اس روایت کے پیش نظر پوری سورت بظاہر مدنیہ معلوم ہوتی ہے (مرتفصیلہ) دین سے مراد یہاں اسلام وشریعت ہے یا جزا ہے۔

فَـذٰلِکَ ...... بندگانِ حق پر مظالم کرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس ظالم کو آخرت وحساب کتاب کا یقین نہیں ہے۔ اور جسکو حساب وجزا کا یقین ہوگا وہ ہر قسم کی حق تلفیوں سے خصوصاً حقوق العباد میں کوتاہی سے بہت دور رہیگا۔

فَوَیْلٌ ...... ان آیات میں منافقوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ لوگوں کو دکھلانے اور اپنے دعوائے اسلام کو ان کی نظروں میں ثابت کرنے کے لئے نماز تو پڑھتے ہیں مگر چونکہ وہ نماز کی فرضیت ہی کے قائل ومعتقد نہیں۔ اسلئے نہ اوقات کی پابندی کرتے ہیں نہ اصل نماز کی، جہاں دکھلانے کا موقع ہوا پڑھ لی ورنہ ترک کردی۔

عَـنْ صَلَاتِهِـمْ میں لفظ عَـنْ کا مفہوم یہی ہے کہ وہ اصل نماز ہی سے بے پروائی کرتے ہیں۔ رہا نماز میں سہو ونسیان کا ہوجانا یہ یہاں مراد نہیں۔ یہ سہو ونسیان ہر مسلمان کو پیش آتا ہے بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آیا اگر یہ مراد ہوتی تو لفظ عَنْ کے بجائے لفظِ فِیْ کا استعمال ہوتا (فِیْ صَلَاتِهِمْ) احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو متعدد بار نماز میں سہو واقع ہوا۔ حضرت انسؓ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا قول مذکور ہے۔ دونوں نے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْن فرمایا اور فِیْ صَلوتِهِم سَاهُون نہیں فرمایا۔ امام بغویؒ نے مصعب بن سعدؓ کی روایت نقل کی ہے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عَـنْ صَلَاتِهِـم سَاهُوْن کا مطلب پوچھا گیا، آپ نے فرمایا اس کا مطلب ہے نماز کو ضائع کردینا، ابویعلیؒ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے سَـاهُوْنَ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کردیتے ہیں۔ ابوالعالیہؒ کہتے ہیں کہ سَـاهُوْنَ وہ لوگ ہیں جو مقررہ وقت پر نماز نہیں پڑھتے اور رکوع وسجود کو پورا ادا نہیں کرتے۔ قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو پرواہ نہیں ہوتی کہ نماز پڑھی یا نہیں پڑھی۔ بعض نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو نماز پڑھ کر ثواب کی امید نہیں ہوتی۔ اور نہ پڑھ کر عذاب کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ مجاہدؒ نے کہا یہ لوگ نماز میں غفلت وسستی کرنے والے ہیں۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ ہیں جو دکھلانے کے لئے نماز پڑھتے ہیں۔ فوت ہوجاتی ہے تو افسوس نہیں ہوتا۔ یہ عبارتیں مختلف ہیں لیکن مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے۔ اور وہ بے یقینی وبے ایمانی سے پیدا ہونے والی غفلت۔ واللہ اعلم۔

وَیَـمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ...... حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، قتادہؒ، حسنؒ، ضحاکؒ، وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ ماعون سے مراد زکوٰۃ ہے وجہ یہ ہے کہ ماعون کے اصل معنی تھوڑی چیز کے آتے ہیں۔ اور زکوٰۃ بھی مال کا تھوڑا سا حصہ ہوتا ہے۔ جمہور مفسرین سے یہی تفسیر منقول ہے۔ دوسرے بہت سے حضرات نے ماعون سے ایسی استعمال چیزیں مراد لی ہیں جو عادۃً ایک دوسرے کو عاریۃً دی جاتی ہیں۔ اور جن کا باہم لین دین عام انسانیت ومروت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔ جیسے ڈول، کلہاڑہ، پھاوڑہ، کھانے پکانے کے برتن جن کا ضرورت کے وقت پڑوسیوں کو مانگ لینا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ اور جوان چیزوں کے دینے میں بخل کرے وہ بڑا کنجوس ہے اور کمینہ سمجھا جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، مجاہدؒ، محمد بن کعبؒ اور کلبیؒ وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ عکرمہؒ کہتے ہیں کہ ماعون سے ہر اعلیٰ وادنیٰ چیز مراد ہے۔ اعلیٰ چیز تو زکوٰۃ ہے اور ادنیٰ استعمال کا گھریلو سامان ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ ماعون سے مراد وہ معمولی اشیاء ہیں جن کا منع کرنا درست

نہیں۔جیسے پانی،نمک اور آگ۔حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ پانی تو خیر معمولی چیز ہے۔نمک اور آگ میں کیا بات ہے،فرمایا حمیرا جس نے آگ دیدی اس نے گویا اس آگ سے پکا ہوا کھانا دیدیا،اور جس نے نمک دیدیا تو اس نے گویا اس نمک سے درست کیا ہوا کھانا دیدیا۔اور جس نے ایسے مقام پر جہاں پانی ملتا ہے کسی مسلمان کو پانی پلا دیا اس نے گویا ایک غلام آزاد کر دیا۔اور اگر ایسے مقام پر پانی پلا دیا جہاں پانی نہیں ملتا اس نے گویا اس کو زندہ کر دیا۔(ابن ماجہ)

لیکن جمہور کا قول ہی درست ہے۔اور ماعون سے یہاں مراد زکوٰۃ ہی ہے۔کیونکہ اس کے نہ دینے پر یہاں ویل جہنم کی وعید مذکور ہے جو ترک فرض ہی پر ہو سکتا ہے۔اور استعمالی آشیاء کا دینا گو بڑا ثواب اور انسانیت و مروت کا تقاضا ہے مگر فرض وواجب نہیں۔جس کے ترک پر جہنم کی وعید ہو،اور جن روایات میں اس کی تفسیر استعمالی اشیاء اور برتنوں وغیرہ سے کی گئی ہے ان کا مطلب ایسے لوگوں کی انتہائی خسّت کا اظہار ہے کہ یہ لوگ زکوٰۃ تو کیا دیتے ایسی معمولی اشیاء جن کے دینے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا اس میں بھی کنجوسی کرتے ہیں۔تو وعید صرف ان اشیاء کے نہ دینے پر نہیں بلکہ زکوٰۃ فرض کی ادائیگی نہ کرنے پر ہے۔اور اس کے ساتھ مزید بخل شدید پر بھی ہے۔واللہ اعلم۔

فائدہ:

اس چھوٹی سی سورت میں اصولِ سعادت،حقوق اللہ اور حقوق العباد نیز تہذیب الاخلاق اور سیاست مدن وتدبیر منزل،حکمتِ نظریہ وحکمت عملیہ وغیرہ کو کس حیرت انگیز طریقہ پر بیان کیا گیا ہے۔یہ کلامِ الٰہی کا ہی کمال ہے کہ ایک بڑے سمندر کو کوزہ میں بند کر کے پیش کر دیا گیا۔اس کی قدرے تفصیل تفسیر حقانی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ہماری اس مختصر میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔

تم تفسیر سورۃ الماعون فسبحان اللہ والحمد للہ الذی اذا اَراداً شیئاً ان یقول لہٗ کن فیکون وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ من اٰمن بہ الاولون والاٰخرون واقتدیٰ بہ الانبیاء والمُسلمون وعلیٰ الہ واصحابہ الذین ھم بھدیہ وھد ایتہ مُھتدون

سُورَۃُ الْکَوْثَرِ

سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ مَکِّیَّۃٌ وَھِیَ ثَلٰثُ ایاتٍ

(رکوع ۱۔آیات ۳ سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں تین آیات ہیں۔ کلمات ۱۰۔حروف ۴۲)

ربط ومناسبت:

(۱) یہ سورت پہلی سورۃ کے مقابلہ میں ہے۔سورۂ ماعون میں منافق وبددین کے چار بڑے اوصاف بیان کئے گئے تھے (۱) بخل (۲) ریا (۳) ترک صلوٰۃ (۴) منع زکوٰۃ۔اس سورت میں بخل کے مقابلہ میں **انا اعطینک الکوثر** فرمایا اور ترک صلوٰۃ کے مقابلہ میں فَصَلِّ (اَیْ دُمْ عَلَی الصَّلٰوۃِ) فرمایا۔اور ریا کے مقابلہ میں لِرَبِّکَ **(ای لرضانہ لا للناس)** فرمایا۔اور منع ماعون کے مقابلہ میں وَانْحَرْ فرمایا۔**واراد بہ سبحانہ وتعالیٰ التصدق بلحوم الاضاحی ،فافھم**

(۲) سورۃ ماعون میں حکمت کے تمام اقسام بیان ہوئے تھے جیسا کہ اخیر میں اشارہ کر دیا گیا وہاں اس طرف بھی

اشارہ ہے کہ بعض بنی آدم ایسے کم نصیب اور بد بخت بھی ہیں جو ان تمام حکمتوں سے یا ان میں سے بعض سے محروم ہیں ایسے لو گ دراصل ابتر منقطع النسل ہیں کہ مرنے کے بعد ان کا نام باقی رہا اور نہ بہتر یادگار۔ ان کے مقابلہ میں اس سورۂ کوثر میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو خوش نصیب قرار دیا گیا کہ آپ کو خیر کثیر کا ایسا بے پایاں سمندر عطا ہوا ہے کہ عالم ہمیشہ ہمیش اس سے سیراب رہے گا اور آپ کی جسمانی وروحانی نسلیں اس آب حیات سے سیراب ہوتی رہیں گی اور ہمیشہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام تابندہ وپائندہ رہے گا۔

سورۂ کوثر کا شان نزول:

یہ سورت بھی اکثر علماء کے نزدیک مکہ میں نازل ہوئی حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن زبیرؓ، مقاتل اور کلبی رحمۃ اللہ علیہما سے یہی منقول ہے۔ مگر مجاہد، قتادہ، حسن بصری اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں اسی کو درست قرار دیا ہے اور علامہ نووی نے بھی شرح مسلم میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ سبب نزول کی روایات سے دونوں قولوں کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ خفاجی فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے اس بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ اس کا نزول دو (۲) مرتبہ ہوا ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں وحینئذٍ فلا اشکال .

شان نزول:

ابن ابی حاتم نے سدی سے اور بیہقی نے حضرت محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ جس کی مذکر اولاد مرجاتی، اہل عرب اس کو ابتر یعنی مقطوع النسل کہا کرتے تھے جب نبی کریم کے صاحبزادے قاسم یا ابراہیم (رضی اللہ عنہما) کا انتقال ہو گیا تو کفار مکہ ابتر کہہ کر آپ کو طعنہ دینے لگے ایسا کہنے والوں میں عاص بن وائل سہمی کا نام خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے سامنے جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو کہتا کہ ان کی بات چھوڑو کوئی فکر نہ کرو کیونکہ وہ ابتر (مقطوع النسل) ہیں جب ان کا انتقال ہو جائیگا تو کوئی ان کا نام لینے والا بھی نہ رہے گا اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

اور بعض روایات میں ہے کہ کعب بن اشرف یہودی ایک مرتبہ مکہ مکرمہ آیا تو قریش مکہ اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ اس نوجوان کو نہیں دیکھتے جو کہتا ہے کہ وہ ہم سب سے (دین کے اعتبار سے) بہتر ہے حالانکہ ہم حجاج کی خدمت اور بیت اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں اور لوگوں کو پانی پلاتے ہیں۔ کعب نے یہ سن کر کہا نہیں تم لوگ اس سے بہتر ہو اس پر یہ سورۂ کوثر نازل ہوئی۔

حاصل یہ ہے کہ کفار مکہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاد ذکور نہ ہونے کی وجہ سے ابتر ہونے کے طعنہ دیتے تھے یا دوسری وجوہ سے آپ کی شان اقدس میں گستاخیاں کرتے تھے ان سب کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی جس میں ان کے طعنوں کا جواب بھی ہے کہ صرف اولاد نرینہ نہ رہنے کی وجہ سے آپ کو مقطوع النسل کہنے والے حقیقت سے بے خبر ہیں آپ کی نسبی نسل بھی دنیا میں قیامت تک رہے گی اگر چہ دختری اولاد سے ہو۔ اور نسل معنوی وروحانی بھی قیامت تک رہیگی یعنی آپ پر ایمان لانے والے مسلمان جو درحقیقت نبی کی روحانی اولاد ہوتے ہیں وہ تو اس کثرت سے ہوں گے کہ تمام انبیائے سابقین کی امتوں سے بڑھ جائیں گے اور اس میں کعب بن اشرف کے قول کی تردید بھی ہے۔

فائدہ...... ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سورت مکیہ ہے دوسری بعض روایات اس کے مدنیہ ہونے پر دال ہیں مثلاً مسلم شریف میں حضرت انسؓ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف

فرماتے اچانک آپ پر ایک غفلت طاری ہوگئی، کچھ دیر کے بعد مسکراتے ہوئے سر اٹھایا ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے مسکرانے کا سبب کیا ہے؟ فرمایا ابھی ایک سورت اتری ہے۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** ﴿**انا اعطینک الکوثر فصل لربک وانحر ان شانئک ھو الابتر**﴾ پڑھی اور فرمایا تم کو معلوم ہے کہ کوثر کیا چیز ہے؟ الیٰ آخر الحدیث۔

ابن جریر نے سعید بن جبر کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت **فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ** حدیبیہ کے دن اتری حضرت جبریل نے آکر کہا قربانی کرو اور لوٹ کر چلے جاؤ، اس حکم پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا خطبہ میں بال کتروانے اور قربانی کرنے کا حکم دیا پھر دو رکعت نماز پڑھی اور جا کر اونٹوں کو ذبح کیا۔ (مظہری)

صاحب مظہری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ **انا اعطینک الکوثر** کا نزول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کی وفات کے قریب نہیں ہوا کیونکہ حضرت قاسم کی وفات تو مکہ میں ہجرت سے پہلے اور بقول بعض بعثت سے پہلے ہوئی تھی اور حضرت محمد بن علی کی روایت کی سند میں جابر جعفی ہے جو انتہائی جھوٹا تھا اور واقدی کا قطعی خیال ہے کہ حضرت ابراہیم کی وفات دس ربیع الاول سن ۱۰ نبوی کو ہوئی (کذا فی سبیل الرشاد) اس آیت کے شان نزول میں صرف دو روایات صحیح ہیں ایک مسلم کی جو حضرت انسؓ سے مروی ہے دوسری ابن عباس کی جو بزاز نے بیان کی ہے جس میں کعب بن اشرف کی مکہ آمد اور قریش کا اس سے سوال مذکور ہے۔ (مظہری) لیکن روایات کی روشنی میں صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سورت کا نزول مکرر ہوا ہے ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

اِنَّـا اَعْـطَیْـنٰکَ الْـکَـوْثَـرَ (۱) فَـصَـلِّ لِـرَبِّکَ وَانْـحَرْ (۲) اِنَّ شَـانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ (۳)

بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمائی۔ سو آپ اپنے رب کی نماز پڑھیے اور قربانی کیجئے۔ یقیناً آپ کا دشمن ہی بے نام نشان ہے۔

اِنَّا	اَعْطَیْنٰکَ	الْکَوْثَرَ	فَصَلِّ	لِرَبِّکَ	وَانْحَرْ	اِنَّ	شَانِئَکَ	ھُوَ	الْاَبْتَرُ
تحقیق (ہم)	دی ہم تجھ	کوثر	پس نماز پڑھ واسطے	پروردگار اپنے	اور قربانی کر	تحقیق	دشمن تیرا	وہی	بے نسل

لغات:

الکوثر بروزن **فوعل** کثرت سے ماخوذ ہے **مبالغة فی الکثرة** کے لئے ہے جیسے نوفل نفل سے اور جوہر جہر سے ہے۔ جو چیز مقدار، تعداد، قدر و مرتبہ اور برکت میں زیادہ ہو اہل عرب اس کو کوثر کہتے ہیں۔ یہاں کیا مراد ہے تفسیر میں ملاحظہ کریں گے۔ **انحر** صیغہ امر **نحر** (ف) سے مشتق ہے جس کے معنی قربانی کرنے کے ہیں **نحر** سینہ کا بالائی حصہ، جہاں **قلادہ** پڑا رہتا ہے اسی اعتبار سے **نحر** کے معنی سینہ پر مارنے یا ذبح کرنے کے آتے ہیں **شانئ** دشمن یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے **شنأ** (ف) **وشنی** (س) **شَنْأً وشَنْأَةً وَشَنَاناً ومَشْنَأً ومَشْنَأَةً**: بغض رکھنا، دشمنی کرنا، نفرت کرنا، **الابتر** کٹا ہوا، دم کٹا، چھوٹا یا زہریلا سانپ، وہ شخص جس کی اولاد نہ ہو جس کا ذکر باقی نہ رہے **بتر بترأ** (ن) کاٹنا **بتر بترأ** (س) کٹ جانا۔

ترکیب:

اِنَّا حرف مشبہ بہ فعل معہ اسم اَعْطَیْنَا فعل بافاعل کَ مفعول اول الکوثر مفعول ثانی۔ جملہ فعلیہ خبر اِنَّ ، اِنَّ اپنے اسم وخبر سے ملکر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔ ف تعریفیہ صَلِّ فعل بافاعل لِرَبِّکَ متعلق جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَانْحَرْ فعل بافاعل جملہ فعلیہ معطوف۔ اِنَّ اپنے اسم شَانِئَکَ (مرکب اضافی) اور خبر اَلْاَبْتَر سے ملکر جملہ اسمیہ۔ اور ھُوَ ضمیر فصل ہے جو مفید تخصیص ہے۔ اور اس کا کوئی محل اعراب نہیں یا ھو مبتدا اور الابتر خبر جملہ اسمیہ ہوکر خبر ان۔

تفسیر:

اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَر ...... (بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا کی) کوثر کے لغوی معنی تو اوپر معلوم ہو چکے، لیکن اس کا مصداق یہاں کیا ہے؟ اس سلسلے میں روایات وآثار اور اقوال بہت ہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں پندرہ اقوال کو خوب شرح وبسط سے ذکر کیا ہے صاحب روح المعانی نے سولہ سترہ اقوال ذکر کرکے فرمایا ہے **وفی التحریر ستة وعشرون قولاً فیه**۔ ذیل میں ہم بطور خلاصہ ان میں سے قابل ذکر اقوال کو ذکر کرتے ہیں۔

کوثر کیا ہے؟

(۱) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ کوثر وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد سعید بن جبیر سے کسی نے کہا کہ بعض کہتے ہیں کہ کوثر جنت کی ایک نہر ہے تو فرمایا کہ ابن عباس کا قول اس کے منافی نہیں ہے بلکہ وہ نہر جنت جس کا نام کوثر ہے وہ بھی اس خیر کثیر میں داخل ہے امام تفسیر مجاہد نے بھی کوثر کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ دارین کی خیر کثیر ہے اور اس میں جنت کی خاص نہر کوثر بھی داخل ہے۔ (۲) کوثر جنت کی وہ نہر ہے جو آپ کو شب معراج میں دکھائی گئی تھی جسکے کنارے موتیوں کے خیمے ہیں اور اس کا پانی مشک کی طرح خوشبودار ہے آپ نے جبریل سے پوچھا یہ کیا ہے؟ جواب دیا کہ یہ وہی کوثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی۔ (بخاری ومسلم) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے کہ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے بڑھ کر شیریں ہے۔ اس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! پھر تو وہ بڑے لطیف ہوں گے ارشاد فرمایا اے عمر! ان کا کھانا ان سے زیادہ لطیف ہے۔ (احمد وترمذی)

حضرت حمزہؓ کی بیوی نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کو جنت میں ایک نہر دی گئی ہے جس کو کوثر کہتے ہیں فرمایا ہاں اور اسکی زمین موتی مونگوں اور زبرجد اور یاقوت کی ہے وہ اتنی بڑی ہے جتنی ایلا سے صنعاء تک کی مسافت ہے اس کے کوزے ستاروں کی تعداد کے موافق ہیں (طبرانی) طبرانی کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ کوثر جنت میں بڑے پھاٹ کی نہر ہے جس کے برتن سونے چاندی کے ہیں ان کی تعداد کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ابن عمرؓ کی روایت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سونے کے ہیں اور پانی موتیوں (کی زمین) پر بہتا ہے (احمد، ترمذی، ابن ماجہ) حضرت عائشہ سے آیت مذکورہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کوثر جنت میں ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عطا فرمائی۔

(۳) وہ حوض کوثر ہے جو محشر میں ہوگی (پل صراط سے پہلے) بعض کہتے ہیں کہ دو حوضیں ہوں گی ایک محشر میں ایک پل صراط کے بعد۔ اور دونوں کا نام کوثر ہوگا بعض کہتے ہیں کہ دراصل نہر جنت ہی کوثر ہے محشر وغیرہ میں وہیں سے لائی جائے گی۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کتابوں میں یہ دیکھا ہے کہ کوثر ایک حوض ہوگا جو ایک عظیم فرشتہ کی کمر پر ہوگا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے وہ آپ کے ساتھ ہوگا۔ **ولا یعجز اللہ تعالیٰ شیء.**

بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ۔ ایک دن جبکہ مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے اچانک آپ پر ایک قسم کی نیند یا بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی، پھر ہنستے ہوئے آپ نے سر مبارک اٹھایا، ہم نے پوچھا یا رسول اللہ آپکے ہنسنے کا سبب کیا ہے؟ فرمایا مجھ پر اسی وقت ایک سورت نازل ہوئی ہے پھر آپ نے بسم اللہ اور سورئی کوثر پڑھی اور فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ کوثر کیا ہے۔ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی کو معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ جس میں خیر کثیر ہے۔ اور وہ حوض ہے جس پر میری امت قیامت کے دن پانی پینے کے لئے آئیگی۔ اسکے پانی پینے کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے۔ اس وقت بعض لوگوں کو فرشتے حوض سے ہٹا دیں گے تو میں کہونگا کہ میرے پروردگار یہ تو میرے امتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپکے بعد کیا نئی نئی باتیں پیدا کیں تھیں۔ ابن کثیرؒ نے اس کے بعد مزید لکھا ہے کہ: حوض کی صفت میں روایات حدیث میں آیا ہے کہ اس میں دو پرنالے آسمان سے گریں گے جو نہر کوثر کے پانی سے حوض کو بھر دینگے اس کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے (یعنی بیشمار ہوں گے)۔

اس حدیث سے سورۂ کوثر کا سببِ نزول بھی معلوم ہوا (کمامر) لفظ کوثر کی صحیح تفسیر بھی یعنی خیر کثیر اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس خیر کثیر میں وہ حوضِ کوثر بھی شامل ہے جو روزِ قیامت امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیراب کریگی۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اصل نہر کوثر جنت میں ہے۔ اور یہ حوض کوثر میدان حشر میں ہوگی۔ اس میں دو پرنالوں کے ذریعہ نہر کوثر کا پانی ڈالا جائیگا۔ اس سے ان تمام روایات میں تطبیق ہوگئی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حوضِ کوثر محشر میں ہے یا بعد الصراط ہے یا جنت میں اور امت کا ورود اس پر جنت سے پہلے ہوگا یا جنت میں، اور روایت مذکورہ میں جو بعض لوگوں کو حوض سے ہٹا دینے کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہوں گے جو دین سے پھر گئے یا جنہوں نے بدعات گھڑ کر دین میں داخل کر کے دین کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ احادیث صحیحہ میں حوض کوثر کے پانی کی صفائی، شیرینی، اسکے کناروں کا سونے جواہرات وغیرہ سے مرصع ہونا یہ ایسے اوصاف ہیں کہ ان کو دنیا میں کسی چیز پر قیاس نہیں کر سکتے۔

تنبیہ:

یہ بھی یاد رکھئے کہ حوض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے نہیں ہے۔ بلکہ ہر نبی کا حوض ہوگا، جیسا کہ ترمذی وغیرہ کتب حدیث میں مذکور ہے۔ لیکن ان تمام حوضوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ کیونکہ ان کا ثبوت احادیث متواترہ یا مشہورہ سے نہیں۔ بلکہ وہ سب احاد ہیں۔ **بل قیل لاتکاد تبلغ الصحة.** ہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کوثر پر ایمان لانا ضروری ہے **لکون احادیثه بلغت مبلغ التواتر عند ناخلافاً للمعتزلة المنکرین لذلک** صاحب مظہریؒ فرماتے ہیں کہ حوض کوثر کے متعلق روایات نقل کرنے والے صحابہؓ کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ جن میں ❁ حضرت ابوبکرؓ ❁ حضرت عمرؓ ❁ عثمانؓ ❁ حضرت علیؓ ❁ حضرت مسعودؓ ❁ حضرت ابن عباسؓ ❁ حضرت

حسن بن علیؓ ﴿حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب﴾ ﴿حضرت عائشہ صدیقہؓ﴾ ﴿حضرت ام سلمہؓ﴾ ﴿حضرت ابو ہریرہؓ﴾ ﴿حضرت ابی بن کعب عبدالرحمن بن عوف﴾ ﴿حضرت جابر بن عبداللہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین﴾ بھی ہیں۔

علامہ سیوطیؒ نے بدورسافرہ میں تقریباً ۱۷۰ احادیث ترتیب وار نام بنام صحابہؓ کی نقل کی ہیں۔(۴) کوثر سے اولاد کی کثرت مراد ہے۔اس لئے کہ یہ سورت انہیں لوگوں کی تردید میں اتری ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتر (مقطوع النسل) کہا تھا،اولاد دو قسم کی ہے،جسمانی،روحانی،آپ کی جسمانی نسل بھی بکثرت ہے۔اور روحانی نسل تو ساری امت ہے۔ جو تمام امتوں سے زائد ہے۔(۵) ابوبکر بن عیاش و یمان بن وثابؒ کہتے ہیں کہ آپ کے اصحاب واشیاع (پیروکار) تاقیامت مراد ہیں۔یہ قول رابع کی دوسری تعبیر ہے۔(۶) آپ کی امت کے علماء اولیاء ہیں۔امتِ محمد یہ میں جس قدر اہل کمال علماء واولیاء گزرے ہیں۔اور اب بھی موجود ہیں۔اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔وہ کسی امت کو نصیب نہیں ہوئے۔(۷) کوثر کا مصداق نبوت عظمیٰ ہے جو اعلیٰ درجہ کی خیر کثیر ہے۔یہ آپ کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

(۸) حسنؒ کہتے ہیں کہ کوثر قرآن مقدس ہے جس کے فضائل وبرکات بیشمار ہیں۔(۹) دین اسلام ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دارین کی حسنات وبرکات دامن اسلام ہی سے وابستہ ہیں۔(۱۰) وہ فضائلِ روحانیہ کوثر ہیں جو آپ کو منجانب اللہ حاصل ہوئے۔(۱۱) جعفر صادق فرماتے ہیں۔آپ کے قلبِ منور کا نور کوثر ہے۔(۱۲) کوثر سے مراد رفعت ذکر ہے۔کہ ہر جگہ آپ کا نام تعظیم سے لیا جاتا ہے۔اور ہر وقت دنیا میں آپ کا ذکر ہوتا ہے۔(۱۳) آپ کے وہ علوم ہیں جن کے متعلق آپ نے فرمایا اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ. (۱۴) آپ کا خلق عظیم ہے۔(۱۵) کوثر مقام محمود ہے جو آپ کا مخصوص مرتبہ ہے جس پر آپ قیامت کے دن تشریف فرما ہوں گے۔(۱۶) بلال کہتے ہیں کہ کوثر سے مراد دولتِ توحید ہے ۔جو آپ کی عطا فرمائی گئی۔(۱۷) ایثار کی صفت ہے جو آپ کو سب سے زائد ملی۔(۱۸) وہ فضائل وکمالات کثیرہ ہیں جن سے آپ متصف تھے۔(۱۹) کوثر یہ سورت مبارکہ ہے۔جو الفاظ میں سب سے کم صرف تین آیات پر مشتمل ہے۔مگر بیشمار مطالب ومضامین کو حاوی ہے۔جس کا مقابلہ عرب کے کسی بلیغ وشاعر سے نہ ہوسکا۔مشہور ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کے فصحاء وبلغاء اپنے اس کلام کو جوانکے نزدیک بے مثل ہوتا تھا لکھ کر بطور تفاخر کعبۃ اللہ کے پردے پر لگا دیتے تھے۔جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس کلام سے سب شعراء حیران رہ گئے۔اور سب نے کعبۃ اللہ سے اپنے اپنے کلام اتار لئے۔پھر کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ کعبۃ اللہ پر اپنا کلام آویزاں کرے ایک استاذ الشعراء کے سامنے جب یہ کلام پیش کیا گیا تو اس نے اس کو دیکھ کر اس کے آخر میں لکھ دیا واللہ ماھذا من کلام البشر. (۲۰) کوثر سے مراد وہ اعلیٰ مقام قرب ہے جس سے اوپر کوئی مقام کسی بندہ کے لئے ممکن نہیں۔اور اصل بات یہ ہے کہ سب ہی اقوال خیر کثیر کی تفسیرات وتفصیلات ہیں۔**وما صح من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی تفسیر الکوثر بالنھر وغیرہ فمن باب التمثیل والتخصیص لنکتۃ والافماصح من الحدیث فھو التفسیر المتعین لایجوز العدول منہ الی تفسیر اٰخر. فافھم**

فوائد:

(۱) اِنَّا شروع میں لایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ یہ عطا سب سے بڑے معطی کی ہے۔اور ہر معطی اپنی شان کے مطابق عطاء کرتا ہے۔(۲) عاشق صادق کو جو فرحت ومسرت محبوب کی ذات سے ہوتی ہے،اس کے عطیات سے نہیں ہوتی،اس لئے اولاً اِنَّا فرما کر اپنی ذات کی طرف متوجہ کیا گیا۔پھر صفات کی طرف۔(۳) اَعْطَیْنَا فرمایا اٰتَیْنَا نہیں فرمایا گیا۔کیونکہ

ایتاء عام ہے کسی خدمت کے صلہ میں ہو یا مفت ہو۔ بخلاف اعطاء کے کہ وہ کرم ہی کرم ہوتا ہے۔ کسی خدمت کا معاوضہ اور صلہ نہیں ہوتا۔ تاکہ معلوم ہو کہ یہ جو کچھ عطا ہوا ہے وہ ہمارے فضل سے ہوا ہے۔ جس کا شکر واجب ہے۔(۴) ماضی کا صیغہ لایا گیا نہ کہ مضارع کا، تاکہ معلوم ہو کہ یہ صرف وعدہ ہی وعدہ نہیں بلکہ دیدیا گیا ہے پھر یقینی چیز کو ماضی سے تعبیر کر دینا محاورہ بھی ہے۔ گویا اس اکرم الاکرمین کا وعدہ دیدینا ہی ہے۔ لِاَنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد. (۵) خطاب میں لکَ لایا گیا کُم نہیں لایا گیا تاکہ یہ مفہوم ہو کہ یہ عطا صرف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے ہے اس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ اور جس کو اس عطا کی برکات نصیب ہوں گی وہ صرف آپ کے طفیل میں ہوں گی۔ بالاستقلال نہیں کیسی ہی کوئی عبادت وریاضت کرلے جب تک آپ کا دامن نہ پکڑے، اتباع نہ کرے محروم ہی رہے گا۔

نماز کو کوثر سے کمال مشابہت ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّکَ (صرف اپنے رب کے لئے نماز پڑھیں) کمال اخلاص کیساتھ کامل ترین عبادت کا حکم دیا گیا۔ جیسا انعام ویسا ہی اس کا شکر جس طرح کوثر (خیر کثیر) جامع ترین عطا ہے نماز بھی جامع ترین عبادت ہے پھر اس کو کوثر سے اس طرح بھی خاص مناسبت ہے کہ وہ اس میں اپنے خالق سے مناجات وعجز ونیاز شہد سے زیادہ شیریں ہے اور نمازی پر جو انوار غیبیہ نازل ہوتے ہیں وہ دودھ سے زیادہ سفید وروشن اور لذیذ تر ہوتے ہیں۔ اور قلب کو اس سے جو سُرور اور چین نصیب ہوتا ہے۔ وہ برف سے زیادہ سرد ہوتا ہے۔ قرۃ عینی فی الصَّلوٰۃ میں اسی حقیقت کا بیان ہے۔ اور نماز کے آداب وسنن ان سرسبز درختوں اور جواہر کی پٹریوں کے مشابہ ہیں جو حوض کرثر کے کناروں پر اردگرد ہیں۔ اور اذکار وتسبیحات جو نماز کے ارکان میں ہیں یہ اس کے روشن آبخوروں اور نورانی کوزوں کے مشابہ ہیں۔ یہ تو عطائے کوثر کا بدنی اور جانی لشکر ہے۔ شکر مالی کو آگے لفظ وَانْحَرْ سے بیان فرمایا ہے کہ آپ قربانی بھی کریں۔

وَانْحَرْ: نحر سے مشتق ہے۔ اونٹ کی قربانی کو نحر کہا جاتا ہے۔ جس کا مسنون طریقہ اس کا پاؤں باندھ کر حلقوم میں نیزہ یا چھری مار کر خون بہادینا ہے۔ اور گائے بکری وغیرہ کی قربانی کا طریقہ ذبح کرنا یعنی جانور کو لٹا کر اسکے حلقوم پر چھری پھیرنا ہے۔ عرب میں چونکہ قربانی اونٹ کی ہوتی تھی اس لئے قربانی کے لئے یہاں لفظ وَانْحَرْ استعمال کیا گیا۔ علاوہ ازیں لفظ نحر مطلق قربانی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سورت کی پہلی آیت میں کفار کے زعم باطل کی تردید کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر یعنی دنیا وآخرت کی ہر خیر اور وہ بھی کثیر مقدار میں عطا فرمانے کی خوشخبری دی گئی۔ پھر اس عطا کے شکر کے لئے دو چیزوں کی ہدایت کی گئی۔ ایک نماز دوسرے قربانی۔ جس طرح نماز بدنی عبادتوں میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح قربانی بھی مالی عبادتوں میں اس بنا پر خاص امتیاز واہمیت رکھتی ہے کہ اللہ کے نام پر قربانی کرنا بت پرستی کے شعار کے خلاف جہاد بھی ہے۔ کیونکہ کفار کی قربانیاں بتوں کے نام پر ہوتی تھیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں ایک اور آیت میں بھی نماز کے ساتھ قربانی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ﴾ ......

(ف ۱) جمہور کے نزدیک یہاں نحر سے مراد قربانی کرنا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، عطاؒ، مجاہدؒ، حسن بصریؒ وغیرہ سے مستند روایات سے یہ بات ثابت ہے۔ بعض لوگوں نے وَانْحَرْ کے معنی نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے بعض ائمہ تفسیر کی طرف منسوب کئے ہیں۔ اس کے متعلق حافظ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہ روایت منکر (ناقابل اعتبار) ہے۔ پھر قربانی بھی عام ہے حج میں ہو یا عیدالاضحیٰ کے دن ہو یا عقیقہ میں ہو جس طرح صَلِّ میں مطلق نماز کا حکم فرض ہو یا نفل کیونکہ مکہ میں نماز بھی

فرض ہوچکی۔آپ نوافل بھی بکثرت پڑھتے تھے۔اور قربانی بھی عہدِ ابراہیمی سے چلی آرہی تھی، گوکفار نے ابراہیمی طریقہ میں تحریف کردی تھی کہ قربانی بتوں کے نام پر کرتے تھے۔جس طرح نماز میں تالیاں بجاتے اور کودتے تھے پھاندتے تھے اس طرح آیت میں دونوں قسم کی عبادتوں کی اصلاح بھی فرمادی گئی۔

(ف۲) بعض علماء نے وَانحر کو بھی نماز کے افعال ہی میں داخل کیا ہے۔پھر اس میں بھی متعدد اقوال ہیں: (۱) تکبیر اولیٰ کے وقت سینہ تک ہاتھ اٹھانا مراد ہے۔(۲) ہر تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھانا۔(۳) دُعا کے وقت سینہ تک ہاتھ اٹھانا۔ (۴) جلسہ استراحت کرنا کہ سینہ سیدھا ہوجائے۔مگر جمہورؒ کا مسلک روایات سے مؤید ہے۔نیز جمہورؒ کے مسلک پر آیت کے دونوں جملوں سے دو حکم ثابت ہوتے ہیں والتاسیسُ خیر من التاکید.

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ یہ معلوم ہوچکا کہ یہ آیت ان کفار کے بارے میں نازل ہوئی جو آپ کو مقطوع النسال ہونیکا طعنہ دیتے تھے الحمدللہ یہ پیشنگوئی پوری ہوئی کہ آپ کے دشمن سب بے نشان ہوئے۔اور آپ کی جسمانی وروحانی نسل سے پوری دنیا آباد ہے۔اور پورے عالم میں آپ کا شہرہ، ذکر اور چرچا ہروقت ہورہا ہے۔اور آخرت میں شفاعت کبریٰ ومقام محمود وغیرہ کے مراتب آپ ہی کے لئے ہیں۔اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ کی اتباع وپیروی اور آپ سے تعلق ووابستگی ہی سے دارین کی سعادت میسر آسکتی ہے۔جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض وعناد اور دشمنی ومخالفت رکھے گا وہ محروم وبے نام ونشان ہوجائے گا۔

تم تفسیر سُورۃُ الکوثر فالحمدُ للہ واللہ اکبر والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ الانور وعلیٰ الہٖ وصحبہٖ الیٰ یوم الْمَحْشر

سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ

سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ سِتُّ ایٰاتٍ

(رکوع ۱۔ ایات ۶ سورۂ کافرون مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں چھ آیات ہیں۔ کلمات ۲۶۔حروف ۹۴)

اس سورت کا نام سورۂ عبادۃ، سورۂ اخلاص او سورۂ مقشقشہ (براۃ) بھی ہے۔وجہ تسمیہ ظاہر ہے جمہور علماء کے نزدیک یہ سورت بھی مکیہ ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حسنؒ اور عکرمہ کا بھی یہی قول ہے۔قتادہؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔دوانی کہتے ہیں کہ یہ سورت بالاتفاق مکیہ ہے۔مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ حضرت ابن زبیر ضحاکؒ اور قتادہؒ سے مروی ہے کہ یہ سورت مدنیہ ہے۔

ربط ومناسبت:

سورۂ کوثر میں آپ کو دارین میں کامیابی کی بشارت دی گئی۔جس میں اتباع کی کثرت، شوکت وعظمت وغیرہ بھی داخل ہیں۔پھر نماز اور قربانی کے اعمال سے آپ کے قلب کو مزید مضبوط فرمادیا گیا۔اور اس سورۂ کافرون میں تمام دنیا کے

بُت پرستوں اور اہل باطل کے سامنے کھلے الفاظ میں اعلان عام کرایا گیا کہ تم کافر ہو، میں تمہارے طریق سے بیزار و بری ہوں۔ تمہارے معبودوں کی جس طرح عبادت نہیں کرتا ہوں آئندہ بھی نہیں کر سکتا۔ جس طرح تم میرے اللہ کی عبادت اخلاص کے ساتھ نہیں کر سکتے۔

شانِ نزول:

ابن اسحٰق کی روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن عبدالمطلب اور اُمیہ ابن خلف (بعض روایات میں ابوجہل اور اسود بن عبدیغوث کے نام بھی ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا (بعض روایات میں ہے کہ حضرت عباسؓ کی معرفت کہلا کر بھیجا) کہ آیئے ہم آپس میں اس پر صلح کر لیں کہ ایک سال آپ ہمارے بُتوں کی عبادت کیا کریں، اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں (قرطبی) اور ابن عباسؓ سے طبرانی کی روایت میں ہے کہ کفارِ مکہ نے اول تو باہمی مصالحت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ صورت پیش کی کہ ہم آپ کو اتنا مال دیتے ہیں کہ آپ مکہ میں سب سے زیادہ مالدار ہو جائیں۔ اور جس عورت سے آپ چاہیں اس سے ہم آپ کا نکاح کرا دیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہا کریں، اور اگر آپ یہ نہیں مانتے تو پھر ایسا کر لیں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کیا کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کیا کریں۔ (مظہری)

اور ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ کی روایت حضرت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے باہمی مصالحت کے لئے یہ صورت پیش کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں میں سے بعض کو صرف ہاتھ لگا دیں تو ہم آپ کی تصدیق کرنے لگیں گے۔ اس پر جبرئیل علیہ السلام سورۂ کافرون لیکر نازل ہوئے جس میں کفار کے اعمال سے براءت اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم ہے شانِ نزول کے جو متعدد واقعات بیان ہوئے ان میں کوئی تضاد نہیں، ممکن ہے کہ یہ سب واقعات پیش آئے ہوں۔ اور سب کے جواب میں اس سورت کا نزول ہوا ہو جس کا حاصل ایسی مصالحت سے روکنا ہے۔

سورت کے فضائل وخواص:

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھی ہیں وہ دونوں سورتیں جو فجر کی سنتوں میں پڑھی جاتی ہیں سورۂ کافرون، اور سورۂ اخلاص (مظہری) تفسیر ابن کثیر میں متعدد صحابہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح کی سنتوں میں اور مغرب کے بعد والی سنتوں میں بکثرت یہ دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے امام احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، ابن حبانؒ، وغیرہ نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ میں نے پچیس ۲۵ بار اور بعض روایات میں ہے کہ ایک ماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دونوں سورتیں فجر کی اور بعد مغرب کی سُنتوں میں پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ (روح المعانی)

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! ہمیں کوئی دُعا بتا دیجئے جو ہم سونے سے پہلے پڑھا کریں۔ تو آپ نے قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ یہ شرک سے براءت ہے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب سفر میں جاؤ تو تم سب ساتھیوں سے زیادہ خوشحال و بامراد ہو۔ اور تمہارا سامان زیادہ ہو جائے۔ عرض کیا یارسول اللہ! بیشک میں ایسا چاہتا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ آخر قرآن کی پانچ سورتیں قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ، اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ، قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ

الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھا کرو، اور ہر سورت کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرو اور بسم اللہ الرحمن الرحیم پر ختم کرو۔ حضرت جبیر کا بیان ہے کہ میں تھا تو دولت مند اور بڑا مالدار لیکن سفر میں میری حالت فرسودہ ہو جاتی تھی اور زادراہ بہت کم ہو جاتا تھا۔ لیکن جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان سورتوں کی تعلیم دی اور میں نے اس تعلیم پر عمل کیا تو میرا حال سب سے اچھا اور زادراہ سب سے زیادہ رہنے لگا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے کاٹ لیا تو آپ نے نمک اور پانی منگایا (نمکین پانی سے دھارتے) اور قل یآیہا الکفرون، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے رہے اور ہاتھ پھیرتے رہے، (مظہری) ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو ایسا کلمہ نہ بتاؤں جو تم کو شرک سے نجات دیدے؟ سوتے وقت قل یآیہا الکفرون پڑھا کرو، حضرت عبداللہ بن جراد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ منافق چاشت کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اور قل یآیہا الکفرون نہیں پڑھتا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ یہ سورت چوتھائی قرآن کے برابر (اجر رکھتی) ہے۔ وجہ اس قول کی یہ ہے کہ قرآن مامورات و محرمات پر مشتمل ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں (۱) جن کا تعلق قلب سے ہو۔ (۲) جن کا تعلق جوارح سے ہو اس طرح چار اقسام پر قرآن مشتمل ہوا، اور یہ سورت محرمات قلبیہ سے نہی پر یعنی اقسام اربعہ میں سے ایک قسم پر مشتمل ہے۔ اور اس سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ قرآن کے مقصود مضامین چار قسم کے ہیں احکام شرعیہ احوال معاد، امر بعبادۃ اللہ، نہی عن عبادۃ غیر اللہ اس سورت میں چوتھی قسم کا مضمون بیان ہوا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی توجیہات بیان کی گئی ہیں۔ لیکن سب تکلفات ہیں۔ حدیث میں جو مضمون ہے وہ درست ہے۔ واللہ اعلم بحقیقتها۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱) لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۲) وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ (۳)

آپ کہہ دیجئے اے کافرو! میں تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کرتا ہوں۔ اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرتے ہو۔

اَعْبُدُ	مَا	عٰبِدُوْنَ	اَنْتُمْ	لَا	وَ	تَعْبُدُوْنَ	مَا	اَعْبُدُ	لَا	الْكٰفِرُوْنَ	يٰۤاَيُّهَا	قُلْ
عبادت کرتا ہوں	اس چیز	عبادت کرنیوالے	تم	نہیں	اور	عبادت کرتے ہو تم	اس چیز	عبادت کرتا میں	نہیں	کافرو	اے	کہہ

وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۴) وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ (۵)

اور نہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا۔ اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرو گے۔

اَعْبُدُ	مَاۤ	اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ	لَاۤ	وَ	عَبَدْتُّمْ	مَّا	عَابِدٌ	اَنَا	لَا	وَ
عبادت کرنیوالا ہوں میں	اس چیز	تم عبادت کرنیوالے	نہیں	اور	عبادت کرتے ہو تم	اس چیز	عبادت کرنیوالا	میں	نہیں	اور

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۶)

تم کو اپنا دین پسند ہے اور مجھ کو اپنا دین پسند ہے۔

دِيْنِ	وَلِيَ	دِيْنُكُمْ	لَكُمْ
دین میرا	اور واسطے میرے	دین تمہارا	واسطے تمہارے

ترکیب:

قُلْ فعل بافاعل یاحرف ندا قائم مقام اُدْعُوْا فعل بافاعل، کے اَیُّ مفرد معرفہ موصوف ھَا تنبیہ کے لئے مضاف الیہ کے عوض میں اَلْکٰفِرُوْنَ صفت، ای موصوف اپنی صفت سے ملکر اُدْعُوْ کا مفعول بہ جملہ فعلیہ ندا، لَآ اَعْبُدُ فعل بافاعل مَا موصولہ اپنے صلہ تَعْبُدُوْنَ جملہ فعلیہ سے ملکر مفعول بہ، جملہ فعلیہ معطوف علیہ، وَلَآ اَنْتُمْ مبتدا عٰبِدُوْنَ صیغہ جمع مذکر اسم فاعل مَآ اَعْبُدُ اسم موصول وصلہ مفعول بہ مشابہ جملہ، ہوکر خبر، مبتدا خبر جملہ اسمیہ، اگلے جملوں کی ترکیب بھی اسی طرح ہے۔ لَکُمْ محذوف سے تعلق ہوکر خبر مقدم۔ دِیْنُکُمْ مبتدا، خبر جملہ اسمیہ وقدم الخبر للتخصیص. وَلِیَ دِیْنِ کی ترکیب بھی اسی طرح ہے۔

تفسیر:

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ یہ خطاب خاص طور پر کفار کی اس جماعت کو ہے جو صلح کے خواستگار تھے۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی ایمان نہ لائیگا۔ اور عموم خطاب بھی ممکن ہے۔ ای مَادُمْتُمْ کَافِرِیْن.

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ . اس سورت میں یہ چند کلمات مکرر آئے ہیں۔ اور تکرار محض کلام میں اچھا نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کلمات کی تفسیر مفسرین نے مختلف کی ہے۔ (۱) ان کلمات کی ایک تفسیر تو وہ ہے جس کو امام بخاریؒ نے بہت سے مفسرین سے نقل کیا ہے۔ مولانا تھانویؒ نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور اسی کو سامنے رکھ کر ان آیات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ کلمات پہلی بار آیت ۲ و ۳ میں زمانہ حال کے لئے ہیں۔ اور دوسری بار آیت ۴ و ۵ میں زمانہ مستقبل کے لئے ہیں۔ اس لئے تکرار نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو فی الحال ایسا ہے کہ میں تمہارے معبودانِ باطل کی عبادت کروں اور تم میرے معبودِ برحق کی عبادت کرو، اور نہ آئندہ ایسا ہوسکتا ہے کہ میں اپنی توحید پر اور تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے کے معبود کی عبادت کریں، مگر امام بخاریؒ کی تفسیر میں لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی تفسیر دین بمعنی مذہب اسلام وکفر سے کی ہے اور مطلب یہ قرار دیا ہے کہ مصالحت کی مجوزہ صورت ناقابل قبول نہیں۔ میں تو اپنے مذہب برحق پر قائم ہوں اور رہوں گا تم بھی اپنے دین باطل پر مصر ہو تو تم جانو اس کا انجام خود تم کو بھگتنا پڑیگا۔ اور بیان القرآن میں دین کو بمعنی جزاء قرار دیا ہے اس لئے ان کے نزدیک اس آیت کے معنی وہ ہیں جو ﴿لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ﴾ کے ہیں، یعنی تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرے اعمال کا۔

(۲) ان آیات کی دوسری تفسیر وہ ہے جس کو ابن کثیرؒ نے اختیار فرمایا ہے کہ حرف مَا لغتِ عرب میں جس طرح بمعنی الَّذِی آتا ہے اسی طرح مصدری معنی میں بھی آتا ہے کہ وہ فعل پر داخل ہوکر اس کو مصدری معنی میں کردیتا ہے اس سورت میں آیت ۲ و ۳ میں تو حرف ما موصولہ (بمعنی الذی) ہے اور معنی یہ ہیں کہ جن معبودانِ باطل کی تم پرستش کرتے ہو میں ان کی پرستش نہیں کرتا۔ اور جس معبودِ برحق کی عبادت کرتا ہوں اس کی تم نہیں کرتے۔ اور آیت ۴ و ۵ میں حرف مصدریہ ہے۔ اور آیتوں کے معنی یہ ہیں کہ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ عِبَادَتِکُمْ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ عِبَادَتِیْ ہماری تمہاری عبادتوں کے طریقے مختلف ہیں، میں تمہارے طرز کی عبادت نہیں کرسکتا، اور تم (جب تک کفر میں ہو) میرے طرز کی عبادت نہیں کرسکتے۔ اس تفسیر میں

آیت ۲و۳ میں معبودوں کا اختلاف بتایا گیا۔اور آیت ۴و۵ میں عبادت کے طرز وطریق کا اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔حاصل یہ ہوا کہ نہ ہمارے تمہارے معبودوں میں اشتراک ہے نہ طرزِ عبادت میں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنوں کا طریق عبادت تعلیم خداوندی کے موافق ہے۔اور کفار کا طریقہ عبادت خود ساختہ ہے اس طرح بھی تکرار کا اعتراض رفع ہوجاتا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس تفسیر کو راجح قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور طریقہ عبادت وہی معتبر ہوگا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔

اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا دوسری جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہے ﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ﴾ مطلب یہ ہے کہ لفظ دین کو ابن کثیرؒ نے بھی اعمال دین کے معنی میں لیا ہے۔اور اس کا مقصود وہی ہوا جو بیان القرآن میں بیان کیا گیا۔کہ ہر ایک کو اپنے اچھے بُرے عمل کی جزاؤسزا بھگتنی پڑے گی۔

(۳) بعض مفسرین نے ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی ہے کہ لفظ ما دونوں جگہ موصولہ ہی ہے۔اور حال واستقبال کا بھی فرق نہیں بلکہ یہ تکرار مفید ہے جیسا کہ ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ میں ہے یہاں اس تکرار کا فائدہ تاکید ہے۔جو تقاضائے بلاغت ہے پھر کفار کی طرف سے مصالحت کی پیش کش متعدد مرتبہ ہوئی تھی تو مکرر تردید بھی برمحل اور ضروری ہے۔قتیبیؒ نے کہا کہ اشتراک وقت کی تکرار کی وجہ سے رد میں تکرار ہے۔وضاحت اس کی یہ ہے کہ مشرکین نے یہ کہا تھا کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت میں آپکے ساتھ شریک ہوجائیں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت میں ہمارے ساتھ شریک ہوجائیں۔تو ہر شرکت کی تردید ایکبار کی گئی۔اس طرح یہ تکرار برمحل اور تقاضائے بلاغت ہے۔واللہ اعلم۔

کفار سے صلح کی بعض صورتیں جائز اور بعض ناجائز ہیں:

سورۂ کافرون میں کفار کی طرف سے پیش کی ہوئی چند صورتوں کو بالکل رد کر کے براءت کا اعلان کر دیا گیا۔مگر قرآن کریم ہی میں دوسری جگہ یہ ارشاد بھی ہے ﴿فَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ (کفار اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی صلح کی طرف مائل ہوجایئے) یعنی معاہدہ صلح کر لیجئے چنانچہ آپ نے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود سے معاہدۂ صلح کیا۔حدیبیہ میں آپ نے معاہدہ صلح کیا۔اس لئے بعض علماء نے سورۂ کافرون کو منسوخ مانا ہے۔اور منسوخ ماننے کی بڑی وجہ آخری آیت لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کو قرار دیا ہے۔کیونکہ یہ آیت بظاہر احکام جہاد کے خلاف ہے۔تو گویا اس کا نسخ آیاتِ جہاد سے ہوا۔لیکن یہ خیال غلط ہے۔اول تو وجہ یہ ہے کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ دو جملے خبریہ ہیں اور اصول ہے کہ خبر میں نسخ جاری نہیں ہوتا ورنہ قائل کا کذب لازم آئیگا۔حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں بلکہ پوری سورت میں نسخ کا اصلاً احتمال ہی نہیں دوسرے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ کفار کو کفر کی اجازت یا کفر پر برقرار رکھنے کی ضمانت دیدی گئی ہے۔بلکہ معلوم ہوچکا کہ اسکا حاصل وہی ہے جو لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ کا ہے۔جس کا حاصل یہ ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔اور یا مطلب یہ ہے کہ ہماری تمہاری عبادت میں اشتراک اسلئے نہیں ہوسکتا کہ تمکو اپنا دین اور طریقہ

عبادت پسند ہے۔ اور مجھ کو اپنا دین اور طریقہ عبادت پسند ہے۔ اور جب ایک دوسرے کا مذہب ایک دوسرے کو پسند نہیں تو شرکت کیسی؟ گویہ آیت پچھلے مضمون (عدم اشتراک) کی دلیل ہے اس لئے یہ صحیح مسلک جمہور علماء ہی کا ہے کہ یہ سورت منسوخ نہیں جس قسم کی مصالحت کافروں نے چاہی تھی۔ اور اسکی تردید اس سورت میں ہوئی ہے۔ وہ مصالحت جیسے اس وقت حرام وممنوع تھی آج بھی وہ حرام ہے۔ اور جس مصالحت کی اجازت وَاِنْ جَنَحُوْا...... وغیرہ آیات سے معلوم ہوئی۔ اور جو صلح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود یا مشرکین سے کی وہ جس طرح اس وقت جائز تھی آج بھی جائز ہے۔ بات یہ ہے کہ صلح نہ تو ہر موقع پر مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ہر موقع پر نا جائز ہے۔ بلکہ صلح کے کچھ اصول وضوابط اور شرائط ہیں اسی طرح ہیں، اسی طرح موقع ومحل بھی ہوتا ہے ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح کا ایک جامع اصول بیان فرمادیا کہ ہم کو ہر صلح تسلیم ہے۔ اور ہر شرط ماننے کو ہم تیار ہیں اِلَّا صُلْحاً اَحَلَّ حَرَاماً اَوْحَرَّمَ حَلَالاً مگر وہ صلح ہمیں ہر گز تسلیم نہیں جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر صلح کی جاسکتی ہے مگر وہ صلح جائز نہیں جس میں شریعت اسلامیہ کے کسی اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ یا جس میں کوئی شرعی اصول پائمال ہوتا ہو وہ صلح ہرگز جائز نہیں۔

اب غور کیجئے کہ کفارِ مکہ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں ان سب میں کم ازکم کفر واسلام میں التباس واشتباہ یقینی تھا اور بعض صورتوں میں تو اصولِ اسلام کے خلاف شرک کا ارتکاب لازم آتا تھا۔ ایسی صلح سے سورۂ کافرون کے ذریعہ اعلانِ براءت کیا گیا ہے جو قیامت تک کے لئے غیر منسوخ ہے۔ پرستارانِ توحید قیامت تک نہ کفر کی تائید پر راضی ہو سکتے ہیں نہ معبودانِ باطل کی پرستش کر سکتے ہیں۔ اور جن نصوص میں صلح کو جائز قرار دیا۔ یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے یا مشرکین سے جو صلح کی ان میں کوئی ایسی صورت نہیں جس سے اصولِ اسلام کی خلاف ورزی وپائمالی لازم آتی ہو۔ یا کفر واسلام کی حدود میں اشتباہ والتباس ہوتا ہو۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام سے زیادہ صلح جوئی، سلمیت، حسنِ سلوک، انسانی ہمدردی کی دعوت دنیا میں کسی مذہب نے نہیں دی۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صلح اپنی انسانی حقوق میں ہوتی ہے خدا کے قانون اور اصولِ دین کو بدل ڈالنے کا کسی کو حق نہیں۔ اس لئے ایسی صلح کی کسی وقت کوئی گنجائش نہیں جس میں اصولِ اسلام پر آنچ آتی ہو یا خدائی قانون میں ترمین لازم آتی ہو۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم۔

تم تفسیر سورۃ الکٰفِرون فالحمدللہ الذی له السموت والارضون وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ من اٰمن به الانبیآء والمسلمون وعلیٰ اٰله واصحابه الذین فازوا بالسعادة والهدایة والجنة کُلهم اجمعون ومن تبعهم الیٰ یوم القیامة فاُولٰئِکَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ

سُوْرَۃُ النَّصْرِ

سُوْرَۃُ النَّصْرِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ ثَلٰثُ اٰیاتٍ

(رکوع ۱ . ایات ۳. سورۂ نصر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں تین آیات ہیں کلمات ۱۷ . حروف ۷۷)

اس سورت کا نام سورۂ نصر اور سورۂ اذا جاءَ اور سورۂ الفتح ہے۔ وجہ تسمیہ ظاہر ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اس سورت کو سورۂ تودیع بھی کہتے ہیں۔ تودیع کے معنی کسی کو رخصت کرنے کے ہیں۔ اس سورت میں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات قریب ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لئے اس کو سورۃ التودیع بھی کہا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایات میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں مجھ کو میری موت کی خبر دی گئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بُلایا اور ان سے گفتگو کی۔ تو وہ روئیں پھر ہنسیں۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ تمہارے رونے کا اور پھر ہنسنے کا سبب کیا تھا؟ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو میری موت کی خبر دی گئی ہے تو میں روئی پھر یہ خبر دی کہ (اے فاطمہ) میرے اہل وعیال میں سب سے پہلے تم مجھ سے جاملوگی تو اس پر میں ہنسی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس سورت کے نزول سے اس بات کو خوب سمجھ گئے تھے۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل اس سورت کے نزول کے بعد ایسا ہوگیا تھا جیسا رخصت کرنے والے کا ہوتا ہے۔ (یعنی آپ وصیت ونصیحت اسی انداز کی کرتے تھے کہ آپ رخصت ہو رہے ہیں)۔

یہ سورت بالاتفاق مدنیہ ہے (اس مشہور اصطلاح کے موافق کہ بعد ہجرت جن سورتوں کا نزول ہوا وہ مدنیات ہیں ورنہ تو روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ میں اس سورت کا نزول ہوا جیسا کہ آئندہ روایات میں آتا ہے)

ربط ومناسبت:

سورۂ کوثر میں جس عظمت وشوکت اور کثرت ذریت واتباع کی بشارت وخوشخبری دی گئی تھی۔ اور اسی وعدہ کی قوتِ یقین پر سورۂ کافرون میں کفار سے بیزاری وبراءت کا اعلان کرایا گیا تھا۔ اس سورۂ نصر میں اسی وعدہ کے ایفاء اور بشارت کے ظہور وقوع کی خبر دی جارہی ہے نیز اس نہر کوثر ومزید خیر کثیر کے سفر کی تیاری کا حکم ہے جس کا سابق میں (سورۂ کوثر) میں وعدہ ہو چکا تھا، علاوہ ازیں جس ناسازگار اور صبر آزما ماحول میں کفار ومشرکین سے اظہار براءت وبیزاری کرایا گیا تھا وہ انسانی عقل سے وراء الوریٰ تھا کوئی بھی ایسے وقت میں سب سے ترک تعلق کو مصلحت خیال نہیں کر سکتا۔ لیکن سورۂ کافرون میں کھلے الفاظ میں اعلانِ براءت کرایا گیا۔ اس میں اشارہ تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام پورا ہوگا۔ اور دین بغیر کسی ظاہری سہارے کے مکمل ہوکر رہیگا، پھلے گا پھولے گا، اور پروان چڑھے گا۔ اس سورتِ نصر میں اسی تکمیل وکمالِ اشاعتِ دین کی خبر ہے۔

شانِ نزول:

معمرؒ نے بحوالہ زہریؒ بیان کیا کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں داخل ہوئے تو فتح سے پہلے خالد بن ولید کو کچھ مجاہدین کے ساتھ مکہ کے نشیبی حصہ پر مامور کر دیا۔ قریش کی کچھ جماعتوں سے ان کی معمولی جھڑپ ہوئی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان جماعتوں کو شکست دیدی۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتال بند کر دیا گیا۔ فتح مکہ ہو گیا اس کے بعد قریش دین اسلام میں داخل ہوئے اس پر یہ سورت نازل ہوئی (مظہری) اس سورت کا اصل شانِ نزول یہی ہے۔ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کام پر مامور کیا تھا اس کی تکمیل ہو گئی۔ تو اس سورت میں فرض منصبی کی تکمیل کی بشارت اور سفر آخرت کی پورے انہماک کے ساتھ تیاری کا حکم فرمایا گیا۔ حضرت عمر حضرت ابن عباس کو بدری صحابہؓ کے ساتھ اپنے قریب بٹھلاتے تھے۔ بعض حضرات کو اس کا احساس ہوا کہ یہ نوعمر بچہ ہے اس کو اکابر کے ساتھ کیوں بٹھلایا جاتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اہل مجلس سے فرمایا کہ اس سورت مبارکہ (اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ الخ) کا کیا مطلب ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ اس میں فتح مکہ کا ذکر ہے۔ جب یہ انعام ہمکو مل گیا تو اس کے شکریہ میں ہم کو تسبیح و توبہ کرنی چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباس سے فرمایا کہ آپ اس کا مطلب بیان کریں۔ فرمایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے جو ان حضرات نے بیان کیا۔ بلکہ اس سورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں بھی یہی سمجھتا ہوں تب تمام حضرات حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی فضیلت کے قائل ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کی علمی فوقیت نے ان کو آگے بڑھایا ہے۔ چنانچہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تھوڑے عرصہ پہلے نازل ہوئی ہے۔

قرآن پاک کی آخری سورت اور آخری آیت:

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ سورئہ نصر قرآن کی آخری سورت ہے مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی مکمل سورت نازل نہیں ہوئی۔ بعض آیات کا نزول جو اس کے بعد روایات میں ہے وہ اس کے منافی نہیں۔ جیسا کہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کی سب سے پہلی سورت اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ مکمل سورت سب سے پہلے یہی نازل ہوئی ہے۔ گو سورۂ اقرء و سورۂ مدثر کی چند آیات کا نزول سورۂ فاتحہ سے پہلے ہو چکا تھا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ سورت حجۃ الوادع کے موقع پر ایام تشریق کے درمیان مقام منیٰ میں نازل ہوئی۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین ماہ اور چند دن پہلے اس کا نزول ہوا۔) اس کے بعد آیت ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ﴾ نازل ہوئی۔ ان دونوں کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں صرف اسی روز رہے۔ (اسی ۸۰ روز کے بعد وفات ہوئی) ان دونوں کے بعد آیت کلالہ نازل ہوئی۔ جس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے صرف پچاس ۵۰ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد آیت ﴿لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡہِ﴾ نازل ہوئی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے صرف پینتیس ۳۵ روز باقی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد ﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ﴾ نازل ہوئی جس کے بعد عمر شریف کے صرف اکیس روز اور مقاتلؒ کی روایت کے موافق اس آیت کے نزول سے صرف سات روز بعد وفات ہو گئی۔

لیکن بظاہر یہ سورت فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ لفظ اِذَا جَآءَ سے یہی مفہوم ہوتا ہے روح المعانی میں بحر محیط سے اسی کے موافق نقل کیا ہے کہ اس سورت کا نزول غزوۂ خیبر سے واپسی کے وقت بیان کیا گیا ہے۔ اور فتح خیبر کا فتح مکہ سے مقدم ہونا معلوم ومعروف ہے (کیونکہ فتح خیبر ۷ھ اواخر محرم میں ہوئی اور فتح مکہ رمضان ۸ھ میں ہوئی ہے)

روح المعانی میں بسند عبد بن حمید حضرت قتادہؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کے نزول کے بعد دو سال دنیا میں تشریف فرما رہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کا نزول فتح مکہ سے قبل ہوا۔ اس لئے کہ فتح مکہ سے وفات تک کی مدت دو سال سے کم ہے۔ فتح مکہ رمضان ۸ھ میں ہوئی اور وفات ربیع الاول ۱۰ھ میں ہوئی۔ اور جن روایات میں اس کا نزول فتح مکہ یا حجۃ الوداع میں ہونا بیان کیا گیا ہے ان روایات کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ان موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے اس سورت شریفہ کی تلاوت فرمائی ہوگی جس سے بعض حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ اس کا نزول ابھی ہوا ہے۔ بہر حال اس میں اختلاف ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا یا بعد میں۔ والاول اولیٰ واظہر۔ واللہ اعلم۔

فضیلت:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (ثواب میں چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ ولم اظفر بوجہ ذلک۔ واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱) وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۲)

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ اورآپ لوگوں کو اسلام میں جوق جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں

اِذَا	جَآءَ	نَصْرُ	اللّٰهِ	وَ	الْفَتْحُ	وَ	رَاَيْتَ	النَّاسَ	يَدْخُلُوْنَ	فِيْ	دِيْنِ	اللّٰهِ	اَفْوَاجًا
جب	آئے	مدد	خدا	اور	فتح	اور	دیکھے تو	لوگوں	داخل ہوتے ہیں	میں	دین	اللہ	فوج فوج

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۳)

تو آپ اپنے رب کی تسبیح وحمد کیجئے اور اسی سے مغفرت کی دعا کیجئے بیشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

فَسَبِّحْ	بِحَمْدِ	رَبِّكَ	وَاسْتَغْفِرْهُ	اِنَّهٗ	كَانَ	تَوَّابًا
پس پاکی بیان کر	ساتھ تعریف	اپنے رب	اور بخشش مانگ اس	تحقیق وہ	ہے	پھر آنیوالا

ترکیب: اِذَا حرف شرط جَآءَ فعل نَصْرُ اللّٰهِ مرکب اضافی معطوف علیہ وَالْفَتْحُ معطوف، معطوفین فاعل، جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَ عاطفہ رَاَيْتَ فعل با فاعل النَّاسَ ذوالحال يَدْخُلُوْنَ فعل ضمیر فاعل فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ متعلق اَفْوَاجًا ضمیر فاعل سے حال، جملہ فعلیہ حال النَّاسَ ذوالحال اپنے حال سے ملکر مفعول بہ، جملہ فعلیہ ہوا۔ یہ ترکیب اس صورت میں ہوگی جبکہ رَءَيْتَ بمعنی اَبْصَرْتَ مانیں۔ اوراگر بمعنی عَلِمْتَ ہوتو جملہ يَدْخُلُوْنَ مفعول ثانی ہوگا۔ بہر دو صورت جملہ رَءَيْتَ ...... معطوف معطوفین ملکر شرط فَ جزائیہ سَبِّحْ فعل ضمیر فاعل ذوالحال بِحَمْدِ رَبِّكَ

مُتَلَبِّسًا کے متعلق ہوکر حال۔ جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَاسْتَغْفِرْهُ فعل فاعل مفعول بہ۔ جملہ فعلیہ معطوف معطوفین ملکر جزا جملہ شرطیہ جزائیہ ہوا۔ اِنَّ اپنے اسم هٗ اور خبر، كَانَ تَوَّابًا فعل اسم وخبر جملہ سے ملکر جملہ اسمیہ ماقبل کی علت ہوا۔

تفسیر:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ ...... نصر کے معنی ہیں تحصیلِ مطلوب میں اعانت کے اور فتح کے معنی تحصیل مطلوب کے۔ نصر فتح کا سبب ہوتی ہے۔ اس لئے فتح کو نصر کے بعد بطور عطف بیان کیا گیا۔ پھر اعانت عام ہے۔ کبھی وہ اسباب ظاہری پیدا کر دینے سے ہوتی ہے۔ جیسے دشمنوں پر فتح پانے کے لئے جنود واعوان وانصار کا مہیا کر دینا اور ان کی ضروریات (اسلحہ وسامان رسد) کا موجود کر دینا، یا مخالفین کی مدافعت کے اسباب پیدا کر دینا جیسے مخالفین میں بزدلی، رعب وہیبت اور سوء تدبیر ڈالدینا، اور منصورین کو بہادری دبدبہ اور حسن تدبیر عطا فرما دینا جیسا کہ غزوۂ بدر میں ہوا، ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدَ اللهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ اسی طرح تہذیب نفس واصلاحِ خلق میں قویٰ بہیمیہ وسبعیہ وشیطانیہ کے لشکروں سے مقابلہ ہوتا ہے اس موقع پر وہ تائید غیبی اللہ کی نصرت کہلاتی ہے جس سے تہذیب نفس واصلاح خلق کا مقصود حاصل اور ملک مقصود فتح ہوتا ہے۔ اور وہ نصرت حق تعالیٰ کی توفیق، ہمت وحوصلہ اور انجذ اب، نیز ہادی کی مقبولیت وقوتِ تاثیر وغیرہ اسباب کا منجانب اللہ مہیا ہوجانا ہے جن سے کشود کار ہوتا ہے۔ اور تہذیب نفس حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اصلاحِ خلق کا باب کھلتا ہے اور خلق خدا دین حق میں جوق جوق، گروہ گروہ داخل ہو جاتی ہے۔ یہ ہی حقیقی فتح مبین ہے۔ جس کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات کے اخیر میں نہایت شاندار طریقہ پر ہوا۔ حضرات مفسرین نے لفظ نصر وفتح کے وسیع معانی کو عموماً ایک ایک شکل میں محدود کر کے بیان فرمایا ہے۔ حالانکہ وہ ظاہری وباطنی متعدد شکلوں کو مشتمل ومحیط ہیں۔

(۱) جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ نصر سے مراد وہ تائید واعانت ہے جو فتح مکہ کے سلسلہ میں ہوئی۔ اور فتح سے مراد فتح مکہ ہے۔ جو ۱۰ یا ۱۲ یا ۱۷ یا ۱۸ رمضان ۸ھ میں (علی اختلاف الاقوال) ہوئی مشہور یہ ہے کہ ۱۸ رمضان ۸ھ میں فتح مکہ ہوئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لئے مدینہ منورہ سے ۲ رمضان یا بدھ کے دن ۱۰ رمضان کو عصر کے بعد نکلے تھے۔ واللہ اعلم۔ اس سفر میں انصار ومہاجرین اور عرب کی مختلف جماعتوں کا لشکر دس ہزار کی تعداد میں آپ کے ہمراہ تھا۔ دوسری روایت کے مطابق لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی لیکن یہ کچھ اختلاف نہیں۔ کیونکہ مدینہ سے آپ کے ہمراہ دس ہزار روانہ ہوئے۔ راستہ میں دوسرے قبائل مل گئے تو تعداد بارہ ہزار ہوگئی تھی۔ فتح مکہ کا تفصیلی واقعہ تفسیر مظہری میں مذکور ہے۔ یہاں اس مختصر میں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں فمن شاء فليطالع ثمه او فی کتب السیر.

(۲) بعض کہتے ہیں کہ فتح سے مراد فتح خیبر ہے۔ جو حدیبیہ ۶ھ کے بعد محرم ۷ھ میں ہوئی۔ اس فتح کے بعد مسلمانوں کو فراخ دستی میسر آئی۔ (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے تمام فتوحات مراد ہیں۔ فتح خیبر، فتح مکہ، فتح طائف، فتح حنین وغیرہ جو پے در پے نصیب ہوئیں۔ جن سے اسلامی حلقہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اور شوکتِ اسلامی کو شباب حاصل ہوا۔
(۴) اس سے مراد فتوحات غیبیہ ہیں جن سے آپ کو وہ ترقیات ملیں جو کسی اور کو نہیں مل سکیں۔ اور فتح کو ایسے عام معنی پر محمول کرنا جسمیں جملہ ظاہری وباطنی فتوحات آجائیں بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

(ف) اگر اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا تو اِذَا اپنے استقبالی معنی پر ہوگا۔ اور یہ سورت ایک پیشنگوئی

اور آپ کی نبوت کی ایک واضح دلیل ہوگی۔ اور اگر بعد الفتح اس سورت کا نزول ہوا تو یہ اِذَا بمعنی اِذْ ظرفیہ ہوگا جو ماضی کے لئے آتا ہے۔ اور اذا، اِذْ ظرفیہ کے معنی میں قرآن میں بہت آیا ہے۔ مثلاً ﴿ اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ﴾ اور ﴿حَتّیٰٓ اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ ﴾ وغیرہ اس صورت میں اِذَا، سَبِّح کا ظرف نہ ہوگا۔ بلکہ فعل مقدر اتمَّ النعمة یاکَمُلَ الْامرُ وغیرہ کے متعلق ہوگا۔ بعض نے اس دوسری صورت میں بھی اِذَا کو مستقبل ہی کے لئے قرار دیا ہے اس اعتبار سے کہ فتح کو عام معنی میں رکھا جائے کہ فتح مکہ اور اسکے بعد کی جتنی ظاہری و باطنی فتوحات ہیں سب کو یہ لفظ شامل ہے۔ گو ام الفتوح فتح مکہ ہے۔ مگر اس فتح کی تکمیل مستقبل میں ہونے والی تمام فتوحات سے ہوئی۔

وَرَءَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً ‎ .رَءَيْتَ میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اور رؤیت سے مراد رؤیت بصریہ ہے یا قلبیہ دونوں احتمال ہیں۔ کما مرَّ فی الترکیب۔ اور النَّاس سے مراد اہل عرب ہیں۔ اور دِيْن اللّٰهِ سے مراد اسلام کیونکہ ﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَام ﴾ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلُ مِنْهُ﴾ اور اَفْوَاجاً: فَوْجٌ کی جمع ہے۔ اس جماعت کو کہتے ہیں جلدی جلدی گزر رہی ہو۔ اور اس کا مطلق جماعت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ فتح مکہ سے پہلے بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وحقانیت پر یقین حاصل تھا مگر ڈر کی وجہ سے اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اور بہت سے لوگوں کو تردد تھا جو کہتے تھے کہ اگر یہ نبی برحق ہیں تو مکہ ضرور فتح ہوگا۔ اور اس پر ان کا تسلط ہو جائیگا۔ تو وہ لوگ فتح مکہ کے منتظر تھے۔ جب مکہ فتح ہو گیا تو دونوں قسم کے لوگ فوج در فوج آئے اور اسلام میں داخل ہو گئے۔ یمن سے سات سو نفر مسلمان ہو کر مدینہ کو چلے اور راستہ میں اذانیں دیتے اور قرآن پڑھتے ہوئے آئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل یمن تمہارے پاس آئے ہیں وہ بہت رقیق القلب اور ایمان کے لئے بڑے نرم دل ہیں۔ حکمت یمنی ہے۔ فخر وغرور اونٹ والوں میں ہوتا ہے اور سکون وبردباری بکریوں والوں میں (بخاری ومسلم) مقاتلؒ وعکرمہؒ کی رائے ہے کہ النَّاس سے مراد اہل یمن ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم مسلمان ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوڑ گئی اور قبائل عرب اسلام لانے کے لئے فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اور یوں کہتے تھے کہ ان کو اور ان کی قوم کو چھوڑ دو اور وہ نبی برحق ہیں تو ضرور اپنی قوم پر غالب آئیں گے۔ مظہری میں ہے کہ فتح مکہ کے بعد عرب آپس میں کہنے لگے۔ اے حرم کے باشندو، جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر فتح یاب ہو گئے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کے حملہ سے تم کو محفوظ رکھا تھا اور ان کو شکست دیدی تھی تو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے بغیر تمہارے لئے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یہ طے کر کے وہ گروہ کے گروہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اور اس سے پہلے ایک ایک دو دو مسلمان ہوتے تھے۔ ابو عمرو بن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جب ہوئی کہ عرب کے سب لوگ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں عرب سے مراد عبدۃ الاوثان (بت پرست) ہیں، ورنہ تو نصاریٰ بنی تغلب مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ جزیہ ادا کرتے تھے، اور جزیرۃ العرب میں یہود بھی موجود تھے جو حضرت عمرؓ کے دور تک رہے اور فاروق اعظمؓ نے ان کو اذرعات وآذربیجان بھیج دیا تھا۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ...... تسبیح سے مراد صرف زبان سے سبحان اللہ کہہ دینا نہیں بلکہ حق تعالیٰ کو تمام صفات محدثات، الواث بشریہ، کدورات امکانیہ اور جملہ عیوب واوصاف مذمومہ سے مبرا و پاک سمجھنا اور زبان وقلب سے اسکی پاکی کا اقرار واعتراف کرنا مراد ہے۔ اور تحمید سے مراد ہے ان تمام صفاتِ کمالیہ واوصاف عالیہ کا اللہ کے لئے ثابت کرنا جو اس کی

شایانِ شان ہیں۔ تسبیح کے انوار کا جب ذاکر کے قلب پر انعکاس ہوتا ہے تو صفاتِ مذمومہ سے اس کو براءت وصفائی میسر آتی ہے۔ اور انوار تحمید کی تجلیات سے حامد کا قلب اوصافِ حمیدہ وصفاتِ کمالیہ سے مزین ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسکو عالم ملکوت سے مناسبت ہوجاتی ہے، اس سے ترقی کر کے بارگاہ قدس تک اسکی رسائی ہوتی ہے، اور اسکا مقام ﴿فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ قرار پاتا ہے تسبیح میں تخلیہ (عارف کا ابتدائی حال) اور تحمید میں تجلیہ (عارف کا انتہائی حال) ہے۔ حضرات صوفیہ کے یہاں تسبیح سے مقام فنا تک رسائی ہوتی ہے۔ اور تحمید سے مقامِ بقاء تک اور دونوں کے مراتب متفاوت ہیں۔ واللہ اعلم۔

فضائلِ تسبیح:

یہاں چندان احادیث کا ترجمہ بالاختصار پیش کیا جاتا ہے جن میں تسبیح وتحمید کے فضائل مذکور ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (۱) روزانہ صبح کو ایک (اللہ کا) منادی ندا دیتا ہے کہ تم پاک بادشاہ کی پاکی بیان کرو۔ (ترمذی) (۲) سب سے افضل دُعاء الحمدُ اللہ ہے (ترمذی) (۳) سبحان اللہ کہنا نصف میزان ہے۔ اور الحمد اللہ اسکو بھر دیتا ہے الحدیث۔ (ترمذی) (۴) جو شخص ۱۰۰ بار صبح اور ۱۰۰ بار شام کو سُبحان اللہ کہے وہ ایسا ہے کہ اس نے سوحج کئے۔ اور جو سو ۱۰۰ سو ۱۰۰ سو بار صبح وشام الحمد للہ کہے وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے سوگھوڑے راہِ خدا میں دیدیئے (الحدیث ترمذی) (۵) قیامت کے دن جن کو سب سے پہلے جنت کی طرف بُلایا جائے گا وہ لوگ ہوں گے جو راحت ومصیبت (ہر حال میں) اللہ کی حمد کرتے تھے۔ (بیہقی) (۶) حمد شکر کا سر ہے۔ اس بندہ نے اللہ کا شکر نہیں کیا جس نے اللہ کی حمد نہیں کی (بیہقی) (۷) جو شخص سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ کہتا ہے اس کے لئے جنت میں ایک کھجور لگادی جاتی ہے (ترمذی) (۸) بہترین کلام وہ ہے جو حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے منتخب (پسند) فرمایا یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ ۱۰۰ سو بار سُبْحَانَ اللّٰہ کہے تو اس کے لئے ایک ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور ایک ہزار گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ (۱۰) دو کلمے زبان پر ہلکے پھلکے ہیں میزان میں بوجھل ثابت ہوں گے۔ حضرت رحمٰن کے پیارے ہیں۔ اور وہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْم۔ (مشکوۃ) (۱۱) جو شخص سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ روزانہ ۱۰۰ بار کہا کرے اس کے سب گناہ معاف ہوجائیں گے اگرچہ وہ سمندر کے جھاگوں کی برابر ہوں۔ (بخاری ومسلم) (۱۲) جو شخص صبح وشام ۱۰۰ سو ۱۰۰ سو بار سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ کہا کرے تو روز قیامت اس سے بڑھ کر نیکیاں کوئی نہیں لاسکتا، ہاں مگر جس نے یہی عمل کیا ہو یا اس سے زیادہ کیا ہو۔ بخاری ومسلم) (۱۳) سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ کا کہنا مجھے ساری کائنات سے زیادہ محبوب ہے (مسلم) (۱۴) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ سُبْحَانَ اللّٰہ تمام مخلوقات کی نماز (عبادت) ہے۔ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کلمہ شکر ہے الخ (رزین)

وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا...... (اور آپ اپنے رب سے معافی مانگئے کیونکہ وہ بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: (۱) یقیناً میں ایک دن میں ستر ۷۰ سے زائد بار اللہ سے استغفار وتوبہ کرتا ہوں۔ (بخاری) (۲) میرے قلب پر تاریکی سی آجاتی ہے اور میں سو بار روزانہ استغفار کرتا ہوں۔ (بخاری) (۳) اے لوگو! تم اللہ سے توبہ کرو میں اس سے روزانہ سو بار توبہ کرتا ہوں۔ (۴) بندہ جب گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول

فرماتے ہیں۔(۵)مغرب کی جانب سے آفتاب طلوع ہونے سے پہلے پہلے جو توبہ کرلے گا اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیں گے۔(۶)قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کروتو خدا تم کو نیست و نابود کردے۔اور ایسے لوگ پیدا کرے جو گناہ کرکے توبہ کریں۔اور ان کی مغفرت کی جائے۔(۷)جس شخص کا یقین یہ ہے کہ میں گناہ بخشنے پر قدرت رکھتا ہوں میں اس کی مغفرت کردونگا۔اور مجھے کچھ پرواہ نہیں جب تک کہ وہ شرک میں مبتلا نہ ہو۔(۸)جو استغفار کو لازم پکڑ لیتا ہے اللہ تعالیٰ ہر تنگی سے اس کے لئے نکلنے کا راستہ، ہر غم سے چھٹکارا اور اسکو ایسے مقام سے رزق عطا فرماتے ہیں کہ اسکو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔(۹)جو استغفار کرتا ہے اس نے گناہ پر اصرار نہیں کیا گو ایک دن میں ۷۰ ستر بار کرے۔(۱۰)تمام انسان خطا کار ہیں۔اور بہتر خطا کار توبہ کرنے والے ہیں۔(۱۱)اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اس وقت تک قبول کرتے ہیں جب تک غرغرہ کی حالت نہ ہو۔(۱۲)حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم شمار کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْر ایک مجلس میں سو بار ۱۰۰ فرماتے تھے۔(۱۳)بڑی خوبی و خوشحالی ہے اس کے لئے جو اپنے نامہ اعمال میں بہت استغفار پائے۔(۱۴)بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والا گنہگار مؤمن بندہ سے محبت فرماتے ہیں۔(۱۵)گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ گویا اس نے گناہ ہی نہیں کیا۔(مشکوٰۃ شریف)

کیونکہ بے شمار آیات و احادیث سے استغفار کی محبوبیت معلوم ہوتی ہے۔جن میں سے چند احادیث کا مختصر ترجمہ بطور نمونہ اوپر مذکور ہوا۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اخیر میں اپنے محبوب کو اس محبوب عمل کا حکم دیا۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر نہایت اہتمام سے کاربند ہوئے۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد یہ دعاء پڑھتے تھے۔سُبْحَانَکَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (بخاری) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اخیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ اکثر فرمایا کرتے تھے۔(مسلم) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اخیر میں (اس سورت کے نزول کے بعد) اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے (ہر حال میں) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اور فرماتے تھے کہ مجھ کو اس کا حکم ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ نازل ہوئی تو جب آپ اس کو پڑھتے اور رکوع کرتے تھے تو اکثر اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ تین بار پڑھا کرتے تھے (روح المعانی) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت میں بڑا مجاہدہ فرمایا یہاں تک کہ آپکے پاؤں ورم کر گئے۔ (قرطبی)

استغفار کا حکم کیوں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی معصوم ہیں آپ کو استغفار کا حکم کیوں کیا گیا تو بہ و استغفار تو گنہگار کو کرنی چاہیے جب گناہ نہیں تو توبہ کیسی؟ علمائے ربانیین نے اس کی بہت سی وجوہات بیان کی ہیں یہاں چند مذکور ہیں: (۱)اس عمل کی محبوبیت کی وجہ سے اپنے محبوب کو اس کا حکم دیا گیا۔(۲)امت کی تعلیم کے لئے آپ کو یہ حکم ہوا۔(۳)خطائے اجتہادی یا خلاف اولیٰ امور سے استغفار کا حکم ہے۔(۴)آپ ہر آن ترقی فرماتے تو ترقی کے بعد پچھلا درجہ و مرتبہ قصور معلوم ہوتا تھا اس کی مغفرت چاہتے۔(۵)قبل البعث جو صغائر کا احتمال تھا اس سے استغفار کا حکم ہے۔(۶)آپ کی امت کے لئے استغفار کا

حکم ہے یعنی امت کی مغفرت کی درخواست کیجئے۔(۷) اللہ کا جو جتنا بڑا عارف ہوتا ہے اتنا ہی وہ خود کو اور اپنی عبادت کو اس کی بارگاہ کی بلندی کے مقابلہ میں ہیچ در ہیچ سمجھتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام سے خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا عارف کون ہوگا؟ اسلئے آپ کو اللہ کی بارگاہ میں استغفار کرنے کا حکم ہوا۔(۸) وَاسْتَغْفِرْهُ کے معنی ہیں کہ آپ مغفرت مانگئے۔ مغفرت ایک گنہگاروں کی ہوتی ہے کہ جو گناہ سرزد ہوگئے ہیں ان کو مخلوق کی نگاہوں سے چھپا لیا جائے۔ اور ایک مغفرت معصوموں کی ہوتی ہے کہ ان کو گناہوں سے چھپا لیا جائے یعنی گناہوں کی رسائی ان تک اور ان کی رسائی گناہوں تک نہ ہو پائے بس یہ مؤخر الذکر صورت انبیائے معصومین کے ساتھ خاص ہے۔ مطلب مغفرت چاہنے کا یہ ہوگا کہ وہ معصومیت کے دوام کی درخواست کر کے اپنی انکساری اللہ کی بارگاہ میں پیش کریں اور لذتِ مناجات سے بہرہ اندوز ہوں وغیرہ وغیرہ۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ...... قیاس کا تقاضا تھا کہ تواباً کے بجائے غفاراً ہوتا۔ اس کا جواب بعض نے دیا کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ استغفار کرنے والے کو توبہ بھی کرنی چاہیے تاکہ استغفار قبول ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ آیت میں صنعت احتباک ہے کہ معطوفین میں ہر ایک طرف میں احد المتقابلین کو حذف اور احد المتقابلین کو ذکر کر دیا گیا۔ تاکہ مذکور محذوف پر دلیل بن سکے۔ اصل عبارت اس طرح تھی وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا وَّتُبْ اِلَيْهِ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا . واللہ اعلم۔

تم تفسير سورة النصر فالحمد للّٰہ رب العصر ومقلب الدهر وصلى الله على نبيه محمد وّاٰله وصحبه الذين ضحوامع رسوله فى اليسر والعسر وعلى متبعيهم الىٰ يومِ الْحَشْرِ.

سُوْرَةُ اللَّهَبِ

سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

(رکوع ۱۔ آیات ۵۔ سورۂ لہب مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پانچ آیات ہیں۔ کلمات ۲۰۔ حروف ۷۷)

ربط ومناسبت:

یہ سورت بالاتفاق مکیہ ہے۔ اس سورت کا دوسرا نام سورۃ المسد بھی ہے۔(۱) سورۂ نصر میں یہ بتایا گیا تھا کہ دنیا میں بھی حکم خداوندی ماننے والوں کو نصرتِ خداوندی وفتح وکامیابی نصیب ہوتی ہے۔ اس سورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حکم خداوندی سے سرتابی کرنے والوں اور اعداء اسلام کو دنیا وآخرت میں خسارہ وبربادی ہے۔(۲) سورۂ نصر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نصر وفتح کی بشارت دی گئی۔ اور اس سورت میں آپ کے بدترین دشمن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا کو خسران وبربادی کی خبر دی گئی ہے۔(۳) سورۂ کوثر میں بتایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر کثیر سے نوازا گیا اور آپ کے دشمن کو ابتر بنا دیا گیا ہے۔ تو سورۂ نصر میں کوثر کا نمونہ ہے۔ اور سورۂ لہب میں ابتر ہونے کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔(۴) سورۂ کافرون میں اعلانِ براءت کے اخیر میں فرمایا گیا تھا لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں گویا یہ بات آئی کہ خدایا مجھ کو اس کا صلہ کیا ملے گا تو جواب دیا گیا کہ نصر وفتح۔ پھر گویا یہ بات قلب میں آئی کہ بندگانِ اصنام خصوصاً عبادتِ اصنام کے داعی ابولہب کو کیا سزا ملے گی تو اس سورت میں اس کا جواب ہے کہ اس کے لئے تباہی وبربادی مقدر کر دی گئی۔ اور وعدہ کو وعید پر اسلئے مقدم کیا تاکہ وَلِيَ دِيْنِ سے وعدہ متصل ہو جائے۔

(ف) یہ مجانست ومناسبت دونوں سورتوں میں اس کے باوجود ہے کہ سورۂ نصر مدینہ میں اخیر زمانہ میں نازل ہوئی اور سورۂ

لہب مکہ میں شروع دور ہی میں نازل ہوگئی تھی۔اس سے یہ بات صاف مفہوم ہوتی ہے کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب منجانب اللہ اسی کے حکم سے ہے۔واللہ اعلم۔

شانِ نزول:

صحیحین میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ نازل ہوئی تو آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر اپنے قبیلہ قریش کے لوگوں کو آواز دی۔بعض روایات میں ہے کہ یا صباحاہ کہہ کر یا بنی عبد مناف و یا بنی عبد المطلب وغیرہ ناموں کے ساتھ آواز دی۔(اس طرح آواز دینا عرب میں خطرہ کی علامت شمار کیا جاتا تھا) سب قریش جمع ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ دشمن (تم پر چڑھ آیا ہے اور) صبح و شام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے۔تو کیا آپ لوگ میری تصدیق کر دیں گے؟ سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہاں ہم ضرور تصدیق کریں گے۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو ایک عذاب شدید سے ڈراتا ہوں (جو کفر و شرک پر اللہ کی طرف سے مقرر ہے) یہ سُنکر ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا (تیرے لئے ہلاکت ہو کیا تو نے ہم کو اسی لئے جمع کیا تھا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنے کے لئے ایک پتھر اٹھالیا اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد رحم والا بڑا مہربان ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (١) مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (٢) سَيَصْلٰى نَارًا

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں گے اور وہ برباد ہوجائے۔نہ اسکا مال اسکے کام آیا اور نہ اسکی کمائی۔وہ عنقریب ایک بھڑکتی آگ

تَبَّتْ	يَدَا	اَبِىْ	لَهَبٍ	وَّ	تَبَّ	مَا	اَغْنٰى	عَنْهُ	مَالُهٗ	وَ	مَا	كَسَبَ	سَيَصْلٰى	نَارًا
ہلاک ہو	دو ہاتھ	ابی	لہب	اور	ہلاک ہو وہ	نہ	کفایت کیا	سے اس	مال اس	اور	جو کچھ	کمایا تھا	داخل ہوگا	آگ

ذَاتَ لَهَبٍ (٣) وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (٤) فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (٥)

میں داخل ہوگا اور اسکی وہ بیوی بھی جو لکڑیاں لاد کر لاتی ہے۔اس کی گردن میں ایک رسی ہوگی خوب بٹی ہوئی۔

ذَاتَ لَهَبٍ	وَ	امْرَاَتُهٗ	حَمَّالَةَ	الْحَطَبِ	فِىْ	جِيْدِ	هَا	حَبْلٌ	مِّنْ	مَّسَدٍ
شعلہ والی	اور	جورو اس	اٹھانے والی	لکڑیوں	بیچ	گردن	اس	رسی	سے	پوست کھجور

لغات:

تَبَّتْ صیغہ واحد مؤنث غائب ماضی تَبَّ تَبًّا وَتَبَابًا (ض) ہلاک ہونا، ٹوٹنا، سدا ٹوٹے میں رہنا۔اَغْنٰى افعال سے فائدہ پہنچانا، مالدار بنانا، مجرد میں سَمِعَ سے لازم، مالدار ہونا كَسَبَ (ض) کمانا۔لَهَبٌ مصدر (س) بھڑکنا پیاسا ہونا۔دھویں اور غبار کو بھی لہب کہتے ہیں۔اِمْرَاَةٌ عورت اِمْرُءٌ کی مؤنث ہے اس کی جمع نِسَاءٌ آتی ہے۔حَمَّالَةٌ صیغہ مبالغہ حمل (ض) سے، خوب اٹھانے والی حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ایندھن سر پر لئے پھرنے والی، یہ ابولہب کی جورو کی صفت ہے۔اس کا نام اروٰی بنت حرب کنیت ام جمیل اور لقب عوراء (کانی) تھا اپنے بدبخت شوہر کی طرح اس شقیہ کو بھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت ترین عداوت تھی۔ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ کو بعض نے تو حقیقت پر محمول کیا ہے کہ خست کی وجہ سے جنگل سے ایندھن خود ہی لاتی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بھی ڈالدیتی تھی۔ بعض نے کہا کہ سخن چینی و چغل خوری سے استعارہ ہے۔ اس میں چغل خوری کی خاص عادت تھی۔ جِیْدٌ: گردن جیود، اجیاد جمع۔ حَبْلٌ رسی جمع حِبَالٌ (ن) رسی بٹنا، حبل مجازاً بمعنی عہدو پیمان بھی استعمال ہوتا ہے جیسے ﴿اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّن النَّاسِ﴾ مَسَدٍ اسم، کھجور کی شاخوں کی چھال سے نکالے ہوئے ریشے (ن) رسی بٹنا، تکلیف میں ڈالنا۔

ترکیب:

تَبَّتْ فعل یَدَا مضاف اَبِیْ لَھَبٍ مرکب اضافی، مضاف الیہ، مضاف مضاف الیہ ملکر فاعل، جملہ فعلیہ وَتَبَّ فعل ضمیر فاعل جملہ فعلیہ مَا اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ ، مر مثلہ فی سورۃ اللیل۔ وَ عاطفہ مَا مصدریہ کَسَبَ فعل ضمیر فاعل، جملہ بتاویل مفرد مالُہٗ پر عطف ہے او موصولۃ او موصوفۃ، فحینئذٍ العائد محذوف. سَیَصْلٰی فعل ضمیر فاعل نارًا اپنی صفت ذَاتَ لَھَبٍ (مرکب اضافی) سے ملکر مفعول فیہ، وَامْرَاَتُہٗ (مرکب اضافی) ذوالحال حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ (مرکب اضافی) حال، ذوالحال وحال ملکر سَیَصْلٰی کی ضمیر پر عطف، یا حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ منصوب تقدیراعنی ہے فِی جِیْدِھَا خبر مقدم، حَبْلٌ موصوف مِن مَسَدٍ متعلق محذوف فتیلٌ کے ہوکر صفت۔ مرکب توصیفی مبتدا مؤخر۔ جملہ اسمیہ حال ہوا، ضمیر حَمَّالَۃَ سے یا امراتُہٗ سے، یہ بھی احتمال ہے کہ امراتہ کی خبر ہوجائے اور حَبْلٌ من مسدٍ ظرف کا فاعل ہوجائے۔

تفسیر:

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ . اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ٹوٹ گیا۔ مگر یہ اور اس قسم کے کلمات عرب کے محاورہ میں بددعاء کے لئے استعمال ہوتے ہیں، حق تعالیٰ کسی کے لئے بددعاء نہیں کرتے۔ بلکہ کیونکہ کلام ربانی محاورات انسانی میں نازل ہوا ہے اس لیے اس محاورہ میں ابولہب کی بربادی کی خبر دیتے ہیں۔ محاورہ کے موافق آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہوجائے یا وہ ہلاک ہوگیا۔ محاورہ میں بددعاء کے بعد ایسا کلمہ استعمال کرتے ہیں جو بددُعاء کی قبولیت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

جَزٰی رَبُّہٗ عَنِّیْ عَدِیَّ بْنَ حَاتِمٍ ۔۔۔ جَزَاءَ الْکِلَابِ الْعَادِیَاتِ وَقَدْ فَعَلَ

بدلہ دے اس کا رب میری طرف سے عدی بن حاتم کو۔ بھونکنے والے کتوں کا بدلہ اور اللہ نے ایسا کیا۔ اُردو کے محاورہ میں کہتے ہیں کہ خدا اس کو غارت کرے اور کردیا۔

دونوں ہاتھ ٹوٹنے سے کیا مراد ہے؟

(۱) چونکہ انسان کے اکثر کام ہاتھ ہی سے سرزد ہوتے ہیں اسلئے ہاتھ بول کر ذات اور نفس مراد لیتے ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے ﴿لَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ﴾ اور بِمَا قَدَّمَتْ یَدَاکَ بعض علماء نے دونوں ہاتھوں کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکا تھا۔ اور بیہقی نے ابن عباسؓ سے روایت بیان کی ہے کہ ابولہب نے ایک دن لوگوں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد فلاں فلاں کام ہوں گے، پھر اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا کہ ان ہاتھوں میں تو ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں آیا۔

پھر اپنے ہاتھوں سے کہنے لگا تبًّا لکُما ما اَریٰ فِیکُمَا شَیْئاً مِمَّا قَالَ مُحمدٌ (تم برباد ہوجاؤ میں تمہارے اندر ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ہوں جن کی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خبر دیتے ہیں۔اس مناسبت سے قرآن نے ہلاکت کو ہاتھوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۲) انسان کے اندر قوت نظریہ وقوت عملیہ حسنات وسعادتِ دارین حاصل کرنے کے دو ہاتھ ہیں۔جسکی یہ دونوں قوتیں خراب ہوگئیں گویا اسکے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔ابولہب کو یہ بات حاصل تھی کہ اس کی دونوں قوتیں ضائع ہوگئی تھیں۔اس لئے اس کے حال زار کی اس مغرور وبے خبر کو اطلاع دی گئی ہے۔اور اس حقیقت کو دونوں ہاتھوں کے ٹوٹ جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔(۳) دونوں ہاتھوں سے مراد دنیا وآخرت ہیں مطلب یہ ہے کہ ابولہب کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہوگئیں۔اور وہ برباد ہوگیا۔(۴) ید بمعنی نعمت ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی احسان کا برتاؤ کرتا تھا اور قریش کے ساتھ بھی اور کہتا تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ ٹھیک ہے تو ان پر بھی میرا احسان ہے۔اور اگر قریش کا معاملہ درست ہے تو ان پر بھی میرا احسان ہے غرض دونوں طرح میرا فائدہ ہے تو اس میں خبر دی گئی ہے کہ اس کا وہ ید (نعمت واحسان) جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے عناد و دشمنی سے ختم ہوا۔اور جو قریش پر ہے وہ اسلئے ختم ہوگیا کہ قریش خائب وخاسر ہوں گے۔یہ مطلب ہوا تبت یدآابی لَھَبٍ کا۔اور وتبّ میں خود اس کی ہلاکت کی خبر ہے۔

ابولہب اور اسکی بربادی:

ابولہب بن عبدالمطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔نام اس کا عبدالعزیٰ تھا کیونکہ یہ سُرخ رنگ خوبصورت آدمی تھا۔اسکے چہرہ کی چمک دمک کی وجہ سے اس کی کنیت ابولہب مشہور ہوگئی تھی۔کیونکہ لہب آگ کے شعلہ کو کہتے ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ اس کو یہ خطاب سرخ وسپید ہونیکی وجہ سے قریش نے دیا تھا۔عرب کا محاورہ ہے کہ کسی کا کوئی خاص وصف بیان کرنے کے لئے لفظ اب، اخ، یا ابن کے ساتھ اس کو منسوب کردیتے ہیں۔جیسے مسافر کو ابن السبیل، چاند کو ابن اللیل، عربی کو اخوالعرب، مٹی لگے ہوئے کو ابوتراب مسکین کو اخوعیلہ، یہ بات نہیں کہ اس کا کوئی بیٹا لہب تھا، جسکی وجہ سے اس کی کنیت ابولہب تھی، البتہ اس کی دوسری کنیت اسکے بیٹے عتبہ کی وجہ سے ابوعتبہ تھی، لیکن ابولہب کنیت غالب رہی، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ لفظ ابولہب سے اس کی کنیت مقصود نہیں بلکہ اسکے جہنمی ہونے کا وصف مراد ہے۔جس طرح جنگجو آدمی کو اخوالحرب یا ابوالحرب کہہ دیتے ہیں۔اسی طرح خدائے تعالیٰ نے عبدالعزیٰ کو ابولہب فرما کر اس کے دوزخی ہونے کو ظاہر کیا ہے۔محلیؒ نے بہترین فیصلہ کیا ہے کہ شروع میں تو اس کے چہرہ کی چمک دمک کنیت کا باعث بنی، اور اخیر میں دوزخی ہونے کے اعتبار سے یہ کنیت اس پر صادق آگئی۔

اور اسلام دشمنی کی وجہ سے اسکے جہنمی ہونے کی دستاویز بن گئی۔یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔اور سرداران قریش میں شمار کیا جاتا تھا۔لیکن کفر وشقاوت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بدترین دشمن اور اسلام کا سخت ترین مخالف تھا۔جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی قبیلہ کو تبلیغ فرماتے تو یہ بدبخت آپ پر پتھر پھینکتا اور آپ کو لہولہان کردیتا تھا۔

طارق محاربیؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں بازار اور ذوالمجاز میں تھا تو ایک جوان آدمی کو دیکھا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے ایُّھا النَّاس قولوا لاالٰہ الااللہ تفلحوا (اے لوگو! توحید کے قائل ہوجاؤ کامیاب ہوجاؤ گے) اور ایک شخص اسکے پیچھے ہے جو اسکے پتھر مار مار کر اسکی پنڈلیوں اور ایڑیوں کو زخمی کررہا ہے۔وہ یوں کہہ رہا ہے کہ اے لوگو! اس کی بات نہ ماننا، یہ جھوٹا ہے میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا یہ آگے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو نبی ہونیکا دعویٰ کرتے ہیں اور پیچھے ان کا چچا

ابولہب ہے جو ان کو جھٹلا رہا ہے۔ جب اس شقی کو عذاب سے ڈرایا جاتا تھا تو کہتا تھا کہ اگر واقعی یہ بات ہونے والی ہے تو میرے پاس مال واولاد بہت ہے ان کو فدیہ دیکر عذاب سے چھوٹ جاؤنگا۔ ہجرت کے بعد قریش کے جارحانہ ارادوں کا باعث یہ لعین بھی بنا تھا۔

غزوۂ بدر سے سات روز بعد اسکے چیچک یا ایک زہریلی قسم کی گلٹی طاعون کی طرح نکلی، مرض لگ جانے کے خوف سے سب گھر والوں نے اس کو الگ ڈال دیا اور یہ وہیں پڑا پڑا سڑ کر مر گیا۔ اس کی لاش تین روز تک اسی جگہ پڑی سڑتی رہی آخر کار اسکے ورثہ کو شرم محسوس ہونے لگی تو حبشی مزدوروں سے اجرت پر اٹھوا کر اس کو گڑوا دیا۔ انہوں نے گڑھا کھود کر ایک لکڑی سے اس کی لاش کو اس گڑھے میں دھکیل دیا۔ اور اوپر سے پتھر بھر دیئے۔ ایک روایت میں ہے کہ گڑھا نہیں کھودا گیا بلکہ اس کی لاش کو دھکیل کر ایک دیوار کے قریب کر کے اوپر سے پتھر ڈالکر اس کی ناپاک لاش کو چھپا دیا۔ اس طرح بصد رُسوائی وذلت وہ ناری جہنم رسید ہوا۔ اور جو کچھ قرآن نے فرمایا تھا دنیا نے اس کا مشاہدہ کر لیا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ سورۂ ابولہب میں ابولہب کی ذاتی ہلاکت مراد نہیں بلکہ اس کی قومی ہلاکت مراد ہے۔ جو غزوہ بدر اور اس کے بعد واقع ہوئی۔ جس طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کے ادوار میں کوئی ایک نافرمان وسرکش انکا زیادہ مقابل ومخالف رہا ہے اور اپنے ظالمانہ رویہ کی بنا پر پوری قوم کی تباہی وبربادی کا باعث بنا، جیسے ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں نمرود، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں فرعون تھا۔ اسی طرح امتِ محمدیہ کا نمرود یا فرعون ابولہب تھا۔ قرآن عظیم نے اسی حیثیت سے تمام عمائد قریش کو چھوڑ کر اسی شقی کا ذکر کیا ہے۔

ذکر کنیت کی وجہ:

آیت میں اس کی کنیت کا ذکر کیا گیا اور اس کے نام عبدالعزیٰ کو ذکر نہیں کیا۔ اس کی بہت سی وجوہ ہوسکتی ہیں مثلاً (۱) عزیٰ ایک بت کا نام تھا جس کا یہ بندہ بنا ہوا تھا۔ ایسا مکروہ وناپاک نام جس سے شرک کی بدبو آتی ہو کلام الٰہی میں ذکر کرنے کے قابل نہ تھا۔ (۲) وہ شقی اپنی اسی کنیت سے زیادہ مشہور تھا۔ (۳) یہ لفظ ابولہب، کیونکہ اسکے دوزخی ہونے پر واضح طور پر دلالت کرتا ہے اس لئے یہاں یہی مناسب تھا وغیرہ۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ اس میں مَا نفی کے لئے ہے یا استفہام انکاری کے لئے یعنی اسکا مال اور کمائی اسکے کام نہ آئیں گے یا کیا اس کا مال اور کمائی اس کو عذاب سے بچالیں گے؟ ابولہب بڑا مالدار تھا اور بہت سے مویشیوں کا مالک تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابن عباسؓ مجاہدؒ، عطاءؒ، ابن سیرینؒ، وغیرہ فرماتے ہیں کہ مَا كَسَبَ سے مراد اولاد ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی کمائی سے کھانا تمہارے لئے پاکیزہ ترین کھانا ہے اور تمہاری اولاد تمہاری کمائی ہے۔ (گویا کسب کا اطلاق اولاد پر بھی ہوتا ہے) دوسرے مفسرین نے مَا كَسَبَ کا مصداق منافع تجارت وغیرہ کو قرار دیا ہے۔ اولاد ومال دونوں چیزیں ناشکری کی وجہ سے اسکے فخر وغرور اور وبال کا سبب بنیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ابولہب یہ بھی کہتا تھا کہ جو کچھ میرا بھتیجا کہتا ہے اگر وہ برحق ہے تو میرے پاس مال واولاد بہت ہے میں اس کو دیکر اپنی جان بچالوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب انتقام الٰہی کا وقت آیا تو اس کے نہ مال کام آیا نہ اولاد، وقال الضحاک مَا اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ الموروث من ابيه وما كسبه بنفسه والذی كسبه من عمله الخبيث الذی هو كيده فی عداوة النبی صلی الله عليه وسلم. والله اعلم.

اولادِ ابی لہب:

ابولہب کے تین بیٹے تھے۔عتبہ اور معتب یہ دونوں فتح مکہ کے دن مسلمان ہوگئے تھے۔اور ان کے مسلمان ہوجانے کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت خوشی ہوئی تھی۔اور ان کے لئے خاص طور پر آپ نے دُعاء بھی فرمائی تھی۔یہ دونوں غزوۂ حنین وطائف میں شریک بھی ہوئے۔تیسرا بیٹا عُتیبہ (مصغراً) مسلمان نہیں ہوا تھا کما قیل

كَـرِهْـتُ عُتَيبَةَ اِذْ اَجـرُمـا وَاَحْبَبْـتُ عُتبَةَ اِذْ اَسـلـمـا
كَـذَا مُـعتَّـبٌ مُسْلِمٌ فَـاحتـرِز وَخَفْ اَنْ تَسُـبَّ فَتـىً مُسـلـمـا

عتیبہ سے مجھے نفرت ہے کیونکہ وہ مجرم رہا اور عتبہ سے محبت کرتا ہوں کہ وہ مسلمان ہوگیا تھا اسی طرح معتب بھی مسلمان تھا تو احتیاط کر اور ڈر کہ تو ایک مسلمان جوان کو بُرا کہے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم عتیبہ کے نکاح میں تھیں۔اور دوسری صاحبزادی حضرت رقیہؓ عتبہ کے نکاح میں تھیں۔جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب نے قسم دیکر اپنے دونوں بیٹوں کو طلاق کا حکم دیا۔ چنانچہ ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کو طلاق دیدی۔مگر عتیبہ نے حد سے بڑھ کر گستاخیاں کیں چنانچہ جب اپنے باپ کے ساتھ اس نے ملک شام کے سفر کا ارادہ کیا تو اس نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاکر ان کو ضرور اذیت دوں گا چنانچہ یہ آیا اور کہا اے محمد میں ﴿والنَّجمِ اِذَاھَوىٰ﴾ کا منکر ہوں اور ﴿دَنىٰ فَتَدَلىٰ﴾ کا بھی انکار کرتا ہوں۔پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر تھوک دیا جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نہیں پہنچا اور حضرت ام کلثومؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طلاق دیدی۔اس خبیث نے اپنے قول وفعل سے ہر طرح اللہ کے محبوب کو ناراض کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بدنصیب کے لئے یہ بددُعاء فرمائی **اَللھم سلط علیه کلبامن کلابک** (اے اللہ اپنے کتوں میں سے کوئی کتا اس پر مسلط کردے) آپ کے چچا ابوطالب وہاں موجود تھے ان کو یہ بددُعاء ناگوار معلوم ہوئی اور کہا اے بھتیجے! تم کو اس بددُعاء سے کیا فائدہ ہوا اسکے بعد عتیبہ اپنے باپ کے پاس چلا گیا اور یہ قصہ سنادیا پھر ملک شام کو یہ لوگ روانہ ہوگئے۔راستہ میں ایک جگہ پڑاؤ کیا۔تو ایک راہب ان کے پاس آیا اور ان لوگوں سے کہا کہ یہاں درندے بہت ہیں احتیاط سے رہنا۔ابولہب کو بددعاء کے پورا ہونے کا یقین تھا اس لئے اس نے اپنے قافلہ والوں سے کہا کہ اس رات میں آپ لوگ میری مدد کریں۔مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددُعاء کی وجہ سے اپنے بیٹے کی جان کا خوف ہے چنانچہ انھوں نے اپنے اونٹ انکے چاروں طرف بیٹھادیئے۔اور چاروں طرف سب لوگوں نے پڑاؤ کیا۔بیچ میں عتیبہ کو کرلیا۔رات کے وقت شیر آیا سب کو سونگھا اور عتیبہ کے پاس آکر اس کے ٹکڑے اڑادیئے۔یہاں تک تو اس کا دنیا میں پیش آنے والا حال بیان فرمادیا آگے آخرت کے حال کا ذکر ہے۔

سیصلیٰ ناراً ...... یعنی قیامت کے دن یا قبر ہی میں وہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔اور اسکی بیوی بھی یعنی وہ بدبخت بھی جو اپنے شوہر کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدترین دشمن تھی،اپنے شوہر کے ساتھ جہنم کی آگ میں جائیگی۔اس کا ایک حال یہ بتایا کہ وہ حمالۃ الحطب ہے جس کے لفظی معنی ہیں سوختہ کی لکڑیاں لادنے والی،یہ عورت ام جمیل بنت حرب بن امیہ ابوسفیان کی بہن تھی اور کانی تھی۔ابن زیدؒ ضحاکؒ وغیرہ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عورت جنگل سے خاردار

لکڑیاں اور کانٹے جمع کر کے لاتی اور رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں بچھا دیتی تھی تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کانٹوں پر اس طرح گزر جاتے جیسے ریشم پر چل رہے ہوں، اس کمینہ حرکت کی بنا پر قرآن مقدس نے اس کا لقب حَمَّالَةَ الْحَطَب ذکر کیا ہے۔ (۲) حضرت قتادہؒ وغیرہ نے کہا کہ کثرت مال کے باوجود وہ اتنی کنجوس تھی کہ جنگل سے ایندھن اپنی کمر پر لاد کر لاتی تھی۔ تو قرآن نے اس لفظ سے اس کی کنجوسی کی عادت کا اظہار کیا ہے۔ (۳) حضرت ابن عباسؓ مجاہدؒ اور عکرمہؒ وغیرہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ یہ عورت بہت زیادہ چغل خوری کرتی تھی۔ اور آپس میں عداوت کی آگ بھڑکا دیتی تھی۔ اس لئے اسکی یہ صفت خاص طور پر قرآن نے بیان کی ہے۔ (۴) سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ حَمَّالَةَ الْحَطَب کے معنی ہیں حمّالة الخطایا و الذنوب چنانچہ اہل عرب گنہگار کے لئے بولتے ہیں فُلَانٌ يَحْطِبُ عَلٰى ظَهْرِهٖ لان كل واحد من الحطب والذنب مبدأ الاحراق فافهم. (۵) ایک قول یہ بھی ہے کہ حطب حاطب کی جمع ہے جیسے حرس حارس کی جمع ہے اور حاطب کے معنی ہیں گنہگار کے تو حمالۃ الحطب کا مطلب ہوگا حَمَّالَةَ الْجُنَاةِ عَلَى الْجِنَايَاتِ (بدکاروں کو بدکاریوں پر ابھارنے والی) لیکن یہ قول محمل بعید و تاویل رکیک ہے۔ (۶) بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا یہ حال دوزخ میں ہوگا کہ وہ جہنم کے درختوں زقوم وغیرہ کی لکڑیاں لا کر اپنے شوہر پر ڈالیگی تا کہ اسکی آگ اور بھڑک جائے جس طرح دنیا میں وہ اسکے کفر و ظلم کو بڑھاتی تھی آخرت میں اسکے عذاب کو بڑھائیگی وھو کما تری.

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ...... مسد اس رسی کو کہا جاتا ہے جو خوب مضبوط بنائی گئی۔ ہو خواہ وہ کسی چیز کی ہو۔ کھجور ناریل وغیرہ کی ہو یا لوہے کی تاروں کی۔ غرض ہر طرح کی رسی اس میں داخل ہے بعض لوگوں نے جو خاص کھجور کی رسی اس کا ترجمہ کیا وہ عرب کی عام عادت کے مطابق کیا ہے۔ اصل اس کا مفہوم عام ہے اسی عام مفہوم کی وجہ سے حضرت ابن عباسؓ و عروۃ بن زبیرؓ وغیرہ نے فرمایا کہ یہاں حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ سے مراد لوہے کے تاروں سے بٹا ہوا رسا ہے۔ اور یہ اسکا حال جہنم میں ہوگا۔ کہ آہنی تاروں سے مضبوط بٹا ہوا طوق اسکے گلے میں ہوگا مجاہدؒ نے بھی اس کی تفسیر یہی کی ہے مِنْ مَّسَدٍ ای مِنْ حَدِيْدٍ۔ شعبیؒ و مقاتلؒ نے کہا کہ اس سے وہ رسی مراد ہے جو کھجور کے ریشوں سے بٹی ہوئی تھی۔ اور ام جمیل اس میں لکڑیاں باندھ کر لاتی تھی۔ ایک دن لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر لا رہی تھی کہ تھک کر ایک پتھر پر آرام لینے بیٹھ گئی۔ پیچھے سے ایک فرشتے نے آ کر رسی کھینچ کر اس کو ہلاک کر دیا۔ ابن زیدؒ نے کہا کہ مسد یمن میں ایک درخت ہوتا ہے اس کی رسی مراد ہے۔ قتادہؒ کہتے ہیں کہ ہار مراد ہے حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اسکے گلے میں کچھ پوتھ پڑے رہتے تھے وہ مراد ہیں۔ سعید بن المسیبؒ نے کہا کہ اس کے گلے میں ایک بیش قیمت خوبصورت ہار پڑا رہتا تھا وہی مراد ہے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دشمنی میں یہ ہار خرچ کر دونگی۔ (تو اس کی سزا دوزخ میں اس کو طوق سے ملے گی)۔

بہر حال مسد سے مراد لوہے کے تاروں کی رسی ہے۔ تو یہ واقعہ آخرت کا ہوگا اس صورت میں اِمْرَاَتُهٗ مبتدا اور فِيْ جِيْدِهَا خبر ہوگی۔ اور اِمْرَاَتُهٗ کو سَيَصْلٰى کے فاعل کا معطوف قرار دیا جائے تو فِيْ جِيْدِهَا حال ہوگا۔ اور بہر دو صورت حَمَّالَةَ الْحَطَب منصوب بالذم ہوگا فِيْ جِيْدِهَا اس سے حال نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ دنیا کی حالت ہے اور فِيْ جِيْدِهَا آخرت کی حالت ہے۔ اور ذوالحال و حال کا زمانہ ایک ہونا چاہیے ہاں اگر حَمَّالَةَ الْحَطَبِ سے مراد دوزخ کے اندر زقوم کی لکڑیاں اٹھانے والی مراد ہو تو فی جیدھا کو اس سے حال بنا سکتے ہیں۔ اور اگر حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ

سے مراد معمولی رسی ہے تو فی جِیدِ ھا مبتدا محذوف کی خبر ہوگی۔ یا اِمْرَاَتُہٗ کی خبر ثانی ہوگی یا حَمَّالَۃَ الْحطب سے حال ہوگا فافہم۔

تنبیہ:...... حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ اور فِیْ جِیْدِھا کو اکثر مفسرین نے ان کے حقیقی معنی پر محمول نہیں کیا۔ کیونکہ ام جمیل اور ابولہب مالدار، اعلیٰ خاندان اور اونچے گھرانہ کے افراد تھے۔ ابولہب سردار قریش تھا۔ اسکی بیوی اتنا ذلیل وحقیر کام کرے کہ گلے میں رسی ڈالے پھرے اور لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھا کر لائے یہ عادۃً ممکن نہیں۔

المسئلۃ:...... واستد ل بقوله تعالیٰ ﴿وامرأته﴾ علیٰ صحة انكحة الكفار (فيمابينهم). والله تعالیٰ اعلم.

تم تفسير سورة اللهب فالحمدُ للهالخالق الرب والصلوٰة والسلام على رسوله الاكرم الاحب الذى طاعته علیٰ خلق الله وَّجب وعلیٰ اٰله المُتادِبين من اٰدابه كل ادب وعلیٰ كُلٍ من تبعهم واقترب.

سُورَةُالاِخْلاصِ

سُورَةُالاِخْلاصِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُ اٰياتٍ

(حروف ۴۷۔ رکوع ۱۔ سورۂ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی۔ اور اس میں چار اٰیات ہیں۔ اٰیات ۴۔ کلمات ۱۵)

یہ سورت جمہور مفسرین کے نزدیک مکیہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حسنؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ، مجاہدؒ اور قتادہؒ سے بھی یہی منقول ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ، محمد بن کعبؒ، ابوالعالیہؒ، سدیؒ اور ضحاکؒ وغیرہ سے منقول ہے کہ یہ مدنیہ ہے۔ اتقان میں علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ اس اختلاف کی بنیاد سبب نزول کی دو متعارض حدیثیں ہیں۔ بعض حضرات نے دونوں متعارض روایتوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ یہ سورت دوبار نازل ہوئی۔ ایک بار مکہ میں دوسری بار مدینہ میں پھر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس کا مدنیہ ہونا زیادہ راجح ہے۔

اسمائے سورت:

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اور علامہ سید محمد آلوسیؒ نے روح المعانی میں اس سورت کے بہت سے نام ذکر کیے ہیں۔

مثلاً۔ سوره توحيد سوره اساس، سورة التفريد، سورة التجريد، سورة النجاة، سورة الولاية، سورة المعرفة، سورة الجمال، سورة النسبة، سورة الصمد، سورة المعوذة، سورة المحضر، سورة المنفرة، سورة البرٰاء ة، سورة المذكرة، سورة النور، سورة الايما ن.

علامہ آلوسیؒ نے یہ اسماء اور روایات سے ان کی وجوہ تسمیہ ذکر کر کے فرمایا کہ ان اسماء میں سے اکثر امام رازیؒ نے ذکر کیئے ہیں اور وجوہ تسمیہ بھی ذکر کی ہیں۔ لیکن امام رازیؒ کو احوال مرویات کی معرفت حاصل نہیں۔ وہ صحیح وغیر صحیح حدیث میں تمیز نہیں کر پاتے۔ اور نہ اس کی کوئی پرواہ کرتے ہیں بلکہ ان کو جیسی روایت مل جائے لکھ ڈالتے ہیں کیونکہ وجوہ تسمیہ کی روایات اکثر ضعاف یا موضوعات تھیں اسلیئے ہم نے سب کو چھوڑ دیا ہے، جس کا جی چاہے تفسیر کبیر میں دیکھ لے۔

ربط و مناسبت:

اس سورت کا سورۂ لہب سے یہ ربط ہے کہ ابولہب وعمائد قریش بلکہ جملہ مشرکین بلائے شرک میں اسلئے مبتلا ہوئے کہ ان کو عرفانِ خداوندی حاصل نہ تھا۔ یہی ابولہب اور اس جیسے تمام لوگوں کی تباہی و بربادی کا باعث ہے، اس سورت میں اس تباہی سے بچنے کا راستہ (معرفت خداوندی) بیان کیا گیا۔ نیز سورۂ کافرون میں جس ذاتِ عالی کی عبادت کا اقرار اور اس پر بجا اصرار کا بیان کیا گیا۔ اس کے بعد اس ذات کے کامل اوصاف بیان کر دینا مقتضائے رحمت واتمام حجت ہے۔ جو نہ مانے وہ فیض کوثر اور فتح ونصر سے محروم رہ کر ابتر بنے اور محرومی کے ساتھ ابولہب والی بلا میں گرفتار ہو۔

سورہ اخلاص گو فواصل اور عبارت کے طرز کے اعتبار سے سورۂ لہب کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے سورۂ کافرون سے زیادہ مربوط ہے۔ یہ دونوں سورتیں نفی واثبات میں کلمہ توحید کی طرح ہیں۔ اسی بنا پر ان دونوں سورتوں کو مقشقشتان کہتے ہیں (قشقش ای صح وبرأ المریض) اور شاید اسی وجہ سے بہت سی نمازوں میں ان دونوں کا پڑھنا منقول ہے مثلاً فجر کی دوسنتوں میں، سفر کی فجر میں، لیلۃ الجمعہ کی مغرب میں، طواف کی دو رکعتوں میں، صلوٰۃ الضحیٰ میں مغرب کی دوسنتوں میں۔

شانِ نزول:

ترمذی، حاکم وغیرہ کی روایت میں ہے کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ کا نسب پوچھا تھا۔ ان کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ مشرکین کے سوال میں یہ بھی تھا کہ اللہ کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ سونے کا یا چاندی کا یا اور کسی چیز کا۔ بعض روایات میں ہے کہ کسی اعرابی (گنوار) نے یہ سوال کیا تھا تب یہ سورت نازل ہوئی دوسری بعض روایات میں ہے کہ سوال یہود مدینہ کعب بن اشرف، حی بن اخطب وغیرہ نے کیا تھا کہ آپ اپنے رب کے اوصاف ہم سے بیان کریں اس پر یہ سورت اتری۔ محدثین نے اس سوال کو اپنی اپنی کتابوں میں مختلف الفاظ واختلاف مضامین کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام احمدؒ نے اپنی مسند میں، امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں حاکمؒ نے مستدرک میں اور ابن خزیمہؒ نے ابن ابی کعبؓ سے روایت ذکر کی ہے کہ مشرکین نے پوچھا تھا۔

حاکم وترمذیؒ نے ابوالعالیہؒ سے یہی روایت نقل کی طبرانیؒ، بیہقی اور ابونعیمؒ نے جابرؓ سے روایت کیا کہ کسی اعرابی نے یہ سوال کیا تھا اور بیہقی وغیرہ نے علمائے یہود کا سوال ذکر کیا ہے۔ اسی لئے اس سورت کے مکی ومدنی ہونے میں بھی اختلاف ہے جیسا کہ مذکور ہوا، ممکن ہے مشرکین یا اعرابی کے سوال پہ مکہ میں اس کا نزول ہوا ہو پھر علمائے یہود کے سوال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو پڑھ کر سُنا دیا ہو، مفسرین کے نزدیک کسی سوال کے جواب میں کسی سورت یا آیت کو پڑھ کر سنا دینے کو بھی نازل ہونے سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اس طرح روایات کا اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فضائلِ سُورت:

اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید اس سورت میں تفصیل سے مذکور ہے غالباً قرآن مقدس کے خاتمہ پر اسی اہمیت کے پیش نظر اس سورت کو رکھا گیا ہے۔ باقی اسکے بعد کی دو سورتیں سورۂ فلق وسورۂ ناس بطور تتمہ ہیں جن میں ہر قسم کے شرور سے خصوصاً ان شرور سے جو توحید واعتقاد میں فرق ڈال سکتے ہیں پناہ مانگنے کا حکم مذکور ہے جس میں اشارہ ہے کہ توحید واعتقاد صحیح پر قائم رہو۔ اور خطرات ووساوس کو دل میں جگہ نہ دو بلکہ ان سے ہماری حفاظت وپناہ طلب کرتے رہو۔ اس سورت کی فضیلت کے لئے یہی

بہت کافی ہے کہ یہ سب سے بڑی بنیادی اور افضل ترین چیز کو حاوی ہے۔

اس کے باوجود بہت سی احادیث میں اسکی فضیلت مذکور ہے جن میں سے چند حسب ذیل ہیں: (۱) ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ سب جمع ہو جاؤ میں تمہیں ایک تہائی قرآن سُناؤں گا تو جو جمع ہو سکتے تھے۔ وہ سب جمع ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ**...... کی تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ یہ سورا یک تہائی قرآن کی برابر ہے۔ (۲) امام بخاریؒ وامام احمدؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ (۳) احمدؒ ونسائیؒ وغیرہ نے روایت کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے یہ سورت پڑھی گویا اس نے ایک تہائی قرآن پڑھا۔ (۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اس بات سے عاجز ہے کہ رات میں ایک تہائی قرآن پڑھ لیا کرے۔ صحابہؓ نے عرض کیا ایک تہائی قرآن کیسے پڑھا جا سکتا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ** ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ (بخاری ومسلم)

(ف) روح المعانی میں اس سورت کے ایک تہائی قرآن کے برابر ہونے کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن میں تین قسم کے مضامین ہیں۔ توحید وصفات، افعال عباد، موت مابعد الموت، اول الذکر مضمون پر یہ سورت مشتمل ہے۔ رہی ثواب کی بات تو ثواب ایک اصولی ہے۔ وہ تو قرآن کی تمام آیات وسور کا برابر ہے ایک تفصیلی ثواب ہے جسمیں بعض آیات اور سورتوں کا دوسری آیات وسورت سے بڑھ کر ثواب ہے۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر کو ایک جہاد میں روانہ کیا تو ان کا امام سب نمازوں میں سورۂ اخلاص ہی پڑھتا رہا۔ واپسی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا، آپ نے فرمایا کہ اس سے پوچھو اس نے ایسا کیوں کیا معلوم کرنے پر امام صاحب نے بتایا کہ اس سورت میں صفت رحمٰن ہے اور میں اس کی تلاوت سے محبت رکھتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو اطلاع کر دو کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم) (۶) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اس سورت **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ** سے محبت کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تیرا اس سورت سے محبت کرنا تجھ کو جنت میں داخل کریگا۔ (بخاری وترمذی) (۷) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب روزانہ رات کو آرام فرمانے کے لئے بستر پر تشریف لاتے تو **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ**، **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ** اور **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس** پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کرتے اور جہاں تک ہاتھ پہونچتے اپنے بدن پر ان کو پھیر لیتے۔ سر، چہرہ اور اپنے بدن کے اگلے حصہ سے ابتداء فرماتے تھے۔ اس طرح تین بار کرتے۔ (بخاری ومسلم) (۸) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو سونے کا ارادہ کرے تو اپنے بستر پر داہنی کروٹ لیٹے۔ پھر ۱۰۰ بار **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ** پڑھے تو قیامت کے دن رب تعالیٰ اس سے ارشاد فرمائیں گے اے میرے بندے اپنی داہنی جانب سے جنت میں چلا جا۔ (ترمذی) (۹) نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ ایک شخص **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ** پڑھ رہا ہے تو آپ نے فرمایا واجب ہوگئی (راوی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا کیا واجب ہوگئی؟ آپ نے فرمایا جنت واجب ہوگئی۔ (مالکؒ وترمذیؒ ونسائیؒ) (۱۰) حضرت عبداللہ بن خبیبؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک بارش والی سخت اندھیری کی رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرنے کے لئے نکلے تو جب ہم نے آپ کو پالیا تو ارشاد فرمایا کہو! میں نے عرض کیا: کیا کہوں؟ فرمایا **قُلْ**

ھُوَ اللّٰہُ اَحَد" اور معوذتین ہر صبح وشام تین تین بار ان کو پڑھا کرو، تم کو ہر چیز سے کافی ہے۔ (ترمذی وابوداؤدونسائی) (۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا زُلْزِلَتْ آدھے قرآن کی برابر ہے۔ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَد تہائی قرآن کی برابر ہے اور قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ (ترمذی) (۱۲) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص روزانہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۲۰۰ دوسو بار پڑھ لیا کرے اس کے پچاس سال کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے مگر یہ کہ اس کے ذمہ کسی کا قرض ہو۔ (ترمذی، دارمی وغیرہ) (۱۳) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص دس بار قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَد پڑھ لے اس کے لئے جنت میں ایک عظیم الشان محل تیار کیا جاتا ہے۔ اور جو بیس مرتبہ پڑھ لے تو جنت میں دو محل بنادیئے جاتے ہیں اور جو تیس مرتبہ پڑھ لے تو جنت میں تین محل تیار کردیئے جاتے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر تو ہم اپنے محلات بہت بنوالیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حق تعالیٰ بہت زیادہ وسعت والے ہیں (دارمی) (۱۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم کو ایسی تین سورتیں بتاتا ہوں جو توراۃ انجیل، زبور اور قرآن (سب ہی کتابوں) میں نازل ہوئی ہیں اور فرمایا کہ رات کو اس وقت تک نہ سوؤ جب تک ان تینوں (قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَد اور معوذتین) کو نہ پڑھ لو۔ (راوی حدیث) حضرت عقبہؓ کہتے ہیں کہ اس وقت سے میں نے کبھی ان کو نہیں چھوڑا۔ (ابن کثیر عن احمد)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱) اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۲) لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (۳) وَلَمْ

آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ اسکے اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہ

لَمْ	وَ	يُوْلَدْ	لَمْ	وَ	يَلِدْ	لَمْ	الصَّمَدُ	اَللّٰهُ	اَحَدٌ	اللّٰهُ	هُوَ	قُلْ
نہیں	اور	جنا گیا	نہ	اور	جنا اس نے	نہیں	بے احتیاج	اللہ	ایک	اللہ	وہ	کہہ

يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۴)

کوئی اس کے برابر ہے۔

اَحَدٌ	كُفُوًا	لَّهٗ	يَكُنْ
کوئی	برابری کرنے والا	واسطے اس کے	ہے

لغات:

اَحَدٌ ایک، اکیلا پہلا، یکتا، مؤنث اِحْدٰی کہا جاتا ہے فُلَانٌ اَحَدُ الْاَحَدِیْنَ فلاں بے مثل ہے۔ اِحْدَی الْاَحَد بڑا عجیب معاملہ اَحَد: کا استعمال کبھی نفی میں ہوتا ہے، کبھی اثبات میں، نفی کی صورت میں استغراق جنسی کے لئے آتا ہے۔ یعنی پوری جنس کی نفی ہوتی ہے۔ خواہ قلیل ہو یا کثیر، مجتمع طور پر ہو جیسے ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْھُمْ﴾ (منافقوں میں سے کسی پر بھی نماز نہ پڑھئے) اور اس معنی میں احد کا استعمال صرف نفی کی حالت میں درست ہے اثبات

میں درست نہیں، کیونکہ دو متضاد چیزوں کی نفی تو صحیح ہے لیکن اثبات صحیح نہیں ہوسکتا۔ اثبات کی حالت میں اس کا استعمال تین طرح ہوتا ہے۔

(۱) دہائیوں پر ایک کے اضافہ کے لئے جیسے ۱۱، ۲۱، ۳۱، ۴۱، وغیرہ میں اَحدَ عَشرَ، اَحدٌ وَّعِشرُونَ، اَحدٌ وَّثلٰثُونَ وغیرہ وغیرہ (۲) مضاف یا مضاف الیہ ہوکر جیسے احد کما، علیٰ راس احد کم (۳) معنی وصفی کے لئے یعنی اکیلے اور یکتا کے معنی میں۔ اس صورت میں اس کا استعمال صرف اللہ ہی کے لئے جائز ہے جیسے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ احدٌ﴾ اَلصَّمَدُ: بے نیاز، بے احتیاج جو کھاتا پیتا نہ ہو۔ اسکے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے عنوان تفسیر میں ملاحظہ فرمائیے صَمَدَ صَمداً (ن ض) قصد کرنا، ارادہ کرنا، اعتماد کرنا، جھلس دینا، بند کرنا، کُفُواً: ہمسر، مرتبہ میں برابر جمع کِفَاءٌ اکْفَاءٌ، کَفَأَ کَفأً (ف) الٹ دینا، جھکا دینا، شکست کھانا، پشت پھیر کر بھاگنا۔ (لازم ومتعدی)

ترکیب:

قُلْ فعل بافاعل۔ هُوَ ضمیر شان یعنی اس کا کوئی محل اعراب نہیں، بعض کہتے ہیں کہ یہ مبتدا ہے۔ اللّٰهُ اَحَدٌ مبتدا وخبر جملہ اسمیہ خبریہ، ضمیر شان کی تفسیر یا هُوَ مبتدا کی خبر، جملہ مقولہ مفعول بہ، جملہ فعلیہ، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ هُوَ مبتدا اور اللہ اور اَحد دونوں خبریں ہوں اللّٰهُ الصَّمد مبتدا وخبر، جملہ اسمیہ۔ لَمْ یَلِدْ فعل فاعل جملہ فعلیہ معطوف علیہ وَلَمْ یُوْلَدْ جملہ فعلیہ معطوف وَلَمْ یَکُنْ فعل ناقص اَحَدٌ اسم مؤخر۔ کُفُواً اپنے متعلق مقدم لَهٗ سے ملکر خبر مقدم جملہ فعلیہ معطوف وتاخیر الاسم لمراعاۃ السّجع.

تفسیر:

قُلْ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو ہدایت کا حکم ہوا ہے۔ اس لفظ کو سنکر مخاطب کو شوق وانتظار بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ دیکھئے عالم غیب سے اسکے بعد کیا ارشاد ہوتا ہے۔ نیز جو مضمون اس سے آگے آنے والا ہے یہ لفظ اس کی عظمت واہمیت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اللّٰه یہ لفظ اس ذاتِ گرامی کا علم ہے جو واجبُ الوجود، تمام صفاتِ کمالیہ کو جامع اور تمام عیوب ونقائص سے پاک ہے یہ جمہور اہل سنت کا مسلک ہے، معتزلہ اس کو علم نہیں مانتے۔ اَحَدٌ احد اور واحد ترجمہ دونوں لفظوں کا ایک ہی کیا جاتا ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے لفظ اَحد میں یہ بھی ہے کہ وہ ترکیب وتجزیہ اور تعدد سے اور کسی چیز کی مشابہت ومشاکلت سے پاک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ ذاتِ حق جل مجدہٗ پر بولا جاتا ہے۔ اور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کسی ایک یا متعدد مادوں سے نہیں بنا نہ اس میں تعدد وترکیب کا کوئی امکان ہے نہ وہ کسی کے مشابہ ہے، اس میں ان لوگوں کا جواب ہوگیا جو اللہ تعالیٰ کے متعلق سوال کرتے تھے کہ وہ سونے کا ہے یا چاندی کا؟ یا اور کسی دھات کا، اس ایک مختصر سے جملہ میں ذات وصفات کے سب مباحث آگئے۔ اور لفظ قُلْ میں نبوت ورسالت کا مسئلہ آگیا اگر غور کیا جائے تو یہ مختصر جملہ ان تمام عظیم الشان مباحث کو جامع وحاوی ہے جو بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں لکھے جاتے ہیں اس مقام پر طویل تفسیروں میں ان مباحث کو لکھا بھی گیا ہے۔ ہماری مختصر کتاب ان کی متحمل نہیں۔

فائدہ...... لفظ ﴿هو﴾ میں دو احتمال معلوم ہو چکے ہیں کہ یا تو وہ ضمیر شان ہے جس کا کوئی مرجع نہیں ہوتا بلکہ

مابعد کا جملہ اسی کی وضاحت وتفسیر کرتا ہے تو اللہُ احد اس کی تفسیر ہے۔ یا لفظ ﴿ھو﴾ ضمیر ہے اس کا مرجع وہ رب ہے جو سائلین کے سوال میں مذکور تھا اس صورت میں اللہ احدٌ اس کی خبر ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں اشکالات ہیں۔

(۱) لفظ اللہ معین ذات کا علم ہے جو خالق، مالک، رازق اور رب ہے وغیرہ وغیرہ وضع کے اعتبار سے اس میں کثرت وعموم کا احتمال ہی نہیں۔ کیونکہ یہ جزئی حقیقی ہے۔ اور جزئی حقیقی میں کثرت کا احتمال ناممکن ہوتا ہے۔ اسکے بعد احدٌ کہنا ایسا ہی ہوا جیسے زیدٌ زیدٌ عمرٌ وعمرٌو۔ اللہ اللہ یعنی زید زید ہے عمرو عمرو ہے اللہ اللہ ہے۔ اس کلام کا غیر مفید ہونا ظاہر ہے، کیونکہ ہر چیز اپنی ذات کا عین ہوتی ہے اہل منطق کی اصطلاح میں اس کو حمل اولی اور حملِ غیر مفید کہتے ہیں اس لئے یہ کہنا پڑیگا کہ لفظ اللہ میں احتمالِ کثرت تھا اور احدٌ کہنے کے بعد اس احتمال کثرت کو رد کر دیا گیا۔ وضاحت اس کی یہ ہے کہ لفظ اللہ کی لفظی وضع ذاتِ واجب الوجود کے لئے خواہ وہ ایک ہو یا متعدد، یہ لفظ وحدتِ شخصیہ پر اصل کے اعتبار سے دال نہیں۔ گویا یہ لفظ اصل وضع میں جزئی حقیقی نہیں بلکہ وضع کے اعتبار سے کلی ہے مگر عقل بتا رہی ہے کہ چند واجب الوجود کا وجود ممکن نہیں۔ اس لئے اس کا حصر ہی ذات میں ہو گیا۔ اور کسی ذات کا اللہ ہونا محال ہے۔ اس طرح لفظ اللہ کے بعد اَحدٌ کا ذکر مفید ہو گیا (مظہری)

لیکن یہ جواب جمہور اہل سنت کے مسلک پر چسپاں نہیں ہوتا جو لفظ اللہ کو اسم ذات (علم ذاتی) اور جزی حقیقی مانتے ہیں۔ اسلئے یہاں صاف بات یہ ہے کہ سائلین نے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق سوالات کئے تھے کہ وہ کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ یا اس کے اوصاف کیا ہیں؟ لفظ اللہ میں ان جملہ احتمالات کو ملحوظ رکھ کر احدٌ سے ان سب کی تردید کی گئی۔ اور لفظ اللہ اسم ذات کو ذکر کر کے احدٌ کے لفظ سے اس کی جملہ صفات کو ایک لفظ اَحدٌ میں بیان کر دیا گیا ہے مثلاً کوئی جاہل آدمی کسی سے سوال کرتا ہے کہ بادشاہ لوہے کا ہے یا لکڑی کا ہے وغیرہ تو جواب دیا جاتا بادشاہ ملک کا مالک ہے۔ مفہوم دونوں اجزاء کا ایک ہے۔ مگر پھر بھی مفید ہے۔ اسی طرح کوئی کہے زید کی صفت کیا ہے تو کہتے ہیں زید عالم ہے۔ اور بالفرض زید کے سوا کوئی عالم نہیں تو عالم اور زید دونوں کا اطلاق ایک ہی ذات پر ہوگا۔ اس کے باوجود کہ یہ ترکیب مفید ہے۔ رہی منطقیوں کی اصطلاح تو ان کے قواعد سب ریت کے محل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس میں ذاتِ خداوندی کے لئے وصف احدیت کو ثابت کیا گیا جو سرے سے موجب اشکال ہی نہیں۔ بلکہ اس سے مسلک جمہور کی تائید ہوتی ہے کہ لفظ اللہ اسم ذات (علم) ہے فافہم۔

(۲) ھو کو ضمیر شان مانو یا وہ ضمیر جس کا مرجع رب ہے، بہر دوصورت یہ اشکال ہوگا کہ یہ جواب سوال کے مطابق نہیں۔ کیونکہ سائلین کا سوال توحید وتعدد کے متعلق نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ان کو آواز بلند لا الہ الا اللہ کے ذریعہ توحید کی دعوت دے رہے تھے۔ سوال تو اللہ کی حقیقت کے متعلق تھا یا اس کے اوصاف کے متعلق۔ اور جواب میں نہ تو حقیقت ترکیبیہ واقع ہے، نہ اوصاف وصفات؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں لفظ احد سے مراد صرف توحید نہیں، بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے مادہ واجزاء ترکیبیہ اور تعدد ولوازم جسمانیت اور ہیئت وضع وتحیز سے پاک ہے۔ نہ اپنی حقیقت میں کسی چیز کے ساتھ شریک ہے نہ کسی صفت کمال میں کوئی چیز اس کے مشابہ ہے۔ الحاصل وہ اپنی ذات وصفات میں بے نظیر اور بے مثل وبے مثیل ہے۔ نہ اسکی کوئی ضد ہے نہ ند، لَیسَ کَمِثلِہٖ شیءٌ فی الارض ولا فی السمآءِ۔ اللہ کا وجود اصل وحقیقی ہے اور ممکنات کا وجود اس کے سایہ کی طرح ہے۔ اسی طرح صفات باری اصلی وحقیقی ہیں۔ اور صفاتِ ممکنات ان کا پرتو، صفاتِ باری کے ساتھ نام کی شرکت ہے حقیقی اشتراک نہیں۔ اسی لئے صوفیہ کرام لا الہ الا اللہ کے معنی لا موجود الا اللہ بتاتے ہیں۔

اللہُ الصمد (۱) حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ، اور شعبیؒ نے کہا کہ صمد وہ ہے کہ جس کے جوف یعنی شکم نہ ہو۔ یعنی جو کھائے نہ پیئے۔ حضرت بریدہؓ سے بھی یہی منقول ہے۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ صمد وہ ہے جسکے آنتیں نہ ہوں۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ صمد وہ ہے جو کھانا نہ کھائے (۲) حضرت ابن ابی کعب حضرت ربیع بن انسؓ اور بہت سے علماء نے کہا کہ صمد: لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ہے یعنی اس کا مابعد اس کی تشریح ہے کیونکہ جو پیدا ہوگا وہ مریگا، جو وارث ہوگا، دوسرا اس کی وراثت پائیگا۔ (۳) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ صمد وہ سردار ہے جس پر سرداری ختم ہوگئی ہو۔ وہ شریف ہے جس پر شرافت ختم ہو۔ وہ عظیم ہے جس پر عظمت کی انتہاء ہوگئی ہو۔ وہ علیم ہے جس پر کمال علم ختم ہوگیا۔ ہو وہ حکیم ہے جسکی حکمت بے انتہاء ہو اور سرداری و شرافت کی تمام انواع اس پر منتہی ہوگئی ہوں۔ (۴) صمد وہ ہے جو کسی کا محتاج نہ ہو اور اس کے سب محتاج ہوں (۵) سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے کہ صمد وہ ہے جو تمام افعال و صفات میں کامل ہو (۶) ربیع کہتے ہیں صمد وہ ہے جس پر آفات نہ آئیں۔ (۷) مقاتل بن حبانؒ کہتے ہیں کہ صمد وہ ہے جس میں کوئی عیب نہ ہو (۸) حضرت علیؓ و عکرمہؒ کہتے ہیں صمد وہ ہے جس کے اوپر کوئی نہ ہو (۹) قتادہؒ کہتے ہیں صمد وہ ہے جو اپنی مخلوق کے بعد بھی باقی رہے۔ (۱۰) معمرؒ کہتے ہیں صمد وہ ہے جو ہمیشہ رہے (۱۱) مرہ ہمدانی کہتے ہیں صمد وہ ہے جو نہ پرانا ہو نہ فنا ہو (۱۲) ہمدانی ہی کہتے ہیں کہ صمد وہ ہے کہ جو چاہے حکم کرے اور جو چاہے کرے اس کے حکم کو کوئی روک نہ سکے۔ اور اس کے فیصلہ کو کوئی رد نہ کر سکے۔ (۱۳) علامہ خازنؒ نے لکھا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ صمد کو ان تمام معانی پر محمول کیا جائے جو اسکے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر ایک معنی کا محتمل ہے۔ واضح رہے جیسا پہلے معلوم ہو چکا کہ صمد کے لغوی معنی قصد کرنے کے ہیں۔ اور صمد اسی سے بروزن فعلٌ صیغہ صفت بمعنی مفعول (مقصود) ہے تو لغت کے اعتبار سے تو وہی معنی ہیں جو ائمہ لغت نے بیان کئے یعنی **الصمد السید الذی یصمد الیہ** (صمد وہ سردار ہے جس کی طرف تمام حوائج و معاملات میں قصد کیا جائے) دوسرے صمد کے معنی لغت میں ٹھوس کے بھی ہیں۔ یعنی جس پر کوئی تغیر نہیں آتا ہو، قوی و مستقل ہو۔ اس صورت میں بمعنی واجب الوجود ہوگا اسی کو صاحب روح المعانی نے ترجیح دی ہے اور مذکورہ تمام معانی اسی میں داخل ہیں۔ ملا علی قاریؒ محدث حنفی نے الحرز الثمین شرح الحصن الحصین میں ان تمام مذکورہ معانی کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے **وحاصلهٗ الغنی المغنی الذی لایحتاج الیٰ شیء ویحتاج الیہ کل واحد** (حاصل یہ ہے کہ صمد وہ ذات غنی و مغنی ہے جس کو کسی شیء کی احتیاج نہ ہو اور ہر ایک کو اس کی احتیاج ہو) صاحب مظہریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صمد کے معنی مقصود کے ہیں سردار کو بھی صمد اسی لئے کہتے ہیں کہ رعایا اس کا قصد کرتی ہے۔ الصمد کا الف لام اس بات کو بتا رہا ہے کہ وہ صمدیت کے اس اعلیٰ مقام پر ہے جہاں کسی اور کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اقوال مذکورہ بالا میں لفظ صمد کی جتنی تشریحات کی گئی ہیں وہ صمد کے اصل معنی (مقصود) کے لوازم ہیں۔ مقصودِ مطلق صرف حق جل مجدہٗ ہو سکتا ہے جس کے سب محتاج ہیں۔ اور وہ کسی کا محتاج نہیں لامحالہ اس میں تمام کمالات ہوں گے۔ اور وہ ہر طرح کے عیوب و نقائص سے مبرا ہوگا۔ ہر طرح کی سیادت اور حقیقی قدامت اسی کو حاصل ہوگی۔ وہ ہر قسم کے تغیرات و آفات والد و ولد اور ہم جنس و ہمسر سے منزہ و پاک ہوگا۔ (مظہری)

امام حدیث طبرانیؒ نے کتاب السنہ میں بھی ان تمام اقوال کو جمع کر کے فرمایا ہے کہ یہ سب صحیح ہیں۔ ہمارے رب کی صفات ہیں۔ لیکن صمد کے اصل معنی یہ ہیں کہ سب اس کے محتاج ہوں۔ اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ اور بڑائی اور سرداری میں ایسا ہو کہ اس سے بڑا کوئی نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ سب اس کے محتاج ہوں وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ (ابن کثیر)

فائدہ......سابقہ تشریحات سے یہ بات روشن ہوگئی کہ اللہُ اَحَدٌ کہنے کے بعد اللہُ الصمد اور اسکے مابعد والے جملوں کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اللہ احدٌ میں یہ تمام معانی موجود ہیں۔لیکن بطور عطف الخاص علی العام ان جملوں کو مزید تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔تاکہ قوت کے ساتھ تنزیہہ باری کا اظہار ہوجائے۔اور جولوگ توحید کے منکر تھے یا انہوں نے ماسوی اللہ کو اپنا مقصود قرار دے رکھا تھا۔یا اللہ کے اولاد (جیسے نصاریٰ مسیح کو یہود عزیر کو اللہ کا بیٹا اور مشرکین مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں) قرار دیتے تھے ان سب کی صریح اور واضح تردید ہوجائے۔اسی لئے اللہُ الصمد کے بعد والے جملوں کی بطور عطف ذکر کیا گیا۔اور اللہُ الصمد کہا گیا ہے یعنی اس میں لفظ اللہ کو دوبارہ لایا گیا حالانکہ قیاس ضمیر کو چاہتا تھا۔اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ جو وصف صمدیت سے متصف نہیں وہ معبودیت کا مستحق نہیں اسی لئے صوفیہ لاالہ الااللہ کے معنی **لامقصود الااللہ** بھی کرتے ہیں کیونکہ وہ ہی مقصود ہے اور وہی معبود ہے۔اس لئے صوفیہ ذکر کرتے وقت غیر اللہ سے مقصودیت کی نفی کرتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ ماسوی اللہ کی مقصودیت کا خیال بھی ان کے قلب سے دور ہوجائے۔

فائدہ:......والتعریف فی الصمد لافادۃ الحصر کقولک زید الرجل و لاحاجۃ الیہ فی الجملۃ السابقۃ بناء علی ان مفہوم احد المنزہ عن انحاء الترکیب و التعدد مطلقاً وقیل ان احد فی غیر النفی و العدد لایطلق علی غیرہ تعالیٰ فلم یحتج الیٰ تعریفہ بخلاف الصمد فانہ جاء فی کلامھم اطلاقہ علیٰ غیرہ .و اللہ اعلم .

لَمْ يَلِدْ ...... اس میں ان کفار کی واضح تردید ہے جو اللہ کے لئے ولد ثابت کرتے تھے جیسے نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہود عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے اور مشرکین مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے) فرمایا کہ اللہ کسی کا والد نہیں کیونکہ (۱) ولادۃ انفصالِ مادہ کو چاہتی ہے۔اور انفصال ترکیب کا متقاضی ہے جو احدیت وصمدیت کے منافی ہے۔(۲) ولد والد کا ہم جنس ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم جنس نہیں کیونکہ وہ واجب ہے اور اسکا ہر ماسویٰ ممکن ہے۔(۳) ولد والد کا مثل معین ومددگار ہوتا ہے۔اور اللہ کا کوئی مثل ومعین ومددگار نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ محتاج نہیں اعانت محتاج کی کیجاتی ہے۔(۴) ولد والد کا جانشیں ہوتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ دائم وباقی ہے۔اس کو قائم مقام کی ضرورت نہیں فانی ہی کا جانشیں ہوسکتا ہے باقی کا نہیں۔(۵) ولد کے لئے زوجہ کی احتیاج ہوتی ہے ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ﴾ اللہ تعالیٰ صمد ہے ہر احتیاج سے بری ہے۔

حکایت:

انگریز نے ہندوستان آکر مروجہ عیسائیت کی تبلیغ شروع کرائی اور اسکے لئے یورپ سے پوپ اور پادری بلائے۔ ہمارے اکابر نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کو ہندوستان سے بھگادیا۔عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں ایک مرتبہ دہرہ دون میں ان کا جلسہ ہوا۔پادری نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور اسکو بہت شدومد سے بیان کیا۔اتفاق سے کوئی عالم اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ایک بھٹیارہ جو روٹی پکار ہا تھا سنتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ کوئی جواب دے لیکن جب کوئی جواب دینے والا سامنے نہ آیا تو وہ بھٹیارہ ہاتھ جھاڑ کر اس پادری کے سامنے آکھڑا ہوا اور کہا کہ پادری صاحب مجھے کچھ آپ سے پوچھنا ہے لیکن میں جاہل آدمی ہوں، بھٹیارہ ہوں، روٹی پکاتے ہوئے اٹھکر آیا ہوں جواب ایسا دینا کہ میری سمجھ میں آجائے یعنی جواب علمی انداز کا نہ ہو۔پادری نے وعدہ کیا، بھٹیارہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی عمر ہے۔پادری نے کہا وہ ازل سے ہے

ابد تک رہیگا۔ بھٹیارہ نے کہا کہ میں ازل ابد کونہیں جانتا مجھے تو یہ بتادو کہ وہ کتنے برس کا ہے؟ پادری نے کہا اچھا تو یہ سمجھ لے کہ ایک لاکھ برس کا ہے، بھٹیارہ نے کہا کہ اب میری سمجھ میں آ گیا۔ اب یہ بتادو کہ اسکے کتنی اولاد ہے؟ پادری نے کہا کہ اسکا بس ایک بیٹا ہے عیسیٰ بھٹیارہ نے کہا مجھے دیکھو میں صرف ساٹھ سال کا ہوں اور میرے دس بیٹے ایسے ہیں کہ اگر تیرے ان میں سے کوئی ایک تھپڑ مار دے تو منہ پھر جائے۔ اب تو بتا کہ تیرا خدا زیادہ طاقتور ہے یا میں۔ پادری لاجواب ہوکر بھاگ گیا۔ یہ واقعہ کسی نے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے آ کر بیان کیا مولانا نے فرمایا سبحان اللہ! اللہ کی شان بھی عجیب ہے وہ کسی سے بھی کام لے لیتا ہے۔ اتنی اونچی دلیل اس نے ایک بھٹیارہ کے دماغ میں ڈالدی۔ اس کو علمی انداز میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو ابوت کی صفت باری تعالیٰ کے لئے اچھی صفت ہے یا بری اگر اچھی ہے تو جس طرح اللہ کی اور صفات بے انتہاء ہیں اسی طرح یہ بھی ایسی ہی ہوتی۔ اور اللہ کی اولاد ایک نہیں بلکہ بے انتہا ہوتی۔ اور اگر یہ بُری صفت ہے تو اللہ کے لئے ایک بیٹا بھی عیب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے منزہ اور پاک ہے۔

(ف) یہاں لَمْ یَلِدْ صیغہ ماضی فرمایا گیا لَنْ یَلِدَ نہیں فرمایا گیا کیونکہ اس میں نصاریٰ، یہود اور مشرکین کی تردید مقصود ہے۔ (گو اللہ کا والد نہ ہونا دوامی ہے) یہ بھی ممکن ہے کہ مراد استمرار نفی ہو۔ اور ماضی سے بطور مشاکلت تعبیر کردیا گیا ہو۔ کیونکہ آئندہ جملہ ماضویہ ہے۔ اور اس کا ماضی ہونا ضروری ہے۔ ورنہ معنی فاسد ہوجائیں گے۔

وَلَمْ یُوْلَدْ ...... اور نہ وہ کسی کا جنا ہوا ہے۔ کیونکہ ہر مولود حادث ہوتا ہے۔ اور اللہ حدوث سے پاک ہے۔ حدوث اُلوہیت احدیت اور صمدیت کے بھی منافی ہے۔ نیز مذکورہ خرابیاں (ترکیب، مجانست وغیرہ) بھی لازم آتی ہیں۔ علاوہ ازیں عدم کے بعد موجود ہونا لازم آتا ہے اور یہ سب باتیں ناممکن ہیں۔ اس جملہ میں ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے اللہ کے نسب نامہ کا سوال کیا تھا۔ یعنی اسکو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جو توالد و تناسل سے وجود میں آتی ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے نہ کوئی اس کی اولاد۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ...... یعنی نہ کوئی اس کا مثل و مماثل ہے۔ نہ کوئی اس سے مشاکلت و مشابہت رکھتا ہے لَهٗ کی تقدیم حصر و تخصیص کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ بے مثل صرف اللہ کی ذات ہے۔ گو اس تقدیم میں رعایتِ فاصلہ بھی ملحوظ ہے کما مر۔ اخیر کے تین جملوں کو بطور عطف شاید اس لئے لایا گیا کہ ہر قسم کی مماثلت کی نفی بالقصد اور مستقلاً ہوجائے کیونکہ مماثلت ولد یا والد یا نظیر سے ہوتی ہے۔ **فلتغاير الاقسام واجتماعها في المقسم لزم العطف فيها. فافهم؟**

(ف ا) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے والے مشرکین و منکرین توحید اور کفار کی دنیا میں بہت سی قسمیں ہیں اس سورۂ اخلاص نے ان سب کی تردید کی اور توحید خالص کا سبق دیا ہے، کفار کا ایک گروہ تو اللہ کے وجود ہی کا منکر ہے۔ بعض وجودِ باری کے تو قائل ہیں وجوبِ وجود کے منکر ہیں۔ بعض دونوں کو مانتے ہیں مگر صفاتِ کمالیہ کے منکر ہیں۔ بعض یہ سب کچھ مانتے ہیں مگر پھر عبادت میں غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ ان سب کے خیالات باطلہ و اعتقاداتِ فاسدہ کی تردید اَللّٰهُ اَحَدٌ میں ہوگئی۔ بعض لوگ عبادت میں شریک نہیں ٹھہراتے۔ مگر غیر اللہ کو حاجت روا اور کارساز قرار دیتے ہیں۔ (جیسے مبتدعین) ان کے خیال کا رد اَللّٰهُ الصَّمَدُ کے ذریعہ کردیا گیا۔ بعض لوگ اللہ کے لئے اولاد کے قائل ہیں۔ ان کا رد لَمْ یَلِدْ سے ہوگیا۔ بعض اس وہم میں مبتلا ہیں کہ جب سب کسی نہ کسی سے پیدا ہوئے تو اللہ بھی کسی سے پیدا ہوا ہوگا۔ اس شیطانی وسوسہ کا جواب وَلَمْ یُوْلَدْ سے دیدیا گیا۔ اور اخیر کے جملہ نے ان سب کو خوب واضح کردیا۔ پھر اگر آپ غور کریں تو ہر بعد کا

جملہ پہلے جملہ کی وضاحت بھی ہے اور دلیل بھی ہے اور یہ سب حقائق صرف لفظ احد کے عموم میں موجود ہیں۔ جیسا کہ پہلے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ اس کی پوری تفصیل روح المعانی وتفسیر حقانی وغیرہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

(ف ۲) عیسائیوں کا ایک فاسد عقیدہ تثلیث ہے وہ کہتے ہیں کہ اقانیم ثلثہ سے ملکر ایک خدا ہے اور تینوں اقنوم برابر (کے خدا) ہیں گو اس میں ان کے تین فرقے ہیں کہ وہ اقانیم کون کون سے ہیں۔ ایک فرقہ یعقوبیہ، دوسرا نسطوریہ، تیسرا مکلانیہ، مگر اس میں وہ سب متفق ہیں کہ تینوں اقنوم برابر کے ہیں۔ خواہ وہ باپ (اللہ) بیٹا (عیسیٰ) روح القدس (جبرئیل) ہوں یا اور کوئی۔ اس عقیدہ فاسدہ کی تردید گو لفظ احد اور اسکے بعد کے تینوں جملوں سے ہو چکی تھی مگر صراحۃً ان کی تردید جملہ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ سے فرما دی گئی۔

(ف ۳) هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ان تینوں الفاظ میں بندوں کے مراتب کی طرف اشارہ ہے بندگان خدا کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) مقربین جنکو عالم مشاہدہ کا مقام حاصل ہے جنکی ہمہ وقت حالت یہ ہے جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔

بخدا غیر خدا در جہاں چیزے نیست بے نشان است کز و نام ونشان چیزے نیست

اور یہ ممکن ہے کیونکہ مثلاً اگر کوئی شخص سُرخ چشمہ آنکھوں پر لگالے تو سب چیزیں سُرخ اور سبز لگالے تو سب چیزیں سبز نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جن حضرات کو مشاہدہ جمال کا مقام حاصل ہو گیا اور ان کی آنکھوں پر نورِ توحید مستولی ہو گیا۔ تو کائنات میں جدھر ان کی نظر پڑیگی وہی نظر آئیگا جو ان کی نگاہوں میں سما چکا ہے

چو سُلطان عزت علم بر کشد جہاں سر بجیب عدم در کشد

یہ مقربین حضرات انبیاء علیہم السلام صدیقین وشہدا اور اولیاء میں سے ہوتے ہیں، ان کی نگاہ سے کائنات کی ہستی مٹ جاتی ہے اور ان کو لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا هُوَ کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان کے لئے لفظ ھو فرمایا گیا جو اشارہ مطلقہ ہے مگر مشار الیہ معین ہے۔

(۲) اصحاب الیمین یہ وہ صلحاء وابرار ہیں جنکی بہیمیت وملکیت کا وزن برابر ہے۔ ان کی آنکھوں میں مخلوق کا بھی وجود ہے ان کا وہ حال نہیں جو مقربین کا تھا اسلئے ان کے لئے لفظ هُوَ کافی نہیں تھا۔ بلکہ ایک ایسا لفظ درکار تھا جو خالق ومخلوق میں امتیاز پیدا کر دے۔ اور وہ لفظ اللہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ مستجمع جمیع صفات کمالیہ کا الوہیت ومعبودیت کا مستحق ہے۔

(۳) اصحاب الشمال یعنی وہ اشرار جن پر بہیمیت غالب ہے۔ ان کی نگاہوں پر پردے پڑے ہوئے اور ان کے دِلوں پر زنگ چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ مشرکین وکفار ہیں، ان کو خالق ومخلوق میں کوئی تمیز نہیں۔ ان کی مثال گدھے کے اس نادان بچہ یا کُتیا کے اس انجان پلے کی ہے جو ہر ایک چیز کے پیچھے مال سمجھ کو دوڑتے رہتے ہیں۔ ان کی فہمائش کے لئے لفظ احد فرمایا تا کہ اسے وہ معبود وغیر معبود میں فرق کر سکیں،

(۴) اللہ کی صفات دو قسم ہی ہیں۔ صفات ثبوتیہ وصفات سلبیہ، پھر صفاتِ ثبوتیہ کی دو قسمیں ہیں (۱) اضافیہ (۲) غیر اضافیہ اس طرح صفات کی کل تین قسمیں ہو جاتی ہیں۔ (۱) صفات ثبوتیہ اضافیہ یعنی وہ صفات جنکا تفصیلی ظہور اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ذاتِ باری کے علاوہ دوسری کوئی چیز اثر قبول کرنے والی نہ ہو۔ یا یہ کہیے کہ وہ صفات جن کا تعلق یا تعقل کسی دوسری چیز سے وابستہ ہو جیسے سمیع، بصیر، خالق، رازق، مالک وغیرہ کہ ان کا تعقل مسموع، منصور، مخلوق، مرزوق اور مملوک سے وابستہ ہے۔ (۲) صفات ثبوتیہ غیر اضافیہ یعنی جن کا تعلق وتعقل اور تفصیلی ظہور ذات باری کے علاوہ کسی چیز پر

موقوف نہ ہو۔ اور وہ ذات کے تابع ہونے کے باوجود اپنا مفہوم جدا رکھتی ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا حی، ازلی، ابدی ہونا وغیرہ۔ (۳) صفات سلبیہ یعنی وہ صفات جو باری تعالیٰ کی تنزیہ پر دال ہیں جیسے جسم و جوہر نہ ہونا۔ متحیز نہ ہونا۔ والد و مولود نہ ہونا، حدوث و امکان سے بالاتر ہونا وغیرہ۔

جملہ ھو اللہ احد میں لفظ ھو ذات باری پر دلالت کرتا ہے۔ اور لفظ اللہ تمام صفات کمالیہ ثبوتیہ پر دلالت کرتا ہے۔ خواہ وہ اضافیہ ہوں یا غیر اضافیہ۔ اور لفظ احد تمام صفات سلبیہ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ احدیت کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی ذات کا منفرد ہوتا ہے، حدوث و امکان سے بالاتر ہونا اور ہر قسم کی ترکیبات سے منزہ ہونا وغیرہ ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا، آگے کے جملوں میں چند صفات سلبیہ ہی کی توضیح و تاکید ہے۔ محتاج نہ ہونا، والد و مولود نہ ہونا اور شریک سے پاک ہونا، جو مخاطبین کی ضرورت سے بیان کی گئی ہیں۔

(ف ۵) باقی رہی یہ تحقیق کہ اللہ کی صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات یا نہ عین ذات اور نہ غیر ذات، یہ فلسفی مباحث ہیں جو علم کلام میں مذکور ہیں۔ ان بحثوں میں الجھنا خطرات سے خالی نہیں اور ان میں کوئی خاص مفید نتیجہ بھی نہیں۔ اور جو اس سلسلہ میں علم کلام میں بحثیں کی گئی ہیں۔ وہ صرف اٹکل کے تیر ہیں۔ واللہ اعلم۔

تم تفسیر سورۃ الاخلاص فالحمد للہ الاحد والصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہ الامجد ورسولہ الاجود من والد وماولد الذی یسمی محمد واحمد وعلیٰ اٰلہ وصحبہ الی الابد.

سُورَۃُ الفَلَقِ

سُورَۃُ الفَلَقِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ خَمسُ اٰیات

(رکوع ۱۔ آیات ۵۔ سورۃ فلق مدینہ میں اتری اور اس میں پانچ آیات ہیں۔ کلمات ۲۳۔ حروف ۷۴)

حسن بصریؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ اور جابرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سورت بھی مکہ میں نازل ہوئی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ قتادہؒ اور علماء کی ایک جماعت نے ابن عباسؓ کے قول کی تصحیح و تائید کی ہے۔ اور جمہور علماء کا مسلک بھی یہی ہے کیونکہ اس کا سبب نزول یہود کا سحر ہے۔ (کما سیاتی) اور انہوں نے مدینہ میں سحر کیا تھا۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے۔ لہٰذا جو لوگ اس کو مکیہ کہتے ہیں ان کا قول ناقابل التفات ہے۔ **وکذا الکلام فی سورۃ الناس لانھما نزلتا معاً کمافی الدلائل للبیھقیؒ** وغیرہ۔

ربط و مناسبت:

سورۂ اخلاص دولتِ ایمان و معرفت پر مشتمل ہے جو بمنزلہ جلب منفعت ہے۔ اور معوذتین میں اس دولت کی حفاظت کا طریقہ مذکور ہے جو بمنزلہ دفع مضرت ہے۔ اور کسب دولت و جلب منفعت مقصود ہونیکی وجہ سے اہم و مستحق تقدم ہے۔ اس لئے اول سورۂ اخلاص کو اور اسکے بعد معوذتین کو لایا گیا۔

(۲) نجات و فلاح کا اصلی مدار درستی اعتقاد پر ہے۔ جو سورۂ اخلاص میں مذکور ہوا لیکن اونچے حضرات کو جن کا ایمان و اعتقاد راسخ ہے اور حق الیقین کا مقام ان کو حاصل ہے کوئی شبہہ و خلجان پیش نہیں آتا۔ نیچے کے طبقے کے لوگوں کو

خصوصاً ان کو جن کا اعتقاد تقلید سے پیدا ہوا ہے شبہات پیش آ کر اعتقاد میں خلل انداز ہو سکتے ہیں۔ یا ان کو کسی کشمکش میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اس لئے معوذتین میں ان امور سے رب الفلق، رب الناس، ملک الناس اور الہ الناس کی پناہ چاہی گئی ہے تا کہ وہ فوز وفلاح کی دولت راہ میں چھن نہ جائے جو حق تعالیٰ نے عطاء فرمائی تھی اور سورۂ اخلاص میں جس کو بیان کیا گیا تھا۔ واللہ اعلم۔

معوذتین کا شانِ نزول:

سورۂ فلق وسورۂ ناس دونوں ایک ساتھ ایک ہی واقعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ سبب نزول کا واقعہ مسند احمد میں اس طرح آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا۔ جس کے اثر سے آپ بیمار ہو گئے تھے، جبرئیل امین علیہ السلام نے آ کر آپ کو اطلاع کی کہ آپ پر ایک یہودی نے جادو کیا ہے اور جادو کا عمل جس چیز سے کیا گیا ہے۔ وہ فلاں کنویں کے اندر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں آدمی بھیجے وہ لوگ کنویں سے اس جادو والی چیز کو نکال لائے اس میں گرہیں لگی ہوئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان گرہوں کو کھول دیا اسی وقت آپ تندرست ہو کر کھڑے ہو گئے اگر چہ جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو اس یہودی کا نام بتا دیا تھا اور آپ اس کو خوب جانتے تھے مگر اپنے نفس کے معاملہ میں کسی سے انتقام لینا آپ کی عادت نہ تھی اس لئے عمر بھر اس یہودی سے کچھ نہ کہا۔ وہ منافق تھا اس لئے حاضر ہوتا تھا مگر کبھی اس کی موجودگی میں آپ کے چہرۂ مبارک سے شکایت کے آثار نہیں پائے گئے۔ بخاری شریف کی روایت حضرت عائشہؓ سے یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک یہودی نے سحر کیا تو اس کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تھا کہ بعض اوقات آپ محسوس کرتے تھے کہ فلاں دنیوی کام کر لیا ہے۔ مگر وہ نہیں کیا ہوتا تھا پھر ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ میری بیماری کیا ہے اور فرمایا کہ دو شخص خواب میں آئے ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا پاؤں کی طرف، سرہانے والے نے دوسرے سے کہا ان کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے کہا یہ مسحور ہیں، اس نے پوچھا کہ سحر ان پر کس نے کیا؟ تو اس نے جواب دیا لبید بن اعصم نے جو یہودیوں کا حلیف منافق ہے، اس نے پوچھا کس چیز میں جادو کیا ہے؟ اس نے بتا دیا کہ ایک کنگھے اور اسکے دندانوں میں۔ پھر اس نے پوچھا وہ کہاں ہے؟ تو اس نے بتایا کہ کھجور کے اس غلاف میں جس میں کھجور کا یہ پھل پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ بیر ذوران میں ایک پتھر کے نیچے مدفون ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کنویں (ذوران) پر تشریف لے گئے اور اس کو (صحابہؓ کے ذریعہ) نکال لیا۔ اور فرمایا کہ مجھے خواب میں یہی کنواں دکھلایا گیا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ آپ نے اس کا اعلان کیوں نہ فرمادیا کہ فلاں شخص نے یہ حرکت کی ہے۔ فرمایا مجھے اللہ نے شفا دیدی اور مجھے یہ پسند نہیں کہ میں کسی شخص کے لئے کسی تکلیف کا سبب بنوں (مطلب یہ تھا کہ اعلان کیا جاتا تو لوگ اس کو قتل کر دیتے یا تکلیف پہنچاتے) اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ کا یہ مرض چھ ماہ تک رہا۔ اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ حرکت لبید بن اعصم نے کی ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اس خبیث کو قتل کیوں نہ کر دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیا تھا۔

اور امام ثعلبیؒ کی روایت میں ہے کہ ایک لڑکا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا اس منافق یہودی نے اس کو بہلا پھسلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کنگھا اور اس کے کچھ دندانے اس سے حاصل کر لئے اور ایک تانت کے تار میں

گیارہ گرہیں لگائیں، ہر گرہ میں ایک سوئی لگائی کنگھے کے ساتھ اس کو کھجور کے پھل کے غلاف میں رکھ کر ایک کنویں میں پتھر کے نیچے دبا دیا، اللہ تعالیٰ نے یہ دوسورتیں نازل فرمائیں جن میں گیارہ آیات ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر گرہ پر ایک آیت پڑھ کر ایک ایک گرہ کھولتے رہے۔ یہاں تک کہ سب گرہیں کھل گئیں اور ایک دم آپ سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ فرشتوں نے (خواب میں سب پتہ بتا کر جاو پر گزرا) کہا کہ اس کو نکال کر جلا ڈالو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار بن یاسرؓ اور چند لوگوں کو بھیجا، کنویں پر گئے تو دیکھا کہ کنویں کا پانی مہندی کے پانی کی طرح (سرخ) ہے ان لوگوں نے کھجور کی ایک گابھہ کو نکال کر جلایا تو اس کے اندر سے ایک تانت نکلی جس میں گیارہ گرہیں تھیں اس پر یہ دونوں صورتیں نازل ہوئیں۔ (قُلْ اعوذ برب الفلق) اور (قل اعوذ برب الناس) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جونہی ان میں سے ایک آیت پڑھتے تھے۔ ایک گرہ کھل جاتی تھی۔ بغویؒ نے کہا روایت میں ہے کہ لوگوں نے جب پتھر اٹھا کر اس کے نیچے سے کھجور کا کھوکھلا گابھہ نکالا تو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کے کچھ بال اور کنگھی کے دندانے موجود تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج کر یہ جادُو برآمد کرایا تھا (ممکن ہے کہ حضرت علیؓ بھی ان صحابہؓ کے ہمراہ ہوں جو نکالنے کے لئے مامور تھے) مسلم میں حضرت ابو سعیدؓ کی روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ علیل ہیں؟ فرمایا ہاں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا بِسْمِ اللهِ اَرْقِيْکَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يؤذيک من شر كل نفس او عين حاسد اللهُ يشفيک بسم الله ارقيک ۔ (یہ سب روایات ابن کثیر و مظہری وغیرہ میں ہیں)۔

سحر سے متاثر ہو جانا نبوت کے منافی نہیں:

گو معوذتین میں صراحۃً اس بات کا ذکر نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا گیا تھا یا کس نے کیا تھا اور اس کا اثر کیا ہوا؟ لیکن چونکہ روایات صحیحہ سے یہ ثابت ہے (کمامر) کہ مدینہ میں لبید بن اعصم اور اسکی بیٹیوں نے سحر کیا تھا جس کا آپ پر اثر ہوا پھر جبرئیل علیہ السلام کی اطلاع پر اس کو نکلوایا گیا وغیرہ اس لئے اکثر مفسرین اسکے قائل ہیں کہ یہ سورتیں اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اور سحر کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا۔ لیکن معتزلہ اور بعض مفسرین نے ان روایات کا صاف انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب روایات غلط اور بے اصل ہیں۔ کیونکہ (۱) کفار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور طعن مسحور کہتے تھے۔ اگر یہ واقعہ صحیح مان لیا جائے تو کفار کا طعن صحیح ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے۔ (۲) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس سے بالا و برتر تھی کہ آپ کو کوئی مضرت پہنچا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ اور وعدۂ خداوندی میں کون خلل انداز ہو سکتا ہے۔

لیکن معتزلہ وغیرہ کا یہ کہنا کوتاہی فہم و قصور عقل و نقصانِ علم کی وجہ سے ہے (۱) احادیث صحیحہ کا انکار خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی بڑا ظلم ہے۔ یہ تو عقل کا قصور ہے نہ کہ روایات کا، بہت سے عقل کے پتلے اس دور میں بھی ایسے موجود ہیں کہ اگر ان کی عقل میں نہ آئے تو وہ نصوصِ صریحہ کا انکار کر دیتے ہیں۔ یہ اعتزالی جراثیم کا اثر ہے۔

(۲) یہ ضروری نہیں کہ جو چیز قرآن کی آیات سے صراحۃً ثابت ہو اسی کو مانا جائے بلکہ اشارہ سے، دلالت سے اقتضائے نص سے بھی احکام ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ اصولِ فقہ میں مذکور ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ میں اس طرف واضح اشارہ ہے اور مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے

کہ ایسا کرنے والا یہود میں سے ہے کیونکہ قرآن نے بہت سی آیات میں یہ صفت یہود ہی کی بیان کی ہے جیسا کہ پہلے پارہ کے اخیر میں اور پانچویں پارہ میں مذکور ہے اور اہل علم پر پوشیدہ نہیں۔ نیز احادیث صحیحہ بھی کسی چیز کے ثبوت کا ایک مضبوط ذریعہ ہیں۔

(۳) سحر بھی اسباب طبعیہ میں سے ایک سبب ہے اور بشر کا اسباب سے متاثر ہونا امر طبعی و تقاضائے فطری ہے۔ جیسے گرمی، سردی، امراض وغیرہ سے متاثر ہو جانا۔ بھوک پیاس، سیری وسیرابی احساسِ درد وغم، زدوکوب کے اثرات وغیرہ اسباب سے نبی وغیر نبی تمام انسان متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح جادو بھی اسباب طبعیہ میں سے ایک سبب ہے۔ جو لوگ سحر کی حقیقت سے ناواقف ہوں وہی تعجب کر سکتے ہیں کہ اللہ کے نبی پر اس کا کیسے اثر ہو سکتا ہے۔ اور اس کا وہی انکار کر سکتے ہیں جو تاثیر اسباب سے نابلد ہوں۔ (۴) رہی یہ بات کہ کفار آپ کو مسحور ہونے کا طعنہ دیدیتے تھے ﴿اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلاً مَّسْحُوْرًا﴾ تو یہ مسحور بمعنی مجنون ہے۔ کفار کا مقصد یہ تھا کہ تم ایک ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس کو سحر نے دیوانہ بنایا ہے۔ اس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے اور آیت کے اشارہ سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ اور اس سحر سے جو لبید اور اس کی لڑکیوں نے کیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوش وحواس اور عقل وفہم میں کوئی قصور واقعہ نہیں ہوا تھا تو اس سے کفار کا مدعا کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ (۵) اور دوسری دلیل کہ اللہ نے حفاظت کا وعدہ فرمایا۔ بیشک حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن وعدۂ حفاظت کی آیت وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ کے نزول کے بعد کیا آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچی؟ آپ کو کوئی بیماری، جسمانی مضرت اور قلبی اذیت نہیں پہنچی؟ کیا جنگ احد میں زخمی نہیں ہوئے؟ دندانِ مبارک شہید نہیں ہوئے؟ کیا خیبر میں یہود نے آپ کو بکری کے گوشت میں زہر ملا کر نہیں دیا؟ جس کا شدید اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا، اگر یہ سب کچھ ہوا ہے تو کیا ان لوگوں کی سمجھ کے مطابق وعدۂ حفاظت میں خلل اندازی نہیں ہوئی؟ حقیقت یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت کا وعدہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی شہید نہیں کر سکتا۔ علمائے سلف وخلف کا اس پر اتفاق ہے۔

حاصل یہ ہے کہ سحر سے متاثر ہو جانا نہ نبوت کے منافی ہے نہ وعدۂ حفاظت کے خلاف ہے۔ بلکہ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر (ساحر) کہتے تھے۔ حالانکہ کفار کا خیال تھا کہ ساحر پر کسی کا سحر اثر نہیں کر سکتا۔ تو اس واقعہ سحر سے کفار کی تغلیط ہو گئی۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا اثر ہو گیا اس لئے اے کفار تمہارے عقیدہ کے مطابق آپ ساحر نہ ہوئے۔ ورنہ سحر کا اثر نہ ہوتا۔ واللہ اعلم۔

معوذتین کے فضائل وخواص:

حافظ ابن قیمؒ نے معوذتین کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان دونوں سورتوں کے منافع وبرکات بے شمار ہیں اور سب لوگوں کو ان کی حاجت وضرورت ہے، کوئی ایک انسان بھی ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں سورتوں کو سحر، نظر بد، آفات جسمانی اور امراض روحانی کے دور کرنے میں تاثیر عظیم ہے۔ اور حقیقت کو سمجھا جائے تو انسان کو ان کی ضرورت سانس لینے، کھانے پینے اور لباس پہننے سے بھی زائد ہے۔

یہ تو ہر مؤمن کا عقیدہ ہے کہ دنیا وآخرت کے منافع ونقصانات سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں بغیر اس کی مشیت کے کوئی کسی کو ذرہ برابر نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اس لئے دنیا وآخرت کی تمام آفات سے محفوظ رہنے کی اصل صورت یہی

ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دیدے، اور اپنے عمل سے اس کی پناہ میں آنے کے قابل بننے کی کوشش کرے۔ ان دونوں سورتوں میں سے پہلی سورت (سورۂ فلق) میں تو دنیوی آفات سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تعلیم ہے۔ اور دوسری سورت (سورۂ ناس) میں اُخروی آفات سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ یا یہ کہئے کہ سورۂ فلق میں جسمانی شرور سے اور سورۂ ناس میں روحانی آفات سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مستند احادیث میں ان دونوں سورتوں کے بڑے فضائل اور برکات منقول ہیں۔ مثلاً۔

(۱) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہیں کچھ خبر ہے کہ آج رات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایسی آیات نازل فرمائی ہیں کہ ان کی نظیر موجود نہیں اور وہ ہیں **قُل اعوذ برب الفلق** ...... اور **قل اعوذ برب الناس** ...... (مسلم) (۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت سورۂ اخلاص ومعوذتین تین تین بار پڑھ کر اپنے اوپر دم فرماتے تھے۔ (بخاری ومسلم) (۳) حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ میں جحفہ اور ابواء کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ چل رہا تھا کہ اچانک ہوا اور شدید تاریکی نے ہمیں گھیر لیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم **قل اعوذ برب الفلق** اور **قل اعوذ برب الناس** کے ذریعہ پناہ (خداوندی) چاہنے لگے اور فرمانے لگے کہ اے عقبہ! ان دونوں سورتوں کے ذریعہ پناہ لو۔ اس لئے کہ کوئی پناہ لینے والا ان دونوں سورتوں کے مثل سے پناہ نہیں لے سکتا۔ (ابوداؤد) (۴) عبداللہ بن خبیبؓ کی روایت گزر چکی ہے کہ جس میں ہے کہ ہم بارش اور سخت تاریکی والی رات میں نکلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو، تو میں نے عرض کیا کیا کہوں؟ فرمایا **قل ھُوَ اللہُ اَحَدٌ** اور معوذتین صبح وشام تین تین بار پڑھو تم کو ان کا پڑھنا ہر چیز سے کفایت کریگا۔ (ترمذی، ابوداؤد ونسائی) (۵) حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں سورۂ ہود یا سورۂ یوسف پڑھا کرتا ہوں۔ فرمایا تم کوئی چیز (باب التعوذ لدفع السوء میں) **قل اعوذ برب الفلق** سے زیادہ اللہ تعالیٰ تک رسائی والی ہرگز نہیں پڑھ سکتے۔ (احمد، نسائی، دارمی) (۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے فرمایا کہ میں تجھ کو ایسی سورتیں نہ سکھلا دوں جن کے مثل نہ تورات میں (کوئی سورت) نازل ہوئی نہ زبور نہ انجیل میں اور نہ قرآن میں؟ میں نے عرض کیا ضرور سکھا دیجئے فرمایا **قل ھو اللہ احد** **قل اعوذ برب الفلق**، اور **قل اعوذ برب الناس**۔ (۷) حضرت عقبہ بن عامر کا بیان ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو معوذتین پڑھائیں اور پھر مغرب کی نماز میں ان دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا کہ ان سورتوں کو سوتے وقت بھی پڑھا کرو اور پھر (نیند سے) اٹھ کر بھی۔ (۸) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی بیماری پیش آتی تو آپ ان دونوں سورتوں کو پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کرتے اور پورے بدن پر پھیر لیتے تھے۔ جب مرض وفات میں آپ کی تکلیف بڑھی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر آپ کے ہاتھوں پر دم کر دیتی تھی۔ آپ اپنے تمام بدن پر پھیر لیتے تھے۔ اور میں یہ کام اسلئے کرتی تھی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کا بدل میرے ہاتھ نہ ہو سکتے تھے۔ (رواہ الامام مالک) (۹) ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے ان دونوں صورتوں کو ہر نماز کے بعد پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ (ابوداؤد ونسائی) یہ تمام روایات مظہری وابن کثیر اور مشکوٰۃ میں ہیں) خلاصہ یہ ہے کہ تمام آفات ومصائب اور امراض میں یہ دونوں صورتیں پڑھنے کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا معمول تھا۔

ایک اہم انتباہ:

امام احمدؒ، بزارؒ، طبرانی اور ابن مردویہؒ نے طرق صحیحہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو مصحف سے مٹادیتے تھے اور فرمادیتے تھے کہ (قرآن سورۂ اخلاص پر ختم ہوچکا معوذتین قرآن کا جزء نہیں ہیں اسلئے) غیر قرآن کو قرآن میں شامل نہ کرو، یہ سورتیں کتاب اللہ کا جزء نہیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان کے ذریعہ صرف تعوذ کا حکم دیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان کی تلاوت بھی نہیں فرماتے تھے۔ اس روایت کو لیکر بعض ملحدوں نے بڑا شور مچایا ہے۔ اور قرآن مقدس کے اعجاز میں نکتہ چینی کی ہے۔ کہ اگر قرآن حد اعجاز کو پہنچا ہوا ہوتا تو ضرور غیر قرآن سے ممتاز ہوجاتا اور ان سورتوں کی قرآنیت میں صحابہ کرامؓ میں ہرگز اختلاف نہ ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس روایت سے ہرگز مغالطہ میں نہ پڑنا چاہیے۔ کیونکہ:

(۱) ان سورتوں کے کلام الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کا انہوں نے انکار نہیں کیا۔ اور جس نے ان کے متعلق یہ خیال کیا ہے وہ انتہائی غلط فہمی میں ہے۔ وہ ان کو کلامِ الٰہی و منزل من اللہ ماننے کے باوجود قرآن کا جزء قرار نہیں دیتے تھے (۲) تمام صحابہ کرامؓ اس بارے میں ان کے مخالف تھے اور سب ہی نے ان کے اس قول کو غلط ٹھہرایا ہے۔ **قال البزاز لم یتابع ابن مسعود احدمن الصحابة.** (۳) صحیح احادیث سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نمازوں میں پڑھا کرتے تھے جبکہ نمازوں میں صرف قرآن مقدس کی تلاوت ہوتی ہے۔ (۴) مصحفِ عثمانی میں جس کی قرآنیت پر تمام صحابہ کرامؓ اور امت مسلمہ کا اجماع ہوچکا ہے ان دونوں سورتوں کو قرآن کا جزء قرار دیا گیا ہے۔ (۵) بخاری، احمد اور نسائی نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے حضرت زر بن جیشؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے ان دونوں سورتوں کے بارے میں سوال کیا کہ ابن مسعودؓ ان کو مصحف میں نہیں لکھتے؟ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اور جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تمہارے سوا مجھ سے اس سلسلہ میں کسی نے دریافت نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جیسا مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے کہا ایسا ہی میں نے کہا تم بھی ایسے ہی کہو (یعنی ان کو جبرئیل امینؑ لیکر آئے ہیں اور یہ بھی قرآن کا جزء ہیں) حضرت ابیؓ کہتے ہیں کہ ہم بھی وہی کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (کہ یہ سورتیں قرآن مقدس کا جزء ہیں) (۶) بعض علماء کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود بھی ان کو قرآن کا جزء مانتے تھے مگر الحمد شریف کی طرح ان کو اکثر پڑھتے تھے اس لئے ان کو اپنے مصحف میں لکھنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ اس نہ لکھنے کی وجہ سے لوگوں نے یہ خیال کرلیا کہ وہ ان کو جزءِ قرآن نہیں مانتے تھے۔

(۷) شرح مواقف میں ایک اصولی بات لکھی ہے کہ بعض سورتوں میں صحابہ کا اختلاف اخبار احاد سے منقول ہے اور اخبار احاد صرف ظن کا فائدہ دیتی ہیں۔ اور قرآن پاک کا مجموعہ تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ اور تواتر سے یقین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں ظن مضمحل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا تواتر کے ہوتے ہوئے ان اخبار احاد کی طرف قطعاً التفات نہ کیا جائیگا۔ (۸) کیونکہ مذکورہ اختلاف نہ تو منزل من اللہ ہونے میں ہے اور نہ ان کے حد اعجاز کو پہنچنے میں اور نہ کلام الٰہی ہونے

میں زائد سے زائد جزوقرآن ہونے میں تھا۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ شاید حضرات ابن مسعودؓ نے ضرور اس سے رجوع کرلیا ہوگا۔(۹) پھر جب یہ معلوم ہو چکا کہ یہ سورتیں مصحفِ عثمانی میں مکتوب ہیں پوری امت کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے دور صحابہؓ سے آج تک ان کو نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اگر کسی خاص مصلحت سے کسی ایک شخص نے ان کو اپنے مصحف میں نہیں لکھا تو اس سے تردد جائز نہیں۔ بلکہ تمام علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اب اگر کوئی ان سورتوں کی قرآنیت کا انکار کرتا ہے تو وہ بلاشبہ کافر ہو جائیگا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ (۱) مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲) وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۳)

آپ کہیے کہ میں صبح کے رب کی پناہ چاہتاہوں۔ تمام مخلوق کے شر سے اور اندھیرے کے شر سے جب وہ پھیل پڑے۔

قُلۡ	اَعُوۡذُ	بِرَبِّ	الۡفَلَقِ	مِنۡ	شَرِّ	مَا	خَلَقَ	وَ	مِنۡ	شَرِّ	غَاسِقٍ	اِذَا	وَقَبَ
کہہ	پناہ پکڑتا ہوں میں	ساتھ پروردگار	صبح	سے	برائی	اس چیز	پیدا کیا ہے	اور	سے	برائی	اندھیرا کرنیوالا	جس وقت	چھپ جائے

وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ (٤) وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (٥)

اور گرہوں پر پھونکنے والیوں کے شر سے ۔ اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔

وَ	مِنۡ	شَرِّ	النَّفّٰثٰتِ	فِی	الۡعُقَدِ	وَ	مِنۡ	شَرِّ	حَاسِدٍ	اِذَا	حَسَدَ
اور	سے	برائی	پھونکنے والیوں	میں	گرہوں	اور	سے	برائی	حسد کرنیوالا	جب	حسد کرے

لغات:

اَلۡفَلَق اسم فعل، تڑکا، اول صبح مخلوق۔ اسکے اصل معنی (ض) پھاڑنا ہیں۔ صبح کا نور سیاہی کے پردے کو پھاڑ کر نکلتا ہے۔ مخلوق پردۂ عدم کو چاک کر کے آتی ہے۔ اسی مناسبت سے صبح یا مخلوق کو خلق کہتے ہیں۔ غَاسِقٍ صیغہ اسم فاعل غَسَقَ سے غَسَقَ غَسَقاً (ض) تاریک ہونا، تاریکی میں داخل ہونا وغیرہ۔ غَاسِقٍ تاریک رات، چاند یا گرہن کے سبب تاریک ہوجانے والا چاند۔ غروبِ آفتاب یا غروبِ شفق کے بعد آنے والی تاریکی، ڈوبنے والا چاند، حوادث شب۔ وَقَبَ (ض) آنا، متوجہ ہونا، گڑھے میں داخل ہونا، غروب ہونا، تاریکی پھیلنا، چاند کا گرھن میں آنا، غاسق سے مراد رات ہوتو وَقَبَ کے معنی تاریک ہونا، اور چاند ہوتو وَقَبَ کے معنی غروب ہونا، غائب ہونا، گرہن ہونا ہونگے اَلنَّفّٰثٰتِ: النَّفَّاثَةُ کی جمع صیغہ مبالغہ نفثٌ (ن ض) منہ سے تھوک پھینکنا تھتکارنا، خون بہانا، تھوکنا تفل بھی تھوکنے کو کہتے ہیں لیکن نفثٌ میں تھوک کی کمی اور تفلٌ میں زیادتی ہوتی ہے۔ پھر دم کرنے کے لئے بھی نفث کا استعمال ہونے لگا۔ اَلۡعُقَدِ جمع عُقۡدَةٌ کی گرہ (ض) گرہ لگانا، معاہدہ کرنا وغیرہ (س) گرہ دار زبان والا ہونا، حَسَدَ (ن ض) حسد کرنا، غیر کی نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنا حسد کہلاتا ہے جو ناجائز ہے۔ اور تمنا سے مثلِ نعمت غیر غبطہ (رشک) کہلاتا ہے جو جائز ہے حَاسِدٍ اسی سے صیغہ واحد مذکر اسم فاعل ہے۔

ترکیب:

قُلْ : امر ۔ اَعُوْذُ فعل بافاعل۔ بِرَبِّ الْفَلَقِ جار مجرور متعلق مِنْ شَرِّ مضاف مَا موصولہ خَلَقَ فعل ضمیر فاعل جملہ فعلیہ صلہ موصول وصلہ مضاف الیہ مجرور مِنْ جار مجرور معطوف علیہ اپنے اگلے تینوں معطوفات ۔ سے ملکر متعلق ثانی اَعُوْذُ اپنے فاعل اور دونوں متعلقوں سے ملکر جملہ فعلیہ مقولہ۔ اِذَا وَقَبَ ظرف ہے شر کا یا غاسق کا اور فِی الْعُقَدِ النَّفّٰثٰتِ کے متعلق اِذَا حَسَدَ اِذَا وَقَبَ کی طرح ہے۔

تفسیر:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ...... فلق کے معنی پھٹنے کے ہیں مراد اس سے پو پھٹنا، صبح کا نمودار ہونا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فالق الاصباح آیا ہے، تمام صفات باری میں سے اس صفت کو اختیار کرنے میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ رات کی اندھیری اکثر شرور وآفات کا سبب بنتی ہے اور صبح کی روشنی ان تمام خطرات کو دور کر دیتی ہے لہٰذا اس صفت میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو اس سے پناہ مانگے گا اللہ تعالیٰ اس کی تمام آفات کو دور فرما دے گا، سعید بن الحسن (جبیر) مجاھد اور قتادہ وغیرہ اکثر مفسرین سے یہی معنی منقول ہیں بعض نے اس کے معنی مطلق پھاڑنے کے لئے ہیں جیسے فالق الحب والنوىٰ اناج کا دانہ اور گٹھلی پھاڑ کر سوئی نکالنے والا، بادل پھاڑ کر بارش، رحم پھاڑ کر بچہ، زمین پھاڑ کر چشمے نکالنا وغیرہ ابن عباسؓ سے بھی یہی تفسیر مروی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ الفلق جہنم کے اندر ایک قید خانہ ہے۔ کلبی نے کہا کہ جہنم کی ایک وادی کا نام الفلق ہے چنانچہ ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الفلق جہنم کے اندر ایک سرپوش کنواں ہے، ابن جریر اور بیہقی نے لکھا ہے کہ عبدالجبار خولانی نے بیان کیا کہ ہمارے پاس دمشق میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تشریف لائے اور لوگوں کو دنیا میں مشغول دیکھ کر فرمایا ان کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیا ان کے سامنے فلق نہیں ہے؟ لوگوں نے پوچھا فلق کیا چیز ہے؟ فرمایا دوزخ میں ایک کنواں ہے جب اس کو کھولا جائے گا تو دوزخی اس سے بھاگیں گے۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے عمرو بن عتبہ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ الفلق جہنم کا ایک کنواں ہے جب اس کو کھولا جائے گا اور اس کے اندر سے آگ برآمد ہوگی تو اس کی تیزی سے جہنم بھی چیخ اٹھے گی۔ ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ الفلق جہنم کے اندر ایک مکان ہے جب اس کو کھولا جائے گا تو جہنم والے بھی اس کی گرمی کی شدت سے چیخیں گے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ زید ابن علیؓ نے اپنے آباء (حضرت حسینؓ وحضرت علیؓ وغیرہم) کے حوالے سے بیان کیا کہ الفلق جہنم کی تہ میں ایک کنواں ہے۔ پناہ مانگنے کے حکم میں اللہ تعالیٰ نے رب الفلق کو خاص طور سے اس لئے ذکر کیا ہے کہ فلق سب سے بڑی تکلیف دہ مصیبت اور عظیم الشان شر ہے اس کا مالک یقیناً ہر شر کو رفع کرنے پر قادر ہے گویا اس وصف کو ذکر کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہم تمام شرور کو دفع کرنے پر قدرت رکھتے ہیں تم ہم سے پناہ مانگو۔ (مظہری) اول تفسیر کو جمہور مفسرین نے اختیار فرمایا مگر ثانی ہمہ گیر ہے جس میں صبح بھی آجاتی ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ...... اللہ تعالیٰ نے اس باغ ہستی کو ہر قسم کے درختوں سے زینت دی ہے اس میں باردار درخت بھی ہیں اور خاردار بھی، میٹھے بھی ہیں اور کڑوے بھی جو چیزیں انسان کے جسم اور اس کی روح کے لئے سازگار ہیں وہ اس کے لئے خیر ہیں اور جو ناموافق ہیں وہ شر ہیں روحانی شر عقائد کا فساد اور برائیوں کی طرف میلان ہے اور جسمانی شر فقر

وتنگدستی، امراض وغلبہء اعداء وغیرہ ہیں پھر شر کے ضد با اقسام ہیں سماوی، ارضی، دنیوی، اخروی، برزخی، اختیاری، غیر اختیاری، متعدی، غیر متعدی، وغیرہ تمام شرور سے خالق الخلق ہی کی پناہ مانگنی چاہئے کیونکہ اور کسی کے بس کی بات نہیں جو تمام شرور سے بچالے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شر کی دو قسم ہیں ایک تو وہ آلام وآفات جن سے براہ راست انسان کو رنج پہنچتا ہے۔دوسری قسم ان کے اسباب وموجبات ہیں، اس دوسری قسم میں کفر وشرک اور معاصی بھی داخل ہیں۔قرآن وحدیث میں ان دو ہی شروں سے پناہ مانگنے کا ذکر آیا ہے نماز کے اخیر میں جو دعاء واستعاذہ مسنون ہے اس میں چار چیزیں مذکور ہیں (۱) عذاب قبر (۲) عذاب نار (۳) فتنۃ الحیاء (۴) وفتنۃ الممات پہلی دو چیزیں خود مصیبت وعذاب ہیں جن سے براہ راست تکلیف پہنچتی ہے اور دوسری دو چیزیں عذاب کے اسباب حاصل یہ ہے کہ تمام شرور انہیں دو قسموں میں داخل ہیں یا تو وہ خود آلام وآفات ہیں یا ان کے اسباب بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ آیت میں صرف عالم خلق سے پناہ مانگنے کا حکم ہے کیونکہ عالم امر سراسر خیر ہے اس میں کوئی شر نہیں عالم خلق کی شر یا تو اختیاری ہے یا طبعی پھر اختیاری شر یا تو اپنی ذات تک محدود رہتی ہے جیسے کفر ومعصیت یا دوسروں تک پہنچتی ہے جیسے ظلم اور طبعی شر (صرف غیر اختیاری اشیاء کے خواص ولوازم ہیں) جیسے آگ جلاتی ہے اور زہر ہلاک کرتا ہے۔صاحب مظہریؒ کہتے ہیں کہ کوئی ممکن شر سے خالی نہیں ہاں اگر اللہ کی ذاتی وصفاتی تجلیات سے جگمگا جائے تو ممکن کی ہر خرابی دور ہو جاتی ہے اور شر خیر سے بدل جاتا ہے فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰت

(ف) لفظ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ساری مخلوق کے تمام شر وآفات سے پناہ مانگنے کے لئے کافی تھا مگر اس سورت میں تین چیزوں کو ممتاز کر کے خاص طور سے ان کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے جو اکثر آفات کا سبب بنتی ہیں پھر شان نزول کے پیش نظر اکثر سحر کی ترتیب وترکیب رات میں ہوتی ہے تاکہ کسی کو اطلاع نہ ہو اور اطمینان سے اسکی تکمیل ہو جائے۔اور گنڈہ پر دم کرنے والی جانوں یا عورتوں کی مناسبت اس جگہ ظاہر ہے۔کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر اسی طرح ہوا تھا۔اور یہودیوں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا تھا اس کا منشا حسد ہی تھا۔اس لئے متعلقہ تینوں چیزوں کو بطور عطف الخاص علی العام بیان فرمایا گیا۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۔ غَسَق کے معنی کیونکہ اندھیری پھیل جانے کے ہیں اس لئے ابن عباسؓ، حسنؒ اور مجاہدؒ نے اسکے معنی رات کے لئے ہیں۔اور وَقَبَ: وُقُوْب سے مشتق ہے جس کے معنیٰ اندھیری کے پوری طرح بڑھ جانے کے ہیں لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ میں رب الفلق کی پناہ چاہتا ہوں رات سے جبکہ اسکی اندھیری پوری ہو جائے۔رات کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ رات کے وقت جنات، شیاطین، موذی جانور، حشرات الارض چور، ڈاکو وغیرہ پھیلتے ہیں۔دشمنوں کے حملہ آور ہونے کا بھی یہی وقت ہوتا ہے۔اور جادو کی تاثیر وتکمیل بھی رات میں زیادہ ہوتی ہے۔صبح ہوتے ہی ان سب چیزوں کا تسلط ختم ہو جاتا ہے۔بعض مفسرین نے کہا کہ غـاسِق سے مراد چاند ہے کیونکہ حضرت عائشہ کی روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا عائشہ رضی اللہ عنہا! اللہ کی پناہ مانگ اس غاسق کے شر سے جب یہ ڈوبنے لگے۔اس صورت میں اِذَا وَقَـبَ کے معنی ہوں گے۔جب وہ ڈوبنے لگے اور بے نور ہونے لگے۔کیونکہ چاند کے نور کی کمی چاند پورا ہونے کے بعد ہی شروع ہو جاتی اور اندھیری زائد ہونے لگتی ہے۔نتیجہ کے اعتبار سے یہ دوسری تفسیر پہلی تفسیر سے ملجاتی ہے۔واللہ اعلم۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ...... لفظ نفّثٰت کا موصوف نفوس بھی ہوسکتا ہے۔ جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ اس صورت میں پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں سے مراد جانیں ہوں گی۔ اور اس کا موصوف النساء بھی ہوسکتا ہے اور ظاہر یہی ہے پھر عورتوں کی تخصیص شاید اسلئے کی گئی کہ جادو کا کام عموماً عورتیں کرتی ہیں۔ اور خلقۃً عورتوں کو اس سے مناسبت بھی زائد ہوتی ہے یا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا جو واقعہ ان سورتوں کا سبب نزول ہوا، اس میں جادو کرنے والیاں لبید بن اعصم کی لڑکیاں تھیں۔ جنہوں نے باپ کے کہنے سے یہ کام کیا تھا۔ اور جادوگروں سے پناہ مانگنے کو خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سبب نزول ہی واقعہ سحر تھا۔ اور یہ بھی کہ اس کا شر اور ضرر اسلئے زیادہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور بے خبری کی وجہ سے اسکے ازالہ کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی، وہ بیماری سمجھ کر دوا دارو میں لگا رہتا ہے اور تکلیف بڑھ کر مسحور لا علاج ہو جاتا ہے۔

(ف) اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک سحر ونظر کا اثر ہوتا ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں سحر میں فی نفسہ کوئی اثر نہیں۔ نہ عقل سلیم اسکو تسلیم کرسکتی ہے۔ البتہ ساحر قوتِ وہمیہ کو متأثر کر دیتا ہے۔ اور قوتِ وہمیہ کے منفعل ہو جانیکی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سحر کا اثر ہوگیا۔ لیکن معتزلہ کا یہ قول مشاہدات کے خلاف و ناقابل تسلیم ہے۔ ابو مسلمؒ کہتے ہیں کہ نفاثات استعارہ ہے ڈھیلا کرنے والیوں سے کیونکہ گرہ تھوک لگانے سے نرم اور ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ اور عُقد سے مراد مستحکم ارادے ہیں۔ اس صورت میں ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیت کا حاصل یہ ہوا کہ میں رب الفلق کی پناہ مانگتا ہوں ان عورتوں سے جنکے مکر کی پھونکیں مردوں کے مستحکم ارادوں کو ڈھیلا کر دیتی ہیں۔ عورتوں کے جادو اور مکر سے خدا کی پناہ، ان کے جادو سے سینکڑوں فرزانے دیوانے بن گئے، اس جادو کی تاثیر کے تو معتزلہ و علمائے فرنگ بھی قائل ہیں۔ ان کا شر بڑا شر ہے **النساء حبائل الشیطان اللھم احفظنا**

گر ہزاراں دام باشد ہر قدم ۔۔۔ گر تو طامائی نباشد ہیچ غم

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ...... یہ تیسری چیز ہے جس کے شر سے خصوصیت کے ساتھ پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ اسکی تخصیص کی وجہ بھی وہی مذکورہ دونوں چیزیں ہوسکتی ہیں (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اقدام حسد ہی کے سبب ہوا، یہود و منافقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی ترقی دیکھ کر جلتے تھے۔ اور جنگ سے وہ آپ پر غالب آنہیں سکتے تھے اس لئے انھوں نے جادو کے ذریعہ ہی اپنے حسد کی آگ کو بجھانا چاہا (۲) حسد حاسد کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ وہ ہر وقت محسود کو نقصان پہونچانے کی فکر میں لگا رہتا ہے اسلئے یہ ضرر شدید بھی ہے۔

کسی کی نعمت و راحت کو دیکھ کر جلنا اور یہ چاہنا کہ اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے چاہے خود اس کو بھی حاصل نہ ہو یہ حسد کہلاتا ہے جو حرام و گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن تحقیق یہ ہے کہ غیر اختیاری طبعی حسد کے مقتضاء پر اگر حاسد عمل نہ کرے بلکہ محسود کے ساتھ اپنے مقتضائے حسد کے خلاف رضائے خداوندی کے لئے عمل کرے تو یہ مجاہدۂ نفس اور باعثِ ثواب ہوگا۔ حسد سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں ہوا۔ اور یہ سب سے پہلا گناہ ہے جو زمین میں ہوا، کیونکہ آسمان میں ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا تھا۔ اور زمین پر آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل سے کیا تھا۔ جتنے متعدی گناہ ارادہ اور اختیار سے سرزد ہوتے ہیں جیسے قتل چوری وغیرہ ان سب کی بنیاد حسد ہے جب کسی کے سینہ میں حسد کی آگ بھڑکتی ہے تو وہ دوسرے کی بربادی کے لئے اپنی بربادی کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی لئے حکماء کا قول ہے کہ حسد ایسا

مرض جاں سوز ہے جس کی آگ میں پہلے خود حاسد جلتا ہے، حاسد خود ملعون و برباد ہوتا ہے مگر محسود کو بھی مبتلائے مصیبت کر دیتا ہے۔ جیسے شیطان خود ملعون و برباد ہوا مگر حضرت آدم علیہ السلام کو بھی مبتلائے مصیبت کر کے چھوڑا۔

اسی طرح قابیل خود مردود و برباد ہوا مگر اپنے بھائی ہابیل مظلوم کو بھی قتل کیا۔ حاسدین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ایذائیں پہونچائیں اور خود بھی وہ لوگ محروم وملعون ہوئے۔ حاسد اپنے خبیث نفس کی غضبناک توجہ سے بسا اوقات ضعیف محسود کو اس طرح نقصان پہونچاتا ہے جس طرح زہریلا سانپ اپنی نظر سے نقصان پہونچاتا ہے۔ اور جیسا نظر بد والا نظر لگا کر نقصان پہونچاتا ہے لیکن نظر بد والا مقابلہ ومعاینہ کے وقت نقصان پہونچا سکتا ہے۔ اور حاسد غیبت وحضور دونوں صورتوں میں محسود کو نقصان وایذاء رسانی کرتا ہے۔ پھر نظر بد کا نقصان نظر بد والے کو نہیں ہوتا اور حسد کا ضرر اولاً حاسد کو برباد کرتا ہے کما قیل

اِصْبِرْ عَلیٰ حَسَدِ حَسُوْ ۔۔۔ دِ فَاِنَّ صَبْرَکَ قَاتِلُہٗ

فَالنَّارُ تَاْکُلُ بَعْضَہَا ۔۔۔ اِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَاْکُلُہٗ

(ف۲) یہاں تین چیزوں سے خصوصی طور پر پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ مگر پہلی اور تیسری چیز میں ایک ایک قید ہے یعنی غاسق کے ساتھ اِذَا وَقَبَ اور حاسد کے ساتھ اذا حسد کی قید کا ذکر ہے۔ درمیانی چیز "النفثت" میں کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ جادو کی مضرت عام ہے۔ اور رات کی مضرت اسی وقت ہوتی ہے جب تاریکی خوب ہو جائے۔ اسی طرح حاسد جب تک دوسرے کو ایذاء پہنچانے کا قصد واقدام نہیں کرتا اس وقت تک اسکے حسد کا نقصان خود حاسد کی ذات ہی کو پہنچتا ہے کہ وہ جلتا اور کڑھتا رہتا ہے۔ اور محسود کو اس کا نقصان اسی وقت پہنچتا ہے جبکہ وہ حسد کے تقاضے پر عمل کر کے ایذاء رسانی کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے پہلی اور تیسری چیز میں یہ قیدیں لگائیں گئیں واللہ اعلم۔

ایک اور تفسیر:

بعض عارفین نے اس سورت کی تفسیر یہ کی ہے کہ سورۂ اخلاص میں جس طرح حق تعالیٰ نے شانِ الوہیت کو بیان فرمایا اسی طرح سورۂ فلق میں مراتب خلق کو بیان فرمایا ہے۔ تمام مخلوق عدم کی تاریکیوں کی شر میں مستور وغرق تھی۔ حق تعالیٰ نے ظلمتِ عدم کے پردے چاک کر کے مخلوق کو نورِ وجود کی طرف نکالا۔ اس لئے فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (آپ کہیے کہ میں اسی قادرِ مطلق کی پناہ چاہتا ہوں جس نے ظلماتِ عدم سے نورِ ہستی کی طرف نکالا) پھر مخلوقات کی دو قسمیں ہیں: (۱) عالم امر: جو کہ ارواح وملائک کا وطن ہے۔ اس میں خیر ہی خیر ہے شر کا نام ونشان وہاں نہیں۔ (۲) عالم خلق جس میں شر بھی ہے خیر بھی۔ اس لئے فرمایا مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ یعنی عالم خلق کے شر سے بچنے کی دعاء کرو۔ پھر عالم خلق میں علویات ہیں یا سفلیات، علویات میں شر کم ہے، سفلیات کی تین قسمیں ہیں: جمادات، نباتات، حیوانات۔ ان تمام قسموں میں شر ہے۔ جمادات میں تو قوتِ نفسانیہ ہی نہیں اسلئے اس میں شر ہی شر ہے کیونکہ وہ اقرب الی العدم ہے۔ اس لئے سب سے اول اس کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ اور نباتات میں قوتِ نامیہ موجود ہے جو ان کو طول وعرض وعمق میں بڑھاتی ہے۔ یہی وہ گرہیں ہیں جن میں وہ قوتِ نباتیہ پھونکتی ہے اسلئے اسکے بعد فرمایا وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ پھر حیوانات میں قوی حیوانیہ، حواس ظاہرہ وباطنہ، شہوت وغضب وغیرہ ہیں۔ اور یہ سب چیزیں حاسد بن کر عالم غیب کی طرف متوجہ ہونے اور بارگاہِ حق میں مشغول ہونے سے روکتی ہیں۔ اسلئے ان کی شر سے پناہ مانگنے کا آخری جملہ میں حکم دیا۔

ومِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ اب عالم سفلی میں باقی رہے حضرت انسان، تو ان کے مراتب کا ذکر سورۂ ناس میں آ رہا ہے۔ واللہ اعلم۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ صوفیوں کی اس قسم کی چیزیں قرآن کی تفسیر نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ اپنے خودساختہ خیالات کو قرآنی اشارات سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تم تفسیر سورۃ الفلق فالحمدُ للہ الّذی کل شیء خلق والصلوٰۃ والسلامُ علی من فاق جمیع الخلق وعلی کلھم سبق وعلی آلہ وصحبہ الذین اھتدوا وھادُوا الی من خَلَق۔

سُورۃُ النَّاسِ

سُورۃُ النّاسِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ سِتُّ ایاتٍ

(رکوع ۱۔ ایات ۶۔ سورۃ الناس مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں چھ آیات ہیں۔ حروف ۷۹۔ کلمات ۲۰)

ربط وغیرہ:

جو کلام سورت کے مکیہ یا مدنیہ ہونے میں اور شانِ نزول و ربط میں سورۂ فلق کے شروع میں ہو چکا وہی یہاں پر ہے البتہ ان دونوں سورتوں میں ربط یہ ہے کہ سورۂ فلق میں دنیوی آفات و مصائب سے پناہ مانگنے کی تعلیم تھی اور اس سورت میں اخروی آفات سے پناہ مانگنے کی تاکید ہے اور جیسا کہ شر کا مفہوم اوپر بیان کیا گیا کہ مصائب وآلام اور ان کے اسباب دونوں کو عام ہے اس سورت میں خاص طور پر اس شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے جو تمام گناہوں کا سبب اور مصائب کی بنیاد ہے یعنی شیطانی وساوس اور چونکہ آخرت کی مصیبت سخت اور وہاں کا نقصان وخسران شدید ہے۔ اس لئے اس کے سبب سے بچنے کی تاکید پر قرآن پاک کو ختم کیا گیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد رحم والا بڑا مہربان ہے

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱) مَلِكِ النَّاسِ (۲) اِلٰـهِ النَّاسِ (۳) مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ

آپ کہیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ (اور) انسانوں کے معبود کی، وسوسہ ڈالنے والے

قُل	اَعُوۡذُ	بِرَبِّ	النَّاسِ	مَلِكِ	النَّاسِ	اِلٰہِ	النَّاسِ	مِنۡ	شَرِّ	الۡوَسۡوَاسِ
کہہ	پناہ پکڑتا ہوں میں	ساتھ پروردگار	لوگوں	بادشاہ	لوگوں	معبود	لوگوں	سے	برائی	وسوسہ ڈالنے والا

الۡخَنَّاسِ (۴) الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ (۵) مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۶)

پیچھے ہٹ جانے والے کی برائی سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

الۡخَنَّاسِ	الَّذِیۡ	یُوَسۡوِسُ	فِیۡ	صُدُوۡرِ	النَّاسِ	مِنَ	الۡجِنَّةِ	وَ	النَّاسِ
پیچھے ہٹ جانیوالا	وہ جو	وسوسہ ڈالتا ہے	میں	سینے	لوگوں	سے	جنوں	اور	انسانوں

لُغات:

الوسواس اور الوسوسۃ رباعی مجرد کا مصدر ہے۔ برا خیال دل میں ڈال دینا، بکسر الواؤ بھی یہی معنی ہیں۔ وَسواس شیطان کو بھی کہتے ہیں، کتے اور شکاری کی ہلکی آواز، ہوا کے جھونکے سے درخت کی خفیف سرسراہٹ کو بھی۔ علامہ زمخشریؒ کہتے ہیں کہ الوَسْوَاس اسم مصدر بمعنی الوسوسۃ ہے جس کے معنی ہیں زیور کی یا اونٹ کے چلنے کی ہلکی آواز کے، اور بکسر الواو مصدر ہے۔ پھر اس کا استعمال بُرائی کے خطرہ (خیال) میں ہونے لگا۔ لیکن مراد شیطان ہے مبالغۃً شیطان ہی کو وسواس کہہ دیتے ہیں کثرتِ وسوسہ کی وجہ سے گویا وہ خود ہی وسوسہ (وسواس) ہوگیا۔ یا مضاف محذوف ہے اور ذی الوسواس لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ صفت ہے لہٰذا کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ الخَنّاس صیغہ مبالغہ اور شیطان کا لقب ہے جس کے معنی ہیں بہت پیچھے ہٹ جانے والا۔ خوب چھپنے والا، بہت رُکنے والا، کیونکہ ذکر اللہ کے وقت وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور وسوسہ ڈالنے سے رُک جاتا ہے۔ نیز وسوسہ ڈالکر غائب ہو جاتا ہے اسلئے اس کو خناس کہتے ہیں۔ مزید تحقیق سورۂ تکویر میں ملاحظہ فرمائیں۔ الجنۃ جنّی کی جمع ہے جو منسوب الی الجن ہے بمعنی جنوں کی جماعت۔ الناس اسم جمع یا جمع، ان دونوں لفظوں کی تحقیق گزر چکی۔

ترکیب:

قُلْ بمثل سابق۔ اَعُوْذُ فعل بافاعل ربّ الناس مرکب اضافی معطوف علیہ مَلِکِ النّاس ھکذا معطوف الٰہ النّاس ھکذا معطوف ثانی معطوفات مجرور باء، جار مجرور ملکر متعلق اول، مِن حرف جر شر مضاف الوَسْوَاسِ موصوف الخَنّاسِ صفت اول الذی اسم موصول یوسوسُ فعل ضمیر غائب فاعل فی صُدُوْرِ النّاسِ متعلق اول مِنَ الجِنَّۃِ والنّاس متعلق ثانی، فعل اپنے فاعل اور دونوں متعلقوں سے ملکر جملہ فعلیہ صلہ، موصول وصلہ ملکر صفت ثانی۔ الوَسْوَاسِ اپنی دونوں صفتوں سے ملکر مضاف الیہ شر مضاف اپنے مضاف الیہ سے ملکر مجرور، جار مجرور متعلق ثانی۔ اَعُوْذُ اپنے فاعل اور دونوں متعلقوں سے ملکر جملہ فعلیہ ہوکر مقولہ۔

تفسیر:

قل اعوذ برب الناس: رب کے معنی پالنے والے، اور ہر حال کی اصلاح کرنے والے، نیز آہستہ آہستہ نہایت شفقت کے ساتھ مربوب کو اس کے ابتدائی حال سے ترقی دے کر انتہائی حال تک پہنچانے والے کے ہیں۔ یہاں رب کی اضافت ناس کی طرف کی گئی ہے اور پہلی سورت میں فلق کی طرف، وجہ یہ ہے کہ سورۂ فلق میں ظاہری اور جسمانی آفات سے پناہ مانگنے کا حکم تھا اور وہ آفات صرف انسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ دوسرے حیوانات کو بھی جسمانی مصائب و آفات پہنچتی ہیں بخلاف وسوسہ شیطانی کے، اس کا نقصان انسان کے ساتھ مخصوص ہے اور جنات بھی اس میں تبعاً شامل ہیں اس لئے یہاں رب کی اضافت خصوصاً ناس کی طرف کی گئی ہے۔

ملک الناس: لوگوں کا بادشاہ الٰہ الناس، لوگوں کا معبود، ان دونوں صفتوں کا اضافہ اس لئے کیا گیا کہ لفظ رب کسی خاص چیز کی طرف مضاف و منسوب ہوتا ہے تو اس میں عموم ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے رب الدار گھر کے مالک رب المال مال کے مالک کو کہا جاتا ہے اور ہر مالک بادشاہ نہیں ہوتا جیسے رب

الداد کا بادشاہ ہونا ضروری نہیں اس لئے آگے مَلِک کی اضافہ کیا گیا یعنی وہ رب جو مالک بھی ہے بادشاہ بھی پھر ہر بادشاہ معبود نہیں ہوتا اس لئے تیسری صفت اِلٰهِ النَّاسِ کا اضافہ کیا گیا ان تینوں صفتوں کو جمع کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ان میں سے ہر صفت حفاظت کی مقتضی ہے اس لئے کہ ہر مالک اپنے مملوک کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح بادشاہ اپنی رعیت و ملک کی حفاظت کرتا ہے اور معبود کا اپنے عابد کا محافظ ہونا تو سب سے زیادہ ظاہر ہے، یہ تینوں صفتیں صرف حق تعالیٰ میں جمع ہیں اس کے سوا کوئی دوسرا ان تینوں صفتوں کا جامع نہیں اس لئے اس کی پناہ حاصل کرنا سب سے بڑی پناہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے ان تین صفتوں کی ساتھ پناہ مانگنا دعا کی قبولیت کے لئے اقرب ہے کہ یا اللہ! آپ ہی ان صفات کے جامع ہیں اس لئے ہم صرف آپ ہی سے پناہ مانگتے ہیں یہاں جبکہ پہلے جملہ میں رب الناس آچکا تھا تو بظاہر تقاضائے مقام یہ تھا کہ بعد میں اس کی طرف ضمیر لائی جاتی یعنی ملکھم و الھھم کہا جاتا مگر لفظ الناس کے بار بار تکرار میں لطیفہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں یہ لفظ پانچ بار آیا ہے پہلے لفظ ناس سے مراد بچے ہیں اور لفظ رب وصف ربوبیت اس کا قرینہ ہے کیوں کہ پرورش کی ضرورت سب سے زائد بچوں کو ہوتی ہے اور دوسرے لفظ ناس سے مراد جوان ہیں اور لفظ ملک اس کا قرینہ ہے جو اپنے اندر سیاست و دبدبہ کے معنی رکھتا ہے وہ جوانوں کے مناسب ہے اور تیسرے لفظ ناس سے وہ بوڑھے مراد ہیں جو دنیا سے منقطع ہو کر عبادت میں مشغول ہوں اور لفظ اله اس کا قرینہ ہے جو عبادت کی طرف مشیر ہے چوتھے لفظ ناس سے مراد اللہ کے نیک بندے ہیں اور لفظ وسواس اس کا قرینہ ہے کیونکہ شیطان نیک بندوں کا دشمن ہے۔ ان کے دلوں میں وسوسے ڈالنا اس کا مشغلہ ہے اور پانچویں لفظ ناس سے مراد مفسد لوگ ہیں کیونکہ ان کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ حق تعالیٰ کی تین صفات بیان فرما کر اس میں اس کا بیان ہے جس کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے اور وہ ہے وسواسِ خناس یہ معلوم ہو چکا کہ وسواس مصدر بمعنی وسوسہ ہے۔ شیطان کو وسواس بطور مبالغہ کہا گیا ہے گویا وہ وسوسے ڈالتے ڈالتے سراپا وسوسہ بن گیا۔ اور وسوسہ کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ایک مخفی کلام کے ذریعہ لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف بلاتا ہے۔ اور وہ کلام مخفی ایسا ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم قلب انسانی میں آجاتا ہے اور آواز محسوس نہیں ہوتی۔

الخنّاس یہ الْوَسْوَاس کی صفت ہے، جس کے معنی پیچھے لوٹنے کے ہیں، شیطان کو خنّاس اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی عادت یہ ہے کہ جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ پیچھے کو بھاگ جاتا ہے پھر جب غفلت ہوتی ہے تو پھر آکر وسوسے ڈالنے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان کے دل میں دو خانے ہیں ایک میں فرشتہ رہتا ہے دوسرے میں شیطان (فرشتہ اس کو نیک کاموں کی رغبت دلاتا ہے اور شیطان بُرے کاموں کی) پھر انسان جب اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور جب تک وہ ذکر میں مشغول نہیں ہوتا تو وہ اپنی چونچ انسان کے دل پر رکھ کر اس میں بُرائیوں کے وسوسے ڈالتا ہے۔ (جیسے مچھر اپنی سونڈھ کے ذریعہ انسان کے بدن میں اپنا زہر پیوست کرتا ہے)۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ یہ بیان ہے وسواس کا یعنی وسوسہ ڈالنے والے جنّات میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ دوسری جگہ قرآن پاک میں ہے ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾ (ہم نے انسانی اور جناتی شیطانوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے......) حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا حکم فرمایا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں جناتی شیطانوں کے شر سے بھی اور انسانی شیاطین کے شر سے بھی۔

شبہہ:

(۱) اگر یہ شبہہ ہو کر جناتی شیاطین کی طرف سے وسوسہ ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ پوشیدہ طریقہ پر کسی انسان کے قلب میں کوئی بات ڈالدیں۔ مگر انسانی شیطان تو کھلم کھلا سامنے آ کر بات کرتے ہیں ان کا وسوسہ سے کیا تعلق؟

جواب: انسانی شیاطین بھی اکثر کسی کے سامنے آ کر ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے اس کے دل میں کسی معاملہ کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوجاتے ہیں جن کو وہ صراحۃً نہیں کہتے (۲) شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اپنی کتاب ''الفوائد فی مشکلات القرآن'' میں فرمایا ہے کہ انسانی شیطان سے مراد خود انسان کا اپنے نفس کا وسوسہ ہے، کیونکہ جس طرح شیطان جن انسان کے دل میں برے کاموں کی رغبت پیدا کرتا ہے اسی طرح خود انسان کا اپنا وسوسہ ہے، کیونکہ جس طرح شیطان جن، انسان کے دل میں برے کاموں کی رغبت پیدا کرتا ہے اسی طرح خود انسان کا اپنا نفس بھی اس کو برائیوں کی طرف مائل کرتا ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفس کے شر سے بھی پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے حدیث میں ہے: اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَشَرِّ الشَّیْطَانِ وشرکہٖ یعنی اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں اپنے نفس کے شر سے بھی اور شیطان کے شر اور اس کے شرک سے بھی۔ (۳) کلبیؒ نے کہا کہ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ میں جو لفظ النَّاس ہے یہ جن وانس دونوں کو شامل ہے اور مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاس اس کا بیان ہے اور جنات پر لفظ انسان کا اطلاق ہوجاتا ہے کبھی لفظ انسان میں جنات تبعاً آتے ہیں کبھی انسان اور آدمی جنات کو بھی بول دیتے ہیں چنانچہ امام بغویؒ نے بیان کیا کہ ایک عربی شخص کے متعلق بیان کیا گیا کہ دورانِ گفتگو اس نے کہا کہ جنات کی ایک جماعت آ کر کھڑی ہوگئی۔ ان سے پوچھا گیا تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم جنات کے آدمی ہیں۔ (۴) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مِنَ الْجِنَّةِ الْوَسْوَاسِ کا بیان ہو اور النَّاس کا عطف الوسواس پر ہو۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی وسوسہ ڈالنے والے جنی شیطان کے شر سے اور انسانوں کے شر سے۔

شیطانی وساوس سے پناہ کی اہمیت:

امام ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اللہ نے اس سورت میں انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کی ان تین صفات (رب، ملک، الٰہ) کا ذکر کر کے شیطانی وانسانی وساوس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے۔ کیونکہ ہر انسان کے ساتھ وقتِ پیدائش سے ایک قرین (ساتھی) شیطان لگا ہوا ہے۔ جو ہر قدم پر اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ انسان کو تباہ وبرباد کردوں۔ وہ اول تو انسان کو گناہوں کی طرف راغب کرتا ہے اور ہر حیلہ وبہانے سے گناہوں میں پھنسا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ اس میں ناکام ہوتا ہے تو پھر انسان جو طاعات وعبادات کرتا ہے ان کو خراب کردینے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ اسمیں ریاء ونمود، غرور کبر اور بدنیتی پیدا ہوجائے۔ اہل علم کے قلب میں عقائد حقہ کے متعلق شبہات ڈالتا ہے۔ (جو جس لائن کا آدمی ہوتا ہے اسی لائن سے اس کو پٹ کرنے کی وہ کوشش کرتا ہے) اور اس کے شر سے تو وہ ہی بچ سکتا ہے جس کو اللہ بچالے۔ اس لئے آدمی کو ہمہ وقت اللہ سے دعاء کرنی چاہیے اور خود کو اس کی پناہ میں دیدینا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی ایسا نہیں جس پر اس کا قرین (ساتھی) شیطان مسلط نہ ہو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ: آپ کے ساتھ بھی یہ قرین ہے؟ فرمایا ہاں! لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری اعانت فرمائی اور اس کو ایسا کردیا کہ وہ مجھے خیر کے سوا کسی بات کو نہیں کہتا۔

حضرت انسؓ راوی ہیں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے، ایک رات میں ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ کی زیارت کے لئے مسجد گئیں واپسی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مسجد میں بیرونی حصہ تک تشریف لائے، دو انصاری حضرات سامنے آ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دیکر فرمایا ٹھہرو! میرے ساتھ صفیہ بن حیی (میری بیوی) ہیں، ان دونوں صحابیوں نے بکمال ادب عرض کیا سبحان اللہ یا رسول اللہ (کیا ہم لوگ آپ کے بارے میں کوئی بدگمانی کر سکتے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک کر سکتے ہو۔ کیونکہ شیطان انسان کے خون کے ساتھ اس کی رگ و پے میں اثر انداز ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت یہ خطرہ ہوا کہ کہیں شیطان تمہارے دلوں میں کوئی وسوسہ (بدگمانی کا) پیدا نہ کر دے (اس لئے میں نے بتا دیا کہ میرے ساتھ کوئی غیر عورت نہیں)

فائدہ:

جس طرح انسان کو خود گناہوں سے بچنا ضروری ہے اسی طرح دوسرے مسلمان کو بھی اپنے بارے میں حتی المقدور بدگمانی کا موقع نہیں دینا چاہیے، ایسے مواقع سے بچنا چاہیے۔ جس سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہو۔ حکم ہے اِتَّقُوا مَوَاضِعَ التُّهَمِ اور اگر کوئی ایسا موقع آ جائے تو وضاحت کر کے تہمت ختم کر دینی چاہیے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث بالا نے شیطانی وسوسہ کا نہایت خطرناک ہونا ثابت کیا ہے۔ جس سے خدا کی پناہ کے بغیر بچنا مشکل ہے۔

تنبیہ...... یہاں جس وسوسہ سے ڈرایا گیا ہے اس سے مراد وہ خیال ہے جس میں انسان اپنے اختیار سے مشغول ہو۔ اور جو غیر اختیاری طور پر دل میں خیالات آ کر گزر جائیں وہ نہ مضر ہیں نہ ان پر کوئی گناہ و مواخذہ ہے۔

دونوں سورتوں کے تعوذات میں فرق:

سورۂ فلق و سورۂ ناس (دونوں سورتوں) میں پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ مگر سورۂ فلق میں ایک صفت رب الفلق ذکر کی گئی۔ اور جن چیزوں سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی وہ تین ہیں۔ اور سورۂ ناس میں اس کے برعکس تین صفات ذکر کی گئیں۔ اور جس چیز سے پناہ کی تلقین کی گئی وہ ایک ہے۔ یعنی شرِ وسواس۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کا شر تمام مصائب و آفات اور شروع سے بڑھا ہوا ہے۔ اول تو اس کے آفات و مصائب کا اثر بیشتر جسم انسانی و امور دنیوی پر پڑتا ہے۔ اور شر شیطانی کا اثر روح انسانی و امور اخروی پر ہوتا ہے بلکہ دنیا و آخرت کو بالخصوص آخرت کو تباہ کرتا ہے اس لئے اس کا ضرر شدید ہے۔ دوسرے یہ کہ دنیا کی آفات کا تو مادی طور پر کچھ نہ کچھ علاج انسان کے قبضہ میں ہے اور وہ کرتا بھی رہتا ہے۔ مگر شیطان کے مقابلہ میں کوئی مادی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ تو انسان کو دیکھتا ہے اور انسان اس کو نہیں دیکھ پاتا، وہ انسان کے باطن میں نامعلوم طریقہ پر تصرف کرنے کی قدرت رکھتا ہے بس اس کا علاج ذکر خداوندی اور پناہ باری ہے۔

انسان کے دو دشمن اور انکا علاج:

انسان کے دو دشمن ہیں (۱) انسان (۲) شیطان، اول دشمن کی دشمنی سے بچنے کی تدبیر اولاً تو حسن خلق، مدارات، صبر، ترک انتقام ہے اس تدبیر سے باز نہ آئے تو قتال و جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسرے دشمن (شیطان) سے بچنے کی تدبیر صرف استعاذہ و ذکر ہے۔

سورۂ اعراف میں ہے۔ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (معافی کو اختیار کرو بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ لگو) یہ تو انسانی دشمن کے مقابلہ کی تدبیر ہے جس کا حاصل عفو و درگزر، اچھے کاموں کی تلقین اور اس

کی برائی سے چشم پوشی ہے۔اسی آیت میں آگے ہے۔﴿ وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ﴾ یہ شیطانی دشمن کے مقابلہ کی تدبیر ہے جس کا حاصل یہ ہے وساوس شیطانی سے اللہ کی پناہ مانگی جائے سورۂ مؤمنون میں انسانی دشمن کے مقابلہ کی تدبیر ﴿اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَۃَ﴾ بتائی ہے یعنی برائی کو بھلائی سے دفع کردو پھر شیطانی دشمن کے مقابلہ کے لئے فرمایا ﴿وَقُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ ہَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ وَاَعُوۡذُ بِکَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ﴾ (اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کی چھیڑ سے اور اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں) تیسری جگہ سورۂ حم سجدہ میں انسانی دشمن کی مدافعت کے لئے فرمایا ﴿اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ﴾ (برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو اگر ایسا کرلو گے تو تم دیکھو گے کہ تمہارا دشمن تمہارا مخلص دوست بن جائیگا۔اسی آیت کا دوسرا جزء شیطانی دشمن کے مقابلہ کی تدبیر میں ہے ﴿ وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ﴾ یہ الفاظ تقریباً وہی ہیں جو سورۂ اعراف کی مذکورہ آیت کے تھے۔اس کا حاصل یہ ہے کہ شیطان کے مقابلہ کی تدبیر استعاذہ کے سوا کچھ نہیں۔حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں یہ تین آیات لکھ کر فرمایا کہ پورے قرآن میں یہ تین آیات ہی اس مضمون کی وارد ہوئی ہیں۔ان تینوں آیات میں انسانی دشمن کا علاج عفو ودرگزر اور حسن سلوک بتایا گیا ہے۔کیونکہ انسانی فطرت یہی ہے کہ وہ حسنِ سلوک واحسان سے مغلوب ہوجاتا ہے اور جو شریر النفس اپنی فطری انسانی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں ان کا علاج حکم جہاد کی آیات میں بتلا دیا گیا ہے کیونکہ وہ کھلے دشمن ہیں کھلے سازوسامان کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔اس لئے ان کی قوت کا مقابلہ قوت سے کیا جاتا ہے۔اور شیطان لعین اپنی فطرت میں شریر وخبیث ہے۔احسان وسلوک عفو ودرگزر سے اس پر کوئی اچھا اثر نہیں ہوسکتا جس سے وہ اپنی شرارت سے باز آجائے۔اور نہ اسکے مقابلہ میں ظاہری جہاد وقتال کارآمد ہوسکتا ہے۔یہ دونوں قسم کی نرم وگرم تدبیریں تو صرف انسانی دشمن کے مقابلہ میں چلتی ہیں نہ کہ شیطان کے مقابلہ میں اس کا علاج تو صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجانا اور اللہ کے ذکر میں ہمہ وقت مصروف رہنا ہے اور بس۔

انجام کا فرق:

انسانی دشمن کے دفاع میں بہر صورت مقابلہ کرنے والا مؤمن کامیاب ہی کامیاب ہے۔اسمیں مؤمن کے لئے ناکامی ممکن نہیں۔غالب آگیا تو فاتح وغازی،مغلوب ہوگیا تو مجاہد صابر،اور مقتول ہوگیا تو شہید،اور اجر وثواب تو ہر صورت میں ضرور ملے گا۔رہا شیطان تو اس کی خوشامد کرکے اسکو راضی کرنا بھی گناہ بلکہ کفر اور اس کے مقابلہ میں شکست کھاجانا بھی بربادی اور مقابلہ کرکے ظاہری طور پر کامیاب ہونیکا کوئی راستہ بھی نہیں۔اس لئے اس کی مدافعت کے لئے حق تعالیٰ کی پناہ لینا ہی ایک کارگر تدبیر ہے۔اس کی پناہ کے سامنے شیطان کی ہر تدبیر ضعیف وبے اثر ہوجاتی ہے۔

کید شیطانی ضعیف ہے:

مذکورہ بالا تقریر سے یہ شبہ نہ ہو کہ شیطان کی طاقت بڑی ہے ہم کمزور ہیں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے ارشادِ باری ہے ﴿ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا﴾ شیطان کا مکر کمزور ہے اور ایمان والوں پر اس کے داؤ پیچ چلتے بھی نہیں ہیں۔ ارشاد ہے ﴿ وَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۔ اِنَّہٗ لَیۡسَ لَہٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ۔ اِنَّمَا سُلۡطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَوَلَّوۡنَہٗ وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ بِہٖ مُشۡرِکُوۡنَ﴾ جب آپ قرآن

پڑھنے لگیں تو اللہ کی پناہ لے لیں شیطان مردود سے ایمان والوں پر اسکا زور نہیں چل سکتا۔ جو خدا پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اس کا زور تو انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور اس کو شریک مانتے ہیں) حاصل یہ ہے کہ اللہ کا مؤحد و متوکل بندہ بن کر اللہ کی پناہ میں آ جانا شیطان مردود کے مقابلہ میں کامیاب ہونے کے لئے بہت کافی ہے اور نسخہ شافی ہے۔

قرآن کریم کے فاتحہ اور خاتمہ میں مناسبت:

حق تعالیٰ نے قرآن پاک کو سورۂ فاتحہ سے شروع فرمایا۔ جس کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد اسکی مدد حاصل کرنا اس سے صراط مستقیم کی توفیق مانگنا ہے۔ اور اللہ کی مدد اور صراط مستقیم یہی دو چیزیں ہیں جن میں انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی مضمر ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے حصول میں اور حصول کے بعد استعمال میں ہر قدم پر شیطان لعین کے مکرو فریب اور وسوسوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اس لئے اس جال کو پاش پاش کرنے اور منزل کی راہ کو صاف کرنے کی مؤثر تدبیر استعاذہ ہے۔ جس پر قرآن مقدس کو ختم فرمایا گیا۔ اور بعض محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کی ابتدا لفظ "ب" سے ہے اور اسکی انتہاء لفظ "سین" پر ہے۔ اس کا مجموعہ بس ہوتا ہے جس کے معنی کافی ہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن پاک دونوں جہان میں بس ہے۔ حکیم سنائی نے کہا

اول وآخر قرآن زچہ باآمد وسین   یعنی اندرہ دین رہبر تو قرآن بس

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم

تم تفسیر سورۃ الناس بفضلِ اللہ وعونہ وکرمہ وبہ تم درسی تفسیر فالحمدُ للہِ الذی بنعمتہ تتم الصٰلحت وماکنا لنھتدی لولا ان ھدٰنا اللہ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ وصفو قِرُسلہ وامام انبیآئہ محمد خاتم النبیین وسید المرسلین وعلیٰ الہ واصحابہ وائمۃ الدین وعلیٰ جمیع المُسلمین وسلم تسلیما کثیر اکثیرا کلماذکرہُ الذاکرُون وکُلماغَفَلَ عن ذکرہ الغافلون. رب جئتُ ببضاعۃٍ مُزجیۃٍفاوف لی الکیل وتصدق علی انک تجزی وتحب المتصدقین وتقبل من عبدک المذنب کماتقبلت من عبادک المخلصین الصٰلحین بجاہِ الانبیاء والمرسلین وحبیبک خاتم النبیین یاارحمَ الراحمین. اٰمین.

لیلۃیوم الاحد لست وعشرین مضت من شھر اللہ رمضان سنہ ۱۴۰۵ھ من ھجرۃالنبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم

چند گزارشات

قرآن کریم ایک معجز اور عظیم لاریب کتاب ہے جس کے مضامین کی جامعیت کا اندازہ اسی امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے علوم و معارف ، رموز و اسرار ، فصاحت و بلاغت..... اور دیگر خصوصیات کا لامتناہی سلسلہ جسے ہر مفسر قرآن نے اپنے عصر حاضر کے اعتبار سے اپنے علم و فضل کے بقدر سرانجام دیا ہے، لیکن اس کے باوجود اسکے عجائبات ختم نہیں ہوئے انہیں خصوصیات کو دیکھتے ہوئے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ''لا تنقضی عجائبہ'' کی عملی تفسیر سامنے آتی ہے۔ ہمارے مدارس اسلامیہ میں جو علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں ان میں بالاتفاق علم تفسیر کا مقام سب سے افضل وارفع ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدارس میں علم تفسیر پڑھانے کا سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا ہے، اور نصاب درس نظامی میں مکمل قرآن کریم کی تفسیر اس انداز میں پڑھائی جاتی ہے کہ مکمل قرآن کریم بمعہ ترجمہ طلبہ عزیز کو ازبر ہو جاتا ہے، اسی سلسلہ میں ثانویہ عامہ میں طلبہ وطالبات کو نصاب کے مطابق پارہ عم کا درس قدرے تفصیل سے دیا جاتا ہے، جس میں صرف، نحو کے قواعد کی مشق، حل لغات، ترکیب، شان نزول، ربط بین السور والآیات، اور دیگر مباحث قدرے تفصیل سے طلبہ کرام کو ذہن نشین کرائی جاتی ہیں، ظاہری بات ہے کہ اس طریقہ سے پڑھانے کے لئے مواد تو وافر مقدار میں مل جاتا ہے، لیکن یکجا اور مرتب نہیں ملتا اور اسکے لئے عربی تفاسیر کی طرف بھی مراجعت ضروری ہوتی ہے، لیکن اگر مطلوبہ مباحث کسی ایسی کتاب میں مل جائیں جو ان تمام ابحاث کو سمیٹے ہوئے ہو تو کیا ہی نعمت غیر مترقبہ ٹھہرے!

پیش نظر درسی تفسیر پارۂ عم تالیف ''حضرت مولانا نسیم احمد غازی مظاہری'' دیگر متقدمین مفسرین کے مختلف طرز و اسلوب (توحید و رسالت، تصوف و سلوک، آداب و اخلاق، فلسفہ و منطق) کی طرح اپنا ایک خاص اسلوب لئے ہوئے ہے، جس میں

1. سب سے پہلے سورت کے رکوعات، کلمات، اور حروف کی تعداد کو بیان کیا گیا ہے۔
2. پھر سورت کے نام پر بحث کی گئی کہ اس سورت کا مذکورہ نام کیوں رکھا گیا جسے وجہ تسمیہ کہا جاتا ہے۔
3. اور اسکے بعد سورت کا ماقبل اور مابعد ربط بیان کرتے ہوئے اگر اس پر کوئی اعتراض ہوسکتا تھا تو اسکا بخوبی جواب دیا ہے۔
4. اور شان نزول کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ یہ سورت کس موقع پر نازل ہوئی اور بعض اوقات نشاندہی بھی کی گئی ہے۔
5. انتہائی آسان زبان اور سلیس اردو محاورات کے مطابق ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔
6. تفصیل کے دوران اگر فعل یا اسم مشتق آیا تو اسکی بحث کو بھی مکمل منضبط کیا۔
7. حل لغات کے بعد مذکورہ آیات کی مکمل نحوی ترکیب سہل انداز میں پیش کی گئی ہے۔
8. پھر چونکہ طلبہ وطالبات کو پارہ عم ابتدائی درجہ میں پڑھایا جاتا ہے، اس لئے خصوصی طور پر طلبہ کی سہولت

کے لئے لفظی ترجمہ کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا، اور یہی اس کتاب کی دیگر اداروں کی طبع شدہ کتب کے مقابلہ میں نمایاں انفرادیت اوراہمیت ہے، اس لئے طلباء کرام اس نسخے سے ہی استفادہ کرنا زیادہ پسند کریں گے، کیونکہ ہر لفظ کے معنی کی الگ پہچان ان کے لئے بہت ضروری ہے۔

کافی عرصہ سے یہ کتاب ہمارے ملک میں چھپ رہی تھی، کتاب کی قدر و قیمت کو دیکھتے ہوئے اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس ہورہی تھی کہ اس کتاب کی خدمت اچھے انداز میں کی جائے اور اسے خوبصورت طبع سے آراستہ کر کے چھپوایا جائے، اور اچھے انداز میں پیش کیا جائے۔ الحمدللہ اس ضرورت کو احباب مکتبہ الہادی شاہ فیصل ٹاؤن نے خوب نبھایا ہے اور خصوصی طور پر اس کتاب میں لفظی ترجمہ کی جو ضرورت تھی اسکو بھی پورا کیا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ اس تفسیر سے انشاءاللہ طلبہ و اساتذہ یکساں مستفید ہوسکیں گے۔ اور ضروری امور کے سلسلہ میں کسی اور کتاب کی طرف رجوع کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ کتاب کے مضامین دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مصنف علیہ الرحمۃ نے اسی وجہ سے بعض مقامات میں قدرے طول بھی اختیار کیا ہے، جسکی وجہ سے بعض مضامین عام طلبہ کی سطح ذہن سے بلند بھی لکھدیئے ہیں بہرحال کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے کسی قسم کی تشنگی نہیں رکھتی......اس کتاب سے بھرپور استفادہ کا طریقہ یہ ہے کہ طلبہ عزیز لغات کو ازبر کریں، ترکیب پر خوب توجہ دیں اور مختصر مطالب کو پیش نظر رکھیں انشاءاللہ خوب فائدہ ہوگا۔ اگر اس اندازِ مذکور سے یہ پارہ طلبہ کرام حل کرلیں تو انشاءاللہ ان کو قرآنِ مقدس سے بہت کچھ مناسبت حاصل ہوجائیگی۔ اوراس کاوش کا یہی مقصد بھی ہے۔

وکتبہ
مفتی راشد محمود راجہ

تقریظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

امابعد!

درسِ نظامی میں ترجمہ قرآن کریم کی اہمیت سے تمام اہل علم اچھی طرح واقف ہیں، قرآنِ کریم کے معانی ومطالب سمجھنے میں اسکا بہت بڑا کردار ہے، یہیں سے طالب علم قرآنِ کریم کے علوم سمجھنے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیتا ہے، اوراس کے بعد زینہ بزینہ علم کی چوٹی اور اسکی اتھاہ گہرائیوں تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔

چنانچہ اس پورے سفر میں عم پارہ کی تفسیر اسکا پہلا قدم ہوتا ہے، اسی حوالے سے پارہ عم کو طلبہ کے ذہنی معیار اور علمی استعداد کو مدنظر رکھ کر لکھی جانے والی کئی ایک کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں مولانا نسیم احمد غازی مظاہری کی کتاب کو سب سے زیادہ پذیرائی ملی ہے، اور طلبہ کے ذوق اور علمی استعداد کے معیار سے ان کے علم کو بڑھانے میں بہت زیادہ ممد ومعاون ہے۔

مفتی راشد محمود راجہ صاحب نے اس میں لفظی ترجمہ کا اضافہ کا کر کے نہ صرف دینی مدارس کے طلبہ کے لئے ایک اچھی سہولت مہیا کردی ہے بلکہ اس کتاب کو بحیثیت افادیت بہت نمایاں کردیا ہے، اس سے طلبہ کی علمی استعداد اور قرآن فہمی میں مزید آسانی اور اضافہ ہوگا، بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کو بھی اس کتاب سے استفادہ کرنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ مولانا راشد محمود خود ایک ذی استعداد عالم دین ہیں احقران کو اس کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہے، اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انکی کاوش قبول فرما کر طلبہ کرام کو اس سے استفادہ کرنے کی بھرپور توفیق عطا فرمائے اور اس کا افادہ عام فرمائے۔ آمین۔

والسلام

(مفتی) ثناء اللہ محمود
نگران شعبہ تخصص فی الافتاء
جامعہ احتشامیہ جیکب لائن کراچی
۴ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ